شہر وحشت

ایم اے راحت

شہرِ وحشت

ایم اے راحت

رات کا گھٹا ٹوپ اندھرا، پرھول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دہشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکرائو، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل و دماغ کو مبہوت کرتی خوف و حیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر و شر کی انوکھی کہانی

صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے آسمان پر سرمئی بدلیاں کروٹیں لے رہی تھیں اور پو پھٹ رہی تھی۔ نعمت علی نے ایک کروٹ بدلی اور جوانی کی مست نیند سونے کی کوشش کرنے لگا کہ باہر سے منشی مدد علی کی لہک سنائی دی۔

وہ اپنی خوب صورت آواز میں مناجات پڑھ رہے تھے۔ ان کی آواز زور، زور سے آرہی تھی۔ نعمت علی نے سر کے نیچے سے تکیہ نکالا اور اسے منہ پر رکھ کر دونوں طرف سے کان بھینچ لئے۔ لیکن منشی مدد علی خوب تیز آواز میں اپنی مناجات پڑھتے رہے۔ نعمت علی دانت پیس پیس کر کروٹیں بدلنے لگا۔ دوسری طرف آسیہ بیگم جو نماز سے فارغ ہوئی تھیں۔ باورچی خانے میں چائے کے برتن دھو رہی تھیں۔ دیگچی میں پانی چڑھا کر انہوں نے سامنے کی الماری میں چائے کی پتی کی برنی تلاش کی اور ایک دم ان کا منہ بگڑ گیا۔ برنی خالی تھی۔ پتی ختم ہوگئی تھی۔ رات کو نعمت علی کو رمضانی کی دکان پر بھیجا تھا۔ رمضانی نے تو جو کچھ کہا ہو یا نہ کہا ہو۔ لیکن نعمت علی جو ہمیشہ باپ کے خلاف ہی رہا کرتا تھا۔ اپنی طرف سے بھی لگائی بجھائی کرتا رہتا تھا۔ اس نے آ کر کہا۔

"منع کردیا رمضانی نے کہ بابا سارا مال ادھار ہی میں بیچ دوں گا تو دکان کا میل کہاں سے بنے گا۔ پیسے دے جاؤ اور پتی لے جاؤ۔" اب اس وقت منشی مدد علی مناجات میں مصروف تھے اور نعمت علی آرام کی نیند سو رہا تھا۔ چائے کہاں سے بنتی جبکہ مدد علی مناجات سے فارغ ہوتے ہی چائے چائے، چیخنے لگتے، آسیہ بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔ ایسے ہی زندگی گزر رہی تھی۔ مدد علی کے ابا جان بھی تعویذ گنڈوں کا کاروبار کرتے تھے۔ مدد علی نے پانچویں کلاس تک تعلیم حاصل کی تھی اور اس کے بعد ان کے ابا جان نے انہیں بھی اسی لائن پر لگا دیا تھا۔ زندگی جیسے بھی گزری لیکن گزر گئی تھی۔ لے دے کر چھوٹی آنکھ کا ٹیٹ ایک بیٹا تھا جو اللہ نے دیا تھا مگر وہ بھی مکمل طور پر باپ کے نقش قدم پر، منشی مدد علی کے ابا جان نے تو جیسے بھی زندگی بسر کی ہو، لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ منشی مدد علی کچھ نہ ہونے کے ساتھ ساتھ نیک اور شریف انسان بھی تھے۔ تھوڑی بہت تعویذ گنڈوں کی سدھ بدھ تھی لیکن کبھی کسی غلط کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ یہ تھی زندگی جو گزر رہی تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ سسر صاحب یہ ایک چھوٹا، موٹا گھر چھوڑ گئے تھے کہ سر چھپانے کا ٹھکانا تھا۔ اب تن اور پیٹ کا مسئلہ رہ جاتا تھا۔ تو باہر والے کیا جانیں کہ کیسے

گزر رہی تھی۔ لیکن بس گزر رہی تھی۔ چائے بننے کے امکانات دور دور تک نہیں تھے اور پتا نہیں منشی جی کی جیب میں کچھ تھا یا نہیں۔ پتی کہاں سے آتی، سودا زیادہ تر ادھار ہی آتا تھا۔ چنانچہ جھلائی ہوئی آسیہ بیگم منشی مدد علی کے سامنے پہنچ گئیں۔

"بڑی آواز نکل رہی ہے۔ اب بتائیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟" منشی مدد علی نے مناجات بند کیں اور لاحول پڑھنے لگے۔

"سبحان اللہ، سبحان اللہ شیطان تو مذکر ہے یہ مؤنث پر لعنت پڑھنے سے آپ کو کیا ملے گا۔"

"بھوتنیاں بھی تو ہوتی ہیں اس دنیا میں۔" منشی مدد علی نے مناجات میں رکاوٹ پڑتے دیکھ کر غصیلے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بھوتنی ہی سہی مگر ایک اطلاع دینے آئی ہوں آپ کو، چائے کا نام لیا تو باورچی خانے میں آگ لگا دوں گی۔"

"کک...... کیا مطلب؟" مدد علی کو یہ دھمکی بڑی خوفناک محسوس ہوئی۔

"چائے کی پتی نہیں ہے بالکل گھر میں۔ نہ چاول ہیں نہ آٹا، دو تین دن سے بتا رہی ہوں کہ چاول اور آٹے کا بندوبست کر لو۔ ورنہ گھر میں کھانا پکانے کو کچھ بھی نہیں رہے گا۔"

"لاحول ولا قوۃ، لاحول ولا قوۃ، یہ صبح ہی صبح، چاول آٹا اور چائے کی پتی نازل ہو گئی میرے اوپر، کس نے منع کیا تھا تم سے کہ رمضانی سے سودا نہ منگواؤ۔"

"جی ہاں، خود رمضانی نے منع کر دیا تھا۔ کہنے لگا کہ اب ادھار دینے کے لئے مال نہیں ہے۔ سارا میل خراب ہو جائے گا۔ میں دکان کہاں سے بھروں گا۔"

"ارے ہمارے اوپر کون سا حساب ہے اس کا۔ سارا حساب چکتا کر دیا ہے اس کا۔ دیکھوں۔ ہاں کیسے منع کرتا ہے سودا دینے کو۔"

"لو، اچھی زبردستی ہے۔ مرضی اس کی۔ ارے میں تو کہتی ہوں کہ اب بھی مان لو۔ کہیں نوکری کر لو۔ وہ جو، حاجی ابراہیم صاحب نے تمہیں کہا تھا کہ اگر تم چاہو تو ان کی فیکٹری میں سپروائزر بن جاؤ، دیکھ بھال کرو۔ ایماندار آدمی ہو۔ ذرا سی محنت کرو گے تو کچھ کا کچھ ہو جائے گا۔"

"کیا بات کر رہی ہے تو آسیہ، اس آدمی کے ہاں نوکری کر لوں جو دو پیسے کی چیز چار پیسے کی اور چار پیسے کی چیز دس پیسے میں بیچنے کی کوشش کرتا ہے ارے اس نے تو اپنا ضمیر بیچ دیا ہے۔ معلوم ہے مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ وہ۔"

"کیا چاہتا ہوگا بھلا؟" آسیہ بیگم نے کہا۔

"بس اس کی ہاں میں ہاں ملاؤں، لوگوں کو لوٹوں۔"

"ارے بس چھوڑو، چھوڑو، دنیا میں سب ایک دوسرے کو لوٹ رہے ہیں۔ کوئی کسی کے گھر ڈاکہ مارنے تو نہیں جاتا۔ آخر انہیں بھی کاروبار کرنا ہے۔"

"نہ بابا نہ، میں اپنی سچ کی دنیا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"ہاں۔ اور اس سچ کے بدلے لوگ تمہیں پھوٹی کوڑی نہیں دیتے۔ کیوں یہ ہی بات ہے ناں۔"

"ارے سچ کا بدلہ ملتا کہاں ہے۔ آسیہ بیگم اس دنیا میں جھوٹ ہی کا بول بالا ہے۔"

"تو بابا کیوں نہیں بولتے جھوٹ پیٹ تو بھرے گا۔ دیکھ رہے ہو چاروں طرف سنیاسی بابا بیٹھے ہوئے ہیں۔ پیر بابا، عامل شاہ بنگالی، ہندوستانی پٹھان، پتا نہیں کون کیا کیا ہے۔ دنیا کی ہر مانگ پوری کرتے ہیں اور آپ ہیں کہ بس نزلہ، بخار کے تعویذ دیتے ہیں۔"

"دل نہیں مانتا آسیہ بیگم، دل نہیں مانتا، کوئی پوچھتا ہے نوکری کب لگے گی، مولوی صاحب! تو کیسے کہہ دوں اس سے کہ بچے کام ہونے ہی والا ہے۔ نکال پچیس روپے، ارے پچیس روپے ممکن ہے اس کے دو دن کا پیٹ بھر دیں اسے بھوکا کر دوں اور خود کھا لوں۔"

"دونوں میں سے ایک کو تو بھوکا مرنا ہی ہے۔ ہم مر یں یا وہ۔"

"نہ بابا نہ آسیہ بیگم دوسروں کو بھوکا مار کر میں اپنا

پیٹ کبھی نہیں بھر سکتا۔"

"تو پھر یہ تعویذ گنڈوں کا کام چھوڑ کر کوئی اور ڈھنگ کا کام کرو ناں۔"

"ساری زندگی اسی میں گزر گئی۔ باپ دادا یہ ہی کرتے چلے آئے ہیں۔ اب کون سا ڈھنگ کا کام کروں۔ اصل بات تو یہ ہے آسیہ بیگم کہ اب یہ ذمے داری ہمارے جوان جہان صاحبزادے کو سنبھالنی چاہئے۔ اللہ کے حکم سے پورے چھ فٹ کا قد ہے۔ ماں باپ تو آرزو کرتے ہیں کہ ان کا بیٹا لمبا تڑنگا، چوڑا چکلا ہوتا کہ زیادہ سے زیادہ محنت مزدوری کر کے ماں باپ کو سکھ دے۔ پر ہم اس سے محروم ہیں۔"

بات بالکل ٹھیک تھی۔ نعمت علی واقعی ایک خوب صورت جوان تھا۔ پر اس کی فطرت بالکل مختلف تھی۔ تعویذ گنڈوں کے کاروبار سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اکثر ماں کو بہکاتا رہتا تھا۔

"ابا سے کہو۔ اماں کہ صبح ہی صبح جو یہ مناجاتیں پڑھتے ہیں ان میں ذرا والیم نیچا رکھا کریں تو کیا حرج ہے۔"

"باپ کے بارے میں اس طرح کی بات کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟"

"لو...... اماں میں تمہیں جو کچھ بتا رہا ہوں تمہاری سمجھ میں کبھی نہیں آئے گا۔ یاد ہے ایک بار رضیہ خالہ نے ابا کی آواز کی تعریف کر دی تھی اور کہا تھا کہ منشی مدد علی تمہاری آواز ہے یا قیامت، اگر کہیں گلوکاری کر لیتے تو پاکستان کے سب سے بڑے گلوکار کہلاتے۔ خیر ذرا زور سے نعتیں پڑھ لیا کرو۔ میں صبح کو تمہاری آواز سننے کو بے چین رہتی ہوں۔ بس اماں اس دن سے یہ ابا جی نے صبح ہی اتنی تیز آواز میں نعتیں پڑھنا شروع کر دی ہیں۔"

کبھی کبھی تو آسیہ بیگم بھی ان باتوں سے بہک جاتی تھیں۔ بات واقعی بالکل سچ تھی۔ جو نعمت علی نے کہی تھی۔ لیکن بہر حال پھر بھی بیٹے سے کافی بحث کرتی تھیں۔ وہ سب کچھ بعد کی بات ہے۔ بیٹا۔ اب تم کچھ کام دھندہ کرو۔ جو گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹے۔ بیچارے مدد علی ویسے بھی بوڑھے ہو گئے ہیں اور جب بیٹے چھ چھ فٹ کے جوان ہو جائیں تو باپ کو تھوڑا سا سکون تو ملنا ہی چاہئے۔"

وہ تو ٹھیک ہے اماں! مگر ابا سے بھی تو کچھ کہیں۔ وہی تعویذ گنڈوں کی لکیر پیٹے جا رہے ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں یہ بڑے بڑے جو سنیاسی بابا اور فلاں فلاں، جو ہیں۔ اخباروں میں ایک ایک فٹ کے اشتہارات دیتے ہیں۔ یہ جو کماتے ہیں ابا کو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ملتا۔"

"ٹھیک ہے مگر وہ ایماندار آدمی ہیں۔"

"اماں کیا کہیں تم سے اور کیا نہ کہیں۔ بس اللہ خیر کرے۔ تم دیکھ لینا ایک دن میں بہت بڑا آدمی بن جاؤں گا۔"

"ایسے ہی بن جائے گا بستر پر لیٹے لیٹے۔"

"بستر پر خالی نہیں لیٹا رہتا اماں! میرا دماغ بس بڑی بڑی اسکیمیں سوچتا رہتا ہے۔" نعمت علی کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔ وہ بہت آگے کی چیز تھا۔ دماغ میں جیسے شطرنج کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے مشورے تھے۔ اس کے باپ کی آمدنی تو خیر، کچھ تھی ہی نہیں بیچارہ اسی طرح گزارہ کر لیا کرتا تھا۔ نعمت علی جان بنا رہا تھا اور اس کے لئے اس نے کئی طرح کے بندوبست کر لئے تھے۔ صبح منہ اندھیرے کبھی کبھی گھر سے نکل جاتا۔ یہ کہہ کر کہ سیر کرنا صحت کی علامت ہوتی ہے اور اس کے بعد پہنچ جاتا، حاجی الیاس خان کے اکھاڑے پر حاجی الیاس خان نے باقاعدہ اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ پندرہ بیس پٹھے تھے ان کے جو صبح صبح ورزشیں بھی کیا کرتے تھے۔ جب نعمت علی پہلی بار وہاں پہنچا تو حاجی الیاس علی نے اسے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔

نعمت علی لنگوٹ باندھ کر اکھاڑے میں اتر گیا اور چیلنج کر ڈالا۔ حاجی الیاس کے پٹھوں میں سے ایک پٹھے نے چیلنج قبول کیا اور خوش قسمتی یہ رہی کہ نعمت علی نے اسے چت کر دیا۔ حاجی الیاس نے اس سے فوراً اس کے استاد کے بارے میں پوچھا۔ تو اس نے جواب دیا کہ

ابھی تو اس کا کوئی استاد نہیں ہے۔ حاجی الیاس کی آنکھوں نے جانچ لیا کہ لڑکا کام کا ہے۔ چنانچہ اسے اپنے پٹھوں میں شامل کرلیا۔ پھر کیا تھا۔ ایک طرح سے نعمت علی کے سارے اخراجات الیاس خان نے سنبھال لئے۔ صبح کو بادام پستے کی ٹھنڈائی۔ دوپہر کا کھانا، رات کا کھانا، گھر میں تو بس نام کا ہی کھانا پینا ہوجایا کرتا تھا۔ بڑی اچھی زندگی گزر رہی تھی اور استاد، خوب داؤ پیچ سکھاتے تھے۔ جان دار تو تھا لیکن کبھی کبھی کوئی تگڑا جوڑ پڑجاتا تو پریشانی ہوجاتی تھی مگر اس موقع کے لئے خاص طرح کے باریک پن خاص طرح سے انگوٹھے میں پھنسا لیا کرتا تھا۔ کشتی ٹھیک چل رہی ہوتی تھی تو ٹھیک تھا۔ ورنہ پن کام آجاتا۔ مقابل اچانک ''سی'' کی آواز کے ساتھ چونکتا اور بس وہی لمحہ ہوتا کہ نعمت علی اپنے مقابل کو پچھاڑ لیا کرتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پن صرف ایک بار استعمال کیا جاتا اور اس کے بعد اسے اس طرح غائب کردیا جاتا تھا کہ اس کا نام ونشان بھی نہ ملے اور پھر چھپوایا بھی ایسی جگہ جاتا تھا کہ مدمقابل کسی کو وہ جگہ دکھا بھی نہ سکے۔ بہرحال اس میں بھی اس نے کافی مہارت حاصل کرلی تھی۔ چنانچہ اس طرف تو منشی مدد علی اس کے بارے میں شاکی رہتا تھا اور دوسری طرف وہ اپنی زندگی اپنی پسند کے مطابق گزار رہا تھا۔

پھر ایک دن منشی مدد علی کا پارہ ضرورت سے زیادہ چڑھ گیا۔ دوپہر میں بیوی سے کہنے لگا۔

''کہاں ہے وہ......؟''

''کون؟''

''وہی تمہارا لعل۔''

''کیوں خیر تو ہے؟''

''آج خیر نہیں ہے۔ آسیہ بیگم۔ کہے دے رہا ہوں میں۔''

''کیا ہوا ہے آخر؟''

''کچھ نہیں ہوا ہے۔ دیکھ لو مجھے تھک ہار گیا ہوں۔ کتنے دن سے کوئی نہیں آیا۔ آخر ہم خرچا کہاں سے چلائیں۔ میں کہتا ہوں۔ وہ کچھ کرے گا یا نہیں اس دنیا میں۔ اب تو مجھ سے کچھ بھی نہیں کیا جاتا۔ یہ

اتفاق کی بات تھی کہ نعمت علی اسی وقت گھر میں داخل ہوا تھا۔ وقت گزر جاتا تو بات ٹل جاتی۔ لیکن اس وقت منشی مدد علی کو غصہ چڑھا ہوا تھا۔ نعمت کو دیکھتے ہی بکھر گئے۔

''آجا، میرے بدترین دشمن، آجا......''

''کون دشمن کہاں ہے؟'' نعمت علی نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے نام بتائیں ابا جی۔ آپ کے دشمنوں کو ختم کرنا میرا فرض ہے۔'' نعمت علی نے سینہ تانتے ہوئے کہا۔

''تجھ سے بڑا دشمن اور بھلا کون ہوسکتا ہے میرا......ارے جوان ہے دیو کا دیو ہے مگر تیرا باپ ہے کہ دوسروں کے ہاں ٹکڑے تلاش کرتا پھرتا ہے۔''

''ٹکڑے، کاہے کے ٹکڑے ابا جی آپ مجھے بتائیے ہر چیز کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے آپ کے سامنے ڈال دوں گا۔''

''دیکھ آسیہ بیگم سمجھالے اسے۔ سمجھالے اسے۔ مذاق اڑا رہا ہے یہ میرا۔''

''ارے نہیں ابا جی، ابا جی کیا بات کررہے ہیں۔ میں نے تو قسم کھائی ہے کہ آپ کا مذاق اڑانے والوں کو اس دنیا میں جیتا نہیں چھوڑوں گا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کا مذاق اڑا رہا ہوں۔''

''کیا کرے گا تو آخر نعمت علی؟''

''جو آپ کہیں گے وہ کروں گا ابا جی، پریشانی کس بات کی ہے۔''

''سوچ لے۔ سوچ لے۔''

''سوچ لیا۔ اچھی طرح سوچ لیا۔ آپ بتائیے جو آپ فرمائیں گے وہ میں کروں گا۔ آخر آپ میرے باپ ہیں کیوں اماں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔''

''دیکھ نعمت علی ہوش میں آجا۔ میں تھک گیا ہوں۔ تھک گیا ہوں بالکل۔'' منشی مدد علی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو اندر چلئے آپ کے ہاتھ پیر دبا دوں۔ ایسے دباؤں گا کہ آپ کی ساری تھکن دور ہوجائے گی۔''

''بیٹا ہاتھ پاؤں دبانے سے تو اچھا ہے کہ تو میری گردن دبا دے۔''

''ارے رے، کیا آپ کی گردن میں درد ہورہا ہے۔''

''چپ کرلے اسے آسیہ بیگم چپ کرلے، خدا کی قسم اپنا بھی سر پھوڑلوں گا اور اس کا بھی پھوڑ دوں گا۔''

''ارے، ارے نہیں ابا جی۔ آپ میرا سر، بے شک پھوڑ دیں اپنا نہ پھوڑیں اماں کوئی بات ہوئی ہے۔ مجھے بتاؤ تو سہی۔''

''بس میں کچھ نہیں کہوں گی نعمت علی تجھ سے تو سمجھ سکتا ہے تو سمجھ لے۔ کیا ہوگیا تجھے آخر۔''

''ایک منٹ، آخر مجھے میرا قصور تو بتا دیجئے کیا قصور کیا ہے میں نے۔'' نعمت علی نے پیار سے مسکراتے ہوئے کہا۔ بہرحال ماں باپ سے محبت بھی کرتا تھا۔ ان سے ایسی بات نہیں تھی۔ شرارتیں تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں لیکن بہرحال ماں باپ کے سوا اس کا دنیا میں تھا بھی کون باپ نے پھر کہا۔

''تو کچھ کرے گا یا نہیں۔''

''آپ جو کچھ کہیں گے کرلوں گا۔ آپ کچھ کہیں تو سہی ابا جی۔''

''تو ایک ہی بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ جو میرے باپ نے مجھے سمجھائی تھی۔''

''کیا؟''

''تو میرے ساتھ تعویذ گنڈوں کا علم سیکھ لے بیٹا کبھی کبھی ایسی ادوے لگتی ہے کہ وارے نیارے ہوجاتے ہیں۔''

''ارے باپ رے باپ، تع......تع......تعویذ گنڈے یعنی، جن، بھوت قبضے میں کروں۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ یہ علم معمولی نہیں ہے کبھی کبھی اگر انسان اس علم کو حاصل کرلے اور اس کا صحیح استعمال کرے تو زندگی بن جاتی ہے۔''

''چلئے اگر آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ اب مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں۔''

''بس تجھے کچھ چلے وظیفے کرنا ہوں گے۔ میں تجھے ایسے وظیفے بتاؤں گا کہ سارے کام بن جائیں۔''

نعمت علی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ذہن میں سوال تو آیا تھا کہ ابا جی اگر آپ کے پاس ایسے وظیفے موجود ہیں۔ تو آپ نے خود ایسے وظیفوں میں سے ایک وظیفہ کیوں نہیں کر ڈالا۔ جو آپ کی تقدیر بدل دیتا لیکن بہرحال باپ کی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ اس وقت دل میں ہمدردی اور محبت پھوٹ پڑی تھی۔ اس نے کہا۔

''تو پھر بتائیے ابا جی کب اور کیسے کرنا ہے؟''

''بیٹا، سب سے پہلے تو صبح کو اٹھنا ہوگا۔''

''کس وقت؟''

''ساڑھے چھ بجے۔''

''ابا جی اس وقت تو اٹھ ہی جاتا ہوں۔ آپ رقیہ خالہ کے کہنے پر زور زور سے مناجاتیں اور نعتیں پڑھتے ہیں۔ مم......مم......میرا مطلب ہے۔'' اچانک ہی نعمت علی کی نگاہ باپ کے چہرے کی طرف اٹھ گئی تھی۔ چہرہ سرخ ہوتا جارہا تھا۔ پھر وہ جلدی سے بولا۔

''نہیں میرا مطلب ہے۔ چلئے ٹھیک ہے جو حکم آپ کا ہوگا۔''

''میں تجھے سکھاؤں گا کہ اب تجھے کیا کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔'' بہرحال، پھر صبح یوں ہوا کہ صبح ساڑھے چھ بجے منشی مدد علی نے اسے جگادیا۔ اسے لے کر چھت پر پہنچ گئے۔ انہوں نے اسے گودام میں بیٹھنے کے لئے کہا اور پھر کچھ وظیفے بتائے اور کہا کہ یہ وظیفے پڑھتا رہ تین دن تک اسے یہ پڑھنا ہے۔''

''صرف تین دن تک؟'' نعمت علی خوش ہوکر بولا۔ ''ہاں ٹھیک ہے، منظور ہے۔'' مدد علی نے اسے چھت پر بٹھایا اور اس کے بعد خود نیچے اتر آئے۔ نعمت علی کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں اور پھر برابر کی چھت پر نظر پڑی تو اسے ایک حسین مورت نظر آئی۔ یہ شاہدہ تھی نیاز علی کی بیوی۔ نیاز علی کی عمر پینسٹھ سال کی تھی اور شاہدہ کی صرف بیس سال۔ دو سال شادی کو ہوئے

تھے۔ نیاز علی نے زندگی بھر دولت کمائی تھی۔ اسے شادی کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ نجانے کیا ہوا کہ شاہدہ کے ماں باپ نے سترہ سال کی شاہدہ کی شادی نیاز علی کے ساتھ کردی۔

شاہدہ کی شکل وصورت بہت اچھی تھی۔ جوانی کی عمر میں ویسے بھی سب حسین ہی ہوتے ہیں۔ اس وقت نجانے کیوں نعمت علی نے صبح ہی صبح اسے دیکھا اور شاہدہ کی نگاہ بھی اس کی طرف اٹھ گئی۔ نعمت علی کو بھی وہ اتنی پیاری لگی کہ اسے دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے بھی ایک دوبار شاہدہ کو دیکھا تھا۔ لیکن سرسری نگاہ سے اچانک ہی اس نے شاہدہ کو سلام کرلیا اور جواب میں شاہدہ نے بھی حسین مسکراہٹ کے ساتھ اس کا جواب دیا۔ چھت کو پھلانگنا کون سا مشکل تھا۔ وہ بھی نعمت علی جیسے جوان کے لئے۔ چنانچہ چھت پھلانگ لی گئی اور نعمت علی اس کے پاس پہنچ گیا۔

"نیاز علی کہاں ہیں۔ شاہدہ؟"

"نیچے خراٹے بھر رہے ہیں۔" شاہدہ نے جواب دیا۔

"اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"مجھے صبح خیزی کی عادت ہے۔ چھوٹا سا گھر ہے اور تو کوئی ایسی جگہ ہے نہیں جہاں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے ہوں۔ صبح ہی صبح اٹھ کر اوپر چلی آتی ہوں۔"

"بڑی بات ہے۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تمہارے بارے میں کچھ کہوں تو میں تمہیں صبح کا ستارہ کہہ سکتا ہوں۔" شاہدہ شرما گئی۔

دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ نعمت علی کو شاہدہ سے باتیں کرتے ہوئے بڑا لطف آیا تھا۔ حالانکہ کردار کا برا نہیں تھا۔ لیکن بس طبیعت میں شوخی اور شرارت تھی۔ شاہدہ بھی تو جوان تھی اور سچی بات یہ ہے کہ اپنے حالات سے پریشان بھی تھی۔ اس کی کوئی ذہنی ہم آہنگی نیاز علی سے نہیں تھی۔ اس لئے نعمت سے باتیں کرکے اسے بھی بہت خوشی ہوئی تھی۔ روزانہ صبح چھت پر ملنے کے وعدے ہوئے اور پھر اس کے بعد شاہدہ چلی گئی۔ جب وہ چلی گئی تو نعمت علی کے منہ سے نکلا

"واہ۔ ابا جان! مجھے کیا پتا تھا کہ میرے خلاف ہوتے ہوئے بھی آپ مجھے ایسے ایسے تحفے دے سکتے ہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ اسے مدد علی نے صرف تین دن یہ چلہ کرنے کے لئے کہا ہے اس نے سوچا کہ باپ سے بات کرے گا کہ ابا جی کہ کہیں تین دن میں ایسے چلے مکمل ہوتے ہیں۔ کم از کم چالیس دن کا چلا تو ضروری ہوتا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس میں مزید چالیس دن کی توسیع کرلی جائے اور پھر چلے کے موکلوں کے حوالے سے کہا جائے کہ انہوں نے کہا کہ بیٹا غیر معینہ مدت کے لئے تمہیں یہ چلا کرنا ہے۔ یہ فیصلہ ہم کریں گے کہ چلے کی تکمیل ہوئی یا نہیں۔ لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تین دن تک یہ چلہ کشی ہوتی رہی اور چوتھے دن خود منشی مدد علی نے اس سے کہا۔

"بیٹے! اب میں تمہیں ایک اور چلہ بتا رہا ہوں۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تم اتنی ذمے داری کے ساتھ اپنا یہ فرض پورا کروگے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سب کچھ سیکھ لو اور باقاعدہ ایک عالم بن جاؤ۔ میں تمہیں یہ بھی بتاؤں گا بیٹے کہ کون سے الفاظ اور کون سا عمل کس کام کے لئے مناسب ہوتا ہے۔" نعمت علی نے جس سعادت مندی سے یہ بات بھی قبول کرلی تھی وہ خود منشی مدد علی کے لئے حیران کن تھی۔ لیکن بہرحال انہیں نہیں معلوم کہ نعمت علی کیسی چلہ کشی کررہا ہے۔ نعمت علی کی تقدیر ہی اچھی تھی کہ ہر جگہ سے اسے سہارا مل جاتا تھا۔ ایک طرف تو الیاس خان کے اکھاڑے میں عیش ہورہے تھے اور دوسری طرف اب نیاز علی کی کمائی میں بھی اس کا حصہ ہوگیا تھا۔

وہ کھانے پینے میں تو زبردست پیٹو تھا ہی۔ دن میں دس بار کھلا لیجئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن شاہدہ نے اس کے عیش کرادیئے تھے۔ اصلی گھی کے پراٹھے، انڈے، کھیر، حلوہ پوری، ترکاری، بھاجی تیار کرتی اور لے کر صبح ہی صبح اوپر پہنچ جاتی اور اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کو ناشتے کے نوالے کھلاتے۔ اس طرح وہ بڑے اچھے دوست بن گئے تھے۔

ادھر نیاز علی کو حیرانی تھی کہ شاہدہ ایک دم سے موم ہوگئی ہے۔ ورنہ پہلے تو وہ انہیں منہ ہی نہیں لگاتی تھی۔ وہ دکاندار تھا اور دکانداری کرتا تھا۔ دکان تو صبح دیر سے ہی کھلتی تھی۔ چنانچہ وہ دیر سے ہی اٹھتا تھا۔ پہلے تو شاہدہ صرف زندگی ہی گزار رہی تھی۔ کبھی دلچسپی کے ساتھ اس نے نیاز علی کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ لیکن پچھلے کچھ عرصے سے وہ نیاز علی کی بڑی خدمت کرنے لگی تھی کیونکہ ناشتے میں کبھی اسے حلوہ پوری ملتی، کبھی کھیر پوری اور یا بھاجی ترکاری یہ ساری چیزیں اس کی پسندیدہ تھیں۔ لیکن خود اسے اپنے بڑھاپے کا خیال تھا۔ اس لئے بیوی سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کیا کرتا تھا۔ اب بغیر فرمائش کے ہی اس کی ساری فرمائشیں پوری ہورہی تھیں۔ تو وہ بڑا خوش تھا۔ غرض یہ کھیل اسی طرح چل رہا تھا۔ لیکن ہر ڈرامے کا ڈراپ سین ضرور ہوتا ہے۔ ادھر نیاز علی کو بیوی کے عمل پر تشویش تھی تو ادھر منشی مدد علی بھی حیرانی سے بیگم سے کہتے تھے۔

"اللہ کی بندی! میرے تو ستارے کھل گئے ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارا بیٹا اس طرح میرے علم کو سیکھنے میں مصروف ہوجائے گا۔"

"اللہ کا احسان ہے یہ سب اللہ ہی کی مدد ہے۔"

"بس اللہ سے دعا ہے کہ وہ اپنے اس عمل کو اسی طرح جاری رکھے۔"

بہرحال ایک دن صبح ہی صبح منشی مدد علی کو خیال آیا کہ ذرا بیٹے کا جائزہ لے لیا جائے۔ یہ سوچ کر وہ سیڑھیاں چڑھے اور جب زینہ طے کرکے تھوڑا سا سر ابھارا تو الگ ہی منظر دیکھا۔ آسمان کا ستارہ زمین پر اترا ہوا تھا۔ کبوتروں کا جوڑا غٹا، غٹ کررہا تھا۔ غٹرغوں، غٹرغوں ہورہی تھی۔ نعمت علی اور شاہدہ بیگم بیچ کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ برابر میں اصلی گھی کی پوریاں اور ترکاری رکھی ہوئی تھی۔ گھی کی خوشبو اڑ رہی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو ناشتا کرا رہے تھے۔

یہ منظر دل دہلا دینے والا تھا۔ بے اختیار مدد علی کے منہ سے نکلا۔

"ارے تیرا ستیاناس، ارے تیرا ستیاناس، خدا کرے تجھے پالا مار جائے۔ یہ...... یہ کیا ہورہا ہے۔"

حیرت کی بات یہ تھی کہ اسی دن نیاز علی کو بھی بیگم پر کچھ شبہ ہوگیا تھا۔ اسی دن وہ بھی سیڑھیاں چڑھ آیا۔ پھر ادھر سے اس کی آواز اور ادھر سے مدد علی کی آواز ابھری۔

ایک طرف شاہدہ نے غڑاپ سے دوسری طرف چھلانگ لگائی اور ادھر نعمت علی نے مرغے کی طرح اچھل کر چھلانگ لگائی تھی۔ شاہدہ کو تو نیاز علی نے بالوں سے پکڑ لیا۔ لیکن نعمت علی دوسری چیز تھا۔ باپ کے جھپٹا مارنے سے پہلے ہی اس نے سیڑھیوں پر چھلانگ لگائی۔ پہلی چھلانگ میں چھ سیڑھیاں عبور کیں پھر باقی سیڑھیاں عبور کرنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی اور اس کے بعد گھر کے دروازے سے باہر نکلنا بھلا کون سا مشکل کام تھا۔ لیکن شاہدہ کی اچھی خاصی پٹائی ہوگئی وہ چیخی چلائی تو برابر والے گھروں میں آوازیں ابھرنے لگیں۔ تب مدد علی نے کہا۔

"نیاز علی۔ میں تم سے بات کروں گا۔ جاؤ، عزت اچھالنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم بھی نیچے جاؤ میں بھی نیچے جارہا ہوں۔" بات نیاز علی کی سمجھ میں آگئی تھی۔ چنانچہ دونوں نیچے اتر آئے۔ مدد علی کو یہ تو اندازہ ہوچکا تھا کہ بیٹے پر ہاتھ ڈالنا ذرا مشکل کام ہے نیچے آئے اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ آسیہ بیگم کو بہت دیر کے بعد سارا ماجرا معلوم ہوا۔ تو وہ بھی فکر سے منہ کھول کر بیٹھ گئیں۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"کہیں وہ ڈر خوف سے کہیں اور نہ نکل جائے۔ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔" مدد علی نے غضبناک نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں بولے۔ بڑا رنج ہوا تھا انہیں وہ تو سمجھ رہے تھے کہ اب نعمت علی کا چلہ مکمل ہی ہوچکا ہوگا لیکن وہ یہ سب کچھ کررہا تھا۔ بہرحال دونوں ہی عزت دار تھے۔ نیاز علی نے بھی اپنی بات چھپانا مناسب سمجھا اور شاہدہ کو میکے بھیج دیا۔ ادھر مدد علی کئی دن تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر ایک دن جب رو

روکر آسیہ بیگم کی آنکھیں سوج گئی تھیں کہ انہوں نے نعمت علی کو اپنے بستر پر لیٹے ہوئے پایا اور حیرت سے اچھل پڑیں۔

"تو یہاں؟"

"ارے باپ رے، دیر ہوگئی اماں، معافی چاہتا ہوں ورنہ میں تو صبح صبح ساڑھے پانچ بجے ہی دیوار پھلانگ کر باہر نکل جاتا ہوں۔ رات کو البتہ اپنے کمرے میں سوتا ہوں کیونکہ مجھے کہیں اور نیند نہیں آتی۔" آسیہ بیگم نے سر پکڑلیا تھا۔ ایک طرف بیٹے کے واپس آجانے کی خوشی بھی تھی۔ تو دوسری طرف یہ خوف بھی تھا کہ اس بات پر مدد علی کا کیا ردعمل ہوگا۔ لیکن مدد علی کا ردعمل بھی زیادہ برا نہیں نکلا۔ آسیہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے انہیں بتایا کہ وہ تو گھر میں ہی ہوتا ہے۔ رات کو گھر میں ہی سوتا ہے اور صبح منہ اندھیرے چپ چاپ نکل جاتا ہے۔ نجانے کیا ہوا کہ مدد علی کو بیٹے کی اس شرارت پر ہنسی آگئی۔

"خدا سمجھے اسے آسیہ، کوئی ترکیب بتادو کہ یہ انسان بن سکے۔"

"اللہ کے واسطے آپ اسے معاف کردیں۔ کچھ سوچ لیں گے اس کے بارے میں۔ کچھ سوچ لیں گے۔" آسیہ بیگم نے کہا اور مدد علی آنکھیں بند کرکے گردن ہلانے لگا۔

بات کسی نہ کسی شکل میں تو آگے بڑھنی ہی تھی۔ آسیہ بیگم نے آخرکار نعمت علی کا باپ سے سامنا کرادیا۔ نعمت علی اس طرح گردن جھکائے باپ کے سامنے آیا تھا کہ جیسے اس سے زیادہ سعادت مند بیٹا روئے زمین پر کوئی دوسرا نہ ہو۔ مدد علی نے بھی حیرت انگیز کردار کا ثبوت دیا تھا۔ اس پر بگڑنے کے بجائے اس سے کہا۔

"بیٹا! اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دیکھ لے تو اگر انہی حالات میں مجھے دنیا سے جانا لکھا ہوا ہے۔ میری تقدیر میں تو چلا جاؤں گا کوئی بات نہیں ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"نہیں ابا! ایک بار اور معاف کردیں، اس کے بعد جو آپ کہیں گے وہ میں کروں گا۔"

"بیٹا، بڑی مشکل سے عزت بچائی ہے، نیاز علی اگر صبر سے کام نہ لیتا تو بڑے سر پھوٹتے پتا نہیں کیا کیا ہوتا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اب مجھے صرف یہ بتادے کہ آگے تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"ابا جو کہو گے وہ کروں گا۔"

"دیکھ بیٹا! میرے ابا بھی یہ ہی کرتے تھے جو میں کررہا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ نہ انہیں کچھ آتا تھا۔ نہ مجھے کچھ آتا ہے۔ پڑھا لکھا تھا نہیں کہ کچھ اور کرلیتا۔ میں بڑی مشکل سے زندگی کی گاڑی دھکیل کر یہاں تک لایا ہوں۔ دو چار بیٹے اور ہوتے تو سارا بوجھ تجھ پر نہ ڈالتا۔ لیکن اب میری عزت کا محافظ تو ہی ہے۔ بیٹا۔ کچھ چلے وظیفے مجھے ایسے معلوم ہیں جو اگر واقعی سچائی کے ساتھ کرلئے جائیں تو کام آتے ہیں۔ اس سے بڑی خوشی میرے لئے کوئی اور نہیں ہوسکتی۔"

"ٹھیک ہے ابا۔ اس بار میں تمہاری خوشی ضرور پوری کردوں گا یہ میرا وعدہ ہے۔"

"مگر ایک شرط ہوگی بیٹا؟"

"جی ابا بتایئے۔"

"جو چلہ میں تجھے بتاؤں گا وہ چالیس دن کا نہیں بلکہ ساٹھ دن کا ہے اور وہ تجھے ایک قبرستان میں بیٹھ کر کرنا ہوگا۔ قبروں کے بیچ میں بیٹھ کر۔ ڈر تو لگے گا تجھے، مگر چلہ ہی ایسا ہے۔ ہاں..... نقصان تجھے کوئی نہیں پہنچے گا اس سے یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔"

"نہیں ابا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ اب جب میں نے تم سے وعدہ کرلیا ہے کہ تمہاری مرضی سے چلوں گا تو پھر وعدہ تو وعدہ ہی ہوتا ہے۔"

"اللہ تجھے خوش رکھے اور تجھے وہ سب کرنے کی توفیق دے جو میں چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ابا ٹھیک ہے۔ بس اب مجھے اور زیادہ شرمندہ نہ کرو۔" پتا نہیں نعمت علی جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سچائی کے ساتھ کہہ رہا تھا یا اب بھی اس کے دل میں کوئی کھوٹ تھی۔ لیکن چلے وظیفے کا وہ آدمی تھا ہی نہیں۔" مدد علی نے اسے چلہ بتایا اور اپنے ساتھ ہی قبرستان لے گئے۔ پھر اسے ایک پکی قبر کے پاس بٹھادیا اور بولے۔

"میں گورکن سے بات کئے لیتا ہوں تجھے کوئی درمیان میں پریشان نہیں کرے گا۔"

"ٹھیک ہے ابا! کب سے شروع کرنا ہے یہ؟"

"بیٹا، کل کرے تو آج کر، آج کرے سو اب، آج ہی سے شروع کردے۔"

"وقت کیا ہوگا؟"

"بس عشاء کی نماز کے بعد یہاں آجایا کر اور یہ چلہ کیا کر۔"

"جی ابا جو آپ کا حکم۔ کرنا کتنی دیر ہوگا؟"

"ساری رات چاہئے تو جتنا تیرا دل چاہے گھنٹے، دو گھنٹے، چار گھنٹے۔"

"ٹھیک ہے ابا، کرلوں گا۔" نجانے نعمت علی کے دل میں کیا آئی تھی۔ وہ سچ مچ سنجیدگی کے ساتھ پانچ دن تک یہ چلہ کرتا رہا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ کوئی بھی اس کے پاس نہیں آتا تھا۔ قبر بھی ذرا دور دراز کو تھی۔ پکی تھی مگر اچھی خاصی پرانی تھی۔ وہ صاف ستھری جگہ کرکے وہاں بیٹھ جاتا تھا۔ چلہ پڑھتا تھا۔ لیکن پانچویں دن اس کی بوریت انتہا کو پہنچ گئی اور وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ باپ کی باتیں ذرا سا دکھ بھی دے رہی تھیں۔ مدد علی نے بڑی عاجزی سے اس سے یہ چلہ پورا کرنے کی درخواست کی تھی۔ البتہ اب اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ دوسرے دن کہیں سے ایک ٹیپ ریکارڈ مہیا کیا گیا۔ جو بیٹری سیل سے بھی چل سکتا تھا۔ اپنی پسند کے دو چار کیسٹ خریدے اور اس کے بعد مقررہ وقت پر قبرستان پہنچ گیا۔ چلہ تو خیر اب کیا کرنا تھا۔ وقت گزاری کی بات تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کسی چلے سے کچھ نہیں ملے گا۔

وہی بات تھی کہ دل تو صنم آشنا تھا۔ بھلا ان چلوں وظیفوں سے اسے کیا رغبت ہوسکتی تھی۔ البتہ اپنی پسند کے گانے سننا شروع کردیئے۔ گورکن کی جھونپڑی خاصے فاصلے پر تھی اور وہاں تک آواز نہیں جاسکتی تھی۔ حالانکہ رات کے سناٹے ہوا کرتے تھے لیکن مناسب آواز سے وہ اپنی پسند کے گانے سنتا تھا۔ جو جدید ترین تھے اور جن میں شاعری کے علاوہ سب کچھ ہوتا تھا۔ دو دن، تین دن، چار دن، گزر گئے اب اسے یہاں زیادہ بوریت نہیں ہوتی تھی۔ چھپا کر ٹیپ ریکارڈر لے آتا تھا اور یہاں بیٹھا مزے سے گانے سنا کرتا تھا۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی ساتھ رکھ لیا کرتا تھا تاکہ وقت گزاری میں مشکل نہ ہو۔

اسے بہرحال یہ ساٹھ دن پورے کرنا تھے۔ البتہ اب اسے ایک بات کا خاص طور سے احساس ہونے لگا تھا۔ اسے یوں لگتا کہ جب بھی وہ ٹیپ ریکارڈر آن کرتا ہے اس کے اردگرد کچھ سائے جمع ہوجاتے ہیں اور مدھم مدھم سرسراہٹیں سرگوشیاں گونجتی رہتی ہیں۔ پہلے تو یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن پھر اس کے ذہن نے خود ہی اس بات کا جواب تلاش کرلیا۔ اس کا مطلب ہے قبرستان کے مردے اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ اب یہ اسے پتا نہیں تھا کہ مرنے کے بعد بھی اس قسم کی چیزوں سے دلچسپی رہتی ہے یا نہیں۔ موت کے بعد کا راز تو کوئی بھی نہیں جانتا لیکن اسے نجانے کیوں اس بات کا پوری طرح یقین ہوگیا تھا کہ آس پاس کے مردے بڑی دلچسپی سے یہ گیت سنا کرتے ہیں۔

غالباً ساتواں دن تھا اور وہ مزے لے لے کر "اماں دیکھ تیرا منڈا بگڑا جائے۔" سن رہا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک ہلکی سی سرگوشی سنائی دی۔

"آواز ہلکی کرلو۔" سرگوشی اتنی واضح تھی کہ وہ چونک پڑا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر گانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ ہوسکتا ہے یہ سرگوشی اس کا وہم ہو۔ لیکن آواز دوبارہ ابھری۔

"آواز ہلکی کرلے یار۔" اس بار یہ آواز پہلے سے زیادہ واضح تھی۔ وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ دور دور تک نگاہیں دوڑائیں مگر کوئی دکھائی نہ دیا تو وہ پھر بیٹھ گیا۔ "نجانے کون مذاق کررہا ہے۔" اس نے سوچا۔ لیکن تیسری بار ایک زوردار تھپڑ

اس کی گردن کے پچھلے حصے پر پڑا تھا اور وہ بری طرح اچھل پڑا تھا۔

''کک...... کون ہے۔ کون ہو بھائی۔ کون ہو تم؟'' تھپڑ سے خوفزدہ ہونے کے بجائے اسے غصہ آ گیا تھا۔

''کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ آواز ہلکی کر لے۔ ایک ہفتے سے یہ بیہودہ گانے سن رہا ہوں۔ اماں دیکھ تیرا منڈا بگڑا جائے اور ابا دیکھ اور پتا نہیں کیا کیا خرافات۔ ابے یہ گانے ہیں۔ لگاتا تھا تو کوئی ڈھنگ کا گانا لگاتا۔ جیسے وہ ہے کہ۔ ''سینے میں سلگتے ہیں ارماں۔ آنکھوں میں اداسی چھائی ہے۔'' یا پھر ''زندگی دینے والے سن تیری دنیا سے دل بھر گیا'' ابے ان میں شاعری بھی ہوتی تھی گانے بھی ہوتے تھے۔ طرز اور ساز و آواز سب کچھ ہوا کرتا تھا۔ اماں دیکھ، اماں دیکھ۔''

''اماں، کون ہو ماموں ذرا سامنے تو آؤ۔'' اس آواز پر نجانے کیوں نعمت علی کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی تھی وہ خوفزدہ ہونے والوں میں سے تو تھا ہی نہیں اچانک اسے ایسا لگا جیسے جس قبر کے نزدیک وہ بیٹھا ہوا ہے اس میں کوئی کھڑکی سی کھلی ہو۔ وہ چونک کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گانا بند ہو گیا تھا اور اس نے دیکھا کہ ایک پراسرار ہیولا قبر کی کھڑکی سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ شکل و صورت مفقود تھی۔ بس ایک ڈھیلا ڈھالا لبادہ تھا جو نگاہوں کے سامنے تھا۔ نعمت علی منہ پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔

''ہاں...... دیکھ لیا تو نے کہ کون ہوں میں۔''

''ایک بات بتاؤ ماموں۔ مر چکے ہو کیا؟'' نعمت علی واقعی کمال کا انسان تھا۔ اس ویران ماحول میں ایسے خوفناک حالات میں اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جاتا۔ لیکن وہ بڑے مزے سے اس پراسرار ہیولے سے باتیں کر رہا تھا۔ البتہ پراسرار ہیولے نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''اندھا ہے کیا بھوتنی کے۔ نظر نہیں آتا۔ ذرا دیکھ اس طرف۔'' اس نے اس پکی قبر کے کتبے کی جانب اشارہ کیا اور نیم تاریک ماحول میں نعمت علی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کتبے کو دیکھنے لگا۔ جس پر لکھا تھا۔

''عالی! مرتبت قبلہ بابا خیر الدین شاہ خیری، تاریخ وفات 28 جنوری 1999ء بوقت گیارہ بجکر اٹھارہ منٹ، چوبیس سیکنڈ۔'' ''یہ تم ہو ماموں، نعمت علی نے کتبے کی تحریر کو زور سے پڑھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ میں ہی ہوں یہ۔'' آواز سنائی دی اور پھر غصیلے لہجے میں کہا گیا۔ ''ابے یہ ٹیپ بند کر لے اگر جسمانی حالت میں ہوتا تو اسے اٹھا کر تیری کھوپڑی پر توڑ دیتا۔ بند کر اسے، بند کر، ذرا دیکھ یہ نگاڑہ کیا بج رہا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر سے آواز آ رہی تھی۔ ''نگاڑہ، نگاڑہ، نگاڑہ بجا'' تیری ماں کا نگاڑہ۔ میں کہتا ہوں اسے بند کر۔'' سائے کی غصیلی آواز سنائی دی اور نعمت علی نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا۔

''قسم ایمان کی زندہ حالت میں ہوتا تو ایسا نگاڑہ بجاتا کہ نگاڑہ بجانے والے بھی دیکھتے۔ ابے میں کہتا ہوں کہ تم لوگوں کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ ایسے بیہودہ گانے آسانی سے سن لیتے ہو۔ نگاڑہ بجا۔''

''چلو اب تو ٹھیک ہو گیا ماموں۔ اب آگے کی سناؤ آخر تم ہو کون؟ مرے ہوئے بھی تمہیں اچھا خاصا وقت ہو گیا۔ یہ ابھی تک قبر سے اٹھ اٹھ کر بھاگنے کی عادت نہیں چھوٹی کیا؟''

''چھوڑو یار بڑی بوریت ہوتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے؟''

''ماموں چکر کیا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ۔ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''فالتو باتیں مت کر، سب کچھ پتا ہے، مجھے تیرے بارے میں۔''

''کیا پتا ہے؟''

''پکا مفت خور ہے پورے کا پورا۔ ماں باپ کو تنگ کر کے رکھا ہوا ہے۔ یہاں بھی چلا کر رہا ہے۔ یا بیٹھ کے مردوں کا اخلاق خراب کر رہا ہے۔ نگاڑہ۔ نگاڑہ۔ منڈا بگڑا جائے۔ ارے بگڑا ہوا تو تو ہے۔''

تو سنوار لو ماموں [illegible] دوستی کر لو۔ کیا کر سکتا ہوں۔ تمہارے لئے۔'' نعمت علی نے کہا اور لبادہ خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''ایک کام کر سکتا ہے؟''

''بولو ماموں بولو۔ دیکھ تیرا باپ تعویذ گنڈے کرتا ہے۔ تجھے بھی معلوم ہے اور مجھے بھی پتا ہے کہ آتا جاتا اسے بھی کچھ نہیں ہے۔ پر میں نے بڑا وقت گزارہ ہے اس دشت کی سیاحی میں بڑے بڑے علوم حاصل کیے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے گزرا ہوں۔ پر کیا کروں زندگی نے انسانوں کی خدمت کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ دل میں تو یہ سوچا تھا کہ جب اپنے علوم میں مکمل ہو جاؤں گا تو خلق خدا کی خدمت کروں گا۔ پر بس زندگی ہی اتنی تھی۔ اب تجھے ایک آفر کر رہا ہوں۔''

''بولو۔ ماموں۔ بولو، بولو۔''

''ابے کیا ماموں، ماموں لگا رکھی ہے۔ خیر الدین خیری میرا نام ہے۔''

''چھوڑو اتنا بڑا نام کون لے ماموں بس مجھے یہ ہی اچھا لگتا ہے۔ تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

''نہیں اعتراض تو کوئی نہیں ہے۔''

''تو کیا کہہ رہے تھے ماموں۔ آگے تو بولو۔''

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ میری جو آرزوئیں تشنہ رہ گئی ہیں۔ تو ان کی تکمیل کر۔''

''تشنہ آرزو کی تکمیل، کسی لونڈیا کا چکر تو نہیں ہے۔''

''کیوں حسرتوں میں مبتلا کرتا ہے۔''

''عمر کیا تھی۔ ماموں جب مرے تھے۔ یہ بتاؤ؟''

''میں نے کہا نا کہ میری جوانی کا ذکر نہ چھیڑ۔ نجانے کیا کیا یاد آ جائے گا۔ اب تو آنکھیں بھی نہیں ہیں کہ آنسو بہا لوں وہ جو کہا تھا نا کسی شاعر نے کہ جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سو جا۔ یہاں آنسو بہانے سے پہلے ہی سونا پڑ گیا۔''

''آدمی دلچسپ معلوم ہوتے ہو۔''

''پھر وہی فضول بات۔ ابے اب کہاں آدمی ہوں۔''

''تو پھر کیا ہوا ماموں؟''

''پھر وہی ماموں، ماموں لگا رکھی ہے۔''

''کہوں گا تو میں تمہیں ماموں ہی۔ چاہے برا مانو یا بھلا مانو۔''

''لفظ تو برا نہیں ہے۔ چل خیر چھوڑ۔ تو میں تجھ سے کہہ رہا تھا کہ بول میرے ساتھ کوآپریشن کرے گا۔''

''کرنا کیا ہوگا۔ ماموں خیری۔''

''بس میں نے کہا نا تجھ سے بہت سی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کرنی ہے اس دنیا میں انسانوں نے انسانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔ کون کس کے چنگل میں بے بس پڑا ہوا ہے کوئی نہیں جانتا۔ کس پر کیا بیت رہی ہے۔ کسی کو نہیں معلوم۔ میرے دل میں خیال ہے کہ میں اور تو مل کر دکھی انسانیت کی خدمت کریں۔ جہاں کہیں کسی پر کوئی ظلم ہو رہا ہو۔ ہم خدائی فوجدار بن کر پہنچ جائیں۔ ہاتھ پاؤں تیرے، روحانی سپورٹ میری، ایسی تیسی کر کے رکھ دیں ان لوگوں کی۔ جو انسانوں پر طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں کیا کہتے ہو۔ جان من۔''

''آئیڈیا برا نہیں ہے ماموں۔ پر کہیں چوڑنے میں مروامت دینا۔''

''ہماری آپس کی انڈر اسٹینڈنگ رہنی چاہیے۔ تو بالکل فکر مت کر۔ میں سائے کی طرح تیرے ساتھ رہوں گا۔''

''ماموں ذرا سوچنے کا موقع دو۔ ویسے سچ سچ تمہارا آئیڈیا مجھے بہت پسند آیا ہے۔ ہمیں طرح طرح کے واقعات کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''میں ان سب کی ایسی تیسی کر دوں گا۔ جو مصنوعی عالم بنے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے ماموں میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تو

یہ سمجھ لے کہ ہم دونوں کا اشتراک غضب ڈھادے گا۔

"پر ایک بات بتاؤ ماموں۔ چکر کیا ہے کیسے مرگئے۔ دل میں انتقام کے یہ جذبے کیوں پیدا ہوئے۔"

"آہ...... یہ ایک لمبی کہانی ہے؟"

"کوئی، پرواہ نہیں ہے۔ ماموں۔ وقت ہی وقت ہے۔ ہمارے پاس۔" نعمت علی نے کہا اور یوں لگا جیسے سایہ کسی سوچ میں ڈوب گیا ہو۔ پھر اس کی مدھم آواز ابھری۔

"تو نے میرے کتبے پر تو یہ دیکھ ہی لیا ہے کہ میرا نام خیر الدین خیری ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ عالی مرتبت بابا خیر الدین خیری، میں بہت بعد میں بنا۔ اس سے پہلے میں صرف خیرو تھا۔ صرف خیرو۔"

یوں تو ہمارا چھوٹا سا شہر بہت خوب صورت تھا۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ لیکن ناگ پور کے ڈھلان مجھے بہت پسند تھے۔ یہ علاقہ جنت نظیر تھا۔ ڈھلان پر پھیلے ہوئے لیچیوں کے درخت شام کی کجلاہٹ میں بے حد حسین معلوم ہوتے تھے۔ ڈھلان کے اختتام پر بھی باغات تھے اور تقریباً دو میل محیط پر پھیلے ہوئے باغات کے بعد اونچی نیچی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ ویسے ان چٹانوں کے درمیان میں کہیں کہیں خودرو درختوں کے جھنڈ موجود تھے۔

ایک دن میں یونہی گھر سے نکل آیا اور ان ڈھلانوں کی طرف چل پڑا دل پر کچھ بوجھ سا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ سرسبز ڈھلانوں کو دیکھ کر میرے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا۔ لیچیوں کے جھومتے ہوئے درختوں کے درمیان سے ہوا گنگناتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میرے قدم خود بخود آگے بڑھنے لگے۔ درختوں کی موسیقی نے مجھے بے خود کردیا۔ لیچیوں کی میٹھی میٹھی خوشبو خوابوں کی وادیوں میں لے جارہی تھی اور میں آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ آگے اور آگے مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ طویل ڈھلان کب ختم ہوا اور کب میں باغ میں داخل ہوا۔ گھنے درخت ایک دوسرے سے سرگوشیاں کررہے تھے اور میں ان سرگوشیوں سے بے خبر آگے چلتا جارہا تھا۔

شام گہری اور گہری ہورہی تھی۔ پھر مجھے بوڑھے گوندا کی جھونپڑی کا چراغ جلتا نظر آیا اور میں چونک پڑا۔

گوندا جھونپڑی کے باہر چارپائی پر بیٹھا کسی سوچ میں غرق تھا۔ میرے قدموں کی چاپ پر اس نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"سلام بابو جی!" اس نے حسب عادت کہا۔ میں اکثر اس طرف آتا تھا۔ اس لئے گوندا سے میری جان پہچان تھی۔

"سلام گوندا چاچا کیا ہورہا ہے۔" میں نے بھی حسب عادت کہا۔

"بس جندگی گجر رہی ہے۔ بابو جی۔ کدھر چل دیئے۔"

"ایسے ہی گھومنے جارہا ہوں۔ ذرا چٹانوں تک جاؤں گا۔"

"اندھیرا پھیلنے سے پہلے آجانا بابو جی! اندھیرے میں وہ چٹانیں محفوج نہیں ہوتیں۔"

"کیوں۔ میرے خیال میں وہاں درندے ہیں؟۔"

"درندے کہاں نہیں ہوتے بابو جی!" گوندا فلسفیانہ انداز میں بولا۔ پھر کہنے لگا۔ "ویسے آج منگل ہے۔ آپ مسلمان لوگ ہیں ہماری باتوں کو نہیں مانتے مگر ہمارے اکیدے کے مطابک (عقیدے کے مطابق) آج بری روحیں آجاد اور ایسے میں ویران جگہیں ان کا مسکن ہوتی ہیں۔"

"اوہ۔ کیا تم نے ان چٹانوں میں روحوں کو بھٹکتے دیکھا ہے۔؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ "میرے سوال پر گوندا خاموش ہوگیا۔ چند لمحات وہ خاموش رہا۔ پھر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس پر کچھ سراسیمگی کے آثار نظر آنے لگے۔

"منگل کے دن ہم روحوں کے بارے میں بات چیت بھی نہیں کرسکتے بابو جی رام رام۔" اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا اور جلدی سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔

میں دل ہی دل میں ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ان ہندوؤں کا مذہب بھی توہمات کی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔ ان کی مکمل تاریخ دیوی، دیوتاؤں، بھوتوں اور پلیدوں سے بھری پڑی نظر آتی ہے۔ پھر بوڑھے گوندا کو منگل کے دن بری روحیں نظر آتی ہیں۔ تو اس میں کیا تعجب کی بات ہے۔ میں آگے بڑھ گیا۔ حالانکہ یہاں تک آنے کے بعد خاصی ذہنی شگفتگی حاصل ہوگئی تھی۔ لیکن نجانے کیوں میرے قدم آگے ہی بڑھ رہے تھے۔ واپس جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں چٹانوں کے نزدیک پہنچ گیا اور پھر اونچی نیچی گول، تکونی اور نوکیلی چٹانوں کے درمیان آگے بڑھتا رہا۔ آخر ایک بڑی چٹان کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ یہ چٹان کافی اونچی تھی اور یہاں سے قرب و جوار کے مناظر نظر آتے تھے۔

کئی بار اس چٹان پر بیٹھ کر میں بہت سی کہانیاں جنم دے چکا تھا۔ اس وقت بھی میں کچھ دیر اس چٹان پر بیٹھنا چاہتا تھا۔

سطح چٹان اس طرح شفاف تھی کہ اس پر بیٹھ کر مجھے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا میں نے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگائی اور اس کے چھوٹے چھوٹے کش لیتے ہوئے دور تک نظریں دوڑانے لگا۔ اندھیرے کے سیلاب نے ماحول کو غرق کردیا تھا اور گوندا کے جھونپڑے کا چراغ جگنو کی طرح چمک رہا تھا۔ پراسرار لیکن دل کش ماحول، میری روح سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ فضا میں تحلیل ہونے لگی۔ وہ اضطراب جو میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ تاریکی میں گم ہوگیا۔

ایک پراسرار سناٹا میرے ذہن پر چھانے لگا اور نہ جانے کب تک میں اس سحر میں ڈوبا رہا۔ پھر سگریٹ کے سرے پر سلگتی ہوئی آگ نے میری انگلیوں کو چوم کر مجھے اس سحر سے نکال دیا اور میں نے جلدی سے سگریٹ پھینک دیا۔ خاصا وقت ہوچکا تھا اور پھر مجھے سکون بھی مل گیا تھا۔ اس لئے میں نے واپسی کا قصد کیا۔ میں چٹان پر کھڑا ہوگیا اور پھر میں نیچے اترنے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ ایک انسانی آواز سنائی دی۔ جس نے مجھے چونکا دیا۔

وہ انسانی کراہ تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہاں کون ہوسکتا ہے؟۔ میں نے اسے اپنی سماعت کا واہمہ قرار دیا اور نیچے اترنے لگا۔ جونہی میں چٹان سے نیچے اترا مجھے کراہ پھر سنائی دی اور اس بار اس کی سمت بھی معلوم ہوگئی تھی۔

"اوہ...... اف، اوہ......"

انسانی کراہ پھر سنائی دی اور میں اس طرف جھپٹ پڑا نہ جانے کون ہے اور اسے کیا تکلیف ہے؟۔ میرا دل ہمدردی سے بھر گیا۔ چند لمحات میں، میں چٹان کے دوسری سمت پہنچ گیا۔ چٹان کا یہ حصہ آدھی چٹان تک کچھ کھلا تھا اور اس کھوکھلے حصے میں ایک انسانی جسم نظر آرہا تھا۔

"کک...... کک کو...... کون ہے؟۔" ایک لرزتی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔ اس آواز میں کمزوری تھی۔ کرب تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ کافی دیر سے میں اس ماحول میں تھا۔ میں نے اس باریش بوڑھے کو دیکھ لیا جو زمین پر چت لیٹا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اس کے نزدیک پہنچ کر گھٹنوں کے بل جھک گیا۔

"کون ہو تم؟ جواب دو۔" بوڑھے کی آواز پھر سنائی دی۔

"ایک انسان ہی ہوں۔ آپ کون ہیں اور آپ کو کیا تکلیف ہے؟۔" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"اگر تمہارے پاس ماچس ہو تو کونے میں رکھا ہوا چراغ روشن کردو۔ بڑی مہربانی ہوگی۔" بوڑھے نے بدستور لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور میں نے جیب سے ماچس نکال کر ایک تیلی جلائی۔ کونے میں رکھا کڑوے تیل کا چراغ نظر آگیا اور چند لمحات کے بعد وہاں روشنی پھیل گئی۔ روشنی میں، میں نے بوڑھے کو دیکھا۔ سفید داڑھی، سر کے بال اور بھنویں سفید تھیں۔ جسم پر بھی سفید لباس تھا۔ لیکن وہ دونوں ٹانگوں سے معذور تھا۔ گلے میں ہزار دانوں والی تسبیح پڑی ہوئی تھی۔ قریب ہی لکڑی کی ایسی کھڑاویں رکھی ہوئی تھیں جنہیں معذور لوگ

ہاتھوں سے استعمال کرتے ہیں۔ ایک طرف کورا مٹکا اور ایک آبخورہ رکھا تھا۔

دوسری طرف اینٹوں کا چولہا تھا۔ جس میں راکھ نظر آ رہی تھی۔ چولہے پر ایک دیگچی رکھی تھی اور قریب ہی دو تین ٹین کے ڈبے نظر آ رہے تھے۔ یہ اس قدرتی کٹیا کا اثاثہ تھا۔

مجھے حیرت ہوئی۔ ابھی ایک ہفتہ قبل میں اس طرف آیا تھا۔ لیکن یہاں کسی کا وجود نہیں تھا۔ یا پھر میں نے دیکھا ہی نہیں ہوگا کیونکہ میں چٹان کے اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ پورے ماحول کا جائزہ لے کر میں بوڑھے کے نزدیک آ گیا۔ بوڑھے کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد بوڑھے نے آنکھیں کھولیں اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

”پانی...... مجھے ذرا سا پانی پلا دو۔“

میں جلدی سے اٹھا اور آبخورے میں پانی لے کر اس کے نزدیک پہنچ گیا میں نے بوڑھے کو سہارا دے کر اٹھایا اور آبخورہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ بوڑھا کافی پیاسا تھا۔

”اور دوں......“ میں نے پوچھا۔ لیکن اس نے انکار میں گردن ہلا دی اور گہری گہری سانس لینے لگا۔ ویسے اسے کچھ سکون ہو گیا تھا کیونکہ اس کی سانسیں اعتدال پر آنے لگیں۔

”تم اس طرف کیسے نکل آئے بیٹے۔“ اس نے محبت بھری آواز میں پوچھا۔

”میں سیلانی آدمی ہوں بابا، اکثر ادھر آ جایا کرتا ہوں۔ مگر میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

”میں تو بہت دن سے یہاں ہوں۔ زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہا ہوں۔ بس ایک خواہش دل میں ہے۔ لیکن اپنی کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے پوری نہیں کر سکا کیا تم میری مدد کرو گے بیٹے؟“

”کیا بات ہے بابا؟“ میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ بیٹے اور...... پھر مجھے زندہ رہنے کی خواہش بھی نہیں ہے۔ کسی بھی وقت فرشتہ اجل میرے پاس آ سکتا ہے۔ مجھے یہاں اس چٹان کے نیچے مرجانے کا دکھ ہے۔ جنگلی جانور میری لاش نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔ میں یہ نہیں چاہتا۔“

”اوہ...... میں آپ کو شہر لے چلوں بابا، میرے گھر میں آپ کافی آرام محسوس کریں گے۔ میں آپ کا علاج بھی کراؤں گا۔“

”تم بڑے رحم دل ہو بیٹے۔ تمہیں اس کا اجر ملے گا۔ لیکن شہر چھوڑے ہوئے ایک جگ بیت گیا اب مجھے دنیا اور دنیا والوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے اپنی زندگی دنیا سے دور رہ کر گزاری ہے۔ آخری وقت میں پھر دنیا میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ تم میری ایک مدد کر سکو تو تمہارا احسان مرنے کے بعد بھی میں نہیں بھولوں گا۔“

”بتایئے بابا! میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ میں نے ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر کہا۔

”ان چٹانوں کے اختتام پر ایک مسجد ہے۔ پرانی اور ویران مسجد برسوں پہلے یہاں ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ آبادی ہندو تھی پھر ایک بزرگ کا ادھر سے گزر ہوا اور انہوں نے اس بستی میں رک کر اپنے مذہب کی تبلیغ کی تب یہاں کے سیدھے سادھے لوگ مسلمان ہو گئے۔ مسجد انہی بزرگ نے بنائی تھی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ بستی تباہ ہو گئی اور مکانات کے نشانات تک مٹ گئے۔ لیکن مسجد اسی طرح سلامت ہے۔ گو وقت نے اس کے نقش و نگار بگاڑ دیئے ہیں۔ لیکن عمارت کسی حد تک باقی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس مسجد میں جان دوں۔ میں معذور ہوں وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر تم مجھے اس مسجد میں پہنچا دو تو میری آخری خواہش پوری ہو جائے۔

”مسجد یہاں سے کتنی دور ہے بابا۔“ میں نے پوچھا۔

”بس ایک میل سے زیادہ نہیں ہے۔“ بوڑھے

نے مجھے امید و بیم کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک میل۔“ میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ ظاہر ہے۔ بوڑھا اپنے قدموں سے نہیں چل سکتا تھا۔ مجھے اسے پیٹھ پر ہی لاد کر ہی لے جانا ہوگا۔ رات کا وقت تھا اور پھر خطرناک علاقہ۔ کیوں نہ یہ کام کل پر رکھا جائے۔ بابا۔ کل دن میں آ جاؤں گا اور تمہیں مسجد تک پہنچا دوں گا۔“

”کل کبھی نہیں آئے گی بیٹے اور پھر مجھے اپنی سانسوں پر بھروسا نہیں ہے۔ تم میرے اوپر یہ احسان کر دو۔ اس کے بدلے میں تمہیں وہ کچھ دوں گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”میں نے غور سے اس اپاہج بوڑھے کو دیکھا اور پھر میری نظریں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ یہ معذور بوڑھا مجھے کیا دے گا۔ کیا اس کے پاس کوئی پوشیدہ دولت ہے۔ پھر میں نے اس برے خیال کو فوراً ذہن سے نکال دیا۔ مجھے یہ کام صرف نیکی حاصل کرنے کے لئے کرنا چاہئے۔ کسی طمع سے ثواب ختم ہو جائے گا۔ مگر مسئلہ وہی تھا۔ میں بھی زیادہ طاقتور آدمی نہیں ہوں۔ بوڑھا گو بہت توانا نہیں تھا۔ بہر حال تیس پینتیس سیر سے کم نہیں ہوگا۔ اس وزن کو لاد کر اندھیرے میں چلنا آسان کام نہیں تھا۔ میں اس الجھن میں تھا کہ بوڑھا پھر بولا۔

”مجھے لے کر چلنے میں تمہیں کسی قسم کی دشواری نہیں ہوگی۔ بیٹے میرا وزن نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا۔ تم مجھے اٹھا کر دیکھ لو۔

میں نے اب مزید سوچنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بوڑھے کی التجا کو ٹھکرانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے رضامندی ظاہر کر دی اور بوڑھا خوش ہو گیا اور پھر میں نے بوڑھے کو سہارا دے کر اٹھایا اور اسے پشت پر لاد لیا۔

بوڑھے نے میری گردن میں باہیں ڈال دی تھیں۔ اس کا کہنا درست تھا۔ اس کے جسم کا کوئی وزن نہیں تھا۔ مجھے اس کی بے وزنی پر حیرت ہوئی بہر حال ایک میل کا سفر تھا۔

”مجھے مسجد کا راستہ بتاتے ہوئے چلو۔ کیا کوئی سامان بھی لینا ہے؟“

”سامان کا کیا کرنا ہے۔ موت کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔

ویسے اس کی آواز پر مجھے حیرت ہوئی تھی کیونکہ اب اس کی آواز میں وہ نقاہت نہیں تھی۔ جو چند ساعت قبل تھی۔ بہر حال میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی اور آگے بڑھنے لگا۔ بوڑھا مجھے راستہ بتاتا جا رہا تھا...... اور میں سبک رفتاری سے چل رہا تھا۔ میرے دل میں بس ایک خیال تھا کہ میں نیکی کر رہا ہوں۔ ایک قریب المرگ انسان کی آخری خواہش پوری ہو جائے۔ یہ بہت اچھی بات تھی۔

میں چلتا رہا۔ سفر کافی طویل محسوس ہوا۔ لیکن مجھے تھکن کا احساس نہیں تھا۔ ماحول بے حد تاریک اور خوفناک تھا۔ لیکن بوڑھے کی موجودگی میں مجھے اس کا احساس نہیں تھا۔ پھر چٹانی سلسلہ ختم ہو گیا اور ایک چھوٹا سا میدان نظر آنے لگا۔ میدان کے اندر ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات نظر آ رہے تھے اور سامنے ایک گنبد موجود تھا۔ زمانے کی کہن سالی کا شکار یہ گنبد نہ جانے کب کی کہانی دہرا رہا تھا۔ یہ ہی وہ مسجد تھی جس میں بوڑھے نے آنے کی خواہش کی تھی۔ میرے قدم اور تیز ہو گئے اور چند منٹ کے بعد میں مسجد کے دروازے پر تھا۔

لیکن اچانک میرے قدم رک گئے۔ میں نے کسی شیر کی غراہٹ محسوس کی تھی اور میری نگاہ مسجد کے دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ تاریکی میں، میں نے شیر کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا جو مجھے گھور رہی تھیں اور میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اچانک شیر زور سے گرجا اور میں اچھل پڑا۔

”خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ بڑھا چل۔“ بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

مگر مجھ میں آگے بڑھنے کی سکت نہیں تھی۔ ویسے

میں حیران بھی تھا اس علاقے میں شیر کی موجودگی حیرت انگیز تھی۔ میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سنا تھا۔ شیر پھر گرجا اور میں نے بوڑھے کو اتارنے کی کوشش کی۔

”نہیں نہیں۔ یہ کیا کر رہا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ شیر تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ آگے بڑھ اور مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہو جا۔“

”میں اندر نہیں جا سکتا۔“ میں نے ہمت ہار دی۔

”میں یہاں تمہیں اتار دیتا ہوں۔ تم خود اندر جانے کی کوشش کرنا۔“

”کیا بکواس کرتا ہے۔“ بوڑھے نے طیش کے عالم میں کہا۔ ”جب میں کہہ رہا ہوں کہ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو پھر تو کیوں ڈر رہا ہے۔ آگے بڑھ اور اندر داخل ہو جا۔“

میں بوڑھے کا لہجہ سن کر چونک پڑا اس میں تحکم تھا۔ حالانکہ اس بوڑھے کو میرا شکر گزار ہونا چاہئے تھا کہ میں بغیر کسی لالچ کے اسے یہاں تک لایا تھا اور وہ الٹی دھونس جما رہا تھا۔ دوسری طرف شیر برابر غرا رہا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ وہ کسی بھی وقت مجھ پر حملہ آور ہو کر ہم دونوں کو چٹ کر سکتا ہے چنانچہ مجھے بھی غصہ آ گیا۔

”مجھے افسوس ہے بڑے میاں! میں بے مقصد جان دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوں۔ نیکی اپنی جگہ لیکن زندگی بچانا بھی ضروری ہے۔“

”اگر تو نے مجھے اندر نہ پہنچایا تو بھی تیری زندگی بچنا مشکل ہے۔ اندر چل ورنہ نقصان اٹھائے گا۔“ بوڑھے نے کہا اور اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اپاہج بوڑھے کی ٹانگیں گھٹنوں کے پاس سے سوکھی ہوئی اور بے جان چھچھڑے کی طرح تھیں۔ بظاہر ان میں کوئی جان نہیں تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے دونوں بے جان ٹانگیں میرے پیٹ سے لپٹ گئیں۔ وہ لجلجی سانپ جیسی ٹانگیں۔ میں دونوں ہاتھوں کی طاقت سے بھی ان ٹانگوں کی گرفت ڈھیلی نہیں کر سکا اور اچانک مجھے اپنے پیٹ پر دباؤ محسوس ہوا۔ ٹانگوں کی گرفت سخت ہو رہی تھی۔ مجھے سخت تکلیف ہونے لگی اور میں جھنجلاہٹ میں بوڑھے کو پیچھے پھینک دینے کی کوشش کی۔ لیکن بوڑھا کسی جونک کی طرح مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ میں کافی کوشش کے باوجود اسے نیچے گرانے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور میری سانس پھولنے لگی۔

مجھے اپنی آنکھیں حلقوں سے ابلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”کیوں بچہ کیا خیال ہے۔ آگے بڑھ رہا ہے کہ نہیں اگر تو آگے نہ بڑھا تو میں اسی جگہ تیرا دم گھونٹ کر تجھے مار دوں گا۔“

”یہ کیا حرکت ہے۔ بوڑھے شیطان۔ کیا میری نیکی کا یہی صلہ ہے؟“ میں نے کہا۔

”صلہ تجھے مل جائے گا یہ میرا وچن ہے۔ مگر اندر جانے کے بعد۔“ پہلی مرتبہ اس کے منہ سے ہندی کا لفظ ادا ہوا تھا۔ میں نے اب تک کی گفتگو پر غور کیا تو مجھے احساس ہوا۔ اس نے نیکی اور اجر کا ذکر ضرور کیا تھا لیکن خدا کا نام ایک بار بھی نہیں لیا تھا۔ کیا یہ ہندو ہے؟“ میں نے سوچا۔

اور اچانک مجھے گوندا کی گفتگو یاد آ گئی۔ ”آج منگل ہے سرکار اور منگل کے دن بری روحیں ان چٹانوں میں بھٹکتی ہیں۔ تو۔ تو کیا یہ بوڑھا کوئی بری روح ہے۔“ میرے دل میں خوف جاگزیں ہو گیا اور میں پھر بوڑھے کو گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں، میں زمین پر چت لیٹ گیا اور بوڑھے کو زمین سے رگڑنے لگا۔ لیکن میری انتہائی کوشش کے باوجود بوڑھے کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ دوسری طرف مجھے شیر کا خوف بھی ستا رہا تھا۔ یقیناً وہ آہٹیں سن کر اس طرف متوجہ ہو جائے گا۔ پھر بوڑھے کے ساتھ میری بھی خیر نہیں۔

”کتنی ہی کوشش کر لے بالک۔ مجھے تیری پیٹھ سے کوئی نہیں اتار سکے گا۔“ بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

میں بری طرح تھک گیا۔ بوڑھے کی مریل ٹانگیں اب بھی سانپ کی طرح میرے جسم سے لپٹی ہوئی تھیں اور ہاتھ گردن میں تھے۔

”کیوں اپنی جان سے ہاتھ دھو رہا ہے مورکھ میں تجھے گردن دبا کر مار دوں گا۔ ورنہ میرا کہا مان لے، تو اگر آگے بڑھے تو شیر تیرا کچھ نہیں بگاڑے گا حالانکہ تو مسلمان ہے۔“

”کیا تم مسلمان نہیں ہو۔“ میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا اور بوڑھا کریہہ آواز میں ہنسنے لگا۔

”میں کیا ہوں۔ یہ تجھے اندر چل کر معلوم ہو جائے گا۔ تو اندر چل۔“

میں اس بوڑھے کے ہاتھوں بے بس ہو چکا تھا۔ موت میری آنکھوں میں رقص کر رہی تھی۔ اگر شیر سے جان بچانے کی کوشش کرتا تو بوڑھا موجود تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس شیطان کی بات مان لوں۔ چنانچہ میں ہمت کر کے آگے بڑھا شیر بالکل سامنے موجود تھا۔ وہ اب بھی دھاڑ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ میرے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک شیر کی دھاڑ مجھے اپنے کان کے بالکل قریب سنائی دی اور میری چیخ نکل گئی۔ ایک ہوا سی میرے قریب سے گزر گئی تھی۔ شاید شیر کی چھلانگ خطا ہو گئی تھی۔ میں نے خوف سے آنکھیں کھول دیں۔ میں مسجد کے دروازے سے زیادہ سے زیادہ دس گز دور تھا اور شیر نظروں سے غائب تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن بوڑھے نے دونوں ہاتھوں سے میرے کان پکڑ لئے۔

”پیچھے مت دیکھ مورکھ بس آگے بڑھ اور جلدی سے اندر چل۔“

میں بوڑھے کے ہاتھوں بے بس تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھائے۔ لیکن اچانک مسجد کے دروازے پر آگ بھڑک اٹھی۔ آن کی آن میں شعلے اتنے بلند ہوئے کہ مسجد کا دروازہ ان سے ڈھک گیا۔ شیر کے بعد یہ نئی مصیبت تھی۔ میں شعلوں کی تپش سے گھبرا گیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ مگر اسی وقت بوڑھے کے پیر میرے پیٹ پر سخت ہو گئے۔

”پرواہ مت کر۔ یہ آگ تیرے شریر کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔ آگے بڑھ جلدی کر۔ یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔“

”بکواس مت کر خبیث بوڑھے میں آگے نہیں جاؤں گا۔ چاہے تو کچھ بھی کر لے۔“ میں نے پلٹ کر پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ بوڑھے نے مجھے روکنے کی انتہائی کوشش کی لیکن میں ہر تکلیف برداشت کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

میں مسجد سے کافی دور نکل آیا اور اچانک مجھے اپنی کمر اور شانے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ بوڑھے کا وزن اچانک دس گنا بڑھ گیا تھا اور میں اس وزن کو لے کر دوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نڈھال ہو کر گر پڑا اور نیچے گرتے ہوئے پتھر کا ایک کونہ میرے سر سے ٹکرایا۔ میرے حواس تاریکی میں گم ہو گئے۔

پھر جب مجھے ہوش آیا تو سورج نکل آیا تھا۔ میں اسی جگہ پڑا تھا جہاں گرا تھا اور خبیث بوڑھا اسی طرح میری کمر سے چپکا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں اور ہاتھ اب بھی میری گردن اور کمر میں پھنسے ہوئے تھے۔ میرے نتھنوں سے ایک بدبو سی ٹکرائی اور میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ قریب دو سیاہ بلیاں مری پڑی تھیں۔ ان کے جسموں پر کیڑے رینگ رہے تھے اور خبیث بوڑھا ہاتھ بڑھا کر ان کیڑوں کو اٹھا رہا تھا۔ کیا وہ کم بخت ان کیڑوں کو کھا رہا ہے۔ میں نے سوچا اور میری طبیعت مالش کرنے لگی۔

”کیا تجھے بھوک لگ رہی ہے۔ مگر یہ لذیذ غذا میں تجھے نہیں کھلا سکتا کیونکہ تجھ سے مجھے کام لینا ہے۔“ بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

”مجھے چھوڑ دے شیطان میں نے تیرے ساتھ نیکی کی تھی اور تو مجھے اس کا یہ صلہ دے رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”صلہ تو میں تجھے دیتا مگر تو خود ہی اسے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا مجھے اس مسجد کے اندر پہنچا دے اس کے بدلے میں تجھے ایک شکتی دوں گا کہ سنسار کا ایک ایک منش تیرا تابع ہو گا۔ تیری ہر

خواہش پوری ہوجائے گی۔ سنسار کی حسین ترین کنیائیں تیری داسی ہوں گی۔ جو تجھے ایک نگاہ دیکھے گی گھائل ہوجائے گی۔ تیری نظریں زمین میں چھپے ہوئے خزانے دیکھ سکیں گی۔ تیری دی ہوئی مٹی کی چٹکی ہر مرض کی دوا ہوگی۔ یہ میرا وچن ہے۔ مگر تو میرا کام کردے۔"

"اگر تو اتنی ہی قوت رکھتا ہے۔ تو خود کیوں نہیں مسجد میں چلا جاتا۔"

"افسوس یہ ہی میرے بس میں نہیں ہے۔ مسجد میں مسلمان ہی جاسکتا ہے۔ تو ہی مجھے پیٹھ پر لاد کر اندر لے جاسکتا ہے۔ اندر جاتے ہی میں تجھے چھوڑ دوں گا اور پھر تو سنسار کا سب سے بلوان منش ہوگا۔"

"مگر تو مسجد میں کیوں جانا چاہتا ہے؟"

"اس بارے میں تجھے نہیں بتایا جاسکتا۔ بس تو ہر خطرے سے بے پرواہ ہوکر میرا یہ کام کردے۔ اپنے دل میں کسی کا خوف نہ لا۔ تیرا کچھ نہیں بگڑے گا اور اس کے بدلے میں جو کچھ تجھے ملے گا وہ تیرا جیون سپھل کردے گا۔"

"نہیں میں کسی قیمت پر یہ کام نہیں کرسکتا۔ دیکھتا ہوں تجھ میں کتنی طاقت ہے۔ تو ناپاک انسان ہے میں تجھے اپنے قدموں سے مسجد میں نہیں لے جاسکتا۔ یہ میرے دین کے خلاف ہے۔"

"تب تو زندگی بھر اس عذاب میں گرفتار رہے گا۔ میں ہمیشہ تیرے کندھوں پر سوار رہوں گا۔ اس وقت تک جب تک تو میرا کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوجائیگا۔" اس نے غصے سے کہا۔

اسی وقت میری نگاہ باغوں کے سرے کی طرف اٹھ گئی۔ کچھ لوگ اس طرف آرہے تھے۔ میں غور سے انہیں دیکھنے لگا اور میں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ میرے والد میرے چچا اور ہمارا ملازم، چوتھا آدمی گوندا تھا۔ جو ان کے ساتھ آرہا تھا۔ میں خوش ہوگیا کہ اب وہ لوگ مجھے اس مصیبت سے نجات دلادیں گے۔ مگر اس وقت بوڑھے خبیث کی آواز سنائی دی۔

"تیرے رشتے دار آرہے ہیں۔" مگر تو انہیں کچھ نہیں بتا سکے گا۔ اس نے اپنا کریہہ ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا اور میرے نتھنوں سے ایسی گندی بدبو ٹکرائی میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بوڑھا قہقہے لگانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے والد اور چچا وغیرہ اس کے قہقہوں کی آواز سن کر ضرور اس طرف متوجہ ہوجائیں گے۔ میں امید وبیم کی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ یقیناً وہ لوگ مجھے ہی تلاش کررہے تھے۔ بوڑھا گوندا ان کی رہنمائی کررہا تھا اور پھر میں نے پوری قوت سے والد صاحب کو آواز دی۔ لیکن خود ہی حیران رہ گیا۔ میرے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی اور بوڑھے کے قہقہے جاری تھے۔ پھر میں چیخا۔ لیکن بے سود میری آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

"یہ۔ کیا کیا تو نے ذلیل انسان۔" اس بار میں بوڑھے سے مخاطب ہوا اور آواز حیرت انگیز طور پر درست ہوگئی۔

"کچھ نہیں تیری آواز اب میرے سوا کوئی نہیں سن سکتا۔ تو کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا تو میری زبان میں بول سکتا ہے اپنی میں نہیں۔"

"یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسی وقت گوندا کی نگاہ مجھ پر پڑی وہ انگلی کے اشارے سے میرے والد کو اس طرف متوجہ کررہا تھا اور وہ سب میری طرف دوڑنے لگے۔ چند لمحات کے بعد وہ میرے قریب تھے۔

"خیرو...... خیرو...... میرے بچے تجھے کیا ہوگیا۔ یہ تیری کیا حالت ہوگئی۔" والد صاحب مجھے سینے سے لگا کر بولے۔

میں نے ان سے کچھ کہنا چاہا، لیکن میری آواز بند تھی۔ ان لوگوں نے مجھے اٹھایا بوڑھا جونک بدستور میرے کندھوں پر سوار تھی۔ پتا نہیں وہ لوگ بھی اسے محسوس کررہے تھے یا نہیں۔ میرا خیال ہے وہ انہیں نظر نہیں آیا تھا۔ ورنہ وہ اسے مجھ سے علیحدہ کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔ میرے چچا، میرے والد اور ملازم مجھے اٹھاتے ہوئے چل پڑے، والد صاحب سخت پریشان

تھے ان کی زبان سے عجیب عجیب کلمات نکل رہے تھے۔

"میں نے سمجھایا تھا۔ سرکار! آج کے دن اس طرف نہ آئیں۔ یہ نہیں مانے۔ میری جندگی ان ویرانوں میں گجری ہے۔ سرکار میں نے اپنی آنکھوں سے ان ویرانوں میں بھٹکتی روحوں کو دیکھا ہے۔ سرکار ہمیں تو ایسی ہی جندگی گزارنی ہے۔ ہم کا کہہ سکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے۔ تم تھوڑی دیر کے لئے بیہوش ہوجاؤ۔" بوڑھے نے میرے کان میں سرگوشی کی اور پھر اس کے ہاتھ کا دباؤ میری گردن کی پشت پر پڑنے لگا اور میرا ذہن تاریکیوں میں گم ہونے لگا۔ چند لمحات کے بعد مجھے کچھ خبر نہ رہی پھر جب میری آنکھ کھلی تو میرے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ بوڑھے کا لجلجا جسم میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں میرے پیٹ پر رکھی ہوئی تھیں میں نے ہاتھ بڑھا کر اپنی والدہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ جو میرے نزدیک بیٹھی آنسو بہارہی تھیں مگر مجھے معلوم ہوا کہ میرا جسم بھی مفلوج ہے۔

یہاں مجھے اور احتیاط کرنی پڑی ہے۔ بالک بے شک تمہاری زبان بند ہے۔ مگر تم لکھ کر انہیں اپنا اور میرا حال بتاسکتے ہو۔ اس لئے میں نے تمہارا جسم بھی سن کردیا ہے۔ اب تم صرف میری مرضی سے ہاتھ پاؤں ہلاسکتے ہو۔"

"اوہ...... خبیث کتے، تو مجھے چھوڑے گا یا نہیں۔ آخر کب تک تو میرے پیچھے اس طرح پڑا رہے گا۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اپنے قریب موجود لوگوں پر اپنی اس بات کا ردعمل دیکھنے لگا۔ لیکن سب اسی طرح بیٹھے تھے اور میری آواز اب بھی کوئی نہیں سن رہا تھا۔

"چھوڑ دوں گا بالک، چھوڑ دوں گا۔ مگر شرط وہی ہے۔ تو مجھے مسجد میں پہنچا دے اور مہان شکتی حاصل کرلے۔"

"مگر تجھ جیسے ناپاک انسان مسجد میں داخل نہیں ہوسکتے۔"

"اس لئے تو تیری ضرورت ہے۔ تو تو پاک ہے۔ تو مجھے لے کر مسجد میں چلا جائے تو کون روک سکتا ہے۔ بس اندر پہنچانا تیرا کام ہے۔ باقی میں خود دیکھ لوں گا۔"

"لیکن وہاں تو نے دیکھا تھا۔ وہاں شیر تھا اور پھر جب میں نے تجھے لے کر اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا تو دروازے پر شعلے بھڑک اٹھے تھے۔"

"تو ان شعلوں سے گزر سکتا تھا۔ جس طرح شیر تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ اسی طرح شعلے بھی تیرے شریر کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ بس ہمت کی ضرورت تھی۔"

اس نے جواب دیا اور میں لاجواب ہوکر کچھ سوچنے لگا۔ ایک خیال آتا تھا کہ اس بدبخت کی خواہش پوری کرکے خود کو اس مصیبت سے نجات دلاؤں لیکن پھر دل کہتا تھا کہ یہ گناہ عظیم ہوگا۔ ایک ناپاک انسان کو مسجد میں لے جانا ایک مسلمان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ ادھر گھر والوں کو دیکھ دیکھ کر دل کڑھ رہا تھا۔ اسی کشمکش میں تھا کہ ایک ڈاکٹر اندر آگیا۔ ملازم اسے بلا کر لایا تھا۔ میرے ذہن پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔

بلاوجہ ڈاکٹر کو بلا لیا گیا ہے۔ یہ کیا کرسکے گا۔ سوائے اس کے کہ چند انجکشن میرے جسم میں گود دے گا اور الٹی سیدھی دوائیں دے دے گا۔ مگر میں کسی کو منع بھی نہیں کرسکتا تھا۔

وہی ہوا۔ ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی اسٹیتھسکوپ سے سینے کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرے بازو میں انجکشن بھی دیا اور فیس لے کر چلتا بنا۔

آپ ایک ایسے انسان کا تصور کیجئے جو اپنی بیماری کے بارے میں بخوبی جانتا ہو۔ لیکن دوسروں کو کچھ بتانے سے قاصر ہو۔ نہ صرف بیماری بلکہ صحیح الدماغ ہوتے ہوئے اپنی کیفیت بھی نہ بتا سکتا ہو۔ میں زبان رکھتا تھا۔ بول سکتا تھا۔ لیکن کوئی میری بات نہیں سن سکتا

تھا۔ یہ کیسی بے بسی تھی اور اس سے چھٹکارہ کس قدر مشکل تھا۔ میرے گھر والے ڈاکٹر کی دوائی کے اثر کا انتظار کرتے رہے۔ میرے حلق میں دوائیں ٹھونسی جاتی رہیں اور تمام دن گزر گیا۔

کڑوی کسیلی دوائیں میرے لئے زہر تھیں۔ اس کے علاوہ خوراک کی شکل میں کچھ نہیں ملا تھا۔ میں بھوک سے نڈھال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ رات ہوگئی بھوک اور کمزوری کی وجہ سے مجھ پر غشی طاری ہوگئی اور جب ہوش آیا تو رات کا ایک بجا تھا۔ میں نے قرب و جوار کا ماحول دیکھا۔ میری والدہ ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگئی تھیں۔ دوسری کرسی پر والد صاحب سو رہے تھے۔ وہ بے چارے میرے لئے جاگ رہے تھے۔ کیسی تھکن کیسی پریشانی تھی ان کے چہروں پر۔

میرا دل رونے لگا۔ پھر مجھے اپنی بھوک کا بے پناہ احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ اپنے پیٹ کی طرف رینگ گئے۔ وہی بچی ٹانگیں پیٹ سے لپٹی ہوئی تھیں۔ مجھے گھن آنے لگی ساتھ ہی غصہ بھی۔

"کیا تم جاگ رہے ہو بوڑھے خبیث۔" میں نے زور سے کہا۔ اور مجھے اس کی کریہہ ہنسی سنائی دی۔

"جاگنے ہی میں کلیان ہے بالک جو سوگیا اس نے بہت کچھ کھودیا۔"

"میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں کیا میں اس طرح چند روز سے زیادہ زندہ رہ سکتا ہوں۔"

"تو خواہش کر بالک، بول کیا کھانا چاہتا ہے۔ جب تک میں تیرے ساتھ ہوں تیری شکتی مہان ہے۔ تو میری اچھا کے ساتھ جو دل چاہے کرسکتا ہے۔"

"تو پھر میرے لئے کھانا منگواؤ۔"

"تو خود منگوا...... میں تیری پشت پر ہوں۔"

اس نے کہا اور میں نے تجربے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر میں نے کھانے کی خواہش کی اور میں اپنے سامنے ایک خوب صورت خوان دیکھ کر حیران رہ گیا۔ گرم اور لذیذ کھانا موجود تھا۔ میری بھوک زوروں پر تھی اور پھر اس وقت میرے ہاتھ پاؤں بھی آزاد تھے۔ بوڑھے کا بوجھ بھی پشت پر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور مجھے سکون محسوس ہوا۔ پلک جھپکی ہی تھی کہ خالی برتن غائب ہوگئے۔ میں نے چائے کی خواہش ظاہر کی اور آن کی آن میں گرم چائے موجود تھی۔ چائے پینے کے بعد میں لیٹ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے نیند آگئی۔

دوسری صبح میری آنکھ کھلی تو میرے کانوں میں ایک آواز گونجی۔ یہ مانوس آواز تھی۔ میری والدہ تلاوت کلام پاک کر رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ نماز کے بعد تلاوت کی عادی تھیں۔ والدہ دوسرے کمرے میں تھیں۔ لیکن ان کی دھیمی دھیمی آواز یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے اپنی پشت پر کلبلاہٹ محسوس کی اور پھر بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

"تو جاگ گیا؟"

"ہاں۔ کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چل یہاں سے نکل چل یہ آواز مجھے بیاکل کررہی ہے۔ میں اس آواز کو برداشت نہیں کرسکتا، جلدی کر۔ میں سخت پریشان ہوں۔" اس نے کہا اور میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ یقیناً ارواح پلید کلام پاک کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں کیوں نہ میں دوڑ کر والدہ کے کمرے میں پہنچ جاؤں۔ اس طرح اس سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔"

"اٹھ رہا ہے یا نہیں؟" اس کی آواز میں بے چینی تھی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

جلدی یہاں سے نکل چل۔ اس وقت تجھے کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ میں نے قدم آگے بڑھائے اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا اور پھر دروازے سے نکلتے ہی میں نے والدہ کے کمرے کی طرف دوڑنے کا قصد کیا۔ لیکن وہ ملعون جیسے میرے ارادے کو بھانپ گیا۔

"مار ڈالوں گا۔ جان سے مار ڈالوں گا، اگر تو اس طرف بڑھا تو۔" اس کے ساتھ ہی میری ہڈیاں کڑکڑا

اٹھیں اور میرے قدم رک گئے۔

"نکل چل مورکھ یہاں سے نکل چل۔ میرے شریر میں سوئیاں چبھ رہی ہیں۔" اس نے بدستور مجھے دباتے ہوئے کہا اور مجبوراً مجھے دروازے سے باہر نکلنا پڑا۔ "چل یہاں سے دور نکل چل۔ اب ہم اس گھر میں نہیں آئیں گے۔"

میں اب اس کے حکم کی تعمیل کے لئے مجبور تھا۔ میں اس کے اشاروں پر چلتا رہا اور چند منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا رخ اسی ڈھلان کی طرف ہے۔ میں چلتا رہا اور ڈھلان طے کرکے باغ میں داخل ہوگیا۔ اس کے اشارے پر میں گوندا کے جھونپڑے سے کافی فاصلے سے گزرا تھا۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ گوندا مجھے دیکھ نہ لے۔ پھر ہم چٹانوں میں داخل ہوگئے اور طویل چٹانی فاصلہ طے کرکے ایک بار پھر اسی بوسیدہ مسجد کے سامنے جا پہنچے۔

لیکن میں ایک انوکھی بات دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کل ہم جس جگہ تک پہنچ گئے تھے آج وہ پہنچنا مشکل نظر آرہا تھا کیونکہ مسجد کے چاروں طرف گہری خندق کھدی ہوئی تھی۔ جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔

"ہوں۔" تو انہوں نے یہ راستہ بند کردیا ہے۔ مگر میرا نام بھی ہیرالعل ہے۔ میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ کیا خیال ہے بالک اگر اس خندق پر پل بن جائے، تو تو مجھے اندر لے چلے گا؟"

"میں تجھے خانہ خدا میں لے کر نہیں جاؤں گا۔ مردود۔ چاہے میری زندگی ہی کیوں نہ چلی جائے۔" میں نے ایک عزم سے جواب دیا۔

"میں تیرے خاندان کو نشٹ کردوں گا۔ میں تجھے ایسی سزا دوں گا کہ تو زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

"کچھ بھی ہو۔ میں ایک گنہگار انسان ہوں۔ مگر اتنا بڑا گناہ نہیں کرسکتا کہ تجھ جیسے ناپاک پلید کو مسجد میں لے جاؤں۔"

"کیوں ہیٹ کر رہا ہے۔ بالک تجھے ابھی تک میری قوت کا احساس نہیں ہوا۔ تو نے ابھی کیا دیکھا ہے، میں تو چاہ رہا تھا کہ بغیر کچھ کہے تو راہ راست پر آجائے۔ مگر تو اس کے لئے تیار نہیں ہوگا ٹھیک ہے۔ اب میری شکتی دیکھ۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ میں تیرے کندھوں پر سوار رہ کر ہی تجھ سے کام لے سکتا ہوں۔ میں اس کے لئے مجبور نہیں ہوں۔ سن غور سے سن۔ آج سے تیری تباہی کا دور شروع ہو رہا ہے۔ میری شرط اب بھی برقرار ہے۔ جب تو میرا کام کرنے کے لئے دل سے تیار ہوجائے گا۔ میں تجھے اس چٹان کے نیچے مل جاؤں گا۔ لیکن اگر تو من میں کھوٹ لے کر آیا تو اندھا ہوجائے گا۔ میں جا رہا ہوں۔ اگر تو اپنی تباہی سے گھبرا جائے تو اسی جگہ آجانا۔ میں تیری تمام تکلیفیں دور کردوں گا۔"

میں دل میں خوش تھا کہ اب یہ بلا میرا پیچھا چھوڑنے والی ہے۔ اس نے مجھے دھمکیاں دی تھیں کہ مجھے تباہ و برباد کردے گا۔ لیکن وہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ میں تو فی الحال اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ میرا جسم چھوڑ کر چلا گیا ہو۔ یہ اندازہ تو مجھے اچھی طرح ہوگیا تھا کہ میں ایک شیطان کے جال میں پھنس گیا ہوں اور اس سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ گندے علوم کا ماہر تھا اور مجھ مسلمان کے ذریعے مسجد کی بے حرمتی کرکے اپنے گندے علوم کی تکمیل چاہتا تھا۔ لیکن میرے دل نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس کے فریب میں نہیں آؤں گا۔ چنانچہ ایک ہی ترکیب میرے ذہن میں آئی تھی وہ یہ کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور بہت دور چلا جاؤں۔

گھر ماں باپ بہن بھائی سارے رشتے دار جن سے مجھے محبت تھی اور جنہیں مجھ سے محبت تھی۔ چھوڑنے کا غم تو بہت تھا۔ لیکن اپنے ایمان کو داغدار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بس نجانے کیوں یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی تھی کہ میں وہ نہیں کروں گا جو وہ چاہتا ہے اور بس اس کے بعد میں نے، وہ دنیا ہی چھوڑ دی اور ایک بہت

دور دراز مقام پر پہنچ گیا۔ ایک خاموش اور ویران سی جگہ تھی۔ میں نے اللہ سے لو لگائی اور وہیں رہنے لگا۔ بہت کچھ عطا ہوا مجھے بارگاہ ایزدی کی طرف سے لیکن میرے دل میں مسلسل ایک خیال جاگزیں رہا۔ وہ یہ کہ نجانے کون کون کہاں کہاں کالے علوم کرنے والوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ کوئی ایسا ذریعہ ہو جس سے ان کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جاسکے۔

میں اس دوران تنہائیوں میں بہت سے چلے وظیفے کرتا رہا اور مجھ پر بہت سے علوم کا ادراک ہوتا رہا۔ پھر میں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور ایک بار پھر بستیوں کا رخ کیا۔ اپنے اہل خاندان کو میں بھول چکا تھا۔ نجانے ان پر کیا گزری اس دوران ہیرالعل بھی مجھ تک پہنچنے میں ناکام رہا تھا۔ بس نجانے دل میں کیا کیا امنگیں تھیں۔ لیکن موت کہاں ساتھ چھوڑتی ہے۔ ان دنوں میں اسی علاقے میں جہاں تم رہتے ہو مقیم تھا کہ بیمار ہوا اور پھر اللہ کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ میں نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو یہاں پایا۔ بے شمار لوگ ساتھ ہیں ان میں ہر طرح کے لوگ ہیں، اچھے، برے نجانے کیسے کیسے۔ سب کے سب زندگی سے ناطہ ختم کر کے یہاں آ بسے ہیں۔ ہماری اپنی ایک دنیا ہے۔ جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ اب اس دنیا میں تیری آمد نے مجھے بھی بے چین کر دیا اور دوسروں کو بھی۔ کچھ شوقین ہیں جو تیری حرکتوں سے لطف اٹھاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو تیری وجہ سے تکلیف کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ہے ساری صورتحال۔''

نعمت علی حیرت سے منہ پھاڑے یہ ساری کہانی سن رہا تھا۔

پراسرار ہیولہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میری نگاہیں ایک بار پھر کتبے کی جانب اٹھ گئیں اور میں اسے غور سے پڑھنے لگا۔ پھر میں نے ایک جھرجھری سی لی اور بولا۔

''تب تو میں معافی چاہتا ہوں کہ واقعی میری وجہ سے آپ کو پریشانی اٹھانی پڑی۔ میں ان سب سے معافی کا خواستگار ہوں۔ جو میری وجہ سے اپنے ذہن سے پریشان ہوتے رہے ہیں۔ آئندہ میں اس قبرستان میں نہیں آؤں گا۔''

''نہیں اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ تیرا کردار برا تو نہیں ہے۔ البتہ میں اگر تجھے ایک پیشکش کروں تو کیا تو اسے قبول کرلے گا؟''

''کیوں نہیں۔ آپ میرے لئے استاد محترم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاید آپ کو میرے بارے میں علم نہیں ہے۔''

''ہے۔ علم ہے۔ لیکن پھر بھی تو مجھے اپنے بارے میں مختصر طور پر بتا۔'' نعمت علی اپنے حالات بتانے لگا۔ تو وہی آواز سنائی دی۔

''تو پھر میں تجھے ایک پیشکش کرتا ہوں۔ زندگی میں جیسا کہ میں نے تم سے کہا کہ بہت سے لوگ نجانے کیسے کیسے مسائل کا شکار ہیں، وہ ترس رہے ہیں زندہ رہنے کے لئے مگر لوگوں نے ان سے زندگی چھین لی ہے ان غمزدہ لوگوں کی دلجوئی کے لئے اگر ہم باقاعدہ کام شروع کریں تو کیسا رہے گا۔''

''طریقہ کار کیا ہوگا؟'' نعمت علی نے سوال کیا اور چند لمحات کے لئے دوسری طرف خاموشی طاری ہوگئی۔

''اس بارے میں تو بھی سوچ، میں بھی سوچوں گا اور ہم طریقہ کار بھی طے کرلیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔''

''میں بھی تیرے ساتھ ہی چل رہا ہوں۔ تیرے قریب تو نہیں رہ سکتا لیکن جب بھی تو مجھے استاد محترم کہہ کر آواز دے گا میں تیرے پاس آجاؤں گا اور اس کے بعد ہم آگے کے سارے معاملات طے کرلیں گے۔''

بڑی دلچسپ اور اچھی پیشکش تھی۔ نعمت علی کے ذہن میں نجانے کیسے کیسے خیالات آنے لگے۔ بہر حال اس کے بعد وہ قبرستان سے اٹھ کر گھر کی جانب چل پڑا تھا۔

ایم اے راحت

قسط نمبر:02

رات کا گھٹا ٹوپ اندھرا، پرھول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دھشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکرائو، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

روزانہ کا ہی معمول تھا۔ امداد علی کے بتائے ہوئے وظیفے کے لیے وہ قبرستان جاتا تو تھا لیکن وہاں بیٹھ کر دوسری ہی تفریحات ہوا کرتی تھیں واپس آ کر یہی بتاتا تھا کہ آج کا وظیفہ بہت اچھا رہا ہے۔ لیکن آج تو وظیفہ واقعی بہت اچھا ہوا تھا۔ خیر الدین شاہ خیری سے پکی دوستی ہوگئی تھی۔ اور خیر الدین شاہ خیری، وہ بھی کوئی معمولی چیز نہیں تھی۔ بلکہ ایک عامل تھا۔ اور مر بھی چکا تھا۔ یعنی اب وہ دو آتشہ ہوگیا تھا۔ اور اس کی قربت بڑے بڑے گل کھلا سکتی تھی۔ نعمت علی گھر کے دروازے سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ کہ لوگوں کو گھر کے دروازے پر جمع دیکھا تو تیز تیز قدموں سے آگے بڑھا۔ تو رمضانی مدد علی کو گالیاں دے رہا تھا۔

رمضانی پڑوس کا دکان دار تھا۔ اور ایک کے چار بنانا اس کا کام تھا۔ غریب لوگوں کو سامان دے دے کر کبھی کبھی ان کے گھر کا سامان بھی اٹھوا لیا کرتا تھا کہ پیسے وقت پر نہیں پہنچے۔ بہت ہی خبیث انسان تھا۔ اس وقت وہ مدد علی کو گالیاں دے رہا تھا۔ اور مدد علی سر جھکائے کھڑے تھے۔ لوگوں نے نعمت علی کو دیکھا تو کانا، پھوسی کرنے لگے۔

"کیا ہوا ابا کیا بات ہے؟" نعمت علی نے پوچھا۔ مدد علی نے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن رمضانی چمک کر بولا۔

"ساڑھے چھ فٹ کے جوان ہو ہاتھی کے ہاتھی ہو رہے ہو۔ باپ بے چارہ الٹے سیدھے تعویذ گنڈے کر کے چار پیسے کما لیتا ہے اور تم باپ کے بل پر عیاشیاں کرتے پھرتے ہو۔ اب اس عمر میں تو زمین میں لات مارو گے تو پانی نکل آئے گا۔ اور تم باپ کو گالیاں کھلوا رہے ہو۔"

"کیا ہوا..... رمضانی چاچا۔"

"چاچا کے بچے، کب سے سودا ادھار لے رہے ہو، پیسے مانگتا ہوں تو ٹالتے چلے جاتے ہو، تمہارے باپ نے دولت جمع کر دی ہے۔ میرے پاس، دکان کا میل بھی رکھنا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کب دو گے ہمارے پیسے۔"

"چاچا پیسے تو آپ کے پہنچتے رہتے ہیں۔"

"اب اس پر ہی اتراؤ گے اور کیا کرو گے۔ محلے بھر میں آنکھ مٹکا کرتے پھرتے ہو۔ دوسروں کی بہو، بیٹیاں تاکتے پھرتے ہو۔ کام کے نہ کاج کے من بھر اناج کے۔ کون سے پیسے دیے ہیں تم نے۔"

"رمضانی بھائی۔ آپ نے پیسے وصول کرنے

کے باوجود وہ رقم کاٹی نہیں ہے جو میں نے ادا کی ہے۔

”دیکھو! میاں ایک بات کہوں تم سے اللہ کا نام لیتے ہو، نماز پڑھنے بھی جاتے ہو، سب کچھ کرتے ہو، اوراس پر جھوٹ بولتے ہو۔ میں کہتا ہوں اللہ سے ڈرو۔ پورے بارہ ہزار روپے ہو گئے ہیں تمہارے اوپر، بارہ ہزار روپے میں تو اتنا سودا آجاتا کہ کم از کم پانچ سو روپے روز کی آمدنی بڑھ جاتی میری۔ کہاں تک برداشت کروں۔“

”خدا سے ڈرو رمضانی بھائی، ہزار، ہزار کرکے چار مرتبہ رقم پہنچا چکا ہوں اور یہ بارہ ہزار کہاں سے ہو گئے یہ تو سب کچھ غلط لکھا ہوا ہے۔“

”یہ ہی کہو گے یہ ہی کہو گے مگر ایک بات سن لو میری، گھر کا سارا سامان اٹھوا دوں گا۔ چار لڑکے لے کر آؤں گا۔ مار پیٹ کرکے تمہیں گھر سے نکال دیں گے، سمجھ لینا دو دن کی مہلت دے رہا ہوں میرے پیسے آجانے چاہئیں۔“

”رمضانی چاچا! ہوش ٹھکانے نہیں ہیں شاید تمہارے ایسے کرو چار لڑکے ابھی لے آؤ۔ اور گھر کا سامان اٹھوالو۔ ٹانگیں، توڑ کر بغل میں دبا دوں گا کسی غلط فہمی کا شکار مت رہنا۔“ نعمت علی کو بھی غصہ آگیا۔ لیکن اچانک ہی اس نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کے کندھے کو تھپتھپایا ہے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ لیکن تھپتھپاہٹ کافی زوردار تھی۔ پھر اسے کان میں سرگوشی سنائی دی۔

”نعمت علی نہیں...... بالکل نہیں...... ایسا مت کرو، ذرا دھیرج رکھو میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔“ نعمت علی نے خیرالدین خیری کی آواز پہچان لی تھی۔ ادھر رمضانی دہاڑ رہا تھا۔

”سن لیا آپ لوگوں نے اسے کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری، دیکھو مدد علی ہماری تمہاری پرانی شناسائی ہے میں نے دو دن کی مہلت دی ہے تمہیں۔ دو دن میں اگر میرے پیسے نہ پہنچے تو تمہارا گھر خالی کردوں گا۔“

”تم بے ایمانی کر رہے ہو رمضانی، کھلی بے ایمانی، میں بھی اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ دو دن کے اندر تمہاری دکان میں صرف چوہے لوٹ رہے ہوں گے، اگر میں سچا ہوں تو، دیکھنا کہ تمہیں میری اس بے عزتی کا کتنا بڑا نقصان ہوتا ہے۔“

”ارے جاؤ، جاؤ، پیر صاحب! شرم نہیں آتی۔ الف کے نام لٹھ کا پتا نہیں ہے۔ اور بنے ہو، پیر مدد علی شاہ۔ جو کچھ میں کہہ کر جارہا ہوں سن لیا تم نے اور جہاں تک چوہے لوٹنے کا تعلق ہے تو بھول جاؤ۔ مدد علی اللہ کا دیا اتنا کچھ ہے۔ میرے پاس کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے، چلو بھائیو چلیں۔“ رمضانی نے کہا۔ اور جو دو تین بندے اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ وہ اس کے ساتھ واپس چلے گئے۔ انہی میں پڑوسی نیاز علی بھی تھا۔ جس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ مسکراہٹ نعمت علی نے دیکھ لی۔ اور ایک عجیب سے احساس کا شکار ہو گیا۔

نیاز علی نے کسی سے کچھ کہا تو نہیں تھا۔ لیکن سب سے پہلے اس نے اپنی نوجوان بیوی کو میکے بھجوا دیا تھا اور اس کے بعد سے مدد علی سے سلام دعا چھوڑ دی تھی۔ حالانکہ مدد علی نے بڑی عاجزی کے ساتھ نیاز علی سے معافی مانگی تھی اور کہا تھا کہ ”اگر اب کبھی نعمت علی کو چھت پر دیکھا یا اس کے دروازے کے سامنے کھڑے دیکھا تو اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔“ لیکن نیاز علی کے دل کی کدورت نہیں گئی تھی۔ وہ بدستور نفرت کا شکار تھا۔

ادھر آسیہ بیگم گھر میں پریشان کھڑی ہوئی تھیں۔ محلے کی ایک دو عورتیں آگئی تھیں مدد علی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ”بھائیو میں بہت غریب ہوں۔ بے شک اللہ کا نام لے کر دعائیں کرتا ہوں اور کبھی کبھی میری دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔ اور میرے دیئے ہوئے تعویذوں سے لوگوں کو فائدہ بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن کتنی ہی بڑی قسم لے لیجیے مجھ سے، یہ رمضانی بالکل جھوٹا حساب لے کر آیا ہے قطعی جھوٹ بول رہا ہے۔ میرے اوپر اس کے صرف ڈھائی سو روپے ہیں۔ جو میں بندوبست کرنے کی کوششیں کررہا ہوں۔ میں جو رقم دیتا رہا ہوں میں نے اس کی ایمانداری پر چھوڑی ہوئی تھی

کہ وہ اپنے رجسٹر میں سے میرے اوپر لکھا ہوا ادھار کاٹ دے گا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔“

”اصل میں یہ ادھار کا چکر ہی برا ہے۔ مدد علی صاحب اور وہ بارہ ہزار کہہ رہا ہے یہ بارہ ہزار تو تمہیں دینے ہی ہوں گے۔“

”اللہ اسے اس بے ایمانی کی سزا دے گا۔ آپ لوگ دیکھ لیجیے گا۔ ٹھیک ہے گھر کا سامان بیچوں گا۔ اور اس کی ادائیگی کروں گا۔“

”ابا......“ نعمت علی دہاڑا لیکن مدد علی نے اس کا کندھا دبایا۔ اور دروازہ کھول کر گھر کے اندر دھکا دے دیا۔ نعمت علی گھر کے اندر آ گیا تھا۔ شدید غصے میں تھا۔ بہرطور مدد علی نے اندر آ کر بھی یہ ہی بتایا کہ وہ رقم ادا کر چکے ہیں۔ لیکن نعمت علی تاک میں لگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چپ چاپ باہر نکلا اور رمضانی کی دکان کے پچھواڑے جا کھڑا ہوا۔ اس نے خاص طور سے دیکھا تھا کہ نیاز علی رمضانی کے پاس پہنچا ہے۔

”واہ...... رمضانی بھائی ایمان کی قسم جی خوش کر دیا۔ یہ لو پانچ سو روپے جن کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ ارے ہاں...... کیا سمجھتے ہیں یہ باپ بیٹے خود کو۔ آج ساری عزت مٹی میں مل گئی۔ میرا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ میری بیوی بیچاری معصوم تھی۔ یہ نعمت علی چھت پر پہنچ کر تانک جھانک کرتا تھا۔ یہ سمجھ لو کہ میرا تو کلیجہ خاک ہو گیا تھا۔ پر بوڑھا آدمی ہوں کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ مگر آج تم نے میرا دل ٹھنڈا کر دیا۔“

”ہمارے لائق کبھی بھی کوئی کام ہو تو بتا دیا کریں نیاز بھائی، ہم نے اپنا کام پورا کر دکھایا۔ اور اب اس سے بارہ ہزار روپے بھی وصول کریں گے۔“ نعمت علی کا خون کھولنے لگا لیکن اسی وقت ایک بار پھر اس کے کانوں میں خیرالدین کی آواز ابھری۔

”ٹھنڈا کرکے کھاؤ۔ ٹھنڈا کرکے کھاؤ نعمت علی۔ یہ دنیا اتنی ہی بری ہے۔ تمہارے شریف باپ نے واقعی پیسے دے دیے ہوں گے۔ لیکن تم نے دیکھ لیا کس نے رمضانی کو بھڑکایا تھا۔“

”مگر یہ تو برا ہوا ماموں ہماری تو اچھی خاصی بے عزتی ہوگئی۔“

”کل صبح کا انتظار کر، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

”کیا مطلب؟“ نعمت علی نے کہا۔

”بس کل صبح کے وقت دیکھنا تیل اور تیل کی دھار، اور خوب مزے لینا۔ اندر جاؤ اور کھانا وانا کھاؤ۔“

”گھر میں کچھ بھی نہیں ہے ادھار سدھار سودا آتا ہے۔“

”تم چلو میں پہنچاتا ہوں۔“

”تم......؟“ نعمت علی نے کہا۔

”ہاں۔ بحث مت کیا کرو، میری باتوں پر اعتماد نہیں کرو گے تو بات آگے کیسے بڑھے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ نعمت علی نے کہا اور گھر کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ گھر میں ایک طرح سے سوگ کی فضا تھی۔ عورتیں جا چکی تھیں اور مدد علی دکھ بھرے انداز میں کہہ رہے تھے۔

”رمضانی اتنا برا تو نہیں تھا۔ بے شک لالچی ہے۔ تھوڑا سا بے ایمان بھی ہے۔ لیکن اتنی بڑی بے ایمانی۔ بارہ ہزار کی چٹی رکھ دی ہے۔ ہمارے سر پر، کیا کریں؟“

”ابا پرواہ نہ کرو۔ اللہ کے فضل سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ نعمت علی نے کہا تو مدد علی نے شکایت بھری نگاہوں سے نعمت علی کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اور خود مدد علی اس خیال سے باہر نکل گئے کہ کہیں رمضانی یا اس کا کوئی آدمی نہ ہو۔ نعمت علی جوان ہے۔ اسے غصہ آجائے گا۔ دروازے پر دو آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ پیکٹ تھے۔

”حکیم صاحب نے کھانا بھجوایا ہے۔ نعمت بھائی کے لیے۔“

”کون حکیم صاحب!“ مدد علی نے کہا۔

''یہ تو ہمیں نہیں معلوم۔ ہوٹل میں آرڈر بک کرایا تھا۔ پیسے دے گئے تھے۔ آپ یہ پیکٹ پکڑ لو، ہمیں واپس جانا ہے۔'' انہوں نے مددعلی سے کہا۔ اور مددعلی نے وہ پیکٹ پکڑ لیے۔

کسی ہوٹل کا نام لکھا ہوا تھا۔ پیکٹوں پر بڑی شاندار پیکنگ تھی۔

''کون ہے ابا، کیا بات ہے؟''

''یہ حکیم صاحب نے کھانا بھجوایا ہے۔ تمہارے لیے اور یہ حکیم صاحب کون ہیں۔''

''کھانا بھجوایا ہے......؟''

''ہاں...... ہوٹل کے دو آدمی آئے تھے۔ کہنے لگے کہ حکیم صاحب نے کھانا بھجوایا ہے۔ نعمت علی کے لیے بل دے کر گئے تھے۔'' نعمت علی کو ایک دم خیرالدین خیری یاد آیا تو اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''پیکٹ رکھ لیجیے، حکیم صاحب سے نئی نئی دوستی ہوئی ہے اماں ذرا کھول کر دیکھو۔ پیکٹوں میں کیا ہے؟''

''پیکٹوں میں بہت ہی اعلیٰ درجے کا کھانا تھا جس سے خوشبوؤں کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔''

''کھاؤ...... ابا، اول طعام، بعدہٗ کلام پہلے کھانا کھاؤ، اس کے بعد دیکھیں گے کہ رمضانی کے ساتھ کیا سلوک کیا جاسکتا ہے۔''

''میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔''

''تمہیں ہماری قسم ابا! آجاؤ، بس یوں سمجھ لو سارے دلدر دور ہوجائیں گے۔ تم نے وظیفہ ہی ایسا بتایا تھا کہ اس کے نتیجے میں حکیم صاحب سے یاری ہوگئی۔''

''مگر یہ حکیم صاحب ہیں کون؟''

''ابا کھانا کھاؤ، میری تو بھوک آسمان پر پہنچ رہی ہے۔'' نعمت علی نے کہا۔ اور ماں کا ہاتھ پکڑ کر دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ مددعلی کی جو بے عزتی ہوچکی تھی۔ وہ اس سے بہت دلبرداشتہ تھے۔ بار بار یہی کہے جارہے تھے۔

''یہ کمبخت رمضانی اتنا بے ایمان نکلے گا، میں نے تو خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا۔''

''افسوس کی بات تو یہی ہے، نعمت کے ابا کہ آپ خوابوں میں بھی سوتے رہتے ہیں۔'' بیوی نے کہا۔

''اری پاگل جاگتی آنکھوں سے خواب کون دیکھتا ہے۔''

''کھانا غضب کا ہے، بھئی واہ!'' نعمت علی اپنی دھن میں مست تھا۔

بہرحال کھانا کھالیا گیا...... مددعلی اس بات کے لیے پریشان تھے کہ رمضانی کو پیسے کہاں سے ادا کریں گے۔

''ابا تیل دیکھیں، تیل کی دھار دیکھیں، کیا کیا جاسکتا ہے، خیر اب جو اللہ کی مرضی۔'' مددعلی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ لیکن دوسرے دن غالباً چھ بجے کا وقت تھا۔ مددعلی بدستور نماز وغیرہ سے فارغ ہوکر مناجات پڑھ رہے تھے اور نعمت علی کروٹیں بدل رہا تھا۔

اچانک محلے میں شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کان پڑا شور تھا۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے تمام محلے میں آگ لگ گئی ہو۔

''الٰہی خیر...... ذرا دیکھنا جی کیا ہوگیا۔ اللہ خیر کرے۔'' آسیہ بیگم نے مددعلی سے کہا تو مددعلی حیران پریشان گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکلے۔

پاس پڑوس سے لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل رہے تھے اور چیخ رہے تھے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر رمضانی پنساری کی دکان تھی۔ لیکن اس وقت دکان پر جو منظر تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ ہزاروں چوہے دکان سے نکل نکل کر باہر بھاگ رہے تھے۔ اور جس کا جدھر منہ اٹھ رہا تھا۔ ادھر بھاگ رہے تھے۔ لیکن لوگوں نے ایک اور بھی عجیب وغریب منظر دیکھا۔ ان میں سے ایک بھی چوہا۔ مددعلی کے گھر کے دروازے پر نہیں آیا تھا۔ جبکہ پاس پڑوس کے سارے مکانات میں چوہے رمضانی کی دکان سے نکل نکل کر گھس رہے تھے اور جس گھر میں بھی چوہے گھستے وہاں سے عورتوں اور بچوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔

خود رمضانی بندر کی طرح اچھل رہا تھا۔ اور اپنی

دکان میں جھانکنے کی کوشش کررہا تھا۔ جہاں سے چوہے باہر نکل رہے تھے اچانک ہی اس کی دہاڑ ابھری۔

''ارے یہ کیا ہوگیا۔ ہائے یہ کیا ہوگیا۔'' وہاں موجود لوگوں نے بھی رمضانی کی دکان میں جھانکا۔ دکان میں موجود ہر چیز کو چوہے چٹ کرچکے تھے آٹے کی، دالوں کی بوریاں پھٹی پڑی تھیں، اور کسی چیز کا ایک دانہ بھی باہر نہیں پڑا ہوا تھا۔ چوہوں نے بڑی صفائی سے ہر چیز کھائی تھی۔ چینی، گڑ، دالیں، چاول، یہاں تک کہ مرچ دھنیا، اور مختلف چیزوں کے ڈبے بھی خالی کردیے گئے تھے۔ دکان میں لاکھوں روپے کا سامان موجود تھا۔ جو چوہے ہڑپ کرگئے تھے۔

رمضانی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''ارے یہ کیا ہوگیا...... ارے یہ کیا ہوگیا۔'' اور اسی وقت رمضانی کے گھر سے بھی آہ وزاری اور چیخ وپکار کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کی بیوی اور بچے گھر چھوڑ کر باہر نکل بھاگے تھے۔ رمضانی کی بیوی چیخ رہی تھی۔

''سب کھا گئے۔ اللہ قسم، سب کھا گئے، الماریاں کپڑوں سے خالی ہوگئیں سارے گھر میں چیتھڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ باورچی خانے میں کھانے پینے کی کوئی چیز باقی نہیں بچی ہے۔ ارے سب کچھ چٹ ہوگیا۔ ہر چیز کھاگئے۔ ہائے ہم فقیر ہوگئے۔''

رمضانی کا رو رو کر برا حال ہورہا تھا۔ دکان کی حالت واقعی قابل غور تھی۔ کیا مجال کہ دکان میں کوئی چیز بچی ہو اور چوہے تھے کہ امڈے چلے آرہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے چوہوں کا طوفان آیا ہو۔ وہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ لوگوں کے گھروں میں گھس رہے تھے اور ہر گھر کے لوگ چیختے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک اور بات بھی معلوم ہوئی کہ رمضانی کے گھر یا دکان کے علاوہ چوہوں نے کسی کے گھر میں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور کونوں کھدروں میں گھس کر غائب ہوگئے تھے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ اسی وقت کسی آدمی نے کہا۔

''ارے...... ایک بات بتاؤں میں تم لوگوں کو تمہیں پتا ہے کل مددعلی نے کیا کہا تھا؟''

''کیا کہا تھا......؟''

''انہوں نے کہا تھا کہ رمضانی اگر تو جھوٹ بول رہا ہے تو تیری دکان میں چوہے لوٹیں گے، کہا تھا ناں، یاد ہے ناں تم لوگوں کو......؟''

''ارے ہاں...... یاد ہے...... لو...... ہوگیا کام۔ ارے وہی کہتے ہیں ناں۔ گھر کی مرغی دال برابر، مددعلی شاہ کو لوگ ایسے ہی ڈھونگیا سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں انہیں کچھ نہیں آتا جاتا۔ اب دیکھ لیا، بھائیو دیکھ لیا تم نے اپنی آنکھوں سے کہ مددعلی شاہ کیا ہیں۔ کسی نے انہیں سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ارے اللہ والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دنیا کو فیض پہنچاتے ہیں اور خود تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ دیکھ لیا تم نے ہم نے دیکھ لیا، رمضانی اب بھی سچ اگل دے۔ ورنہ قسم اللہ کی چوہے تجھے بھی کھا جائیں گے۔ بول مددعلی شاہ پر تیری رقم قرض ہے یا نہیں...... بول۔'' ایک بزرگ نے کہا۔

''اولاد کی قسم صرف ڈھائی سو روپے ہیں۔ ان پر...... اور کچھ نہیں ہے۔''

''تو پھر یہ بارہ ہزار کہاں سے بن گئے تھے؟ وہ بے چارے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہہ رہے تھے کہ رمضانی، میرے اوپر غلط الزام مت لگاؤ۔ میں نے تمہاری رقم ادا کردی ہے۔ مگر تو...... تو...... بول رمضانی سچ بول...... دے۔''

''نہیں بھائیو! معافی چاہتا ہوں معاف کر دیں۔ پیر جی معاف کردیں۔ معاف کردیں تمہیں اللہ کا واسطہ، ہائے میں تو مر چکا۔ سب کچھ تباہ و برباد ہوگیا میرا...... ارے نہ دکان میں کچھ رہا اور نہ گھر میں، فاقے کریں گے اب ہم لوگ۔ کہاں گیا یہ کتا۔ کہاں گیا یہ نیاز علی۔ ارے اسی نے بہکایا تھا مجھے کہنے لگا۔ کہ مددعلی کا بیٹا۔ اس کی نوجوان بیوی سے عشق لڑا رہا تھا۔ وہ بدلہ لینا چاہتا تھا۔ لالچ میں آگئے ہم۔ نیاز علی نے ہمیں کچھ پیسے دیئے تھے۔ مارے گئے ہم۔ بھیا لینے کے دینے پڑ گئے۔ کدھر گیا یہ کتے کا بچہ...... ابھی تو یہیں کھڑا تھا۔

"کدھر گیا یہ......" رمضانی نے دانت پیستے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ اسی وقت ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکے نے بتایا کہ نیاز علی تو اپنے گھر کے دروازے پر تالا لگا کر بھاگا ہوا جا رہا تھا۔ ہم نے اسے سامنے والی گلی میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

"بھاگ گیا کمینہ کہیں کا مجھے مروا گیا۔ مگر کوئی ایسی بات نہیں ہے لالچ کا نتیجہ تو بڑا ہی برا ہوتا ہے۔ اس کے کہنے پر ہم نے یہ جھوٹ بولا تھا۔ معاف کردو...... پیر مدد علی معاف کردو۔" رمضانی آیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر مدد علی کے پیروں میں سر رکھ دیا۔

"ارے...... ارے کیوں گناہ گار کر رہے ہو۔ رمضانی کیوں گناہ گار کر رہے ہو۔ برا کیا تھا۔ برا ہوا۔"

"ہمیں معاف کردو۔ ہمیں معافی دے دو پیر صاحب۔" ہمیں معافی دے دو۔ نعمت علی بھی اس سارے ہنگامے کو سن کر پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور ساری باتیں سن رہا تھا۔ اسے بھی حیرت تھی۔ تبھی اس کے کان میں خیر الدین شاہ نے کہا۔

"میں نے کہا تھا ناں تم سے صبر کر کے کھانا اچھا ہوتا ہے۔ ویسے کھانا ٹھیک تھا رات کا۔"

"یار اب میں تمہیں کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاؤ ماموں۔" نعمت علی نے کہا۔ اور اسے ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ نعمت سمجھ گیا کہ جو کچھ کیا ہے۔ خیر الدین شاہ خیری نے کیا ہے۔

بہر حال دوپہر تک محلے بھر میں خوب ہنگامہ رہا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں آ کر مدد علی شاہ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے الفاظ اس طرح کے تھے۔

"وہی تو ہم نے کہا ناں۔ جتنے بزرگوں سے سنتو یہی پتا چلتا ہے کہ جو اللہ والے ہوتے ہیں۔ جن کی اللہ سنتا ہے وہ ہمیشہ تکلیف میں رہتا ہے۔ مدد علی شاہ نے ہمارے سامنے پوری زندگی تکلیفوں میں گزاری اب دیکھ لو تم کو رمضانی نے ان پر الزام لگایا تو برداشت نہیں کر سکے اور رمضانی کا خانہ خراب ہو گیا۔"

عزت کرو ان کی قدر کرو سب سے معافی مانگو ان سے چل کر ان کی عزت کرو۔ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھو۔ وہ اگر چاہیں تو اس پورے محلے کو چوپٹ کر سکتے ہیں۔ بلیاں آ جائیں گی۔ پھر شیر آ جائیں گے۔ نہیں بابا نہیں...... ان بزرگوں کی عزت کرنا بڑا ضروری ہے۔" جتنے منہ اتنی باتیں۔ مدد علی خود بھی اپنے گھر میں پریشان بیٹھے تھے۔ نعمت علی بھی گھر ہی میں موجود تھا۔ لیکن اپنے کمرے میں۔

"یہ کیا تم واقعی اتنے ہی اللہ والے ہو گئے ہو؟" آسیہ بیگم نے مدد علی سے کہا۔

"اللہ والا تو نہیں...... اللہ کا بندہ ہوں...... اس کا غلام ہوں...... اس کا ایک ناچیز اور گناہ گار بندہ ہوں میں...... اسی نے میری عزت رکھی ہے۔ رمضانی واقعی الزام لگا رہا تھا آسیہ بیگم۔ آپ جانتی ہیں میں صرف اتنا ہی ادھار لیا کرتا ہوں۔ جتنا ادا کر سکوں...... ہمیشہ ایسا ہی کیا ہے میں نے...... نیاز علی نے بہکا دیا تھا رمضانی کو اس نے جھوٹ بولا اور سزا پائی مجھے بہت افسوس ہے بے چارے کا۔ دکان خالی ہو گئی، گھر کے کپڑے وغیرہ سب چھن گئے، سب ختم ہو گئے باقی اللہ کی مرضی ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"اب کیا کریں......؟"

"وہی ڈھائی سو روپے ہیں اس کے میرے پاس، وہ کہیں سے جمع کر کے ادا کر دوں گا۔ پڑوسی بے چارے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے ہیں مجھ سے۔" خیر الدین شاہ خیری نے نعمت علی سے کہا۔ "کیا خیال ہے، ہوٹل کا کھانا اچھا نہیں تھا، اور بھجوادوں۔"

"نہیں ماموں ایسا نہ کرو، اصل میں ابا اور اماں ذرا مختلف قسم کے آدمی ہیں۔ کھائیں گے نہیں سوچیں گے کہ آخر یہ کون حکیم صاحب ہیں؟ جو اتنی مہربانی کرتے ہیں۔ یہ مت کرو ماموں کچھ اور سوچتے ہیں ذرا گھر کے حالات ٹھیک ہو جائیں۔"

"تم فکر کیوں کرتے ہو۔ روزانہ جب صبح اٹھا کرو تو تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر رقم نکال لیا کرو۔ اور

باپ کے حوالے کر دیا کرو۔"

"کیسی رقم؟"

"یار میں رکھ دیا کروں گا۔ کتنے روپے روز کا خرچا ہو گا تمہارا دو سو، چار سو، پانچ سو، پانچ سو کا ایک نوٹ رکھ دیا کروں گا۔"

"ماموں...... یہ تو تم میری پشتوں پر احسان کرو گے۔ ابا کے تمام دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"بس تو پھر پرواہ کی کیا بات ہے، کہہ دو کہ جو تم نے وظیفہ پڑھا تھا کامیاب ہو گیا ہے اور یہ رقم اسی وظیفے کے نتیجے میں آ رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تو پھر نکال لو جا کر آج کی رقم تکیے کے نیچے سے۔" خیر الدین خیری نے کہا اور تکیے کے نیچے نعمت علی کو پانچ سو روپے کا نوٹ مل گیا۔ وہ خوشی خوشی باپ کے پاس پہنچا۔ اور بولا۔

"ابا تمہیں اللہ عزت بھی دے اور زندگی بھی دے، لمبی زندگی دے۔ میری اماں یہ لو پانچ سو روپے گھر کے کھانے پکانے کے لیے۔"

"پپ، پپ، پانچ سو روپے۔" مدد علی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں...... ابا، تم نے سچ مچ زندگی بڑی سادگی سے گزاری ہے۔ میں یہ تو بالکل نہیں کہوں گا کہ تمہیں تعویذ گنڈوں کا کام آتا نہیں ہے۔ لیکن جو وظیفہ تم نے مجھے بتایا تھا وہ بڑا کار آمد تھا۔ ابھی تو آدھا بھی نہیں ہوا کہ غیب سے میری پانچ سو روپے کی آمدنی ہو گئی۔ یہ پانچ سو کا نوٹ اسی سلسلے کا پہلا نوٹ ہے۔ ابا یہ رقم تمہیں ملتی رہے گی۔ تم بالکل فکر مت کرنا۔"

"ابے کیا کہہ رہا ہے۔ اس وظیفے میں تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔" مدد علی نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہی نہیں، ہو گی ابا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" بہر حال پانچ سو روپے کا نوٹ آسیہ بیگم کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اور آسیہ بیگم کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا کہنے لگیں۔

"کہتے تھے ناں...... کہ نکھٹو ہے۔ کبھی کچھ نہیں کرے گا زندگی میں، اب دیکھ لیا۔"

"ایک بات کہوں آسیہ بیگم اتنا نیک نفس میں بھی نہیں ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وظیفے میں کوئی ایسا کام بھی ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا تو پہلے سے نہ شروع کر دیتا۔"

"ارے سوچو تو سہی۔ پانچ سو روپے روز ملیں گے۔ ہمارے تو سارے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔"

"بس جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ وقت پر ہو جاتا ہے۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور پھر...... اور پھر......" مدد علی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ غالباً چوہوں کے بارے میں کہنا چاہتا تھا۔ جو نجانے کہاں سے نکل پڑے تھے۔ مدد علی کے فرشتوں کو بھی اس بارے میں نہیں معلوم تھا۔ لیکن اس واقعے سے محلے میں جو افراتفری پھیلی تھی۔ اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ سارے محلے والے اس بات پر پشیمان تھے کہ اس سے پہلے انہوں نے مدد علی کی عزت کیوں نہ کی۔

مدد علی بے چارہ بڑی کسمپرسی میں گزارہ کر رہا تھا، اور سبھی کو یہ بات معلوم تھی جبکہ اس کے منہ سے نکلی ہوئی کوئی بھی بات آسانی سے پوری ہو سکتی تھی۔ محلے والے منصوبہ بندیاں کرنے لگے کہ کس طرح آگے چل کر مدد علی کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ ادھر نعمت علی بھی خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس کا چلہ یا وظیفہ واقعی سب سے زیادہ کار آمد ثابت ہوا تھا۔ خیر الدین خیری نے تو غضب ہی ڈھایا تھا۔ اس نے بڑے احترام سے آواز دی۔

"استاد محترم......"

"موجود ہوں...... موجود ہوں...... کیا بات ہے......؟"

"استاد محترم اب ہمیں آئندہ کیا کرنا ہے؟" یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" کچھ لمحے خاموشی رہی پھر خیر الدین خیری نے کہا۔

"جیسا کہ میرے اور تیرے درمیان پہلے ہی

بات چیت ہو چکی ہے۔ میری جو آرزوئیں تشنہ رہ گئی ہیں۔ ان کی تکمیل میں تو میری مدد کرے گا اور میں تیری ...... گھر کے معاملات سے تو، تو مطمئن ہو گیا ہے ناں......"

"ایسا ویسا شاہ جی...... آپ نے میری اور میرے باپ کی جو عزت بڑھائی ہے میں اس کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔"

"چل تو خوش ہے تو میں بھی خوش ہوں۔ میں تجھے سچ بتا رہا ہوں کہ اس دنیا میں ایسے ایسے دکھی پڑے ہوئے ہیں۔ جن کے دکھوں کو سن کر بس یوں سمجھ لے کہ آنکھوں سے آنسو نہیں رکتے۔ پر اب کیا کر سکتا ہوں اب تو میری آنکھیں ہی نہیں ہیں......"

"میری تو ہیں شاہ جی۔ اب تم میری آنکھوں سے روؤ گے۔" نعمت علی نے دلسوزی سے کہا۔ اور خیر الدین خیری خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"گھر پر کوئی کام تو نہیں ہے اس وقت۔"

"نہیں شاہ جی...... کہو......"

"آ پھر بازار میں نکلتے ہیں۔"

"چلو......" نعمت علی نے کہا اور دونوں گھر سے باہر نکل آئے۔ نعمت علی کے لئے یہ بھی ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ خیر الدین خیری اس کا بہترین دوست بن چکا تھا۔ کوئی وجود اس کے ساتھ نہیں تھا لیکن اسے یہ اندازہ تھا کہ اس کا دوست اس کے ساتھ چل رہا ہے۔ پھر وہ ایک سڑک سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہی گاڑی کے ٹائروں کی چرچراہٹ کی آواز سنائی دی۔ اور نعمت علی ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ ایک کار تھی جو نوجوان کو ٹکر مارتی ہوئی چلی گئی تھی۔ نوجوان بہت اونچا اچھل کر نیچے گرا تھا۔ لوگ چیخ و پکار کرنے لگے۔ نعمت علی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ خیر الدین کی آواز سنائی دی۔

"آؤ...... ذرا دیکھیں تو سہی۔" اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر وہاں پہنچ گئے۔ جہاں لوگ دور دور سے بھاگ کر جمع ہو رہے تھے۔ وہ آپس میں چیخ و پکار کر رہے تھے۔"

"کار کا نمبر نوٹ کیا؟" کسی نے کہا۔

"نہیں کسی نے بھی نوٹ نہیں کیا۔"

"نکل گیا۔ کمبخت۔"

"ارے اسے تو دیکھو، کوئی بڑی چوٹ نظر آ رہی ہے؟"

"چوٹیں ہی چوٹیں ہیں۔"

"اسپتال لے چلو۔"

"وہ سامنے اسپتال ہے۔" کسی نے ایک طرف اشارہ کیا اور نعمت علی نے بھی اس طرف دیکھا۔ اسپتال کا بورڈ سامنے ہی لگا ہوا تھا۔ لوگ اس نوجوان کو اسپتال کی جانب لے چلے۔

"آؤ......" خیر الدین کی آواز ابھری۔ اور نعمت علی بھی لوگوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس نے نوجوان کی صورت دیکھی اچھی شکل و صورت کا مالک تھا۔ لوگوں کے چہروں پر تشویش جھلکنے لگی پھر ان میں سے ایک نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

"یہ مر چکا ہے۔" نعمت علی کو کافی دکھ ہوا حالانکہ اس نوجوان سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ لیکن ایک انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے دل میں دکھ کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ لوگ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹروں میں سے ایک نے کہا۔

"حادثہ کہاں ہوا ہے؟ آپ براہ کرم ذرا تھوری سی تفصیلات بتا دیجیے؟" دو افراد ڈاکٹروں کو بریف کرنے لگے اور اس کے بعد عام کارروائیاں ہونے لگیں۔ کچھ لوگ چلے گئے تھے۔ کچھ وہیں موجود تھے۔ پولیس کو بلا لیا گیا تھا۔ ایک پولیس آفیسر نے نوجوان کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں ایک پرس تھا لیکن بالکل خالی، پرس میں اس کا شناختی کارڈ موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک خط بھی تھا۔ جو کسی نے اس کی نوکری کے لیے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ جس شخص نے یہ رقعہ لکھا تھا۔ اس نے اپنا فون نمبر وغیرہ بھی دے دیا تھا۔

نوجوان کے شناختی کارڈ سے اس کے گھر کا پتہ بھی چلا تھا اور اس کے بعد مزید چھان بین ہونے لگی یہ

سارے کام ہو رہے تھے۔

"آپ کون ہیں؟" ایک ڈاکٹر نے نعمت علی سے سوال کیا۔

"میں بھی راہ گیر ہی ہوں۔"

"براہ کرم اب آپ جائیے۔ یہ مر چکا ہے، باقی کارروائی پولیس خود کرے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" نعمت علی بولا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"تم اس شناختی کارڈ پر اس لڑکے کے گھر کا پتہ وغیرہ دیکھو۔"

"مم...... مگر شناختی کارڈ۔"

"یہ لو......" ایک کارڈ ہوا میں تیرتا ہوا نعمت علی کے پاس پہنچ گیا۔ نعمت علی سمجھ گیا تھا کہ یہ خیر الدین کا کام ہے۔ اس کے لیے یہ کارڈ حاصل کر لینا کون سا مشکل کام ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے کارڈ لے کر پتہ دیکھا۔ جس پر نوجوان کا نام اور تصویر وغیرہ تھی۔ نوجوان کا نام محسن علی تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے گھر کا پتہ وغیرہ لکھا ہوا تھا۔"

"بس ٹھیک ہے۔ یہ پتہ ذہن نشین کر لو۔ یہاں پر کوئی فائدہ نہیں اس کے گھر چلتے ہیں ذرا دیکھیں کہ اس کے گھر کی کیا کیفیت ہے۔"

"لیکن ہم وہاں جا کر کیا کریں گے؟" نعمت علی نے کہا۔

"یار اب بھی یہ سوال کر رہے ہو۔ ہم کس لیے یہاں آئے ہیں اور کس طرح ہمیں ایک شخصیت مل گئی ہے۔"

"دیکھتے ہیں...... دیکھتے ہیں...... ٹھیک کہہ رہے ہو۔" نعمت علی جلدی سے بولا۔ اور اس کے بعد اس نے کہا۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ......"

"آؤ...... آؤ...... یار آؤ...... بہت سارے سوال تم ایک ساتھ ہی کر ڈالتے ہو۔"

"جو حکم استاد محترم، معافی چاہتا ہوں۔ ابھی تو زیر تربیت ہوں۔ آپ جس طرح بھی چاہو گے۔ اس طرح سے کروں گا۔" نعمت علی نے کہا اور پھر بولا۔

"کڑیل نوجوان اور خوبصورت بھی تھا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔"

"ہاں...... دیکھتے ہیں......" یہ کہہ کر وہ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ جس محلے کا پتہ شناختی کارڈ میں لکھا ہوا تھا۔ وہ ایک سادہ سی آبادی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ایک مکان کے دروازے پر وہ نمبر لکھا ہوا تھا جو شناختی کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ اندر پہنچ گئے۔ اندر انہوں نے ایک عمر رسیدہ خاتون کو دیکھا جو بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ غالباً وہ بیمار تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک نوجوان اور خوبصورت سی لڑکی بھی تھی۔ جو باورچی خانے میں گیلی لکڑیاں جلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ گھر بہت خستہ حالت میں تھا۔ اور صاف پتا چلتا تھا کہ کسی بے روزگار انسان کا گھر ہے۔ نعمت علی نے آہستہ سے کہا۔

"استاد محترم یہ ہم اندر کیسے گھس آئے......؟"

"میرے ساتھ جو کوئی بھی عمل کرو گے وہ صیغہ راز میں رہے گا۔ کسی بات پر حیرت کا اظہار مت کیا کرو۔ تم ان لوگوں میں سے کسی کو نظر نہیں آ رہے۔ کیونکہ اس وقت میں تمہارے وجود میں داخل ہو چکا ہوں اور میرا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔"

"مگر ایک بات بتایئے استاد محترم، ویسے تو آپ کسی ہیولے کی شکل میں میرے ساتھ ہوتے ہیں۔"

"ہاں...... درست سوال ہے تمہارا۔ غالباً تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ اگر میں زندگی سے دور بھی ہو گیا ہوں تب بھی میرا استخوانی ڈھانچہ تمہاری آنکھوں کے سامنے آنا چاہیے۔ لیکن میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے زندگی میں پراسرار علوم سیکھے ہیں بہت سے علوم میرے اب بھی کام آ سکتے ہیں۔"

"اوہ......" نعمت علی نے کہا۔

''اس وقت اس نوجوان کی موت کا دکھ اس کے دل و دماغ پر سوار تھا۔ لیکن یہ سن کر کے اس وقت وہ نظر نہ آنے والا انسان بنا ہوا ہے۔ اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پولیس کے دو جوان وہاں پہنچ گئے۔ کسی نے دستک دی تو باورچی خانے سے لکڑیاں سلگانے کی ناکام کوشش کرنے والی لڑکی جس کا چہرہ دھوئیں سے زرد ہو گیا تھا۔ باورچی خانے کے دروازے سے باہر نکلی اور اس نے باورچی خانے کا دروازہ کھول کر سامنے دیکھا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئی تھی۔

''محسن علی اسی گھر میں رہتے ہیں۔''

''جی...... جی...... جی ہاں...... کیوں کیا بات ہے...... خیریت......؟''

''بی بی...... آپ کو اسپتال چلنا ہوگا۔ محسن علی کو چوٹ لگ گئی ہے۔ ہم اسپتال سے آئے ہیں۔''

''چوٹ لگ گئی ہے بھائی کو، وہ اسپتال میں ہیں۔ چوٹ زیادہ لگی ہے...... اماں بھائی کو چوٹ لگ گئی ہے۔''

''کون ہے...... نائلہ......؟'' عمر رسیدہ خاتون بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

''اماں اسپتال سے کوئی آیا ہے۔ پولیس والے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ بھائی کو چوٹ لگ گئی ہے۔ دوسرے لمحے عمر رسیدہ عورت بھی دروازے پر آ گئیں اور پھر انہوں نے پولیس والوں سے بہت سے سوالات کیے۔ پولیس والے نرم دل اور رحم دل تھے۔ انہوں نے بڑی تسلی سے بزرگ خاتون کو ان کے بیٹے کے بارے میں بتایا جسے چوٹ لگ گئی تھی۔ غالباً اسپتال سے منع کر دیا گیا تھا کہ فوراً ہی کسی کو موت کی اطلاع نہ دی جائے۔

''ہائے میرے مولا ...... اب کیا کریں، نائلہ...... نائلہ بیٹی، نائلہ ذرا الیاس ماموں کو بلا لو...... ان کے ساتھ اسپتال چلی جاؤ۔'' الیاس ماموں غالباً پڑوسی تھے۔ نائلہ ان کے گھر گئی تو وہ فوراً ہی باہر آ گئے۔

''آؤ...... بیٹا میں تمہیں لے کر چلتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ اور اندر سے موٹر سائیکل نکال لائے۔

پولیس والوں نے کہا۔

''ہم چلتے ہیں صاحب، آپ اسپتال کا نام اور جگہ نوٹ کر لیجیے اور وہاں پہنچ جائیے۔'' پولیس والوں کے پاس بھی موٹر بائیک تھی۔

''بھائی آپ ہمارے ساتھ ہی چلو۔'' الیاس صاحب نے پولیس والوں سے کہا۔

''نہیں ہمیں کہیں اور جانا ہے۔'' دونوں پولیس والے چلے گئے۔ تب نعمت علی نے کہا۔

''جی استاد محترم کیا حکم ہے۔''

''ایک منٹ رکو، وہ اسپتال جا کر صورتحال تو پتا چلا ہی لیں گے اور اس کے بعد اس گھرانے پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا تاں کہ جہاں کہیں کسی دکھی انسان کو دیکھیں گے وہاں اس کے لیے جو کچھ بھی کر سکیں گے کرنے کی کوشش کریں گے۔ آؤ ذرا یہاں کی صورتحال معلوم کی جائے۔'' خیر الدین خیری نے کہا۔ اور نعمت علی نے گردن ہلا دی۔

بہرحال پڑوس کی کچھ عورتیں۔ اس گھر میں آ گئی تھیں۔ ان کی تعداد چار پانچ کے قریب تھی اور پھر وہیں باتیں شروع ہو گئیں جن کی توقع کی جا سکتی تھی۔ نعمت علی اور خیر الدین خیری کو محسن علی کے گھرانے کے بارے میں معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ غربت زدہ گھرانہ تھا۔ محسن علی کئی سال سے بے روزگار تھا۔ نوکری نہیں مل رہی تھی۔ ماں اور بہن کی کفالت کے لیے اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ غربت و افلاس زندگی کے ساتھی بنے ہوئے تھے۔ غم کی ایک کہانی تھی۔ جوان لوگوں سے وابستہ تھی۔

محسن علی کی والدہ بیمار تھی۔ لیکن اس وقت وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑے ہوئے ایک ہی دعا کر رہی تھی۔

''الٰہی میری مدد کر مجھے میرے بچے کی زندگی دے دے اسے تندرست کر دے۔'' ایک ماں کی یہ آہ و زاری نعمت علی کی آنکھوں میں آنسو لے آئی۔ اور اس کی آنکھوں سے نامحسوس آنسو ٹپکنے لگے۔ کچھ قطرے اس کے نادیدہ جسم پر بھی گرے تھے۔ تو اسے احساس ہوا کہ خیر الدین خیری بھی رو رہا ہے۔ دونوں کے دونوں بری طرح غم کا شکار تھے۔ خیر الدین خیری نے نعمت علی کے کان میں سرگوشی کی۔

''بس ابھی تھوڑی دیر کے بعد اس بوڑھی عورت پر غم کے پہاڑ ٹوٹنے والے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا۔ اس کے تو تصور میں بھی نہیں ہوگا۔''

''ہم کیا کریں؟''

''بیٹھو نعمت علی۔ ہمیں کچھ راستے ملے ہیں۔ انہی راستوں سے ہم اپنے نئے سفر کا آغاز کریں گے۔''

تھوڑی دیر کے بعد الیاس خان واپس آیا۔ اور اس نے آ کر یہ اطلاع دی کہ حادثے میں محسن علی زندہ نہیں رہ سکا ہے۔ ماں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ پڑوسی عورتیں رونے پیٹنے لگیں۔ ان لوگوں کا دل بری طرح دکھ رہا تھا۔ انسان کسی بھی حالت میں ہو۔ بہرحال انسانی دکھوں سے متاثر ہوتا ہے۔ حالانکہ نعمت علی ایک لاابالی نوجوان تھا۔ لیکن بہرحال اب زندگی کے ان واقعات سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ تو اسے احساس ہو رہا تھا کہ دنیاوی دکھ کیا چیز ہوتے ہیں۔

محلے کے افراد اسپتال چل پڑے تھے۔

اسپتال کی کارروائیوں میں ظاہر ہے۔ مرنے والے کی ایک بہن اور وہ بھی ایک نوجوان لڑکی جو خالص گھریلو لڑکی تھی کیا کر سکتی تھی۔ چنانچہ محلے ہی کے ایک صاحب نائلہ کو گھر واپس لے آئے۔ لاش ملنے میں ابھی دیر تھی اور پڑوس کے لوگ ضروری کارروائیاں کر رہے تھے۔ پھر اسی وقت دن کے تقریباً پونے تین بجے تھے جب لاش اسپتال سے لائی گئی پڑوسی بھی شدید غم کا شکار تھے۔ اس وقت انہیں ایک ماں نظر آ رہی تھی۔ اور جو حسرت اور کیفیت نعمت علی اس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے دیوانہ کر دیا۔ اس کے دماغ میں تاریکیاں سی پھیل گئیں۔

دنیا کس قدر دکھوں کا شکار ہے۔ اس سے پہلے تو کبھی یہ بات معلوم ہی نہیں تھی۔ نائلہ کی چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں اور نعمت علی سکتے کے عالم میں اس لاش کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی خیر الدین خیری کی آواز ابھری۔

''نعمت علی ایک بات کہوں؟''

''جی...... استاد محترم'' نعمت علی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''ہمیں انسانوں کی مدد کرنی ہے ناں......؟ کیا کہتے ہو......؟''

''جی استاد محترم۔''

''کسی مردے کو زندہ کرنا کوئی انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ لیکن ایک کام بخوبی کیا جا سکتا ہے۔''

''وہ کیا استاد محترم؟''

''ایک ایسا عمل جسے کر کے ان لوگوں کے آنسو خشک کیے جا سکتے ہیں۔''

''مجھے بتائیے تو سہی۔''

''ہم بآسانی اس مردہ جسم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ایک عمل کرنا ہوگا بس اور اس کے بعد یہ شخص اٹھ کر بیٹھ جائے گا۔ لیکن یہ محسن علی نہیں ہوگا۔ بلکہ تم ہو گے نعمت علی۔ کیا سمجھے۔ تم اس وقت ایک نظر نہ آنے والے وجود کی شکل میں ہو۔ بآسانی ہم اس کے قالب میں داخل ہو کر اسے متحرک کر سکتے ہیں۔ ایسا بے شک عارضی طور پر ہوگا۔ لیکن میرا علم اس عمل کو کر سکتا ہے۔'' نعمت علی کی سمجھ میں تو بات ہی نہیں آئی تھی۔ جب بات اس کی سمجھ میں آئی تو وہ دنگ رہ گیا۔

''استاد محترم......''

''ہاں...... خیر الدین کا علم یہ کام کر سکتا ہے۔''

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوگی۔ بعد میں ہم دیکھ لیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔'' نعمت علی نے اس بات پر آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔ گھر والوں کو پانچ سو روپے روز ملتے رہیں گے اور کوئی مشکل بھی نہیں ہوگی۔ یہ عجیب و غریب شخصیت اس کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ تو کیوں نہ زندگی کے انوکھے تجربات کیے جائیں۔ وہ لوگ محسن علی کی لاش کو دیکھنے لگے۔ اسے نہلا دھلا لیا گیا تھا۔ ایک طرف ایک کرسی پر عمر رسیدہ خاتون بیٹھی ہوئی

تھیں۔ ادھر نائلہ درد بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”بھائی وعدہ خلافی کر ڈالی ناں..... تم تو کہتے تھے کہ نائلہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ بولا ناں جھوٹ ہم سے۔ دیکھ لو ہمیں بے آسرا چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ اچھا تو نہیں کیا تم نے بھائی۔“ نعمت علی بے اختیار ہو گیا۔ اس نے کہا۔

”استاد محترم اس سے زیادہ میں نہیں سن سکتا خدا کے لیے آپ اپنا عمل کیجیے۔“ خیرالدین خیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نعمت علی کو تو یہ سن کر ہی حیرت ہوئی تھی کہ اس وقت خیرالدین خیری اس کے وجود میں ہے اور کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا۔ اسی وقت اسے محسوس ہوا جیسے اس کا جسم ہلکا ہوتا چلا جا رہا ہو اور یہ کیفیت تھوڑی دیر تک رہی اور اس کے بعد اسے اپنے چاروں طرف ایک عجیب سی تاریکی کا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک بند کمرے میں آ گیا ہو۔ یہ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا۔ اور اس کے بعد اسے وہ کرنا تھا۔ جس سے کسی کو کوئی غلط احساس نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس نے ایک کراہ کے ساتھ کروٹ بدلی۔ اور بے شمار خواتین جو رو پیٹ رہی تھیں۔ اچانک ہی وہاں سے حیرانی سے پیچھے ہٹ گئیں۔ ایک عجیب سی بھگدڑ مچ گئی۔ طرح طرح کی باتیں کی جا رہی تھیں۔

”دیکھو! وہ ہل رہا ہے قسم لے لو..... اس نے منہ سے آواز نکالی ہے۔“

”ارے ہاں..... دیکھو..... دیکھو ذرا بلاؤ شیخ صاحب کو.....“ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن سچی محبتوں کا انداز ہی مختلف ہوتا ہے۔ نائلہ آگے بڑھی اور بھائی سے لپٹ گئی۔

”زندہ ہو تم بھیا..... زندہ ہو..... میرے بھائی..... میرے بھائی تم زندہ ہو، اماں سن لی اللہ نے ہماری۔ اماں بھائی زندہ ہیں۔ اماں بھائی زندہ ہیں۔“ نائلہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ ماں کی دل دوز چیخ بھی سنائی دی تھی اور وہ بیمار عورت اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹے پر جھپٹ پڑی تھی۔

نعمت علی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا سمجھ لیا تھا۔ آپ لوگوں نے اور یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں ارے باپ رے باپ مجھے اپنی بے ہوشی تو یاد ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ نہیں پتا مجھے۔“ نعمت علی اپنی دانست میں بہت اچھی اداکاری کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں خیرالدین خیری کا احترام اور بڑھ گیا تھا۔ جس نے ساری مشکلیں حل کر دی تھیں۔ انسانی جذبے بہر طور ایک حیثیت رکھتے ہیں اس گھرانے کو آج تو عارضی طور پر خوشی مل گئی تھی۔ مگر نعمت علی یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کبھی نہ کبھی تو ان لوگوں کو ان سارے معاملات کا پتا چل ہی جائے گا۔ یہ سب خوشیوں کا جھولا جھول رہے تھے۔ پڑوسی بھی خوش تھے۔ خوب مبارک بادیں دی گئیں تھیں۔ ایک دو پڑوسیوں کے گھر سے مٹھائی بھی آئی تھی۔

پھر رات کا کھانا کھایا گیا اور اس کے بعد آرام کی ٹھانی گئی۔ تھوڑی بہت تفصیلات بتائی گئیں اور پھر سب کے سب سونے چلے گئے۔ نائلہ بھائی پر نثار ہوئی جا رہی تھی۔ یہ تمام ساری چیزیں بڑی حیثیت رکھتی تھیں۔ رات کو جب خود نعمت علی سونے کے لیے گیا تو اس نے بڑے احترام کے ساتھ آواز دی۔

”استاد محترم کیا حکم ہے اب؟“

”ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ نعمت علی یہ بتاؤ۔ کہ تمہارے اپنے دل میں کیا ہے؟“

”استاد محترم یہ بات تو میں نہیں جانتا۔ آپ کو پتا ہے کہ میں نے زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا۔ جو بہت بڑی حیثیت کا حامل ہو۔ آپ بتائیے کہ کیا کرنا چاہیے۔“

”تم خوش ہو۔ اس کام سے.....؟“

”ایسا ویسا خوش ہوں۔ کسی کے کام آنا تو بہت بڑی بات ہے اور پھر جس طرح اس نیم مردہ خاندان کو نئی زندگی ملی ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو کبھی اس حقیقت سے آگاہ نہ کروں کہ ان کا اپنا بیٹا اور بھائی

اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

”ہاں..... لیکن بہرحال ہمیں اس کے قالب سے نکل کر جانا ہوگا۔ بہت زیادہ وقت تو نہیں دیا جا سکتا۔“ خیرالدین خیری نے کہا۔

”کچھ سوچتے ہیں..... کچھ سوچا جائے۔“ نعمت علی بولا۔ اور بہت دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر اچانک ہی نعمت علی نے چونک کر کہا۔

”ایک بات تو بتائیے ماموں۔“

”ہاں..... بولو..... کیا.....؟“

”مجھے اپنے گھر بھی جانا ہوگا۔ اس کے لیے کیا کیا جائے۔ اس کے علاوہ یہاں ان لوگوں کو بھی مطمئن کرنا ہوگا۔“

”اتفاق ہے۔ اس وقت میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے۔“

”کیا.....؟“

”آج کی رات تو یہیں گزاری جائے یہ تو مجبوری ہے۔ لیکن کل صبح تم یہاں سے نکلو..... نائلہ اور محسن علی کی والدہ سے یہی کہو کہ تم کام کے سلسلے میں جا رہے ہو..... اور کسی ملازمت کے بارے میں تمہاری بات چیت چل رہی ہے۔ وہ لوگ تمہیں ایڈوانس رقم دینے کے لیے تیار ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میرا اپنا کیا ہوگا؟“

”نہیں کچھ نہیں..... میں تمہیں قبرستان لے کر چلوں گا۔ وہاں میری قبر خالی ہے۔ محسن علی کے مردہ جسم کو وہاں قبر میں لٹا دیں گے تم..... تم اپنے جسم میں اپنے گھر چلے جانا۔ باقی سب خیریت ہے۔ ہمیں جب بھی محسن علی کے گھر آنا ہوگا۔ اس کے جسم میں داخل ہو کر اس کے گھر آ جایا کریں گے۔“

”قبر میں لیٹ کر اس کا جسم ضائع تو نہیں ہو جائے گا۔“

”نہیں جب تک کوئی مناسب فیصلہ نہ کر لیا جائے۔ اس کے جسم کو تازہ رکھنے کے لیے ان تمام ضروریات کو پورا کیا جائے گا جو جسموں کو جلا بخشتی ہیں۔“

بہرحال نعمت علی کے لیے یہ ایک نہایت دلچسپ تجربہ تھا۔ دوسرے دن اس نے نائلہ اور محسن علی کی والدہ کے ساتھ ناشتا وغیرہ کیا۔ پھر بولا۔

”اب مجھے چلنا ہے۔ اماں ذرا کوشش کر رہا ہوں نوکری کے لیے۔ اللہ نے چاہا تو کوئی بہت ہی بہتر نتیجہ نکلنے والا ہے۔“

”بیٹا کل کے حادثے سے میں تو بری طرح ڈر گئی ہوں۔ ذرا اپنا خیال رکھنا۔“

”آپ دعائیں کرتی رہا کریں اماں، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہی رہے گا۔ پھر بھی ماں نے بازو پر امام ضامن باندھا اور سینکڑوں دعائیں دینے کے بعد نعمت علی کو گھر سے رخصت کیا گیا۔ یہاں سے وہ سیدھا قبرستان پہنچا اندازے کے مطابق خیرالدین خیری اس کے ساتھ تھا۔ پھر بہت ہی دلچسپ صورت حال پیش آئی۔ کسی زندہ انسان کے لیے کسی خالی قبر میں جا کر لیٹنا بڑا انوکھا تجربہ تھا۔ یہ تجربہ بھی نعمت علی کو ہوا۔ اور جب وہ محسن علی کے مردہ جسم کو قبر میں چھوڑ کر واپس آیا۔ تو اپنے جسم میں تھا۔

”ماموں تم نے تو مجھے نجانے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔“

”مزہ نہیں آ رہا۔“

”بہت..... اور سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ ہم نے کسی کام کا آغاز ایک نیک کام سے کیا ہے۔“

”مجھے بھی اس بات کی خوشی ہے۔ کہ میرا علم میری موت کے بعد بھی میرے کام آیا ہے۔“ خیرالدین خیری نے کہا۔ ”اب چلو اپنے گھر چلو..... وہاں کے معاملات دیکھو۔ یہاں خوشیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ مدد علی اور آسیہ بیگم کی تو شخصیت ہی بدل گئی تھی۔ دونوں کے دونوں بہت مسرور تھے۔ غالباً صبح ہی صبح پانچ سو روپے کا نوٹ پھر تکیے کے نیچے سے مل گیا تھا۔ نعمت علی کو دیکھ کر مدد علی نے کہا۔

”بیٹا رات کو کہاں چلے گئے تھے؟“

”بس ابا جو وظیفہ آپ نے مجھے بتایا تھا۔ اس کی

شکل ہی بدل گئی ہے۔ اب ذرا مجھے مصروف رہنا پڑے گا۔"

"بیٹا اپنا خیال رکھنا کوئی دقت تو نہیں ہوتی ہے۔ اس وظیفے میں؟"

"نہیں ابا کوئی خاص نہیں۔" گھر والوں کو مطمئن کرنے کے بعد نعمت علی گھر سے باہر نکل آیا۔ اور بولا۔

"استادِ محترم۔"

"ہاں..... ہاں موجود ہوں..... موجود ہوں۔"

"اب کیا کریں.....؟"

"سوچتے ہیں کچھ سوچتے ہیں اور اس کے بعد خیرالدین خیری اور نعمت علی ایک ویران سے علاقے میں جا کر بیٹھ گئے۔

"کیا خیال ہے ماموں..... محسن علی کے جسم کو قبر سے نکال لیا جائے۔"

"ہاں..... گھر والوں کو تو تم نے اب مطمئن کر ہی دیا ہے۔" بہر حال یہ سارا سلسلہ بڑی عمدگی کیساتھ چل رہا تھا۔ گھر کے حالات کا بھی اچھی طرح اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ پھر نعمت علی نے کہا۔

"اب میرے خیال میں اس ڈرامے کا ڈراپ سین کر دینا چاہیے۔ میں نے کچھ باتیں سوچی ہیں۔"

"کیا مجھے بتاؤ۔"

"میں نے اچھی خاصی رقم ان لوگوں کو لے جا کر دی ہے۔ اور کہا ہے کہ مجھے یہ رقم ایک کمپنی نے ایڈوانس دی ہے۔"

"ہاں وہ تو میرے دل میں ہے۔"

"میں یہ کہے دیتا ہوں۔ ماموں۔ کہ مجھے ملک سے باہر ایک نوکری مل رہی ہے۔ میں ملک سے باہر چلا جاؤں گا اور کافی عرصے کے لیے ان لوگوں سے دور ہو جاؤں گا۔ نائلہ اور اماں سے کہے دیتا ہوں کہ وہ اس رقم سے فائدہ اٹھائیں۔ انہیں باقاعدہ رقم ملتی رہے گی۔"

"ویری گڈ..... ویری گڈ..... اچھا آئیڈیا ہے یہ کام کر کے کل خلاصی حاصل کر لو۔ کسی بینک میں ایک خاصی بڑی رقم جمع کر دو اور انہیں ہدایت کر دو کہ مہینے کی پہلی تاریخ کو وہ رقم ان لوگوں کو دے دی جائے۔"

"ہم خیال رکھیں گے اگر کسی اور کا بھی کوئی ایسا مسئلہ سامنے آیا تو تم جانتے ہو کہ دولت کا حصول اب کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" نعمت علی نے جب محسن علی کی حیثیت سے ماں اور بہن کو یہ بتایا کہ اسے بیرون ملک جانا ہے۔ تو دونوں خوب روئیں۔

"بھائی ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ نوکری تم یہیں کر لو۔"

"نہیں بیٹا..... ابھی کچھ عرصے کے لیے تو باہر جانا ہی پڑے گا۔ ویسے میں چوتھے پانچویں مہینے آجایا کروں گا۔ تم لوگوں سے ملاقات بھی ہو جایا کرے گی۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ تمہارے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھلوا دیا گیا ہے۔ میں ملازمت کروں گا۔ وہاں سے رقم تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتی رہے گی۔ تم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو گھر کی ضروریات کے لیے چیک لکھ کر بینک سے رقم لے لیا کرو۔ غرض یہ کہ یہاں کا معاملہ اس طرح طے ہو گیا۔ اس کے بعد نعمت علی خیرالدین خیری کے ساتھ شہر گردی کرنے لگا۔ انہیں اب کسی نئے مسئلے کی تلاش تھی۔ یہ نیا مسئلہ براہ راست نعمت علی تک تو نہیں آیا بلکہ اس سلسلے میں مددعلی صاحب ہی کو ایک انوکھے تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔

مددعلی صاحب کی عزت و شہرت تو آسمان تک پہنچ چکی تھی۔ محلے کے لوگ ان گھر کے سامنے سے گزرتے تو گردن جھکا کر گزرتے۔ مددعلی صاحب کو ایک بہت بڑے بزرگ کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ گھر کے اندر کی تو خیر، خیر تھی۔ لیکن باہر کی صفائی بھی محلے والے ہی کر دیا کرتے تھے۔ اور کوئی ایسا کام نہیں ہوتا تھا۔ جو مددعلی صاحب کو خود کرنا پڑتا۔ پڑوس کی عورتیں گھر میں آجاتیں اور آنے کے بعد گھر کی صفائی وغیرہ کرتیں۔ کھانے پینے کی چیزیں محلے سے آجاتی تھیں

اور جب مددعلی نے پڑوسیوں کو منع کیا کہ بھائی میں تو آپ کا وہی قدیم پڑوسی ہوں۔ آپ کے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں۔ آپ یہ کام نہ کیا کریں تو مہربانی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ میرا رزق مجھے آسانی سے پہنچا رہا ہے۔ تو پڑوسیوں نے عاجزی سے کہا تھا۔

"نہیں..... مددعلی صاحب آپ تو سچ بات یہ ہے کہ ہمارے محلے کے لیے باعث رحمت ہیں۔ آپ کی برکت سے تو ہم پر سے..... مصیبتیں ٹل گئیں ہم تو اس بات پر شرمندہ ہیں کہ اس سے پہلے ہمیں آپ کے بارے میں معلوم کیوں نہیں ہو سکا۔ جو ہم آپ کی خدمت اسی طرح کیا کرتے۔

"غرض یہ کہ بڑی اچھی زندگی گزر رہی تھی۔ نعمت علی اپنے کام میں مصروف تھا۔ گھر کے معاملات اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ ادھر محسن علی کے گھر میں اس نے وہ سارے کام کر دیئے تھے اور اب اس کے بعد یہ بات بھی طے کر لی گئی تھی کہ وہیں بے چارے محسن علی کی قبر کرا دی جائے اور اسے آخری آرام گاہ مہیا کر دی جائے۔ اس کے لیے بھی تھوڑا سا ڈرامہ بہت ضرور تھا۔ وہ یہ کہ محسن علی کی بیرون ملک روانگی کا کھیل کھیل لیا جائے اور ایک دن یہ کام بھی کر لیا گیا۔ محسن علی اپنے گھر سے رخصت ہو گیا اور محلے والوں نے اسے آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ نعمت علی نے چلتے وقت پڑوسیوں سے کہا تھا۔

"آپ لوگ میری بہن اور ماں کا پورا پورا خیال رکھیے گا۔ ان لوگوں کے لیے اخراجات کا مسئلہ اللہ تعالیٰ نے خود حل کر دیا ہے اس میں انہیں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ باقی کوشش میں یہ بھی کروں گا کہ جیسے ہی مجھے وہاں سے چھٹی ملے آجایا کروں۔ حالانکہ یہ کام بہت مشکل تھا۔" محسن علی کے جسم کی تدفین کے بعد تو یہ کسی طور ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن تسلی دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ دنیا اپنے معاملات خود نمٹتی ہے۔ وقت یقینی طور پر ان لوگوں کی بھی مدد کرے گا۔ ان تمام کاموں سے فراغت کے بعد وہ یہ ہی سوچ رہے تھے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے

اکثر قبرستان میں دوسرے مکینوں کے ساتھ بیٹھ کر ساری صورتحال حل ہو جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ان کی ملاقات پہلی بار محسن علی سے بھی ہوئی تھی۔ محسن علی کی روح نے بھی ان کی اس سبھا میں شرکت کی تھی۔ اور اس کے بعد محسن علی نے بڑی نیاز مندی سے کہا تھا۔

"زندگی موت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ نعمت علی بھائی، سارے واقعات مجھے معلوم ہو چکے ہیں۔ آپ نے جس طرح میری ماں اور بہن کی مدد کی ہے۔ اب میں کیا کہوں..... روز قیامت اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا صلہ دے گا۔ آپ نے بڑا نیک کام کیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔ محسن علی سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہی ہوتا ہے۔ میں بھلا کس قابل ہوں۔"

پھر ایک دن ایک نئے اور دلچسپ سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ محلے کے ایک صاحب تھے۔ داؤد خان، داؤد خان ایک بہت بڑی فرم میں کام کرتے تھے اور وہاں باقاعدہ اکاؤنٹینٹ تھے اور وہاں فرم کے مالک کو کچھ مشکلات درپیش تھیں۔ وہ بہت دن سے پریشانیوں کا شکار تھے۔ کسی طرح داؤد خان کو ان کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ اور داؤد خان نے ان سے کہا کہ "ان کے پڑوس میں ایک ایسے بزرگ رہتے ہیں جو بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔" اور داؤد خان نے انہیں چوہوں والی تفصیل بتائی تھی۔

عنایت بیگ نے یہ ساری تفصیل سنی اور دم بخود رہ گئے۔

"اگر آپ جھوٹ نہیں بول رہے ہیں داؤد خان تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو فوری طور پر مجھے ان بزرگ سے ملوانا چاہیے۔"

"جب..... آپ پسند کریں۔ میں ان سے بات کر لوں۔"

"آپ فوری طور پر بات کریں۔ بلکہ اگر چاہیں تو براہ راست مجھے لے چلیں۔"

"نہیں میں پہلے ان سے بات کیے لیتا ہوں۔"

داؤد خان نے کہا۔ اس کے بعد وہ مدد علی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس وقت نعمت علی بھی مدد علی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ داؤد خان نے بڑے احترام کے ساتھ مدد علی کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور بولا۔

"مرشد! ایک بہت ضروری کام سے آپ کی خدمت میں حاضری دی ہے۔"

"بھائی ہم نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ہم آپ کے وہی قریبی پڑوسی ہیں۔ یہ مرشد وغیرہ کا لفظ جو ہے ناں...... یہ تو ہمیں گناہ گار ہی کرے گا۔ ہم سے صرف مدد علی کہہ کر بات کریں۔"

"ہر بڑا آدمی ایسا ہی انکسار پسند ہوتا ہے۔ مدد علی بھائی، میں ایک فرم میں ملازمت کرتا ہوں۔ اس فرم کے مالک سمجھ لیں یا جنرل منیجر سمجھ لیں مرزا عنایت بیگ ہیں یہاں سے دور ایک چھوٹے سے قصبے میں ان کا قیام ہے۔ وہیں ان کے اہل خاندان رہتے ہیں۔ فرم کے اصل مالک کا نام دلاور شاہ ہے۔ دلاور شاہ بھی رنگ نگر میں رہتے ہیں۔ رنگ نگر اس قصبے کا نام ہے۔ جس کا تذکرہ میں آپ سے کر رہا ہوں۔ یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے۔ کوئی چھ گھنٹے کا سفر ہے۔ ریل کے ذریعے بہر حال رنگ نگر میں دلاور شاہ ایک مشکل کا شکار ہیں اور وہ اس سلسلے میں آپ کی مدد چاہتے ہیں۔"

"مشکل کیا ہے؟"

"کوئی آسیبی چکر ہے جو ابھی تک بھرپور طریقے سے سمجھ میں نہیں آیا۔ مدد علی بھائی میں نے کچھ زیادہ تعریفیں کر دیں ہیں آپ کی بس یوں سمجھ لیں کہ میری عزت کا معاملہ ہے۔"

"ارے بھائی داؤد خان کہاں ان حماقتوں میں پڑ گئے ہم خاموشی سے اللہ کی یاد میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ہمارے حال میں رہنے دو ہم کسی آسیب وغیرہ کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتے۔"

اسی وقت خیر الدین خیری کی آواز نعمت علی کے کانوں میں ابھری۔

"بات کرو...... بات کرو...... کرنا ہے کام کرنا ہے۔" نعمت علی جلدی سے سنبھل کر بولا۔

"ابا جی...... انسانوں کی مدد کرنا تو انسانوں کا فرض ہے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے۔ وہ انسانوں کی بھلائی ہی میں صرف ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں آپ کو یہ کام کر لینا چاہیے۔" مدد علی نے نعمت علی کی طرف دیکھا تو نعمت علی جلدی سے بولا۔

"آپ مجھے وہاں بھیج دیں ابا جی، آپ کی دعائیں شامل حال رہیں اور اللہ کی مدد رہی تو میں ان صاحب کی مدد کر سکوں گا۔ جن کا نام ابھی داؤد صاحب نے لیا ہے۔" مدد علی نے بیٹے کی طرف دیکھا تو نعمت علی نے کہا۔

"ہاں...... ابا جی میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اپنی دعاؤں کے ساتھ روانہ کیجیے۔"

"ٹھیک ہے...... داؤد خان صاحب اپنے مالک سے کہہ دیجیے کہ میں ان کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔" داؤد خان نے مدد علی کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ مدد علی نے کہا۔

"یہ تم نے کیا اپنے سر لگا لیا...... نعمت علی، کیا کر لو گے تم؟"

"ابا جی بس آپ کی دعائیں چاہئیں۔ مجھے آپ اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیجیے اللہ کا حکم ہوا تو میں سب ٹھیک کر لوں گا اور آپ کا نام روشن کروں گا۔ اب جب آپ نے مجھے اتنی محنت سے علم دیا ہے۔ تو اس کا استعمال بھی انسانوں کی بھلائی کے لیے ہونا ہی چاہیے۔"

"اللہ تمہاری مدد کرے بیٹا، میں تو حیران ہوں، میں نے تو ساری زندگی چلے وظیفے کیے ہیں مگر بس گزارہ ہی کیا ہے۔ چلو ٹھیک ہے۔ اللہ جسے علم دے۔" مدد علی کی طرف سے اجازت مل گئی، باقی سارے انتظامات کیے گئے اور اس کے بعد نعمت علی کا تعارف عنایت بیگ سے کرایا گیا۔ عنایت بیگ نے کہا کہ وہ رنگ نگر چلے جاتے ہیں۔ وہاں جا کر وہ سارے انتظامات کیے لیتے ہیں۔ جبکہ نعمت علی ٹرین سے بیٹھ کر رنگ نگر پہنچ جائے۔ عنایت بیگ نے اسے پیشکش کی کہ جتنے بھی اخراجات

ہوں گے وہ پائی پائی خرچ کریں گے۔"

"اس کی آپ پرواہ نہ کریں اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔" عنایت بیگ اس کے ان الفاظ سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ جن لوگوں پر اللہ کی نگاہ ہوتی ہے۔ وہ دولت کے لالچی نہیں ہوتے۔" بہر حال بات ختم ہو گئی۔

عنایت بیگ نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ یہ دو دن کے بعد رنگ نگر آ جائیں۔ نعمت علی نے خیر الدین خیری سے مشورہ کیا تو خیر الدین خیری نے کہا۔

"مزا آئے گا یار! میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم ایسے معاملات میں کافی دلچسپی لیں گے۔ جن میں آسیب وغیرہ کا چکر ہوگا۔ آخر میرے یہ علوم کس دن کام آئیں گے۔ جو میں نے سیکھے ہیں۔ مجھے تو زندگی نے زیادہ مہلت نہیں دی۔ لیکن تمہارے ذریعے میں اپنے سارے شوق پورے کروں گا۔"

"اب یہ پوچھنا تو بالکل بیکار ہے کہ تم میرے ساتھ ہی ہو گے ناں ماموں......؟"

"واقعی بالکل بیکار ہے۔ ایسے کبھی سوچنا بھی مت کہ میں ایسے کسی کام میں تمہیں اکیلا چھوڑ دوں گا۔"

"بہر حال سارے معاملات طے ہو گئے، مرزا عنایت بیگ رنگ نگر چلا گیا۔ اور یہ لوگ رنگ نگر جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ تیاریاں کیا بس ٹرین کے ذریعے ایک لمبا سفر کرنا تھا اور نعمت علی کو تو ان ساری چیزوں میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ زندگی کا طویل حصہ جس لاابالی اور آوارگی میں گزرا تھا۔ اب اس کا الٹا ہو رہا تھا وہ ایک ذمے دار آدمی بن چکا تھا۔ ٹرین کا سفر زندگی میں پہلی بار ہی کیا تھا۔ ٹرین برق رفتاری سے اپنا سفر طے کرنے لگی۔

قرب و جوار میں بہت سے مسافر موجود تھے۔ سب اپنی اپنی دھن میں مست تھے۔ نعمت علی نے خیر الدین کو پکارا۔

"استاد محترم۔"

"موجود ہوں...... موجود ہوں...... اور تمہارے دماغ میں جھانک رہا ہوں۔ ظاہر ہے۔ میں تمہارے ہی وجود میں پوشیدہ ہوں۔"

"یار مزہ آ رہا ہے۔ ماموں۔"

"ابھی تو آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔" خیر الدین خیری کی آواز نعمت علی کے کانوں میں ابھری اور نعمت علی خوشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ بہر طور ٹرین کا سفر ختم ہوا۔ جس وقت ٹرین رنگ نگر پہنچی سورج چھپ رہا تھا۔ ریلوے پلیٹ فارم پر زیادہ رش نہیں تھا۔ لوگ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ اسی وقت عنایت بیگ اس کے پاس پہنچ گیا۔

"آیئے، نعمت علی شاہ جی، رنگ نگر میرے آباؤ اجداد کی بستی ہے۔ میں یہاں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔" نعمت علی، عنایت بیگ کے ساتھ اس کی پرانی کار میں بیٹھ کر اس کے گھر پہنچ گیا۔ بالکل اجنبی جگہ تھی۔ لیکن عنایت بیگ نے ذرا بھی اسے اکیلے پن کا احساس نہ ہونے دیا۔ اس نے بہت عمدہ کھانا وغیرہ تیار کرایا تھا۔ عنایت بیگ نے بتایا کہ دلاور ان کی فرم میں یہ عہدہ سنبھالنے سے پہلے وہ نجانے کہاں کہاں سفر کر چکا ہے۔ اس نے دنیا کے بے شمار دشوار گزار حصوں میں اور انجان علاقوں میں سفر کیا تھا۔ اس کی زندگی کی داستان بڑی پر اسرار اور لرزہ خیز تھی۔ بہر حال اس نے بتایا۔

"اصل میں دلاور شاہ ایک انتہائی شوقین آدمی ہے۔ سیر و سیاحت کے دوران ہی اس سے میری ایک بار ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا تھا۔ پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا شوق بھی دنیا کی نایاب اور پر اسرار ترین چیزیں جمع کرنا ہے۔ اس نے خود ہی مجھے پیش کش کی تھی کہ میں اس کی فرم سنبھال لوں۔ اب اس کے بعد ہمارے درمیان یہ فرق نہیں ہے۔ کہ وہ مالک ہے اور میں اس کی فرم کا انتظامی امور کا ڈائریکٹر اصل چیز ہمارے درمیان دوستی ہے۔ بہر حال میں نے شاید تمہیں بتایا تھا۔ مسئلہ ایک عمارت کا ہے۔

"اصل میں عمارت میں دلاور شاہ کے ساتھ

ساتھ اس کا بھائی رحیم شاہ بھی رہتا ہے۔ وہ عمارت بظاہر کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ لیکن اس کی پر اسراریت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بہت پر اسرار عمارت ہے۔ صدیوں پرانی طرز تعمیر کا نمونہ لاتعداد کمرے، گیلریاں برآمدے اور غلام گردشیں وہاں موجود ہیں۔ لیکن اس کے بارے میں دلاور شاہ نے جو تفصیلات بتائی ہیں وہ بالکل ہی مختلف اہمیت کی حامل ہیں۔"

"کیا خاص بات ہے، ان میں؟" نعمت علی نے سوال کیا۔

"اب یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ نعمت علی اصل میں عمارت کے نیچے ایک اور عمارت بنی ہوئی ہے۔ یعنی تہہ خانہ اور اس تہہ خانے میں غالباً دلاور شاہ نے یہ سارا سامان جمع کر رکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس میں لاتعداد پرانے زمانے کے ہتھیار فرنیچر اور ایسی بے شمار اشیاء ہیں جو وہاں موجود ہیں، لیکن کوئی ایسی پر اسرار چیز بھی وہاں موجود ہے جو ناقابل فہم ہے۔"

"تو اب کیا ارادہ ہے۔ دلاور شاہ صاحب کا......؟"

"بس وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے باقی تفصیلات آپ کو انہی کی زبانی معلوم ہوں گی۔"

"تو پھر کب وہاں جانا ہے؟"

"بس نکلتے ہیں تھوڑی سی فراغت کے بعد۔" خیر الدین خیری نے کہا۔

"یار اس سے کہو...... جلدی کرے...... میرے ذہن میں بڑا تجسس پیدا ہو گیا ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں یہ کتنی دیر لگاتا ہے۔ اگر اس نے زیادہ دیر لگائی پھر میں اس سے اس بارے میں بات کروں گا۔" لیکن عنایت بیگ نے بھی شاید دلاور شاہ کو وقت دے دیا تھا۔ چنانچہ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو گیا۔ اور یہ لوگ کار میں بیٹھ کر چل پڑے، عنایت بیگ رنگ نگر کے بارے میں تفصیلات بتاتا جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"جب وہ عمارت تعمیر ہوئی ہو گی تو اس کے آس پاس آبادیاں ہوں گی لیکن اب وہ آبادیاں پتا نہیں کیوں ختم ہو گئی ہیں۔ ہمیں وہاں تک پہنچنے کے لیے تقریباً دو گھنٹے کا سفر طے کرنا پڑے گا۔ پھر مزید تھوڑا سا کچا سفر۔" نعمت علی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ خیر الدین خیری بھی خاموش رہا تھا۔

وہ سڑک زیادہ بری نہیں تھی۔ جس سے گزر کر عمارت کے آخری حصے تک پہنچا گیا تھا۔ ہاں اس کے بعد ایک ذیلی سڑک عمارت کی طرف جاتی تھی۔ اس علاقے کی جغرافیائی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ پھر...... نعمت علی نے دور سے اندھیرے میں لپٹی ہوئی اس کھنڈر نما عمارت کو دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جس جگہ وہ واقع تھی وہ کافی خطرناک اور پر اسرار جگہ کہی جا سکتی تھی۔ عمارت کو دور ہی سے دیکھ کر یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ بہت ہی عظیم الشان اور ہیبت ناک جگہ ہے۔

قریب پہنچ کر اس کی صورتحال مزید واضح ہو رہی تھی۔ بلند و بالا دیواریں نمی دھوپ اور ہوا کے باعث کالا رنگ اختیار کر چکی تھیں۔ جگہ جگہ سے اینٹیں ادھڑی ہوئی تھیں بدنما اور خستہ اینٹیں عجیب غریب شکلیں اختیار کر چکی تھیں۔ قرب و جوار میں ریت کے ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ جن پر ناگ پھنی کے پودے جا بجا نظر آ رہے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس علاقے میں سانپ بھی ضرور ہوں گے۔ بلکہ اگر غور سے زمین کو دیکھا جاتا تو ریت پر سانپوں کی لکیریں نمایاں نظر آتیں۔ عمارت کے دروازے پر روشنی ہو رہی تھی اور اس روشنی میں کچھ انسانی سائے صاف نظر آ رہے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ دور سے دیکھنے والے یقینی طور پر اس ماحول کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے۔

"عجیب و غریب جگہ ہے۔" نعمت علی نے متاثر لہجے میں کہا۔

"ہاں...... میں نے کہا تھا ناں کہ عمارت بڑی خوفناک لگتی ہے۔"

"یہ دروازے پر کون ہے؟"

"یقینی طور پر وہ لوگ تمہارا استقبال کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔" عنایت بیگ نے کہا۔ بہرحال

تھوڑی دیر کے بعد یہ اس عمارت کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اور دلاور شاہ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ دلاور شاہ کسی قدر پستہ قامت لیکن سرخ و سفید چہرے والا خوش مزاج آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بڑے پرتپاک انداز میں نعمت علی اور عنایت بیگ سے مصافحہ کیا تھا پھر اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام دلاور شاہ ہے۔ اور میرا چھوٹا بھائی رحیم شاہ اور یہ ہمارا ملازم نما دوست فرقان ہے۔" اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہی تین آدمی یہاں موجود تھے دلاور شاہ نے آگے بڑھتے ہوئے۔ خوش مزاجی سے کہا۔

"یہاں صرف ہم تین افراد کا بسیرا ہے۔ میں، رحیم شاہ، اور یہ فرقان اور یہ فرقان جو ہے ناں...... بس یوں سمجھ لو ہم اسی کے دم پر زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ بہترین کھانا پکاتا ہے۔ بہترین ڈرائیونگ کرتا ہے۔ بہترین ہاؤس کیپر ہے۔ ایک نڈر اور ضرورت سے زیادہ شاندار نوجوان۔ جسے شاید پستول سے لے کر ٹینک تک سارے ہتھیار استعمال کرنے کا تجربہ ہے۔

"ویری گڈ...... ویری گڈ......"

"حالانکہ میں نے پہلے سوچا تھا کہ اس عمارت میں ملازموں کی ایک فوج جمع کراؤں۔ لیکن چار آدمی بڑی مشکل سے گھیر گھار کر لا سکا۔ اور چاروں ہی بھاگ گئے۔"

"بھاگ گئے......؟"

"ہاں......"

"کیوں......؟"

"اس لیے کہ اس عمارت کے دوسرے رہائشیوں نے انہیں پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔"

"کک...... کیا مطلب یہاں دوسرے لوگ بھی رہتے ہیں......؟"

"ہاں...... نعمت علی صاحب، ظاہر ہے۔ ایک ایسی جگہ جہاں طویل عرصے تک کوئی نہ رہا ہو۔ اگر کچھ لوگ اپنا بسیرا کر لیتے ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اور پھر یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ زر، زن، زمین کے لیے جھگڑا تو ہمیشہ ہی سے چلتا رہا ہے۔ اب ہم نے یہاں آ کر جن لوگوں کو پریشان کیا ہے وہ ظاہر ہے ہماری آمد کو پسند تو نہیں کرتے ہیں اور ان کے اور ہمارے درمیان ایک دلچسپ جنگ چلنا تو بہت ضروری ہے۔"

"اوہ...... آپ کا مطلب ہے کہ......"

"نہ...... نہ...... ان کے لیے کوئی غلط جملہ نہ کہنا۔ نعمت علی، تم سے بھی دشمنی چل جائے گی۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ دلاور شاہ صاحب یہاں آسیب بھی رہتے ہیں؟"

"نہ گھوڑا دور ہے، نہ میدان، میں پورے دعوے سے تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں کس کس کا بسیرا ہے۔ لیکن بہرحال ہماری یہاں آمد کے بعد یہاں تھوڑی سی پر اسرار مدافعت ہو رہی ہے۔ اب یہ مدافعت انسانی تو ہے نہیں۔"

"اوہو...... اچھا اچھا......"

"میں آپ کو بتاتا ہوں۔" اچانک ہی رحیم شاہ نے درمیان میں دخل دیا۔ وہ اب تک بالکل خاموش رہا تھا۔ عنایت بیگ اور نعمت علی اس کی طرف متوجہ ہوئے تو رحیم شاہ بولا۔

"میں نے یہاں بہت سے ایسے واقعات دیکھے ہیں جن سے مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہیں ہماری یہاں موجودگی کو ناپسند کرتے ہیں۔"

"چلیے ٹھیک ہے۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔" نعمت نے کہا تو دلاور شاہ بولا۔

"ہاں...... آؤ...... معزز مہمانوں کو پہلے ہی مرحلے پر اس قدر خوفزدہ کر دینا بہت غیر مناسب عمل ہے۔ ویسے عنایت بیگ نے تمہیں بہت سی باتیں بتائی ہوں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پر اسرار واقعات میں دلچسپی لینے کا ایک الگ ہی مزہ ہے۔ آیئے آپ کے لیے کوئی مناسب جگہ منتخب کر دوں ویسے تو رات کو ہم سب جمع ہو کر اس مسئلے پر بات چیت کریں گے۔"

جو کمرہ عنایت بیگ اور نعمت علی نے منتخب کیا تھا۔ وہ صاف ستھرا، ٹھنڈا اور زمانۂ قدیم کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اس کے بارے میں دلاور شاہ نے بتایا۔

’’جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ یہ فرنیچر پہلے یہاں موجود نہیں تھا۔ بلکہ اسے پراسرار تہہ خانے سے نکالا گیا ہے اور اس کے بعد کمرے میں اسے جگہ دی گئی ہے۔ یہ تہہ خانہ بھی میں نے خود ہی دریافت کیا تھا۔‘‘

’’ہاں..... اس سلسلے میں کوئی تفصیلی بات تو نہیں ہوئی ہے۔ لیکن بہرحال عمارت کا ایک جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ یہاں واقعی کوئی گڑبڑ ہے۔ ویسے نعمت علی شاہ صاحب آپ کو بھی اس سلسلے میں کافی تجربات ہوں گے کیونکہ عنایت بیگ نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ نعمت علی ہنسنے لگا پھر بولا۔

’’بس جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا اس سلسلے میں زیادہ بات چیت کرنا غیر مناسب ہے۔‘‘

’’چلیں ٹھیک ہے۔ اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ ان لوگوں سے مذاکرات کریں۔‘‘ نعمت علی ہنسنے لگا تھا ویسے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ عمارت اپنے حلیے سے آسیب زدہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اصل میں آسیب زدہ عمارتوں میں ایک عجیب سی نحوست چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے در و دیوار روتے ہوئے لگتے ہیں ایک ایک منظر سے عجیب و غریب احساسات جاگتے ہیں۔ نعمت علی تو خیر زیادہ کچے دل کا انسان نہیں تھا۔ بچپن ہی سے اس نے تعویذ گنڈوں میں زندگی گزاری تھی جس کی وجہ سے اس کا دل بھی خاصا پکا ہو گیا تھا۔ لیکن بہرحال بعد میں کافی دلچسپ واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔

قبرستان میں تھوڑے سے پراسرار واقعات ضرور ہوئے تھے۔ جس کے نتیجے میں خیر الدین خیری اسے ملا تھا۔ لیکن اس کے بعد خیر الدین خیری کی دوستی اور قربت نے اسے کافی پکے دل کا مالک بنا دیا تھا اور ہر موقع پر خیر الدین خیری اس کے کام آتا تھا۔

’’میں موجود ہوں ناں..... نعمت علی میری موجودگی میں اگر تم پریشان ہوتے ہو تو یہ تو میری بے عزتی ہے۔‘‘

’’نہیں ..... نہیں میں پریشان نہیں ہوں۔‘‘ نعمت علی کے منہ سے نکلا اور عنایت بیگ رحیم شاہ اور دلاور شاہ اسے چونک کر دیکھنے لگے۔

’’کیا ہوا..... کیا بات ہے؟‘‘

’’اوہو..... نہیں، کچھ بھی نہیں۔‘‘ نعمت علی نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ بہرحال پراسرار قدیم فرنیچر جگہ جگہ سے ٹوٹا پھوٹا تھا۔ لیکن اسے قابل استعمال بنا لیا گیا تھا۔ میزیں، کرسیاں، آتش دان اور ایسے ہی دوسرے ڈیکوریشن پیس جن میں سے کچھ کو زبردستی ڈیکوریشن پیس بنایا گیا تھا۔ مثلاً کارنس پر رکھا ہوا ایک انسانی ہاتھ۔ جو دور سے دیکھتے ہی کسی انسان کا کٹا ہوا ہاتھ محسوس ہوتا تھا۔ لیکن اصل میں اس کی انگلیوں کے درمیان ایک شمع رکھی ہوئی تھی۔ ہاتھ کے دوسری طرف سے خون ٹپکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ان تمام چیزوں کو ڈیکوریٹ کرنے سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ خود دلاور شاہ بھی ایک سنگین مزاج انسان ہے۔ اگر عام انسان ہوتا تو اسے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

بہرحال وقت گزرتا رہا۔ پھر ایک چیز جس نے نعمت علی کو حیران کیا وہ یہ تھی کہ اس کٹے ہوئے انسانی ہاتھ جس کی انگلیوں کے درمیان شمع رکھی ہوئی تھی۔ انگلیاں اسے ہلتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے حیران نگاہوں سے کارنس پر رکھے ہوئے انسانی پنجے کو دیکھا۔ واقعی یہ اس کی آنکھوں کا دھوکا نہیں بلکہ اس کی انگلیاں حرکت کر رہی تھیں۔ اس وقت ہاتھ کے درمیان رکھی ہوئی شمع روشن نہیں تھی۔ لیکن اچانک ہی وہ روشن ہو گئی تھی۔ نعمت علی نے حیرانی سے ان لوگوں کو دیکھا لیکن شاید وہ اس بات سے ناواقف تھے۔ اسی وقت دلاور شاہ کی آواز ابھری۔

’’عنایت بیگ میرے ساتھ آؤ ذرا۔‘‘ عنایت بیگ باہر نکل گیا تو نعمت علی اندر رہ گیا۔ شمع کا اچانک جل جانا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قدم آگے بڑھے اور وہ ہاتھ کے قریب پہنچ گیا۔ تب اس نے دوسرا منظر دیکھا۔ ہاتھ کی کٹی ہوئی کلائی سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے اور اچھا خاصا خون جمع ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

ہلتی ہوئی انگلیاں اب ساکت ہو گئی تھیں، قریب سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ کوئی ڈیکوریشن پیس نہیں ہے۔ بلکہ واقعی ایک انسانی ہاتھ ہے۔ جو کلائی کے پاس سے کاٹ دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے خون کے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔ اس نے انگلی سے اس خون کو چھو کر دیکھا تو گاڑھا گاڑھا خون اس کی انگلی کے پور پر لگ گیا۔ ایک لمحے تک وہ سوچتا رہا۔ پھر اس نے وہ جگہ چھوڑ دی۔

اچانک ہی دروازے پر آہٹ ہوئی اور عنایت بیگ جو رحیم شاہ اور دلاور شاہ کے ساتھ باہر نکل گیا تھا واپس آ گیا، اس نے شاید نعمت علی کے چہرے پر کوئی خاص بات دیکھی تھی۔ جلدی سے بولا۔

’’کیا ہوا.....؟ کیا بات ہے.....؟‘‘

’’ادھر آؤ..... جلدی سے دیکھو.....؟‘‘ نعمت علی کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس نے ہاتھ کے پنجے کی طرف اشارہ کیا۔

’’کہا تھا ناں میں نے تم سے کہ دلاور شاہ ایک کھسکا ہوا آدمی ہے۔ اسے اس طرح کی فضول چیزوں سے دلچسپی ہے۔ اور وہ انہیں نوادرات میں سے سمجھتا ہے۔ یہ کٹا ہوا ہاتھ یقینی طور پر کسی ایسی چیز سے بنا ہے جو انسانی کھال سے مشابہت رکھتی ہے۔‘‘

’’نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ ذرا غور سے دیکھو یہ واقعی کٹا ہوا انسانی ہاتھ ہے۔ اور یہ شمع..... یہ شمع بھی میں نے نہیں جلائی بلکہ خود بخود جلی ہے۔‘‘

’’کیا.....؟‘‘ عنایت بیگ حیران لہجے میں بولا

’’ہاں..... تم..... دیکھو۔‘‘ یہ کہہ کر نعمت علی نے رخ بدلا اور دوسرے ہی لمحے اس کا منہ حیرت سے کھل گیا..... شمع بجھی ہوئی تھی۔ موم بتی جب جلتی ہے اور اسے بجھا دیا جاتا ہے تو لازمی طور پر اس سے ہلکا ہلکا سفید دھواں خارج ہوتا ہے اور ایک ناگواری بو بھی محسوس ہوتی ہے لیکن نا تو اس وقت اس کا موم پگھلا ہوا تھا اور نہ ہی، اس بتی میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ جلی ہوئی ہو۔ جبکہ نعمت علی نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ یہ بات دیکھی تھی کہ شمع خود بخود جل اٹھی تھی۔

اس کے بعد اس نے اسی طرح چونک کر اس ہاتھ کو دیکھا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ہاتھ تو واقعی پتھر کا بنا ہوا تھا۔ جس کی انگلیاں ایک مخصوص انداز میں اٹھی ہوئی تھیں۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی انگلی میں تو خون بھی لگا ہوا ہے۔ اس نے جلدی سے اپنی انگلی کو دیکھا۔ لیکن خدا کی پناہ..... انگلی کا یہ حصہ بالکل شفاف تھا۔‘‘

’’کیا ہو گیا ہے، تمہیں نعمت علی لگتا ہے، تم خوفزدہ ہو گئے ہو۔‘‘

’’نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بہرحال ہر چیز پر نگاہ رکھنی ہے۔‘‘ نعمت علی نے خفیف لہجے میں کہا۔ عنایت بیگ بولا۔

’’بہرحال سارے معاملات کو تم بہتر جانتے ہو۔ مجھے تو تمہاری تقویت ہے۔ ظاہر ہے بدو علی صاحب نے تمہیں بے مقصد نہیں بھیجا ہوگا۔‘‘ نعمت علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عنایت بیگ کہنے لگا۔ ’’باہر کھانے وغیرہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میرا خیال ہے میز لگ رہی ہے۔ فرقان تمہیں لینے آ جائے گا۔ خود کو سنبھالے رکھو۔‘‘ جب عنایت بیگ باہر نکل گیا تو خیر الدین خیری کی کسی قدر طنزیہ آواز سنائی دی۔

’’میں بھی انسان ہی ہوں اور زندگی بھر میں نے طرح طرح کے تجربات کیے ہیں۔ انسان کے اندر سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ وہ کبھی کسی پر اعتبار نہیں کرتا ہے۔‘‘ خیر الدین خیری کے لہجے میں طنز تھا۔ نعمت علی نے جلدی سے کہا۔

’’مجھے اندازہ ہے۔ استاد محترم کہ آپ ناراض ہو گئے ہوں گے لیکن ابھی آپ نے خود ہی کہا ہے کہ آپ بھی انسان ہیں اور زندگی میں تھے تو کیا انسانی فطرت میں خوف شامل نہیں ہے؟‘‘

’’ہے..... بے شک ہے..... اسی لیے میں غیر

مطمئن نہیں ہوں لیکن ایک بار پھر کہتا ہوں کہ زیادہ فکر مت کیا کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''بہت کوشش کروں گا کہ خیال رکھوں۔'' نعمت علی نے جواب دیا۔

بہر حال عنایت بیگ کی اطلاع کے مطابق تھوڑی دیر بعد فرقان ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ان سے بڑی دست بستہ درخواست کی تھی کہ وہ کھانے کی میز پر چلیں۔ کھانے کی میز پر دلاور شاہ اور رحیم شاہ موجود تھے۔ فرقان کو واقعی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ کھانا بے شک اس نے تیار کیا تھا۔ لیکن کھانے کی میز پر وہ خود بھی ایک معزز مہمان کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا۔ کھانے کے دوران دلاور شاہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''آپ لوگوں کی آمد سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔'' نعمت علی صاحب عنایت بیگ آپ کے بارے میں بہت سی تفصیلات بتا چکا ہے۔ آپ ایک بہت ہی محترم بزرگ کے بیٹے ہیں اور انہوں نے آپ کو اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ عنایت بیگ میری زندگی کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ اس عمارت کی خریداری بھی میں اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ سمجھتا ہوں۔ عمارت میں کچھ لرزہ خیز اور پراسرار آوازیں سنی جاتی رہی ہیں۔ میری زندگی میں ایسے بہت سے واقعات پیش آئے ہیں کہ کچھ لوگوں نے کسی جگہ کوئی اڈہ بنا رکھا ہے اور اس طرح کے پراسرار حالات پیدا کر دیے کہ کوئی وہاں تک نہ سکے۔ اس بات پر میں نے خاص طور سے نظر رکھی ہے۔''

''واقعی آپ نے اس بارے میں معلومات تو حاصل کی ہوں گی۔''

''ہاں..... کیوں نہیں میں نے جب متعلقہ افراد سے اس بارے میں بات کی تو کچھ چہرے حیرت کی تصویر بن گئے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کوئی پاگل آدمی ہوں اس عمارت کو خریدنے کی بات دیوانگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ بہر حال کچھ لوگوں نے پذیرائی بھی کی اور اس عمارت کو خریدنے کے سلسلے میں میری کافی مدد کی بہر حال یہ خرید مکمل ہوگئی۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا نعمت علی صاحب کہ دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ یہاں سے گزرنے والے عمارت کے قریب سے ہو کر نہیں گزرتے۔ گویا لوگوں کے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ یہ عمارت آسیب زدہ ہے اور اس کے نزدیک سے گزرنا خطرناک ہے۔''

''ہاں..... کیا آپ نے اس عمارت کی تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی؟'' اس بار یہ الفاظ نکلے تو نعمت علی کے منہ سے تھے۔ لیکن اس کے ذہن میں خیر الدین خیری بول رہا تھا۔

''ہاں..... یہ سات سو یا آٹھ سو سال پرانی ہے اس کی طرز تعمیر اس کا فرنیچر اور بہت سی ایسی چیزیں جو یہاں سے مجھے دستیاب ہوئی ہیں اس کی تاریخ کی تصدیق کرتی ہیں۔ اس کا زیادہ تر حصہ ٹوٹ پھوٹ چکا ہے اور یہ برسوں سے ویران پڑی ہوئی ہے۔ میں نے اس پر کافی محنت کی ہے اور اس پر کام کیا ہے۔ لیکن کسی قسم کی تعمیر نہیں کرائی ویسے یہ بالکل محفوظ ہے کیونکہ بلڈنگ انجینئرنگ میں بھی مجھے تھوڑا سا تجربہ ہے یہ ابھی صدیوں اسی طرح رہ سکتی ہے اور اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ یہ عمارت گر جائے۔''

''آپ کافی دن سے یہاں رہ رہے ہیں۔ کیا کیا واقعات آپ کو یہاں پیش آئے ہیں؟'' سوال سو فیصد خیر الدین خیری ہی کر رہا تھا۔

''میرے یہاں آنے کے تقریباً آٹھ دن بعد کا ذکر ہے کہ رات کے گیارہ یا بارہ بجے ہوں گے ہر طرف دہشت ناک سناٹے کو چیرنے والی ان آوازوں سے یوں لگتا تھا جیسے کوئی ساز بجایا جا رہا ہو۔ آہستہ آہستہ وہ آواز بلند ہونے لگی اور پھر اچانک ایک دھماکا ہوا اور اس آواز میں انسانی چیخیں شامل ہوگئیں۔ کرب ناک اذیت ناک جیسے کوئی کسی کو سخت تکلیف دے رہا ہے۔''

دلاور شاہ کا چہرہ زرد ہونے لگا تھا۔

یوں لگا جیسے وہ ان آوازوں کو محسوس کر رہا ہو۔

قسط نمبر:03

ایم اے راحت

رات کا گھٹا ٹوپ اندھرا، پرھول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دہشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکرائو، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیروشر کی انوکھی کہانی

کچھ لمحوں کے بعد دلاور شاہ کی آواز ابھری۔ ”اصولی طور پر یہ ہونا چاہیے تھا کہ میں اٹھ کران آوازوں کی طرف دوڑتا، لیکن میں نے برداشت کیا، بہت دیر تک یہ آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ اس وقت وہ چار ملازم بھی میرے پاس نہیں تھے۔ جب یہ آوازیں بند ہوگئیں تو وہ دہشت سے لرزتے ہوئے میرے پاس آئے اور بولے۔ ”عمارت میں انسانی چیخوں کی آوازیں بلند ہورہی ہیں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی کسی کو قتل کررہا ہو۔“ ان میں سے ایک ملازم نے کچھ اور بھی عجیب وغریب باتیں بتائیں۔

”وہ کیا......؟“ نعمت علی نے سوال کیا۔

اس نے کہا۔ ”یہاں سے فاصلے پر جو آبادی رنگ نگر کی ہے وہاں کے کچھ باشندوں نے بڑی عجیب و غریب باتیں انہیں بتائی ہیں۔“

”وہ کیا......؟“

اس بار عنایت بیگ نے سوال کیا۔ تو دلاور شاہ بولا۔

”یہ باتیں چونکہ مجھے اس عمارت کے خریدنے سے پہلے معلوم نہیں ہوئی تھیں بلکہ بعد میں جب میں نے ان ملازموں کو جمع کیا تو یہ ملازم ساری تفصیلات بتا رہے تھے۔“ وہ شخص جس نے یہ بات بتائی تھی۔ اس نے کہا۔

”تھوڑے عرصے پہلے کی بات ہے کہ جن کا نام ذاکر لغاری تھا ادھر سے گزر رہے تھے۔ گاڑی کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی اور وہ بند ہوگئی۔ لاکھ دھکے لگائے گئے مگر گاڑی دوبارہ اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ چنانچہ وہ رات کو اس عمارت میں رک گئے۔ لیکن دوسری صبح ان کا دماغی توازن درست نہیں تھا۔ رسیاں کندھے سے باندھ کر گاڑی گھسیٹنے کی کوشش کررہے تھے یہاں تک کہ ان کی موت واقع ہوگئی۔ ایک اور صاحب یہاں آکر قیام پذیر ہوئے تھے۔ صبح کو ان کی بھی لاش یہاں پر ملی۔ ایسے کئی واقعات پیش آئے۔ میں نے ملازم کو ڈانٹا اور کہا کہ ایسی فضول باتیں کرکے دوسروں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ملازم خاموش ہوگیا تھا۔ لیکن میں یہ بات محسوس کرچکا تھا کہ باقی ملازموں کے چہرے بھی خوف سے زرد پڑے ہوئے تھے۔

بہرحال دن کی روشنی میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے کافی دیر تک دور دور کا جائزہ لیا تھا۔ لیکن کہیں ایسے نقوش نہیں پائے گئے۔ جن سے یہ اندازہ ہوتا کہ رات کو کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ البتہ دوسری رات

جب ہم، میرا مطلب ہے ملازم اور میں اس وقت تک رحیم شاہ میرے پاس نہیں آیا تھا۔ بہت دیر تک آوازوں کا یا کسی اور بات کا انتظار کرنے کے بعد اپنے بستر پر پہنچ گئے تھے کہ اچانک پھر کمروں سے سسکیوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر کوئی زور زور سے رونے لگا۔ پھر ایسی سیٹیاں بجیں جیسے کوئی کسی کو ہوشیار کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے دن کی روشنی میں بندوبست کر لیا تھا اور یہ سوچا کہ آج اگر یہ آوازیں بلند ہوئیں تو میں ان کا جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔

ملازموں میں سے صرف ایک ملازم نے میرا ساتھ دیا۔ باقی تین کمرے میں گھسے رہے۔ میں نے ٹارچ اور رائفل لی، اور آوازوں کا اندازہ لگاتا ہوا۔ اس کمرے کی جانب بڑھا جو آوازوں کا مرکز تھا۔ ملازم سمٹا ہوا میرے ساتھ چل رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں اس کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس میں تالا لگا ہوا تھا اور آوازیں مجھے اس کمرے سے آ رہی تھیں۔ میں نے اپنے ذہن کو سنبھالا اس میں کوئی شک نہیں کہ ان آوازوں کو سننے کے بعد خاص طور پر رات کی اس بھیانک تاریکی میں اپنے دل و دماغ پر قابو رکھنا ایک مشکل کام تھا۔

لیکن بہرحال زندگی میں بہت سے مرحلے پیش آ چکے تھے۔ جن میں خاصی خوفناک حالت میں وقت گزارنا پڑا تھا۔ چنانچہ میں نے خود کو سنبھالا اور اطمینان سے تالا کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ طاقتور ٹارچ کی روشنی میں نے چاروں طرف پھینکی اندر قدم رکھتے ہی اچانک آوازیں بھیانک شکل اختیار کر گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے تیز ہوائیں میرے بدن کو ٹٹول رہی ہوں۔ کئی بار جسم میں سرسراہٹوں کا احساس ہوا تھا۔ آوازیں اتنی تیز ہونے لگی تھیں کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ میرا سر گھومنے لگا۔ اور جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اس دوران میرا وہ دلیر ملازم باہر نکلا۔ اور میں کمرے میں تنہا رہ گیا تھا۔ بہرحال اس کے بعد میں واپس پہلے کمرے میں آ گیا۔ اب تو ملازموں کو کسی طرح بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خوفزدہ نہ ہوں۔ وہ ملازم بھی میرے ساتھ کمرے میں گیا تھا۔

آپ لوگ یقین کریں کہ دوبارہ وہ مجھے اس عمارت میں نظر نہیں آیا۔ باقی تینوں ملازم بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے کہ وہ کہاں گیا......؟ اس دن سے آج تک اس کا پتہ نہیں چل سکا ہے، لیکن رات کی تاریکی میں یہ آوازیں اب بھی کمرے سے آتی ہیں اور میں آج تک ان کا سراغ نہیں لگا سکا۔ اس کے بعد رحیم شاہ کو یہاں بلا لیا۔ باقی ملازم بھی بھاگ گئے۔ فرقان میرا پرانا ساتھی ہے یہ کچھ مصروف تھا۔ جس کی وجہ سے اس وقت میرے ساتھ نہیں تھا۔ لیکن بعد میں یہ واپس آ گیا اور اب میں رحیم شاہ اور فرقان کے ساتھ مقیم ہوں۔ لیکن نہایت بے چینی کے ساتھ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ پچھلے کچھ معاملات میں تم میرے ساتھ تھے اور تم نے بڑی دلچسپی کا ثبوت دیا تھا۔

یہ الفاظ اس نے عنایت بیگ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہے تھے۔ عنایت بیگ کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار تھے، اس نے کہا۔

''گویا اب بھی ان آوازوں کو سنا جا سکتا ہے؟''

''اندازہ تو یہی ہے۔ یہ روزانہ آدھی رات کے بعد سورج نکلنے تک سنائی دیتی ہیں۔ تھوڑا تھوڑا وقفہ ہو جاتا ہے۔ ان کے درمیان اور اس کے بعد وہ پھر شروع ہو جاتی ہیں۔''

''اندازہ کیا ہوتا ہے......؟'' نعمت علی نے دلچسپی سے سوال کیا۔

''بس کبھی سیٹیاں بجتی ہیں کبھی باجے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر کبھی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ ویسے ان چیخوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ یہ ایسے شخص کے حلق سے نکلتی ہیں جسے شدید اذیت دی جا رہی ہو۔''

''دلاور شاہ آپ نے تہہ خانے سے یہ سامان نکالا ہے۔''

''ہاں......''

''تہہ خانے میں کیا پوزیشن تھی، آپ نے اس کا جائزہ لیا......؟''

''میں سمجھا نہیں......''

''میرا مطلب ہے کہ اس کمرے کے نیچے بھی تہہ خانہ ہوگا۔'' دلاور شاہ نے کچھ دیر سوچا پھر بولا۔

''ممکن ہے......آپ نے دیکھا نہیں......''

''نہیں خاص طور پر نہیں دیکھا۔''

''دن کی روشنی میں آپ نے کبھی کمرے میں جا کر دیکھا......؟''

''ہاں...... ایسا میں نے ضرور کیا، لیکن کوئی قابل ذکر بات نظر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ کوئی نشان تک نہیں ملا۔''

''آپ اگر یہ سوچ رہے ہیں کہ وہاں کوئی ایسے مائیکروفون یا ایسی چیز رکھ دی گئی ہو یا دیواروں میں نصب کر دی گئی ہو۔ جس سے یہ آوازیں سنائی دی جاتی ہوں۔ اور اس کا منظر یہ ہو کہ کوئی شخص اس عمارت سے دور کرنا چاہتا ہوں۔ تو میں یہ کوشش بھی کر چکا ہوں۔ لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔'' دلاور شاہ یہ باتیں کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

عمارت کے مشرقی حصے سے ہواؤں کی لہروں پر تیرتی ہوئی ایک مدھم سی آواز میں نے بھی سنی تھی۔ دلاور شاہ نے آہستہ سے کہا۔

''حیرت ناک، یہ وقت سے پہلے ہوا، دیکھو کیا تم کسی پراسرار ساز کے سر سن رہے ہو۔'' نعمت علی نے خود آوازیں سنی تھیں۔ دلاور شاہ کے کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

نعمت علی کو یہ محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے باقاعدہ ایک نغمہ بجایا جا رہا ہو۔ جس کمرے میں یہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے اس کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ دیر تک یہ آوازیں بڑھتی رہیں۔ اچانک نعمت علی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے وہ تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ آوازیں تیز ہو گئیں۔ ایک آواز لمبی چیختی ہوئی انجن کی سیٹی کی مانند سنائی دے رہی تھی۔

یہ لوگ کمرے کے اندر تھے۔ لیکن باہر پھیلی تاریکی اور بھیانک ماحول میں یہ آواز درحقیقت اعصاب شکن ہو گئی۔ اور کوئی بھی اجنبی شخص ان سے متاثر ہو سکتا تھا۔ اگر خود دلاور شاہ، اور اس کا ملازم فرقان، اور بھائی رحیم شاہ ان آوازوں کے عادی نہ ہوتے تو ان کی حالت بھی خراب ہو جاتی۔ لیکن نعمت علی، عنایت بیگ کے چہرے پر ایک پیلاہٹ سی دیکھ رہا تھا۔ اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا ہو، خود وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا اور اسے بار بار اپنے لباس کے نیچے ایک سرسراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے نادیدہ ہاتھ اس کے بدن کو ٹٹول رہے ہوں۔ یہ آواز بغور سن رہا تھا۔ پتہ نہیں کس انسان کی تھیں یا نہیں، کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کوئی مشینی آواز ہو۔ یہ کبھی تیز ہو جاتی اور کبھی مدھم، لیکن اس میں درد، کرب اور تکلیف کی شدت کا احساس تھا۔ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی تھی۔ کچھ لمحے وہ مختلف کھڑکیوں کے پاس کھڑا کان لگا کر ان آوازوں کی سمت کا اندازہ لگاتا رہا۔

غالباً وہ وہی ان کے درمیان ایک ایسا شخص تھا۔ جو آوازوں کے سراغ کے سلسلے میں متحرک تھا۔ ورنہ باقی سب لوگ تو سرد اور خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر اس نے ساری کھڑکیاں بند کر دیں اور اب وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

یہاں موجود لوگوں کے چہروں سے وہ یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ سب کے سب خوفزدہ ہیں۔ تعجب کی بات تھی۔ خاص طور سے دلاور شاہ اور رحیم شاہ وغیرہ کے سلسلے میں کہ اگر وہ ان آوازوں سے خوف زدہ تھے تو پھر یہاں قیام کیوں کیا ہوا تھا۔ انہوں نے، نعمت علی نے یہ ہی سوال دلاور شاہ سے کر ڈالا۔

''معافی چاہتا ہوں، دلاور شاہ صاحب بڑا ذاتی سا سوال ہے لیکن چونکہ ہم سب یہاں موجود ہیں اور ہمیں اس سلسلے میں گفتگو بھی کرنی چاہیے، آپ ایک بات بتائیے آپ ان آوازوں سے خوفزدہ ہیں......؟''

دلاور شاہ نے عجیب سی نگاہوں سے نعمت علی کو دیکھا۔ پھر بولا۔

''میں سمجھ رہا ہوں کہ اس وقت واحد آپ ہیں،

جو اس قدر متاثر نظر نہیں آتے۔ یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی ہوسکتا ہے عنایت بیگ نے آپ کا انتخاب کسی خاص مقصد کے تحت کیا ہو اور مجھے اس بارے میں تفصیل نہ بتائی ہو، آپ واقعی ایک دلیر انسان ہیں جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے۔ تو میں بس یہی کہہ سکتا ہوں، کہ میں نے یہ عمارت خریدی ہے۔ اور یہاں پر ایک میوزیم بنانا چاہتا ہوں جس کے بارے میں لوگ سوچیں اور کہیں کہ دیکھو دلاور شاہ نے ایک ایسا کام کیا جو عام لوگوں سے منفرد ہے۔ چنانچہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر کوئی میرا راستہ روکنا چاہتا ہے تو روشنی میں آجائے اور مجھے پتہ چل جائے کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔"

"کیا آپ کو اس سلسلے میں کسی پر شبہ ہے؟ میرا مطلب ہے کوئی ایسی شخصیت جو آپ کا راستہ روکنا چاہتی ہو۔"

نعمت علی کے اس سوال پر دلاور شاہ چونک پڑا۔

چونکنے کا مطلب ہے کہ کوئی ایسی شخصیت ضرور ہے جس کے بارے میں اس کے ذہن میں اس دوران یہ شبہ ہو رہا ہوگا اور پھر نعمت علی کی دلچسپیاں اس سلسلے میں بڑھ گئی تھیں وہ خاموشی سے دلاور شاہ کی صورت دیکھتا رہا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا۔ کہ عنایت بیگ بھی تجسس بھری نگاہوں سے دلاور کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد دلاور شاہ نے کہا۔

"حالانکہ اس وقت جو صورتحال ہے اس میں مجھے یہ الفاظ کہنا یوں عجیب سا لگتا ہے کہ میرا بھائی رحیم شاہ بھی یہاں موجود ہے لیکن معاملہ چونکہ ذرا مختلف ہے اور اس وقت کی صورتحال صرف مذاق نہیں ہے۔" تمام لوگ ان جملوں پر متوجہ ہوگئے۔

دلاور شاہ نے کہا۔ "اصل میں زندگی کے دن رات اس طرح گزرے کہ ہمیں بہت سے معاملات میں اپنے مستقبل کے بارے میں ایک مناسب فیصلہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے اور میرے بھائی نے جس طرح زندگی گزاری ہے۔ وہ عام راستوں سے ہٹ کر ہے۔ خاص طور پر رحیم شاہ جس نے یہیں پر رہ کر بڑی ترقی کی ہے اور اس خیال میں رہ گیا تھا کہ مستقبل کا آغاز تو کسی بھی وقت ہوسکتا ہے۔ یعنی بیوی اور بچے وغیرہ اصل میں مستقبل بنانے کے لیے صحیح وقت پر عمل کر لینا ضروری ہے کیونکہ گزرنے والا وقت ضائع ہوتا ہے۔ مستقبل سے مستقبل تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ حال سے مستقبل تعمیر کیا جاتا ہے۔ شاید تمہید طویل ہوگئی۔ کہنا یہ چاہتا تھا نہ میں نے شادی کی اور نہ میرے بھائی نے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ میں نے زندگی کی لطافتوں سے منہ موڑ رکھا ہے۔

یہاں آنے کے بعد رنگ نگر کی ایک معزز اور پر اسرار شخصیت سے ملاقات ہوئی اصل میں عزیزہ ناصری مجھے یورپ میں ملی تھیں۔ کاروباری ذہن کی مالک ہیں اور حیران کن بات یہ ہے کہ میری طرح ہی ان کی زندگی بھی اپنی تعمیر میں گزر گئی۔ ان کی مختصر کہانی یہ ہے کہ ان کے والدین دو چھوٹی بہنوں کا بوجھ ان کے شانوں پر چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اور انہیں اپنی بہنوں کو ایک مناسب زندگی دینے کے لیے مردوں کی طرح کام کرنا پڑا۔ اور یہ حقیقت تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب عورت اپنے جذبوں میں سفر کرتی ہے تو پھر وہ بہت آگے ہوتی ہے۔ عزیزہ ناصری بھی ایسی ہی آگے کی شخصیت ہے۔ میری ان سے یورپ میں ملاقات ہوئی۔ تو ہم دونوں کے درمیان گہری دوستی ہوگئی۔ میں اس دوستی کو محبت کا نام تو نہیں دے سکتا چونکہ ہم دونوں کی عمر پختہ تھی۔ البتہ آپ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پختہ عمر کی دوستی تھی۔ جو زیادہ پائیدار رہی۔

اگر آپ لوگ عزیزہ ناصری کو دیکھیں تو وہ آپ کو بے انتہا پسند آئیں گی۔ حسین صورت کے ساتھ ساتھ حسین سیرت اور ذہانت کی مالک بھی ہیں۔ ان کا خاندان انتہائی اعلیٰ ہے۔ زمانہ قدیم میں ان کی اپنی ایک کہانی ہے۔ وہ یہ کہ خاندان کے کسی بزرگ نے برائیوں کو اپنا کر جائیداد وغیرہ کھو دی تھی اور اس کے بعد یہ خاندان پس منظر میں چلا گیا تھا یہاں تک کہ عزیزہ ناصری نے ایک بار پھر اس کے نام کو روشن کیا۔ آپ لوگوں کو حیرت ہوگی کہ یہ عمارت جس میں اس وقت

موجود ہیں عزیزہ ناصری کی آبائی عمارت ہے۔ انہوں نے اس بارے میں مجھے تفصیلات بتائی تھیں۔ اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی نوعیت اس وقت کیا تھی۔

آپ یہ سمجھ لیجیے کہ اس خاندان کے برے افراد نے اس عمارت کو دور دراز تعمیر کرا کے اپنے لیے ایک عیش گاہ بنائی تھی۔ یہاں کے بارے میں کہانیاں مشہور ہیں۔ بہر حال وہ یورپ سے واپس چلی آئیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ وطن واپس آنے کے بعد سب سے پہلے انہی سے ملاقات کروں گا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ ان کا تعلق اب بھی رنگ نگر سے ہے۔ ایک اچھا کاروبار کرتی ہیں۔ وہ اور میں ایک دوسرے کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی آپ لوگ ذہن نشین کر لیجیے کہ ہماری پسند کو بہت سی نگاہیں تکلیف کے انداز میں دیکھتی ہیں۔ چونکہ اور بھی چند افراد ہیں جو عزیزہ ناصری پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کا مقصد ایک ایسی عورت کی قربت حاصل کرنا ہے جو مالی طور پر انتہائی مطمئن ہے یہاں تک کہ میں نے اور عزیزہ ناصری نے اپنی شادی کا بھی اعلان کر دیا۔

بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں جو وقت سے پہلے بتانا مناسب نہیں ہوتیں۔ میں نے شاید کچھ الفاظ کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں یہ مکان عزیزہ ناصری کو تحفے میں دینا چاہتا ہوں کیونکہ ان کے بیان کے مطابق یہ ان کا خاندانی مکان ہے۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس کو میرے اس خیال سے اختلاف ہے اور کون یہ نہیں چاہتا کہ میں یہ مکان اس طرح اپنی تحویل میں رکھوں یا اسے عزیزہ ناصری کو دینے کی کوشش کروں۔ حالانکہ یہ ایک بے مقصدی بات ہے لیکن بہر حال یہ تصور میرے ذہن میں بارہا آیا ہے کہ ہو سکتا ہے۔ میرے رقیبوں نے مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس بات کے تو سو فیصد امکانات ہیں۔"

"میں آپ کو کچھ اور بھی باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ لوگ اس سلسلے میں میری مدد کرسکیں۔"

"ضرور......"

"ایک روز شام کے وقت جب میں رنگ نگر میں عزیزہ ناصری کے گھر کھانے پر مدعو تھا کچھ اور لوگ بھی وہاں آئے ہوئے تھے اور میں اس مکان کی خریداری کی بات کر رہا تھا تو دوران گفتگو کسی صاحب نے کہا کہ آخر میں اس مکان کا کروں گا کیا......؟" ازراہ مذاق میں نے کہا۔

"آپ لوگوں کو اس بات کا تو علم ہے کہ میں اور عزیزہ ناصری منفرد مزاج کے مالک ہیں۔ ہم اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ میں نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ شادی کی پہلی رات ہم مکان میں گزاریں گے۔ باقی لوگوں پر کچھ بھی ردعمل ہو۔" وہ الگ بات ہے کہ عزیزہ ناصری نے کہا۔

"کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں کہ وہ عمارت آسیب زدہ ہے......؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ عزیزہ ناصری کہ ہماری زندگی کی پہلی رات ایک آسیبی ماحول میں گزرے گی۔ ہر ماحول کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہونا خوش ذوقی کی علامت ہے۔" وہاں بیٹھے ہوئے چند افراد ہنس پڑے تو میں نے کسی قدر درشت لہجے میں سوال کیا۔

"آپ لوگ بڑی فراخدلی سے ہنس رہے ہیں کیا اس ہنسی کی وجہ بتانا پسند کریں گے۔"

"جب آسیب ہیبت ناک آوازیں نکال رہے ہوں اور ماحول پر دہشت سوار ہو تو میرا خیال ہے کہ آپ جیسا ہی بے جگر انسان رومانس کی باتیں کرسکتا ہے۔"

"کاش میں آپ کو اپنی اس بے جگری کا نظارہ کرنے کے لیے مدعو کرسکتا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"دیکھیے میرا ہمدردانہ مشورہ ہے کہ آپ یہ منحوس عمارت نہ خریدیں شاید آپ کو اس کا ماضی نہیں معلوم بہت سے لوگ......"

"معلوم ہے، معلوم ہے آپ یہی کہنا چاہتے ہیں یہ عمارت میں نے بھی خریدی ہے۔ جس نے بھی اس سے تعلق قائم کیا یا تو پاگل ہوگیا یا موت کے گھاٹ

اتر گیا۔ رنگ نگر کی آبادی میں یہ عمارت بدروحوں کا مسکن مشہور ہے۔''

''جی ایسی ہی بات ہے۔ وہی تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور پرفضا مقامات پر تو لوگ ہنی مون منایا کرتے ہیں۔ آسیبوں کی ڈراؤنی اور دہشت ناک فضا میں ہنی مون منانا ایک دلچسپ عمل ہوگا۔ اور لوگ اس کی فکر نہ کریں۔ ساری زندگی میں نے بدروحوں کا مقابلہ کرتے ہوئے گزاری ہے۔ آپ لوگ ہمارا بھی جائزہ لے لیجیے۔''

''ٹھیک ہے آپ بے شک ایسا ہی کریں، لیکن ایک بات آپ ذہن نشین کرلیں کہ اس عمارت میں اب قیام طویل نہیں ہوسکتا۔ اور اگر آپ نے اس میں قیام رکھنے کی ضد کی تو آپ سمجھ لیجیے کہ بدترین نقصان سے دوچار ہوں گے۔ آپ کوئی شرط بدلنا چاہیں تو بدل لیجیے۔''

یہ شخص جس نے مجھ سے بات کی تھی اس کا نام نادر بیگ ہے۔ یہ بھی ہڈیوں کی صنعت کا بہت بڑا کاروباری ہے اور خاصا دولت مند، بہر حال میں نے نادر بیگ سے یہ شرط پختہ کرلی۔ بات صرف مذاق میں ہوئی تھی۔ لیکن جب تمام چلے گئے تو عزیزہ ناصری نے کہا۔

''یہ تم نے کیا کرڈالا ہے؟ تم بھی بڑے جذباتی آدمی ہو، جب دوسروں سے کسی ضد والی بات پر گفتگو کر رہے ہوتو میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ میں تمہیں ٹوکنا چاہتی تھی۔ روکنا چاہتی تھی، لیکن اب کیا کروں تم نے شرط لگا کر حماقت کی ہے۔''

''آخر کیوں......؟''

''اس لیے کہ یہ عمارت واقعی آسیب زدہ ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ یہ میری خاندانی عمارت اور اب اللہ کے فضل سے میں اس قابل تھی کہ میں خود بھی اسے خرید سکوں۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ البتہ خاندانی عمارت ہونے کی وجہ سے میں نے اس کے بارے میں لاتعداد بار معلومات حاصل کی ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ اس کا ایک کمرہ تو بہت ہی خطرناک ہے۔ صرف ایک کمرہ خاص طور سے۔''

''اس میں کیا بات ہے......؟''

''سنا ہے......اس کمرے سے آوازیں آتی ہیں انتہائی خوفناک آوازیں۔''

''ناصری کیا تم نے یہ آوازیں اپنے کانوں سے سنی ہیں......؟''

''یہ آوازیں باہر سے نہیں سنی جاسکتیں۔ میں نے کبھی آوازیں نہیں سنیں۔ اس لیے کہ میں اس عمارت میں کبھی اندر داخل نہیں ہوئی۔ اگر کوئی اس عمارت سے باہر ہوتو یہ آوازیں نہیں سن سکتا۔ ہاں اگر کوئی اندر داخل ہوجائے تو وہ یہ آوازیں سن سکتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ نادر بیگ صرف مجھے دھوکا نہیں دے رہا تھا۔ یعنی اب جب میں یہاں آنے کے بعد ان آوازوں کو سنتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ مجھ سے شرط لگانے والے شخص نے ان آوازوں کا انتظام کیا ہوتا کہ میں دہشت زدہ ہوکر یہ عمارت چھوڑ دوں اور وہ شرط جیت جائے۔ لیکن جو معلومات مجھے بعد میں حاصل ہوئیں ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ آوازیں کافی عرصے سے سنی جاتی رہی ہیں اور نئے سرے سے عالم وجود میں نہیں آئیں۔ بہر حال یہ ہے کہانی، اب بتاؤ میں کیا کروں......؟''

''آپ یقینی طور پر عزیزہ ناصری سے شادی کر کے ہنی مون کے لیے یہاں آنا چاہتے ہیں؟''

''سو فیصدی اور اب یہ میری عزت و وقار کا معاملہ ہے۔ ظاہر ہے اس سلسلے میں نہ تو پولیس سے مدد لے سکتا ہوں نہ ہی کچھ ایسے لوگوں سے لیکن عنایت تم سے میں یہ کہہ کر مدد کی خواہش کا اظہار کرتا ہوں کیونکہ تم ایک ذہین آدمی ہو اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مسٹر نعمت علی میں بھی کچھ ایسی خصوصیات موجود ہیں جو میں نے کبھی عام لوگوں میں نہیں دیکھیں میرا اندازہ ہے کہ میری ٹیم ان پراسرار واقعات کا سراغ ضرور لگالے گی۔ دیکھو وہ آوازیں شروع ہوگئیں ہیں اور اب یہ جاری رہیں گی۔ شاید ساری رات یا شاید......''

''تو پھر کیا خیال ہے، کیوں نہ ہم......''

لیکن یہ جملہ ادھورا رہ گیا۔ عنایت بیگ نے کہا۔

''آج رات نہیں آج کی رات اور کل دن اور گزار لیا جائے۔ اس کے بعد ہم یقینی طور پر ان واقعات کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے۔''

جواب میں دلاور شاہ نے گردن ہلائی اور بولا۔

''بالکل ٹھیک ہے، میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ واقعات تم دونوں کے علم میں بھی آ گئے ہیں میں کسی قیمت پر یہ نہیں چاہوں گا کہ تم صرف میری خواہش پر اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کرلو۔ بلکہ پورے اطمینان کے ساتھ تمہیں ان حالات کا تجزیہ کرنا ہے اور اس کے بعد عمل کرنا ہے۔ جلد بازی میں کسی کو نقصان پہنچ جائے یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں ہوگی، چنانچہ یہ بات دن میں طے ہوگی اب ہم لوگ آرام کریں۔'' دلاور شاہ نے پوچھا۔

''جیسا کہ اس عمارت کے بارے میں آپ کو اندازہ ہو چکا ہے کہ اس میں بے شمار کمرے ہیں اور بہت سے کمروں میں فرنیچر بھی سجا ہوا ہے۔ آپ لوگ آرام سے جس کمرے کو اپنے لیے منتخب کرنا چاہیں۔ منتخب کرلیں۔ دونوں کو الگ الگ کمرہ چاہیے تو الگ کمرہ لے لیں۔''

''آپ لوگ کہاں سوتے ہیں۔'' عنایت بیگ نے پوچھا۔

''بھئی بالکل جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ہم نے ہمت کر کے یہ سب کچھ کرتو لیا ہے لیکن اب اتنے دلیر نہیں ہیں کہ ان پراسرار واقعات کی حیثیت کو جانے بغیر کوئی بہادری دکھانے کی کوشش کریں۔ ہاں ہم نے ایسے تمام انتظامات ضرور کرلیے ہیں کہ اگر کوئی انسان کسی ذریعہ سے ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو اس سے نمٹ لیں بلکہ آپ لوگ چونکہ اب ہمارے مہمان ہیں ہم یہ بالکل نہیں چاہیں گے کہ آپ کسی طرح حالات کے تقاضوں سے محروم رہیں۔ چنانچہ یہ چند چیزیں آپ بھی رکھ لیجیے۔''

یہ کہہ کر دلاور شاہ نے اپنے بھائی کو اشارہ کیا۔ رحیم شاہ نے دو ریوالور دو ٹارچیں اور فالتوں کارتوسوں کا پیکٹ عنایت بیگ کے حوالے کردیا۔ اور واقعی وہ بڑی ضروری چیزیں تھیں۔ جوان لوگوں کے پاس موجود نہیں تھیں۔ دلاور شاہ کے موقف سے بھی پتا چل گیا تھا یعنی یہ تینوں افراد ملازم اور آقا کا فرق مٹا کر ایک ہی میز پر کھاتے تھے اور ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنی خواب گاہ دکھائی اور اس کے بعد وہ کمرہ جس میں انہیں قیام کرنا تھا۔ یہ کمرہ اسی کمرے کے قریب تھا اور اس میں پرانے طرز کا شاندار فرنیچر لگا ہوا تھا۔ وہ فرنیچر جو اسی طلسمی داستان کا حصہ تھا۔ اب ان کے پاس اس موضوع پر گفتگو کے لیے خاصا مواد تھا۔ جب دلاور شاہ وغیرہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے اور انہوں نے ان کا دروازہ بند ہونے کی آوازسنی تو ان لوگوں نے بھی اپنا دروازہ بند کرلیا۔ حالانکہ عنایت بیگ کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ نعمت علی کون ہے کیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے آپ سے زیادہ اس پر اتنا بھروسا کیا تھا۔ حالانکہ اس بڑے اور وسیع کمرے میں دو بیڈ موجود تھے۔ لیکن عنایت بیگ نے کہا۔

''دیکھو نعمت علی بے شک دلیری دکھانے کے لیے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے لیکن سب سے دلیر آدمی وہ ہے جو اپنی حفاظت کرسکے چنانچہ کیوں نہ ہم ایک ہی بستر پر......''

عنایت بیگ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تو نعمت علی نے ہنس کر کہا۔

''ہاں کیوں نہیں ایک ہی بستر پر سوجاتے ہیں۔ باتیں بھی کریں گے کیا تمہیں نیند نہیں آرہی ہے؟''

''یار اصل میں کچھ باتیں قابل غور ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ دلاور شاہ نے ان پر غور نہیں کیا ہوگا ذہین آدمی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر اگر وہ غور نہ کرے تو مجھے حیرت ہوگی۔ میں ان آوازوں پر غور کررہا ہوں۔ تو کہنا میں یہ چاہتا

ہوں۔ کہ ان بھیانک آوازوں کی موجودگی میں جو دروازے اور کھڑکیاں بند ہوجانے کے باوجود مدھم مدھم آرہی ہیں۔ آسانی سے نیند آنے کا بھلا کیا سوال۔ لیکن میں جو غور کررہا ہوں۔ وہ ایک اور بات ہے، کیا تم اس بارے میں سوچ سکتے ہو؟''

''کیا......؟'' نعمت علی نے سوال کیا۔

''میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہوں کہ ان آوازوں کا ایک ہی انداز ہے۔ یعنی ماؤتھ باجے کے سر یا چیخیں، کیا چیخنے والوں کی آوازیں اگر وہ ایک ہی سر میں آتی رہتی ہیں۔ تو ہم ایسے کسی زیر زمین ٹیپ ریکارڈر پر یا کسی اور آواز نشر کرنے والے آلے یا مشین کے بارے میں سوچ سکتے ہیں اور اگر ان کا انداز ہر لمحے بدلا ہوا ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کوئی مشین نہیں بلکہ یہ آوازیں حقیقی ہیں۔''

نعمت علی نے تحسین آمیز نگاہوں سے عنایت بیگ کو دیکھا۔ اور گردن ہلا کر کہا۔

''بلاشبہ اس سوچ میں ذہانت ہے۔ کیا تم نے اس بارے میں......''

''آوازیں یکساں نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں ہر سر بدلا ہوا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے۔ ساری آوازیں حقیقی ہیں۔''

''میں، فیصلہ کن انداز میں یہ بات نہیں کہوں گا۔ ہر بات میں گنجائش رکھنی چاہیے۔''

''ایک سوال جو اس سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے عنایت بیگ، وہ میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں...... بولو......''

''نہ تو تم نے پہلے کبھی مجھے دلاور شاہ کے بارے میں کچھ بتایا اور نہ ہی مجھ پر اب تک یہ بات واضح ہوئی ہے کہ تم دلاور شاہ کے لیے یہ سب کچھ کیوں کرنا چاہتے ہو......؟''

نعمت علی کے سوال پر عنایت بیگ کچھ دیر خاموش ہوگیا۔ پھر کسی قدر شرمندہ لہجے میں بولا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم یہ سوال ضرور کروگے۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اگر تم اس بارے میں مجھے بتانا نہ چاہو تو بھی میں تمہیں مجبور کروں گا۔''

''یار حقیقت بتاؤں تمہیں، کبھی کبھی شیخی خوری ایسی طبیعت درست کرتی ہے کہ لطف آجاتا ہے اصل میں میری ملاقات دلاور شاہ سے ملک سے باہر ہوئی تھی۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ بہر حال یہ ایک راز ہے۔ لیکن یوں سمجھ لو کہ دلاور شاہ وہاں بھی ایک آسیبی چکر میں ہی مجھ سے ملا تھا۔ اور میں اپنے ایک ایسے غیر ملکی دوست کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ جس کا خیال تھا کہ وہ آسیبوں کے جال میں پھنس گیا ہے۔ کہانی بڑے دلچسپ اور لمبی ہے۔ اگر تم سننا چاہتے ہو تو سن سکتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''اگر تمہیں نیند نہیں آرہی اور گفتگو کرنا چاہتے ہو تو بے شک وہ کہانی بھی مجھے سنادو۔''

''بڑی دلچسپ اور قابل غور ہے۔ بات نیوزی لینڈ کی ہے۔ نیوزی لینڈ کی ایک چائے بنانے والی فرم میں میرا ایک دوست انجینئر تھا۔ جس کا نام مائیکل تھا۔ میں بھی وہاں کسی کام سے پہنچا اور ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔ دلاور شاہ بھی مائیکل کا دوست تھا۔ مائیکل نے اپنی ایک مشکل بتائی اور وہ مشکل ایک مکان تھا۔ جو اس کمپنی نے مائیکل کو رہائش کے لیے دیا تھا۔ ایک خالی مکان جو اتنا خوبصورت تھا کہ بتا نہیں سکتا۔ نیوزی لینڈ کا ماحول خوبصورت، درخت، پرفضا منظر لیکن وہ مکان آسیب زدہ تھا۔ اور مائیکل نے نشے کے عالم میں یہ بات سننے کے باوجود کہ مکان آسیب زدہ ہے۔ اسے لینے کی حامی بھرلی۔ چنانچہ کمپنی نے اسے ڈیکوریٹ کر کے مائیکل کے حوالے کردیا تھا اور جب ہوش وحواس کے عالم میں مائیکل کی پہلی رات وہاں پر گزری تو اس کے حواس بگڑ گئے۔ مکان کے آسیب رات پھر مکان کی اوپری منزل میں ہنگامہ کرتے رہے تھے۔ اسے ڈراتے رہے تھے۔ اور مائیکل کی ساری رات تباہ ہوگئی تھی۔ اور اس کے بعد اس کی نیند حرام ہوگئی۔

گھر کی بیشتر اشیاء غائب ہوجاتی تھیں، کچن میں افراتفری پھیل جاتی تھی اور ہر طرح کے نقصانات ہوتے رہتے تھے۔ قیمتی چیزیں غائب ہوجاتیں۔ مائیکل سخت پریشان تھا۔ اور اسی پریشانی کے عالم میں دلاور شاہ سے اس کی ملاقات ہوئی اور میری دلاور شاہ سے میں نے یوں ہی مذاق ہی مذاق میں دعویٰ کردیا کہ میری زندگی پراسرار واقعات سے بھری پڑی ہے اور میں جن بھوت اور آسیب آسانی سے بھگا دیتا ہوں۔

یوں، بس مائیکل کا معاملہ میرے سر پر آن پڑا، اور پہلی رات میں نے مائیکل کی اس رہائش گاہ میں گزاری۔

رات کو گیارہ بجے کے قریب چھت پر قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں مائیکل اور دلاور شاہ جاگ رہے تھے پھر آواز تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ ان دونوں کے حواس خراب تھے۔ توڑ پھوڑ، بھاگ دوڑ، لڑائی جھگڑا، میں بھی ان آوازوں کو سن رہا تھا اور بہت غور کررہا تھا۔ ان پر پھر یہ تجویز میں نے ہی پیش کی تھی کہ اوپر چل کر دیکھا جائے۔ لیکن دونوں میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی۔ تنہا میں بھی یہ ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن میں نے یہ کہہ دیا تھا ان لوگوں سے کہ میں ان بھوتوں کو بھگادوں گا۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ مائیکل پورے خلوص کے ساتھ مجھے گھر پر چھوڑ کر چلا گیا۔

دلاور شاہ بھی چلا گیا اور اس کے بعد صرف میں وہاں تنہا رہ گیا۔ حالت تو میری بھی خراب تھی۔ لیکن جانے کیوں میرے ذہن میں ایک عجیب سا احساس پرورش پا رہا تھا۔ وہ یہ کہ جس طرح بھی بن پڑا میں بہر حال اس راز کو معلوم کرلوں گا۔ کہ یہ بھوت کیسے ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ دن کی روشنی میں، میں اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کرکے چھت کی طرف جانے والے زینے کی طرف رخ کیا اور تھوڑی دیر بعد چھت پر پہنچ گیا۔

چھت پر جا بجا مختلف چیزیں بکھری ہوئی تھیں روٹیوں کے ٹکڑے، کپڑے، اور دوسری ایسی ہی چیزیں، حالانکہ مکان بہت خوبصورت تھا۔ لیکن اوپر کا منظر انتہائی بھیانک تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہاں پراسرار وآسیب اپنا گھر بنائے ہوئے ہیں۔ سامنے والی سمت ایک کمرہ تھا۔ جو لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس کے کچھ روشن دان نظر آرہے تھے۔ اس کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ نجانے کیوں میرے دل کو یقین ہوگیا کہ جو کچھ بھی ہے اسی کمرے میں ہے دوسری رات پھر ویسی ہی ہنگامہ خیز تھی۔ مائیکل اور دلاور شاہ تو آج بھی ہمت نہیں کرسکے۔ لیکن میں نجانے کیوں جان کی بازی لگانے پر تل گیا۔

اوپر پہنچا تو اس آسیب زدہ کمرے میں روشن دانوں سے روشنی جھلک رہی تھی اور آسیب اندر خوب دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ اس سے زیادہ ہمت نہیں کرسکا اور واپس آگیا۔ مائیکل اور دلاور شاہ تو مایوس تھے۔ لیکن میں دوسرے دن کچھ نہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو میں نے جان کی بازی لگا کر اس آسیب زدہ کمرے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت وہاں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میں اوپر کے کمرے کے قریب پہنچا دروازے کو آزمایا وہ لاک نہیں تھا۔ میں نے ہمت کرکے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ اور پوری قوت سے دروازہ کھول دیا۔ اندر سے کچھ عجیب سی آوازیں ابھریں۔ جنہوں نے کچھ لمحوں کے لیے تو میرے دل کی دھڑکنیں تک بند کردی تھیں لیکن دوسرے لمحے میں نے ان آوازوں کو پہچان لیا۔ اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس عجیب وغریب مخلوق کو دیکھنے لگا، یہ بندر کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے جو مجھے دیکھ کر چیخ رہے تھے۔ کمرے میں مختلف اشیاء کے انبار لگے ہوئے تھے۔ پھٹے ہوئے کپڑے کھانے پینے کی چیزیں پرس، جوتے، میں یہاں کھڑے ہوکر صورتحال کا تجزیہ کرنے لگا۔ اور یہ تجزیہ بڑا ہی دلچسپ تھا۔ یہ کمرہ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ عقبی حصے میں ایک روشن دان کھلا ہوا تھا اور دوسری طرف ایک پتلی گلی تھی۔ اس گلی میں بجلی کا ایک پول لگا ہوا تھا۔ جس پر لگی ہوئی لائٹ اس روشن دان سے اس کمرے میں پہنچتی تھی۔ اور رات کو جب یہ لائٹ جلتی تو کمرہ خود بخود روشن ہوجاتا۔ خوبصورت ماحول، بندروں کی آزادی یہ بندر اس کمرے

میں بسیرا کرتے تھے۔ اور دن کی روشنی میں کھانے پینے کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔ یہاں انہوں نے اپنا پورا خاندان آباد کر رکھا تھا۔

رات کو یہاں آنے کے بعد وہی، زر، زن اور زمین والا معاملہ شروع ہو جاتا تھا۔ بھاگ دوڑ، اچھل کود، لڑائی جھگڑا بس ان ساری چیزوں نے مل کر اس گھر کو آسیب زدہ بنا دیا تھا۔ میری تو لاٹری نکل آئی۔ سارا دن میں نے ان روشن دانوں کو بند کرنے میں صرف کر دیا۔ بندر کے تین بچوں کو وہاں سے ہٹا کر سامنے گلی کے دوسرے جانب والی چھت پر ڈال دیا۔ وہ چی چی کرتے ہوئے بھاگ گئے۔ کمرے کی صفائی کی اور چھت کی صفائی کی اور ان ساری چیزوں کو صاف ستھرا کرنے کے بعد میں نے فضول چیزیں ڈرم میں ڈالیں اور پھر تھوڑا سا ڈرامہ کیا۔ اپنے بدن کو زخمی کر لیا۔ لیکن یہ زخم نہیں بس ایسے ہی نشان تھے۔ چہرے پر بھی کچھ نشان بنا لیے۔ اور شام کو جب مائیکل اور دلاور واپس آئے تو میرا حلیہ دیکھ کر چونک پڑے۔

''ارے یہ کیا......؟'' دلاور شاہ نے پوچھا۔

''جنگ......''

''کیا مطلب......؟''

''جنگ کا مطلب میرا خیال ہے۔ جنگ ہی ہوتا ہے۔'' میں نے پھیکے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور وہ تشویش سے مجھے دیکھنے لگے۔

''خدا کے لیے مجھے بتاؤ تو کیا ہوا ہے؟''

''ایک خوشخبری ہے آپ لوگوں کے لیے۔''

''کیا......؟''

''میں نے یہ گھر بھوتوں سے پاک کر دیا ہے۔''

''اور تم زخمی ہو گئے ہو......؟''

''زیادہ نہیں۔''

اس رات تو ان لوگوں کو میری بات کا یقین نہیں آیا لیکن اس رات اور پھر دوسری اور تیسری رات بھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تو وہ میرے مرید بن گئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ معاملہ یہاں تک پہنچا ہے۔''

''مطلب......؟''

''یار سیدھی سی بات ہے۔ اگر ہم دلاور شاہ کی یہ مشکل حل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بڑی رقم ہاتھ آ جائے گی۔''

''تو یہ معاملہ ہے؟''

''ہاں......''

''یہ بندروں کی آوازیں نہیں ہیں۔''

''ہاں میں جانتا ہوں یار اور اسی لیے میری ہوا کھسک رہی ہے۔ اگر واقعی یہاں کی صورت حال مختلف ہوئی تو عزت جان بچانا بھی مشکل ہو جائے گی۔''

''لیکن عنایت بیگ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم اس مسئلے میں کیا کہتے ہو؟''

''دیکھو ساری صورتحال تمہارے علم میں آ چکی ہے۔ نعمت علی یوں سمجھ لو کہ نہ میں کوئی عالم ہوں۔ نہ تم، ہاں ایک بات ہے۔ کہ اگر ہم اس مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مال اچھا خاصا ہاتھ آ جائے گا اور ضرورت تو بہرحال ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے تم کیا کہتے ہو......؟ ایک نام آیا ہے۔ ہمارے سامنے نادر بیگ، تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا یہ شخص اس پراسرار عمارت میں ہونے والے واقعات کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ عزیزہ ناصری کے لیے۔''

''سوچنے کی تو بہت سی باتیں سوچی جا سکتی ہیں عزیزہ ناصری بذات خود بھی اس کی ذمہ دار ہو سکتی ہے۔ ہم لوگ اس موضوع پر باتیں کرتے رہے کہ اچانک ہی باہر انتہائی بھیانک آوازیں شروع ہو گئیں اور ایسی بھیانک چیخیں محسوس ہوئیں جیسے کہ بہت سے انسانوں کو گردن کاٹ کر چھوڑ دیا گیا ہو۔ اور وہ درد کی شدت سے تڑپ رہے ہوں۔ ایسی خوفناک حالت میں ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ عنایت بیگ کا رنگ فق ہو گیا۔

اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے نعمت علی کی طرف دیکھا۔ بولنے کی کوشش کی مگر اس کے منہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے

کے قریب پہنچ کر دروازہ کھولا۔ تو سامنے دلاور شاہ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ، چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

''کیا تم میں سے کوئی میرا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ دیکھ رہے ہو، سن رہے ہو یہ آوازیں، انتہا ہو گئی ہے۔ اب یہ کسی کی مجرمانہ سازش ہے تو آج میں اس سازش کو منظر عام پر لا کر رہوں گا۔ میری قوت برداشت انتہا کو پہنچ چکی ہے۔''

عنایت بیگ اب بھی ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ نعمت علی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ عنایت بیگ اس وقت قطعی اس قابل نہیں ہے کہ وہاں تک جائے گا۔ اس کی ساری دلیری ہوا ہو چکی ہے۔ لیکن نعمت علی چونکہ اسی کے ساتھ آیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ عنایت بیگ کی بے عزتی نہ ہونے پائے، چنانچہ اس نے کہا۔

''کیا چاہتے ہیں، مسٹر دلاور شاہ......''

''وہ دونوں بزدل خوف سے کانپ رہے ہیں اور میرا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اگر تم میں سے کوئی میرا ساتھ دے تو آؤ ہم اس کمرے کی جانب چلتے ہیں ذرا دیکھیں تو سہی کہ یہ خوفناک آسیب آخر ہے کیا بلا اور کیا بگاڑ لیتے ہیں میرا......''

''چلو......'' نعمت علی نے کہا۔ اور دروازے سے باہر نکل آیا۔ اس دوران خیر الدین خیری مسلسل خاموش تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ نعمت علی جو کچھ کر رہا ہے وہ اس سے مطمئن ہے۔ اگر کوئی غلط عمل ہوتا تو وہ اسے روکنے کی کوشش کرتا۔ یہ ان کے درمیان معاہدہ بھی تھا۔ اس لیے نعمت علی مطمئن تھا۔

دلاور شاہ کچھ اس طرح غصے میں نظر آ رہا تھا کہ لگتا تھا کہ آج وہ ساری حدیں پار کر دیگا۔ نعمت علی اس کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور دبے پاؤں اس کمرے کی جانب روانہ ہو گئے۔ جس کے بارے میں اندازہ تھا کہ آوازیں اسی کمرے سے آتی ہیں ایک لمبی راہداری اور سنسان غلام گردش کو عبور کر کے آخر کار وہ اس آسیب زدہ کمرے کی جانب پہنچ گئے۔ آوازیں یہاں نہایت دہشت ناک طریقے سے آ رہی تھیں۔ کچھ لمحے کے لیے یہ آوازیں اسی طرح آتی رہیں اور وہ دھڑکتے دلوں سے سنتے رہے۔ پھر یہ آوازیں مدھم ہونے لگیں اور یوں لگا کہ جیسے کوئی سسک سسک کر رو رہا ہو۔ دلاور شاہ نے ریوالور اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔

''تمہارا ریوالور تمہارے پاس موجود ہے۔''

''ہاں بالکل۔''

''ذرا میں یہ تالا کھولتا ہوں۔ اس نے آگے بڑھ کر تالا کھولا اور جیسے ہی تالے میں چابی گھومی سسکیوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ وہ لوگ آگے بڑھے اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ اب ہر طرف ایک خوفناک سناٹا پھیل گیا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی اور اندھیرا تھا۔ ٹارچوں کی روشنیاں چاروں طرف لہراتی رہیں ماحول انتہائی لرزہ خیز تھا۔ ایک عجیب و غریب سی نحوست چاروں طرف برس رہی تھی۔ مکڑی کے بڑے بڑے جالے نظر آ رہے تھے۔ چھت کے قریب سرسراہٹیں جیسے کوئی چھت سے چپکا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اس گہرے سناٹے میں ٹارچوں کی روشنی ادھر ادھر ڈالتے رہے۔ کہ اچانک ہی ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ ایسی بھیانک کہ انسان اگر ان چیخوں کو برداشت کرے تو اسے انسان ہی نہ کہا جائے۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے دیواروں سے اچانک ہی لاتعداد چہرے نمودار ہو گئے ہوں۔ ان کی بھیانک زبانیں سانپوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ اور وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ دلاور شاہ کے ہاتھ سے ٹارچ گر گئی اور وہ بری طرح دروازے کی طرف بھاگا۔

نعمت علی ایک لمحے تک وہاں رکا لیکن وہ چیخیں کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں بدن میں خوف جیسے جم رہا تھا۔ دلاور شاہ شدید غصے کے عالم میں یہاں آیا تھا اور اب ہمت ہار کر باہر نکل بھاگا تھا اور نعمت علی کو اس کی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔ کمبخت نے دل چھوڑ دیا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور اس کے بعد

نفرت بھری نگاہوں سے کھلے دروازے کے باہر دیکھا۔ پتہ نہیں دلاور شاہ کہاں جا مرا تھا۔ بہر حال وہ کمرے کے درمیان کھڑا ان آوازوں کو سنتا رہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ آوازیں صرف آوازیں ہیں یا ان کے ساتھ کچھ اور بھی ہے۔ چھت کے قریب ہونے والی سرسراہٹیں بھی ان آوازوں میں دب گئیں تھیں۔

بہر حال وہ دیر تک کھڑا حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور یہ سوچ رہا تھا کہ جب تک کوئی ہاتھ اس کے بدن کو چھوئے گا نہیں وہ آنکھیں نہیں کھولے گا اور ان آوازوں کو برداشت کرتا رہے گا۔ یہ اندازہ بھی لگانا چاہتا تھا کہ اس مکان کے آسیب صرف چیخ و پکار کرتے ہیں یا کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔

یہ ایک دلچسپ تجزیہ تھا۔ خاص طور سے اس لیے کہ وہ اپنے جسم سے بالکل بے فکر تھا۔ بہت دیر تک یہ آوازیں شور مچاتی رہیں اور وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر جب اسے یہ احساس ہوا کہ اب ان کی شدت میں کمی آ گئی ہے تو وہ آہستہ آہستہ سامنے والی دیوار کی جانب بڑھا۔ دیوار پر ہاتھ رکھ کر یہ اندازہ لگائے کہ کہیں ان کے اندر مائیکروفون تو فٹ نہیں ہیں لیکن چند ہی لمحوں میں اس نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ آوازیں دیواروں کے اندر سے آ رہی ہیں۔ البتہ ایک اور خوفناک بات ہوئی وہ یہ کہ اس کے پیروں کے نیچے فرش ٹیڑھا ہونے لگا۔ چیخیں انتہائی خوفناک ہو گئی تھیں۔ دوسری خوفناک بات یہ ہوئی کہ اس کے ہاتھ میں روشن ٹارچ کی روشنی مدھم ہونے لگی جیسے اس کے سیل ختم ہو گئے ہوں۔ یہ دونوں چیزیں ناقابل یقین تھیں۔ وہ گرنے لگا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اس نے اپنے جسم کو بیلنس کرنے کی کوشش کی۔ ٹارچ بجھ گئی تھی اور وہ نیچے کی جانب کھسکتا چلا جا رہا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ دروازے سے باہر نکل جائے۔ جیسے ہی وہ دروازے سے باہر نکلا۔ اچانک ہی ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اور پھر یہ بھیانک قہقہے ایک کے بعد ایک بلند ہوتے رہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کی شکست پر ہنس رہا ہو۔ پھر ایک دم گہری خاموشی طاری ہو گئی۔

"استاد محترم! کوئی ہدایت......؟" نعمت علی نے سرگوشی میں کہا۔

"ٹھیک جا رہے ہو...... جاری رہو۔" فوراً جواب ملا۔ اور نعمت علی کا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو گیا۔

بہت فاصلے پر اسے کچھ انسانی سائے نظر آ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ ان کے قریب پہنچ گیا اور اچانک ہی ٹارچ پھر سے روشن ہو گئی۔ یوں لگا جیسے اس میں نئی زندگی پڑ گئی ہو۔ جس جگہ وہ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں بھی انہوں نے روشنی کر رکھی تھی اور اس روشنی میں ان کے چہرے ہلدی کی طرح زرد ہو رہے تھے۔ یہ عنایت بیگ، دلاور شاہ، رحیم شاہ اور فرقان تھے۔ جو چاروں ساکت و جامد کھڑے غالباً اس کی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ پھر وہ ان کے قریب پہنچا تو دلاور شاہ نے کہا۔

"آؤ...... میرے کمرے میں......"

سب اس کمرے کی جانب بڑھ گئے جہاں دلاور شاہ نے اپنا قیام رکھا ہوا تھا۔ اس بڑے اور وسیع کمرے کی دیواریں، چھت سیاہ پتھر کی بنی ہوئی تھیں یہاں انہوں نے ایک بڑا لیمپ روشن کر رکھا تھا۔ دلاور شاہ نے غصیلے انداز میں کہا۔

"اور اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ میں اس کمرے کو کھدوا کر پھنکوا دوں اس کی دیواریں، اس کا فرش، سب کچھ تباہ کر دوں، میں ہار نہیں مان سکتا۔ ہار ماننے کا مطلب ہے کہ میں عزیزہ ناصری سے شادی نہ کروں۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔"

"جذباتی ہونے کی کوشش نہ کریں دلاور شاہ، بات کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔" نعمت علی نے کہا۔

"تم اس کمرے میں گئے تھے۔ کوئی اندازہ لگایا تم نے۔"

"صرف اتنا کہ یہ کام کسی انسان کا معلوم نہیں ہوتا اور شاید کمرہ کھدوانے کے بعد بھی یہ آوازیں بند

نہیں ہوں گی۔"

نعمت علی کے ان الفاظ نے ایک لمحے کے لیے وہاں خاموشی طاری کر دی تھی۔ پھر دلاور شاہ نے کہا۔

"گویا کوئی حل نہیں ہے کہ میں اس عمارت کو دوبارہ آباد کر لوں۔ لیکن ایک بات میں بھی تم لوگوں کو بتا دوں میرے دوستو! خدا نے مجھے جو کچھ دیا ہے۔ اتنا ہے کہ میں دس خاندان آباد کر لوں تب بھی اس میں کوئی فرق نہیں پڑے۔ میں اپنی دولت کا ایک حصہ تم لوگوں کو دینے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کروں گا۔ میں اس عمارت کو نہیں چھوڑوں گا۔ اب تم لوگ یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں سخت پریشان ہوں۔"

"سب سے پہلے ہمیں چائے تیار کروانی چاہیے کیوں فرقان۔"

"اس وقت میں کچن میں بالکل نہیں جاؤں گا۔ ہاں چائے کے سامان کا بندوبست میں نے الگ سے کر رکھا ہے۔ یہیں بیٹھ کر چائے بنائی جائے گی۔ اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو۔"

"بھلا چائے کا معاملہ اور کوئی اعتراض کرے۔ اچانک ہی باہر تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ یوں لگا تھا جیسے مکان کے آسیب پوری طرح اس مکان میں کھیلتے پھر رہے ہوں۔ تیز ہواؤں کی سیٹیاں، جگہ جگہ سے ابھر رہی تھیں۔ اور ادھر فرقان نے چائے کا بندوبست شروع کر دیا تھا۔ گیس اسٹو جلا لیا گیا۔ پانی وغیرہ تمام چیزوں کا بندوبست یہیں تھا۔ برتن بھی موجود تھے۔ چائے کی پتی، دودھ، شکر، پھر اچانک ہی باہر بادلوں کی گرج ابھری اور تیز بجلی چمکنے لگی۔ بہت دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور محسوس ہوا کہ جیسے بارش صبح تک بند نہیں ہو گی چائے نے اس وقت جو مزہ دیا تھا اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اچانک ہی نعمت علی کو کچھ خیال آیا۔ اس نے دلاور شاہ سے کہا۔

"دلاور صاحب ایک بات تو بتائیے۔ آپ نے اس مکان کی تاریخ تو معلوم کی ہو گی۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ آخری بار یہ مکان کس کے قبضے میں تھا۔"

"میں بالکل نہیں جانتا۔ اور شاید مشکل ہو جائے۔ کیونکہ تھوڑی سی تفصیلات مجھے عزیزہ ناصری سے حاصل ہوئی تھیں۔ یہ ان کے خاندان کا گھر تھا۔ لیکن آبادیاں یہاں سے دور ہٹ گئیں تھیں۔ اس وقت سے یوں ہی پڑا ہے۔ اور اس پر کسی نے کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ چنانچہ یہ حکومت کی تحویل میں چلا گیا۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں جو قیمتی فرنیچر آپ نے نیچے سے نکلوا کر اوپر منگوایا ہے۔ یہ کس نے خریدا تھا اور کس نے انہیں تہہ خانوں تک پہنچوایا......؟"

"افسوس اس بارے میں، میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"میں اصل میں جو کہنا چاہتا تھا۔ وہ یہ کہ ان سارے معاملات کا تعلق ان تہہ خانوں سے تو نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ اندر کوئی ایسا بندوبست کیا گیا ہو۔"

دلاور شاہ پر خیال نگاہوں سے نعمت علی کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

"ابھی چلنا چاہو تو ابھی...... چلو......" دلاور شاہ نے کہا اور نعمت علی ہنس پڑا۔

"کیوں......؟ کیا ہوا......؟"

"تہہ خانے میں جائیں گے۔ اگر وہاں کہیں ہنگامہ ہوا تو آپ سب لوگ تو بھاگ آئیں گے مجھے وہاں چھوڑ کر۔"

دلاور شاہ اس کے الفاظ سے شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ کچھ لمحے وہ خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

"ہاں واقعی یہ ایک افسوسناک عمل ہے۔ جس پر میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔ خود تمہیں اپنے ساتھ اپنی مدد کے لیے لے گیا تھا۔ لیکن میں خود وہاں سے بھاگ آیا۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی جو میں نے کی۔"

"ارے نہیں...... نہیں، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ آج نہیں تو کل دن کی روشنی میں ہم تہہ خانے کو دیکھیں گے۔"

باہر مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ پھر دونوں اپنے کمرے میں گئے عنایت بیگ نے کہا۔

"حقیقت تو یہ ہے۔ نعمت علی کہ میں تو ہمت ہارتا

چلا جا رہا ہوں۔ یہاں کے معاملات تو واقعی بے حد سنسنی خیز ہیں۔ اور میں خوف محسوس کر رہا ہوں۔

"فی الحال اپنے محسوسات کو پس پردہ ڈال کر آرام کی نیند سو جاؤ، ورنہ میں تو کم از کم صبح کو بیمار پڑ جاؤں گا۔"

"پتہ نہیں...... عنایت بیگ سو گیا تھا یا نہیں، لیکن نعمت علی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ بس ایک ہلکی سی غنودگی کا عالم اس پر طاری تھا۔ اچانک ہی اس نے محسوس کیا کہ ایک شی...... شی کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی کسی کو مخاطب کرتا ہے۔ اس نے چونک کر آنکھیں پھاڑ دیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جوان کے کمرے کا واحد دروازہ تھا اور جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے کھلے دروازے پر نگاہ جما کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ دروازہ کس نے کھولا۔ اس نے حیرت بھرے انداز میں سوچا اور پھر ان حقیقتوں پر غور کرنے لگا۔ جنہیں پر اسرار نہ سمجھا جا سکے۔ باہر تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور بارش بھی ہو رہی تھی۔ دروازے کا بولٹ ڈھیلا ہے ہو سکتا ہے۔ ہوائیں آہستہ آہستہ دروازے پر دباؤ ڈالتی رہی ہوں اور آخر کار کنڈی کھل گئی ہو لیکن شی شی کی یہ آواز اور ان آوازوں کے بارے میں بھی جو اندازہ ہوا کہ وہ ہوا کی سرسراہٹیں ہو سکتی ہیں۔

لیکن پھر اس کی نگاہیں بے اختیار دروازے کی طرف اٹھیں تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی انسانی جسم دروازے کے سامنے سے گزرا ہو۔ ایک بار پھر زمین پر پاؤں مار کر اسے مخاطب کیا گیا۔ جیسے پہلے کیا گیا تھا اور اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ دروازہ بھی کسی نے کھولا ہے اور دروازے کے باہر بھی کوئی موجود ہے اس نے اپنے قریب سوئے ہوئے عنایت بیگ کو دیکھا اور یہ تصور ختم ہوا کہ وہ عنایت بیگ ہو سکتا ہے۔ پھر کون دلاور شاہ، رحیم شاہ، یا پھر فرقان......

لیکن دیکھے بغیر کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ چنانچہ وہ بے آواز اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ قدموں سے کھلے دروازے کی جانب چل پڑا جب اس نے دروازے سے باہر قدم رکھا تو اس سے کوئی پندرہ گز کے فاصلے پر ایک انسانی جسم متحرک نظر آیا۔ شانوں سے لے کر پیروں تک سیاہ لباس میں ملبوس وہ اس طرح وہاں کھڑا تھا جیسے وہاں کسی کا منتظر ہو۔ اس کے قد و قامت اور اس کے لباس سے کم از کم یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں ہے۔ یعنی دلاور شاہ، رحیم شاہ، یا فرقان، پھر یہ کون ہے......؟ تجسس نے اسے خوف سے بیگانہ کر دیا۔ ایک قدم آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ وہ سایہ بھی آگے چل پڑا ہے ایک پر اسرار انوکھا اور دلچسپ کھیل، جس کے اختتام کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کیا ہونا ہے نعمت علی نے قدم آگے بڑھا دیے۔ نڈر اور بے خوف ہو کر، تجسس اب ہر احساس پر حاوی ہو گیا تھا اور وہ ہر قیمت پر اب یہ جان لینا چاہتا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔"

اسی وقت خیر الدین خیری کا خیال آیا اور اس نے دبی آواز میں کہا۔

"ماموں! ماموں! کیا تم ہو......؟ ماموں...... استاد محترم...... لیکن کوئی جواب نہیں ملا...... یہ پہلا موقع تھا کہ اسے محترم کہہ کر بھی جواب نہیں ملا تھا۔ لیکن اسے کوئی خوف نہیں محسوس ہوا۔

پر اسرار سایہ اس طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے وہ اس کی رہنمائی کر رہا ہو۔ اور وہ بھی شاید اس کے سحر میں گرفتار تھا۔ تھوڑے بہت خوف کا احساس تو ہو رہا، لیکن وہ ہر احساس سے بے نیاز اب اس سائے کا تعاقب کر رہا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے بالکل اجنبی راستوں پر جا رہا ہے۔ حالانکہ اس عمارت کو اس نے کافی حد تک دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت جن راستوں سے وہ گزر رہا تھا۔ وہ بالکل ہی نیا اور اجنبی معلوم ہو رہا تھا۔ وسیع و عریض راہداری جس کی دیواریں اور چھتوں کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ لکڑی کے بنے ہوئے دروازے اور اونچی اونچی کھڑکیاں، قرب و جوار میں چند کرسیاں لیمپ اور کراکری کا کچھ سامان بھی نظر آ رہا تھا۔ دیواروں پر روغنی

تصویریں جن کے رنگ اور نقوش مدھم پڑ چکے تھے۔ تصویروں کے گرد لمبی لمبی سیاہ موم بتیاں روشن تھیں۔ اور ان کی جھلملاتی، کانپتی روشنی میں تقریباً 50 سے 60 فٹ لمبی اس راہداری کو عبور کرتے ہوئے۔ اس نے یہ تمام عجیب و غریب چیزیں دیکھیں۔ اس کے حواس بھی بحال تھے۔ اور ہر طرح کا خوف اس کے دل سے نکل چکا تھا۔ حالانکہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا لیکن اس کے باوجود ایک سحر زدگی کی کیفیت اس پر بے شک سوار تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس سائے کو بھی بھول گیا۔ جس کی وجہ سے اس نے اس تعاقب کا آغاز کیا تھا۔ یہاں جو چیزیں موجود تھیں۔ انہیں دیکھ کر ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔

اچانک ہی اس کے کانوں میں ایک عجیب سی آواز ابھری اور اس آواز نے اسے ایک بار پھر ہوش و حواس کی دنیا میں لا پھینکا۔ وہ چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آواز سامنے سے آ رہی تھی۔ یہ کوئی عجیب سے ساز کی آواز تھی۔ کانپتی اور سریلی آواز لیکن اس میں ایک ردھم تھا۔ بجانے والا یقینی طور پر ماہر فنکار تھا۔ کیونکہ چند ہی لمحوں کے بعد اس پر خود فراموشی کی سی کیفیت چھانے لگی۔ جس طرح سانپ بین بجانے والے کے سامنے مست ہو جاتا ہے۔ اس کا بھی یہی حال تھا۔ رات کے اس ہولناک سناٹے میں کسی نامعلوم ہستی کا یوں ساز بجانے سے اس پر دہشت کے بجائے فرحت کا حملہ ہوا تھا۔ دل میں ایک عجیب سی خوشی پیدا ہو گئی تھی۔

وہ آگے بڑھا اور اس دروازے تک پہنچ گیا۔ جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ دروازے کے قریب پہنچا دروازہ خود بخود کھل گیا اور اس سے روشنی نظر آئی لیکن یہ روشنی موم بتیوں کی نہیں تھی۔ دروازہ کھلتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے ساز کی آواز پیچھے ہٹ گئی ہو۔ اس نے سامنے دیکھا اور ایک ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ لیکن اچانک ہی اسے یوں لگا جیسے وہاں کوئی موجود ہو۔ روشنی کمرے کے تمام گوشوں کو منور کیے ہوئے تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کمرہ صدیوں سے بند پڑا ہے۔ ساز کی آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ ایسا ہولناک سناٹا جو اعصاب کو چیرتا ہوا روح

کوزخمی کیے دیتا تھا۔ آوازوں کے رک جانے سے یوں محسوس تھا جیسے کوئی خوفناک واقعہ عمل میں آنے والا ہو۔ اس کی چھٹی حس بتارہی تھی کہ اس خاموشی میں بھی کوئی راز ہے۔ اچانک ہی اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ اعصاب شکن خاموشی دور ہوجائے۔ اور وہی چیخنے چلانے کی آوازیں دوبارہ سنائی دیں۔

یہ خاموشی ان آوازوں سے زیادہ بھیانک اور پر خطر لگ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آوازوں کے بغیر اس کمرے کی ہیبت کا احساس شعور کو نہیں ہوتا تھا۔ جو دل و دماغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر بے اختیار اس کے دل میں جوش وخروش کی ایک ناقابل برداشت لہر نمودار ہوئی۔ اس نے پستول جیب میں رکھا۔ حالانکہ کمرے میں روشنی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ٹارچ روشن کرلی۔ اور پھر کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ، کمرے کا چکر لگانے لگا۔

اس نے پاگلوں کی طرح دیوار پر گھونسے مارے اور پیروں سے فرش بجایا لیکن دیوار سے اور سنگی فرش کے اندر سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ جنوبی دیوار پہ بہت بڑے آتش دان کے قریب کھڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ اس نے ان کھڑکیوں کے بند دروازوں کا معائنہ کیا لیکن کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوئی۔ جو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کہ یہاں کیا ہے؟ آتش دان میں جلی ہوئی لکڑیوں کا جلا ہوا برادہ بکھرا ہوا تھا۔ آتش دان برج سے کہیں زیادہ بڑا تھا اس نے اس میں گردن ڈال کر اوپر چمنی کی طرف دیکھا۔ چمنی بہت اونچی اور تاریک تھی۔ لیکن درمیان میں ایک موٹا سارسا لٹک رہا تھا۔ آتش دان کی دیوار کے ساتھ ساتھ لوہے کے کئی کڑے گڑے ہوئے تھے۔ ان کڑوں میں دو دوفٹ لمبی زنجیریں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ حیران ہوگیا۔

ان زنجیروں اور کڑوں کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اسی عالم میں اس نے فیصلہ کیا کہ دن کی روشنی میں اس چمنی کا بغور جائزہ لے گا۔ نجانے کیوں چھٹی حس یہ بتا رہی تھی کہ ان پراسرار آوازوں کا راز اس چمنی کے سینے میں چھپا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کی متجسس نگاہیں قرب و جوار کا جائزہ لیتی رہیں پھر اچانک آتش دان کے اندر اسے ایک اور چیز نظر آئی۔ جس پر نظر ڈالتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے یہ آتش دان سے راکھ کریدنے اور راکھ ہٹانے والی لوہے کی موٹی سی سلاخ تھی۔ اس کے ایک سرے پر بالکل تازہ خون جما ہوا تھا۔ وہ اس پر جھک گیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ بہت دیر تک وہ اسے ہاتھ لگائے بغیر جھک کر قریب سے دیکھتا رہا۔ خون نہ صرف ہتھی پر جما ہوا تھا بلکہ سلاخ کے نچلے اور درمیانی حصے پر بھی موجود تھا۔ وہ سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

کیا یہ سلاخ اس سے پہلے بھی یہاں پڑی ہوئی تھی۔ لیکن اس پر تازہ خون کے دھبے کہاں سے آئے۔ یہ خون انسان کا ہے...... یا پھر......؟ اسی قسم کے کئی سوالات اس کے ذہن میں بجلی کی طرح آئے تھے۔ اگر یہ سلاخ پہلے یہاں موجود نہیں تھی۔ تو اسے کون یہاں لایا؟ اور وہ کمرے میں کس وقت اور کس راستے سے داخل ہوا......؟ کیا اس چمنی کے راستے سے کوئی یہاں آتا ہے۔ یہ خون ممکن ہے۔ ہم لوگوں کو جو یہاں اس عمارت میں اس وقت موجود تھے۔ خوفزدہ کرنے کے لیے اس سلاخ پر لگایا گیا ہو۔ اس خیال نے اس کے ذہن میں کچھ اور کرید پیدا کردی۔ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

''تم لوگ جو کوئی بھی ہو دوستو! یہ سمجھ لو کہ تمہارے آخری لمحات قریب آگئے ہیں اور اب تم کم از کم مجھ سے نہیں بچ سکو گے۔ سمجھ رہے ہو، میں تم سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوں۔ تم کوئی بھی ہو، میرے سامنے آکر مجھ سے بات کرو، دیکھتا ہوں تم کس طرح یہاں کامیاب ہوسکتے ہو۔ اب جب میں اس عمارت میں آگیا ہوں تو تمہاری ہر سازش ختم کرکے یہاں سے جاؤں گا۔''

اس نے جھک کر خون آلود سلاخ اٹھائی لیکن سلاخ کو چھوتے ہی جیسے زلزلہ آگیا۔ کمرہ بھیانک آوازوں سے گونج اٹھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے بے شمار بدروحیں خوفناک آوازوں کے ساتھ اس کے اردگرد رقصاں ہوگئی ہیں۔ وہ چاروں طرف سے اس پر حملہ کر رہی تھیں۔ اس نے بے اختیار سلاخ فرش پر دے ماری ایک خوفناک آواز آئی۔ جس جگہ زمین پر سلاخ گری تھی وہاں سے تازہ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ ایسا لگا جیسے اس نے سلاخ زمین پر نہ ماری ہو، بلکہ کسی کے سینے میں گھونپ دی ہو، خون کے اس فوارے کے بے شمار چھینٹے اس پر پڑے تو اس کی اعصابی قوت ساتھ چھوڑ گئی۔ اور دوسرے ہی لمحے اس نے کمرے سے باہر چھلانگ لگادی۔ دروازے کے قریب پہنچا تھا کہ عنایت بیگ کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

''کیا ہوا......؟ کیا ہوگیا......؟''

نعمت علی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

عنایت بیگ نے اسے سنبھالا اور بولا۔ ''یہ رات میں تم اٹھ کر کہاں چلے گئے تھے؟''

''مجھے پانی پلاؤ۔''

''میں لاتا ہوں...... لیکن تم......؟''

''پلیز مجھے پانی پلاؤ......'' اس نے کہا۔ اور عنایت بیگ پانی لانے کے لیے دوڑ گیا۔ اسے صورتحال کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ پانی پلانے کے بعد جب وہ اس کے قریب آیا تو اس نے اس سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہاری نیند خراب ہوئی۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو......؟'' میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ تم خود میری وجہ سے ان الجھنوں کا شکار ہوئے ہو، کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔''

''صرف مجھے، بہر حال میرا مسئلہ تو بالکل مختلف ہے۔''

''اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہوا کیا تھا۔''

''بس تم یہ سمجھ لو کہ میرے ذہن میں دیوانگی آگئی تھی۔''

''مطلب......؟''

''میں اس کمرے کی حقیقت جاننے گیا تھا۔''

''اکیلے......؟''

''اور کیا......''

''مجھے کیوں نہ جگایا......؟''

''کیا فائدہ......؟''

''کیوں فائدہ یا نقصان کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر تمہارے دل میں یہ خیال آیا تھا۔ تو تم مجھے جگا لیتے، کیا وہ زیادہ اچھا نہیں ہوتا؟''

''خیر وہ ایک الگ بات ہے کہ کیا اچھا ہوتا کیا برا ہوتا۔ لیکن بہر حال میں اس کمرے میں داخل ہوگیا تھا۔''

''داخل ہوگئے تھے......؟''

''ہاں......''

''تو پھر......؟''

''واقعی وہاں کی صورتحال بڑی عجیب وغریب ہے۔''

''تم نے واقعی اس وقت کمال کر ڈالا۔''

''کیوں......؟''

''بھئی تم تنہا اس کمرے میں گئے۔ اور وہ بھی رات کے اس پہر، اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو، اچھا خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ وہاں تم نے کمرے میں کیا دیکھا۔''

ایسی پراسرار چیزیں جن کے بارے میں شاید میں خود بھی ابھی اندازہ نہیں لگا سکتا۔''

''مثلاً......''

''کیا مطلب......؟''

''مجھے کچھ بتاؤ تو سہی پلیز۔'' اور جواب میں اس نے عنایت بیگ کو ساری تفصیلات سنا دی اور پھر اس نے کہا۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب فراڈ ہے۔ یقیناً یہ کچھ ایسے لوگوں کا کام ہے۔ جو یہ نہیں چاہتے کہ بے چارہ دلاور شاہ عزیزی ناصری سے شادی کرے۔ لیکن دوست اب ہونا وہی چاہیے جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔''

دلاور شاہ کو عزیزہ ناصری سے شادی کرنا ہوگی۔ اور ہم یہ سب کچھ کریں گے۔ ان لوگوں کو اس بارے میں بتانا چاہیے۔''

''کیوں......؟''

''اس میں کیا حرج ہے......؟''

''چلو ٹھیک ہے...... جیسے تم مناسب سمجھو......

ویسے وہ لوگ ابھی جاگے نہیں ہیں۔''

''یہ اچھی بات ہے۔''

دوسری صبح ناشتے کی میز پر نعمت علی نے دلاور شاہ کو ساری کہانی سنائی تو وہ دنگ رہ گیا۔ فرقان تو تھر تھر کانپنے لگا۔

رحیم شاہ نے کہا۔ ''تم تو بے انتہائی بہادر آدمی معلوم ہوتے ہو، دوست......''

میں نے بھائی صاحب سے یہ ہی کہا تھا کہ یہ شخص مجھے بڑا بہادر معلوم ہوتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے یہ ہمارے کام آجائے۔ لیکن اس کے باوجود تمہیں اس طرح خطرے کا سامنا نہیں کرنا چاہیے۔''

میں نے جو کچھ کیا ہے یا نہیں کیا...... ''لیکن کیا تم لوگ اس کمرے میں جانے کی ہمت کرو گے......؟''

نعمت علی بولا۔

''کیوں نہیں......؟''

''تو پھر آؤ...... میں تمہیں وہ سلاخ اور زمین سے ابلنے والا خون دکھاؤں۔'' وہ نعمت علی کے ساتھ چل پڑے تھے۔ اس نے بہادری کے ساتھ آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا تو کمرہ پہلے کی طرف صاف اور خالی تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہاں نہ خون تھا۔ نہ سلاخ تھی۔ بلکہ ایسا لگتا تھا۔ جیسے یہاں کوئی آیا ہی نہ ہو۔ سلاخ آتش دان کے اندر پڑی ہوئی تھی۔ لیکن اس پر نہ خون کے دھبے تھے نہ وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ بڑی عجیب شرمندگی بھی ہوئی اور وہ سخت پریشان ہوگیا۔ دلاور شاہ، رحیم شاہ سب لوگ چند لمحات تو وہاں کھڑے رہے۔ پھر دلاور شاہ نے کہا آؤ واپس چلتے ہیں۔ وہ باہر نکلا، تو اس کے ذہن پر ایک عجیب سا تردد سوار تھا۔ وہ باہر آنے کے بعد شرمندگی سے ان لوگوں کو دیکھنے لگا تو دلاور شاہ بولا۔

''ہم جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان میں اس واقعہ کا اس طرح ہوجانا حیرانی کا باعث نہیں ہے۔ تم اس پر توجہ نہ دو اور اپنا دل خراب نہ کرو۔'' پھر ساڑھے دس بجے کے بعد ایک شخص اس عمارت کے دروازے کے پاس کھڑا نظر آیا۔ سہا سہا، ڈرا ڈرا، اندر پہنچا تھا۔ اس وقت یہ سب عمارت کے برآمدے میں ہی موجود تھے۔ آنے والے سے دلاور شاہ بولا۔

''ہاں...... رحمت، کیا بات ہے......؟''

''صاحب جی بی بی صاحب نے آپ کو بلوایا ہے۔'' دوپہر کا کھانا آپ ان کے ساتھ ہی کھایئے گا۔''

''اوہو...... اچھا ٹھیک ہے۔ تم جاؤ میں آجاؤں گا۔''

''رحیم شاہ صاحب کو بھی بلایا ہے۔''

''ہاں کیوں نہیں رحیم شاہ بھی آئیں گے۔''

دلاور شاہ نے کہا اور ملازم چلا گیا۔ تب دلاور شاہ نے کہا۔ ''عزیزہ ناصری اکثر لوگوں کی دعوت کرتی رہتی ہیں۔ وہ اس بات پر ہم سے سخت ناراض ہیں کہ ہم خطرہ مول لے کر اس مکان میں کیوں رہ رہے ہیں۔ اس کے تاثرات بڑے عجیب ہیں۔ اپنا خاندانی مکان ہونے کی وجہ سے اس سے محبت بھی کرتی ہیں۔ لیکن بہر حال یہاں ہونے والے واقعات اور حالات سے کبھی کبھی خوفزدہ بھی ہوجاتی ہیں۔

بہر حال وہ دونوں تیار ہو کر نکل گئے اور فرقان سے کہہ گئے کہ وہ ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کرے۔ فرقان باورچی خانے میں چلا گیا۔ تو نعمت علی نے عنایت بیگ کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کیا خیال ہے عنایت صاحب ہم اپنا کام شروع کریں۔''

عنایت کے اندر ایک ہچکچاہٹ سی تھی۔ اس نے کہا۔

''کس طرح......؟''

''مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ عنایت بیگ جیسے تم ان حالات اور واقعات سے بددل ہوتے جا رہے ہو۔''

عنایت بیگ نے فوراً ہی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''کچھ امید ہے......؟''

''کیوں نہیں......''

''تو ٹھیک ہے......'' میں بس یہ ہی سوچ رہا ہوں کہ کہیں صورتحال کوئی مشکل شکل نہ اختیار کر جائے۔''

''اب جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا لیکن ابھی تک میں مکمل طور پر اس بات پر اتفاق نہیں رکھتا کہ یہ سب کچھ آسیبی کارنامے ہیں۔''

''تو پھر......؟''

''آؤ...... ذرا جائزہ لیتے ہیں...... اور اس کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ عمارت کے اردگرد کوئی آبادی، کوئی بستی نہیں تھی۔ دور دور تک کوئی انسان ادھر ادھر نظر نہیں آتا تھا۔ نزدیک ترین بستی جس میں عزیزہ ناصری رہتی تھی۔ یعنی رنگ نگر یہاں سے تقریباً ساٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھی۔ ہمیں اس عمارت کی صحیح تاریخ کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا جیسا کہ بات معلوم ہوئی تھی کہ یہ عمارت عزیزہ ناصری کے بزرگوں کی تھی۔ لیکن پھر بھی اس کے بارے میں اور بھی تھوڑی بہت معلومات ملنی چاہیے تھیں کوئی ایسی عمر رسیدہ شخصیت جو یہاں بہت پہلے سے رہتی ہو، اس سے معلومات حاصل ہو تو کچھ کام بنے...... فرقان نے دوپہر کا کھانا تیار کر دیا۔ نعمت علی اور عنایت بیگ نے اپنے ہی کمرے میں کھانا کھایا تھا اور اس کے بعد نعمت علی نے عنایت بیگ سے کہا۔

''کیا خیال ہے دوست ہمت کرنی ہے......؟''

''کک...... کیسی ہمت......؟'' عنایت بیگ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''یار کمال ہے۔ اس سے پہلے تو میں نے تمہیں اتنا بزدل نہیں دیکھا۔''

''بس یوں سمجھ لو کہ ان حالات سے نجانے کیوں میری طبیعت کچھ الجھی سی ہے۔''

''آؤ...... ذرا...... اس کمرے کی چھت پر دیکھتے ہیں۔ میں نے تمہیں چمنی کے بارے میں بتایا تھا ...... ناں......؟''

''تو پھر آؤ......'' اور اس کے بعد وہ دونوں کمرے کی چھت پر جانے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔

راستہ نہیں ملا۔ البتہ ایک سیڑھی دستیاب ہوگئی۔ جس کو لگا کر ہم کمرے کی چھت پر پہنچ گئے اور اس کے بعد خوب اچھی طرح دور دور تک اس پوری عمارت کی چھتوں پر دیکھا۔ لیکن وہاں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی۔ اوپر پہنچنے کے بعد میں چمنی کے اندر جھانکا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ آواز کدھر سے آتی ہے۔ اگر یہ آواز کسی مشین سے سنائی دیتی تو وہ مشین آخر کہاں چھپائی جا سکتی ہے۔ سلاخ سے خون نکل آنا ایسی کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ کوئی بھی شوخی باز ایسی چیزیں تیار کر سکتا تھا۔ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز دبائی گئی ہو۔ جس سے خون ابل پڑے لیکن بہر حال یہ سارے احساسات کچے تھے اور ان کے بارے میں زیادہ اعتماد کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔''

☆......☆......☆

شام کو چار بجے کے قریب دلاور شاہ اور اس کا بھائی واپس آگئے۔ دلاور شاہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''دوستو! میں بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے کر آیا ہوں۔''

''وہ کیا......؟''

''اصل میں، میں نے عزیزہ ناصری کو مطمئن کر دیا ہے کہ بہت جلد اس آسیب زدہ مکان کی مرمت شروع کرادوں گا۔ میں نے اس آسیب زدہ مکان کی روحوں پر قابو پالیا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ روحیں وغیرہ کچھ نہیں ہیں۔ بلکہ کچھ ایسے وہم پیدا ہوگئے ہیں۔ جن کی بنا پر اس مکان کو آسیب زدہ سمجھ لیا گیا ہے۔ میں سارا کام ٹھیک کرادوں گا۔''

''ویری گڈ......''

''ویسے آپ کو طلب کیوں کیا گیا تھا......؟''

''اصل میں عزیزہ ناصری بھی بری طرح تنہائی کا شکار ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہم دونوں جلد شادی کر لیں تاکہ اس کے بعد حالات پرسکون ہو جائیں۔ میں نے بھی اس بات کا وعدہ کر لیا ہے۔''

''کیا آپ سے اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ میر امطلب ہے عزیزہ ناصری سے شادی کے بعد آپ اسی مکان میں رہیں گے؟''

''ہاں...... کیوں نہیں......''

''لیکن کیا، آپ نے یہ وعدہ زیادہ جلد بازی میں نہیں کرلیا۔''

''دیکھ لیں گے شادی تو ہوجائے۔'' اگر ہم اس مکان میں گزر بسر نہ کرسکے تو کہیں اور بندوبست کر لیں گے۔ ویسے نجانے کیوں مجھے اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ آپ ضرور ان آوازوں پر قابو پالیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بس یہی آوازیں ہیں جو ہمیں خوفزدہ کرتی ہیں...... ورنہ باقی تو کوئی اور بات نہیں ہے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ آوازوں کا سراغ لگالیں۔ ویسے آپ سے کچھ چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً ٹیپ ریکارڈر۔''

''ٹیپ ریکارڈر......''

''ہاں......''

''اتفاق ہے کہ ٹیپ ریکارڈر بمع اپنے تمام لوازمات کے ساتھ میرے سامان میں موجود ہے۔'' اصل میں موسیقی کا شوقین ہوں اور کچھ خاص قسم کی چیزیں اپنے ساتھ رکھتا ہوں لیکن کیا کروں یہاں تو صورتحال ہی کچھ ایسی پیش آگئی ہے کہ میں یہ سب کچھ نہیں کرسکا۔ میں ٹیپ ریکارڈر آپ کو فراہم کردوں گا۔''

''آپ مجھے دے دیجیے۔'' اور اس نے اپنے سامان سے وہ قیمتی ٹیپ ریکارڈر نکال کر نعمت علی کو دے دیا۔ یہ بہت چھوٹا اور اس کے کیسٹ بھی بہت چھوٹے تھے۔ دراصل نئی چیز تھی۔ اتنی طاقتور کہ بجلی کے بغیر بھی بیٹری سے چلا کر دور دور کی ریکارڈنگ کی جاسکتی تھی۔ اب اس کے بعد انہیں رات کا انتظار تھا۔ اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کب یہ آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔

رات کو تقریباً بارہ بجے کا وقت تھا۔ کہ کمرے سے رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں اٹھیں، پھر آہستہ آہستہ بلند ہوتی چلی گئیں۔ نعمت علی نے فوراً ٹیپ ریکارڈر آن کرلیا ٹارچیں روشن کیں اور دبے پاؤں اس کمرے کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچتے ہی رونے کی آوازیں لرزا خیز چیخوں میں تبدیل ہوگئیں تھیں اور اس گہرے سناٹے میں دور دور تک سنی جاسکتی تھیں۔ البتہ یہ بات ان کے علم میں آگئی تھی کہ یہ آوازیں کتنی ہی تیز کیوں نہ ہوں انہیں اس عمارت کے اندر رہنے والے ہی سن سکتے ہیں اور اس کے باہر یہ آوازیں کوئی بھی نہیں سن سکتا تھا۔ چاہے وہ عمارت کی دیوار کے پاس ہی کیوں نہ ہو۔ ٹیپ ریکارڈر آن کردیا گیا اور اس کے ایک ڈائل سے سبز روشنی تھرتھرا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ آواز ریکارڈ ہورہی ہے کافی دیر تک یہ آوازیں ابھرتی رہیں وہ انہیں ٹیپ ریکارڈ میں ریکارڈ کرتے رہے۔ پھر آوازیں اچانک بند ہوگئیں۔ اور اعصاب شکن سناٹا فضا میں پھیل گیا۔

ایک لمحے تک ہم سوچتے رہے۔ پھر میں نے سب کو واپسی کا اشارہ کیا اور اس کے بعد ہم اس بڑے کمرے میں پہنچ گئے جو دلاور شاہ کا کمرہ تھا۔ ٹیپ ریکارڈر بیٹری سے چل رہا تھا اور بالکل فٹ حالت میں تھا۔ چنانچہ ٹیپ کو ریوائنڈ کیا گیا، اور اس کے بعد ہم نے اسے آن کیا۔ پھر انتہائی دہشت ناک صورتحال سامنے آگئی کہ ٹیپ ریکارڈ پر کوئی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔ سب لوگوں کے چہرے پسینوں پسینوں ہوگئے۔ رحیم شاہ نے کہا۔

''ممکن ہے، ٹیپ ریکارڈ خراب ہو......؟''

''نہیں...... یہ ممکن نہیں ہے۔'' نعمت علی نے جواب دیا۔

''کیوں......؟''

''وہ سبز روشنی جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ آواز ریکارڈ ہورہی ہے۔ جل رہی تھی۔''

''تو پھر کوئی آواز ریکارڈ کیوں نہیں ہوئی......؟''

''سمجھ میں نہیں آتا۔''

''ایک منٹ تجربہ کرکے دیکھ لیا جائے۔'' دلاور شاہ بولا۔

''وہ کیسے؟''

''ٹیپ ریکارڈر آن کرو۔ ہم لوگ جو باتیں کر

رہے ہیں وہ ریکارڈ ہونی چاہئیں۔'' اس بات پر عمل کیا گیا اور یہ لوگ یوں ہی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ پھر جب کیسٹ ریوائنڈ کرکے دیکھا گیا تو ان کی آوازیں بالکل صاف اور واضح ریکارڈ ہوئی تھیں۔ اور صورتحال بالکل سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ لیکن اس کیفیت کا سب سے زیادہ اثر دلاور شاہ پر ہوا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اور اس نے کہا۔

''میں نے سنا ہے کہ بدروحوں کے نہ سائے ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی آواز ریکارڈ کی جاسکتی ہے۔''

''میرے خدا...... اس کا مطلب ہے کہ یہ تو واقعی آخری بات ہے۔ اب بھی اگر ہم یہ سوچیں کہ ایسا کوئی عمل نہیں ہے۔ یہاں تو واقعی حماقت ہے۔'' اس کے بدن میں تھرتھراہٹ پیدا ہوگئی آواز بھنچنے لگی۔

نعمت علی اور عنایت بیگ نے چونک کر اسے دیکھا۔ تو وہ تھرتھر کانپ رہا تھا۔

''کیا ہوا مسٹر دلاور......''

''اب...... اب...... میری ہمت جواب دے رہی ہے۔''

''نہیں مسٹر دلاور۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔''

''آپ خود کو سنبھالیے، دلاور شاہ۔'' عنایت بیگ نے کہا۔

''میں...... میں نہیں سنبھال سکتا۔'' اس کے دانت بجنے لگے اور جسم کا تمام خون چہرے پر جمع ہونے لگا اور آہستہ آہستہ اس پر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ دلاور شاہ نے کہا۔

''یہ تو خطرناک علامت ہے۔ ہم انہیں یہاں سے لیے چلتے ہیں۔''

''نہیں...... بالکل نہیں...... میں یہاں سے بالکل نہیں جاؤں گا۔''

''کیوں...... آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں......؟''

''مجھے تنہا چھوڑ دو...... پلیز...... پلیز میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔''

بہرحال اس پر غشی طاری ہوتی چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا سارا وجود بخار میں پھنکنے لگا۔ لیکن، جب بھی ہم اسے یہاں سے لے جانے کی بات کرتے وہ فوراً ہوش میں آجاتا اور شدت سے اس کی مخالفت کرتا۔ صبح کی روشنی نمودار ہوئی اور دلاور شاہ جاگ گیا۔ اس پر لرزہ طاری تھا اور بری طرح کانپ رہا تھا اور سب اس کی جانب سے تشویش کا شکار تھے۔ رحیم شاہ نے کہا۔

''میرا خیال ہے، ہم بھائی جان کی بات نہیں مانتے انہیں اسپتال لے جانا ضروری ہے۔''

''میں نے تم سے ایک بار کہہ دیا کہ میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔ البتہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو!'' دلاور شاہ بولا۔

''ہاں بتاؤ......''

''تم اسے بلا لاؤ۔''

''کسے......؟''

''تم......عزیزہ ناصری کو یہاں بلا لاؤ، میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس پر عمل کرنا اگر اس کے برعکس کیا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں۔ کہیں عجیب سی کیفیت نہ ہوجائے اس کی۔ ویسے بھی عزیزہ ناصری کو اطلاع دینا میرے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ وہ میری ہونے والی بھابھی بھی ہے، اور ہوسکتا ہے۔ دلاور شاہ عزیزہ ناصری کی بات پر یہاں سے جانے کے لیے تیار ہوجائے۔ تم لوگ ذرا اس کا خیال رکھنا۔''

''ٹھیک ہے...... میں اس کا خیال رکھوں گا۔''

فرقان کو انہوں نے دلاور شاہ کے پاس چھوڑ دیا اور نعمت علی عنایت بیگ کو لے کر اس کمرے سے باہر نکل آیا۔

''اب کیا کہتے ہو......؟'' نعمت علی نے سوال کیا۔

''ایک بات کا تم یقین کرو یا نہ کرو میں بڑی سنسنی کا شکار ہوگیا ہوں۔''

''ڈر رہے ہو......؟''

''دیکھو...... بلاوجہ بہادر بننے کی کوشش

نہیں کروں گا۔ خوف تو انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے کیا تمہیں حالات بہت زیادہ سنگین نظر نہیں آ رہے۔“

”میں بھی یہی کہنے کے لیے تمہیں کمرے سے باہر لایا ہوں۔“

”کیا مطلب......؟“ عنایت بیگ نے سوال کیا۔

”دلاور شاہ کی کیفیت بالکل بہتر نہیں ہے۔ مجھے تو کچھ عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔“

”کیا احساس......؟“

”خوفزدہ تو نہیں ہو رہے......؟“

”نہیں...... بالکل نہیں، مجھے لگ رہا ہے۔ جیسے دلاور شاہ اپنی اصل آواز میں نہیں بول رہا ہو۔“

”اصل آواز میں......“

”ہاں......“

”یار...... ذرا کھل کر بات کرو۔“

”وہ کسی خاص کیفیت کا شکار معلوم ہوتا ہے۔“

”ارے باپ رے باپ تو تمہارا مطلب ہے کہ......“

”میں نے کہا تھا ناں...... ڈرو گے تو نہیں...... اور تمہارا ہکلانا اس بات کی علامت ہے کہ تم ڈر رہے ہو......“

”نہیں ڈر تو نہیں رہا ہوں۔ لیکن...... لیکن اب کیا ہوگا۔“

”دیکھو کیا ہونے والا ہے۔“

اس کے بعد ہم نے خود ہی ناشتہ وغیرہ کی چیزیں تلاش کیں اور اپنا پیٹ بھر لیا۔

چائے اور کچھ سلائس ہم نے فرقان کو بھی دیے اور اس نے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ دلاور شاہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اور اس کا تھرتھراتا ہوا جسم ساکت ہو گیا تھا۔ نعمت علی بھی رات بھر جاگا ہوا تھا۔ اس نے عنایت بیگ سے کہا۔

”کیا چاہتے ہو، عنایت بیگ سوتا ہے......؟“

”یقین کرو...... شدید نیند محسوس کر رہا ہوں۔ میرا بدن بھی کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے بخار آتا ہے ناں...... بخار کی سی کیفیت ہو رہی ہے۔

”فرقان تم یہاں موجود ہو......؟“

”جی صاحب......“ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں یہاں موجود ہوں۔ فرقان نے ہمت سے جواب دیا اور وہ دونوں وہاں سے واپس آ گئے، اور اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد وہ اپنے بستروں پر لیٹ گئے اور پھر جب عنایت بیگ کی آنکھ کھلی تو اس نے کہا۔

یہ آسیب زدہ مکان ہے۔ میرا خیال ہے۔ تھوڑا وقت انتظار کر لیا جائے ہر راز کا ایک پہلو ہوتا ہے۔ اور کھل کر سامنے آتا ہے۔“

”پتہ نہیں کیا حال ہے۔ دلاور شاہ کا......؟“

”آؤ دیکھ لیتے ہیں۔“ پھر جب وہ دونوں باہر نکلے تو انہوں نے محسوس کیا کہ آسیب زدہ مکاں میں تھوڑی سی رونق ہے۔ فرقان چائے کی ٹرے لیئے ہوئے جا رہا تھا۔ دلاور شاہ کے کمرے سے رحیم شاہ باہر آ رہا تھا انہیں دیکھ کر مسکراتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

”کہو...... آسیبوں کے ساتھ کیسی گزری......؟“

”ٹھیک ہیں، تم بتاؤ، عزیزہ ناصری کی کیا صورتحال رہی......؟“

”بے موت ماردی گئی بے چاری......“ رحیم شاہ نے ہنس کر کہا۔ اور وہ دونوں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”مطلب......؟“ ”بڑے دل گردے کا کام ہے۔ عشق کر تو لیا جاتا ہے۔ لیکن عشق کو نبھانا اصل مسئلہ ہے۔ عزیزہ ناصری جس کیفیت میں یہاں آئی ہیں اس سے دو ہی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ یا تو عشق کامل ہو گیا۔ یا پھر بھاڑ میں جائے لیلیٰ تیری والی بات ہو گی۔ اور عزیزہ ناصری یہاں سے بھاگ جائیں گی۔“

رحیم شاہ کا انداز کچھ اس طرح کا تھا کہ خود بخود ہنسی آ جائے۔ تاہم نعمت علی نے تفصیل پوچھی تو رحیم شاہ نے کہا۔

”عزیزہ ناصری کسی قیمت پر بھی اس آسیب زدہ

مکان میں آنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ لیکن جب انہیں بتایا گیا کہ دلاور شاہ کی حالت بہت خراب ہے تو وہ سوچ میں ڈوب گئیں۔ غالباً فیصلہ کر رہی تھیں کہ زندگی زیادہ قیمتی چیز ہے یا عشق؟ لیکن دنیا داری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آ گئی ہیں۔“

”اوہو...... کہاں ہیں۔“

”اندر ہیں۔“

پھر رحیم شاہ، نعمت علی، اور عنایت بیگ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ اندر چل پڑے۔ نعمت علی نے پہلی بار عزیزہ ناصری کو دیکھا تھا۔ پختہ عمر کی لیکن بہت ہی پرکشش عورت تھی، اور جب پہلی بار اس سے تعارف ہوا تو اس نے گردن خم کر کے انہیں سلام کیا۔ دلاور شاہ اس کی آمد سے خاصی بہتر کیفیت کا حامل ہو گیا تھا۔ عزیزہ ناصری کے آ جانے کے بعد ویسے بھی آپ کو ٹھیک ہو جانا چاہیے۔“ نعمت علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور دلاور شاہ بھی مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔

”میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔ ویسے عزیزہ ناصری آپ یہاں قیام کریں گی یا جانا چاہتی ہیں۔“

”نہیں میں تو دلاور شاہ سے کہہ رہی ہوں کہ یہاں سے چلیں۔ لعنت بھیجیں اس منحوس عمارت پر ہم یہاں نہیں رہیں گے۔“

”ایسا نہ کہو، اب جبکہ تم نے مجھے یہ بتا دیا ہے کہ یہ تمہاری خاندانی عمارت ہے تو میرے لیے بھی ضروری ہو گیا ہے۔ کہ میں اس سے محبت کروں ہم ایسے یہاں سے نہیں جائیں گے۔“

”مگر میں تمہیں اس عالم میں چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتی......“ یہ الفاظ بڑے متاثر کن تھے۔ اس عمر کا عشق بھی ایک دلچسپ تجربے کی حیثیت رکھتا تھا۔ نعمت علی سوچ رہا تھا کہ جو واقعات سامنے آئے ہیں ابھی تک ان میں کوئی ایسا ربط نہیں ملا جسے خیر الدین خیری کا کارنامہ کہا جا سکے۔ اس نے موقع ملتے ہی خیر الدین خیری کو پکار لیا۔

”استاد محترم آپ کبھی اس طرح غائب بھی ہو جائیں گے یہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔“

”خواب مت دیکھا کرو بھانجے، خوابوں میں کچھ نہیں رکھا ہوتا۔ ویسے تو جگہ بری نہیں ہے۔ بس ذرا یہ الٹی سیدھی حرکتیں کبھی کبھی پریشان کر دیتی ہیں۔ عنایت بیگ تو بہت ہی بری حالت میں ہے۔ جہاں تک دلاور شاہ، رحیم شاہ، اور فرقان کا تعلق ہے۔ وہ اتنے غیر مطمئن نظر نہیں آتے۔ اور پھر یہ خاتون عزیزہ ناصری، یہ دلاور شاہ کو یہاں سے لے جانا چاہتی ہیں۔

”اصل میں بھانجے انہیں چکروں میں لگا ہوا تھا کہ آخر یہ سب ہنگامہ آرائی ہے کیا بلا اس معلومات کے لیے تھوڑی سی گمشدگی تو ضروری تھی۔“

”مگر یہ چکر ہے کیا۔ سمجھ میں نہیں آیا......؟“

”بیٹے! ہر کام ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہو جاتا۔ بعض معاملات کا اختتام منطقی ہوتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔ استاد جی!“

”تم نے اس عمارت میں ابھرتی ہوئی آوازیں غور سے سنیں۔ یہ محسوس نہیں کیا تم کہ جیسے کوئی آگ میں جل رہا ہو۔ اور جلنے والے کے حلق سے چیخیں نکل رہی ہوں۔ تم نے سازوں کی آوازیں بھی سنی ہوں گی، اصل میں میرا رابطہ ان لوگوں سے ہو گیا ہے۔ جن کا تعلق اس عمارت سے ہے۔ اس عمارت میں رہنے والی روح کسی سے انتقام لینے کے لیے بے قرار ہے۔“ نعمت علی حیران رہ گیا تھا۔

کچھ لمحوں کے بعد خیر الدین خیری کی آواز ابھری۔

”یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ اس عمارت میں ہر سال کسی نہ کسی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ تم نے اس کے مشرقی حصے کے ایک کمرے سے اٹھتی ہوئی آوازیں شاید سنی ہوں۔ غور کرو گے تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ جیسے کوئی آگ میں جل رہا ہے۔ اور اس کے حلق سے آوازیں نکل رہی ہیں۔ میں نے تم سے سازوں کی آوازوں کا بھی تذکرہ کیا تھا اور اب میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ نجانے کتنے عرصے سے ایک

روح کسی سے انتقام لینے کے لیے بے قرار ہے۔"

"مگر وہ روح کس کی ہے ماموں......؟" نعمت علی نے سوال کیا۔

"اس کا نام دائم شاہ تھا، یہ عمارت ایک بہت بڑے رئیس نے خریدی تھی اور اس کا پورا خاندان یہاں آباد تھا۔ اور یہ رئیس عزیزہ ناصری کے بزرگوں میں سے تھا۔ اس عمارت میں مقیم ایک نوجوان ملازم نے عمارت میں رہنے والی رئیس زادی سے محبت کی تھی۔ لیکن وہ ملازم تھا اور اس کی محبوبہ رئیس زادی، وہی پرانی کہانی رئیس کو اس بات کا علم ہوگیا اور پھر ایک ملازم کے لیے آقا زادی سے محبت کرنے کا جو نتیجہ ہوسکتا تھا وہی ہوا۔ رئیس نے اس ملازم کو عمارت کے اس مشرقی حصے میں قید کردیا اور اس پر مظالم کی انتہا کرڈالی۔ لوہے کی سلاخیں آگ میں سرخ کر کے اس کا جسم داغا گیا۔ اس کی آنکھیں نکال لی گئیں اور ایک دن آخر کار اسے آتش دان پر لٹکا کر آگ میں جلادیا گیا۔ اس کہانی کا بدترین پہلو یہ ہے کہ رئیس زادی نے اپنے باپ سے جھوٹ بولتے ہوئے اس نوجوان لڑکے پر الزام لگایا اور کہا کہ وہ زبردستی اسے ملاقات کے لیے مجبور کرتا تھا۔ یہ بات اس رئیس زادی نے محبت کرنے والے نوجوان کے سامنے کہی تھی اور جب اسے آگ میں جلایا جارہا تھا۔ تو اس نے چیختے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس خاندان سے انتقام لے گا اور اس وقت تک اس کی روح کو چین نہیں آئے گا۔ جب تک اس خاندان کا ایک شخص بھی اس زمین پر باقی رہے گا۔ کیا سمجھے؟ یہ ہے، اصل کہانی۔"

"یہ تو گڑبڑ ہوگئی ۔ اس کا انجام کیا ہوگا ماموں......؟"

"بہت کم وقت رہ گیا ہے کہ اس کا انجام ہوجائے گا۔" خیرالدین خیری کی آواز ابھری اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ رات سرد اور تاریک تھی۔ آسمان پر کالے بادل رکے ہوئے تھے۔ بارش بھی شروع ہوگئی تھی۔ ابھی رات کا پہلا پہر ہی گزرا تھا کہ اچانک ہی ایک لرزہ خیز دھماکہ سنائی دیا اور پھر انسانی چیخیں بلند ہوئیں۔ جن میں بہت سی ملی جلی آوازیں تھیں۔ نعمت علی اور عنایت بیگ بری طرح لرز گئے تھے۔ عمارت کے مشرقی حصے میں چیخوں اور قہقہوں کی آوازیں مسلسل بلند ہورہی تھیں۔ پھر ایک طرف سے اچانک ہی آگ کے شعلے بھڑک پڑے اور آگ اس طرح آناً فاناً پھیلی کہ یقین نہ آئے۔ بمشکل تمام یہ لوگ عمارت سے باہر نکل سکے تھے۔

آگ اس خوفناک انداز میں بھڑکی تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پھر جب آگ بجھ گئی تو یہ لوگ دوبارہ اندر کی طرف بھاگے۔ گوشت جلنے کی بدبو پھیلی ہوئی تھی اور انتہائی ہولناک ماحول نظر آرہا تھا۔ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے وہ آخر کار اس کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے کا دروازہ جل کر خاکستر ہوچکا تھا اور اس وقت نعمت علی اور عنایت بیگ نے جو کچھ دیکھا۔ وہ ناقابل یقین تھا۔ آتش دان کے اوپر ایک جلی ہوئی انسانی لاش لٹک رہی تھی۔ اس کی گردن میں موٹے رسے کا پھندا پڑا ہوا تھا اور آتش دان کے دائیں جانب عزیزہ ناصری زنجیروں سے بندھی کھڑی تھی۔ اس کی کھوپڑی کے کئی حصے ہوگئے تھے اور سارا جسم خون میں لت پت تھا۔ وہ لوگ یہ دہشت ناک منظر دیکھتے رہے۔ اسی وقت نعمت علی کے کانوں میں خیرالدین خیری کی آواز ابھری۔

"کھیل ختم، پیسہ ہضم اب واپسی کا کام شروع کردو، یہاں رکنا بے کار ہوگا۔"

"وہ رحیم شاہ اور فرقان۔"

"عمارت جس طرح شعلوں کا الاؤ بنی تھی۔ اس کے بعد کیا تم کسی کی زندگی کی توقع رکھتے ہو۔ خیرالدین خیری کی آواز ابھری اور نعمت علی ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ عنایت بیگ بری طرح افسردہ تھا اور واپسی میں وہ سارے راستے روتا رہا تھا۔

"کسے کیا جواب دوں گا۔ یہ سب کچھ بہت برا ہوا ہے۔"

"جو کچھ بھی ہوا ہے۔ وہی ہونا تھا۔" نعمت علی نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

شہرِ وحشت

ایم اے راحت

قسط نمبر: 04

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرہول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دہشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراؤ، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

مدد علی ہر صبح کو جاگتے تو یہی سوچتے کہ صبح ہوگی اور یہ سنہرا خواب ٹوٹ جائے گا۔ وہی بے بسی اور بے کسی کے معاملات ہوں گے۔ کھانے کو ہے تو پہننے کو نہیں، پہننے کو ہے تو کھانے کو نہیں، لیکن ہر صبح ان کا دل خوشیوں سے معمور ہوجاتا۔ پانچ سو روپے تکیے کے نیچے سے نکل آتے۔ وہ میاں بیوی معمولی سے اخراجات ایک دن کے پانچ سو روپے ہی ہفتے بھر چل جاتے۔ نعمت علی بھی گھر پر نہیں تھا۔ اچھے خاصے پیسے جمع ہوگئے تھے۔ دوسری ضرورتیں پوری کرنے کے بعد بھی کافی رقم بچتی تھی۔ آسیہ بیگم کہتیں۔

''مدد علی، اللہ نے اتنا علم دیا تھا تو ساری زندگی کیوں ترساتے رہے......؟''

''دیکھو آسیہ، میں نے کوشش کی ہے کہ زندگی میں کبھی جھوٹ نہ بولوں۔ ان پیسوں کے حصول میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ پتہ نہیں میرے بیٹے کو کون سا علم مل گیا جس کی وجہ سے یہ دن پھرے ہیں۔''

مدد علی تو پورے محلے کی آبرو بن گئے تھے۔ جسے دیکھو جھاڑ پھونک کرانے آرہا ہے۔ گھر کی شکل ہی بدل دی تھی پڑوسیوں نے خود پورے گھر میں رنگ کیا تھا۔ باہر پھولوں کے گملے سجا رہے تھے۔ ان کے لیے اس سے زیادہ فخر کی بات اور کوئی نہیں تھی کہ اتنا بڑا عالم ان کا پڑوسی ہے۔

ایک دن صبح کو اٹھے تو گھر کے باہر کچھ چہل پہل محسوس ہوئی، باہر نکل کر دیکھا تو بہت سے نمازی جمع تھے جو مسجد سے نماز پڑھ کر لوٹ رہے تھے۔ ان کے درمیان دروازے کے عین سامنے رمضانی دھرنا دیے بیٹھا تھا پاس ہی اس کی بیوی ایک چادر میں لپٹی بیٹھی تھی اور اس کے ساتھ تین بچے۔ مدد علی حیرانی سے منہ کھولے انہیں دیکھتے تھے۔ پھر آگے بڑھ کر بولے۔

''خیر تو ہے رمضانی بھائی۔''

''بس مدد علی بھائی، زندگی کے آخری دن گزارنے آیا ہوں۔ رمضانی نے کہا اور منہ ڈھک کر سسکیاں لینے لگا۔

''ارے کیا ہوگیا...... کیا ہوگیا......''

''ہمیں معاف کر دیں مدد علی بھائی۔ قصور رمضانی کا تھا۔ بھوکی میں اور میرے بچے مر رہے ہیں۔'' رمضانی کی بیوی نے کہا۔

''بخدا میں کچھ نہیں سمجھا۔'' مدد علی نے کہا۔

''اس نے آپ پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ تباہ ہو گیا۔ چوہے سب کچھ کھا گئے۔ اب فاقے کر رہا ہے۔

آپ کے در پر آپڑا ہے کہتا ہے یا تو مدد علی اسے معاف کر دیں گے یا وہ اور اس کے بچے بھوک سے دم توڑ دیں گے۔"

"اللہ نہ کرے، اللہ نہ کرے، ہم نے تو اسے معاف کر دیا تھا۔" مدد علی نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں معاف کیا۔ اور کرنا بھی نہیں چاہیے۔ اتنے بڑے اللہ والے پر میں نے الزام لگایا تھا۔ معاف کردو مرشد، معاف کردو، قصور میرا نہیں تھا۔ مجھے نیاز علی نے بہکا دیا تھا۔ ل گیا تو ہڈیاں توڑ دوں گا سسرے کی۔ سسرال تک تلاش کر آیا ہوں، چھپ گیا ہے کہیں....." رمضانی نے روتے ہوئے کہا۔

"بات ختم ہوگئی رمضانی..... تم بھی دماغ سے نکال دو۔"

"کیسے نکال دوں مرشد..... ساری زندگی عیش کرایا ہے بچوں کو..... اب پائی پائی کو محتاج ہوں۔ کیسی اچھی چلتی تھی دکان..... اب تو وہاں خاک بھی نہیں اڑتی۔"

"اللہ بہتر کرے گا، ایک منٹ رکو، ہم ابھی آئے۔ اندر آ کر مدد علی نے وہ رقم نکالی جو اس دوران ان کے پاس بچ گئی تھی باہر آ کر انہوں نے وہ رقم رمضانی کو دے کر کہا۔ "لو..... اس سے تھوڑا بہت سامان لے آؤ..... بسم اللہ کر کے کام شروع کرو، اللہ برکت دے گا۔"

ہر طرف سے داد و تحسین کے ڈنکے بجنے لگے۔ رمضانی نے مدد علی کے پاؤں پکڑے بہر حال وہ اپنے گھر چلا گیا اور اس نے اسی دن تھوڑا سا سامان لا کر دوبارہ دکان سجائی۔ مدد علی کی شہرت میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہونے لگی تھی۔ دوسری طرف نعمت علی نے خیر الدین خیری کی معیت میں اپنی دنیا آباد کرلی تھی۔ اور کوئی کام نہ ہوتا تو وہ قبرستان جا کر مردوں کی داستانیں سنا کرتے تھے۔

ایک دن خیر الدین نے کہا۔ "نعمت علی میں کچھ دن کے لیے تم سے دور رہوں گا۔ ان دنوں میں مجھے آواز نہ دینا۔ موت کے بعد کچھ راز ایسے ہوتے ہیں جو زندہ انسانوں کو نہیں دیئے جاسکتے۔ تم زندہ ہو اس لیے میں اس وقت کی مصروفیت تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"ٹھیک ہے ماموں....." نعمت علی نے کہا۔

گھر میں نعمت علی کی اب بے پناہ عزت تھی۔ باہر کے لوگوں کو تو اصلیت معلوم نہیں تھی لیکن مدد علی اور آسیہ بیگم جانتے تھے کہ نعمت علی ہی اب اس کے لیے نعمت خداوندی ہے۔ البتہ نعمت علی کا دل اب پراسرار واقعات اور قبرستانوں میں ہی لگتا تھا۔

اس دن بھی وہ ایک دوسرے قبرستان میں نکل گیا تھا کہ اس نے ایک قبر پر ایک شخص کو بیٹھے دیکھا۔

"آپ وہاں اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ادھر آجایئے۔ باتیں کریں گے۔" قبر پر بیٹھے شخص نے کہا۔ نعمت علی حیرت اور خوشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قریب پہنچا۔

"بیٹھیے....." اس نے سامنے والی قبر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"دوست ایک بات بتاؤ۔ کیا تم مجھے دیکھ سکتے ہو.....؟"

جواب میں اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "کیوں نہیں بھلا آپ کو دیکھنے میں مجھے کیا دقت ہو سکتی ہے.....؟"

"نہیں میرا مطلب ہے، م..... میں..... میں، مجھے تو..... مجھے تو....."

"روحیں ایک دوسرے کو دیکھ سکتی ہیں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے.....؟"

"م..... مطلب..... مطلب.....؟"

"کوئی مطلب نہیں..... میں صرف آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ روحیں تو ہر چیز کو دیکھ سکتی ہیں۔ یہ تو زندہ انسانوں کا معاملہ ہے کہ ان کی آنکھیں یہ کام نہیں کر سکتیں۔"

"م..... م..... میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا

تم..... کیا تم مر چکے ہو.....؟"

اس کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ہاں..... آپ کا کیا خیال ہے.....؟"

"اوہ..... تو یہ بات ہے۔" نعمت علی نے کہا۔

"مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں.....؟"

"نہیں..... میں ایسے ہی....." نعمت علی نے آگے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور بولا۔ "مگر دوست تم کیوں اس طرح ویران سے بیٹھے ہو، کیا تم بھی کسی الجھن کا شکار ہو، کیا تمہارے دل میں بھی کوئی افسردگی ہے.....؟"

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "جناب آپ کا کیا خیال ہے، وہ جو کہتے ہیں ناں کہ سنگ و آہنگ بے نیاز غم نہیں..... ہماری بھی یہی کیفیت ہے ہم تو نہ سنگ ہیں نہ آہن پھر بھلا ہمارا دل غموں سے خالی کیوں ہوگا۔"

"بڑی دکھ بھری باتیں کی ہیں تم نے دوست.....! مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گے.....؟"

"کیا حرج ہے۔ زندگی تو کسی طرح کٹ ہی جاتی ہے۔ لیکن اندازہ یہ ہوا کہ موت کے بعد بھی کسی غم گسار کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"تم..... میرا مطلب ہے۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔" نعمت علی نے کہا اور وہ ٹھنڈی سانس لے کر کسی سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"موت ایک بھیانک تصور ہے۔ کون مرنا چاہتا ہے۔ کسی سو سالہ بوڑھے کو موت کی پیش کش کردو، وہ آخری کوشش کرے گا کہ زندگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے حالانکہ اس کی ساری زندگی کی خواہشات پوری ہو چکی ہوتی ہیں۔" وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوا۔ جیسے گزرے ہوئے واقعات کو اکٹھا کر رہا ہو۔ نعمت علی خاموشی سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

"کیا آپ یقین کریں گے کہ جس وقت مجھے سزائے موت سنائی گئی۔ میں نے سکون کی گہری سانس لی تھی۔ بعض اوقات انسان کی زندگی اس اسٹیج تک پہنچ جاتی ہے۔ جہاں وہ خود زندہ نہیں رہتا ہے۔ وہی مقصد روح کہلاتا ہے اور جب وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ تو زندگی مٹی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ اب اگر آپ اس غلیظ مٹی سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں تو اس کا بوجھ اٹھائے پھریں۔ ورنہ جب مقصد پورا ہو گیا۔ تو زندگی کیا معنی رکھتی ہے۔

اور میں خوش نصیب انسان ہوں۔ جو میرا مقصد تھا۔ میں اسے پورا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ رائے نوبت پال کے چھ جوان بیٹے، اس کی بیوی، ایک بیٹی، ایک داماد پورے دس آدمی تھے اور میں نے ان دسوں کے دسوں کو انہی کے گھر میں بند کر کے جلا دیا تھا۔

ہاں میں نے جو کہا تھا وہ پورا کر دکھایا تھا۔ باپ اپنے کی لاش پر کھڑے ہو کر میں نے اس کے سینے سے ابلتا ہوا خون اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چہرے پر ملا تھا اور پوری بستی کے سامنے کہا تھا۔

"بستی والو! سن لو، تم نے دیکھا نوبت پال نے میرے بوڑھے باپ کو کس طرح قتل کیا ہے۔ خدا کی قسم، حکومت، نوبت پال کو اس سلسلے میں کوئی سزا دے یا نہ دے۔ میں اس کے خاندان کو نیست و نابود کر دوں گا۔ میں نوبت پال کی نسل کو آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ سنو!..... بستی والو.....! میں جا رہا ہوں تم میں سے کسی کی جرأت ہو تو میرے باپ کو کفن پہنا دینا نہیں تو اس کی لاش کی تقدیر میں جو بھی ہو میری زندگی کا اب صرف ایک ہی مقصد ہے۔"

اور پھر برسات کی ایک رات جب تین دن بارش لگا تار برسنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے رکی تو بستی والوں نے دیکھا کہ رائے نوبت کی حویلی شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کی اور اس کے اہل خانہ کی درد ناک چیخیں رات کے سناٹے میں دور دور تک گونج رہی

تھیں۔ اور جب بستی کے ہمدرد لوگ حویلی کی طرف دوڑے تو سنسناتی گولیوں نے ان کا استقبال کیا اور رات کے سناٹے میں گونجنے والی آواز میری ہی تو تھی۔

''بستی والو! میں جہانگیر خان تم سے مخاطب ہوں۔ بابر خان کا بیٹا...... جس کی لاش تمہارے حوالے کر گیا تھا۔ آج میں اپنے باپ کا انتقام لے رہا ہوں۔ میرے نزدیک مت آؤ، میں نہیں چاہتا کہ کسی اور کو نقصان پہنچے، ہاں...... اگر تم نوبت پال سے وفاداری کا اظہار کرنا ہی چاہتے ہو تو رات گزر جانے دو، ان جسموں کو خاکستر ہو جانے دو، صبح کو ان جلی ہوئی لاشوں کے ساتھ میں بھی تمہیں ملوں گا۔''

اور وہی ہوا، جو میں نے کہا تھا۔ میں نے انتہائی پرامن انداز میں خود کو بستی والوں کے سپرد کر دیا اور بستی والوں نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا۔ بات وہی ہوئی ناں...... یعنی مقصد، باپ کی موت کے بعد میں نے قسم کھائی تھی اور قسم کھاتے ہوئے مجھے پورا پورا احساس تھا کہ جو کچھ میں کرنے جا رہا ہوں اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ سو میں نے سوچ لیا کہ نوبت پال نے صرف میرے باپ کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ مجھے بھی مار دیا ہے کیونکہ اب میں زندہ نہ تھا صرف ایک مقصد زندہ تھا اور جب وہ پورا ہو جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے صرف مٹی کا ڈھیر......

تو پولیس والوں نے جو سلوک اس مٹی کے ڈھیر کے ساتھ کیا وہ نہ مجھے یاد ہے اور نہ ہی یاد رکھنا چاہتا ہوں۔ پولیس افسر بھی حیران تھے۔ کہ کس سر پھرے سے پالا پڑ گیا ہے۔ بستی والوں کی بھلا کیا مجال تھی کہ میری ہمدردی کرتے۔ حکومت نے ہی میرے لیے وکیل صفائی مقرر کر دیا تھا اور وہ بیچارہ بھی مجھ سے عاجز آ گیا تھا کیونکہ جو کچھ وہ مجھ سے کہتا میں اس کا الٹ ہی کرتا تھا۔ سو نہایت آسانی سے میں نے اپنے لیے سزائے موت کی راہ ہموار کر لی اور مجھے موت کی سزا سنا دی گئی۔

یہ چند روز عجیب و غریب احساسات کے روز تھے۔ نہ جانے کیا کیا خیالات میرے ذہن میں آتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے وقت کا کوئی تعین نہیں ہے۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہے۔ آج سے چار دن بعد سوا چھ بجے مجھے سزائے موت دے دی جائے گی۔ کیسے مزے کی بات ہے۔ مجھے اپنی موت کا وقت معلوم ہے۔ ساری روایتیں جھوٹی ہیں۔

لیکن صاحب کیا کیا جا سکتا ہے، روایتوں کا قیام بہر حال کوئی معنی ضرور رکھتا ہے اور بعض انسان جو خود کو بہت زیادہ ذہین سمجھنے لگتا ہے۔ بری طرح چوٹ کھاتا ہے سو یہی میرے ساتھ ہوا۔ غالباً میری موت میں صرف اٹھارہ گھنٹے باقی رہ گئے تھے، مجھے ایک ایسی کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا۔ جہاں سزائے موت کے قیدی رکھے جاتے تھے۔

تنگ و تاریک کوٹھری، موت کے انتظار کا کوئی مونس نہیں ہوتا۔ ایک قبر کی مانند اور میں خود ہی منکر تھا اور خود نکیر اپنا حساب آپ لے رہا تھا۔ زندگی میں کیا کھویا کیا پایا ہے۔ کس کے ساتھ ظلم کیا اور کس کے ساتھ نیکی، اوتہہ......! نیکی اور بدی کا فیصلہ ہونے میں اب کتنی دیر باقی رہ گئی ہے۔ جس کا جو کام ہے وہ کرے گا۔ میں کسی کے معاملات میں ٹانگ کیوں اڑاؤں۔

تو صرف اٹھارہ گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب تنگ و تاریک کوٹھری میں کوئی انسانی آواز سنائی نہیں دے گی۔ گویا یہ قبر ہے جو زندگی میں عطا کر دی گئی ہے۔ لیکن رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جبکہ نیند آنکھوں میں بھر آتی ہے۔ خواہ اس کے بعد موت ہی کیوں نہ نصیب ہو جائے۔ مجھے ہلکی سی چاپ محسوس ہوئی۔ شاید اس کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا۔ پھر روشنی کی ایک رمق اندر آئی اور اچانک کوئی دھڑام سے میرے اوپر آ گرا۔

میں بوکھلا کر اٹھ گیا اور ٹٹول ٹٹول کر اسے دیکھنے لگا۔ اتنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ کوئی انسانی جسم ہے۔ اس نے بھی مجھے محسوس کر لیا تھا اور اس کے ہاتھ میرے بدن کو میری مانند ٹٹولنے لگے۔ پھر ایک غراہٹ کی آواز سنائی دی۔

''ہا...... کون ہو بھائی اور اس کوٹھری میں کیوں

ہو؟''

''پکنک پر آیا ہوں......'' میں نے مسخرے پن سے کہا۔ اور دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ سوچنے لگا تھا کہ پھانسی کی کوٹھری میں یہ کون بے جگر ہے۔ جو اس مزاحیہ انداز میں گفتگو کر سکتا ہے۔ پھر جب حیرت کا دور ختم ہوا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

''نوجوان ہو......؟''

''اور تم شاید بوڑھے معلوم ہوتے ہو۔''

''یہی بات ہے......''

''بڑے میاں یہ پھانسی کی کوٹھری ہے۔ کیا یہ بات بھی تمہیں معلوم ہے۔''

''ہاں...... میں بھی سزائے موت پانے والا ہوں۔'' بھاری آواز نے جواب دیا۔

''میرے بارے میں کیا پوچھا تھا تم نے؟''

''آواز سے جوان معلوم ہوتے ہو......؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''ہاں...... بڑے میاں میری جوانی کے اٹھارہ گھنٹے باقی ہیں پورے اٹھارہ گھنٹے اور اس کے بعد بوڑھا ہو جاؤں گا پھر مر جاؤں گا۔ اب بتاؤ کیا میں پیدا ہو گیا۔ کیا میں جوان ہوں......؟ بوڑھا ہو چکا ہوں یا مر چکا ہوں۔ کیا تم اٹھارہ گھنٹے کی زندگی کو کوئی حیثیت دے سکتے ہو...... ہاں، کہو گے تو میں تمہیں احمق سمجھوں گا۔''

چند ساعت خاموشی طاری رہی۔ پھر بوڑھے کی آواز ابھری۔ ''کیا موت کے خوف نے تمہارا ذہن ماؤف کر دیا ہے۔''

اور میرے ذہن میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ میں نے بوڑھے کا گریبان پکڑ لیا۔ ''کیا بکواس کرتے ہو۔ موت کیا ہے۔ خوف ایسا ہوتا ہے۔ میں لاش ہوں، لاش...... خوف کسی زندہ انسان کے سینے میں بیدار تو ہو سکتا ہے۔ لیکن تم لاش کا دل کہاں سے لاؤ گے اپنے الفاظ واپس لو ورنہ تمہیں موت سے پہلے ختم کر دوں گا۔ پورے دس انسانوں کو قتل کیا ہے میں نے......''

اور بوڑھے کی ہنسی بے حد ٹھنڈی تھی۔

''میرا گریبان چھوڑو...... نوجوان! دلچسپ انسان معلوم ہوتے ہو۔ زندگی نے کوئی مذاق کیا ہے تمہارے ساتھ۔''

''کہانی سننا چاہتے ہو، میں داستان گو نہیں ہوں۔'' میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

''کہانی...... گزری ہوئی داستان کو کہتے ہیں۔ اور جو گزر جائے وہ قابل ذکر نہیں ہوتا میں مستقبل کی باتیں کرنا پسند کرتا ہوں۔''

''کیوں آئے ہو یہاں......؟''

''یہ لوگ مجھے موت دینے والے ہیں۔''

''تم...... سزائے موت کے قیدی ہو۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں......''

''کتنے مارے تھے۔ کیوں مارے تھے......؟''

''تم مجھ سے وہی بات پوچھ رہے ہو، جس پر تم خود بوکھلا گئے تھے۔''

''اوہ...... بات درست ہے......'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن بڑے میاں موت کا کوئی خوف تو نہیں ہے۔ مرنے کا رنج تو نہیں ہے۔''

اور پھر بوڑھے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''موت مجھے پیش کی گئی ہے، میں نے اسے قبول نہیں کیا۔''

''کیا مطلب......؟''

''ارے میں زندہ انسان ہوں، موت نہیں چاہتا اور تم سن لو مروں گا بھی نہیں بھلا کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص مرنا نہ چاہتا ہو اور اسے موت دے دی جائے۔ ہم قدرت کی دی ہوئی موت کو نہیں ٹال سکتے۔ لیکن انسانوں کی کیا مجال ہے کہ وہ کسی کو مار سکیں۔''

''بجلی کی کرسی پورے بدن میں کرنٹ دوڑا دیتی ہے۔ اور انسان اس قدر لذت محسوس کرتا ہے کہ پھر کبھی آنکھ نہیں کھولتا۔'' میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''کہنا یہ چاہتے ہو کہ ہمارے لیے سزائے موت تجویز کرنے والے ہمیں کسی طرح نہ جینے دیں

گے۔"

"ہاں میرا مقصد یہی ہے۔"

"تو تم بزدل ہو۔" بوڑھے نے حقارت سے کہا۔ "مجھے دیکھو انہوں نے مجھے سزائے موت دے دی ہے۔ لیکن میں نے اسے دل سے قبول نہیں کیا۔ اور میں قبول کروں گا بھی نہیں۔ اب سے کچھ دیر بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"بہت خوب......" میں نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"چلو گے میرے ساتھ......؟"

"نہیں...... لیکن دیکھوں گا کہ تم کس طرح باہر جاتے ہو۔"

"زندگی کی آرزو نہیں ہے......؟"

"نہیں"

"اور پھر تمہاری بزدلی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ احمق نوجوان مجھے دیکھ میں بوڑھا ہوں۔ معذور ہوں۔ لیکن میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تو اتنی چھوٹی سی عمر میں کیوں مرنا چاہتا ہے؟"

"میری ایک منطق ہے۔ میں مقصد کو زندگی سمجھتا ہوں اور جب پورا ہو جائے تو زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے۔"

"تو تمہارا مقصد پورا ہو گیا؟"

"ہاں......"

"لیکن نوجوان تم نے اتنی طویل زندگی کو صرف ایک مقصد کے قابل کیوں سمجھا یہ تو خوش بختی ہے کہ انسان کو کچھ مقصد حاصل ہو جائے۔ تمہارے نظریے کے مطابق اگر تم زندگی کا سب سے بڑا مقصد حاصل کر چکے ہو اور اپنی دانست میں زندگی ختم کر چکے ہو تو پھر ان بقیہ سانسوں کو کسی اور مصرف میں کیوں نہیں لگا دیتے تمہیں کیا معلوم جس زندگی کو تم اس بے دردی سے ختم کرنے پر تلے ہوئے ہو ممکن ہے۔ وہ اس کی زندگی کو تمہاری زندگی کی ضرورت ہو۔

بوڑھے کے الفاظ نے نجانے کیوں میرے ذہن میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے واقعی میری سوچ غلط ہو، لیکن بڑے میاں بھی پاگل ہی معلوم ہو رہے تھے۔ زندگی چند گھنٹوں کی رہ گئی تھی اور وہ نکل جانے کی باتیں کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے ان کے بارے میں سوچتا رہا وہ بھی خاموش کچھ سوچ رہے تھے پھر بولے۔

"میرے خیال میں تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر رہے ہو۔"

"تم نے میرے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔" میں نے پریشان لہجے میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں زندگی کی راہ پر لے جانا چاہتا ہوں۔ تم نہ جانے کیوں موت کی وادیوں میں گم ہو جانا چاہتے ہو۔"

"تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے، زندگی اور موت میرے لیے کیوں یکساں ہیں غور کرو، اس دنیا میں اربوں انسان ہیں۔ زندگی کے ایک ایک حصے پر لاکھوں جاندار ہیں ان میں رشتے ناطے ہیں۔ محبتیں ہیں، اپنایت ہے، میں نہیں کہتا کہ دنیا میں میرے جیسے نہ ہوں گے۔ لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ انہیں میرے مانند جینے کی خوشی نہ ہوگی۔ میری زندگی سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے میں مر جاؤں گا تو کوئی آنسو نہیں بہائے گا۔ ایسے بے مقصد انسان کو کیوں جینا چاہیے؟"

"مرنا بھی نہیں چاہیے۔ تم اپنے لیے کیوں جیتے ہو، میں نے کہا نا، تمہاری زندگی اگر کسی کے کام آ جائے تو یہ کتنی خوشی کی بات ہے۔"

"کیوں آ جائے، جب کوئی مجھ سے ہمدردی نہیں رکھتا۔ ساری دنیا میرے لیے اجنبی ہے تو میں ان اجنبیوں سے محبت کیوں کروں کیوں کسی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دوں۔ ان سے انتقام لینے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ خود کو فنا کر دیا جائے۔"

تب بوڑھے کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کے انداز میں بڑی محبت تھی۔ بڑی اپنایت تھی۔"

"ٹوٹے ہوئے معلوم ہوتے ہو، بڑی توڑ پھوڑ

ہوئی ہے تمہاری شخصیت میں۔ نہ جانے کون سنگدل تھا۔ جس نے تمہیں زندگی سے اتنی دور دھکیل دیا ہے۔ بہر حال میں چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو۔ یوں سمجھو کہ میں ایک خود غرض انسان ہوں اور اپنے لیے تمہاری زندگی چاہتا ہوں۔"

"لیکن میرے بزرگ! ہم دونوں سزائے موت کے مجرم ہیں جیل کی کوٹھری میں ہیں اور تم اس طرح باتیں کر رہے ہو۔ جیسے اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہو، یہاں سے نکلو گے کس طرح......؟"

"بہت آسانی سے۔ بات یہ ہے کہ میں ابھی زندگی چاہتا ہوں۔ میں نے موت نہیں قبول کی اور جو موت قبول نہیں کرتے۔ وہ موت سے جنگ کرنا بھی جانتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد میں موت سے زندگی کے لیے جنگ کروں گا۔ اگر اس جدوجہد میں مارا گیا تو سمجھ لوں گا۔ اس جنگ میں شکست ہو گئی۔ ممکن ہے، زندگی کامیاب ہو جائے۔"

"اگر مجھے میری زندگی کا کوئی مصرف بتا دو تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"مصرف ہے، اور ایسا ہے کہ تمہیں اس سے دلچسپی ہو جائے گی۔ لیکن یہاں سے نکلنے کے بعد بتاؤں گا۔"

"ہوں......" میں اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ درحقیقت میں نے پہلے اس انداز میں نہیں سوچا تھا ورنہ خود کو اس طرح بستی والوں کے حوالے نہ کرتا۔ اسی وقت اپنے بچاؤ کی جدوجہد کرتا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی واقعی ایسی بے حقیقت چیز نہیں ہے۔ زندگی کے بہت سے دور ہوتے ہیں۔

"میں تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ اور بوڑھے نے مجھے ٹٹول کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"یقین کرو، زندگی بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ بشرطیکہ اسے گزارنے کے گر سیکھ لیے جائیں۔ میں اب بھی اور کبھی بھی تم سے یہ بات نہیں پوچھوں گا کہ تم یہاں تک کس طرح پہنچے۔ لیکن اپنے بارے میں اتنا ضرور بتاؤں گا کہ میں جان بوجھ کر یہاں تک آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے صرف چند روپوں کے لیے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ بھرے بازار میں تاکہ مجھے یہاں تک پہنچا دیا جائے مجھے ان روپوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"اوہ......" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ حقیقت ہے، میرے بچے، میں تمہیں اس کا ثبوت دوں گا۔"

"لیکن آخر کیوں......؟ تم یہاں کیوں آنا چاہتے تھے......؟"

"اس داستان کو ہم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ برسات کا موسم دور ہے اور امن کا دور ہے۔ ہم کچھ وقت سکون سے گزار سکتے ہیں۔" بوڑھے کی گفتگو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن بہرحال مجھے اس کی شخصیت دلچسپ محسوس ہوئی تھی۔ اور میں اس کی باتوں میں بھی دلچسپی لے رہا تھا۔

"پھر اب کیا کیا جائے......؟"

"کیا وقت ہوا ہوگا......؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔"

"اوہ...... کیا یہاں بہت تاریکی ہے؟"

"تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے......؟" میں نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔

"مجھے......" بوڑھا چند ساعت کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "یا تو یہاں گہری تاریکی ہے، یا پھر تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔"

"کیا مطلب......؟" میں نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"میں اندھا ہوں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ اور میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ اب تک کی گفتگو سے کہیں یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ بوڑھا اندھا ہے۔ میری خاموشی سے بوڑھے نے اندازہ لگا لیا کہ میں ابھی تک اس بات سے لاعلم تھا۔ چنانچہ اس نے گردن

ہلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ اس وقت گہری تاریکی ہے اور تم میری صورت نہیں دیکھ پائے۔''

''ہاں...... یہ حقیقت ہے، لیکن میرے محترم دوست! کیا تمہاری ساری باتیں ناقابل فہم نہیں ہیں۔ تم اندھے بھی ہو، تم نے ایک قتل بھی کیا ہے۔ تم یہاں سے نکل جانے کی باتیں بھی کرتے ہو۔''

''بلاشبہ تمہیں میری یہ باتیں حیرت انگیز محسوس ہو رہی ہوں گی۔ لیکن میرے پیارے بیٹے......! کچھ عرصے کے لیے اپنے تجسس کی آنکھ بند کرلو اور صرف میری ہدایات پر عمل کرو...... میرا خیال ہے، بہت مختصر وقت میں تمہیں، میرے بارے میں معلوم ہوجائے گا۔''

بوڑھے کے لہجے میں عاجزی تھی اور میں کسی سوچ میں گم ہوگیا۔ اب تک میں نے صرف جذباتی انداز میں سوچا تھا۔ میں یہ ہی سوچتا رہا تھا کہ مقصد کے حصول کے بعد زندگی ضروری نہیں ہوتی۔ لیکن بوڑھے سے گفتگو کرنے کے بعد نجانے کہاں سے میرے ذہن میں بھی زندگی کی روشنی کی ایک کرن آئی تھی اور میں زندہ رہنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ تب بوڑھے کی آواز ابھری۔

''کیا تم تیار ہو؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''میں تیار ہوں۔''

''بہت خوب۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہیں زندگی کی اہمیت سے آشنا کردیا۔ بہت عمدہ، تو میرے بچے......! ہم اب سے چند منٹ کے بعد کام شروع کردیں گے۔ ہاں تمہیں اس جیل میں کتنا عرصہ گزر گیا؟''

''تقریباً ڈیڑھ سال۔'' میں نے جواب دیا۔

''یقیناً تم اس کی پوری پوزیشن سے واقف ہوگئے۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تم اس وقت کہاں موجود ہو۔ یہ جگہ جیل کی آخری دیوار سے کتنے فاصلے پر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم صرف ایک بار مجھے اس کا نقشہ سمجھا دو۔'' بوڑھے نے کہا۔ اور میں اپنی یاداشت کے سہارے اسے صورتحال سمجھانے لگا۔ بوڑھا بہت غور سے سن رہا تھا۔ پھر اس نے غالباً گردن ہلائی۔

''ٹھیک ہے، اس طرح تو ہم معمولی چالاکی سے جیل کی دیوار عبور کرسکتے ہیں بیٹے......''

''لیکن اس آہنی کوٹھری سے کیسے نکلو گے؟''

''سنتری یہاں سے خاصی دور ہے اور تم بتا چکے ہو کہ کوٹھری کے پیچھے ایک ناکارہ گلی موجود ہے۔ جو کوڑا کرکٹ پھینکنے کے کام آسکتی ہے۔''

''ہاں......'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر ممکن ہے کہ ہم سنتری کو قتل کیے بغیر ہی دیوار تک پہنچ جائیں اور پھر باہر نکلنے کے لیے ہم گٹر لائن استعمال کریں گے۔ وہی گٹر لائن جو دیوار کے قریب سے شروع ہوتی ہے۔''

''لیکن چچا جان......! اول تو اس کوٹھری کی موٹی سلاخیں، اور پھر جس گٹر لائن سے آپ فرار کا پروگرام بنا رہے ہیں اس کے اوپر بھی آہنی جنگلا زمین کی خاصی گہرائی میں نصب ہے۔ وہاں سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے اس طرف محافظ خاص نگرانی بھی نہیں رکھتے۔''

''واہ......!'' بوڑھا خوش ہو کر بولا۔ ''اور تم کہتے ہو کہ فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، چلو آؤ......''

بوڑھا اٹھ گیا اور پھر وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ اور دوسرے لمحے کوٹھری کے آہنی جنگلے کے قریب پہنچ گیا۔ میں متحیرانہ انداز میں اسکے سائے کو دیکھتا رہا اور پھر میں بھی اس کے پیچھے پیچھے جنگلے تک پہنچ گیا۔ تب میں نے محسوس کیا۔ اور پھر کچھ اور بھی محسوس ہوا اس کے بعد بوڑھے کی طویل سانس ابھری۔

''آؤ......'' اس نے کہا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ وہ باہر نکل گیا ہے۔ میں متحیرانہ انداز میں جنگلے کو ٹٹولنے لگا۔ اور پھر مجھے سلاخوں کے درمیان کافی بڑا خلا نظر آیا اتنا بڑا کہ میں باآسانی اس سے نکل گیا۔ اب نہ جانے کیوں مجھے بوڑھے کی شخصیت پر کسی حد تک اعتبار آ گیا تھا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ شاید ہم فرار ہونے میں

کامیاب ہوجائیں۔''

''میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔'' بوڑھے نے کہا اور میری ڈھال بنا رہا۔ ایک بار پھر میرا ذہن ڈانواں ڈول ہونے لگا تھا۔ بوڑھا جس انداز میں چل رہا تھا۔ اس سے قطعی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اندھا ہے۔ محافظ اس کوٹھری سے کافی دور تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ رات کی خاموشی میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر وہ اس گٹر کے قریب رک گیا۔ جس کے بارے میں، میں نے اسے بتایا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے مجھے سرگوشی میں پکارا۔

''سنو!...... کیا یہ وہی جگہ ہے......؟''

''ہاں...... میں نے بے ساختہ کہا اور پھر خود اپنی حماقت پر مسکرایا۔

بوڑھا مجھے بے وقوف بنا رہا تھا لیکن وہ خاموشی سے زمین پر ہاتھ پھیرنے لگا اور پھر اس نے گٹر کی سلاخیں پکڑ لیں۔

''تھوڑے پیچھے ہٹ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ اور میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا میں پیچھے ہٹ گیا تھا۔ تب میں نے مٹی کا ایک تودہ زمین سے ہٹتے دیکھا۔ خوفناک بوڑھے نے گٹر کا ڈھکن اٹھا لیا تھا۔ جو اپنے ساتھ قرب و جواب کی مٹی اکھاڑ لایا تھا اور زمین میں ایک چوڑا سا سوراخ بن گیا تھا جس کے نیچے پانی بہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

بوڑھے نے آواز پر کان لگایا پھر آہستہ سے بولا۔ ''گہرائی آٹھ فٹ سے زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے۔ ہم باآسانی نیچے کود سکتے ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ گٹر کافی کشادہ ہے...... آؤ...... میری تقلید کرو......''

اس نے کہا اور دوسرے لمحے غڑاپ سے اندر کود گیا اب میں بھی اتنا بزدل نہیں تھا کہ سوچنے میں وقت گنواتا۔ یوں بھی مجھے زندگی سے کوئی ایسی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ہر وہ کام کرسکتا تھا۔ جو دوسرے نہ کرسکیں۔

چھپاک سے میں گندے پانی میں جا پڑا جس میں شدید تعفن تھا۔ لیکن پانی ٹخنوں سے تھوڑا سا اونچا تھا اور اس کا بہاؤ بہت آہستہ تھا۔

بوڑھا بھی میرے نزدیک ہی کھڑا تھا پھر اس نے کہا۔ ''ہمیں بہاؤ کی سمت چلنا چاہیے، ظاہر ہے پانی نشیب کی طرف بہتا ہے اور یہ نشیب کسی گہرے نالے یا ندی پر ختم ہوتا ہوگا۔ اس لیے اس طرف جانا خطرناک ہے۔''

''یقیناً......'' میں نے تائید کی۔

''آؤ......'' بوڑھے نے کہا۔ اور ہم آگے بڑھنے لگے۔ پھر تھوڑی دور چلنے کے بعد بوڑھا بولا۔ ''میرا خیال ہے، تم آگے آجاؤ، کیونکہ تم آنکھیں رکھتے ہو، کسی بھی خطرے سے آگاہ کرسکتے ہو، میرا خیال ہے۔ یہاں بھی گہری تاریکی ہوگی۔''

''ہاں...... یہاں بھی گہری تاریکی ہے۔'' میں نے کہا۔

''حالانکہ خود مجھے اپنی آواز عجیب معلوم ہورہی تھی۔ میرے لہجے میں خود شکوک وشبہات تھے۔ میں اس کو اندھا کیوں کر تسلیم کرلیتا۔ کس بنا پر کرتا۔ اس کی ساری حرکتیں آنکھوں والوں کی سی تھیں۔ وہ اندھا کیسے ہوسکتا تھا۔

کشادہ گٹر میں جس قدر تعفن پھیلا ہوا تھا۔ اس کے پیش نگاہ بڑی مشکلات سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن بہر حال، ایک منزل تک تو پہنچنا ہی تھا۔ موت کے قریب جاتے جاتے جس طرح زندگی کے قریب لوٹ آیا تھا۔ وہ بس انہونی ہی تھی۔ زندگی نے مجھے ایک اور موقع دیا تھا۔ تو اب میں اس سے گریزاں نہ رہا۔ یوں ہم چلتے رہے۔ پھر ایک جگہ چھت میں روشنی نظر آئی تو میں نے بوڑھے کو اس سے آگاہ کیا۔

''اوہ...... میرا خیال ہے، ہم کافی دور نکل آئے ہیں۔ اب اوپر نکل جانا مناسب ہوگا۔'' بوڑھے نے کہا۔

''چھت کافی اونچی تھی۔ لیکن گٹر میں اترنے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ چنانچہ میں نے پہلے بوڑھے کو ہی ان سیڑھیوں تک پہنچایا کیونکہ ابھی تو صورت حال کا

اندازہ کرتا تھا۔ وہ خود کو اندھا کہہ رہا تھا۔ اس لیے اس کا احساس تو رکھنا ہی تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد بوڑھے نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر وہ انتہائی اطمینان سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ کر مین ہول سے باہر نکل آیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں اوپر تھے۔ پتلی سی ایک گلی تھی۔ جس کے دونوں طرف مکانات بنے ہوئے تھے۔ زیادہ روشنی نہیں تھی۔ بس دور دور پولز پر اسٹریٹ بلب لگے ہوئے تھے یا کہیں کہیں لیمپ پوسٹ لگے ہوئے تھے۔ جن کی روشنی تھوڑے سے حصے کو منور کر رہی تھی۔ کافی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ رات چونکہ زیادہ گزر چکی تھی۔ اس لیے جاگتے ہوئے لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید گلیوں کے کتے بھی سو گئے تھے۔

''کیا کیفیت ہے......؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک......'' میں نے جواب دیا۔

''یوں لگتا ہے جیسے رات کا آخری پہر ہو۔ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ خاموشی چھائی ہو......''

''ہوں......'' میں نے گردن ہلائی۔

''کیا تمہارے بدن پر بھی قیدیوں جیسا لباس ہے......؟''

''ظاہر ہے......'' میں ہنس پڑا۔

''ہاں......واقعی یہ کچھ بے تکا سا سوال تھا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے دوست کہ سب سے پہلے ہمیں اس لباس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔''

''لیکن کس طرح......؟''

''چوری......'' اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔

''کیا مطلب......؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں چوری، اس کے علاوہ تو اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔''

''لیکن یہ ترکیب بے حد خطرناک ہوگی محترم بزرگ۔''

''خطرناک......بھئی تم نے اس لفظ کو اہمیت دے رکھی ہے۔ ورنہ تو خطرات زندگی کے کس لمحے نہیں ہوتے۔ کون سا وقت ایسا ہوتا ہے۔ جب ہم خطرات سے دور ہوتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے نوجوان دوست کہ ہمارا آنے والا وقت کتنے خطرناک لمحات سے بھرپور ہوگا۔ مجھے بتاؤ کیا سڑک پر چلتے وقت تمہیں یہ احساس نہیں ہو سکتا کہ کسی کار کا ٹائی راڈ ٹوٹے گا اور وہ تمہارے اوپر آ چڑھے گی۔ کیسے بچ سکتے ہو، میرے بچے، خطرات تو ہر جگہ موجود ہیں میرے دوست! انہیں نظر انداز کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔''

''شاید تمہارا خیال درست ہے۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا۔

بوڑھا دلچسپ انسان معلوم ہوتا تھا اور بہر حال اس کی باتیں حقیقت سے دور نہیں تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ مجھے پسند آتا جا رہا تھا۔ ''لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ ہم کسی مکان میں داخل ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... یہ ہی بہتر ہوگا......''

''تب ٹھیک ہے، کسی بھی مکان کا انتخاب کر لیا جائے۔''

''لیکن اس سلسلے میں ...... میں ناکارہ ثابت ہوں گا۔ سوائے اس کے کہ باہر کھڑا قدموں کی چاپ سنتا رہوں۔ میرے دوست! تم کوشش کرو، یہاں صرف تم کام کر سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں، تم اس جگہ کھڑے ہو جاؤ، اور ہاں اگر کوئی خاص خطرہ محسوس کرو تو سیٹی بجا دینا۔'' میں نے کہا۔ اور بوڑھے نے گردن ہلا دی۔

عجیب و غریب حالات تھے اور نہیں بھی اس سے کچھ گھنٹے پہلے میرے ذہن میں تصور بھی نہ تھا کہ میں زندگی کے لیے کوئی جدوجہد کروں گا۔ لیکن اب...... اب میں مکمل طور سے زندہ رہنے کا خواہش مند تھا۔

مکان میں داخل ہونے کے بعد اور اپنی مرضی کے لباس چرانے میں جو حالات پیش آئے ان میں ایسا کوئی دلچسپ واقعہ نہیں تھا۔ جو خاص طور پر قابل ذکر ہو۔ بس ہوا یوں کہ کچھ کرنسی اور چند لباس جو میری دانست میں ہم دونوں کے بدن پر آ سکتے تھے حاصل کر لیے گئے اور میں باہر نکل آیا۔

شاید قسمت ہی یاور تھی کہ ان حالات میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ نہ کوئی ناخوشگوار بات ہوئی۔ بوڑھے کے نزدیک پہنچا تو اس نے بڑے تپاک سے میری طرف اپنے ہاتھ بڑھا دیے۔

''کیا...... کامیاب آئے ہو ...... میرے بچے؟'' اس نے پوچھا۔

اور ایک بار میں پھر حیران رہ گیا۔ اس کا انداز ایسا نہیں تھا۔ جس سے وہ اندھا معلوم ہوتا۔ تاہم میں نے جواب دیا۔

''ہاں......کام بن گیا......''

''بہت خوب......'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر ہم ایک دیوار کی سمت بڑھ گئے۔ سب سے پہلے میں نے اور پھر بوڑھے نے اپنا لباس تبدیل کر لیا۔ جیل کے کپڑے ہم نے وہیں۔ ایک طرف گٹھری بنا کر ڈال دیے تھے۔ یہ لباس جو میں نے پہنا تھا۔ وہ تو میرے بدن پر فٹ تھا۔ لیکن بوڑھے کی جسامت اچھی خاصی تھی۔ اس بنا پر لباس اسے ذرا تنگ تھا۔ تاہم کام چل سکتا تھا۔ میں نے کرنسی احتیاط سے جیب میں رکھی اور ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

''اب کیا خیال ہے......؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''یہ تو تمہی بتا سکو گے۔ میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ اس وقت ہم ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ میں نے بوڑھے کے چہرے پر نگاہیں دوڑائیں پہلی بار میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا اور ایک بار پھر مجھے ذہنی جھٹکا لگا۔ میرے خیال کے مطابق بوڑھا اندھا ہونے کا فریب کر رہا ہے۔ ورنہ اس میں کوئی بھی بات اندھوں جیسی نہ تھی۔ لیکن اب میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں تو احساس ہوا کہ روشنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں دو گڑھے تھے۔ جن میں کچھ نہ تھا۔ یقیناً وہ اندھا تھا۔

''لیکن ایک اندھا اس قدر تیز حسیات کا مالک'' یہ بات بہت متحیر کن تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے...... نوجوان......؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''جہانگیر خان......'' میں نے جواب دیا۔ اور بوڑھا گردن ہلانے لگا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں بھی اس بوڑھے کا نام پوچھوں۔

''اور تمہارا......؟''

''میرا نام......؟'' بوڑھا چند لمحات کے لیے رکا اور پھر بولا۔ ''سرجیت بھوما۔''

''سرجیت بھوما۔'' میں نے تعجب سے کہا۔

''ہاں......بھوما......''

''تمہاری قومیت کیا ہے......؟'' میں نے اس کے نام پر حیران ہو کر پوچھا۔

''قومیت کچھ بھی سمجھ لو......کچھ بھی کہہ لو...... یہ سب کچھ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بس ہم دوست ہیں......یہ ہی کافی ہے......''

''ٹھیک ہے...... مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن اب ہم کہاں چلیں......؟'' چند منٹ کے بعد میں نے پوچھا۔

''جہانگیر......!'' بوڑھے نے مجھے پکارا۔

''ہاں......'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے ایک بات بتاؤ...... اگر تمہیں زندگی مل جاتی تو تم اسے کہاں صرف کرتے......؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''یہ بات مجھ سے بار بار کیوں پوچھتے ہو، میں بتا چکا ہوں کہ پوری دنیا میں میرے باپ کے سوا میرا کوئی نہ تھا اور وہ مر چکا ہے۔ اس کی موت کے بعد میں نے بھی مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور تم نے دیکھا میں موت کے کتنا نزدیک تھا۔ اب تم مجھے زندگی کے قریب لے آئے ہو۔ تو مجھ سے ایسی باتیں مت کرو، میرا کوئی نہیں

ہے۔ میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔''

''اوہ..... میرے بچے، جہانگیر! میں تمہارے زخموں کو نہیں کریدنا چاہتا تھا۔ میں تو صرف تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے دل میں کوئی خاص خواہش تو نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں جاؤ گے.....؟''

''سرائے دلبر۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''کیا مطلب.....؟''

''ہاں..... میں اسی طرف کا رہنے والا ہوں۔''

''اوہ ٹھیک ہے۔ ظاہر ہے۔ جب میرا اس دنیا میں ٹھکانہ ہی نہیں ہے تو پھر کہیں بھی چلو۔''

''تب پھر میرے دوست ہمیں اس وقت اسٹیشن چلنا چاہیے۔''

''چلو.....'' میں نے لاپرواہی سے کہا اور ہم دونوں اسٹیشن کی جانب چل پڑے لباس تو بدلے ہوئے تھے ہی، اس لیے کسی نے خصوصی طور پر ہماری طرف توجہ نہیں دی اور ہم اسٹیشن پہنچ گئے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل پر ہم نے سرائے دلبر کے لیے ٹرین کا ٹائم دیکھا۔ اتفاق ہی کی بات تھی کہ اب سے پون گھنٹے کے بعد ایک ٹرین سرائے دلبر کی طرف روانہ ہوتی تھی۔ ہم نے فوراً ٹکٹ خرید لیے اور پلیٹ فارم پر ٹہل ٹہل کر وقت گزارنے لگے رات کا چونکہ آخری پہر تھا۔ اس لیے پلیٹ فارم پر مسافر اکا دکا ہی تھے۔ چند دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ایک چائے خانے پر پہنچ گئے۔ چائے طلب کی اور دونوں چائے پینے لگے۔ بوڑھا سرجیت خاموش تھا۔

ویسے اس کے نام پر میں جب بھی غور کرتا مجھے عجیب سا لگتا۔ نہ جانے یہ کیسا نام تھا۔ کون سے علاقے کا تھا۔ ویسے تو یہ بوڑھا ہی پراسرار تھا۔ اس کی کون کون سی بات پر غور کرتا۔ بہر حال مجھ جیسے انسان کو ان ساری باتوں کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔

پون گھنٹہ گزر گیا اور ہماری مطلوبہ ٹرین آ گئی۔ کافی مسافر نیچے اترے ہم دونوں کو بڑی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ بوڑھا سرجیت، ٹرین میں بھی آنکھوں والوں کی طرح ہی چڑھا تھا۔ اس کے انداز میں ذرا بھی جھجک نہیں تھی۔ البتہ سیٹ پر بیٹھنے میں اس نے میری مدد طلب کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین روانہ ہو گئی۔ بھوما بالکل خاموش تھا اور جب یہ خاموشی طویل ہونے لگی تو میں نے ہی اسے مخاطب کیا۔

''کیا بات ہے۔ تم ضرورت سے زیادہ خاموش ہو.....؟''

''کچھ سوچ رہا تھا۔ تم ہی گفتگو کرو.....'' بھوما نے جواب دیا۔

''کیا گفتگو کروں..... تم بتاؤ کیا سوچ رہے تھے.....؟''

''اوہ..... میری بات مت کرو..... میرا ذہن تو خیالات کا دفینہ ہے۔ بس نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا ہوں۔''

''دراصل ہم لوگوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا ہے یعنی ایک دوسرے کا ماضی نہیں کریدیں گے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ تمہاری پچھلی زندگی بے شمار واقعات سے پر ہو گی اور یقیناً وہ واقعات میرے لیے بہت دلچسپ ہوتے۔ خیر ہم دوسری گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔''

''یہ ہی مناسب ہے۔ میرے دوست! ماضی کریدنے سے کچھ نہیں ملتا۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن اب تم سرائے دلبر پہنچ کر کیا کرو گے.....؟''

''تمہیں اپنی قدیم رہائش گاہ دکھاؤں گا۔'' بڑی انوکھی جگہ ہے۔ تم اسے دیکھ کر یقیناً حیران ہو گے۔''

''کیا خاص بات ہے۔ اس میں.....؟''

''بس دیکھو گے تو اندازہ ہو گا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ اس کی بات اس وقت تک گئی۔ تمہارے عزیز واقارب تو ہوں گے؟''

''تم خوش ہو جاؤ بیٹے کہ اتفاق سے اس دنیا میں

میرا ابھی کوئی نہیں ہے۔''

''اس میں خوشی کی کیا بات ہے.....؟''

''ہاں..... یہ بھی ٹھیک ہے۔'' بوڑھے نے روا روی میں کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ کیا تم پیدائشی اندھے ہو.....؟''

''نہیں.....'' بوڑھے کی آواز میں اچانک تختی سی آ گئی۔ ''میں پیدائشی اندھا نہیں ہوں۔ لیکن آنکھیں کھوئے مجھے دو سال سے زیادہ نہیں گزرے۔ میرے دشمن نے میری دونوں آنکھیں نکالی ہیں۔''

''ارے.....'' میں چونک پڑا۔ ''کون تھا وہ دشمن.....؟''

''تھا نہیں، تھی..... بلکہ ہے۔''

''اوہو..... کوئی عورت تھی.....؟''

''ہاں..... عورت نہیں ناگن، ایک خوفناک ناگن۔'' بوڑھا نفرت زدہ آواز میں بولا۔

''کیا دشمنی تھی اس سے.....؟''

''ابھی نہیں بتاؤں گا دوست..... اس کے لیے کچھ انتظار کرو۔''

''اچھا تمہاری مرضی، لیکن ایک بات پر مجھے حیرت ہے۔ وہ یہ کہ تم کسی طور پر اندھے معلوم نہیں ہوتے۔ تمہاری حرکات آنکھوں والوں کی سی ہیں۔ جیل کی تاریک چار دیواری میں تم نے جس انداز میں راستہ تلاش کیا تھا۔ وہ میرے لیے بڑی حیرت انگیز بات تھی۔''

''ہاں..... انسان جب کسی حس سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو اس حس کی کمی دوسری چند خصوصیات سے پوری کر دی جاتی ہیں۔ میرا ذہن میری آنکھیں ہیں۔ تم نے جیل کے راستوں کا جو نقشہ کھینچا تھا۔ میرے ذہن کی آنکھ نے اسے پہچانا۔ اور میری رہنمائی کی اس طرح میں اس کے مطابق چلتا رہا۔ میرے کان ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ میں ہوا کی سرسراہٹ سے بہت سی باتوں کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ میں قدموں کی چاپ سے انسان کی پوری شخصیت پہچان لیتا ہوں۔ اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں مجھ میں جو تم پر آہستہ آہستہ کھل جائیں گی..... انتظار کرو۔''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے گہری سانس لے کر کہا اور پھر راستے بھر میں بوڑھے بھوما کی پراسرار شخصیت کا جائزہ لیتا رہا۔ میرے ذہن کی چولیں ہل گئی تھیں۔ بالآخر وہ پہاڑی اسٹیشن جس کا نام سرائے دلبر تھا۔ آ گیا، میں نے تو اس وقت تک اسٹیشن کا بورڈ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن بوڑھا بھوما اس وقت اونگھ رہا تھا۔ اور اچانک ہی وہ اونگھتے اونگھتے چونک پڑا۔ اس نے چہرہ اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھا اور پھر مجھے ٹٹولنے لگا۔

''کیا تم سو رہے ہو، جہانگیر خان.....؟'' اگر سو رہے ہو تو جاگو ہماری منزل آ گئی ہے۔''

''میں جاگ رہا ہوں بھوما..... لیکن تم نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ آنے والا اسٹیشن سرائے دلبر کا ہے۔'' اور میری اس بات پر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''..... یہ سب نہ پوچھو۔ اپنی زمین کی خوشبو روئیں روئیں میں بسی ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ تمہارے دل میں وطن کی سچی محبت ہو یہ ہوائیں مجھے میری سرزمین کی آمد کی اطلاع دے رہی ہیں۔'' اس نے جواب دیا اور درحقیقت آنے والا اسٹیشن سرائے دلبر ہی تھا۔

ہم دونوں ٹرین سے نیچے اتر گئے۔ بوڑھا اس انداز میں آگے بڑھ رہا تھا کہ جیسے سارے راستے اس کے جانے پہچانے ہوں۔ میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم بستی میں داخل ہو گئے۔ اچھی خاصی پکی آبادی تھی۔ جھٹپٹا وقت تھا۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ زندگی کی گہما گہمی ماند نہیں پڑی تھی۔ لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

بوڑھا سرجیت بھوما چلتے چلتے چند ساعت کے لیے رک جاتا اور پھر چلنے لگتا۔ ایک جگہ رک کر اس نے کہا۔

''اپنے بائیں سمت دیکھو جہانگیر..... ! کیا تمہیں سرخ رنگ کا ایک مینار نظر آ رہا ہے۔''

”ہاں...... مینار موجود ہے۔“ میں نے بائیں سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

”اندازاً کتنے فاصلے پر ہوگا......؟“

”تقریباً سو گز پر ہے۔“

”ہوں......“ بوڑھے نے گردن ہلائی اور پھر تقریباً پچیس تیس قدم چلنے کے بعد وہ دائیں سمت مڑ گیا۔ اس طرف ایک پتلی سی گلی تھی۔ جو کافی طویل معلوم ہوتی تھی۔ اس گلی کے آخری سرے پر بستی کا آخری مکان تھا۔ اس کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جو حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا اور ہم کھیتوں کے درمیان پگ ڈنڈی پر ہو لیے۔ بوڑھا بھوما۔ خاموشی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے سورج ڈوب گیا تھا۔ اب کھیتوں پر تاریکی کی دبیز چادر پھیلی جا رہی تھی۔ چلتے چلتے میں تنگ آ گیا تھا۔ تب میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

”تم نے کہا تھا یہی بستی تمہاری بستی ہے......؟“

”ایں......“ بوڑھا چونک پڑا...... ”کیا کہا تم نے......؟“

”میں کہہ رہا تھا کہ تم تو دیکھ نہیں سکتے...... اپنے ذہن کی آنکھوں سے دیکھو کہ سورج چھپ چکا ہے اور تاریکی پھیلتی جا رہی ہے اور ہم طویل و عریض کھیتوں کے درمیان چلے جا رہے ہیں بستی کا آخری مکان بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

”اوہ...... بس تھوڑی دور اور...... ان کھیتوں کے اختتام پر جنگلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بس وہی قیام گاہ ہوگی۔“

”جنگلوں میں......؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں...... میں کسی قدر تنہائی پسند بھی ہوں...... اور پھر ایک طویل عرصے تک میں اپنی قیام گاہ سے دور رہا ہوں۔ بہرحال اب ہمیں زیادہ نہیں چلنا پڑے گا۔“

کھیتوں کے اختتام پر پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ جنگلات کا سلسلہ گہری تاریکی میں لپٹ گیا تھا۔ مجھے تو تھوڑے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن سماعت کی بینائی سے مرصع بھوما اس وقت حیرت انگیز ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اچھی خاصی رفتار سے چل رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور سچ مچ میں اس عمارت کو نہیں دیکھ سکا۔ جس کے دروازے پر اس نے مجھے لا کھڑا کیا تھا۔ پتہ تو اس وقت چلا جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ جیسے کسی پرانی عمارت کا طویل عرصہ سے بند دروازہ کھلا ہو...... چوں...... چہ...... کی آواز بند ہو گئی۔ اور پھر بوڑھے سرجیت بھوما کی آواز سنائی دی۔

”کیا خوف زدہ ہو......؟“

”بوڑھے کی بات مجھے پسند نہیں آئی تھی، اس لیے میں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ اس نے چونک کر میرے ہاتھ کو ٹٹولا اور پھر اسے پکڑ کر بولا۔

”غیر معمولی طور پر خاموش ہو، کیا بات ہے......؟“

”کچھ نہیں...... تم بار بار احمقانہ گفتگو کرنے لگتے ہو، بھلا میں دنیا میں کس چیز سے خوفزدہ ہو سکتا ہوں......؟“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”اوہ...... مجھے افسوس ہے۔ واقعی میں نے غلط جملے استعمال کیے ہیں۔ مگر تمہاری خاموشی کیا معنی رکھتی ہے......؟“

”بس میں حیران ہوں...... میں اس عمارت کو بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔“ میں نے جواب دیا اور بھوما نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”کافی تاریکی ہے شاید......“

”ہاں......“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”میرا ہاتھ پکڑ کر چلتے رہو...... آؤ......“ اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیسی عمارت ہے۔ مجھے تو اس کے در و دیوار تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن اندھا بھوما بہ آسانی موڑ مڑ رہا تھا۔ ویسے کافی وسیع عمارت معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اندر داخل ہونے کے بعد کافی دیر تک چلنا پڑا تھا۔

پھر بھوما رکا اور اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں ایک گہری سانس لے کر اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا تھا، لیکن اندر تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کمرے میں سیلن کی بو بالکل نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کشادہ اور ہوادار ہے اور کسی طرف سے اس میں ہوا آتی ہے۔

”ٹھہرو...... میں تمہارے لیے روشنی کر دوں...... میں نے لفظ تمہارے لیے ٹھیک استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے، میرے لیے روشنی اور تاریکی یکساں ہیں۔ ہے ناں......؟“ اس نے کہا۔

میں نے اس وقت بھی خاموشی مناسب سمجھی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں ایک شمع دان روشن ہو گیا۔ پہلے ایک شمع جلی تھی۔ اس کے بعد متعدد...... خاصی روشنی ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں......“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

میں کمرے کی آرائش دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف انتہائی نفیس پرانے طرز کا فرنیچر موجود تھا۔ فرش پر سرخ رنگ کا ایک دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف حسین مسہری بھی تھی۔ غرض ہر لحاظ سے اسے ایک قیمتی کمرہ کہا جا سکتا تھا۔ جس سے بوڑھے کے ذوق کا پتہ چلتا تھا۔“

”یہ عمارت تمہاری ہے......؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں...... آبائی، پشتوں کی......“ اس نے جواب دیا۔

”لیکن کیا یہاں تمہارے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے؟“

”ہے......“ اس نے کہا۔

”کون ہے......؟“

”میرے دو ملازم......“

”اوہ...... مگر عمارت تو ویران ہے۔ یہاں وہ لوگ کس طرح رہتے ہوں گے......؟“

”وہ بھی میری طرح سکون پسند ہیں۔ اس لیے انہیں یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ بھوما نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

”یہ سکون کی جگہ ہے۔ مجھے خوشی ہے۔ کہ ہم نہایت کامیابی سے یہاں تک آ پہنچے اب یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اول تو پولیس جیل سے مفرور قیدیوں کی تلاش کرتی یہاں تک پہنچ نہیں سکتی اور اگر پہنچ بھی گئی تو اس ویران عمارت میں اسے کچھ نہیں ملے گا۔ یہاں داخل ہونے والے باہر کے لوگ یہاں کچھ تلاش نہیں کر سکتے۔“

”ہاں...... یہ جگہ مجھے ایسی ہی لگتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم بھوکے ہو گے، میں تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ تم بے جگر انسان ہو، اور خوف زدہ ہونے والوں میں سے نہیں ہو۔ یہاں تمہیں جو کچھ نظر آئے۔ اس سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں سب ہمارا اپنا ہے۔“

”ٹھیک ہے بڑے میاں، آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ اور پراسرار بوڑھا مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں ایک آرام دہ کرسی پر دراز ہو گیا۔ درحقیقت میں یہاں خوف زدہ نہیں تھا۔ میری اس کیفیت کا جواز یہ ہے کہ میں نے طویل عرصہ موت کے تصور میں گزارہ تھا۔ خوف کی بنیادی وجہ، تکلیف، آزار یا موت ہوتی ہے۔ یعنی موت اس سلسلے میں آخری اسٹیج ہوتا ہے اور میں اس اسٹیج پر تھا۔ ایک جذباتی مقصد کے تحت میں نے موت اپنالی تھی اور مجھے اپنی زندگی سے دلچسپی ہوتی تو اول تو میں اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کیلئے اتنا بھیانک کھیل ہی نہ کھیلتا یا پھر انتقام لینے کے بعد وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ لیکن میں نے خوشی سے خود کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔

گویا مجھے اب زندگی کی ضرورت نہیں تھی اور

اب میں تونگر بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ جب مجھے سزائے موت سنائی گئی تو میں نے موت کے بارے میں سوچا ضرور تھا۔ لیکن وہی عزم واستقلال برقرار رہا تھا۔ یعنی میں نے اپنی زندگی کی حدیں اپنے مقصد سے منسلک کردی تھی۔ اس لیے موت سے ڈر نہیں لگا تھا۔

نہ جانے اس بوڑھے کی باتوں میں کیا جادو تھا کہ اس نے مجھے اس قدر جلدی متاثر کرلیا تھا اور اب زندگی کی طرف آکر بھی میں پشیمان نہیں تھا۔ بلکہ اب تو مجھے زندگی سے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن میں عام انسانوں سے زیادہ بے جگر تھا۔ میں اس ماحول میں قطعی خوف زدہ نہیں تھا۔ ہاں...... اس کے بارے میں سوچ ضرور رہا تھا اور سوچ کی وجہ قدرتی تھی۔

بوڑھا بے حد پراسرار تھا۔ وہ آنکھوں سے اندھا تھا۔ اگر اس کی آنکھیں موجود ہوتیں اور صرف بینائی کھو جانے کی بات کرتا تو شاید ذہن تسلیم نہ کرتا۔ میں سوچتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن آنکھوں کی جگہ دو غار اس کی سچائی کا ثبوت تھے اور پھر اس کی بے پناہ صلاحیت جو شاید آنکھوں والوں کو بھی نصیب نہیں تھی۔ حیرت انگیز بات تھی۔ پھر اس عمارت کا ماحول لیکن وہ مجھے یہاں لایا کیوں ہے اور اب عمارت میں آکر میں کیا کروں گا۔

نجانے ان سوچوں میں کس قدر وقت بیت گیا۔

پھر دروازے پر ہلکی سی آہٹ سن کر ہی میں چونکا تھا دروازہ کھل رہا تھا اور پھر بوڑھے کے بجائے ایک اور شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی جو اس نے انتہائی تہذیب سے ایک میز پر رکھ دی اور پھر پانی کا جگ بھی درست کرنے لگا۔

لیکن جب پانی وغیرہ رکھ کر سیدھا ہوا تو میں بری طرح چونک پڑا اوہ...... اس کی بھی دونوں آنکھیں غائب تھیں۔ اور ان کی جگہ دو گہرے غار تھے۔ سیاہ گہرے غار میں، ششدر رہ گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ کھانا لانے والے نے اپنے قریب میری موجودگی کو بخوبی محسوس کرلیا تھا۔ پھر وہ نرم آواز میں بولا۔ ''کھانا کھا لیجیے جناب......!''

''ہاں...... ٹھیک ہے، سنو کیا تم اندھے ہو......؟'' میں نے پوچھا۔

لیکن وہ اس طرح واپس مڑ گیا جیسے اندھا ہی نہ ہو۔ بہرا بھی ہو، اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے طویل سانس لے کر شانے ہلائے اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جہنم میں جائے سب کچھ، خواہ یہ اندھوں کی نگری ہو، یا بہروں کی، میں جیل سے باہر نکل آیا ہوں۔ اور اب زندگی کی طرف چل پڑا ہوں۔ یہ زندگی میری اپنی ہے۔ بوڑھا بھوما بے شک مجھے جیل سے نکالنے میں معاون ہے۔ میرا مددگار ہے۔ لیکن اب میری زندگی میری اپنی ہے۔ میں اس کا پابند تو نہیں ہوں۔ جب تک دل چاہے گا یہاں رہوں گا اور جب دل چاہے گا تو یہاں سے نکل جاؤں گا۔

میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا بہت عمدہ کھانا تھا اور پھر میں برتن ایک طرف سرکا کر ملحقہ باتھ روم میں گیا۔ دانت وغیرہ صاف کیے۔ شیو کافی دن سے نہیں بنا تھا۔ وہ بنایا۔

اس وقت میں نے اس کمرے سے نکلنا مناسب نہیں سمجھا۔ جاتا بھی کہاں، چنانچہ مسہری پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ عرصہ کے بعد احساس ہو رہا تھا کہ جیل کی بجائے میں گھر میں ہوں۔ اب وہ گھر کسی کا بھی ہو۔ زمین پر ٹاٹ بچھا کر سوتے ہوئے نجانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ آرام دہ مسہری عجیب سی لگی اور نیند تو جیسے تلی بیٹھی تھی۔ گہری نیند سو گیا اور دوسرے دن صبح ہی کو آنکھ کھلی۔

ناشتہ بوڑھے سرجیت بھوما نے میرے ساتھ ہی کیا تھا۔ ہم جس کمرے میں گئے وہ بھی باقاعدہ ڈرائنگ روم تھا۔ جس میں اخروٹ کی لکڑی کی منقش میز اور کرسیوں کا سیٹ تھا۔ برتن بھی نہایت قیمتی تھے۔ بوڑھا خاصا صاحب ذوق تھا۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہا۔

''بھوما...... میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہاں

کے حالات دیکھ کر، تمہاری شخصیت کو محسوس کرکے تجسس اس قدر بڑھ گیا ہے کہ میں تمہارے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوگیا ہوں، کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ہم دونوں اپنا عہد توڑ دیں تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ اور میں تمہیں اپنے بارے میں۔

میری بات سن کر بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اس کے بجائے کیوں نہ ہم کام کی باتیں کریں۔'' اس نے کہا۔

''لیکن میرا تجسس......؟''

''تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے......؟''

''نہیں...... لیکن میں تمہارے اندھے ملازم کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''ارے...... کیا جاننا چاہتے ہو۔ اس کے بارے میں......؟''

''کیا تمہارا دوسرا ملازم بھی اندھا ہے......؟''

''ہاں......''

''واقعی؟'' میں اچھل پڑا۔

''بالکل...... میں غلط نہیں کہہ رہا۔''

''لیکن معاف کرنا یہ اندھوں کی ٹیم تم نے کیوں جمع کی ہے......؟''

''اسے میرا کمپلیکس سمجھ لو۔ میں خود اندھا ہوں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھی بھی اندھے ہوں۔'' بوڑھے نے مسکرا کر جواب دیا۔

''لیکن تم تو خصوصی حسیات کے مالک ہو، کیا یہ ملازم بھی تمہاری طرح ہیں۔''

''ہاں...... یہ پوری عمارت کی نگرانی کرتے ہیں۔ باورچی خانے میں کھانے پکاتے ہیں۔ کمروں کو صفائی کرتے ہیں۔ کوئی کام ایسا نہیں جو نہ کرسکیں۔

''لیکن پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے......؟ اور تم کہہ چکے ہو کہ تم پیدائشی اندھے نہیں ہو......''

''ناشتے کی میز سے بوڑھا اٹھ گیا اور پھر اس نے مجھے یہ کھنڈر نما عمارت دکھائی درحقیقت تاحد نگاہ ویران جنگل کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس کھنڈر کی موجودگی بھی حیرت انگیز تھی۔ نجانے آبادی سے دور یہ عمارت کس لیے بنائی گئی تھی۔ بوڑھا مجھے ایک ایک جگہ کے بارے میں بتاتا رہا۔ اور پھر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

''بیٹھو......''

''اس نے ایک طویل سانس لے کر خود بھی بیٹھتے ہوئے کہا اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ جس گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا اور بوڑھا کسی سوچ میں گم تھا۔ کافی دیر خاموشی سے گزر گئی۔

''میرا خیال ہے تم خصوصی طور پر مجھے اپنے بارے میں بتانا نہیں چاہتے......''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں بہت جلد اپنے بارے میں بتادوں گا...... بہت جلد......''

اس نے پرخیال انداز میں کہا۔

اور میں خاموش ہوکر کچھ سوچنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اپنے بارے میں چھپانا چاہتا ہے تو مجھے بھی اتنی کرید نہیں ہے۔ میرا کیا ہے۔ میرا جب دل چاہے گا۔ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کس کی مجال ہے کہ مجھے روک سکے۔ اس کے بعد میں نے بوڑھے سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا تم آرام کرو...... میں چلتا ہوں اور ہاں ذہن میں کسی وسوسے کو جگہ دینے کی ضرورت نہیں...... میرے ساتھ رہ کر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''تم بالکل فکر مت کرو۔ میں نے دوبارہ زندگی قبول کرلی ہے اور اب میں اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔''

''یقیناً...... یقیناً......'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں اب یہاں سے کسی حد تک اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا اور دوسرے انداز میں سوچ رہا تھا کیوں نہ راہ فرار اختیار کی جائے۔

جو فاصلہ طے کر کے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ اس سے واپس بھی جا سکتا ہوں۔ کون روکنے والا تھا۔ تھوڑی دیر اور سہی۔

اور پھر میں مسہری کی طرف بڑھ گیا۔ لیٹ گیا اس کے علاوہ اور کام بھی کیا تھا...... لیکن اب...... کیا کرنا چاہیے......؟ یہاں سے کہاں جاؤں۔ کس طرح زندگی بسر کروں۔ ظاہر ہے۔ پولیس میرا تعاقب کرے گی۔ دس آدمیوں کا قتل تھا۔ اور سزائے موت کا مجرم۔ مہذب دنیا میں پتہ نہیں میرے خلاف کیا کیا کارروائیاں ہو رہی ہوں لیکن جب زندگی سے ہاتھ ہی دھو لیے تھے جب اپنے آپ کو مردہ ہی تصور کر لیا تھا تو اب زندہ رہنے کے لیے خوف بے معنی تھا۔ آنکھ مچولی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ زندہ بچ گیا تو ٹھیک ہے اور پولیس کی گولی دل میں اتر گئی۔ تو بہر حال موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔ لیکن اب اس بوڑھے سے کچھ گھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

اونہہ اس بور ماحول میں زندہ رہنا ہی بے مقصد ہے۔ جب زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں تو پھر کیوں نہ چند سانسیں زندگی سے بھرپور ماحول میں گزاری جائیں۔

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔

دوپہر ہوئی اور پھر شام ہو گئی۔ رات کے کھانے پر بھی بوڑھا میرے ساتھ تھا۔ کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی اور وہ مجھے کھانے کے بعد آرام کی تلقین کر کے چلا گیا تھا۔ میں بھی بیزار سا کمرے میں واپس آ گیا۔ اب تو بالکل ہی دل اکتا گیا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی اور ذہن نیم غنودہ ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ اس کا احساس گہرے گہرے سانسوں کی آواز سے ہوا تھا اور سانسوں کی آواز اتنی تیز تھی۔ جیسے خراٹے لیے جا رہے ہوں۔ پہلے تو میں نے سوچا شاید میری سماعت کا دھوکا ہے۔ لیکن سانس اتنے گہرے تھے کہ ذہن کی غنودگی دور ہو گئی۔ اور میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ لیکن شمع دان کی روشنی میں کوئی نظر نہیں آیا۔

پھر یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ پورے طور سے غور کیا تو احساس ہوا کہ مسہری کے نیچے سے تیز سانسوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اچھل کر نیچے کود آیا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی بھلا یہاں کون ہو سکتا تھا۔ بے ساختہ میں نیچے جھکا اور پھر اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ یقیناً کوئی موجود تھا۔ دو پاؤں سامنے ہی نظر آ رہے تھے۔ چونکہ شمع دان کی روشنی مسہری کے اس رخ پر نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ یہ پاؤں بوڑھے کے ہیں یا اس کے نوکر کے۔ بہر حال میں نے کوئی تکلف نہیں کیا اور اطمینان سے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور زور سے باہر گھسیٹ لیے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ کمرے میں گونج اٹھی۔ چیخ کے ساتھ ہی میں نے گھبرا کر پاؤں چھوڑ دیے اور اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

لیکن میں نے جس طاقت سے اسے گھسیٹا تھا۔ اس سے وہ پوری باہر نکل آئی تھی اور اپنے کمرے میں ایک حسین اور نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر میری آنکھیں متحیرانہ انداز میں پھیل گئیں۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ کیونکہ اب تک میں نے صرف بوڑھے بھوما کو دیکھا تھا۔ یا اس کے دونوں اندھے ملازموں کو۔ اب تک نہ تو کسی سے کسی لڑکی کے بارے میں سنا تھا اور نہ ہی ایسے آثار نظر آتے تھے۔

”لیکن یہ اچانک لڑکی کہاں سے ٹپک پڑی۔“

وہ متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکا رہی تھی۔ جیسے سونے سے جاگنے والے وقتی طور پر خالی الذہن ہو جاتے ہیں۔ اس کے چہرے کے تراش عجیب سی تھی۔ عمر کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک نگاہ میں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک سادہ سی لڑکی ہے۔ لیکن بغور دیکھنے سے چہرے پر بے حد سفاکی نظر آتی تھی۔ ہونٹوں کی تراش میں ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اس کے بدن پر سیاہ چست پتلون اور سفید مردانہ قمیص تھی۔ بالوں کا اسٹائل بھی کافی خوب صورت تھا۔ اور اس کی پلکیں جھپکانے کا

انداز۔

پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ حواس کی دنیا میں واپس آ گئی ہو اس نے دونوں کہنیاں زمین پر لٹکائیں اور بدن کو تھوڑا سا اٹھایا۔ اور پھر ایک بے تعلق سی کراہ کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

”کب آئے تم......؟“ اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ جیسے برسوں سے شناسا ہو۔

”کیا مطلب...... کون ہو تم......؟“ میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

”ویرنا......“ اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ لیکن آپ کون ہیں۔ اور کہاں سے نازل ہوئی ہیں......؟“

”اس مسہری کے نیچے سے......“

”سبحان اللہ کیا ابھی ابھی پیدا ہوئی ہیں......؟“

”نہیں...... میری عمر بائیس سال ہے۔“

”تو بائیس سالہ حسینہ اب اپنی شان نزول بھی بتا دیجیے۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہو تم، پورے چار گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ دھرم اور کرم یقیناً میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ بلکہ شاید مایوس بھی ہو چکے ہوں۔ بس میں چھپ کر آئی اور سیدھی مسہری کے نیچے آ گھسی، پتہ نہیں کس وقت نیند آ گئی۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے۔“

”اوہ......“ میں نے پریشانی سے گردن ہلائی۔

نجانے اس بھوت خانے میں کیا کیا تھا۔ اب اس لڑکی سے کیا کیا جائے اور یہ جو کچھ کہہ رہی ہے اسے کیا سمجھا جائے۔ پتہ نہیں کون ہے اور اس عمارت میں کہاں سے آ گئی۔ سرجیت بھوما سے اس کا کیا تعلق ہے۔ بہت سے سوالات میرے ذہن میں مچل رہے تھے۔ چند ساعت میں اس کی شکل دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سہارا قبول کر لیا گیا۔ اس کا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ تب وہ اٹھ گئی اور شکریہ کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”خدا کے لیے اب تو بتا دو کون ہو تم......؟“

”ارے تم یہ نہیں جانتے......؟“

”جی نہیں......“

”کہہ تو چکی ہوں کہ ویرنا ہوں۔ اور تمہیں ایک بہت اہم اطلاع دینے آئی ہوں۔“

”اچھا تو فرمائیے۔“ میں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر کہا۔

”بھاگ جاؤ...... فوراً بھاگ جاؤ۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہوں گی۔“

”کیوں خیریت یہاں میری موجودگی آپ کو گراں گزر رہی ہے......؟“ میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا اور اگر تم ویرنا ہو تو ویرنا ہوتی کیا چیز ہے......؟“

”بس...... بس رہنے دو...... میں سمجھ گئی تم میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے۔ بھگتو گے خود، میں نے دوستانہ طور پر تمہیں بتا دیا ہے اور اس کے لیے میں چار گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ لڑکی کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی۔ جیسے وہ صحیح الدماغ نہ ہو۔ میں غور سے اسے دیکھتا رہا اور پھر میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

”بھوما سے تمہارا کیا رشتہ ہے......؟“

”موت کا رشتہ ہے۔ مارے جاؤ گے، تم کتے کی موت اور پھر یاد کرو گے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہوں گی ارے مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے تمہارے لیے وقت ضائع کیا ہو۔“ وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولی۔ اور پھر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے نہیں، نہیں بیٹھو...... تم تو مجھے بہت اچھی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔“ میں نے آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے اور اس نے ایک جھٹکے میں شانے چھڑا لیے۔

”بولو...... جاؤ گے یا نہیں......؟“ اس نے

پوچھا۔

”تم یہیں رہتی ہو......؟“

”ہاں......“

”تب تو مجھے یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں کہتی ہوں۔ فضول باتیں مت کرو اور......“

اچانک اس کے حلق سے چیخ نکل گئی دروازہ بہت زور سے کھلا تھا۔ سب سے آگے بھوما اور اس کے پیچھے دونوں ملازم اندر گھس آئے تھے۔ تینوں کے چہروں پر خوفناک تاثرات تھے۔ بھوما منہ اٹھا کر کتے کی طرح سونگھنے لگا اور پھر غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”ہوں...... تو تم یہاں موجود ہو۔“

”مم...... میں تو ابھی آئی تھی۔“ لڑکی نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور اس کی آنکھوں سے خوف ٹپکنے لگا۔

”چلو ...... دھرم! اسے یہاں سے لے جاؤ......“ اور دونوں ملازموں نے آگے بڑھ کر لڑکی کے بازو پکڑے اور اسے خاصی بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ لڑکی نے منہ سے آواز نہیں نکالی تھی۔ بھوما کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔ چند ساعت وہ سوچتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کیا بکواس کر رہی تھی یہ بے وقوف لڑکی......؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”جو کچھ کہہ رہی تھی۔ اس سے تمہیں سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ تم نے مجھے یہاں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ میں نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جہانگیر تم بہت بے صبرے ہو، میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ لیکن نہ جانے کیوں تمہیں اس سلسلے میں اتنی جلدی ہے۔ بہرحال اس کے بارے میں سنو!

وہ میری بیٹی ہے...... ویرنا، اس کا دماغ الٹ چکا ہے۔ مکمل طور سے پاگل ہے۔ اس کی کسی بات کا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اب بتاؤ، وہ کیا کہہ رہی تھی، تم سے......؟“

”بس میرا خیال ہے۔ کوئی عقل کی بات نہیں کی تھی۔ کہہ رہی تھی، یہاں سے بھاگ جاؤ، ورنہ مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا تھا اس نے......“ میں نے کہا اور یوں محسوس ہوا جیسے بوڑھے نے اطمینان کا سانس لیا ہو۔ پھر وہ غم زدہ انداز میں بولا۔

”میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ بچی ہے۔ اس کی ماں اس کی پیدائش کے وقت ہی مر گئی تھی اور اس کے بعد میں نے ہی اس کی پرورش کی۔ بے حد حساس ہے۔ ذرا ذرا سی بات کو ذہن میں چپکا لیتی ہے اور بالآخر یہی بات اس کے ذہنی انتشار کا باعث بنی۔ اب وہ صحیح الدماغ نہیں ہے۔ اس کی غیر موجودگی سے ہم بڑے پریشان ہو گئے تھے۔ بہرحال شکر ہے کہ وہ تمہارے کمرے میں مل گئی اور ہمیں اس کی تلاش میں جنگلوں کا رخ نہیں کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے تمہیں نیند آ رہی ہو گی۔ آرام کرو...... احمق لڑکی نے تمہیں پریشان کیا۔“

”بیٹھو...... بھوما...... مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی، تم مجھے اس لڑکی کے بارے میں کچھ اور بتاؤ......“

”صبح کو سہی جہانگیر...... میں خود بھی تھکن محسوس کر رہا ہوں۔“ بھوما نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”تمہاری مرضی بھوما، ویسے میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم مجھ سے بہت سی باتیں چھپا رہے ہو اور مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتے۔ بہرحال میرے محسن ہو۔ تم نے مجھے جیل سے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔ میں تمہیں کسی سلسلے میں مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر تم اپنے بارے میں بتانا نہیں چاہتے تو نہ بتاؤ، بلکہ سچ کہوں اگر تمہیں میری یہاں موجودگی ناگوار گزر رہی ہے۔ تو میں یہاں سے چلا جاؤں ہم دونوں ایک دوسرے کو دوست کی حیثیت سے یاد رکھیں گے۔“

”غلط فہمی کا شکار نہ ہو جہانگیر، ایک رات کی

مہلت اور دے دو کل صبح تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ کوئی بھی بات تم سے پوشیدہ نہیں رہے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ بس مجھے اجازت دو۔

وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ گیا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا میرا ذہن الجھنوں کا شکار ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک سوچتا رہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر مسہری پر آ گرا۔ لعنت ہے، اس پاگل خانے پر، بوڑھے بھوما کچھ بتائے یا نہ بتائے میں کل یہ کھنڈر چھوڑ دوں گا۔ بعد میں جس انداز کی بھی زندگی گزارنی پڑے اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد خاصی سکون کی نیند آئی تھی۔ ساری رات شاید کروٹ بھی نہیں بدلی۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو ذہن پر بڑا خوش گوار تاثر تھا۔ بدن ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ انگڑائی لینے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ بلکہ بدن پر جگہ جگہ ایسی بندشیں ہیں جو ظاہر محسوس نہیں ہوتیں لیکن ہلنے جلنے کی کوشش کی جائے تو اسے ناکام بنا دیتی ہیں۔

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ کس نے باندھ دیا تھا مجھے اور کیوں......؟ میں نے گردن گھمانے کی کوشش کی۔ لیکن اس میں بھی ناکام رہا۔ سر کے دونوں طرف بھی ایسی رکاوٹیں کر دی گئی تھیں کہ گردن نہ ہلائی جا سکے۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا اور صاف اندازہ ہو گیا کہ میں اس کمرے میں نہیں۔ جس میں پچھلی رات سویا تھا۔ لیکن میں یہاں کیسے آ گیا اور یہ کون سی جگہ ہے۔ مجھے یہاں لانے والا کون ہے۔ عجیب سی بات محسوس ہونے لگی تھی۔

اور پھر اس وقت بھوما کی کریہہ آواز کانوں میں گونجی۔

”کیا محسوس کر رہے ہو......؟“

میں چونک پڑا، لیکن گردن گھما کر بھوما کو نہیں دیکھ سکا اور اس وقت بھوما کا چہرہ میرے چہرے کے مقابل آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اس وقت اس کے چہرے میں تبدیلی تھی اور یہ تبدیلی بڑے بڑے شیشوں والی عینک سے ہوئی تھی۔ جو اس کی منحوس آنکھوں پر چڑھی ہوئی تھی۔

”کیا تمہیں اپنے بدن میں ایک خصوصی توانائی محسوس ہو رہی ہے؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”یہ...... یہ سب کیا ہے......؟“ میں نے غصیلے انداز میں پوچھا۔

”میری بات کا جواب دو۔“

”بکواس مت کرو...... مجھے بتاؤ...... تم نے مجھے کیوں باندھ دیا ہے......؟“ میں نے غراتے ہوئے پوچھا۔

”اوہ...... تم بضد تھے ناں کہ تمہیں سارے حالات سے آگاہ کر دیا جائے۔“ بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم نے مجھے باندھ کیوں دیا ہے اور...... اور مجھے میرے کمرے سے کیسے لایا گیا......؟“

”بے ہوش کر کے بہرحال تمہیں یہاں آنا ہی تھا۔“

”یہ کون سی جگہ ہے......؟“

”اس عمارت کا تہہ خانہ، لیکن میں نے اس میں ترمیم کرائی ہیں۔ یہ میری لیبارٹری ہے۔“

”لیبارٹری......؟“ میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں...... لیبارٹری......“ بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ ”بہت کم لوگ ڈاکٹر بھوما کو جانتے ہیں۔“

”ڈاکٹر بھوما......“ میں نے تعجب سے کہا۔

”ہاں ڈاکٹر بھوما...... آنکھوں کا ماہر، میں نے آنکھوں کی متعدد بیماریوں کے علاج دریافت کیے لیکن بہت سے لوگوں کو میرے طریق کار سے اختلاف تھا۔ میری لیبارٹری پر کئی بار چھاپے مارے گئے اور مجھے کبھی سکون سے کام نہیں کرنے دیا گیا۔“

’’مگر تم...... تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے......؟‘‘

’’یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ میرے بارے میں پوری تفصیل سنو! یہ تمہاری سب سے بڑی خواہش تھی...... ہاں...... تو میں بتا رہا تھا کہ میں نے آنکھوں کی متعدد بیماریوں کا علاج دریافت کیے اور انہیں عام کر دیا۔ یہ جو آنکھیں بدلنے کے آپریشن عام ہو گئے ہیں۔ یقین کرو، ان کا بنیادی تصور میں نے ہی دیا تھا۔ لیکن ہر تعمیر کے لیے پہلے قربانیاں دینا ہوتی ہیں۔ آنکھوں کے موثر علاج کے لیے مجھے انسانی آنکھوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے لیے میں نے مردہ انسانوں کی آنکھیں خریدنا شروع کر دیں۔

عام طور سے لاوارث مرنے والوں کی آنکھیں مل جایا کرتی تھیں۔ لیکن موت کے بعد بینائی پر جو جھلی چڑھ جاتی تھی وہ میرے اس منصوبے کے لیے ناکارہ تھی۔ جس پر میں نے سوچا تھا۔ اس پر عمل کرنے کے لیے زندہ انسانوں کی آنکھوں کی ضرورت تھی۔ میں نے بے اندازہ دولت خرچ کر کے بھی انسانی آنکھیں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ دوسری طرف میں اپنے تجربے کے لیے پاگل ہو رہا تھا اور اس جنون کے عالم میں، میں نے ایک زندہ انسان کی آنکھیں نکال لیں۔ لیکن عجیب قانون ہے۔ عجیب لوگ ہیں۔ میری کوششوں سے بے شمار ایسے انسانوں کی آنکھوں کی روشنی واپس آئی جو اندھے ہو چکے تھے مجھے کچھ نہیں ملا، لیکن میں نے انہی کے فائدے کے لیے صرف ایک انسان کی آنکھیں ضائع کر دیں تو دنیا میری دشمن ہو گئی اور میری زندگی دو بھر کر دی گئی۔

بالآخر مجھے اس دنیا کو خیر باد کہنا پڑا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کے بعد میں لوگوں کی فلاح کے لیے یہ کام بند کر دیتا۔ لیکن تم جانو شوق کا نشہ اتنا ہلکا نہیں ہوتا کہ آسانی سے زائل ہو جائے۔ میں اپنے تجربات کو اس حد تک وسعت دینا چاہتا تھا کہ میں کسی ایسے انسان کو بینائی دے سکوں جو پیدائشی طور پر اندھا ہو، اس کی آنکھوں کی شریانیں تک نہ ہوں۔ جس طرح پلاسٹک کے دو اعضاء بنا لیے گئے ہیں۔ جن میں ہاتھ، پاؤں یہاں تک، کہ نازک ترین اعضا یعنی دل، گردے، پھیپھڑے وغیرہ شامل ہیں اور وہ انسانی زندگی کے تار قائم رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں مصنوعی آنکھیں بنانا چاہتا تھا کہ ہم ان آنکھوں کے محتاج نہ رہیں۔ جو عطیہ کے طور پر دی جاتی ہیں۔

تم غور کرو، کیسی اچھی بات ہے۔ کہ دنیا میں کوئی انسان بینائی سے محروم نہ رہے۔ لیکن یہ دنیا والے کسی اچھے کام کی اس وقت تو تعریف کر دیتے ہیں۔ جب وہ ہو چکے لیکن اگر اس کی تکمیل کے مراحل میں ان کی مرضی کے خلاف کچھ ہو تو اسے قطعی نہیں برداشت کرتے۔ ہم لوگ بہت سے مسائل میں اس لیے مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہمیں تعاون نہیں ملتا۔

لیکن میرا نظریہ مختلف ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ٹھیک ہے۔ دنیا سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ جو کرنا ہے کر ڈالو۔ چنانچہ میں نے آبادیوں کی گہما گہمی سے دور ان کھنڈرات کا انتخاب کیا اور یہاں اپنی تجربہ گاہ قائم کی۔ مجھے زیادہ معاونین کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر کام شروع کر دیا۔ میرے ساتھ میری بچی ویرنا بھی تھی یہ ہی میری معاون ہے اور یہ ہی میری اسسٹنٹ بھی جو بھی سمجھو میں نے اپنا کام شروع کر دیا لیکن مسئلہ وہی تھا یعنی انسانی آنکھوں کی ضرورت۔

بالآخر میں نے ایسے دو انسانوں کا انتخاب کیا جو دنیا کی سرد مہری سے تنگ آئے ہوئے تھے، معاشی مسائل نے انہیں خودکشی کی منزل تک لا پھینکا تھا۔ وہ مرنا چاہتے تھے۔ تب میں نے ان سے سودا کیا۔ میں نے ان سے ان کی آنکھیں خرید لیں۔ بھاری رقم کے عوض اس دولت نے ان کے بچوں کے لیے اچھا مستقبل مہیا کر دیا اور میں نے ان کی زندگی بھی برباد نہ ہونے دی۔ میں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور اب وہ دونوں میرے معاون ہیں۔ تم سمجھ گئے ہو گے یعنی دھرم، اور کرم۔

اور اس کے بعد میں نے اپنی آنکھیں بھی تجربے کی نذر کر دیں۔ میں اپنے کام میں اس قدر مخلص نہیں ہو سکتا تھا مجھے بتاؤ، فلاح انسانیت کے لیے اس سے بڑی قربانی اور کیا دی جا سکتی تھی کہ میں نے اپنی کائنات تاریک کر لی۔ اب بھی لوگ میرے خلوص پر شک کریں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کسی چیز کی ضرورت پیش آئے تو میں کیا کروں۔ سوائے اس کے کہ جائز ذریعوں کی تلاش میں وقت ضائع نہ کروں اور یہ ہی ہوا تھا۔ میں نے شہر جا کر ایک انسان کو قتل کر دیا اور پھر اس کی آنکھیں نکال لی تھیں۔ لیکن اس جرم میں پکڑا گیا۔ دنیا کو تو میں نے اصلیت کی کوئی ہوا نہ لگنے دی۔ ہاں، مجھے سزائے موت ضرور سنا دی گئی۔ نکلنا تو تھا ہی، میں نے سوچا کہ کوئی ساتھی بھی مل جائے۔

سو میں نے تمہارا انتخاب کیا اور تمہیں یہاں لے آیا۔ اب دیکھو ناں میرے دو دو کام ہو گئے۔ ایک ساتھی بھی مل گیا اور اپنے تجربے کے لیے دو آنکھیں بھی۔‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘ میں اچھل پڑا۔

’’انسانیت کی فلاح کے لیے میرے دوست......!‘‘

’’کیا بکواس ہے۔‘‘ میرے بدن میں خوف کی لہریں دوڑ گئیں۔

’’تھوڑی سی فراخدلی سے کام لو...... غور کرو...... اگر تمہاری آنکھیں میرے تجربے کا آخری دور پورا کر سکیں تو اس سے سینکڑوں ایسے لوگوں کو روشنی مل جائے گی جنہوں نے کبھی یہ دنیا نہیں دیکھی۔ جنہوں نے کبھی باغوں میں کھلے پھولوں کے رنگ نہیں دیکھے جنہوں نے کبھی معصوم بچوں کی مسکراہٹیں نہیں دیکھیں۔ کائنات کی سب سے انمول شے بینائی جس سے وہ محروم ہیں، تمہاری آنکھیں ان کے درد کا درماں ہو جائیں تو اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے۔‘‘

’’نہیں...... نہیں...... میں تمہاری بات نہیں مان سکتا۔‘‘

’’کیوں...... آخر کیوں......؟‘‘ تم تو سزائے موت کے مجرم تھے۔ تم تو موت اپنا چکے تھے۔ پھر اگر میں تمہاری زندگی میں تھوڑا سا خلا پیدا کر رہا ہوں۔ تو تم اس قدر منحرف کیوں ہو رہے ہو خود کو اس تجربے کے لیے وقف کر دو۔ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کامیاب ہو گیا تو تعاون کرنے والوں میں تمہارے نام کو نظر انداز نہیں کروں گا۔ تم بھی محسن انسانیت کہلاؤ گے۔‘‘

’’لیکن آنکھوں کے بغیر زندگی کا تصور بے حد بھیانک ہے۔‘‘

’’تم ہمیشہ اندھے نہیں رہو گے۔ دوست! تمہاری بینائی واپس مل جائے گی، تم نے دیکھا کہ میں خود بھی اس کیفیت میں ہوں۔ ہمارا تجربہ ہماری آنکھوں کے ان دو گڑھوں کو دو خوبصورت اور روشن آنکھوں سے پر کر دے گا۔‘‘

بوڑھے کی آواز میری سماعت پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی متحیر بھی تھا۔ بھلا یہ اندھا بوڑھا یہ تجربات کیسے کر رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بھی داؤ پر لگا دی ہیں۔ کیسی انوکھی بات ہے۔‘‘

’’تم نے اب تک ایک دلیر انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ جہانگیر! میں چاہتا ہوں۔ تم اب بھی اسی انداز سے پیش آؤ اور خوشی خوشی اپنی آنکھوں کا عطیہ پیش کر دو۔ تم یہاں رہو گے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم تینوں کو سب سے پہلے آنکھیں واپس کروں گا۔‘‘

میں اس بات پر غور کرنے لگا۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب تھا۔ آنکھیں کھونے کا تصور بڑا ہی اذیت ناک تھا۔ بھلا آنکھوں کے بغیر بھی زندگی کو زندگی کہا جا سکتا ہے۔ بوڑھا پاگل کیا ضروری ہے کہ اپنے تجربات میں کامیاب رہے وہ دونوں بے چارے اندھے جو زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ افسوس ناک تھی۔ نہ جانے انہیں کب تک انتظار کرنا پڑے اور بوڑھا کامیاب ہو یا نہ ہو۔‘‘

’’تم نے کیا سوچا......؟‘‘ بوڑھے کی آواز ابھری۔

’’کیا تم مجھے سوچنے کا موقع دو گے......؟‘‘

''فیصلے لمحوں میں کیے جانے چاہئیں، ان کے لیے وقت درکار نہیں ہوتا۔''

''لیکن یہ فیصلہ.....'' میں نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

''جہانگیر.....! میں نے تمہیں جس انداز میں پایا تھا۔ اس کے بعد میں نے سوچا تھا کہ تم جیسا دلیر انسان زندگی کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا، کیوں نہ تم خود کو مردہ ہی تصور کرو.....''

''تب میں تمہیں رائے دیتا ہوں۔ میرے دوست کہ پہلے مجھے ختم کردو اور اس کے بعد میری آنکھیں نکال لو.....''

''نہیں تم اس قدر مایوس نہ ہو، ایک وعدہ تو کرتا ہوں کہ جب تم دنیا دیکھنا چاہو گے دیکھ سکو گے۔ وقتی طور پر سہی، مصنوعی طور پر سہی۔''

''میں نہیں سمجھا۔'' میں نے کہا۔

''سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرو، جہانگیر.....! میں اپنی سانسوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔ موت کا تو کوئی وقت معین نہیں ہوتا۔ جب بھی آجائے پھر ہم انتظار میں وقت ضائع کیوں کریں۔ جو کام کرنا ہے۔ جلد از جلد کرلیا جائے۔''

''بکواس مت کرو، مجھے کھول دو۔''

''ہرگز نہیں دوست، ہرگز نہیں، تم اس خوب صورت موقع کو ضائع کرنے کا مشورہ دے رہے ہو، میری زندگی میں یہ آپریشن بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بہتر تھا، کہ تم رضا کارانہ طور پر خود کو اس کے لیے پیش کر دیتے۔ لیکن تم اتنے فراخ دل نہیں ہو۔ جتنا میں سمجھا تھا۔ مجھے اجازت دو، کہ میں اپنا کام کروں۔'' اس کا چہرہ میرے سامنے سے ہٹ گیا۔

میں بری طرح بدحواس ہوگیا تھا۔ یہ سب کچھ میرے توقع کے بالکل خلاف تھا۔ ظاہر ہے، میں بزدل انسان نہیں تھا۔ میں نے تو موت کو گلے لگالیا تھا۔ لیکن اس وقت جب زندگی سے محبت ہوئی۔ تو یہ تکلیف دہ دور شروع ہوگیا آنکھوں کے بغیر کچھ نہیں۔ اندھا رہ کر زندہ رہنے سے کیا فائدہ اور اب جب کہ یہ بوڑھا خبیث اپنی مقصد براری کے لیے مجھے زندگی کے بدترین لمحات سے آشنا کرنے والا تھا۔ تو میں ہر قیمت پر اس سے بچاؤ چاہتا تھا۔ میں نے اپنے بدن کے گرد کی بندشوں کو توڑنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی لیکن خبیث اور طاقتور بوڑھے نے جس طرح مجھے باندھا تھا۔ اس سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ نہ جانے میرے بدن کے کون کون سے حصوں پر زخم آئے لیکن میں اس وقت تک جدوجہد کرتا رہا۔ جب تک سکت رہی یا پھر میرا ذہن جواب دینے لگا۔ بوڑھا نہ جانے کون سے کاموں میں مصروف تھا۔

☆.....☆.....☆

پھر نیم غنودگی کی کیفیت میں ہی میں نے اپنے بازو میں انجکشن کی ہلکی سی چبھن محسوس کی۔ ''سی'' میرے منہ سے نکلی اور اس کے بعد کیفیت عجیب سی تھی۔ پتہ نہیں، میں جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ لیکن ذہن ان کے بارے میں سوچنے سے قاصر تھا۔ ہاں البتہ جب مکمل طور سے ہوش آیا تو رات ہوچکی تھی۔

رات..... یہ کیسی رات تھی۔ میں نے سوچا، پھر مجھے بوڑھا خبیث یاد آگیا۔ اور..... اور میں نے اپنے ہاتھوں میں اینٹھن محسوس کی۔ ایک بار پھر میں نے بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ لیکن بندشیں تو اب میرے گرد نہیں تھی۔ سر بھی ہلا سکتا تھا۔ ہاتھ پاؤں بھی ہلا سکتا تھا۔ شاید رات کا آخری پہر ہے۔ ورنہ اس قدر گھور تاریکی ہیں، میں نے پلکیں جھپکانے کی کوشش اور اچانک میری گھگی بندھ گئی۔

''اوہ!..... یہ کیا.....؟ میری پلکیں آنکھوں کے درمیان کے ان ڈیلوں کو محسوس نہیں کر رہی تھیں۔ جن میں بینائی ہوتی ہے۔ دہشت زدہ ہوکر میں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ٹٹولیں اور آنکھوں کے گڑھوں میں خون کی چپچپاہٹ میری انگلیوں سے ٹکرائی اور پھر میرے حلق سے جو آواز نکلی وہ بڑی وحشت ناک تھی۔

شہروحشت

قسط نمبر:05

ایم اے راحت

رات کا گھٹا ٹوپ اندھرا، پرھول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دھشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراؤ، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بز اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ھوجائے گی، برسوں ذھن سے محو نہ ھونے والی اپنی مثال آپ کھانی۔

دل ودماغ کومبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

نہیں......نہیں......یہ کیا......یہ کیا کیا تو نے کتے......سر جیت بھوما......بھوما......کتے میں تجھے جان سے ماردوں گا۔ آہ......میری آنکھیں...... آہ......میری آنکھیں۔"

میرے دماغ میں شعلے بھڑک چلے تھے۔ میں طوفان کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا جو چیز میرے سامنے آئی، میں اسے نیست ونابود کرنے پر تل گیا۔ شیشے ٹوٹنے کی آوازیں، میز کرسیوں کا شور اور پھر میں سامنے کی دیوار سے ٹکرایا تو اسے ٹٹول، ٹٹول کر دروازے تک پہنچ گیا۔ میرے بدن کی ٹکروں نے دروازہ توڑ دیا۔

"بھوما، بھوما تو کہاں ہے؟ میرے سامنے آ کتے۔ تو نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میری آنکھیں مجھے واپس دے دے۔ میں کہتا ہوں۔ میری آنکھیں مجھے واپس دے دے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں تجھے ایسی موت ماروں گا کہ تو سوچ نہ سکے گا۔"

میں نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ نیچے گر پڑا۔

میرا سر زور سے کسی پتھر سے ٹکرایا تھا۔ اور ذہن پھر تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ نہ جانے کب تک......لیکن زندگی تھی تو ہوش بھی آ گیا۔ اور ذہن جاگا تو کسی کی گفتگو کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اس طرف کان لگا دیئے۔

اوہ!......یہ اسی ذلیل بوڑھے کی آواز تھی۔ کسی سے کہہ رہا تھا۔

"اسے پائپ سے خوراک دو۔ ہوش میں لانا ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی وہ برداشت نہیں کر سکے گا۔"

"جو حکم سر۔ کیا اس کی آنکھوں پر دوا لگا دی جائے؟"

"ارے......اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس کی شریانیں بند کر دی ہیں۔ آنکھوں کے گڑھے بالکل بے جان ہیں۔ اسے تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ لیکن اسے ہوش میں نہیں آنا چاہئے۔"

"بہت بہتر جناب۔" دوسرے شخص کی آواز آئی۔

اور پھر مجھے کوئی نزدیک آتا ہوا محسوس ہوا۔ میرے دانت بھینچ گئے تھے۔ میں نے اس کے قدموں کی چاپ کو محسوس کیا۔ اور جونہی آنے والا میرے قریب آیا۔ میری دونوں ٹانگیں پوری قوت سے اس کے منہ پر پڑیں اور وہ بے ساختہ چیخ کے ساتھ شاید دوسری طرف الٹ گیا۔

میں پھرتی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ در حقیقت آنکھوں کے خالی حلقوں میں کوئی تکلیف محسوس نہیں

ہو رہی تھی۔ بوڑھے کتے نے میری آنکھیں نکال کر کوئی ایسی دوا ان حلقوں پر لگا دی تھی۔ جس سے تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بدن میں توانائی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

تب ہی میں نے بوڑھے بھوما کی آواز سنی۔

"اوہ!.....دھرم کیا ہوا۔ کیا تم ٹھیک ہو؟"

"نہیں جناب! شاید وہ ہوش میں آ گیا ہے۔"

"اوہ!....." بھوما نے مخصوص انداز میں منہ اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور پھر اس نے مجھے آواز دی۔

"جہانگیر خان! کیا تم نے دھرم کو کوئی نقصان پہنچایا ہے؟"

"میرے نزدیک آ کتے..... کیا تو اس لئے مجھے جیل سے نکال کر لایا تھا۔ دیکھ میری آنکھیں مجھے واپس کر دے۔ ورنہ میں تجھے کتے کی موت مار دوں گا۔" میں نے دونوں ہاتھ فضا میں نچاتے ہوئے کہا۔ تب اچانک میرے ہاتھ کسی کے جسم سے ٹکرائے اور میں نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

یہ بوڑھا بھوما ہی تھا۔ "کتے..... کتے۔" میں نے اس کی گردن ٹٹولی۔ اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ تب بوڑھے بھوما کے چوڑے ہاتھ میری کلائیوں پر آ جمے اور اس نے نہایت اطمینان سے اپنی گردن میری گرفت سے چھڑا لی۔

"جہانگیر آخری بار کہہ رہا ہوں۔ ہوش میں آ جاؤ۔ جو ہونا تھا۔ وہ ہو چکا ہے۔ ایک خوب صورت مستقبل کے لئے تم تھوڑے دن کے لئے تاریکی برداشت کر لو۔"

"میں..... میں تجھے مار ڈالوں گا۔" میں نے دانت بھینچ کر اس کا لباس کھینچا۔

"اچھا تو مار ڈالو۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ اور میں اپنی جدوجہد کرنے لگا۔ لیکن جیل کی سلاخوں کو موم کی طرح توڑ دینے والا، زمین میں ایک فٹ گہرے گڑے ہوئے آہنی جنگلے کو اکھاڑ پھینکنے والا۔ میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے دونوں بازو پکڑے اور دوسرا ہاتھ میری کمر میں ڈال کر اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا۔ اور پھر نہایت اطمینان سے بستر پر لا پٹخا۔

"اگر تم شرافت سے باز نہ آئے۔ تو اب تمہارے ساتھ برا سلوک کیا جائے گا۔ تمہاری آنکھوں کے گڑھوں میں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ میں جانتا ہوں۔ اور اب بہتر یہی ہے کہ تم مجھ سے تعاون کرو۔ اور اگر تم نے تعاون نہ کیا۔ تو پھر یہی ہو گا کہ میں تمہیں کسی بھری پری بستی میں چھوڑ آؤں گا۔ اور پھر تم ایک اندھے کی حیثیت سے بھیک مانگنے کے سوا کچھ نہ کر سکو گے۔"

بوڑھے نے جس طرح میری جدوجہد کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس سے یہ احساس تو یقین پا گیا تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چنانچہ میرا دل چاہا کہ بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا میں۔ لیکن بہر حال شان مردانگی کے خلاف تھا چنانچہ دل گھٹ کر رہ گیا۔ چند ساعت خاموشی رہی۔ پھر بھوما کی آواز سنائی دی۔

"اگر تم نے فیصلہ اثبات میں کیا ہے۔ تو مجھے بتا دو۔ اگر تم اب بھی کوئی جدوجہد کرنا چاہتے ہو تو ظاہر ہے۔ تمہاری جدوجہد تمہیں آنکھیں واپس نہیں دے سکے گی۔ سوائے اس کے کہ میں تمہیں عدم تعاون کرنے والوں میں شامل کروں گا۔"

پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ سب باہر چلے گئے تھے، اور میں حقیقت میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

زندگی چلی جاتی تو کوئی غم نہ تھا۔ لیکن..... آنکھیں.....!! آنکھوں کے بغیر زندگی بیکار تھی۔ اور اب کوئی جدوجہد بھی بے مصرف ہی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر کیا زندگی کو، کرم اور دھرم کی طرح گزارہ جائے۔ آہ..... کتنی بڑی غلطی ہو گئی۔ اے کاش! اس سے تو موت ہی آ جاتی۔

میں شاید زندگی میں پہلی بار رو دیا تھا۔ آنسو نجانے کہاں سے نکلے تھے۔ یہ نمکین پانی بڑا ہی وزنی ہوتا

ہے۔ ذہن پر اس طرح چھا جاتا ہے۔ جیسے منوں بوجھ۔ بہہ جاتا ہے۔ تو طبیعت کیسی سبک ہو جاتی ہے۔ رونے سے میں بھی خود کو ہلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ اور پھر میں سنجیدگی سے آئندہ زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔

زندگی کی جو امنگ سینے میں جاگی تھی۔ وہ تو اب ختم ہو گئی تھی۔ اب اس بے کار بوجھ کو لئے لئے جگہ جگہ گھسٹتے پھرنا کیا معنی رکھتا تھا۔ بہتر یہ تھا کہ اسی ویران کھنڈر میں دوسروں کی مانند زندگی گزاری جائے۔ بڑی مایوسی بڑی بددلی چھا گئی تھی۔ میرے ذہن پر اور پھر میں اپنے اس فیصلے پر اٹل ہو گیا۔

چنانچہ جب مجھے خوراک دی گئی تو میں نے خاموشی سے قبول کر لی۔ ٹٹول ٹٹول کر کھانا کھایا۔ پانی پیا اور پھر لیٹ گیا۔ اور جب میں نے کئی دن تک کوئی حرکت نہ کی تو جیسے بوڑھے بھوما کو مجھ پر اعتبار آ گیا۔ پانچویں یا چھٹے دن اس نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

"جہانگیر! کھنڈرات کے حصوں میں چہل قدمی کیا کرو۔ آواز کے سہارے چلنے کی کوشش کیا کرو۔ میرا خیال ہے۔ تم بہت جلد اس کے عادی ہو جاؤ گے۔ جتنا وقت تاریکی میں گزرنا ہے۔ ایک جگہ پڑے گزارنے سے کیا فائدہ۔ چلنے پھرنے سے بدن میں قوت بھی رہے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ مسٹر بھوما۔ آپ مجھے میرا کام بتا دیں، میں کیا کام کروں گا؟"

"کیا مطلب؟"

"کیا آپ کرم اور دھرم کی طرح کوئی کام میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں مسٹر بھوما؟"

"احمقانہ انداز میں مت سوچو۔ تمہاری حیثیت ان سے مختلف ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے انہیں ان کی زندگی کی پوری پوری قیمت ادا کر دی تھی۔ جبکہ تم میرے دوستوں میں شامل ہو۔ ٹھیک ہے تم نے میرے ساتھ اس انداز میں تعاون نہیں کیا۔ جیسے میں چاہتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں تم سے انسیت رکھتا ہوں۔ یہاں سکون سے رہو۔ میرے دوست۔ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

اور میں صرف ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے خلاف میرے دل میں جو نفرت تھی۔ اسے کوئی نہیں نکال سکتا تھا۔ لیکن میں خاموشی کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ خود کو ذلیل و خوار کرنے سے کیا فائدہ۔ کئی دن مزید گزر گئے۔ اب یہاں رہنا میں نے اپنی عادت بنا لی تھی۔ چہل قدمی بھی کر لیتا تھا۔ لیکن اس ویرانے سے باہر جانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ آنکھیں کھونے سے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے۔ کہ ایک شام میں عمارت کے ایک حصے میں ابھرے ہوئے پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ خاموش اور سوچ میں گم۔ میری زندگی میں جو ویرانے در آئے تھے۔ ان سے نجات تو اس زندگی میں ممکن نہیں تھی۔ موت چونکہ میرا مقدر بن گئی تھی۔ اور میں تقدیر کے خلاف زندگی کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ اس لئے مجھے اس دوڑ کی سزا مل رہی تھی۔ دفعتاً مجھے اپنی پشت پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور میں چونک پڑا۔ میں نے لاپروائی سے سوچا اور پھر مجھے اپنے قریب وہی نسوانی آواز سنائی دی جو میں پہلے سن چکا تھا۔

"ارے تم یہیں موجود ہو۔" اس نے کہا۔ اور پھر شاید وہ میرے سامنے آ گئی۔ دوسرے لمحے اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

"اوہ!..... نہیں۔" وہ شاید رو پڑی تھی۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ آہ یہ کیا ہو گیا؟" اس نے میرے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر میرا رخ اپنی جانب کیا اور پھر بے اختیار مجھے سینے میں بھینچ لیا۔ بڑی بے اختیارانہ کیفیت تھی۔ اس کے انداز میں، میں نے بھی تعرض نہیں کیا۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے کے درمیان وہ کہتی جا رہی تھی۔

"کہا تھا ناں میں نے تم سے بھاگ جاؤ۔ لیکن نہ سنی تم نے، پاگل سمجھا تھا ناں۔ دوسروں کی مانند۔ کیوں نہ گئے۔ بتاؤ۔ کیوں نہیں چلے گئے بتاؤ؟" وہ روتی رہی۔

درحقیقت اب میرے ذہن میں اس کی باتیں

آ رہی تھیں۔ بلاشبہ اس نے مجھے چلے جانے کیلئے کہا تھا لیکن بھوما نے اسے پاگل قرار دیا تھا۔ اور اس وقت میں نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ اس نے شاید میرا چہرہ اپنے چہرے کے مقابل کیا۔ مجھے دیکھتی رہی اور پھر غمزدہ لہجے میں بولی۔

"آہ! کس قدر بدنما کردیا تمہارا چہرہ۔ کیسی حسین آنکھیں تھیں۔ لیکن اب کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔ بتاؤ اب میں تمہارے لئے کیا کروں؟"

"شکریہ ویرنا! تمہاری ہمدردی نے مجھے کافی سکون بخشا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"لیکن میرا سکون ختم ہوگیا ہے۔ پپا جو کچھ کرتے رہے۔ وہ مجھے سخت ناپسند تھا۔ لیکن انہوں نے یہ جو کچھ کیا ہے اس پر...... اس پر میں انہیں معاف نہیں کرسکتی۔" اس نے مسلسل روتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس بارے میں سب کچھ معلوم ہے ویرنا؟"

"کس بارے میں؟"

"جو کچھ تمہارے پپا کرتے رہے ہیں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔"

"کیا تم نے کبھی ان سے اس پر اختلاف کیا؟"

"ہاں...... میں سخت احتجاج کرتی رہی ہوں۔"

"ظاہر ہے۔ بھوما نے تمہاری بات قبول نہیں کی ہوگی؟"

"ہاں۔ پپا بہت سنگدل ہیں۔ لیکن انہوں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا ہے۔ اس پر میں انہیں معاف نہیں کروں گی۔"

اور وہ پھر رونے لگی۔ اور میرے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس لڑکی کو آلہ کار بنایا جائے اور اس سے بھوما کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔ میں بھوما سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کم بخت نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔ وہ بے حد بھیانک تھا۔ میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن اب اگر یہ لڑکی مجھ سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ تو شاید میں اس خبیث بوڑھے کے خلاف کچھ کرسکوں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ متاثر ہے ورنہ کسی کے لئے آنکھوں میں آنسو کہاں آتے ہیں۔

"ویرنا تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے ناں؟"

"ہاں میں تم سے متاثر ہوں۔ ان سارے دنوں میں مسلسل کوشش کرتی رہی ہوں کہ کسی طرح اگر مجھے قید سے رہائی مل جائے تو میں تم سے ملاقات کروں لیکن مشکل ہوگیا تھا۔ آج بڑی مشکل سے دھرم کو دھوکا دے کر بھاگی ہوں۔ اسے پتہ بھی نہیں چل سکا۔ کھانا دینے کے بعد اس نے میرے قید خانے کا دروازہ حسب معمول بند کردیا۔ یہ معلوم کیے بغیر کے میں چپ چاپ دروازے سے باہر نکل آئی ہوں۔ اس کے بعد میں تمہیں تلاش کرتی رہی۔ اور بڑی دیر تک تلاش کرتی رہی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہوچکا ہے۔"

اس نے پھر ایک سسکی لی۔ اور میں نے حیران ہوکر پوچھا۔ "تو کیا تمہیں قید رکھا جاتا ہے؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے پپا کے کام سے اختلاف ہے میں نے ان سے کھل کر کہہ دیا تھا کہ میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ اس پر انہوں نے مجھے پاگل قرار دے کر قید کردیا۔"

"اوہ!...... بھوما، بے حد سنگدل ہے۔" میں نے کہا۔

"تم پپا کے چنگل میں کیسے پھنس گئے تھے؟" اس نے پوچھا۔ اور میں نے اُسے مختصراً اپنی کہانی سنادی۔

"اوہ!...... تو پپا اتنے دن تک جو غائب رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ اپنے کام میں مخلص ہیں۔ لیکن ان کی یہ جذباتیت، شدت پسندی کی حدود میں داخل ہوگئی ہے تم غور کرو۔ کہ اگر وہ اپنے تجربے میں کامیاب ہو

جاتے ہیں۔ تو دنیا کو کیا مل جائے گا۔ کیا ساری دنیا سے اندھوں کا وجود ختم نہیں ہوجائے گا۔ وہ لوگ جو کائنات میں رہ کر حسین کائنات کی دید سے محروم ہیں کیا وہ خود کو ایک نئی دنیا میں محسوس نہیں کریں گے۔ اس کے بعد ان کے دلوں میں پپا کی کیا حیثیت ہوگی۔ کیا احترام ہوگا۔ اس کا اندازہ تم خود کرسکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے اعتراف ہے۔ لیکن بات ان کی آنکھوں کی تھی۔"

"جب انہیں کوئی نہ ملا تو انہوں نے فوراً اپنی آنکھیں اپنے تجربے کی نذر کردیں۔"

"...... لیکن اس کے بعد بھوما کو کتنی مشکلات درپیش آئی ہوں گی۔"

"کسی کو نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے لئے ایک خاص انتظام کیا ہے۔"

ویرنا نے کہا۔ اور اسی وقت عقب سے بھوما کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"آج پھر تیرا دماغ پھر گیا ہے۔ ویرنا۔ تو کیوں یہ چاہتی ہے کہ میں تجھ پر تشدد کروں؟"

"نہیں پپا آج میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" بھوما کا انداز بھی بدل گیا۔ "کیا باتیں کرنا چاہتی ہے؟"

"میری سوچ میں معمولی سا فرق آ گیا ہے پپا۔"

"اچھا تو...... پھر اندر چلو۔" بھوما نرم لہجے میں بولا۔

"یہاں کیا حرج ہے۔! مسٹر جہانگیر کو یہی سمجھا رہی تھی۔" ویرنا نے کہا۔ اور میں ایک لمحے کیلئے چونک پڑا۔ حالانکہ لڑکی نے مجھ سے گفتگو نہیں کی تھی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ وہ بھوما کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کررہی ہے۔ چنانچہ میں بھی تعاون پر آمادہ ہوگیا۔

"کیا بتا رہی تھیں؟"

"یہی کہ میں نے اب تک پپا سے اختلاف کیا تھا۔ لیکن اگر گہری نگاہوں سے جائزہ لیا جائے تو پپا کا مقصد عظیم ہے۔ اندھے انسان کو آنکھیں مل جانا کتنی بڑی بات ہوگی میں نے جو پپا سے اختلاف کیا تھا۔ وہ صرف اس لئے کیا تھا۔ کہ مجھے زندہ انسانوں سے ہمدردی تھی۔ لیکن بہرصورت یہ بات اب میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ کہ وسیع تر مفاد کے لئے کچھ قربانیاں دینا ہی ہوتی ہیں۔ اگر اس تجربے کی کامیابی کیلئے کچھ انسانوں کو تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ تو وہ بہرحال تعمیری حیثیت رکھتی ہے۔"

"یقیناً...... یقیناً" بھوما نے خوش ہوکر کہا۔

"پپا میں پیش کش کرتی ہوں کہ اب تمہارے تجربے کے لئے میری آنکھیں بھی کام آجائیں تو میں تیار ہوں۔"

"اوہ!...... ہاں......!!" میں نے بھوما کی آواز میں نمایاں لرزش محسوس کی، ظاہر ہے یہ اولاد کا معاملہ تھا۔ وہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ظاہر ہے وہ اپنی آنکھیں دے سکتا تھا۔ لیکن اپنے جگر گوشے کے ساتھ یہ سلوک کس طرح ممکن تھا۔

"آؤ...... آؤ...... میرے ساتھ آؤ۔" اس نے ویرنا سے کہا اور پھر معذرت آمیز انداز میں بولا۔

"مسٹر جہانگیر! مجھے امید ہے کہ تم محسوس نہیں کروگے۔"

پھر میں نے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ صورتحال کسی حد تک میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ لڑکی نے یقیناً چال چلی تھی۔ ظاہر ہے وہ بھوما سے متفق نہیں تھی۔ لیکن اس نے جو فوری طور پر پلٹا کھایا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا۔ کہ وہ بوڑھے بھوما سے فریب کرنا چاہتی ہے۔

بہرحال میں تھوڑی دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ اور پھر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ مجھے اتنا اندازہ ہوچکا تھا۔ کہ میں عمارت کے کسی حصے سے اپنی رہائش گاہ پر واپس آجاؤں میں اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گیا۔

دن اور رات کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اب تو سب دن تاریک تھے۔ اور سب راتیں سیاہ۔ نجانے کتنا

وقت گزرا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوا۔ چائے آئی اور چائے پینے کے بعد میں چہل قدمی کیلئے نکل آیا۔ ایک محدود دنیا تھی۔ اور اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور اس محدود دائرے میں وقت گزارنے کے بعد میں پھر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

اور اس وقت شاید رات ہو چکی تھی۔ جب مجھے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔

''دھرم۔'' میں نے پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا ''کرم۔'' لیکن آنے والا کرم بھی نہیں تھا۔ پھر دروازہ شاید اندر سے بند کر دیا گیا۔ میں حیران رہ گیا تھا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟! تب مجھے اپنے شانے پر ایک ہاتھ محسوس ہوا۔ اور یہ ہاتھ ویرنا کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔ تب مجھے ویرنا کی آواز سنائی دی۔

''جہانگیر۔''

''اوہ..... ویرنا؟''

''ہاں..... میں ہی ہوں۔''

''اس وقت..... شاید رات ہو چکی ہے؟''

''ہاں۔''

''کیا بھوما سو چکا ہے؟''

''نہیں اس وقت وہ اپنی تجربہ گاہ میں ہے۔''

''اوہ!..... تو کیا تم قید سے فرار ہو کر آئی ہو؟''

''نہیں۔ مجھے قید نہیں کیا گیا، صبح کی چال کارگر رہی۔''

''اوہ!..... تو میرا اندازہ درست تھا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا اندازہ؟''

''صبح کو جب تم نے بھوما سے گفتگو کی تھی۔ تو میں نے یہ ہی اندازہ لگایا تھا کہ تم بھوما کو شیشے میں اتار رہی ہو۔''

''ہاں جہانگیر۔ پپا اس سلسلے میں بہت ہی شدت سے سوچنے کے قائل ہیں۔ لیکن میں تم سے یہ کہنے میں عار محسوس نہیں کرتی۔ کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں میں چاہتی ہوں کہ پپا اب مکمل طور پر ناکام ہو جائیں۔ تاکہ انسانی زندگیاں یوں خاک میں نہ ملیں۔'' ویرنا نے کہا۔ ''اوہ۔ کیا تمہارے خیال میں بھوما اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔''

''یہ کوشش ایک دیوانگی ہے۔''

''کیا تم یقین کرو گی ویرنا کہ میں بہر حال دل سے بھوما کے جذبے کی عظمت کا قائل ہوں۔''

''ہاں۔ جہانگیر۔ پپا برے انسان نہیں ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔''

''لیکن وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ وہ انداز شدت پسندی میں بدل گیا ہے کون جانے کب وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوں۔ اور اس وقت تک کتنی زندگیاں برباد ہوں جائیں۔ اگر وہ کامیاب نہ ہو سکے تو پھر یہ لوگ ہمیشہ اندھے رہیں گے۔ میں اب کسی اور کو اندھا دیکھنا نہیں چاہتی جہانگیر۔ اب میں کسی اور کو پپا کی دیوانگی کی بھینٹ چڑھنے نہیں دوں گی۔''

''لیکن بھوما کرتا کیا ہے۔؟ کیا تم اس بارے میں کچھ جانتی ہو۔؟''

''ہاں.....''

''مجھے بتاؤ۔''

''وہ انسانی آنکھوں کا لعاب الگ الگ کر لیتے ہیں۔ اور پھر ان میں سے پھر اس لعاب کا انہوں نے ایک مخصوص محلول تیار کر لیا ہے۔ یہاں ایک اور انسان ہے۔ جسے تم نے نہیں دیکھا ہوگا۔''

''وہ کون ہے؟''

''اس بدنصیب کا نام۔ مائیکل ہے۔ پپا کا پرانا ساتھی۔ پپا نے سب سے پہلے اس کی آنکھیں نکالی تھیں۔ اور اب وہ اس کی آنکھوں پر تجربہ کر رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''کاش تم دیکھ سکتے۔''

''ہاں..... اب تو میں نہیں دیکھ سکتا۔'' میں نے اداسی سے کہا۔

''نہیں جہانگیر! تم دیکھ سکو گے۔'' ویرنا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اور میں اس کے لہجے پر غور کرنے لگا۔ اس کے لہجے میں محبت تھی، امید تھی۔ خلوص تھا۔ ''نجانے کب..... یا شاید کبھی نہیں۔''

''نہیں جہانگیر! میں تمہاری مدد کروں گی۔''

''لیکن کس طرح؟''

''ابھی نہیں بتاؤں گی۔''

''تمہارے الفاظ نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ ویرنا۔ بہر حال کوئی بات نہیں میں انتظار کروں گا۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ خدا کرے میں تمہیں پھر سے دیکھ سکوں اس وقت جب میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ تو تمہاری کیفیت دوسری تھی۔ میرے ذہن میں تمہارے لئے وہ جگہ نہیں تھی۔ جو اب تم نے قائم کر لی ہے۔''

''جہانگیر۔'' ویرنا نے میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ اور پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے پہلی بار کسی دوشیزہ کے ہونٹوں کی حلاوت چکھی تھی۔ اور میرے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ویرنا جلدی سے میرے پاس سے ہٹ گئی تھی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ اور میں خیالات میں گم ہو گیا۔ ویرنا کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ جسے میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ بہر صورت یہ لڑکی مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔

اور پھر وہ رات میں نے عجیب و غریب خیالات میں گزاری۔ نجانے کیا کیا سوچتا رہا۔ دوسرا دن بھی حسب معمول تھا۔ ویرنا دن بھر میرے پاس نہیں آئی۔ اور میں حسب معمول کھنڈرات میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔ لیکن شام جس کے بارے میں، میں صرف اندازہ کر سکتا تھا۔ خیر ویرنا میرے پاس پہنچ گئی۔

''جہانگیر!'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''اوہ..... ویرنا تم آ گئیں۔''

''ہاں..... کیا تم میرا انتظار کر رہے تھے؟''

''دن بھر انتظار کرتا رہا ہوں۔'' میں نے اداس آواز میں کہا اور وہ میرے سینے سے آ لگی۔

بڑی شدت پسند لڑکی تھی۔ جذبات کے اظہار میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتی تھی اس وقت وہ جس شدت سے لپٹی تھی۔ اس میں بڑی اپنائیت بڑی چاہت تھی۔ میں نے کچھ نہ کیا..... اور اس نے میرے سینکڑوں بوسے لے ڈالے۔

''جہانگیر میں تمہیں جس حیثیت سے چاہنے لگی ہوں، اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔''

''میں بھی ویرنا۔'' میں نے جواب دیا۔

''دیکھو..... میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔''

''کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ اور ویرنا نے کوئی چیز میرے ہاتھ میں تھما دی۔

''ٹٹول کر ہی چیزوں کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ میں نے ٹٹول کر اس کا جائزہ لیا بڑے بڑے شیشوں والی کوئی عینک تھی۔''

''چشمہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں..... اسے لگاؤ۔''

''اسے لگاؤ۔''

''کیوں؟''

''بس میں کہہ رہی ہوں۔ اسے لگاؤ۔'' ویرنا نے کہا۔

اور میں نے صرف اس کی خاطر عینک اپنی آنکھوں کے گڑھوں پر چڑھا لی۔ بھلا فائدہ بھی کیا تھا۔ سوائے ایک نقص چھپانے کے۔ وہ اور کیا کام دے سکتی تھی۔

''جہانگیر!'' ویرنا نے مجھے چومتے ہوئے کہا۔ ''کچھ محسوس ہوا؟''

''کیا؟''

''اوہ..... تم میرے بارے میں تصور کرو۔ سوچو میرے بارے میں..... پلیز۔ جہانگیر! جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔''

اور میں نے ویرنا کے کہنے پر عمل کیا۔ نجانے کیوں مجھے ایک ہلکی سی روشنی کا احساس ہوا۔ اور پھر یہ روشنی بڑھتی چلی گئی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے اس روشنی کا تعلق دماغ سے ہو۔ میں ویرنا کے بارے میں سوچ رہا تھا اور پھر میرا دل دھک سے ہو گیا۔ ویرنا میری نگاہوں کے سامنے تھی۔

’’یہ کیسے ممکن تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟‘‘

’’ویرنا......‘‘ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیئے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ’’ویرنا مجھے یقین نہیں آ رہا۔ خدا کے واسطے مجھے بتاؤ۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیوں ہے؟‘‘

’’جہانگیر یہ ایک مخصوص عینک ہے۔ میرے پپا کی ایجاد۔ وہ اسے تصور کی عینک کہتے ہیں۔ جب انہوں نے اپنی آنکھیں نکالنے کا فیصلہ کیا۔ تو اس بات کا بھی بندوبست کیا۔ کہ ان کے کام میں رکاوٹ نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایسی عینک ایجاد کی جو آنکھوں کا نعم البدل ہو۔ وہ اسے آنکھوں پر لگا کر ہی تمام کام کرتے ہیں۔ بات صرف میری ذات تک محدود نہیں ہے۔ تم اسے لگا کر کہیں کا بھی تصور کر لو۔ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہوگا۔‘‘

’’واقعی۔‘‘ میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

’’ہاں۔‘‘ ویرنا نے جواب دیا۔ اور میں نے بھوما کی لیبارٹری کے بارے میں سوچا اور وہ ہال میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ جس کی میں نے صرف چھت دیکھی تھی۔ اور جہاں میری آنکھیں نکالی گئی تھیں۔ چاروں طرف مشینیں نصب تھیں۔ ان میں عجیب عجیب سیال کھول رہے تھے۔ کرم، اور دھرم لیبارٹری کے کام میں مصروف تھے۔ البتہ بھوما ایک کرسی پر خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے کرم کو آواز دی۔ اور کرم کسی آنکھوں والے ہی کی مانند اس کے پاس پہنچ گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے ان سب کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ عجیب پراسرار عینک تھی۔ بھوما نے کرم سے کوئی چیز طلب کی اور کرم نے ایک چھوٹے سے بلوریں پیالے میں ایک مٹیالا سیال اس کے سامنے رکھا۔ تب بھوما نے ایک ڈراپر سے سیال کھینچا اور اس کے چند قطرے اپنی آنکھوں میں ٹپکا لئے۔ اس کے بعد وہ دونوں آنکھیں بند کرکے بیٹھ گیا۔

میں دیوانوں کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

یہ......یہ صرف تصور کا کمال تھا۔ حیرت انگیز بات تھی۔ اور میں اس دلچسپ عینک میں کھو گیا۔

’’کیسی حیرت انگیز چیز تھی۔ کیسی عجیب و غریب میں نے پھر ویرنا کو دیکھا۔ اس کے سرخ لباس کے بٹن میری آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ پھر سرخ لباس کے نیچے چمکدار سفید جلد پھر کچھ اور نیچے سرخ سرخ گوشت پسلیوں کے درمیان دھڑکتا ہوا دل صاف نظر آ رہا تھا۔ نگاہیں کچھ اور پیچھے پلٹ گئیں۔ اور اس کی پشت کے پیچھے کی دیوار صاف نظر آئی میرا دماغ چکرانے لگا۔ میں نے گھبرا کر عینک اتار دی۔

’’ویرنا یہ عینک...... یہ عینک۔‘‘

’’یہ اب تمہاری ہے۔‘‘ ویرنا نے کہا۔

’’میری......‘‘ میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

’’ہاں...... میں تمہاری آنکھیں تو واپس نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ عینک اب تمہاری آنکھوں کا بدل ہے۔‘‘

’’لیکن بھوما۔‘‘

’’پپا نے جو کچھ کیا۔ وہ اس کے لئے خود بھگتیں گے۔‘‘

’’اور میں دیر تک خالی خالی انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ بالکل نہیں محسوس ہوا تھا۔ کہ میری آنکھوں کے سیاہ حلقے بالکل خالی ہیں۔ ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ پھر میں نے کہا۔

’’لیکن تمہارے پپا اسے تلاش تو کریں گے۔ تم یقیناً اسے چھپا کر لائی ہوگی؟‘‘

’’ہاں...... جہانگیر۔ اور اسی کے لئے میں نے پپا سے گفتگو شروع کی تھی۔‘‘ ویرنا کافی دیر تک میرے پاس رہی اور پھر چلی گئی۔

لیکن میرے لئے وہ حیرت کا سمندر چھوڑ گئی تھی۔ جس جگہ کا تصور کرو۔ چشم زدن میں نگاہوں کے سامنے دیواروں کے پار بھی دیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ ایک ایسی بیش بہا چیز مجھے مل گئی تھی۔ جس کے بارے میں پوری طرح سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اب کیا کروں۔ اس بیش بہا چیز کو کس طرح استعمال کروں۔ کیا یہاں سے فوراً نکل بھاگوں۔ عقل ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ مسہری پر لیٹ کر میں نے عینک اٹھا کر سینے میں چھپا لی۔ اب یہ میرے لئے بیش بہا تھی۔ ویرنا چلی گئی تھی۔ لیکن اب یہاں ٹھہرنا دوبھر محسوس ہو رہا تھا۔ خاموشی سے بیڈ سے نیچے اتر آیا۔ دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔

دروازے سے باہر نکلا اور اچانک ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ ویرنا۔ محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ جس نے میرے لئے اپنے باپ کے خلاف کام کیا تھا۔ وہ تو بھوما کی دیوانگی کی شریک بھی نہ تھی۔ اگر میں بھوما کے ہتھے چڑھ گیا تو اس میں ویرنا کا کیا قصور تھا۔

لیکن وہ بیچاری اپنے باپ کے کرتوتوں سے شرمندہ تھی۔ بھوما۔ میں نے بوڑھے خبیث کے بارے میں سوچا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کی زندگی برباد کرے گا۔ (کیوں نہ میں ویرنا کو یہاں سے نکال لے چلوں۔ اور پھر پولیس کو بوڑھے کے کرتوتوں کے بارے میں اطلاع دے دوں۔ یہی عمدہ ترکیب ہے۔ اس طرح وہ کیفر کردار کو پہنچ جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں آیا۔ اگر بوڑھا گرفتار ہو گیا۔ تو میرے بارے میں بھی پولیس کو اطلاع دے دے گا۔ لیکن مجھے اس بات کی پرواہ نہیں ہے۔ میں تو یوں بھی مجرم تھا۔ اور پولیس بہر حال میری تلاش میں ہوگی۔ مجھے پولیس سے روپوش ہونا ہی ہے۔ پہلے بوڑھے کا قصہ پاک کر دیا جائے۔

میں اپنے فیصلے پر پوری طرح عمل کرنے کیلئے تیار ہو گیا۔ اور پھر میں ویرنا کی تلاش میں چل پڑا۔ ویرنا کا کمرہ تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اس وقت وہ اداس سی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

’’ویرنا۔‘‘ میں نے اسے مخاطب کیا اور وہ چونک پڑی۔

’’اوہ...... جہانگیر آپ؟‘‘

’’حیران کیوں ہو گئیں ویرنا؟‘‘

’’حیران نہیں خوش ہوئی ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔ تم کسی حد تک اپنی آنکھوں کی کمی پوری کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔‘‘

’’ہاں...... ویرنا۔ اور یہ تمہاری مہربانی سے ہے ورنہ......‘‘ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

’’میرے پپا نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا تھا نا؟‘‘

’’اوہ...... تو اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟‘‘ میں نے اس کی دلجوئی کی۔

’’میرے پپا کا تو ہے۔‘‘ اس نے اداسی سے جواب دیا۔ اور پھر کئی منٹ کی خاموشی چھا گئی۔ میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر جب وہ کئی منٹ تک نہ بولی۔ تو میں نے اسے مخاطب کیا۔

’’لیکن اب تم نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے۔ ویرنا؟‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’میرا مطلب ہے کہ کیا مجھے اس طرح زندگی گزارنی ہوگی؟‘‘

’’پھر میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں۔؟‘‘

’’میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں لیکن تنہا نہیں۔‘‘

’’پھر؟‘‘

’’تم بھی میرے ساتھ چلو گی ویرنا۔‘‘

’’کہاں؟‘‘

’’اس ویرانے سے دور۔ بھوما کی پرہوس دنیا سے بہت دور۔ بے شک میں اس کے جذبے سے بہت متاثر ہوں۔ لیکن وہ بھٹک گیا ہے۔ اور اس بھٹکے ہوئے انسان کو راہ پر لانا کسی طور ممکن نہیں ہے۔ کیا تم بھوما کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہو؟‘‘

جہانگیر، ساری خرابیوں کے باوجود وہ میرا باپ ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ ویرنا۔ لیکن میں یہاں تو نہیں رہ

سکتا۔ مجھے اجازت دو۔ میں اس ویرانے میں زندگی کی تلاش میں آیا تھا۔ اور روشنی کھو کر جا رہا ہوں۔ ہاں تمہاری مہربانی نے جو کچھ مجھے دے دیا ہے۔ وہ جب تک میری زندگی کے کام آئے گا۔ تمہاری یاد میرے سینے میں رہے گی اور شاید اس کے بعد بھی۔"

"لیکن۔ جہانگیر تم یہاں سے جا کیوں رہے ہو۔ یہاں میں ہوں۔ کیا میری ذات تمہارے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دو محبت کرنے والے جس جگہ یکجا ہو جائیں وہ ویرانے آباد ہو جاتے ہیں۔ تم یہیں رہو۔"

"بھوما ہمارے درمیان آنے کی کوشش کرے گا۔"

"تم یہ بات مجھ پر چھوڑ دو میں ان سے نمٹ لوں گی۔"

"لیکن اگر اسے عینک کی گمشدگی کا علم ہو گیا۔ تو......؟"

"ظاہر ہے۔ وہ برآمد نہیں کر سکیں گے۔"

"یہ تمہاری حماقت ہے۔ ویرنا۔ بھوما اتنا احمق نہیں ہے۔ تم اسے دھوکا نہیں دے سکتیں۔"

"آستین کے سانپ۔" دروازے پر کھڑے بھوما کی آواز آئی ہم دونوں دہشت سے اچھل پڑے۔ خونخوار بھوما اپنی بھیانک شکل لئے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے کرم اور دھرم بھی موجود تھے۔ اور اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ساری گفتگو سن چکا تھا۔ اور عینک کے بارے میں اسے معلوم ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس سے کچھ چھپانے کی کوشش بے سود تھی۔ لیکن اب کیا کرنا چاہئے۔

"مجھے احساس نہیں تھا۔ کہ تم اس قدر سازشی ثابت ہو گے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا سمجھتے ہو تم مجھے۔ تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں موت کے قریب تھا۔ تم نے مجھے زندہ رہنے کا مشورہ دیا۔ لیکن روشنی کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔ اس سے تو موت کی تاریکی ہی بہتر ہے۔ بتاؤ دنیا میں میرا کیا مقام ہے۔ جواب دو میں کیسے زندہ رہوں۔ کیا تم جہاں سازشی نہیں ہو جو تم نے مجھے فریب دیا۔ زندگی کے قریب لا کر مجھے دھوکے سے جہنم کی تاریکیوں میں دھکیل دیا۔ کیا حق تھا۔ تمہیں اس کا اور اب اگر میں نے سازش کی ہے تو تم اس پر حیران کیوں ہو۔"

"جہانگیر خان! میں زندگی کی تمام قدروں سے بے نیاز ہوں۔ میں اخلاقیات سے مستثنٰی ہوں۔ میں نے صرف اس لئے یہ بات کہہ دی تھی۔ کہ تم مجھے دوست سمجھتے تھے۔ میرے دوست، یہ دنیا کسی بھی صاحب فن کی قدر اس وقت تک نہیں کرتی جب تک اس کا فن اس کے کام نہ آ سکے۔ لیکن فن کو تکمیل کی منزل تک پہنچانے کے لئے بہت سے کٹھن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ اور ان کٹھن مراحل میں کوئی ان کا ساتھی نہیں بنتا۔ سب دور سے دیکھنے والے ہوتے ہیں اور اگر فنکار دلدل میں گر کر دم توڑ دے تو دیکھنے والے قہقہے لگا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہاں اگر وہ اسے منزل پر پائیں تو پھر خود کو اس کا ساتھی بناتے ہیں۔ کہتے ہیں ہاں ہم اس کے نزدیک تھے۔ مگر میری سوچ مختلف ہے۔ میں قرب کی بھیک نہیں مانگتا۔ میں بازو پر اپنی انگلیوں کی مضبوط گرفت قائم کرتا ہوں۔ اور اپنے نزدیک کھینچ لیتا ہوں۔ تا کہ قریب آنے والا کچھ نہ کہہ سکے۔ میں تو زبان بند کرنے کا قائل ہوں۔" مجھے کچھ بھی سمجھا جائے میرے بارے میں کچھ بھی سوچا جائے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہوتی ہے۔"

"لیکن تم بھول گئے بھوما...... کہ مقابل بھی جیتی جاگتی زندگی کا مالک ہوتا ہے۔"

"ہاں...... ہاں تو فیصلہ کئے لیتے ہیں۔ آؤ میں تمہیں موت کی منزل تک پہنچا دوں۔" بھوما نے واپس دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ پھر ویرنا کو مخاطب کر کے بولا۔ "ویرنا تو میری بیٹی ہے میں تیرا باپ نہیں ماں بھی ہوں۔ تیری رگوں میں میرا خون ہے۔ ہمارے درمیان اختلافات ہو سکتے ہیں۔ لیکن کیا تو اس خونی کو کسی دوسرے کے ہاتھوں مرتا دیکھنا پسند کرے گی؟"

"تم خود غرض ہو پیا۔ تم قانون قدرت میں ترمیم کرنا چاہتے ہو۔ ہم سب مشیت کے محکوم ہیں خدا کسی کو اندھا کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے اندھا کر دیتا ہے۔ ہم اسے روکنے والے کون تم صرف اپنی شہرت چاہتے ہو۔ پپا۔ اور تم اسی کے لئے ساری جدوجہد کر رہے ہو میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔ میں اب جہانگیر کے ساتھ ہوں۔"

"اوہ۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد تو دیکھے گی کہ جہانگیر اس دنیا میں نہیں ہو گا۔ لیکن اس کے بعد میری ہمدردی تیرے ساتھ نہ ہو گی۔" بوڑھے نے کہا۔ اور پھر مجھے زور سے آواز دی۔

"جہانگیر!"

اور میں بے اختیار بول پڑا۔ یہ میری غلطی تھی۔ کیونکہ خونخوار بوڑھے نے میری آواز پر میری سمت کا تعین کر لیا تھا۔ اور پھر اس نے وحشیانہ انداز میں میرے اوپر حملہ کر دیا۔ لیکن مصنوعی آنکھیں ویرنا کا دیا ہوا عطیہ میرے کام آ گیا۔ میں نے فوراً چھلانگ لگا کر اس کا وار خالی کر دیا۔ اور بوڑھا دیوار سے ٹکرایا۔ لیکن وہ بیحد پھرتیلا تھا۔ میرے قدم جونہی زمین پر ٹکے اس نے پلٹ کر قدموں کی چاپ پر چھلانگ لگا دی۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر دبوچنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے لئے بھی یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ میں نے پھر اس کا وار خالی کر دیا۔ اور ایک زوردار گھونسہ اس کی ناک پر جڑ دیا۔

بوڑھا چکرا گیا تھا۔ لیکن پھر وہ ایک دم رک گیا۔ اور پھر اس نے مضطربانہ انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"کرم...... دھرم، اس پر حملہ مت کرنا۔ عینک اس کے پاس ہے۔ کہیں وہ ٹوٹ نہ جائے۔" اور پھر وہ کھڑا ہو کر بے بسی سے مجھے دیکھنے لگا۔ "دیکھو عینک کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔ میں تم سے جنگ نہیں کروں گا۔ عینک مجھے واپس کر دو۔ یہ میری زندگی کی سب سے اہم چیز ہے۔ میں اس کے بغیر کچھ نہیں کر سکوں گا۔ میری کامیابی کا انحصار اسی پر ہے۔"

میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں جس طرح دوبار اس کے حملوں سے بچا تھا۔ اس سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ عینک میری آنکھوں پر موجود ہے۔ اور اب یہ عینک میرے لئے بھی ایک اہم حیثیت رکھتی تھی۔

"میں تمہیں یہ واپس نہیں کروں گا۔ ذلیل کتے۔ تو نے میری آنکھیں نکالی ہیں تو نے میری زندگی تاریک کر دی ہے۔ میں تیرے سارے منصوبے خاک میں ملا دوں گا۔"

"نہیں...... نہیں۔ ان منصوبوں کا صرف میری ذات سے تعلق نہیں ہے۔ یہ رفاہ عامہ کیلئے ہیں۔ مجھے عینک واپس کر دو۔ اس کے عوض مجھ سے جو چاہو طلب کر لو۔"

"تب پھر میری آنکھیں مجھے واپس دے دو۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"اوہ...... جہانگیر...... جہانگیر، ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ میری مجبوری سمجھو۔" بوڑھے نے لرزتی آواز میں کہا۔ وہ جس قدر خونخوار ہو رہا تھا۔ مجھے اس کا احساس تھا۔ لیکن عینک کی وجہ سے بے بس تھا۔ اور میں اس تاک میں تھا کہ جونہی دروازہ خالی ملے میں باہر چھلانگ لگا دوں۔ میں نے آہستہ سے ویرنا کو اشارہ کیا۔ اور ویرنا آہستہ آہستہ دروازے کی جانب کھسکنے لگی۔ اس دوران میں نے بوڑھے کو باتوں میں لگا لیا۔ اس وجہ سے وہ ویرنا کے قدموں کی چاپ پر توجہ نہ دے سکا۔ اور ویرنا بالآخر دروازے سے نکل گئی۔ میں نے بھوما کو کافی حد تک مطمئن کر دیا۔ اور اب وہ مجھ سے مصالحت کی گفتگو کر رہا تھا۔ بڑی ہی نپی تلی تھی میری چھلانگ بھی۔

پھر میں بھی ویرنا کے قریب پہنچ گیا۔ بوڑھا دھاڑتا ہوا ہمارے پیچھے بھاگا اور اس کے پیچھے کرم اور دھرم بھی۔ لیکن میں ویرنا کا ہاتھ پکڑے ہوئے بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ ہم کھنڈرات نما عمارت سے نکل آئے۔ ویرنا میرا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔

بوڑھا طاقتور ضرور تھا۔ لیکن بہرحال دوڑنے میں ہمارا مقابل ثابت نہ ہوا اور ہم اسے بہت پیچھے چھوڑ آئے پھر ہم نے سرائے دلبر پہنچ کر ہی دم لیا۔

اوراس کے بعد میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ سرائے دلبر ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ سیدھے سادھے لوگوں پر مشتمل۔ ہم اس بستی میں ضم ہوگئے۔

میں جانتا تھا کہ ایک مفرور مجرم کی حیثیت سے کسی وقت بھی پولیس میری گردن ناپ سکتی ہے۔ اس کے لئے میں نے حلئے میں تبدیلی ضروری سمجھی۔ چنانچہ مسمات ویرنا جو عام طور سے مغربی لباس میں ملبوس رہتی تھی۔ اب برقع پوش خاتون بن گئی تھی۔ میرے گالوں پر سیاہ گھنگریالی داڑھی بھی تھی۔ مسجد کے ایک مولوی صاحب نے ہمیں رشتہ حیات میں منسلک کردیا تھا۔ میری حیثیت ایک درویشی صفت انسان کی سی تھی۔ اکثر بیمار لائے جاتے اور میں ان کے جسم میں جھانک کر ان کی بیماری کی نشاندہی کردیتا گمشدہ لوگوں کے لئے ان کے ورثاء کو بتادیتا۔ اور یہ سب تصور کا کمال تھا۔ عینک میری بڑی ہی مددگار ثابت ہوئی۔ گو میری آنکھوں کی واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔ لیکن عینک کی موجودگی ان کی کسر پوری کردیتی تھی۔ یہ عینک مجھے اپنی بینائی کی مانند عزیز تھی۔ درحقیقت اگر یہ میری زندگی میں نہ ہوتی تو میں کیا تھا۔

لیکن میں نے اپنی زندگی کو یہیں تک محدود رکھنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ہاں کچھ وقت گزرنے کا منتظر تھا۔ تاکہ پولیس کی فائلوں سے میرا ریکارڈ کافی نیچے دب جائے۔ اور میں وفاشعار ویرنا کے ساتھ زندگی کے لمحات کچھ اور خوب صورت انداز میں بسر کرسکوں۔ بھوما کو میں نے معاف کردیا تھا۔ کیونکہ یہ ویرنا کی فرمائش تھی اور بہرحال وہ میری بیوی تھی۔

تقریباً چار سال میں نے ویرنا کے ساتھ سرائے دلبر میں بسر کئے۔ اور پھر چھوٹی سی خوب صورت اپنی ننھی بچی مناہل کے ساتھ ایک شہر کا رخ کیا۔ میرے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے۔ جنہیں میں تکمیل تک پہنچانے کیلئے کوشش میں مصروف ہوگیا۔ اس عجیب وغریب ایجاد سے میں پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ہم نے ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کیا۔ جس کی حیثیت بڑی پر اسرار تھی۔ ہم ڈاکٹروں کو ان کے مریضوں کی بیماریوں کی شناخت میں مدد دیتے۔ جن کی بیماریاں نامعلوم ہوتی تھیں۔

ہم ایسے لوگوں کی بھی امداد کرتے تھے۔ جنہیں کسی کا پتہ معلوم کرنا ہوتا تھا۔ ان کے حالات معلوم کرنا ہوتے تھے۔ اکثر پولیس کے لوگ ہمارے پاس مفرور مجرموں کی تلاش کے سلسلے میں آتے تھے۔ ایک عجیب سی پراسراری حیثیت مل گئی تھی مجھے۔ اور بہرصورت ان تمام کاموں سے آمدنی بھی نہایت مناسب تھی۔ میں نے لوگوں کو مطمئن کرنے کیلئے ملازم بھی رکھے تھے۔ جن کے بارے میں یہ اظہار کرتا تھا۔ کہ میرے لئے کام کرنے والے یہ ہی لوگ ہیں۔ اس طرح بینائی کھونے کے باوجود میری زندگی کو ایک مناسب سہارا مل گیا تھا۔ اور یہ سہارا تھی میری عینک۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زمانہ کس قدر حاسد ہے۔ اور وقت کس قدر سنگدل۔ ہمارا سکون آسمان کو پسند نہیں آیا۔ بے شمار حاسد پیدا ہوگئے تھے۔ ایک رات ہماری رہائش گاہ میں آگ لگا دی گئی۔ اور ہم جل کر راکھ ہوگئے۔

''آگ لگادی گئی؟'' نعمت علی نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں.....'' وہ غم زدہ لہجے میں بولا۔

''وہ حاسد، وہ دشمن کون تھے؟''

''ایسے کچھ ڈاکٹر جن کا کاروبار میری وجہ سے ٹھنڈا ہوگیا تھا۔''

بہرحال افسوس ناک کہانی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔ ''تمہارا انتقال کیسے ہوا؟''

''انتقال..... میرا انتقال کہاں ہوا۔ میں تو زندہ ہوں۔'' نعمت علی نے کہا اور وہ چونک پڑا۔

''کیا بکواس کررہے ہو۔ زندہ ہو؟''

''ہاں دوست۔ میں تو زندہ ہوں۔'' نعمت علی نے کہا اور وہ غصے سے آگ بگولہ ہوگیا۔ ''غیرت نہیں آتی زندہ ہوکر مردوں میں آ گھسے ہو۔ بے غیرت، بے شرم دفع ہوجاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے دوڑا اور قبر میں

گھس گیا۔ نعمت علی ہکابکا رہ گیا تھا۔ دور کہیں گیدڑوں کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ نعمت علی اداس سا وہاں سے اٹھا۔ اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆☆

بیچارے مدد علی عجیب مشکل کا شکار ہوگئے تھے۔ تعویذ گنڈوں، عمل اور عملیات کے بارے میں بڑی معمولی سی سدھ، بدھ تھی۔ نہایت شریف آدمی تھے۔ چونکہ باپ دادا نے اس کے علاوہ کچھ نہیں سکھایا تھا۔ اسلئے انہیں چیزوں میں گزارہ کرتے تھے۔ ہلکے پھلکے تعویذ گنڈے وغیرہ دے دیا کرتے تھے۔ معمولی سی آمدنی ہوجاتی تھی۔ لیکن اب جو مشکلات گلے پڑی تھیں۔ ان سے وہ انتہائی خوف زدہ رہتے تھے۔ بیشک حالات بہت بہتر ہوگئے تھے۔ مالی مشکلات دور ہوگئی تھیں۔ بیچارے قناعت پسند انسان تھے۔ پانچ سو روپے روز تو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ لیکن پیسے آنے پر بے قابو نہیں ہوئے تھے۔ پچھلے دنوں جو کچھ بچا پائے تھے۔ وہ رمضانی کے سپرد کردیا تھا۔ اور رمضانی ان کا بے دام غلام بن گیا تھا۔ لیکن وہ اس قدر انکسار پسند تھے کہ کسی کی غلامی سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

محلے والے تھے کہ گھر کے سامنے سے گزرتے تو آنکھیں نیچی اور گردن جھکا کر وہاں سے گزرتے۔ کبھی دروازے کے باہر نظر آجاتے تو لوگ ہاتھ باندھ کر حاضری دیتے اور پوچھتے کہ حضور! کس ضرورت سے باہر نکلے ہیں۔ مدد علی صاحب ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتے کہ بھائی آپ لوگ مجھے کیوں گناہ گار کرتے ہیں۔ ساری زندگی آپ کے درمیان گزاری ہے۔ اب کوئی آسمانی بات نہیں ہوگئی۔ بس اللہ تعالیٰ کا نام خلوص وعقیدت سے لیتا ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ ہر مشکل آسان کردیتا ہے آپ لوگ میرے ساتھ یہ سلوک کرکے مجھے زیر بار نہ کیا کریں۔'' تو لوگ کہتے۔

''کہ حضور! یہ ہی تو آپ کی بڑائی ہے اور اسی میں تو آپ کی درویشیت جھلکتی ہے ورنہ دور تو یہ ہے کہ اگر کسی کو سر اٹھانے کا موقع مل جائے تو وہ آسمان سر پر اٹھالیتا ہے۔ آپ نے آج تک نہ پہلے نہ اب کسی سے بڑائی کا اظہار نہیں کیا۔ اور بڑائی اسی کو کہتے ہیں۔ بہرحال لوگ اپنی مشکلات لے کر بھی آجاتے تھے۔ چھوٹے موٹے معاملات میں مدد علی جو کچھ کرسکتے تھے کردیا کرتے تھے۔ لیکن اب لوگوں نے ان کے بارے میں طرح طرح کے اندازے قائم کرنا شروع کردیئے تھے۔ ایک دوبار ایسی کچھ مشکلات سامنے آئیں تو اتفاق سے نعمت علی گھر آگیا۔ مدد علی نے کہا۔

''نعمت علی تم کہاں مارے مارے پھرتے ہو بیٹے! میرے علاوہ کون یہ بات جانتا ہے کہ قدرت نے تمہیں کوئی بہت بڑا علم دے دیا ہے۔ جس نے تمہیں بڑی بلندیاں عطا کردی ہیں۔ لیکن بیٹے میں تو وہی معمولی سا مدد علی ہوں۔ لوگ میرے پاس اپنے مسائل لے کر آجاتے ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انہیں کیا جواب دوں۔''

''ابا کیوں پریشان ہوتے ہو۔ میں کون سا بہت دور چلا جاتا ہوں۔ بس اب تم نے اس راستے پر لگا دیا ہے۔ تو اللہ کی مخلوق کی جو بھی مدد ہوتی ہے کرلیتا ہوں۔ یہ ہی شوق بھی پیدا ہوگیا ہے۔ جب بھی کوئی مشکل پیش آئے۔ آواز دے لیا کرو۔ حاضر ہوجایا کروں گا۔''

''بس بیٹے یہ گھر نہیں چھوڑ سکتا۔ چونکہ یہاں میرے باپ دادا کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اور یہ خوشبو مجھے زندگی سے زیادہ پیاری ہے۔ لیکن گھر کا چکر لگاتے رہا کرو۔''

''جی ابا فکر نہ کرو۔'' بات کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اور کہاں آکر ختم ہوتی ہے۔ مدد علی اس محلے میں خاصے مشہور ہوگئے تھے۔ اور یہ چیز ان کے لئے کافی پریشانی کا باعث تھی۔ محلے ہی کے ایک صاحب تھے جن کا نام رئیس خان تھا۔ رئیس خان کے ایک اور رشتے دار کے ہاں کوئی مہمان ہندوستان سے آئے۔ اور کوئی

مشکل اپنے ساتھ لے کر آئے۔ عمر رسیدہ آدمی تھے۔ خوش پوش، خوش لباس۔ لیکن چہرے سے شدید پریشانی جھلکتی تھی۔ جن صاحب کے ہاں وہ آئے۔ انہوں نے ان سے پوچھا کہ آخر ایسی کیا مشکل ہے۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ بھائی۔ اپنے کئے کا شکار ہو گیا ہوں۔ اور پورا گھر مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی کے یہ چند دن کس طرح پورے کئے جائیں۔ بات اپنی ذات تک ہوتی تو ٹھیک تھی لیکن میرا پورا گھرانہ میری نحوست کا شکار ہے۔ بس تم لوگوں کو دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ تو سوچا کہ چلو پاکستان کا چکر ہی لگا آؤں۔ سو آ گیا۔"

"مسئلہ کیا ہے؟"

"ایک جناتی عمل میں پھنس گیا ہوں۔ جناتی نہ کہا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ دیوی دیوتاؤں کے عذاب کا شکار ہو گیا ہوں۔ کچھ جادوگروں سے پالا پڑ گیا تھا۔"

"تو پھر؟"

"بس کیا بتاؤں گھر کے سارے افراد عذاب میں گرفتار ہیں۔ بیٹی سسرال میں پریشان ہے۔ بیٹا کہیں مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے۔"

"اچھا...... یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ ارے ہاں...... آپ کو ایک صاحب سے ملاؤں۔ آپ کی مشکلوں کا حل نکال لیں گے۔"

"کون ہیں؟"

"رئیس خان میرا دوست ہے۔ میرا بھائی ہے۔ رشتے کا بھائی ہے۔ اس کے محلے میں ایک بہت بڑے بزرگ رہتے ہیں۔ مددعلی نام ہے۔ اور یوں سمجھ لو کہ اس دور میں فرشتہ صفت ہیں۔ رئیس خان یہ ہی بتاتے ہیں۔"

"یار اگر ایسی بات ہے۔ تو فوراً رئیس خان کو پکڑو اور مجھے ان کے پاس لے کر چلو۔" زاہد خان نے عاجزی سے کہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے رئیس خان کو پکڑا گیا۔ اور اس کے بعد زاہد خان کو لیکر یہ لوگ مددعلی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔

مددعلی بیچارے اس وقت بھی اپنے گھر میں بیٹھے اپنی بیگم سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے بڑی عاجزی سے کہا تھا۔ کہ مہمانوں سے ملاقات کے لئے شام کو پانچ بجے سے سات بجے تک کا وقت مقرر کر لیا جائے۔ اس سے زیادہ وقت وہ نہیں دے سکتے۔ بحالت مجبوری انہوں نے یہ بات بھی کہی تھی۔ کہ یہ وقت وہ عمل پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ اگر وہ عمل نہیں پڑھیں گے۔ تو پھر لوگوں کا کام کیسے ہوگا۔

بہر حال رئیس خان اپنے مہمانوں کو لئے ہوئے۔ مددعلی کے پاس پانچ بجے کے بعد ہی پہنچے تھے۔ مددعلی نے ان کا استقبال کیا تو رئیس خان نے کہا۔

"مددعلی صاحب معافی چاہتا ہوں ہاتھ جوڑ کر بڑی مجبوری کے عالم میں آپ کو تکلیف دینے کیلئے آیا ہوں۔"

"نہیں نہیں بھائی! آپ ہمارے پڑوسی ہیں۔ حکم کیجئے۔ یہ کون صاحب ہیں؟"

"ان کا نام زاہد خان ہے۔ اور یہ میرے بہت ہی قریبی رشتے دار فضل بیگ ہیں۔"

"اچھا...... اچھا۔ بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر کیا پئیں گے آپ لوگ چائے یا شربت وغیرہ۔"

"بالکل نہیں...... بالکل نہیں۔ حالانکہ آپ کے ہاں کا تو پانی بھی اکسیر ہوتا ہے۔"

"خدا کیلئے کانٹوں پر نہ گھسیٹئے۔ جو کچھ ہوں بس وہی رہنے دیجئے۔ فرمایئے کیا بات ہے؟"

"حضور! میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میرا نام زاہد خان ہے۔ ہندوستان سے اپنے ان عزیز سے ملنے کیلئے آیا ہوں۔ میں وہاں پر ایک بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہوں۔ یہ بات تو آپ کے علم میں ہوگی کہ ہندوستان دوسری تہذیبوں کا بھی شہر ہے۔ وہاں دیوی، دیوتا، اور جادوٹونوں کے چکر یہاں سے بہت زیادہ ہیں۔ میں بھی ایک ایسی ہی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ ویسے یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ بچپن ہی سے مجھے اس طرح کی چیزوں

سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اور نئی بار میں نے ایسے کام ابھی کئے ہیں۔ جو بہر حال غلط تھے۔ لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ہندو دیوی دیوتاؤں کے جال میں پھنسنے سے روک دیا۔ لیکن کبھی کبھی وہ ہو جاتا ہے۔ جو انسان خود نہیں کرتا۔ جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ پر اسرار روحوں سے مجھے دلچسپی تھی لیکن اس کے بعد جب میری شادی ہو گئی۔ اور ایسے معاملات سامنے آ گئے تو میں نے ہر دلچسپی چھوڑ دی۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت سنجیدگی سے اپنا کاروبار کر رہا تھا۔ بنارس سے تعلق ہے۔ اور بنارسی ساڑھیوں کے بارے میں تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ پورے ہندوستان میں جگہ جگہ یہ کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ ایک پارٹنر کے ساتھ مل کر میں نے ساڑھیوں کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ میرے پارٹنر کا نام فاروق تھا۔ تو فاروق کے ساتھ میں یہ کام کر رہا تھا۔ ہمارے ہاں کا بنا ہوا مال بہت کم ہوتا تھا۔ کیوں کہ ہم خود اسے اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے۔ لیکن اسے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اور بڑے بڑے رئیسوں کے ہاں ہمارا یہ مال جاتا تھا۔

جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ ہندوستان کے رجواڑوں میں اب ریاستیں تو نہیں ہیں۔ لیکن رئیسوں کا بول بالا ہے۔ قدیم قسم کے محل اور حویلیاں اب بھی وہاں موجود ہیں۔ اور ان حویلیوں کے رسم ورواج اور روائتیں بھی وہی ہیں جو ہوا کرتی تھیں۔ میرا پارٹنر فاروق علی ایک دن میرے پاس آیا اور بولا کہ ایک بڑی سرکار میں ہم لوگوں کو مال لے کر طلب کیا گیا ہے۔ اگر وہاں ہماری شنوائی ہو گئی اور رانی صاحبہ کو ہمارا مال پسند آ گیا۔ تو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔" حضور قبلہ! مددعلی صاحب ہم چونکہ ناوقت آئے ہیں آپ کا بہت زیادہ وقت لیں گے۔ کیونکہ میں پوری داستان آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ آپ ہمیں یہ وقت دیں گے؟"

"ہاں...... ہاں بھائی۔ اس وقت کوئی ہے نہیں۔ اور اگر کوئی آیا بھی تو میں منع کرا دوں گا۔ اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔"

"بہت شکریہ۔ تو میں آپ سے عرض کر رہا تھا۔ کہ وہاں ہماری طلبی ہوئی تھی۔ جس جگہ ہمیں بلایا گیا تھا۔ اس کا نام بھوج گڑھی تھا۔ بھوج گڑھی کا آس پاس کا علاقہ ایک قدیم ریاست کا علاقہ تھا۔ اور اس قدیم ریاست کا آخری رئیس جو ریاست ختم ہونے کے بعد جاگیر دار کہلاتا تھا۔ سنگرام سنگھ تھا۔ سنگرام سنگھ کی بیوی رام رتی کپڑوں کی بہت شوقین تھی۔ اور اسی نے اپنے آدمی کو بھیج کر ہمیں اپنی ساڑھیوں کے نمونے لانے کیلئے اطلاع بھجوائی تھی۔ اور ہمیں ساڑھیاں لے کر بھوج گڑھی پہنچنا تھا۔ میرا نوجوان دوست فاروق علی ذرا دل پھینک قسم کا آدمی تھا۔ اور حسن و جمال سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔ تھوڑا سا اس کا ساتھ میں بھی دے دیا کرتا تھا۔ لیکن بس ایک حد تک بہر حال ہم گڑھی پہنچ گئے۔ اور ہمارا استقبال کیا گیا۔ ہم اپنے ساتھ ساڑھیوں کے انبار لے گئے تھے ہمیں مہمان خانے میں ٹھہرا دیا گیا۔ واقعی یہ حویلی محل ہی معلوم ہوتی تھی۔ اور اسے محل ہی کہا جاتا تھا۔ ہمیں مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ سامنے ہی وسیع و عریض لان تھا۔ پھر بہت ہی عمدہ قسم کا کھانا پیش کیا گیا۔ یہاں آ کر ہم بہت خوش ہوئے تھے۔ میں اور فاروق علی۔ رانی رام رتی کے بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ فاروق علی کہنے لگا۔

"مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔"

"دیکھیں گے۔ تو اندازہ ہوگا۔ ویسے وہ کتنی ہی خوب صورت ہو۔ ہمیں اس سے کیا فاروق علی؟"

"ہاں...... یار۔ ہم تو وہی ساڑھی والے کے ساڑھی والے۔" بہر حال خاصی رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہے تھے۔ مہمان خانہ بھی کافی وسیع و عریض تھا۔ مگر باہر کا ماحول کچھ عجیب سا تھا۔ درخت لگے ہوئے تھے اور یہ وسیع و عریض باغ مجھے بڑا خوفناک محسوس ہو رہا تھا۔ دن کی روشنی میں بھی یہ مجھے عجیب پر اسرار سا لگا تھا۔ پھر رات کا نجانے کون سا وقت تھا۔

فاروق علی تو سو گیا تھا۔ میں جاگ رہا تھا۔ باغ میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سامنے نگاہیں جمادیں۔ اچانک ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سامنے املی کے درخت سے کوئی نیچے اتر رہا ہو۔ میں بری طرح چونک پڑا۔ یہ میرا وہم نہیں تھا بلکہ حقیقتاً کوئی درخت سے نیچے اترا تھا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ اس کا رخ ہمارے اسی مہمان خانے کی طرف تھا۔ جس کا برآمدہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ باہر سے آنے والے کو یقیناً ہم لوگ نظر نہیں آسکتے تھے۔ لیکن چکر کیا ہے؟ کون ہے اور وہ یہاں کیوں آرہا ہے۔ دل چاہا کہ فاروق علی کو جگادوں۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ آخر دیکھوں تو سہی کہ یہ چکر کیا ہے۔ سایہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ میں سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ لیکن تاریکی کی وجہ سے اسے بھی شاید کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے آگے بڑھ رہی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتا۔ وہ میرے قریب پہنچ گئی۔ یا تو وہ اندھی تھی۔ یا پھر تاریکی اس پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہورہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور فاروق علی پر ڈھیر ہوگئی۔ فاروق علی پلنگ پر سو رہا تھا۔ وہ اسی کے اوپر گری تھی۔ فاروق علی بری طرح گھگھیا کر چیخا۔

"بچاؤ...... بچاؤ۔" لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی سایہ بھی چیخ اٹھا۔ نسوانی چیخ کے ساتھ ہی آواز ابھری۔

"نہیں بھگوان کے لئے نہیں۔" فاروق علی نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس نے شاید نیند کے عالم میں اپنے اوپر گرنے والی کو پکڑ لیا تھا۔ "چھوڑ دو مجھے...... بھگوان کے لئے چھوڑ دو مجھے...... تمہیں بھگوان کا واسطہ مجھے چھوڑ دو۔"

"کک۔ کک...... کون ہو تم؟" فاروق علی گھگھیا کر بولا۔ اسی وقت میں سنبھل گیا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر روشنی جلا دی۔ غالباً پچیس وولٹ کا نہایت ہی دھندلا اور پرانا بلب یہاں لگا ہوا تھا۔ جس کی مدھم روشنی پیلی اور بدنما تھی۔ فاروق علی نے جلدی سے لڑکی کو چھوڑ دیا۔ اور لڑکی اندھوں کی طرح دوڑی۔ وہ عورت نہیں بلکہ ایک نوخیز لڑکی تھی۔ اس بار وہ مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اس نے مجھے بھی دیکھ لیا تھا۔ اور اس کے چہرے پر مزید دہشت پھیل گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو تمہیں دعائیں دوں گی مجھے چھوڑ دو۔" میں نے لڑکی کو بغور دیکھا۔ چیتھڑے جھول رہے تھے۔ اس کے جسم پر سفید لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ مگر خوف میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ بال گھنے اور سیاہ کھلے ہوئے اور الجھے ہوئے تھے۔ عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ فاروق علی نے بھی اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ وہ پلنگ سے اتر کر آیا۔ اور لڑکی کو سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

"ہم نے تمہیں پکڑا کہاں ہے لڑکی۔ اور تم کیا چھت سے ٹپکی ہو۔" اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ اور پھر میری طرف۔ "مگر یہ نازل کہاں سے ہوئی ہے؟" فاروق علی کے لہجے میں مذاق تھا۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔

"تم اگر جانا چاہو تو جاسکتی ہو۔ ہم نے تمہیں پکڑا نہیں ہے۔ کیا سمجھیں؟ تمہیں ہمارے ہاتھوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" لڑکی نے سہمی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

"تو پھر کیا تم یہاں رہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"مم...... میں تم سے ایک بات کہوں؟"

"ہاں...... ہاں کہو...... ضرور کہو۔"

"مجھے کچھ کھانے کو دے دو۔ میں دو دن سے بھوکی ہوں۔ کوئی بھی چیز دے دو مجھے۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔ میں تم سے کبھی ایسی بات نہ کرتی۔ تم بھی پتہ نہیں کیا سوچو گے میرے بارے میں۔ مگر میں دو دن

کی بھوکی ہوں۔ اور اب مجھ سے چلا بھی نہیں جارہا۔ پیاسی بھی ہوں۔ کوئی بھی چیز دے دو مجھے۔ چاہے وہ جیسی بھی ہو۔ سوکھی ہوئی روٹی کا ٹکڑا ہو۔ جو بھی ہو میں کھالوں گی۔" اس کے لہجے میں بڑی عاجزی تھی۔ میں نے فاروق کی طرف دیکھا تو فاروق بولا۔

"ہاں...... ہاں...... ابھی لو...... ابھی لو۔" اس نے کہا۔ اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ لڑکی نے خوف بھری نگاہوں سے دروازے کو دیکھا۔ پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

"وہ کسی کو بتا تو نہیں دے گا؟" وہ انہیں خبر تو نہیں کردے گا؟"

"کسے؟" میں نے پوچھا۔

"انہیں...... انہیں...... وہ سب بھبوری کے داس ہیں۔"

"بھبوری؟" میں حیرانی سے بولا۔

"ہاں...... وہ...... وہ...... وہ میری گردن کاٹ دے گی۔ اسے اوپر لٹکا دے گی اس طرح میرے شریر کو بھی...... میرا خون اس پر گرے گا۔ اور وہ میرے خون سے نہائے گی۔ وہ منتر پڑھتی جائے گی۔ ہائے رام...... ہائے رام۔" وہ رونے لگی اور اسکا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔

"سنو...... میری بات سنو...... رونا بند کرو۔ وہ میرا دوست ہے۔ تمہارے لئے کھانا لینے گیا ہے۔ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا وہ۔"

"دو دن ہوگئے ہیں پورے دو دن...... پہلے میں ایک سوکھے نالے میں چھپی رہی اور پھر وہاں کچھ لوگ نظر آئے تو بھاگ کر یہاں آگئی۔ املی کے درخت سے اس وقت میں اس خیال سے نیچے اتری تھی۔ کہ یہاں رسوئی تلاش کروں۔ شاید کچھ کھانے کو مل جائے۔"

"مگر تم ہو کون؟"

"پوچھے جارہے ہو...... پوچھے جارہے ہو۔ مجھ سے بولا بھی نہیں جارہا۔ بتایا ہے کہ دو دن سے بھوکی اور پیاسی ہوں۔" وہ جھلا کر بولی۔ اور نجانے کیوں وہ مجھے بڑی عجیب سی لگی۔ میں خاموش ہوگیا۔ بڑا ترس آرہا تھا۔ مجھے اس پر پھر دروازے پر آہٹ ہوئی تو وہ چونک پڑی۔ اس نے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر دہشت بھری نظروں سے مجھے لیکن آنے والا فاروق ہی تھا۔ اس کے ہاتھوں میں پتوں سے بنے ہوئے ڈونگے تھے جن میں ایک میں کچھ لڈو رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے میں پوریاں اور ترکاری تھی۔

"بس یہ ملا ہے۔ کام چل جائے گا۔" فاروق نے یہ چیزیں آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور اس نے بھوکوں کی طرح ان کو جھپٹ لیا۔ پھر وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

"پانی...... پانی نہیں ملا۔"

"وہ بھی آجائے گا۔ تم کھاؤ تو سہی۔"

"بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔ بھگوان کرے کبھی بھوکے نہ رہو۔" وہ پوریاں ٹٹولنے لگی اب ہم نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ مگر بڑی ناقدری کی شکار۔ جو کچھ اس نے بتایا تھا۔ وہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ فاروق اسے مسلسل گھورے جارہا تھا۔ اس نے ایک پوری منہ میں ٹھونس لی۔ دوسری ہاتھ میں دبالی۔ ساتھ ساتھ وہ بولتی بھی جارہی تھی...... کہنے لگی۔

"بس ان کا خطرہ ہے۔ مجھے۔ وہ مجھے جگہ جگہ کھوجتے پھر رہے ہیں۔ وہ تو میں بہت تیز دوڑتی ہوں۔ ورنہ ان کے ہاتھ آجاتی۔" اچانک دروازے کا پٹ زور سے کھلا اور وہ دہشت سے چیخ پڑی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے بجلی سی کوندگئی۔ ایسی نپی تلی چھلانگ لگائی اس نے کہ سیدھی کھڑکی کے باہر جاکر گری۔ اس طرح دروازہ کھلنے سے ہم بھی اچھل پڑے ہماری گردنیں دروازے کی طرف گھوم گئیں۔ ہمارا ملازم گنگا رام پانی کے برتن سنبھالے اندر گھس آیا تھا۔ اور احمقوں کی طرح منہ کھولے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

پھر میں نے اور فاروق نے بیک وقت کھڑکی کی طرف دوڑ لگائی اور باہر جھانکنے لگے۔ باہر بیکراں

سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ میرے ساتھ وہ بھی کھڑکی سے باہر آگیا۔ اور ہم اسے تلاش کرنے لگے۔

میں نے چیخ کر کہا۔ ''تمہیں کوئی خطرہ نہیں وہ ہمارا ساتھی تھا۔ جو تمہارے لیے پانی لایا تھا۔ اگر تم درخت پر چڑھ گئی ہو تو واپس آجاؤ...... ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔''

آدھے گھنٹے تک جھک مارتے رہے۔ اور ملازم گنگا ہمیں کھڑکی میں کھڑا جھانکتا رہا۔ اس کا کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ میرے ذہن میں شدید جھلاہٹ پیدا ہوگئی۔ غصے کے عالم میں کھڑکی کے اندر داخل ہوگیا۔

''تم انسان ہو یا گدھے۔'' میں نے گنگا سے کہا۔

''ہپ...... پتہ نہیں۔'' وہ بوکھلا کر بولا۔

''یوں بیل کی طرح ٹکر مار کر اندر آتے ہیں۔''

''نہیں جی...... وہ......''

''پاگل...... احمق...... گدھا۔'' فاروق بھی غرایا۔

''اب میں کیا کروں۔'' گنگا بولا۔

''دفع ہوجاؤ۔''

''ہپ...... پانی چھوڑ جاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''دفع ہوجاؤ یہاں سے۔'' فاروق پاؤں پٹخ کر بولا۔ اور گنگا پھرتی سے باہر نکل گیا۔

''بہت برا ہوا یار۔ وہ سب کچھ ایسے ہی چھوڑ گئی۔ کیا حسین لڑکی تھی۔ نجانے کس سے خوف زدہ تھی۔

میں گہری سانس لے کر پلنگ پر آبیٹھا۔ سخت ذہنی اذیت کا شکار ہوگیا تھا۔ ''کچھ بتایا تھا اس نے......'' فاروق نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ بس وہ خوف زدہ تھی۔ کہہ رہی تھی چند لوگ اس کی تلاش میں ہیں۔ افسوس وہ کچھ کھا بھی نہ سکی۔''

''غلطی مجھ سے ہوئی کھانے کیلئے گنگا کو جگانا پڑا تھا۔ یہ کھانا اس کے پاس بچا ہوا رکھا تھا۔ میں نے اس سے پانی لانے کو کہا۔ اور کھانا لے کر آگیا۔ میرے دونوں ہاتھ بھرے ہوئے تھے۔ اس لئے اس سے کہہ دیا تھا۔''

''مگر وہ تھی کون؟''

''یہ کچھ نہیں معلوم مجھے؟'' میں نے کہا۔ اور پھر فاروق بولا۔

''اس وقت میں ایک عجیب خواب دیکھ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میں ایک اونچے سے درخت کی شاخ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ شاخ کی موٹی لکڑی میرے وزن سے چرچرا رہی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ درخت میرے اوپر آگرا۔ مگر یار بڑی یاد آرہی ہے۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ فاروق خود ہی مجھ سے بے تکلف ہوا تھا۔ میں نے کبھی اس سے بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ بہر طور میں نے لڑکی کے سلسلے میں اس سے بہت زیادہ گفتگو نہیں کی۔ وہ اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا بولا۔

''یہ کھڑکی بھی بند نہیں کی جاسکتی۔ کیا تمہیں نیند آجائے گی؟''

''سونا تو ہے ناں۔ ورنہ رات کو طبیعت خراب ہوجائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہی میں کہنا چاہتا تھا۔ حالانکہ کیا یہ اچھا ہوتا کہ وہ ہمارے ساتھ ہوتی۔ خیر...... خیر جو چیز تقدیر میں نہیں ہوتی انسان کتنی ہی کوشش کرے......'' فاروق جملہ ادھورہ چھوڑ کر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

مجھے اس کی ذہنیت سے نفرت تھی۔ کچھ لوگ صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ حالانکہ میں اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری تو خیر سوچیں ہی مختلف تھیں۔ اور حیران کن بات یہ تھی کہ عام زندگی میں بھی مجھے ایسے ہی واقعات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جو عام واقعات نہیں ہوتے تھے۔ اس کے الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا۔

بھنبھوری...... خون کا غسل...... یہ ساری باتیں بے مقصد نہیں تھیں۔ اسے قید رکھا گیا تھا۔ یقینی طور پر اس نے کوئی ایسا منظر دیکھا ہوگا۔ جس کی بناء پر اسکے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوا۔ نجانے کس کی اولاد تھی۔ نجانے کون تھی...... میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اور بالآخر مجھے نیند آگئی۔

دوسری صبح خوب دیر تک سویا تھا۔ جاگا تو فاروق نظر نہیں آیا۔ کھڑکی پر نگاہ پڑی۔ املی کے درختوں کو دیکھا۔ رات کا سارا منظر نگاہوں میں اجاگر ہوگیا۔ ہڑبڑا کر اٹھا اور کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ زمین کھڑکی سے زیادہ نیچے نہیں تھی۔ لڑکی کا خیال مسلسل ذہن میں آرہا تھا کہ بس خوف زدہ ہوکر وہ دوبارہ کسی املی کے درخت پر تو نہیں جا بیٹھی جائزہ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نیچے اتر کر املی کے اس درخت کے پاس پہنچ گیا۔ جس سے میں نے اسے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ زمین پر کچھ قدموں کے نشانات بنے ہوئے تھے۔ وہ ننگے پاؤں ہی تھی۔ اور اس کے پیروں کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔ اگر وہ کوئی دھوکا ہوتی کوئی بری روح ہوتی تو قدموں کے یہ نشانات یہاں نہ ملتے۔ میں ان نشانات کی کھوج کرنے لگا۔ نشانات درخت سے کھڑکی تک آئے تھے۔ اور اس کے بعد جب وہ واپس کھڑکی سے لوٹی تھی تو وہ زیادہ گہرے تھے۔ میں ان کا جائزہ لیتا ہوا۔ آگے بڑھتا رہا لیکن پھر تھوڑے بہت نشانات اس پر ہوں گے تو ہوا نے انہیں مٹا دیا تھا۔ املی کے بہت سے درخت یہاں موجود تھے۔ جن کی شاخیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ میں بھرپور نگاہوں سے ان شاخوں کے درمیان جھانکنے لگا۔ ایک درخت کے نیچے پہنچا۔ آوازیں بھی دیتا رہا۔ پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر واپس آیا۔ مجھے اس سلسلے میں مکمل طور پر مایوسی ہی ہوئی تھی۔ ابھی واپس کھڑکی کے نزدیک نہیں پہنچا تھا۔ کہ فاروق کی آواز سنائی دی۔

''لو...... تم بھی وہی کررہے ہو جو میں دو گھنٹے تک کرچکا ہوں۔''

''نہیں بھائی اب وہ املی کے کسی درخت پر نہیں ہے۔ اس عمارت سے بھاگ چکی ہے۔''

''میں نے کسی قدر شرمندہ سے انداز میں فاروق کی صورت دیکھی۔ اور گردن جھٹک کر بولا۔ ''بہر طور میں اس کے لئے غم زدہ ہوں۔''

''غم زدہ تو ہم بھی ہیں پیارے بھائی، مگر اب کیا کیا جائے۔ آؤ۔ اندر آؤ۔ ناشتہ بالکل ٹھنڈا ہوچکا ہے۔ میں نے بھی تمہاری وجہ سے ناشتا نہیں کیا۔ بہت دیر سے رکھا ہوا ہے۔'' کھڑکی ہی کے راستے ہم دونوں اندر آئے تھے۔ اور پھر فاروق نے ناشتے کی ٹرے اٹھا کر آگے رکھ لی۔ چائے وغیرہ بھی موجود تھی۔ جواب اتنی گرم نہیں رہی تھی۔ لیکن ہم نے وہ ٹھنڈی چائے ہی پی لی۔

میں نے چونکہ فاروق سے رانی کے بارے میں پوچھا تھا۔ تو فاروق نے بتایا کہ وہ محل جاچکا ہے اور ساری باتیں کرکے ہی واپس آیا ہے۔

''بھوج گڑھی کیسی جگہ ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''بس بہت بڑا شہر نہیں ہے۔ پھر بھی اچھی خاصی آبادی ہے۔ ذرا ان معاملات سے نمٹ لیں۔ پھر ایک دو دن گھومیں گے۔''

رانی رام رتی سے ملاقات کے بعد ہی فرصت ہوسکے گی۔''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔''

''جادو ٹونوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔'' میں نے پوچھ ہی لیا۔

''کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ حالانکہ لوگ طرح طرح کی کہانیاں سناتے ہیں کوئی ان حسین چڑیلوں کی داستانیں سناتا ہے۔ جو راہ گیروں پر عاشق ہوجاتی ہیں۔ اور راہ گیروں کے عیش ہوجاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ بارہا۔ ویرانوں میں ان چڑیلوں کی تلاش میں نکلے۔ لیکن اتنے بدقسمت ہیں کہ وہ بھی ہمیں دیکھ کر بھاگ جاتی ہیں۔ پر تم نے یہ سوال کیوں کیا۔ رات کی لڑکی پر شک کررہے ہو؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ویسے وہ املی کے

درخت سے اتری تھی۔"

"کیا؟" فاروق نے چونک کر کہا۔

"ہاں، رات کو پوری کہانی میں تمہیں نہ سنا سکا تھا۔ رات کو میری آنکھ کھل گئی تھی۔ اور پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ کہ میں نے اسے املی کے درخت سے اترتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کے بعد وہ کھڑکی سے اندر آ گئی۔"

"ڈرا رہے ہو؟" فاروق نے خوف زدہ سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ اور مجھے ہنسی آ گئی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"اماں قسم کھاؤ۔ کیا وہ چڑیل تھی؟" فاروق نے پرخوف لہجے میں پوچھا۔

"نہیں فاروق صاحب چڑیل تو بالکل نہیں تھی وہ۔"

"ہاں۔ ہو تو نہیں سکتی۔ ہم...... مگر ہمیں چڑیلوں کا تجربہ بھی تو نہیں ہے۔"

"ابے نکلو یار یہاں سے تم نے تو واقعی خوف زدہ کر دیا۔ ویسے یہ گھر بھوت گھر معلوم ہوتا ہے۔ ٹوٹا پھوٹا اے...... لاحول ولاقوۃ۔ کس خوف کا شکار کر دیا۔ آؤ باہر بیٹھیں۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ "اور اگر بھوت یہ ساز و سامان لے کر چلے گئے۔ تو مصیبت نہیں ہو جائے گی؟"

"بھئی میں سچ بتا رہا ہوں۔ اب مجھے اس ویران جگہ سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اور مجھے مزید خوف زدہ نہ کرو۔ تم۔ اور اگر رات کو وہ ہمارے کمرے میں رہ جاتی تو؟"

"تو مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بھوتنی ہے۔ کم بخت! سنا ہے۔ بھوتنیاں اور چڑیلیں ایسے ہی درختوں پر بسیرا کرتی ہیں۔ ارے باپ رے۔ میں تو تم سے پہلے اسے املی کے درختوں پر تلاش کرتا پھرتا رہا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ کہیں وہ شاخ پر سو نہ رہی ہو۔ پتہ نہیں کس سے خوف زدہ تھی۔"

کوئی بات نہیں ہوئی تم سے......"

"نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ بھوکی تھی بیچاری میں نے باتیں کرنے کی کوشش کی تو جھلا گئی کہنے لگی کہ میں بھوکی ہوں اور مجھ سے بولا نہیں جا رہا۔ اور تم سوال ہی سوال کیے جا رہے ہو۔"

"تو پھر چڑیل نہیں ہو گی استاد، بھلا ان بھوت پریتوں کو کھانے پینے سے کیا دلچسپی اور اگر ہو بھی تو ان کے لئے مشکل کیا ہے۔ جہاں سے جو دل چاہے حاصل کر لیں۔"

"ارے باپ رے باپ، پتہ نہیں یہ کمبخت...... کب واپس آئے گا۔ آؤ کم از کم دروازے پر تو بیٹھتے ہیں اس قسم کی باتوں میں خوف کا کیا تعلق۔ ہمارا ایجنٹ بھی ساڑھے بارہ بجے کے قریب آیا تھا۔ اور کھانے پینے کا انتظام کر کے لایا تھا۔

"جیتے رہو۔ میرے لال جیتے رہو۔ کم از کم کام کی باتیں کر کے آئے ہو۔ چلو یہ کھانے کا بنڈل مجھے دے دو۔ ہمارے لئے لائے ہو ناں؟"

"ہاں...... میں تو محل میں کھا کر آیا ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ ابھی سے کھا بھی لیا۔" فاروق نے کہا۔

"ان لوگوں نے مجبور کر دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ کھانا کھا کر جاؤ۔"

"اچھا ملاقات ہو گئی ان لوگوں سے؟"

"ہاں۔ پہلی کوشش میں ہی ملاقات ہو گئی۔ ساڑھے چار بجے ہمیں محل پہنچ جانا ہے۔" مع سامان، پھر دیوان جی کی نگرانی میں ساڑھیاں سجائی ہوں گی۔ پھر شام کو۔ ساڑھے چھ بجے ان کا جائزہ لیں گی۔ اور اپنی رائے کا اظہار کریں گی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے کام آج ہی ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

یار شرما! اس گھر کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمارے ٹھہرنے کے لئے اگر پھر بھی اس گھر میں ٹھہرنا پڑا تو کم از کم میں تو نہیں رکنے کا۔ واپس چلا جاؤں گا۔"

"کیوں اس گھر میں کیا ہو گیا۔" شرما نے فاروق کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا رات کو ہمارے گھر میں سوتا تو پتہ چلتا کہ اس گھر میں کیا ہو گیا ہے۔ چڑیلیں گھس آئی ہیں املی کے درختوں سے نیچے اتر کر۔" فاروق نے کہا

خیر دیکھا جائے گا۔ ہم تو ویسے بھی چڑیلوں سے خاصی انسیت رکھتے ہیں۔" فاروق نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری۔ لیکن میں نے اس کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔

اس لڑکی کی بے بسی کا احساس اس وقت بھی میرے دل میں موجود تھا۔ بے چاری کھانا بھی نہیں کھا سکی تھی۔ اور اسے خوف زدہ ہو کر بھاگنا پڑا تھا۔ نجانے کیا قصہ تھا۔

ساڑھے چار بجے سب لوگ تیار ہو گئے۔ سامان بڑی خوب صورتی سے پیک کیا گیا۔ اور ہم اسے لئے ہوئے محل کی طرف چل پڑے۔ زمانہ قدیم میں محلوں کا کیا تصور ہوتا ہو گا۔ وہ ایک الگ بات تھی۔ مگر میں نے محل وغیرہ کم ہی دیکھے تھے۔ یہ محل بھی محل کیا تھا۔ البتہ اسے ایک حویلی کہا جا سکتا تھا۔ وہی پرانے طرز کی تعمیر کی ہوئی عمارت بہت خوب صورت اور صاف ستھری۔ ملازمین وغیرہ بھی زیادہ تھے۔ ویسے یہ سچ تھا کہ بے شک ریاستیں وغیرہ ختم ہو گئی تھیں۔ لیکن ان کی باقیات آج بھی اسی شان و شوکت کی حامل تھی۔ حویلی میں ملازموں کی پوری فوج موجود تھی۔ ہمیں فوراً ہی خوش آمدید کہا گیا۔ ملازمین نے ہمارا سامان اٹھا لیا۔ اور اس کے بعد ایک بہت ہی خوب صورت ہال میں پہنچا دیا گیا۔ گہرے سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر بھی بہت ہی خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں۔ سنگی مجسمے سجے ہوئے تھے۔ قد آدم تصویریں یقینی طور پر اس خاندان کے پرانے لوگوں کی تھیں۔

میں نے گہری نظروں سے پہلے محل کا جائزہ لیا۔ لیکن شرما جی کے اشارے پر ہم لوگ جلدی جلدی اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ محل کے بڑے لوگ ابھی ہمارے پاس نہیں آئے تھے۔ لیکن اس وقت ہم ساڑھیوں کو بڑے خوب صورت انداز میں سجا رہے تھے۔ دروازہ کھلا اور کچھ افراد اندر آ گئے۔

فاروق نے انہیں گردن خم کر کے تعظیم دی۔ میں اپنے کاموں میں مصروف رہا۔ فاروق مسلسل میرا ساتھ دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا۔

"حضور والا! ہم آپ کے حکم کے مطابق وقت پر پہنچ گئے ہیں۔ میں نے رانی صاحبہ سے بات کر لی ہے۔ وہ بس شام کو ساڑھے چھ بجے یہاں پہنچ جائیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"میں نے اس آواز کو سن کر گردن گھمائی۔ اور اتفاق سے اس وقت آنے والے نے میری طرف دیکھا۔ کوئی بڑی شخصیت ہی تھا۔ بالکل کالی رنگت۔ اتنا کالا کہ شاید اندھیرے میں بھی نظر نہ آئے۔ بڑی بڑی مونچھیں جو اس کے رخساروں سے بھی نکلی ہوئی تھیں۔ بہت خاص قسم کا لباس پہنے ہوئے۔ آنکھیں گہرے سیاہ چہرے پر بالکل سفید نظر آ رہی تھیں۔ لیکن چہرہ پر رعب اس نے مجھے دیکھا۔ اور دفعتاً میں نے اس کے چہرے پر ایک تغیر محسوس کیا۔ اس کی تیز آنکھیں میرا جائزہ لینے لگیں۔ ایک نگاہ دیکھنے کے بعد میں پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ لیکن دماغ میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی۔ اس کے چہرے پر چونکنے کا سا انداز تھا۔ نجانے کیوں۔ نجانے کیوں۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ بلکہ خاموشی سے ہمیں کام کرتے دیکھتا رہا۔ البتہ شرما جی سے فاروق کی مسلسل باتیں ہو رہی تھیں۔

مہاراج۔ آپ بھی ایک نظر ڈال لیں۔ اور ذرا ہمیں بتائیں گے کہ ہم نے جو محنت کی ہے۔ وہ رانی صاحبہ کو پسند آئے گی یا نہیں؟"

"یہ میرا کام نہیں ہے۔ تم اپنا کام خاموشی سے کرو۔ اس کی آواز بھی بڑی بھرپور تھی۔"

میں نے اپنے کام سے فراغت حاصل کر کے ایک بار پھر اس شخص کو دیکھا اور مجھے پھر اسی کیفیت کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں شک کے سے تاثرات

تھے۔ ویسے کالا رنگ ہونے کے باوجود اسے بھیانک شکل کا مالک نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لیکن نجانے کیوں وہ مجھے عجیب سا لگا تھا۔

جب ہم نے اپنا کام کرلیا تو وہ کہنے لگے۔

"اب تم باہر جا کر آرام سے بیٹھو ابھی کچھ کام باقی ہے؟"

"آپ کا جو حکم مہاراج جیسا آپ کہیں ویسا کریں گے۔" شرما جی نے کہا۔

"تو پھر آؤ باہر آ جاؤ۔ میں یہاں تالا لگوائے دیتا ہوں۔ تم بیٹھو۔ کھاؤ پیو۔ اور اس کے بعد ٹھیک ساڑھے چھ بجے رانی رام رتی یہاں پہنچ جائیں گی۔"

"ہمارا کام ختم ہوگیا تھا۔ چنانچہ ہم تینوں باہر نکل آئے۔ اس شخص نے ملازمین کو حکم دیا کہ ہمیں آرام سے بٹھایا جائے اور ہماری خاطر مدارت کی جائے۔"

جس کمرے میں یہ سامان سجایا گیا تھا۔ وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک جگہ ہم بیٹھ گئے اور ملازمین نے ہمارے سامنے پھل وغیرہ لاکر رکھ دیئے۔" فاروق نے کہا۔

"کہو لطف آ رہا ہے یا نہیں؟" میں نے چونک کر فاروق کو دیکھا۔ اور پھر آہستہ سے کہا۔

"یہ خوف ناک شخص کون تھا؟"

"صورت سے نہیں لگتا تھا۔" فاروق نے ہنس کر کہا۔ شرما جی ہنس کر بولے۔

"نہیں مہاراج ایسی باتیں نہ کہیں اگر کسی کے کانوں تک پہنچ گئیں۔ تو شامت آ جائے گی ہماری۔"

"بے شک یہ ریاستیں نہیں رہیں اب لیکن ان لوگوں کی شان وشوکت وہی ہے۔ ذرا سی دیر میں گردنیں اتروا دیا کرتے ہیں۔ وہ بھیم چند مہاراج ہیں۔ ویسے یہ سمجھ لو میرے دوست کہ ان کا نام ان کی پیدائش کے بعد ہی رکھا گیا ہوگا۔"

"ظاہر ہے نام پیدائش کے بعد ہی رکھے جاتے ہیں۔ لیکن سوچنے والوں کو ذرا دقت پیش نہیں آتی ہوگی۔ ان کی شکل دیکھی اور فوراً ہی بھیم چند کا تصور ذہن میں آ پہنچا۔ سو بھیم مہاراج۔ بھیم چند بن گئے۔"

"تمہاری مرضی ہے۔ جو دل چاہے کہے جاؤ۔ اپنی بات کے ذمے دار تم خود ہوگے۔" شرما جی پھر بولے۔

"اب یہاں کون سن رہا ہے۔ تیری تو جان ہی نکلی جا رہی ہے۔" فاروق نے کہا۔

"لیکن اس کا اندازہ چونکتا ہوا کیوں تھا۔ وہ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے میری ذات پر کوئی شک ہو مگر فاروق سے اس بارے میں کیا کہنا تھا۔ ویسے بھی وہ غیر سنجیدہ اور لاابالی سا آدمی تھا۔

رانی رام رتی کو ساڑھے چھ بجے ہی آنا تھا۔ مگر پورے چھ بجے آ گئیں۔ ملازم ہمارے پاس دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ اور انہوں نے کہا۔ "ہوشیار ہو جاؤ۔ رانی جی آ رہی ہیں۔"

کئی افراد تھے اور ان کے بیچ رانی رام رتی آ رہی تھی۔ میں بھی شرما جی اور فاروق علی کے ساتھ کھڑا ہو کر ان کی شان وشوکت کو دیکھنے لگا۔ کچھ خادمائیں، کچھ ملازمین، اور ساتھ میں بھیم چند بھی تھا۔ جو الگ ہی نظر آ رہا تھا۔

رانی رام رتی۔ دراز قد اور نہایت خوب صورت تھی۔ سرخ وسفید، سیب جیسی رنگت، بال گھٹاؤں جیسے اتنے کہ یقین نہ آئے۔ چہرے پر ایک انوکھا بانکپن اور آنکھوں میں بجلیاں سی کوندتی ہوئی۔ بڑے وقار سے ایک ایک قدم رکھتی ہوئی وہ آگے آئی اور میں نے محسوس کیا کہ بھیم چند آہستہ آہستہ کچھ بدبدا رہا ہے۔ جس کے جواب میں رانی نے خصوصاً مجھے دیکھا۔ پھر اس کی نظریں میرے ہی چہرے پر گڑی رہی تھیں۔ اور مجھے یوں لگا تھا۔ جیسے کچھ انگلیاں میرے چہرے کو ٹٹول رہی ہوں۔

بے اختیار جی چاہا کہ چہرہ ٹٹول کر دیکھوں۔ لیکن پھر خود کو سنبھال لیا۔ وہ بالکل قریب آ گئی۔ اور میں نے اس سے نظریں ملائیں۔ اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگا دیئے۔ اس کی پرشوق نظریں

مسلسل میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

بھیم چند نے کہا۔ "دروازہ کھولوں" ساتھ آنے والوں نے دروازہ کھول دیا۔ رانی رام رتی جیسے سنبھل گئی۔ پھر پہلے وہ، اور پھر اس کے بعد ہم سب اندر داخل ہوگئے۔ رانی ہماری لائی ساڑھیاں دیکھنے لگی۔ مگر اس کے انداز میں لاپرواہی تھی۔ وہ بار بار میری طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"تمام ساڑھیاں بہت اچھی ہیں۔ بڑی خوب صورت ہیں۔ ہمیں پسند آئیں۔" دیوان جی ہمیں تمام ساڑھیاں پسند آئیں ان سب کو سنبھال کر رکھوا دو۔ اور تاجروں کو ان کی منہ مانگی قیمت ادا کر دو۔" رانی رام رتی نے بھیم چند کی جانب انگلی اٹھا کر کہا اور بھیم چند دونوں ہاتھ جوڑ کر جھک گیا۔ اور بولا۔

"جی رانی جی۔"

"یہ لوگ بہت اچھی ساڑھیاں بناتے ہیں۔ میں ان سے کچھ اور کام کرانا چاہتی ہوں۔ اور اس کام کے ڈیزائن بنوا کر میں ان کے حوالے کرنے کی خواہش مند ہوں۔ تم لوگ ساڑھیوں کی قیمت اور اپنا انعام وصول کرو۔ ان میں سے ایک آدمی کو میرے پاس چھوڑ دو۔ وہ یہاں ہمارا مہمان رہے گا۔ اور بعد میں ہمارا نیا حکم لے کر واپس پہنچے گا۔ اس کے لئے یہیں قیام کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ رام رتی نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور بھیم چند ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر جھک گیا۔

"جو حکم رانی جی۔"

رام رتی فوراً ہی گھومی اور پلٹ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس کا حکم آخری حکم تھا۔ اور اس میں کسی بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن میں ساکت رہ گیا تھا۔

بھیم چند نے ہم تینوں سے کہا۔ تم لوگ احتیاط کے ساتھ یہ ساڑھیاں پیک کر دو۔ اور تم میں سے ایک ذمے دار میرے ساتھ چلے اور ان کی قیمتوں کی بات کرکے مجھ سے رقم لے لو۔ آؤ..... تم دونوں براہ کرم یہ کام کر ڈالو۔ بھیم چند، شرما جی کو لے کر باہر نکل گیا۔

اور فاروق علی نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ "یار یوں سمجھ لو کہ تقدیر چمک گئی۔ ہمارے صاحب تو اتنے خوش ہوں گے کہ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ مگر یہ شرما۔ کمینہ اپنی کوششوں کی قیمت کیا مانگے گا۔ یار کہیں یہ گڑبڑ نہ کر جائے..... کیا اسے ان کی قیمتوں کا اندازہ نہیں ہے۔"

"خیر ایسی بات نہیں ہے۔ آدمی تو بہت سیانا ہے۔ اور مجھ سے زیادہ کاروباری گر جانتا ہے۔ بنیئے کی اولاد ہے اور تم جانتے ہو کہ بنیئے کتنے تیز ہوتے ہیں لیکن کہیں بیچ میں ٹانکا نہ لگا جائے۔ چلو اسے بھی سنبھال لیں گے۔ ویسے اسے قیمتیں معلوم ہیں۔ وہ ہمارا مستقل ایجنٹ ہے۔ یہ بات تو اپنی جگہ یار یہ ساڑھیاں اٹھواؤ۔ دیر کرنا مناسب نہ ہوگا۔" اور فاروق میرے ساتھ ساڑھیاں اٹھوانے میں مصروف ہوگیا پھر بولا۔

"ہاں..... تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ سب کچھ جو ہے سو ہے۔ مگر تم نے رانی رام رتی کی نظروں میں کچھ محسوس کیا؟"

"کیا.....؟" ..... میں نے سوال کیا۔

"ساڑھیاں کم دیکھ رہی تھی۔ تمہیں زیادہ دیکھ رہی تھی۔" فاروق آنکھ دبا کر بولا۔

"بے کار باتیں ہیں۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ اور فاروق قہقہہ لگا کر ہنس پڑا پھر بولا۔

"نہیں بھائی یہ رانیاں، ایسی ہی ہوتی ہیں کسی کی تقدیر ساتھ دے جائے تو سمجھ لو کہ وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اب جب تم واپس آؤ گے تو نجانے کیا بن کر آؤ گے۔"

"فاروق میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔"

"ارے باپ رے باپ کیسی خوف ناک باتیں کر رہے ہو۔ بھلا رام رتی کا حکم ہو اور اس کی تعمیل نہ ہو۔ انہوں نے پوچھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کہ تم رہنا چاہتے ہو یا نہیں پھر حماقت کی باتیں مت کرو۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ کہ راج محلوں کی کہانیاں ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ اور تقدیر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ ہو سکتا

ہے کہ یہ میری غلط فہمی ہی ہو۔ لیکن چانس لینے میں کیا حرج ہے۔"

"یہ نہیں ہوسکتا فاروق کہ تم یہاں رک جاؤ۔"

"کاش! ایسا ہوسکتا، مگر جسے پیا چاہے۔ وہی سہاگن۔ بھلا کون پوچھتا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ بہر طور تمہیں رکنا ہوگا۔"

"......بس ذرا احتیاط رکھنا۔ بس ان کے دماغ پھرے ہوئے ہوتے ہیں دولت اچھے اچھوں کا ستیاناس کردیتی ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اس دنیا کا باسی نہیں سمجھتے بس تھوڑی سی احتیاط اور بہادری کے احکامات کی تعمیل اور پھر یار یہ تو خوش بختی ہے کتنی حسین ہیں وہ عمر کتنی ہی ہو۔ لیکن کیا شان ہے۔ کیا انداز ہے۔ دیکھنے دکھانے کی چیز ہیں۔ چلو بھیا عیش کرو۔ ہماری طرف سے پیشگی مبارکباد۔" میں الجھا ہوا تھا۔

"ویسے تو مجھے کوئی خاص پریشانی نہیں تھی۔ ظاہر ہے رانی مجھے لقمہ تر سمجھ کر نگل تو نہیں جائیں گی۔ لیکن بس ایک الجھن تھی۔ ایسی کیا بات پائی ہے۔ انہوں نے مجھ میں اور بات اگر رانی ہی کی ہوتی تو چلو مان لیتا کہ فاروق کا کہنا درست ہے۔ لیکن اس سے پہلے بھیم چند نے بھی مجھے چونک کر دیکھا تھا۔ "کیوں...... آخر کیوں؟"

کام ختم ہوگیا بھیم چند اور دوسرے لوگ چلے گئے۔ بھیم چند نے مجھے محل کے خادموں کے حوالے کردیا۔ حویلی یا محل کے بغلی حصے میں بنے ہوئے مہمان خانے میں مجھے جگہ دی گئی تھی۔ ہر طرح کا خیال رکھا گیا۔ پھل سبزیاں وغیرہ کھانے میں دی گئیں۔ میرے ذہن میں بہت سے خیالات تھے۔ مگر بے سکونی نہیں تھی۔

رات خوشگوار گزری دوسرا دن بھی گزر گیا۔ کوئی ایسی بات نہ ہوئی جو قابل ذکر ہو۔ شام کو ایک ملازم آیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کشمیرلال والے کے آدمی ہوناں؟"

"جی میں ہی ہوں۔"

"رانی رام رتی تمہیں کچھ ڈیزائن دینا چاہتی ہیں بہت بڑا کام ہوگا۔ تمہیں اس کے لئے کئی دن رکنا پڑے گا۔" کوئی جلدی تو نہیں ہے تمہیں؟ تم جب سے آئے ہو۔ اندر گھسے رہتے ہو۔ تم مہمان ہو۔ قیدی نہیں محل بہت بڑا ہے۔ گھومو پھرو اس جگہ رہنا پسند نہ ہو تو جہاں چاہو بندوبست کردیا جائے گا۔

"نہیں جناب! مجھے یہاں ہر طرح کا آرام ہے۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"زاہد خان۔"

"ایں۔" وہ بری طرح چونکا۔

"زاہد خان۔" میں نے دوبارہ اسے اپنا نام بتایا۔

اس کے چہرے پر شک کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ پھر وہ بولا۔

"مسلمان ہو؟"

"جی بالکل۔"

"اچھا۔" وہ حیرت سے بولا۔ پھر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم واپس پلٹ آیا۔ کچھ سوچ کر دروازے میں رکا۔ میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

"یہاں داسیاں...... باندیاں بھی بہت سی ہیں۔ کسی کو کسی سے ملنے پر پابندی نہیں۔ ہنسی خوشی لمحے گزارو۔ تم رام رتی کے مہمان ہو۔ ایرے، غیرے کے نہیں۔ میں تمہارے پاس پونم کو بھیجتا ہوں تمہیں پسند آئے گی۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

میں دروازے کو گھورتا رہا۔ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کچھ دیر کے بعد دروازے سے ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ بڑا جاذب نظر چہرہ تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولی۔

"میرا نام پونم ہے۔"

"جی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیسی ہوں؟" وہ شوخی سے بولی۔

"جی۔" میری گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ یہ سوال میرے لئے غیر متوقع تھا۔

شہرِوحشت

ایم اے راحت

قسط نمبر:06

رات کا گھٹا ٹوپ اندھرا، پرہول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دھشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکرائو، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

میں تعجب بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اپنی اداؤں سے مجھے لبھانے کی کوشش کررہی تھی۔ فاروق کے ساتھ تھوڑی سی دلچسپ باتیں کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں تھا۔ لیکن میں صاحب کردار تھا۔ اور نوجوانی کی عمر میں بھی میرے کردار پر کوئی داغ نہیں تھا۔ اب تو میں شادی شدہ اور بال بچے دار تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”جو کچھ تمہارے دل میں ہے۔ یا جو تمہاری آنکھوں سے ظاہر ہورہا ہے۔ اگر تم مجھے اس راستے پر لانا چاہتی ہو تو بی بی۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔“ پونم کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پھیل گئی۔ میرا خیال تھا کہ اس نے میرے ان الفاظ سے اپنی توہین محسوس کی ہوگی۔ لیکن اس کے چہرے پر غم کے آثار پھیل گئے تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

”بری جگہ آپھنسے ہو۔ ہوسکے تو یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کرو۔ ورنہ ساری عمر نکل نہیں پاؤ گے۔“ اس کے ان الفاظ پر میں نے کسی قدر دہشت زدہ ہوکر اسے دیکھا۔

”کیا کہہ رہی ہو تم؟“

”میں جو کچھ کہہ رہی ہوں۔ بس یوں سمجھ لو کہ تم سے متاثر ہوکر کہہ رہی ہوں بہت کم لوگ اس طرح کے ہوتے ہیں جو کسی کو دیکھ کر اپنے آپ کو ایک باکردار انسان کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ اور کچھ نہیں کہوں گی اپنے بارے میں بس یوں سمجھ لو۔ کہ لٹی پٹی ہوں۔ زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے مجھے چنانچہ اگر تمہارے معاملے میں یہ بات کرنے کی مجھے اگر کوئی سزا بھی ملی۔ تو اب مجھے پرواہ نہیں ہے۔ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا۔ اب میں چلتی ہوں۔“ وہ تو چلی گئی۔ لیکن میرے لئے خوف ہی خوف چھوڑ گئی تھی۔ فاروق بھی جاچکا تھا۔ اور اب میں یہاں اکیلا رہ گیا تھا۔

دوسرے ہی دن میں نے شور مچانا شروع کردیا۔ اور کہا کہ ”میری واپسی بہت ضروری ہے۔ اگر رام رتی صاحبہ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتی ہیں تو اس کے لئے جلدی کریں۔ ورنہ میں چلا جاؤں گا۔“ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ کہ ایک منحوس سی شکل کا آدمی میرے پاس آیا۔ پتہ نہیں اس کے دانت ہی بڑے تھے۔ یا وہ اس وقت مجھے دیکھ کر مسکرارہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ اس نے کہا۔

”میرا نام رمھو ہے...... رمھو...... اور میں مہارانی

جی کے خاص داسوں میں سے ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم یہاں سے جانے کی جلدی کر رہے ہو۔"

"یار! میں تم لوگوں کا ملازم تو نہیں ہوں۔ میں تو صرف ڈیزائن لینے کیلئے رک گیا تھا۔ ورنہ میرا تو فاروق کے ساتھ ہی چلے جانا ٹھیک تھا۔"

"اب رک ہی گئے ہو تو یہاں سے کچھ لے کر جاؤ......" رمھو نے پھر عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے کی شیطنیت کا مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔

"بس تھوڑا سا انتظار اور کرلو۔ وہ جلد ہی تمہیں بلانے والی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ لیکن میرے لئے ایک عجیب سی کیفیت چھوڑ گیا تھا۔ نجانے کیوں اب مجھے یہاں سخت دہشت محسوس ہونے لگی تھی۔ مجھے لگتا تھا جیسے آنے والے بھیانک واقعات میرا انتظار کر رہے ہوں۔

تھوڑا وقت گزر گیا۔ پھر وہی شخص دوبارہ میرے پاس آیا۔ جس کا نام رمھو تھا۔

"چلئے۔ آپ کو بلایا گیا ہے۔" اس نے کہا اس وقت بھی وہ مسکرا رہا تھا۔ مجھے ایک دم سے اس سے نفرت کا احساس ہوا۔ دل تو چاہا کہ ایک زوردار گھونسہ اس کے منہ پر رسید کروں۔ اور اس کے یہ دانت اندر کردوں۔ لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ بہت سے خوب صورت راستوں سے گزرتا ہوا، آخرکار ایک ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں رانی رام رتی ایک چوڑی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ شاندار حویلی کا یہ حصہ اپنی مثال آپ تھا۔ بڑے سے دروازے کو کھول کر اس شخص نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اور میں اندر داخل ہوگیا۔ انتہائی شاندار فرنیچر سے آراستہ کمرہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کرسی پر رانی رام رتی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ لاکھوں روپے کی مالیت کی ہوگی۔ اس کے بدن پر ایک نہایت قیمتی ساڑی تھی۔ اور چہرے پر رانیوں جیسی تمکنت۔ اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"آؤ......رک کیوں گئے؟ رمھو ہمارے مہمان کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں رانی جی۔ ہم نے ان کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔"

"ان کی خاطر مدارت بھی کی؟"

"ہاں......"

"ٹھیک ہے جاؤ۔" رانی نے کہا۔ اور رمھو باہر نکل گیا۔ تب رام رتی نے مجھے دیکھا اور بولی۔

"ہاں......مہاراج اب آپ مجھے بتلایئے۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ میں نے آپ کی سیوا کیلئے ایک لڑکی پونم کو بھیجا تھا۔ سنا ہے آپ نے اسے کوئی حیثیت نہیں دی۔"

"دیکھئے رانی رام رتی جی! میں ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ شادی شدہ اور بال بچوں والا۔ اور پھر یہاں میں اپنی دکان کے سلسلے میں آیا ہوں۔ آپ مجھے ڈیزائن دیجئے......میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"نہیں......نہیں ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ تم ہمارے لئے بڑے قیمتی ہو۔ اصل میں، میں تمہیں اپنے بارے میں پوری تفصیل بتاتی ہوں۔ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ میرے پتا جی! ایک بہت بڑے مہان جوتشی تھے۔ اور میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پتا جی چاہتے تھے کہ میں۔ راج نگر کی رانی بنوں۔ عیش، آرام کا جیون بیتاؤں۔ انہوں نے میری کنڈلی بنائی تھی پر اپنی جوتشی ودیا سے کام لے کر انہوں نے اس کنڈلی میں کچھ ایسی تبدیلیاں کیں۔ جن سے میرے جیون کا رخ ہی بدل گیا......میرے لئے نجانے کیا کیا جتن کئے گئے۔

ایک بار میں ماتا پتا کے ساتھ جنگل سے گزر رہی تھی کہ راستے میں بارش ہوگئی۔ بڑی تیز بارش۔ پتا جی کو آگے بڑھنے سے رکنا پڑا ہماری بیل گاڑی آخرکار ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں ایک ٹوٹا پھوٹا مندر تھا۔ مگر یہ مندر نہیں تھا بلکہ ایک سادھو کا مٹھ تھا۔ اور اندر ایک ایسا بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے سر کے بال بڑھ بڑھ کر زمین تک آ گئے تھے۔ اور ان کے سرے مٹی میں گم ہوگئے تھے۔ داڑھی اور مونچھیں گود میں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ آسن جمائے بیٹھا ہوا تھا۔ تم اسے دیکھ کر ڈر گئے۔ اس نے اپنی لال، لال آنکھیں کھولیں، اور اس کے منہ سے بادلوں جیسی گرجتی ہوئی آواز نکلی۔

"تو آ گئی۔ رام رتی۔ میں تیرے لئے ہی ہزار سال سے جیتا ہوں اور اب میرا جیون آخری سانسیں لے رہا ہے۔ میں نے اب تک جو تپسیا کی ہے اسے میں تیرے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے ہمت سے کام لیا۔ تو سمجھ لے سنسار تیرے چرنوں میں ہوگا۔ تو جو چاہے گی وہ کر سکے گی۔ جتنا میں تجھے دے رہا ہوں۔ اسے آگے لے جانا تیرا کام ہوگا۔ اور اس کے لئے تجھے ایک آخری جاپ کرنا پڑے گا۔"

دیکھو! کیا نام بتاتے ہو تم اپنا......زاہد خان......زاہد خان......، اگر تمہیں زاہد خان کے بجائے کرن جوت کہہ لیا جائے تو کیا حرج ہوگا۔ لیکن کرن جوت بن کر جو شکتی تمہیں ملے گی۔ اس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

حضرت۔ میں آپکو کیا بتاؤں......آپ یوں سمجھ لیجئے کہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ اپنی دھن میں کہے جارہی تھی۔

"ہاں تو میں تمہیں بتارہی تھی کہ اس کے بعد میری تقدیر کے ستارے چمکتے رہے۔ یہاں تک کہ میں بھوج گڑھی کی رانی بن گئی۔ بھوج گڑھی بہت بڑی ریاست ہے۔ اور ہم یہاں راجہ، رانیوں کی طرح جیون بیتا رہے ہیں۔ پر اگر ہم اپنی وہ شکتی حاصل کرلیں۔ تو پھر ہر مہان شکتی کے مالک ہوجائیں گے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ پورن ماشی کی رات کو۔ مجھے ایک جاپ کرنا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی جس سے تم مل چکے ہو۔ میرا گیان مجھے بہت کچھ بتاتا ہے۔ وہ میں نے اپنے اسی مقصد کیلئے رکھی ہوئی تھی۔ تمہیں یاد ہوگا۔ دو راتیں پہلے وہ تمہارے پاس پہنچی تھی۔ املی کے درخت سے نیچے اتر کر۔ اور اس نے تم سے مدد مانگی تھی۔ اور تم نے اسے کھانا کھلایا تھا۔" رام رتی مسکرائی اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ جادوگرنی اتنی گہری باتوں کو بھی جانتی تھی۔ تب اس نے کہا۔

"پورن ماشی کو تمہیں اپنے ہاتھوں سے اس کی گردن کاٹ کر اس کا خون پینا ہوگا۔ اور میرے ساتھ کچھ بول دہرانے ہوں گے۔ پورن ماشی تک تم ہمارے ساتھ رہو گے۔ اور جو کچھ میں تمہیں دوں گی۔ وہ تمہیں پینا پڑے گا۔ تمہارے دین دھرم میں وہ گندی چیز ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے لئے بڑی پوتر۔ سمجھے۔ میں اس کا نام نہیں لوں گی۔ یہ سمجھ لو کہ اس کے بارے میں تم جان جاؤ گے۔ تو تمہیں یہ سب کچھ پسند نہیں آئے گا۔"

"اب میں معافی چاہتا ہوں۔ رانی صاحبہ! نوکری کرتا ہوں۔ تھوڑے سے پیسے ملتے ہیں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں۔ اور خوش ہوں۔ آپ مجھے یہ بتایئے کہ مجھے کیا پڑی ہے۔ آپ کی یہ ساری باتیں ماننے کی۔"

"دیکھو......بھاگ کی بات ہے۔ تقدیر کس طرح تمہیں یہاں تک لے آئی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اور میں تمہیں یہ بتادوں۔ کہ مجھے تمہاری ہی ضرورت تھی۔ اگر میں تمہارے ماضی میں لوٹ جاؤں۔ تو وہ کچھ بتا سکتی ہوں کہ جو تمہیں بھی نہیں معلوم ہوگا۔ اپنے بارے میں۔ بس یوں سمجھ لو کہ تم میرے کام کی چیز ہو۔ اور میں تم سے وہ کام لینا چاہتی ہوں۔ اور تمہیں وہ کام کرنا پڑے گا۔"

"ایسے ہی کرنا پڑے گا۔ میں آج اور ابھی جانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں جاسکو گے۔ یہی تو تمہاری بدقسمتی ہے۔"

"کیسے روکو گی تم مجھے؟"

"ارے......ارے......ارے کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تم یہ بتاؤ کہ تم خوشی سے اس کام کیلئے تیار ہو یا نہیں۔"

"میں تھوکتا ہوں، تمہاری ہر طرح کی آسائشوں پر۔"

"ہوں یا......میں تو تمہیں اپنا داس بنا کر اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی پر۔ اب تم بھی ایک بات سن لو......جو کچھ بھی چاہو کرلو۔ اگر تم میرے ہاتھوں سے نکل بھی گئے۔

تو بھی سکون سے نہیں رہ سکو گے۔ چاہے کتنا ہی جیون گزر جائے تمہارا سمجھ رہے ہو ناں...... میری بات۔ رنگا سیہ...... رنگا سیہ مہاراج۔" اس نے پیچھے رخ کرکے آواز دی۔ اور دوسرے دروازے سے ایک انتہائی بھیانک شکل کا آدمی باہر نکل آیا۔ اس کا اوپری بدن ننگا تھا۔ دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ گردن میں ہڈیوں کی مالا پڑی ہوئی تھی۔ یہ ہڈیاں طرح طرح کے جانوروں کی تھیں جن کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ آگے آگیا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ اس نے گھٹنوں تک جھک کر کہا۔

"جے رام رتی...... کیا بات ہے؟"

"اسے دیکھیں مہاراج...... ذرا قریب سے دیکھیں۔" وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آگیا۔ اس کے بدن سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ میں نے نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ جس کا نام رنگا سیہ لیا گیا تھا۔ اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ اچانک ہی مجھے عجیب سی ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں رنگا سیہ کے پاس سے آئی تھیں۔ میں نے دیکھا۔ کہ اس کے گلے میں پڑی ہوئی کھوپڑیوں کے ہار کی تمام کھوپڑیاں ہنس رہی ہیں۔ ان کے منہ ہل رہے تھے۔ اور وہ اتنا بھیانک منظر تھا۔ کہ دیکھ کر دہشت سے دل کانپ جاتا تھا۔ رام رتی اور رنگا سیہ بدستور مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ میرے چہرے سے میری کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ رنگا سیہ اپنی خوفناک سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتا ہوا بولا۔

"ہاں۔ تو کیا کہتے ہو تم...... رام رتی کی باتیں مانو گے یا نہیں؟"

"کیا تم دونوں پاگل ہو؟ روکو مجھے۔ اگر روک سکتے ہو تو روکو۔"

"تم کہاں جا سکو گے...... کہاں جا سکو گے تم؟" اس نے خوفناک لہجے میں کہا۔ اور اپنی گردن سے کھوپڑیوں کا ہار اتار کر میری طرف اچھال دیا۔ میرے قدم اٹھ رہے تھے۔ ہار ایک دائرے کی شکل میں زمین پر پڑا۔ اس دوران میرا قدم اٹھ چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اچانک ہی وہ کھوپڑیاں میرے پیروں سے لپٹ گئی تھیں۔ انہوں نے میرے پیروں کو جکڑ لیا تھا۔ میں پوری قوت سے اوندھے منہ نیچے گرا۔ میرے پیٹ میں بڑی زور سے چوٹ لگی تھی۔ تھوڑی سی چوٹ منہ پر بھی لگی تھی۔ میں اپنے پیروں سے کھوپڑیوں کے اس ہار کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن گھناؤنی اور چمک دار کھوپڑیوں نے مجھے پوری طرح کس لیا تھا۔

پھر ایک گرد و غبار کا سا طوفان فضاء میں بلند ہوا۔ اور میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میری جدوجہد رک گئی۔ اور آہستہ آہستہ میرا بدن ساکت ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا۔ کہ میں ہوش و حواس کھوتا جا رہا ہوں۔

نجانے کب تک اس کیفیت کا شکار رہا۔ آہستہ آہستہ ہوش آگیا۔ اب میری آنکھیں صاف ستھری ہو گئی تھیں اور قرب و جوار میں اچھی طرح دیکھ سکتی تھیں۔ ایک عجیب و غریب ویران سی جگہ تھی بے پناہ خوفناک سوکھے ہوئے پتوں والے درخت جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر بدنما چٹانوں اور پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جس جگہ میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ وہاں سے زمین پر چند گز کے فاصلے پر ایک غار کا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ میں وحشت زدہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا...... اور پھر میری نگاہ اپنے پاس ہی پڑی۔ خوفناک کھوپڑیوں کا دائرہ مجھے اپنے حصار میں لئے ہوئے تھا۔

ان کھوپڑیوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں...... منہ ہل رہے تھے۔ اور میرا خون دہشت سے جمنے لگا تھا۔ پھر کچھ اور فاصلے پر نگاہ پہنچی۔ تو اُدھر کا منظر نظر آیا۔ تھوڑے فاصلے پر رنگا سیہ پتھر کی ایک چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک ہی مجھے یوں لگا۔ جیسے وہاں کوئی اور بھی ہو۔ تب میں نے غور سے ادھر دیکھا۔ اور پھر یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کہ یہ وہی لڑکی تھی۔ جو اس دن مہمان خانے میں املی کے درخت سے اتر کر ہمارے پاس آئی تھی۔ اس وقت وہ رسیوں سے بندھی ہوئی بیٹھی

ویران نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ رنگا سیہ نے جب دیکھا کہ مجھے ہوش آ گیا ہے اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا ہوں تو اس کے حلق سے ایک قہقہہ نکلا۔ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔

"ہاں...... مہاراج بتاؤ...... ہمارا کام کرنے کیلئے تیار ہو یا نہیں۔ یہ موجود ہے۔ اور آج رات پورن ماشی ہے۔ اگر آج تم اس کام کیلئے تیار نہ ہوئے تو پھر ایک مہینے انتظار کرنا پڑے گا۔ تم اپنا کام کر دو...... اور اس کے بعد تماشا دیکھو...... کہ تمہیں کیا شکتی مل جاتی ہے۔ پگلے مان لے...... ہماری بات۔ کیا سمجھا...... بس جو ہم کہہ رہے ہیں وہ کر لے۔ اس کی گردن کاٹ اور اس کا خون پی لے...... جب تو یہ کام کرے گا۔ تو پھر تو ہماری مہارانی رام رتی کا چہیتا ساتھی ہوگا۔ اور سنسار تیرے چرنوں میں ہوگا۔"

مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔

"الو کے پٹھے! تو کیا سمجھتا ہے۔ تیرے کہنے سے میں ایک انسانی جان لے سکتا ہوں۔ اور وہ بھی اس معصوم لڑکی کی جان جس سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تو یا تیری جادوگرنی مجھے کبھی اس کام کے لئے مجبور نہیں کر سکتی۔"

"مت بھول کے تو ہو چکا ہے۔ پاگل۔ پر تو وہ کھو رہا ہے۔ جس کے بارے میں اگر کسی کو بتا دیا جائے۔ تو وہ سو جانے دینے کو تیار ہو جائے گا۔ تو پھر یہ بات بھی کم از کم تو سن لے کہ وہ میں نہیں ہوں گا۔ کیا سمجھ رہے ہو۔"

"بس اب میں کیا کہوں تجھ سے اگر تو نہیں مان رہا تو میں رانی جی کو خبر کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے واپس پلٹا۔ اس نے آگے بڑھ کر بندھی ہوئی لڑکی کو اپنے کندھے پر ڈال۔ اور مجھ سے دور ہوتا چلا گیا۔ میں سخت پریشان کھڑا اور میری دلی خواہش تھی کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ اس ویران جگہ کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ کہ یہ کون سی جگہ ہے اور کہاں ہے؟ لیکن مجھے خوف تھا کہ کھوپڑیوں کا یہ حصار بے مقصد نہیں ہے۔ ڈرتے ڈرتے قدموں سے میں آگے بڑھا۔ اور جس جگہ سے میں نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ وہاں پڑی ہوئی کھوپڑی منہ کھول کر میری جانب لپکی۔ اور اس نے میرا ٹخنا پکڑ لیا۔ میرے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی تھی۔

کھوپڑی نے ایک لمحہ کیلئے مجھے چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے دانت جہاں میرے پاؤں میں گڑے تھے۔ وہاں سے خون بہنے لگا تھا۔ مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ میں جس طرف سے بھی نکلنے کی کوشش کروں گا۔ میرے ساتھ یہی سب کچھ ہوگا۔ چنانچہ میں واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ جادو نگری بڑی خطرناک جگہ ہے۔ اور یہ مصیبت جو میرے سر پر پڑی ہے۔ وہ آسانی سے نہیں ٹلے گی۔ رنگا سیہ غائب ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد پھر مجھے کوئی سایہ سا نظر آیا۔ کوئی میرے قریب آ رہا تھا۔ اور جب وہ قریب پہنچا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ بھیم چند تھا۔ کالی صورت والا بھیم چند۔ وہ کھوپڑیوں کے اس طرف جا کھڑا ہوا اور غصیلے لہجے میں بولا۔

"تم جیسے لوگ اپنی ضد سے اپنا سب کچھ تباہ کر دیتے ہیں۔ پاگل کے بچے تجھے جو عزت مل رہی ہے۔ وہ تو دس جنم میں بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ رام رتی جن قوتوں کی مالک ہے۔ اگر تو اس کا ساتھی بن جاتا تو سنسار تیرے لئے بڑا آسان ہو جاتا۔ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تو کیا بن گیا ہے۔ میری بات مان لے میرے دوست! رانی کو قبضے میں رکھنا میرے اور تیرے دونوں کے فائدے میں ہے۔ کیا سمجھا؟ اتنا موقع کسی اور کو نہیں ملتا۔ سمجھ رہا ہے تو؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ اب مجھے بتاؤ کہ میں ان کھوپڑیوں کی مصیبت سے کیسے نجات پا سکتا ہوں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"آرام سے ہو جائے گا یہ کام...... تو آج رات کو اس لڑکی کو ذبح کر دے اور اس کا خون پی لے...... میں تجھے سچ سچ بتاؤں۔ اس خون کا الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔ اگر انسان کو پتہ چل جائے کہ خون میں کیا لذت ہے۔ تو

ہر شخص ایک دوسرے کا خون پینے کی کوشش کرے۔"

"مجھے سوچنے کا موقع دو۔" میں نے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ یہ تبدیلی میں نے اپنے اندر اس لئے پیدا کی تھی۔ کہ ان لوگوں سے بچنے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ اگر تھوڑا سا موقع مل جائے تو کوئی ترکیب سوچی جاسکتی ہے۔ بھیم چند خوش ہوگیا۔ اس نے کہا۔

"تو بس تھوڑی دیر انتظار کر...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔ سمجھا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" بھیم چند بہت خوش ہوگیا تھا۔ واپسی میں اس کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ آخر میں کر کیا سکوں گا۔ یہاں تو جادوگروں کی پوری بستی آباد ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں...... کیا نہ کروں؟......

بھلا اس معصوم سی لڑکی کو میں کیسے ذبح کرسکتا تھا۔ اور پھر خون پینے کا تصور...... مجھے اس تصور سے ہی ابکائیاں آرہی تھیں۔ اور میں نے اپنے دل میں ایک بار پھر اپنی قوت فیصلہ کو مضبوط کیا۔ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ اور ایک ہی بار جاتی ہے۔ کم از کم کوئی ایسا عمل تو نہ کیا جائے۔ جس سے موت کے بعد بھی ضمیر داغ دار رہے۔ وقت کے ساتھ سمجھوتہ کرنا تھا۔ پھر میں نے دور سے رنگا سیہ کو آتے دیکھا۔ یہ شاید کوئی خاص جادوگر تھا۔ وہ ناچنے کے انداز میں چلتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ پھر اس نے منحوس لہجے میں کہا۔

"جگہ بتاتا ہوں مہاراج! اس غار کی طرف چلو۔ کھوپڑیوں کا ایک حصہ خالی ہوگیا۔ بظاہر کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ کہ اس وقت میں کوئی عمل کروں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں ہوں کس جگہ؟ بہر حال میں نے رنگا سیہ کی ہدایت کے مطابق عمل کرنا شروع کردیا۔ وہ مجھے اسی غار کی جانب لے جارہا تھا۔ جو سامنے نظر آرہا تھا۔ میں موقع کی تاک میں تھا کہ کسی طرح اگر ممکن ہوجائے تو میں رنگا سیہ کو کوئی نقصان پہنچادوں۔ اور اس مصیبت سے رہائی حاصل کروں۔ لیکن اس نے مجھے کوئی موقع نہیں دیا۔ اور میں آخرکار غار میں داخل ہوگیا۔ صبر سے کام لینے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ یہ گہری تاریک اور لمبی سرنگ آخرکار ایک ایسی جگہ ختم ہوگئی۔ جہاں آگ روشن تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اندر سے سارا پہاڑ کھوکھلا ہوچکا ہے۔ جگہ جگہ دیواروں میں چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ اور یہ آگ انہی لکڑیوں کی تھی۔ لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ غار میں کوئی تپش نہیں تھی البتہ پورا غار انتہائی خوف ناک چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ انسانی جسموں کی ہڈیوں کے لاتعداد انبار بے شمار کھوپڑیاں جو جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔ میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑوں کے ڈھیر...... اور نجانے ان کپڑوں کے ڈھیر کے پیچھے کیسی کھڑکھڑاہٹ ہورہی تھی۔

آخرکار ایک جگہ جاکر رنگا سیہ رک گیا۔ اور بولا۔

"یہ کالا پتھر دیکھ رہا ہے ناں تو؟ بیٹھ جا اس پتھر پر...... اور خبردار ہلنے جلنے کی کوشش مت کرنا۔ میں یہ فیصلہ کرچکا تھا کہ جب تک کسی مؤثر صورت حال کی امید نہ ہوجائے۔ کوئی احمقانہ جدوجہد کرنا بالکل بے مقصد ہوگی۔ چنانچہ میں پتھر پر بیٹھ گیا۔ رنگا سیہ ایک طرف چلا گیا تھا۔ اور میری نگاہیں اس کا تعاقب کررہی تھیں۔ پھر اچانک ہی کپڑوں کے ایک ڈھیر سے مجھے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ اس آواز کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیسی ہے۔ میری نگاہیں دیر تک کپڑوں کے اس ڈھیر پر جمی رہیں۔ لیکن وہاں کوئی تحریک نہیں تھی۔ البتہ آواز بدستور آرہی تھی۔ اور میرا دل لرز رہا تھا۔ غار انتہائی ہولناک تھا۔ اس کی بلندی بھی ناقابلِ یقین تھی کیونکہ اس کی چھت تو نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ ابھرے ہوئے چٹانی پتھروں میں موٹے موٹے تاروں والے مکڑیوں کے جالے لٹکے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں مکڑیاں نظر نہیں آتی تھیں۔ پھر یہ آواز نجانے کہاں سے آرہی ہے۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی چیز گھسیٹی جارہی ہو۔ اور اس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا میرا سارا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔

نجانے میں کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ کہ اس ہولناک کیفیت میں میرے دل کی حرکت بند نہیں ہورہی تھی۔

کپڑوں کے ڈھیر سے ایک ہولناک وجود باہر نکلا۔ آہ...... اس وقت میرے دل کی جو کیفیت تھی شاید میں اسے الفاظ میں بیان نہ کرسکوں۔ چٹان کے پیچھے سے جو وجود برآمد ہوا وہ ایک انتہائی تندرست عورت کا انسانی جسم تھا۔ یہ عورت گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی۔ اور یوں لگتا تھا۔ جیسے کسی چیز کو گھسیٹ رہی ہو۔ پھر اس کا پورا جسم باہر نکل آیا۔ اور وہ ہولناک منظر میری نظروں کے سامنے آگیا۔ جسے دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بند ہوجائیں۔

بھیانک شکل کی خوف ناک عورت جس چیز کو گھسیٹ رہی تھی۔ وہ بھی ایک انسانی جسم ہی تھا۔ کسی عورت کا جسم جو خون میں نہایا ہوا تھا۔ جانور نما عورت کے لئے سیاہ بالوں نے دوسرے جسم کا کچھ حصہ ڈھکا ہوا تھا۔ خود اس کا اپنا چہرہ بھی بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ بلی کی طرح دونوں ہاتھ پیروں سے پیچھے کی طرف کھسک رہی تھی۔ اور اس نے دوسری عورت کے مردہ جسم کو دانتوں میں دبوچا ہوا تھا۔ میرا سانس رک گیا تھا۔

ہولناک بلا منہ کی مدد سے ایک انسانی جسم کو گھسیٹ رہی تھی۔ پھر ایک جگہ وہ رک گئی۔ اس نے انسانوں کی طرح بالوں کو زور سے جھٹکا اور انہیں اپنے ہاتھوں سے سنوارنے لگی۔ بالوں کے پیچھے ہٹنے سے اس کا چہرہ نمایا ہوگیا۔

"خدا کی پناہ۔ کتنا بھیانک چہرہ تھا انسانی نقوش ہی تھے لیکن لیکن خون میں ڈوبے ہوئے۔ اگر میں مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا۔ تو شاید دماغی توازن ہی کھو بیٹھتا۔ میں نے اس عورت کو پہچان لیا۔ وہ انتہائی خوبصورت عورت اس وقت جس بھیانک بلا کی شکل اختیار کئے ہوئے تھی۔ رام رتی تھی۔

وہ انسان سے زیادہ جانور نظر آرہی تھی۔ خون آلود چہرہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں سفیدی نمایاں تھی۔ کالی پتلیوں کی جگہ ایک سیدھی سبز روشن لکیر نظر آرہی تھی۔ ہونٹ گہرے سرخ ہورہے تھے۔ اور جگہ جگہ خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس نے شاید مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اور اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ کہ میں یہاں موجود ہوں۔ میری طرف سے بے توجہ رہ کر اس نے دونوں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل جھک کر بالکل جانور ہی کی طرح انسانی جسم کو سونگھا۔ اور جگہ بدل بدل کر اسے سونگھتی رہی۔

اچانک اس نے ایک غراہٹ جیسی آواز نکالی۔ اور مردہ جسم کی گردن میں دانت گاڑ دیئے۔ گردن میں دانت پیوست کرکے شاید وہ اسکا خون چوس رہی تھی۔ پھر وہاں سے اس نے منہ ہٹایا۔ اور اس کے بعد مردہ جسم کا سینہ ٹٹولنے لگی۔

خوف ناک غراہٹیں اس کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ اور اس کے تیز دانت عورت کے بدن کو ادھیڑنے میں کامیاب ہوتے جارہے تھے۔ میں یہ ہولناک منظر اپنی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے بعد اتفاقیہ طور پر اس لاش کا چہرہ میری جانب ہوگیا۔ اور دوسرے لمحے میرے حلق سے ایک دردناک آہ نکل گئی۔

یہ وہی مظلوم لڑکی تھی۔ جو جان بچانے کیلئے درخت سے اتر کر ہمارے پاس آئی تھی۔ وہی معصوم لڑکی جو بھوکی تھی۔ اور بھوکی ہی بھاگ گئی تھی۔ اسے اپنی زندگی کا خطرہ تھا۔ اپنی جان کا خوف تھا۔ اور وہی ہوا۔ اس نے کچھ اس طرح کے الفاظ ادا کئے تھے اس وقت بھی اس کے وہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ میرے حلق سے ایک دلخراش آہ...... نکل گئی۔ اور میری اس آواز پر رام رتی نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ اسکے منہ سے خون ٹپک رہا تھا۔ اس کے نوکیلے دانت کسی بلی کی طرح تھے۔ اور یہ بھی خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور وہ مجھے دیکھ کر غراتی رہی۔ پھر دوبارہ جھک کر اس نے لاش کے سینے میں دانت گاڑ دیئے۔

اپنے دانتوں سے اس نے لڑکی کے جسم میں سے کسی چیز کو جھٹکا دیا اس کے بعد اس کا کلیجہ اور دل باہر نکال لیا۔ اسی وقت مجھ پر ایک وحشیانہ جنون طاری ہوگیا۔ میں بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک انسانی پاؤں کی سوکھی ہوئی ہڈی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر گھمایا۔ اور

پوری قوت سے اس پر پھینک ماری لیکن وہ بالکل بلی کی طرح چوکنی تھی۔ ہڈی میرے ہاتھ سے نکل کر سنسناتی ہوئی اس کی جانب بڑھی تو اس نے لڑکی کے سینے سے نکالا ہوا کلیجہ دانتوں میں دبا کر ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ اور ایک ابھری ہوئی چٹان پر جا پڑی۔

میں نے دوسری ہڈی اٹھا کر اس پر ماری تو اس نے اس چٹان سے دوسری چٹان کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اور پھر دوسری سے تیسری اور پھر کافی اوپر ایک دیوار پر نکلی ہوئی چٹان پر جا بیٹھی۔ یہ چھلانگیں اتنی نپی تلی اور اتنی مہارت کے ساتھ لگائی گئی تھیں۔ کہ کہیں بھی اس سے چوک نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس وقت ایک بالکل خوف ناک بلی لگ رہی تھی۔

انسان کا اس سے خوف ناک روپ کبھی کسی نے تصور بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ جو میں دیکھ رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر پھر جھک کر بیٹھ گئی۔ اس نے دانتوں میں دبی ہوئی کلیجی۔ چٹان پر رکھی اور اپنی سیدھی سیدھی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میری طرف سے کوئی تحریک نہ پا کر اس نے پھر کلیجی پر منہ مارا اور اسے چیڑ پھاڑ کر کے کھانے لگی۔

مگر میرا جنون اس وقت ختم نہیں ہوا تھا۔ میرے حلق سے ایک غراتی ہوئی آواز نکلی۔

"کتیا کی بچی! تو نے ایک بے گناہ معصوم لڑکی کو مار دیا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میری اس آواز پر اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے چونک کر دیکھا تھا۔ اور پھر لاپرواہی سے جھک کر کلیجی چبانے لگی۔ وہ انسان لگ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اتنی بلندی پر تھی کہ اگر میں اس کے پاس جانے کی کوشش بھی کرتا تو میرے لئے ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک پھرتیلی بلی کی طرح چوکنی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر لڑکی کا جسم ادھڑا ہوا پڑا ہوا تھا۔ اور میں بے بسی سے ہاتھ مل رہا تھا۔

اچانک ہی میری نگاہ ایک کھوپڑی پر پڑی۔ اور میں نے آگے بڑھ کر کھوپڑی اٹھالی۔ اور اس پر نشانہ لگانے لگا۔ اس بار مجھے کامیابی حاصل ہوگئی تھی۔ کھوپڑی کسی وزنی پتھر کی طرح میرے ہاتھ سے نکلی۔ اور اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ جس بلندی پر تھی وہیں پر ڈولنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ چکرا گئی ہو۔ اور پھر میں نے اسے بلندی سے گرتے ہوئے دیکھا۔ جس قدر بلندی پر وہ موجود تھی اس حساب سے تو پتھر کی اس چٹان پر گر کر اس کا وجود پاش پاش ہو جانا چاہئے تھا۔

لیکن کمبخت بلی ہی کی طرح نیچے آئی تھی۔ اور اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ البتہ نیچے آ کر وہ چکر کاٹنے لگی اسکے حلق سے غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ پھر وہ ایک طرف دوڑتی چلی گئی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد بھیم چند لوگوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے۔ اندر آ کر اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بولا۔

"کتے تو نے جو کچھ کر دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں تجھے بری طرح بھگتنا پڑے گا چلو اسے لے چلو" مجھے وہاں سے نکال کر لایا گیا۔ اور ایک لمبا فاصلہ طے کر کے آخر کار مجھے وہی عمارت نظر آئی جہاں مہمان خانے میں مجھے رکھا گیا تھا۔ لیکن اس بار مجھے مہمان خانے میں نہیں بلکہ ایک قید خانے میں لے جا کر بند کر دیا گیا تھا۔ میں اپنی تقدیر کو کوس رہا تھا۔ لعنت تھی ایسے کاروبار پر جو اس قسم کے عذاب میں گرفتار کر دے چنانچہ! بس سوائے خدا سے دعا مانگنے کے اس وقت میرے پاس اور کچھ نہیں تھا۔ ایک دن اور ایک رات مجھے بھوکا، پیاسا وہاں بند رکھا گیا۔ پھر اس رات کی صبح مجھے کھانا پیش کیا گیا۔ جسے زہر مار کرنا ضروری تھا۔ اور دوپہر کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے مجھے رام رتی کے سامنے پیش کیا گیا۔ رام رتی کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسکے خوب صورت چہرے پر بھی ایک دو نشان نظر آ رہے تھے۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"زاہد خان ہے ناں تیرا نام؟" چل ٹھیک ہے میں تجھے ایک بات بتاؤں، سے میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ سے بیتتا جائے گا اور میں جوان رہوں گی تو بوڑھا ہو کر مر جائے گا لیکن اس سے تک نہیں مرے گا

جب تک تو میرا کام نہ کر دے۔ میں نے تجھ سے جو کچھ کہا ہے۔ وہ تجھے کرنا ہی ہوگا۔ میرے لئے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میں تو ایسی کی ایسی ہی رہوں گی۔ پر ایک بات سوچ لینا، اب تیرے برے دن شروع ہو گئے ہیں۔ جیئے گا تو ضرور۔ پر تیرا سب کچھ لٹ جائے گا۔"

غلط نہیں کہا تھا اس نے مدد علی شاہ صاحب! اس نے مجھے آزاد کر دیا۔ میں مختلف صعوبتیں برداشت کر کے آخر کار گھر واپس پہنچ گیا۔

لیکن بس آپ یوں سمجھ لیجئے کہ اس کے بعد سے اب تک میرے لئے مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں۔ میرے بچے جوان ہو چکے ہیں۔ برسوں بیت گئے ہیں۔ پر نحوست نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا سارا کاروبار برباد ہو گیا۔ بیٹی کی شادی کر دی۔ بیٹے کی بھی شادی ہوگئی۔ ہم لوگ اچھی زندگی حاصل کرنے کیلئے بڑی محنت کرتے ہیں لیکن تباہی بربادی ہمارا مقدر ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے کبھی دکان میں آگ لگ گئی۔ کبھی ڈکیتی ہوگئی۔ بیٹے کا بھی یہی حال ہے اور بیٹی کا بھی اب تو صبر کر لیا ہے۔ اور یہ سوچ لیا ہے کہ تقدیر میں یہی سب کچھ لکھا ہے۔ دل گھبرا رہا تھا۔ رئیس خان کے پاس آ گیا۔ یہاں پہنچ کر آپ کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس سے پہلے بھی بڑی دعا، درود کرا چکا ہوں۔ پر اللہ کی مرضی نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا وہ جاری ہے۔ مجھے معاف کیجئے گا رئیس خان نے کہا تھا کہ شاہ جی بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ آپ اگر میری بات کا برا نہ مانیں۔ تو میں اس کے لئے دوبارہ معافی مانگنے کیلئے تیار ہوں۔ پر مایوسی ہی مایوسی ہے۔ دیکھیں اللہ بہتر جانتا ہے۔ کہ آگے کیا ہوگا۔ مدد علی صاحب کو یہ داستان بڑی عجیب لگ رہی تھی۔ مگر اس طرح کی باتیں تو عجیب ہی ہوتی ہیں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ کسی کے لئے۔" انہوں نے کہا۔

"بھائی سب کچھ اللہ کر سکتا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ کچھ کاموں کیلئے وہ اپنے بندوں کا انتخاب کر لیتا ہے۔ اور وہ بندے اس کی رضا سے۔ اور اس کی راہنمائی ملا وہ کام کر لیتے ہیں۔ ورنہ انسان کیا اور اس کی حقیقت کیا۔ ایک سوال بس ہمیں آپ سے کرنا ہے۔"

"جی۔ جی فرمایئے۔"

"کیا اس کے بعد..... میرا مطلب ہے۔ اب تو بہت عرصہ گزر گیا۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا۔ کہیں رام رتی کی شکل آپ کو نظر آئی۔"

"ہاں..... معافی چاہتا ہوں یہ بات تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔ مجھے جگہ جگہ اس کے مجسمے نظر آتے رہتے ہیں ایک دفعہ بازار سے گزر رہا تھا کہ اچانک ہی قدم ٹھٹک گئے۔ ایک دکان کے شوکیس میں پتھر کا ایک حسین مجسمہ لگا ہوا تھا۔ اور یہ مجسمہ رام رتی کا تھا۔ میں ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔ میں آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ اچانک ہی مسکرا دی۔ میرا مطلب ہے مجسمہ۔ اور پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔

"میں تمہیں یاد دلاتی رہوں گی۔ زاہد خان! اس سے تک جب تک کہ تم خود مجھ سے یہ نہ کہو۔ کہ رام رتی میں تیرے حکم کی تعمیل کرنے کیلئے حاضر ہوں۔"

دوسری مرتبہ مجھے ایک کپڑے کی گڑیا ملی۔ یہ راستے میں پڑی ہوئی تھی۔ اور بہت ہی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر اٹھائی کہ شاید کسی بچے کی گر گئی ہے۔ مگر وہ رام رتی تھی۔ اور اس نے وہی الفاظ پھر سے کہے دس گیارہ مرتبہ اسی طرح ہو چکا ہے۔"

"کبھی آپ کا بھوج گڑھی جانا ہوا؟"

"نہیں بھوج گڑھی کا تو میں نے کبھی رخ نہیں کیا بلکہ ایسے راستے تک ترک کر دیئے جن میں ٹرین بھوج گڑھی کے اسٹیشن کے سامنے سے گزرتی تھی۔"

"آپ مجھے چوبیس گھنٹے کا وقت دیجئے۔ جو اللہ کو منظور ہوا وہ میں آپ کو بتاؤں گا۔ اور جب وہ لوگ چلے گئے۔ وہ اپنی بیگم آسیہ سے کہنے لگے۔

"آسیہ! بڑی عجیب کہانی سنی ہے میں نے۔"

"ہاں۔ میں نے بھی سنی ہے۔ اور میرے تو رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔"

"صاحبزادے سے ہی اس موضوع پر بات کی

جاسکتی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے آسیہ ہمارا کلن تک کا نکما بیٹا۔ آج کیا سے کیا بن گیا ہے۔ اور ہم اس کے محتاج ہوگئے ہیں۔" مدد علی اِدھر یہ بات کررہے تھے اور اُدھر خیرالدین خیری نعمت علی کے بارے میں کہہ رہا تھا۔

"نعمت علی سن لی تم نے یہ کہانی۔"

"ہاں۔ ماموں۔ بڑی عجیب وغریب کہانی ہے۔"

"کیا یہ کہانی ہمیں چیلنج نہیں کررہی؟"

"میں سمجھا نہیں ماموں۔"

"ذرا اس رام رتی کو ہم بھی تو دیکھیں کیا شے ہے۔ ہمارا تو دلچسپ مشغلہ یہ ہی ہے۔ ذرا اس کا تیا پانچہ کرکے دیکھیں۔"

"مگر وہ تو بڑی خوف ناک ہے۔"

"اصل میں وہ خوف ناک ہوگی۔ مگر ہماری تو ناک ہی نہیں ہے۔ جو خوف محسوس ہو۔" خیرالدین خیری نے اپنی دانست میں مذاق کیا۔ لیکن نعمت علی سوچ میں ڈوب گیا۔ اسی وقت خیرالدین خیری نے کہا۔

"یار! ایسی باتوں پر سوچنا گناہ ہوتا ہے۔ اب تم ایسا کرو۔ اپنے ڈیڈی حضور سے ملو۔ اور ان سے ہدایات لے لو۔ وہ تمہیں اس بارے میں بتانا چاہتے ہیں۔ اور تمہاری والدہ ماجدہ سے تمہارے بارے میں بات کررہے ہیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

"اوکے ماموں۔" نعمت علی نے کہا۔ اور اس کے بعد وہ گھر کی جانب چل پڑا تھوڑی دیر کے بعد اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ تو خود مدد علی نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر خوش ہوگئے۔

"تمہیں یاد ہی کررہا تھا میں نعمت علی!"

"جی ابا جی...... میں حاضر ہوں۔"

"بیٹا...... میں نے تمہارے لئے ماش کی دال پکائی ہے۔ تمہیں ماش کی دال بہت پسند ہے ناں؟"

"سارے دلدر دور ہوگئے اصل میں ماش کی دال چیز ہی ایسی ہے۔ کہ انسان ساری باتیں بھول جاتا ہے۔" کھانے پینے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مدد علی نے کہا۔

"ایک مشکل پیش آگئی ہے بیٹے۔" نعمت علی یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ کہ اسے اس مشکل کے بارے میں معلوم ہے۔ لیکن خیرالدین خیری نے کان میں سرگوشی کی۔

"نہیں تم خود کچھ نہیں بتاؤ گے۔ مدد علی صاحب سے سنو!" تب نعمت علی نے کہا۔

"جی ابا جی! کیا مشکل درپیش ہے؟" اور جواب میں مدد علی نے پوری کہانی دہرادی۔ پھر بولے۔

"یہ ساری مشکل تمہاری ہی پیدا کی ہوئی ہے بیٹے۔ تم نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ لوگ میرے بارے میں نجانے کیا کیا سوچتے ہیں۔"

"خیر ابا جی! میں نے کوئی احسان نہیں کیا آپ پر اصولی طور پر تو یہ ہی ہوسکتا تھا کہ میں ہاتھ پیروں سے مزدوری کرکے آپ کی خدمت کرتا۔ کیونکہ آپ نے زندگی بھر محنت کرکے مجھے پروان چڑھایا ہے۔ لیکن بس اب جب یہ راستہ بن گیا ہے تو پھر مجبوری ہے۔ کہ میں اسی راستے سے آپ کی خدمت کروں۔" نعمت علی نے کہا۔

"یہ کہانی تم نے سن لی!"

"جی ابا جان!"

"کیا کہتے ہو؟"

"مجھے۔ ہندوستان جانا ہوگا۔ وہاں پہنچ کر بھوج گڑھی جاؤں گا۔ اور اس کے بعد اللہ کا نام لے کر جو کچھ بھی ہو پائے گا کروں گا۔"

"خدا تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ اس کے علاوہ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"یہ ہی تو سب کچھ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں زاہد خان کو تسلی دے دینی چاہئے کہ آپ ان سے صرف اتنا کہہ دیں کہ آپ کام کب شروع کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ زاہد خان کی مشکل دور کرے گا۔ ہم ذرا سی معلومات کرلیں گے کہ صورتحال کیا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تمہارا زاہد خان سے تعارف

ندیم

کرادوں۔"

"ٹھیک ہے جیسے آپ مناسب سمجھو کرلو۔" غرض یہ کہ مدد علی صاحب بہت دیر تک اپنے ہونہار بیٹے سے باتیں کرتے رہے۔ اور اس کے بعد طے ہوا کہ رئیس خان اور زاہد خان کو بلا لیا جائے۔ اور ان سے بات کرلی جائے۔

"ٹھیک ہے۔ ذرا سی تفصیلات کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ اس کے بعد ساری صورتحال دیکھ لیں گے۔" غرض یہ کہ دوسرے ہی دن رئیس خان زاہد خان کے ساتھ گھر پہنچ گئے۔ اور مدد علی صاحب نے بڑے فخر کے ساتھ اپنے بیٹے کا تعارف کرایا۔

"یہ میرا بیٹا نعمت علی ہے۔ آپ ہندوستان کب روانہ ہورہے ہیں؟"

"بس دو دن کے بعد۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ آپ کے ساتھ جائے گا۔ اور ساری صورتِ حال کی تفصیل کا پتہ چل جائے گا۔"

"بہت مناسب۔" زاہد خان نے جواب دیا۔ پھر خیر الدین خیری سے بات ہوئی۔

"ایک بات بتایئے، استاد محترم، ہندوستان جانے کیلئے تو پاسپورٹ وغیرہ کا بندوبست بھی کرنا پڑتا ہے۔ ویزہ وغیرہ بھی لگوانا پڑتا ہے۔ ہم زاہد خان کے ساتھ کیسے جاسکیں گے۔"

"تم فکر نہ کرو کل ہی پاسپورٹ کے لئے فارم جمع کرادو، باقی کام میرا ہے۔" خیر الدین خیری نے کہا۔ دوسرے دن نعمت نعمت علی نے پاسپورٹ کے لئے فارم جمع کرادیا اور پھر چند دن میں ہی پاسپورٹ بن کر آگیا اور نعمت علی آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔

خیر الدین خیری کے کام ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔ وہ ساری باتیں اپنی جگہ ایک زبردست عالم بھی تھا۔ اور اس نے اپنی زندگی پراسرار علوم کیلئے وقف کردی تھی۔ چنانچہ اس طرح کے کام وہ اپنے علوم کے ذریعے بھی کردیا کرتا تھا۔ غرض کہ زاہد خان ہندوستان واپس چل پڑا۔ اندازہ یہ تھا کہ ایک ہی آدمی اس کے ساتھ سفر کررہا ہے لیکن بے چارہ زاہد خان یہ بات کیا جانتا تھا کہ ایک نہیں دو افراد اس کے ساتھ سفر کررہے ہیں۔ اور اسے بہت بڑی مدد حاصل ہوچکی ہے۔ راستے میں زاہد خان نے کہا۔

"نعمت علی صاحب، میرا بیٹا ہے۔ بیٹی ہے۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میرا بیٹا اور بیٹی بھی شدید مشکلات کا شکار ہیں۔ بہت عرصے سے میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن جو اطلاعات مجھے ان کے بارے میں مجھے ملتی رہتی ہیں۔ وہ میرے لئے بڑے دکھ کا باعث ہیں۔ داماد اچھا خاصا ٹھیکے داری کا کام کرتا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں بیٹی آئی تھی۔ وہ بہت بڑی مصیبت میں گرفتار تھی۔ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ آپ کو کیا بتاؤں۔ اور پھر کمبخت رام رتی نے مجھے بتادیا کہ یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔"

"اوہ..... تو پہلے آپ مجھے اپنی بیٹی اور داماد ہی سے ملایئے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تعارف کرادوں گا۔ لیکن میرا وہاں رکنا مناسب نہیں ہوگا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں رکیں بھی نہیں، آپ کا وہاں رکنا ضروری نہیں ہے۔" نعمت علی نے کہا۔ اصل میں یہ تمام باتیں نعمت علی خود نہیں کررہا تھا۔ بلکہ اس کے وجود میں خیر الدین خیری اسے ڈائریکشن دے رہا تھا۔ بہر حال ہندوستان پہنچ گئے ہندوستان کے شہر ناگ پور میں زاہد خان نے نعمت علی کی ملاقات اپنے داماد مرزا فرقان بیگ سے کرائی۔ فرقان بیگ بہت اچھی شکل وصورت کا نوجوان آدمی تھا۔ وہ واقعی بہت پریشان نظر آتا تھا۔ زاہد خان کی بیٹی شکیلہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں کسی مصیبت کا شکار ہیں۔" زاہد خان نے کہا۔

"بیٹے میں یہاں زیادہ عرصہ نہیں رک سکوں گا۔ یہ ایک بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ کے صاحبزادے ہیں۔ اور تمہاری مدد کیلئے یہاں آئے ہیں۔ انہیں اپنے سارے معاملات سے آگاہ کردو۔ ہوسکتا ہے۔ کہ اللہ

تعالیٰ ہماری مشکل کا حل ہمیں پیش کردے۔ میں چلتا ہوں۔ ذرا کچھ ضروری کام ہیں۔ اجازت دو۔"

زاہد خان چلے گئے۔ فرقان بیگ بہت ہی خوش مزاج اور نرم طبیعت کا آدمی تھا۔ اس نے نعمت علی کی بڑی خاطر مدارات کی تھیں۔ پھر تنہائی میں موقع ملا۔ تو اس نے نعمت علی سے کہا۔

"میں نہیں جانتا محترم نعمت علی صاحب! کہ آپ کی روحانی قوتیں کیا ہیں لیکن ایک بات میں آپ کو پورے اعتماد اور خلوص کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جتنے نوجوان اور خوب صورت آپ ہیں اس نوجوانی میں تو اپنا ایمان قائم رکھنا تو بڑا ہی مشکل کام ہوتا ہے۔ یہ تو بھٹک جانے کی عمر ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ کا اپنا عمل کیا ہے۔ خدا نخواستہ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ صاحب کردار نہیں ہیں۔ لیکن جو روحانیت عمر کے ایک خاص دور میں حاصل ہوتی ہے۔ اگر وہ ابھی سے حاصل ہوگئی ہے آپ کو تو بہت بڑی بات ہے۔"

"خود آپ کی کیا کیفیت ہے۔ فرقان بیگ صاحب! حسن پرست ہیں رقص موسیقی کے رسیا ہیں۔ یا پھر....؟"

"نہیں..... نہیں۔ خدا کی قسم ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس آپ سے ذرا بے تکلف ہونے کی کوشش کررہا ہوں۔"

"آپ مجھے اپنی مشکل کے بارے میں بتایئے۔" نعمت علی نے کہا۔

"بس! یوں سمجھ لیجئے کہ ایک ہنستی بولتی زندگی میں کچھ تکلیفیں پیش آگئی ہیں۔ میں ٹھیکے داری کرتا ہوں۔ عمارتیں وغیرہ بناتا ہوں۔ ہمارے ایک جاننے والے جن سے میری بڑی پرانی شناسائی ہے۔ بڑے دولت مند آدمی ہیں بس یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ نے پیٹ بھی بھر دیا ہے۔ اور تجوری بھی۔ ایک بہت ہی خوب صورت قطع زمین خریدا تھا انہوں نے جو ایک ہندو بنیئے کا تھا۔ اجاڑ اور ویران پڑا ہوا تھا۔ لیکن جگہ اتنی خوب صورت تھی کہ ہمارے دوست کو بہت پسند آگئی۔ اور انہوں نے اسے خرید لیا۔

پھر انہوں نے میرے ساتھ میٹنگ کی۔ وہ چاہتے تھے کہ وہاں ایک بہت ہی خوب صورت فارم ہاؤس بنایا جائے۔ اور انہوں نے اس کا ٹھیکہ مجھے دے دیا۔ انہوں نے ہر طرح سے میرے ساتھ تعاون کیا۔ اور میں نے اس علاقے میں کام شروع کرادیا۔ جب میں نے پہلی نگاہ اس علاقے پر ڈالی۔ تو مجھے یوں لگا جیسے وہ بہت ہی عجیب سی جگہ ہو۔ سوکھے ہوئے درخت۔ جن میں پتوں کا نام ونشان نہیں تھا۔ شاید ان پتوں پر خزاں کے بعد بہار کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ جگہ جگہ اینٹوں کے ڈھیر جن کا رنگ کالا پڑا ہوا تھا۔ زمین پر تھور کی جھاڑیاں اگی ہوئی۔ اگر کوئی اس جگہ کے قریب سے بھی گزر جائے تو اسے احساس ہو کہ اس جگہ پر ایک نحوست سی برس رہی ہو۔ ایسی بہت کم جگہیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جہاں پہنچتے ہی یہ احساس ہو۔ کہ یہ کوئی عام جگہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔

میں نے جب پہلی ہی نگاہ اسے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے کچھ پراسرار قوتیں مجھے وہاں کام کرنے سے منع کررہی ہوں۔ پہلے تو میں بہت پریشان ہوا۔ اور میں نے سوچا کہ یہاں کام کرنا تو بہت مشکل ہے۔ میں ایک بہت بڑی رقم ایڈوانس لے چکا تھا۔ اور اس میں سے بہت سی خرچ بھی کرچکا تھا۔ اگر مقصود صاحب کو انکار بھی کرتا۔ تو مجھے وہ رقم واپس کرنا پڑتی بے شک میرے ان سے اچھے تعلقات تھے۔ لیکن کام کام ہوتا ہے۔ اور پھر ایک عجیب سی بات ہے کہ میں یہ کہوں کہ یہ جگہ مجھے منحوس لگ رہی ہے۔ اور میں یہاں کام کرنا نہیں چاہتا۔

میرے پیشے کے خلاف بات بھی تھی۔ اور پھر یہی بات یہ ہے کہ مذاق بھی اڑتا اچھی طرح۔ کہ میاں! ٹھیکے داری کررہے ہو یا پیری..... مریدی، چنانچہ میں وہاں کام کرنے پر مجبور ہوگیا۔ ویسے سچ بتاؤں۔ میرا واسطہ کبھی ایسے واقعات سے پڑا بھی نہیں تھا۔ جو عقل سے آگے کی چیز ہوں۔ بہر حال میں نے مزدور اکٹھے کیئے اور ان سے سارے معاملات طے کرنے لگا۔ اس

دوران میں نے قرب و جوار کی آبادی کے لوگوں سے بھی بات چیت کی۔ اور ان لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ زمین ایک ایسے ہندو سیٹھ کی ملکیت تھی جو بڑا ہی کنجوس اور بہت ہی ظالم شخصیت کا مالک تھا۔ بہت سے لوگوں کو اس نے صرف دولت کے لالچ میں مروا دیا۔ اور ان کی ارتھیاں خفیہ طور پر یہاں جلا دی گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ رقم بچانے کیلئے لوگوں پر طرح طرح کے مظالم بھی کرتا رہا۔

آخرکار ایک دن اسے سانپوں نے گھیر لیا۔ اور اسے کاٹ کاٹ کر پانی کی طرح بہا دیا۔ یہ اس سے قدرت کا انتقام تھا۔ لیکن اس کے بعد پتہ یہ چلا کہ اس جگہ اکثر اس ہندو سیٹھ کی روح نظر آتی ہے۔ اور لوگوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ کوئی اس طرف سے گزرتا بھی نہیں تھا۔ ان صاحب نے میرا مطلب ہے مقصود صاحب نے بس مست ہو کر یہ زمین خرید لی۔ وہ اس طرح کی باتوں کے قائل نہیں تھے۔ یہ زمین اسی ہندو سیٹھ کے بیٹوں کی ملکیت چلی آ رہی تھی۔ اور چونکہ جگہ بری نہیں ہے۔ چنانچہ مقصود صاحب نے اسے سستا سمجھ کر خرید لیا۔ اور یہاں فارم ہاؤس بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

مجھے پہلے سے اس کے بارے میں تفصیلات معلوم نہیں تھیں ورنہ شاید میں یہ ٹھیکہ نہ لیتا۔ اب جبکہ یہ کام مجھے کرنا ہی تھا۔ تو میں نے تھوڑی سی عقل مندی دکھانے کی کوشش کی۔ یعنی میں نے اپنے کام کرنے والے مزدور ایسے دور دراز علاقوں سے لئے جو یہاں کے بارے کچھ نہیں جانتے تھے۔ بہرحال مزدوروں کو میں نے بہترین معاوضے دیئے۔ اور انہوں نے کام کا آغاز کر دیا۔ یہاں موجود جھاڑ جھنکار اور درخت کاٹے جانے لگے۔ مزدوروں کو بھی یہ علاقہ بڑا عجیب سا لگا تھا۔ اور وہ یہاں کسی قدر سہمے سہمے سے رہتے لیکن بہرحال غریب لوگ تو پیٹ کیلئے نجانے کیا کیا کچھ کر ڈالتے ہیں۔

وہ آپ میں چہ میگوئیاں ضرور کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے کام بند نہیں کیا تھا۔ بہت سے درخت تھے لیکن برگد کا ایک بہت ہی پرانا درخت بے حد بھیانک تھا۔ اس کی جڑیں اور ڈالیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور وہ دیکھنے ہی سے بہت عجیب لگتا تھا۔ لیکن مزدور وغیرہ ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھے۔ میں جب بھی اس درخت کے قریب ہوتا۔ مجھے عجیب و غریب سرگوشیاں سی سنائی دیتیں۔ انسانی آواز میں کچھ کہا جاتا تھا۔ لیکن الفاظ واضح نہیں ہوتے تھے۔ بس آوازیں آتی تھیں جیسے بہت سے لوگ مل کر بول رہے ہوں۔ میں نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ آوازیں مزدوروں کو بھی سنائی دیتی ہیں یا نہیں...... لیکن مزدوروں نے کسی قسم کی شکایت نہیں کی تھی۔

دن رات کام ہو رہا تھا۔ جھاڑ جھنکار صاف کئے جا رہے تھے۔ درختوں کی کٹائی ہو رہی تھی۔ میں جب بھی وہاں موجود ہوتا۔ میرے دل پر ایک عجیب سا خوف چھایا ہوا ہوتا۔ کئی بار مجھے یوں لگا جیسے کچھ نادیدہ ہاتھ مجھے ٹٹول رہے ہوں۔ کبھی مجھے یوں لگتا جیسے کسی نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا ہو۔ خاصا وزن ہوتا تھا اس ہاتھ کا اور میں دہشت سے پلٹ کر دیکھتا لیکن مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔ بہرحال اس دن دوپہر کا وقت تھا۔ مزدور جڑیں کھود رہے تھے کہ درخت کی جڑ میں ایک عجیب و غریب پتھر کی سل نظر آئی...... یہ پتھر بہت خوب صورت تھا۔ اور اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ بس زمین ہی کا کوئی پتھر ہے۔ مزدوروں نے اپنے طور پر اس کے آس پاس کے کنارے صاف کئے۔ اور پھر اچانک ہی ایک مزدور نے مجھے اطلاع دی۔ کہ صاحب! وہاں زمین میں پتھر کا ایک صندوق دبا ہوا ہے۔

صندوق کا نام سن کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں آپ کو سچ بتا دوں نعمت علی صاحب میرے دل میں بھی بہت سی خواہشیں تھیں۔ میں بیوی بچوں کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا۔ اور

چاہتا تھا کہ کہیں سے مجھے کوئی ایسا خزانہ مل جائے جس سے میری زندگی سنور جائے۔ صندوق کی بات سنتے ہی میرے دل پر ایک عجیب سی کیفیت چھا گئی۔ میں دوڑا دوڑا وہاں پہنچا...... اور مزدوروں کو ہٹا کر میں نے اس گڑھے میں جھانکا۔ اور پھر میری آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔

پتھر کے صندوق پر کوئی تحریر کندہ تھی۔ لیکن زبان اجنبی اور انوکھی تھی۔ مزدوروں میں سے بھی کوئی اس زبان کو نہیں جانتا تھا۔ یہ گرمکھی ٹائپ کی کوئی زبان تھی۔

بہرحال میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ صندوق کھولا۔ اس وقت اسے نہیں کھولنا چاہئے تھا۔ کیونکہ مزدور میرے آس پاس موجود تھے۔ اگر اس صندوق میں کوئی بڑا خزانہ موجود ہے تو اس بات کے بھی امکانات تھے کہ مزدور ہی میرا تیا پانچہ کر کے خزانہ نکال لیتے اور مجھے اس صندوق میں بند کر کے اس پر مٹی ڈال دیتے۔ لیکن کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی۔ کہ مزدوروں کو کیا کہہ کر میں یہاں سے ہٹاؤں۔

بہرحال دھڑکتے دل سے میں نے یہ صندوق کھولا اور پھر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ صندوق میں ایک بت نظر آ رہا تھا۔ تصویروں میں فلموں میں اور ایسی بہت سی جگہوں پر جہاں ہندومت کے لوگ دیوی دیوتاؤں کی تصویریں رکھتے تھے۔ وہاں میں نے ایسی تصویر دیکھی تھی۔ ہندو اسے درگا دیوی کا مجسمہ کہتے تھے۔ یہ مجسمہ بہت خوب صورت تھا۔ اور صاف اندازہ ہو جاتا تھا۔ کہ یہ کانسی کا بنا ہوا ہے۔ بہت زیادہ وزنی نہیں تھا۔ لیکن بہرحال میں نے اسے صندوق سے نکال لیا۔ مزدور بھی حیرت اور دلچسپی سے اس مجسمے کو دیکھ رہے تھے۔ اور اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بوڑھے مزدور نے کہا۔

"ایک بات کہیں صاحب جی! آپ اسے اسی صندوق میں بند کر کے اوپر سے مٹی ڈالو اور...... بہت پرانی بات ہے۔ ہمارے ایک جاننے والے تھے۔ وہ پرانی عمارتوں کی کھدائی کا کام کرتے تھے۔ وہ کون سا ...محکمہ ہوتا ہے۔ آثار...... آثار...... پتہ نہیں کیا۔ اس میں افسر تھے۔ ایک مرتبہ وہ کسی جگہ کھدائی کر رہے تھے۔ کہ انہیں بھی ایک مجسمہ ملا۔ اور بس سمجھ لیجئے کہ ان پر وبال آ پڑا۔ بند کر دیں صاحب جی! اسے یہیں بند کر دیں۔"

لیکن میرے دل میں نجانے کیا خیال تھا۔ بہرحال مزدوروں سے میں نے وہ گڑھا خوب گہرا کھدوا لیا۔ اس لالچ میں کہ شاید یہاں کوئی خزانہ وغیرہ بھی دفن ہو...... مزدوروں کو بھی میں یہ اطمینان دلانے لگا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ علاقے ہندوؤں کے تھے۔ ہو سکتا ہے۔ زمانہ قدیم میں کسی نے اس مجسمے کو یہاں دفن کر دیا ہو۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ مزدور میری بات سے مطمئن ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

بہرحال میں شام کو گھر آیا۔ تو وہ مجسمہ اپنے ساتھ لے آیا۔ دیکھنے میں بہت خوب صورت تھا۔ حالانکہ ہماری اسلامی روایات کے مطابق ایسے کسی مجسمے کو ہم اپنی نگاہوں کے سامنے نہیں رکھ سکتے تھے۔ صحیح کو اندر کر ایسے کسی مجسمے کو دیکھنا بھی نحوست ہوتی ہے۔ میں نے یہ سوچا کہ کل اسے کہیں محفوظ کر دوں گا۔ بہرحال ایک خوب صورت چیز تھی۔ اگر کسی ہندو نے اسے خریدنے کی کوشش کی تو میں اسے دکھا کر اس کی قیمت بھی وصول کر لوں گا۔ میں نے وہ مجسمہ اپنی خواب گاہ میں ایک الماری کے اوپر رکھ دیا۔ میں اور میرے بچے خوشی اور آرام سے وقت گزار رہے تھے۔ میری بیوی بہت اچھی ہے۔ شکیلہ اور میں رات کو آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاتے رہے۔ بچوں سے باتیں کیں۔ بیٹی بڑی ہے۔ اور بیٹا چھوٹا ہے۔ میرے دونوں بچے دوسرے کمرے میں سوتے تھے۔ رات کو ہم دونوں میاں بیوی معمول کے مطابق کمرے میں سو گئے۔ مجسمہ وہیں الماری کے اوپر رکھا تھا۔ اس وقت رات کے تقریباً دو بجے تھے۔ کہ ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ مجھے لگا جیسے کوئی دھماکہ سا ہوا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک چیخ سنائی دی

اور میں اچھل پڑا۔ کمرے میں مدھم روشنی جل رہی تھی اور شکیلہ فرش پر پڑی ہوئی تھی۔

میں نے سیڑھی سے چھلانگ لگائی اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی اور اسکی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ ہوش و حواس میں تھی اور بار بار انگلی اٹھا کر الماری کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بہر حال بڑی مشکل سے میں نے اسے سہارا دے کر سیری تک پہنچایا۔ پانی پلایا دلاسے دیئے۔ تو اس کی کیفیت بحال ہونے لگی۔ میں نے اس کے کسی قدر بہتر ہو جانے کے بعد اس سے پوچھا۔

''کیا ہوا شکیلہ کچھ بتاؤ گی نہیں؟''

''فرقان...... میں واش روم گئی تھی۔ جب میں باہر نکلی تو اس الماری کے اوپر کوئی چیز گردش کرتی ہوئی نظر آئی میں سمجھی کہ شاید کوئی چوہا۔ اوپر چڑھ گیا ہے مگر جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو وہ تمہارا لایا ہوا مجسمہ تھا۔ فرقان مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن پھر میں نے کچھ اور مناظر دیکھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجسمہ الماری کے انتہائی سرے پر پہنچ گیا۔ اور پھر وہاں بیٹھ گیا۔ پھر اس کے پتلے پتلے پاؤں نیچے لٹکنے لگے اور اتنے لمبے ہو گئے کہ زمین تک پہنچ گئے۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ اور اس کے بعد الماری سے نیچے اتر آیا۔

ساڑھے چھ فٹ کی الماری سے فرقان اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے زیادہ ہو گیا تھا...... اس کے بعد...... اس کے بعد...... وہ آہستہ آہستہ دروازے کی جانب گیا۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ دیکھو...... اُدھر دیکھو۔ بس مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں زمین پر گر پڑی۔ میں نے حیران نظروں سے اس الماری کی طرف دیکھا اور میرا دل بھی دھک سے ہو گیا کیونکہ مجسمہ الماری سے غائب تھا۔ اور پھر میری نگاہیں دروازے کی جانب گئیں۔ اور میں نے دروازہ بھی کھلا ہوا دیکھا۔ اس طرح شکیلہ کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی۔

میں یہ بات کہتے ہوئے ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوں کہ فرقان علی صاحب کہ میرا خود بھی دم نکل گیا تھا۔ ایسے واقعات سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن دوسروں سے قصے بہت سے سنے تھے۔ میں چاہ رہا تھا کہ باہر نکلوں لیکن میرے پاؤں من، من بھر کے ہو گئے تھے۔ اور میری ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں شکیلہ کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ بہر حال ذمہ داری میرے ہی اوپر تھی شکیلہ کا دہشت سے برا حال تھا۔ اسے سہارا دینا بہت ضروری تھا۔ وہ دوبارہ پانی پینے کے بعد کسی قدر سنبھل گئی۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''یہ سب کیا تھا۔؟'' فرقان۔ کیا میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ ویسے تم یہ مجسمہ جو لے کر آئے تھے ناں؟ کہاں سے لائے تھے تم یہ مجسمہ اور یہ سب کچھ کیا تھا؟'' وہ دہشت سے کانپ رہی تھی۔

''بس مجھے ایسے ہی پڑا ہوا مل گیا تھا۔ کانسی کا تھا میں نے سوچا کہ وزنی مجسمہ ہے ہندوؤں کی ایک دیوی کا ہے۔ میرے ملاقاتیوں میں کئی ایسے ہندو ہیں جو بڑے کٹر قسم کے مذہبی ہیں اگر انہوں نے درگا دیوی کا یہ مجسمہ خریدنے کی بات کی تو میں اس کے اچھے خاصے پیسے وصول کر لوں گا۔ میں نے تو دل میں یہ سوچا تھا شکیلہ کہ میں اس کے بارے میں انہیں طرح طرح کی کہانیاں سناؤں گا۔ تم سچ جانوں۔ میں نے ایسی ایسی بے وقوفی کی باتیں سوچی تھیں کہ جن پر مجھے خود ہنسی آتی ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ کہ پرتھوی راج کو میں بتاؤں گا کہ اس مجسمے نے اس کا نام لیا تھا۔ اور کہا تھا کہ مجھے پرتھوی راج کے پاس پہنچا دو...... پرتھوی راج اچھا خاصا کاروباری ہے۔ اور مذہب کے معاملے میں تو بس یہ سمجھ لو کہ بہت ہی آگے کی چیز ہے۔ بنارس، اور ایسے دوسرے مقامات پر جاتا رہتا ہے۔ اور لاکھوں روپے خرچ کر کے آتا ہے۔ میں اسے یہ کہانی سناؤں گا تو وہ مجھے اس کی اچھی خاصی رقم دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔''

وہ چلا گیا...... یا واپس آئے گا؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''مگر تمہارے خیال میں یہ کیا ہو سکتا ہے؟''

''یہ بھی کوئی ہندو سادھو ہی بتا سکتا ہے۔''

''اور اگر وہ واپس آ گیا تو؟''

''دیکھیں گے کہ کیا کیا جا سکتا ہے؟''

''مگر میں تو بہت ڈری ہوئی ہوں...... صبح کو تم چلے جاؤ گے اور میرا دہشت سے دم نکلتا رہے گا۔ میں تو اب اس کمرے میں سو بھی نہیں سکتی۔'' شکیلہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں شکیلہ وہ اب چلا گیا...... جہنم میں جائے اچھا ہی ہوا۔ نہ جانے کہاں سے نحوست گھر میں آ گئی تھی اگر وہ مجھے دوبارہ باہر کہیں نظر بھی آ گیا تو اب میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔''

''مگر میری بات تو سنو فرقان...... تم کچھ دن کے لئے مجھے میرے گھر بھیج دو۔''

''اچھا...... گویا مشکل وقت میں تم میرا ساتھ چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔''

''مم...... مم...... مشکل وقت۔'' شکیلہ نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

''نہیں میرا مطلب ہے۔ کہ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ ایک واقعہ ہو گیا ہے ہم سب لوگ اسی ایک گھر میں رہتے ہیں اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو مل کر ہی تو بھگتیں گے۔'' میری بات شکیلہ کی سمجھ میں آ گئی۔

بہر حال میں خود بھی خوف زدہ تھا لیکن میں نے صرف اس لئے شکیلہ سے یہ باتیں کیں کہ میں اسے دہشت زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار میں اسے سمجھا بجھا کر پلاٹ پر چل پڑا۔ جب وہاں پہنچا تو وہاں دوسری مصیبت انتظار کر رہی تھی۔ مزدور ایک جگہ جمع تھے۔ اور انہوں نے کام شروع نہیں کیا تھا۔ جب کہ ان مزدوروں پر میں نے جس شخص کو متعین کیا تھا۔ وہ بڑا ذمے دار اور اچھا انسان تھا۔ میں وہاں پہنچا تو وہ سب میرے گرد جمع ہو گئے۔ رحیم خان نے کہا۔

''صاحب جی! یہ لوگ یہاں کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ جگہ بھوت پریت والی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہمارا ایک آدمی زخمی ہو گیا ہے صاحب!'' ایک مزدور نے کہا۔

''ارے وہ کیسے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ اور مزدور مجھے تفصیل بتانے لگے۔ یہاں کام کرنے والے مزدوروں نے اپنے لئے ایک آرام کی جگہ بنا رکھی تھی اور وہاں چھوٹے موٹے خیمے لگا رکھے تھے۔ کسی نے ایک مزدور کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ اور اس مزدور کو کافی چوٹ لگی لیکن پٹخنے والا نہ تو اسے نظر آیا تھا۔ اور نہ ہی اور کوئی بات پتہ چل رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس نے ایسا کیا ہے۔ ابھی دوسرے مزدور اس کے بارے میں اندازہ ہی لگا رہے تھے کہ ایک اور مزدور کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا لباس اتار پھینکا اور بھیانک آواز میں چیخنے لگا۔

''کمال کی بات ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔ تمہارے خیال میں......'' ایک مزدور آگے بڑھ کر بولا۔

''ٹھیکے دار جی! میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ وہ شخص جو چیخ رہا تھا۔ چیختے چیختے اس نے منہ کھول دیا۔ اس کی زبان کوئی آٹھ انچ باہر نکل آئی تھی۔ اور ایسی خوفناک شکل ہو رہی تھی اس کی کہ سارے مزدور وہاں سے بھاگ پڑے۔ وہ کافی دیر تک وہیں رکا رہا۔ اور پھر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ ہم لوگوں کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ دوبارہ اس کے پاس جائیں۔ صبح کو وہ زخمی حالت میں واپس آ گیا۔

اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے کہا کہ ''اب وہ یہاں پر کام نہیں کرے گا اور اگر ہم لوگوں نے بھی یہاں کام کیا تو مارے جائیں گے۔ معافی چاہتے ہیں ٹھیکے دار جی! ہم پوری ایمان داری سے آپ کا کام کرنے کے لئے تیار تھے پر اب ہم یہاں کام نہیں کریں گے۔ ہمیں معاف کر دیجئے گا۔ ہمارا حساب کر دیجئے۔''

بہر حال میں نے مزدوروں کو بہت سمجھایا۔ ان سے

کہا کہ وہ بے شک کچھ دن کے لئے کام بند کردیں اور بعد میں یہ کام شروع کردیں۔ مگر وہ نہیں رکے اور اس طرح نعمت علی صاحب میرا کام بند ہوگیا۔ آپ کو کیا بتاؤں میں نے بڑا پیسہ لگا دیا تھا وہاں پر جو ایڈوانس میں نے مقصود صاحب سے لیا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے بہت بڑی رقم جو میرے پاس جمع تھی۔ وہ بھی میں نے کام پر لگا دی تھی۔ کیوں کہ اس کام سے مجھے خاصا منافع حاصل ہونے والا تھا۔ مقصود صاحب! لاکھ میرے شناساؤں میں تھے...... لیکن کام بہر حال کام ہوتا ہے۔

میرے تعلقات ان سے اسی وقت قائم رہ سکتے تھے جب میں اپنا کام مکمل کرکے دیتا۔ مزدور بھاگ گئے تھے۔ میں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا میں نے سوچا اب مجھے کیا کرنا ہے۔ انتہائی قیمتی سامان بھی وہاں سائٹ پر رکھا ہوا تھا۔ ایک بھی مزدور وہاں نہیں رکا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کرلیا تھا کہ میں ان کا پورا حساب چکتا کردوں گا۔

بہر حال ان کے لئے میرے پاس رقم موجود تھی۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اب شہر جاکر کچھ مزدور لے کر آؤں گا۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں؟ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ بہر حال میں گھر واپس چل پڑا گھر پہنچا تو میں نے شکیلہ کو پرسکون دیکھا۔ بچوں کے بارے میں میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اسکول سے آنے کے بعد کھانا کھا کر سو گئے ہیں۔"

"تم تو بالکل ٹھیک ہو ناں شکیلہ۔" میں نے سوال کیا۔

"ہاں......" وہ آہستہ سے بولی۔

"کھانا پکایا ہے تم نے؟"

"ہاں۔" اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا یہ شکیلہ کے بولنے کا انداز نہیں تھا۔ وہ اس وقت ایک عجیب سے لہجے میں بول رہی تھی۔

آپ یقین کریں جناب! ہم میاں بیوی کے درمیان بڑی محبت ہے۔ ہم ایک دوسرے سے اتنی واقفیت رکھتے ہیں۔ کہ شاید دوسرے لوگ اتنی نہ رکھ پاتے ہوں اس لئے خلاف معمول میری اتنی جلدی واپسی کے بارے میں بھی نہیں پوچھا تھا۔ اس کی کیفیت میں ایک ٹھہرا ٹھہرا پن سا تھا۔ لیکن میرے لئے یہ ٹھہرا ٹھہرا پن بڑا عجیب تھا۔ کیونکہ یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ کھانا لینے چلی گئی اور پھر وہ ٹرے لئے اندر داخل ہوئی۔ ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ کر واپس مڑی اور دروازہ بند کردیا۔ یہ بھی سمجھ میں نہ آنے والا عمل تھا۔ میں نے گردن جھٹکی بھوک لگ رہی تھی۔ سالن کے ڈونگے سے ڈھکن اٹھایا۔ تو میرے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ ڈونگے میں شوربا بھرا ہوا تھا۔ لیکن اس میں لمبے لمبے عجیب سی ساخت کے کیڑے تیر رہے تھے۔

میں نے بے اختیار ڈونگا اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اور وحشت زدہ انداز میں شکیلہ کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن اس کی صورت دیکھ کر میرا سانس بند ہوگیا نعمت علی صاحب آپ کو کیا بتاؤں وہ سیدھی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے دانت ایک ایک انچ لمبے ہوگئے تھے۔ آنکھوں کا رنگ گہرا سرخ ہوگیا تھا۔ اور اب ان آنکھوں میں پتلیوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ سر کے بال اس طرح لہرا رہے تھے۔ جیسے سانپ کلبلا رہے ہوں۔ اس کی یہ ہیبت ناک حالت دیکھ کر میرا رُواں رُواں کانپ اٹھا۔ اعصاب بے جان ہوگئے۔ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ پاؤں نے ساتھ نہ دیا۔ بولنا چاہا مگر آواز نہیں نکلی۔

بس میری دہشت بھری نگاہیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ سرخ ہوتی جارہی تھیں۔ پھر اس کے چہرے کا زاویہ بدلا اور اس نے زمین پر کلبلاتے ہوئے کیڑوں کو دیکھا۔ آگے بڑھ کر ان کے قریب گئی۔ الٹا ہوا ڈونگا سیدھا کرکے اس نے یہ کیڑے چن چن کر اس میں رکھنا شروع کردیئے۔ میں سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میرے پیروں میں زنجیریں باندھ دی گئی ہوں۔ اور میں وہاں سے ہل بھی نہ سکتا ہوں۔ شکیلہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس وقت بالکل ختم ہوگئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔

اور اس سے نجات کیسے حاصل ہوسکتی ہے۔

کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ یا پھر کیا ہوا ہے۔ شکیلہ نے تمام کیڑے چن کر اس ڈونگے میں واپس رکھ دیئے اور اس طرح ہاتھ ہلانے لگی جیسے نیم غشی کی کیفیت میں ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اونگھ رہی ہو۔ بار بار اس کے سر کو جھٹکے لگ رہے تھے اور وہ کچھ دیر کے بعد فرش پر سیدھی لیٹ گئی۔

ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ بے ہوش ہوگئی ہے۔ پھر اس کے چہرے میں تبدیلیاں نمایاں ہونے لگیں اور کچھ لمحوں کے بعد وہ اپنی اصلی صورت میں واپس آگئی۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے حالات میں کسی بڑے سے بڑے دل گردے والے انسان پر کیا بیت سکتی ہے۔

میں نے اپنے اعصاب کو سنبھالنے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ ان پر قابو پالیا۔ دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ دروازہ کھولوں اور باہر دوڑ جاؤں۔ لیکن جو کچھ بھی تھا شکیلہ کو اس طرح چھوڑ کر بھاگنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی جو کچھ ہوا تھا وہ ایک الگ بات تھی۔ لیکن اب اپنی اصلی شکل میں تھی۔ میں صرف اپنی زندگی نہیں بچانا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں بے چاری کس عذاب میں گرفتار ہوگئی ہے۔ چنانچہ اپنے آپ کو ہمت دلا کر میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اب اس کی صورت بالکل ٹھیک ہوگئی تھی۔ سانس آہستہ آہستہ معتدل ہوتی جارہی تھی۔ لیکن اس کے آس پاس پڑے ہوئے کیڑے اب بھی کلبلا رہے تھے۔

انہیں دیکھ کر شدید گھن کا احساس ہورہا تھا۔ لیکن میں نے انہیں نظر انداز کردیا اور شکیلہ کی گردن اور پاؤں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانے کی کوشش کی میں کیا بتاؤں جناب آپ کو کہ مجھے پسینہ آگیا۔ حالانکہ وہ ایک نرم و نازک جسم کی مالک پھول جیسے وزن والی عورت تھی اور میں بھلا اس کے وزن سے کیسے واقف نہ ہوتا۔ لیکن اس وقت ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اس کا بدن ٹھوس پتھروں سے تراشا گیا ہو۔ میں اسے جنبش بھی نہیں دے سکا تھا اور میری دہشت اور خوف انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

اچانک ہی شکیلہ کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے مجھے دیکھا۔ اور ایک دم اس کے چہرے کے نقوش بدلنے لگے۔ ہونٹ اوپر چڑھ گئے اور لمبے لمبے دانت باہر جھانکنے لگے۔ پھر اس کے حلق سے ایک بھیانک قہقہہ نکلا۔ اور اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھے دبوچنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت میں نے ذرا ہمت سے کام لیا۔ اور بندر کی طرح چھلانگ لگا کر دور چلا گیا۔ پھر اس کے بعد بھلا میں کیا کوئی بھی انسان ہوتا۔ اس کمرے میں کیسے رک سکتا تھا۔ میں باہر بھاگا اور چھلانگ لگا کر دور چلا گیا ساری محبت سارے جذبات سرد ہوگئے تھے جو منظر میں نے دیکھا تھا وہ اتنا ہولناک تھا۔ کہ میں تو کیا کوئی بھی ہوتا وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ میں دوڑتا ہوا بچوں کے کمرے کی طرف آیا۔ اور دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔

میں نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ میرے دل کی جو کیفیت تھی میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ آپ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے خود سوچیں بیٹھے بٹھائے جو مصیبت مجھ پر آپڑی تھی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا اس کا دماغی توازن درست نہیں رہ سکتا تھا۔

میرے دونوں بچے گہری نیند سو رہے تھے میں ان کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ یہ اچانک بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیا۔ میرا ہنستا بستا گھر اس طرح مصیبتوں میں کیوں گرفتار ہوگیا۔ بہت سے پچھتاوے بھی ہو رہے تھے کاش میں یہ ٹھیکہ نہ لیتا اب کیا کروں۔ دل تو کہتا تھا ٹھیکہ جہنم میں جائے جو رقم پھنس گئی ہے۔ وہ بھی غرق ہوجائے میں اور میرے بچے اس مصیبت سے تو نکلیں بڑی مشکل سے میں نے ہمت کی سوتے ہوئے بچوں کو جگایا اور انہیں ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکلا۔ باہر قدم رکھا تو مجھے شکیلہ نظر آگئی اس وقت وہ بالکل صحیح کیفیت میں تھی۔ اور بڑی اداس نظر آرہی تھی۔ اس نے بوجھل لہجے میں بچوں کا نام لے کر انہیں پکارا اور پھر تعجب

سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ارے آپ کب آ گئے؟" اس کے اس انداز میں بالکل سادگی تھی۔ میں نے صورتِ حال پر غور کیا اور فیصلہ کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ وہ میرے قریب آ گئی اور بولی۔

"خیریت تو ہے۔ یہ آپ کا رنگ پیلا کیوں ہو رہا ہے۔ جلدی کیسے آ گئے؟"

"بس ایسے ہی شکیلہ۔ تم کہاں تھیں اور کیا کر رہی تھیں؟" وہ جیسے غور کرنے لگی کہ میرے سوال کا کیا جواب دے۔ پھر اس نے کہا۔

"بس دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ بچوں کو سلایا اور خود بھی اپنے کمرے میں آ کر سو گئی۔" اس نے سادگی سے کہا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے اپنی کیفیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ اسے یہ سب کچھ بتانا غیر مناسب ہوگا بات کو گول کر جانا چاہئے۔ میں نے کہا۔

"بس شکیلہ! ایسے ہی تمہاری وجہ سے ذرا جلدی آ گیا ہوں۔ میں نے سوچا کہ کہیں تم پریشان نہ ہو رہی ہو۔" وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد وقت گزرتا رہا۔ بچوں کو آج رات ہم نے اپنے پاس سلایا تھا۔ شکیلہ نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا۔

"بس پچھلی رات جو واقعہ پیش آیا تھا۔ اس سے میں کافی متاثر ہو گیا ہوں جو کام میں نے شروع کیا تھا۔ وہ بھی کچھ دن کیلئے رک گیا ہے۔ اب چند روز آرام کرنا پڑے گا۔" شکیلہ نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔"

"نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے شکیلہ! بس رات کے واقعے کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں۔ آخر وہ سب کیا تھا۔ تمہاری سمجھ میں کچھ آتا ہے؟" شکیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک خاموشی سے سوچتی رہی پھر بولی۔

"بس دماغ کچھ گم سم سا ہو رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے دن بھر جسم پر وزن سا طاری رہا ہو۔ میں خود نہیں سمجھ پا رہی کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟" شکیلہ کی یہ بات سن کر میں خاموش ہو گیا۔ لیکن دل میں ہزاروں خوف بھرے خیالات جنم لے رہے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ خود بہ خود ٹھیک ہو جائے۔ بستر پر لیٹے لیٹے کروٹیں بدلتا رہا۔ شکیلہ کے بارے میں تھوڑی دیر کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ سو گئی ہے۔ بچے پہلے ہی گہری نیند سو رہے تھے۔ میں انتہائی کوشش کے باوجود سو نہیں سکا۔ پریشان کن خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس فام ہاؤس کو مکمل کرنے میں رکاوٹ ہو گئی تھی۔ شہر سے مزدوروں کو تلاش کرنا اور یہاں تک لانا بہت مشکل کام تھا۔ نجانے کب تک جاگتا رہا غالباً رات کے دو یا ڈھائی بجے ہوں گے کہ اچانک ہی شکیلہ سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اور میں چونک پڑا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے کسی نے گہری نیند سے جگا دیا ہو۔ میں اسے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے دونوں ہاتھ سیدھے کر کے اپنی جگہ کھڑے ہوتے دیکھا۔ اور جس چیز نے میری گردن دبا دی وہ یہ تھی کہ اس کا چہرہ انگارے کی طرح روشن ہو کر دہکنے لگا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور سر کے بال آہستہ آہستہ پھیلتے جا رہے تھے۔ وہ ایک چھتری کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ پھر وہ ہاتھ سیدھے کئے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اور میرے خوف میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب میں نے دیکھا کہ دروازہ اس کے ہاتھ لگائے بغیر کھل گیا تھا۔

باہر تاریک رات پھیلی ہوئی تھی۔ شکیلہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ میرے بدن پر تھرتھری طاری ہو گئی تھی۔ پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ اعصاب پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ دماغ خوف سے اڑا جا رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ گہری نیند سو جاؤں۔ تاکہ اس خوف سے نجات مل جائے۔ لیکن میری بیوی...... میرے بچے میرا مستقبل سب کچھ داؤ پر لگ گیا تھا۔ میں نے بڑی ہمت کر کے اپنی جگہ چھوڑ دی اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں دروازے کی طرف پہنچ گیا۔ جھانک کر باہر دیکھا تو شکیلہ آگے جا رہی تھی۔ میرے مکان کے وسیع احاطے کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس کا آخری گوشہ کافی فاصلے پر ہے۔ وہاں بھی میں نے ایک کمرہ بنا رکھا ہے۔ جس میں کنسٹرکشن کا کاٹھ کباڑ بھرا رہتا ہے۔ وہ اسی کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ کمرے کے بالکل قریب ہی ایک درخت ہے جس کا سایہ اس کمرے پر رہتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ درخت کے پاس جڑ میں بیٹھ گئی ہے۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ میں آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ جاؤں۔ چناں چہ احاطے کی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے میں بالکل بلی جیسے قدموں سے چلتے ہوئے اس کے اتنے پاس بیٹھ گیا کہ وہاں سے اس کی حرکات کا جائزہ لے سکوں وہ زمین پر جھکی اس طرح زمین کھود رہی تھی کہ جیسے بلی اپنے پنجوں سے زمین کھودتی ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد میں نے اس کے ہاتھ میں کوئی چیز دیکھی۔ آسمان پر چاند بھی نکلا ہوا تھا۔ اور عمارت کے سامنے کے حصے میں ایک طاقت ور بلب بھی روشن تھا۔ اس تیز روشنی میں، میں اس وقت شکیلہ کی تمام حرکتیں دیکھ سکتا تھا پھر میں نے جو منظر دیکھا وہ میرے دل کی حرکت بند کرنے لگا۔

میں نے دیکھا کہ اس نے مٹی کھود کر ایک مجسمہ نکالا ہے۔ اور یہ مجسمہ وہی تھا جسے مصیبت بنا کر میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور جو الماری پر سے غائب ہو گیا تھا۔ شکیلہ نے اسے اس درخت کی جڑ میں ایک اونچی جگہ رکھ دیا۔ اور پھر تقریباً چار فٹ پیچھے ہٹی۔ اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہاتھ اس طرح سیدھے کر لئے کہ جس طرح کوئی عبادت کرتا ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک عجیب و غریب عمل شروع کر دیا۔ اس نے ہاتھ زمین پر ٹکائے اور خود بھی ان کے ساتھ جھکتی چلی گئی۔ پھر پیچھے کی سمت اپنے جسم کو موڑنے لگی۔ اس کے بعد اسی انداز میں اس کی رفتار تیز ہوتی رہی۔ وہ ہاتھ سیدھے کر کے سر نیچے جھکا کر زمین سے لگاتی اور اس طرح پیچھے ہو کر سر عقب میں پیچھے لگا دیتی۔

میں اسے اس عالم میں دیکھتا رہا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ لیکن آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ شکیلہ کے اس انداز میں جنبش کرنے کی رفتار میں تیزی ہونے لگی۔ پھر اتنی تیز ہوئی کہ اس پر نگاہ جمانا مشکل ہو جائے۔ میرا کلیجہ خون ہوئے جا رہا تھا۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ شکیلہ ایک نرم و نازک عورت تھی۔ اس انداز میں جنبش کرنے سے اس کی جو کیفیت ہو سکتی تھی۔ اس کا مجھے احساس تھا۔

میں دونوں ہاتھوں سے دل پکڑے اسے دیکھتا رہا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک یہی عمل دہراتی رہی۔ اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اس کی رفتار سست ہوتی چلی گئی۔ پھر میں نے اس مجسمے کو اٹھا کر واپس اس کی جگہ پر رکھتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس کام سے فارغ ہو کر پلٹی تو میں اس سے پہلے ہی دوڑتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ دل کی جو حالت ہو رہی تھی وہ خدا ہی جانتا ہے۔ میں بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ مگر بدن جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ دماغ جیسے قابو میں نہیں تھا...... آہ یہ کیا ہو گیا۔ میری پیاری بیوی کیسے عذاب کا شکار ہو گئی۔ وہ جس انداز میں نظر آ رہی تھی اس

مسکراہٹ

ایک دیہاتی کو انگریزی سیکھنے کا بڑا شوق تھا وہ ایک استاد کے پاس گیا استاد نے پہلے دن تین حرف سکھائے۔ "یس، نو، ویری گڈ" اتفاق سے اس دن چوری ہو گئی وہ آدمی پکڑا گیا۔

تھانیدار نے پوچھا۔ "چوری تم نے کی ہے۔"

اس نے کہا۔ "یس"

تھانیدار نے کہا۔ "مال واپس کر دو۔"

اس نے کہا۔ "نو"

تھانیدار نے کہا۔ "اس کو بند کر دو۔"

تو دیہاتی نے کہا۔ "ویری گڈ"

﴿شایان خان۔ لاہور﴾

سے اندازہ ہوتا تھا۔ کہ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں بالکل نہیں ہے۔ بہرحال، میں نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کردیا۔ اس طرح تو وہ ہلاک ہوجائے گی اور میرے بچے ماں سے محروم ہوجائیں گے۔ کیا کروں ...... کسی سے کوئی مشورہ کروں۔ واقعات ایسے انوکھے تھے۔ کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ بہرحال یہ ساری صورتحال چل رہی تھی۔ جب میری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ تو میں نے اپنے سسر صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ وہ ہمارے بہت ہی ہمدرد ہیں...... اور بہت ہی اچھے انسان ہیں۔

وہ دوڑے دوڑے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ اور پھر میں نے انہیں تمام تفصیلات بتائیں باقی بات آپ ان سے خود سن لیجئے گا۔" فرقان بیگ نے اپنی کہانی ختم کرتے ہوئے کہا۔ زاہد خان نے اس کے بعد جو کچھ بتایا وہ نعمت علی کے لئے بڑا حیران کن تھا۔ زاہد خان نے کہا۔

"میں ناگ پور پہنچ گیا۔ شکیلہ میری چھوٹی بیٹی ہے۔ میں نے اس کی کیفیت دیکھی اور اس کے بعد ایک رات میں نے شکیلہ کو اس درخت کے پاس جاکر وہ عجیب و غریب حرکت کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ میں نے وہ جگہ دیکھ لی تھی۔ جہاں وہ مورتی دفن تھی۔ میرے کہنے پر فرقان بیگ شکیلہ اور بچوں کو گھومانے پھرانے لے گیا۔ اپنی بیٹی کے لئے میں ہزار جانیں دینے کیلئے تیار تھا۔ میں درخت کی جڑ میں جاکر کدال سے وہ مٹی ہٹائی اور تھوڑی دیر کے بعد کانسی کا وہ مجسمہ نمودار ہوگیا۔ لیکن آپ یقین کریں نعمت علی خان صاحب اس وقت میری عقل نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ مجسمہ درگا دیوی کا نہیں۔ بلکہ "رام رتی" کا تھا۔ وہ سو فیصد رام رتی ہی تھی۔

میں مجسمہ لے کر وہاں سے ہٹ آیا۔ میرا دل جہاں خوف کا شکار تھا۔ وہیں میں غصے کی کیفیت میں بھی تھا۔ میں نے بغیر کسی اطلاع کے ناگ پور چھوڑ دیا اور مجسمے کو لے کر وہاں سے چل پڑا یہاں تک کہ میں اپنے گھر پہنچ گیا۔ یہاں میں نے ایک جگہ منتخب کی۔ اور پھر کوئلوں کا ایک بڑا سا الاؤ بنایا۔ اور اس میں آگ روشن کردی۔ رام رتی کا مجسمہ میرے پاس موجود تھا۔ اور میں شدید غصے کے عالم میں تھا۔ میں نے کوئلے کے دہکتے ہوئے الاؤ میں کانسی کا وہ مجسمہ ڈال دیا۔ اور مجسمے سے باریک باریک چیخیں ابھرنے لگیں۔ پھر میں نے دیکھا۔ کہ وہ مجسمہ سیدھا کھڑا ہوگیا ہے۔ اس کے منہ سے رام رتی کی آواز نکلی۔

"کتنی بار جلائے گا تو مجھے زاہد خان۔ آخرکار تجھے ایک دن میرے کام کیلئے تیار ہونا ہی پڑے گا۔ تو سبھوری کو خون کا غسل دے گا۔ تو اپنے ہاتھ سے اس کی گردن کاٹے گا۔ جس کی گردن کاٹنے کے بعد میرا جیون امر ہوجائے گا۔ اور میں سنسار کی سب سے بڑی قوت بن جاؤں گی۔" یہ کہہ کر رام رتی نے قہقہہ لگایا اور کانسی کا مجسمہ جل کر راکھ ہوگیا۔ یہ بیان زاہد خان کا تھا۔ فرقان بیگ نے کہا۔

"وہ ٹھیکہ ختم ہوگیا۔ شکیلہ ٹھیک ہوگئی لیکن ہم برے حالات کا شکار ہوتے چلے گئے۔ یہ سب جو میں نے بتایا تھا۔ آہستہ آہستہ ختم ہوگیا۔ یہ گھر باقی ہے۔ شکیلہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور اس کے بعد شکیلہ پر کوئی دورہ نہیں پڑا لیکن ہمارے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اب میں ایک جگہ نوکری کرتا ہوں۔ وہ بھی ایک کنسٹرکشن فرم ہے۔ اور بس شکیلہ کے والد صاحب ہماری مدد کرتے رہتے ہیں۔ مگر اب بھی کبھی کبھی ہمیں بڑے خوف کا احساس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے کچھ سرگوشیاں ہمارے اردگرد گردش کررہی ہوں۔

"یہ ساری صورت حال ہے......" نعمت علی نے یہ ساری کہانی سن لی۔ اب اس کے بعد ظاہری بات ہے کہ خیرالدین خیری کا کھیل شروع ہوجانا تھا۔ اسی رات خیرالدین خیری سے مشورہ ہوا۔

"ہاں۔ جناب...... استاد محترم...... اب فرمایئے اس سلسلے میں کیا کرنا ہے؟"

"بات صرف اتنی سی ہے نعمت علی کہ ہم خدائی فوجدار تو ہیں نہیں۔ لیکن کسی کام میں اگر ہاتھ ڈالیں اور ہمیں کامیابی حاصل ہوکر کسی کا بھلا ہوجائے تو یہ تو اچھی بات ہے۔ خاص طور سے تمہارے لئے۔ میں تو زندگی سے محروم ہوچکا ہوں۔ اور میرا یہ اندازہ ہے کہ تم جب تک زندہ ہو، تمہیں بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں بھوج گڑھی کا سفر کرنا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں زاہد خان کو جس کام کے لئے مجبور کیا جارہا ہے۔ وہ کام زاہد خان کو کبھی نہیں کرنا چاہئے۔ ایک مسلمان کیلئے اس طرح کا کوئی عمل ممکن نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ محترمہ رام رتی صاحبہ کس قدر قوتوں کی مالک ہیں یہ تو پتہ چل گیا۔ کہ وہ ایک شیطان صفت عورت ہے اور اپنی شیطانیت کو زیادہ طاقت دینا چاہتی ہے۔ لیکن اسے روکنا ہماری ذمے داری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ بھوج گڑھی کے بارے میں زاہد خان سے معلوم کیے لیتے ہیں اور پھر اپنا کام شروع کیے لیتے ہیں۔ زاہد خان ہی کی زبانی اس کے بیٹے کا حال بھی معلوم ہوا تھا۔ جہاں سے یہ ہی اندازہ ہوتا تھا کہ رام رتی نے زاہد خان کو جو چیلنج دیا ہے۔ کہ جب تک وہ اس کا کام نہیں کرے گا۔ وہ اسے آباد نہیں ہونے دے گی۔ اور اس کے اہل خاندان کو نقصان پہنچاتا رہے گا۔ تو یہ سارا کچھ اس بے چارے کے ساتھ بھی ہوا ہوگا۔ بجائے اس کے کہ ہم۔ اس کی کہانی بھی جاکر سنتے اور اس میں اپنا وقت ضائع کرتے اس لئے بہتر ہے کہ ہم بھوج گڑھی پہنچ کر رام رتی کے خلاف کام شروع کردیں نعمت علی کو خیرالدین خیری کی یہ بات بالکل درست محسوس ہوئی تھی۔

اس کے بعد انہوں نے بھوج گڑھی کے بارے میں تفصیلات معلوم کیں بے چارے زاہد خان کو پتہ بھی نہیں تھا کہ نعمت علی کے علاوہ اور کوئی بھی ہے۔ جو اس کے ساتھ کام کررہا ہے۔ وہ تو اکیلا نعمت علی ہی اس کو، اس کا ذمے دار سمجھتا تھا۔ غرض یہ کہ سارے معاملات طے ہوگئے۔ زاہد خان نے پیش کش کی کہ اگر نعمت علی چاہے تو زاہد خان اس کے ساتھ بھوج گڑھی جاسکتا ہے۔ لیکن نعمت علی نے منع کردیا۔

"نہیں خان صاحب! آپ اپنے گھر پر آرام کریں۔ یہ ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔ میں ہی اسے سرانجام دینے کی کوشش کروں گا۔"

"اللہ تعالیٰ...... آپ کو کامیاب کرے۔ لیکن ایک بات میں آپ سے عرض کردوں۔ وہ یہ ہے کہ زندگی بھی ایک بار ملتی ہے۔ اور موت بھی ایک ہی بار آتی ہے۔ ہم کچھ امیدوں کے سہارے جیتے ہیں۔ میرا مذہب میرا دین کسی بھی طور اس بات کی اجازت نہیں دے گا۔ کہ میں ایک ناپاک وجود کو کامیابی دلانے کے لئے ایک ایسا عمل کروں۔ جو کسی بھی طرح ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ میں رام رتی کا وہ کام کبھی پورا نہیں کروں گا۔ ویسے بھی اب وہ کم بخت بوڑھی ہوگئی ہوگی۔"

"رام رتی کے بارے میں ہمیں معلومات تو ہو ہی جائیں گی لیکن آپ مجھے اس کا حلیہ بھی بتا دیجئے۔" نعمت علی نے خیرالدین خیری کے اشارے پر پوچھا۔ اور زاہد خان اسے رام رتی کا اس وقت کا حلیہ بتانے لگا۔ جب اس کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ بھوج گڑھی کے لئے جانے والی ٹرین رات کو تقریباً ساڑھے نو بجے چل پڑی تھی۔ اور نعمت علی ذہن میں نجانے کیا کیا سوچیں سجائے ٹرین کی آواز سے اپنا ذہن ہم آہنگ کررہا تھا۔

خیرالدین خیری اس وقت نجانے کہاں ہوگا۔ نعمت علی نے یہ بھی سوچا کہ اگر خیرالدین خیری کسی انسانی وجود میں اس کے ساتھ ہو تو کتنا اچھا ہو۔ ایک اچھا دوست ایک اچھا ساتھی۔ زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہوتی ہے۔ ابھی اس نے اتنا ہی سوچا تھا کہ اسے خیرالدین خیری کی آواز سنائی دی۔

"تو کیا میں تمہارا اچھا دوست اچھا ساتھی نہیں ہوں۔"

"ارے ماموں۔ تمہارے اندر بس یہ ہی تو ایک خرابی ہے۔ کہ ہر وقت دماغ میں گھسے رہتے ہو۔ انسان کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ ماموں کبھی کبھی تو دل میں خفیہ خیالات بھی آتے ہیں۔ اب اگر ایسا خیال آجائے۔ تو

"ابھی تم نے اچھے دوست اچھے ساتھی کی بات کی تھی ناں۔ تو اگر تعلقات میں سچائی نہ ہو۔ تو کبھی نہ کبھی وہ ختم ہو ہی جاتے ہیں۔ دل و دماغ میں کوئی بھی بات آئے اسے ظاہر کرنے کے لئے ایک اچھا دوست ایک اچھا ساتھی ضروری ہوتا ہے۔ میں تمہیں اس کے لئے مجبور نہیں کرتا۔ کہ تم مجھے اچھا دوست، اچھا ساتھی سمجھو...... لیکن تمہارے یہ الفاظ مجھے اچھے نہیں لگے۔"

"ارے سوری ماموں۔ سوری...... استاد محترم...... ایسی باتیں نہ کریں...... عزت کا جو مقام آپ نے مجھے دے دیا ہے اب یوں سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نے مجھ سے چھین لیا۔ تو زندگی ہی مجھ سے چھن جائے گی۔"

"میں تمہیں ایک بات بتاؤں نعمت علی! میرا وجود تو اب اس کائنات سے جسمانی رشتہ کھو چکا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی ایک الگ کہانی ہے۔ تم جانتے ہو کہ یہ کہانی بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اور کسی زندہ انسان کے لئے اس کا جاننا بالکل ہی مناسب نہیں ہوتا۔ تو میں تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اچھے دوست اچھے ساتھی کی تلاش ہے۔ تو عشق کرو۔ اگر تم عشق کر بھی لوگے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عشق کرو...... شادی کرو...... بچے پیدا کرو۔ میرا تمہارا ساتھ ہمیشہ ہی رہے گا۔ اور میں تمہیں یہ مشورہ بھی دینے والا ہوں۔ کہ زندگی کے لئے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔ تمہارے ماں باپ کی بھی کچھ خواہشیں ہوں گی۔" نعمت علی حیرت سے یہ تمام باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"استاد محترم! یہ تو آپ نے مجھے ایک نیا ہی راستہ دکھا دیا۔ میں نے تو صحیح معنوں میں آج تک اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ سچی بات ہے۔ کہ ابتداء اسی انداز میں ہوئی تھی بلکہ ابتداء میں کچھ دلچسپ واقعات بھی ہوئے تھے۔" نعمت علی کو ماضی یاد آ گیا۔ لیکن بہرحال اس نے ذہن کو جھٹک دیا۔ پھر بولا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ استاد کی استادی میں یہ بھی کر کے دیکھ لیں گے۔" انسان کس طرح اپنے آپ کو چھپائے۔ جواب میں خیرالدین خیری کی ہنسی کی آواز ذہن میں گونجی تھی۔

سفر جاری رہا۔ اور نعمت علی سوتا جاگتا رہا۔ پھر اس وقت صبح کے پونے پانچ بجے تھے۔ جب خیرالدین خیری نے اسے نیند سے جگا دیا۔

"اگلا اسٹیشن بھوج گڑھی ہے۔" پیچھے اس کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ "ہوشیار ہو جاؤ۔" نعمت علی نے مختصر سا سامان ساتھ لیا ہوا تھا۔ خیرالدین خیری کے سامان کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ٹرین کی رفتار سست ہونے لگی۔ وہ وسل دے رہی تھی۔ اور پھر آہستہ آہستہ رکتی ہوئی وہ ایک ویران سے اسٹیشن پر جا رکی بھوج گڑھی بہت زیادہ بڑا شہر نہیں تھا لیکن بہت خوب صورت جگہ تھی۔ اور وہ سرسبز و شاداب علاقے میں واقع تھی۔ ٹرین رکنے پر کچھ مسافر نیچے اترے۔

نعمت علی بھی نیچے اتر آیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خواب میں بھی اپنی کسی ایسی حیثیت کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ خیرالدین خیری نے اسے بہت بڑا مقام دے دیا تھا۔ ٹرین تھوڑی دیر کے بعد آگے بڑھ گئی۔ تو خیری نے کہا۔

"اب مجھے سب سے پہلے کسی آرام گاہ کی ضرورت ہوگی۔ آؤ باہر چلتے ہیں۔" نعمت علی اپنا مختصر سا سامان اٹھائے ہوئے باہر نکل آیا۔ ابھی پوری طرح صبح نہیں ہوئی تھی اجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ اسٹیشن پر کچھ تانگے وغیرہ کھڑے ہوئے تھے۔ اور منتظر انداز میں سواریوں کی تلاش میں تھے۔ نعمت علی ایک تانگے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے تانگے والے سے کہا۔

"تانگے والے یہاں کوئی اچھا ہوٹل ہے؟"

"ہوٹل تو نہیں ہے صاحب! البتہ دو تین سرائے ہیں۔ اس میں ہندوؤں کی سرائے بھی ہیں اور مسلمانوں کی بھی۔ آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟"

"مسلمان۔" نعمت علی بولا۔

"بس آ جایئے...... تانگے میں بیٹھ جایئے۔"

ایم اے راحت

قسط نمبر: 07

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرہول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دہشت طاری کرتا وقت، جسم و جان پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراؤ، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل و دماغ کو مبہوت کرتی خوف و حیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر و شر کی انوکھی کہانی

تانگہ پختہ سڑک پر مناسب رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اور بھوج گڑھی کے قرب و جوار کے مناظر نمایاں ہوتے جارہے تھے۔ کچے پکے مکانوں پر مشتمل یہ آبادی کافی خوب صورت تھی۔ ہر گھر میں درخت نظر آرہے تھے۔ سبزہ ہر سمت پھیلا ہوا تھا۔ گھاس کے قطعے نمایاں تھے۔ جگہ جگہ مندر نظر آرہے تھے۔ اس وقت مندروں میں عبادت کا وقت ہورہا تھا۔ ناقوس، قرنے، اور گھنٹیوں کی آوازیں فضاء میں ابھر رہی تھیں اور مندروں کے تالابوں پر اشنان ہورہا تھا، کہیں کہیں مساجد بھی تھیں، راستہ طے کرتے ہوئے اذان کی آواز بھی سنائی دی۔ نعمت علی خاموش بیٹھا یہ مناظر دیکھ رہا تھا، اسے اندازہ تھا کہ خود خیر الدین خیری بھی ان مناظر سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ وہ اسی کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اسی کے کانوں سے سنتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے دماغ سے سوچتا تھا اور عمل بھی کرتا تھا تانگہ پکی سڑک پر کچے راستے پر اترا دونوں طرف سرسوں لگی ہوئی تھی۔ ہری ہری ڈنڈیوں پر پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے اور سرسوں کی سوندھی خوشبو فضا میں بکھری ہوئی تھی۔

دور کہیں سے سورج سر ابھار رہا تھا۔ یہ منظر انتہائی حسین تھا۔ کچی سڑک کا راستہ بھی آگے جاکر آبادی سے جاملا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کچے پکے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ جہاں پوجا کے لئے بت بھی رکھے ہوئے تھے تو وہیں مسلمانوں کے گھر بھی صاف دیکھے جاسکتے تھے۔ جس سرائے کے سامنے تانگہ رکا اس کا احاطہ کافی وسیع تھا دیواریں کچی تھیں لیکن اندر پختہ کمرے نظر آرہے تھے۔ احاطہ کافی بڑا تھا اور سرائے کے مالک نے تھوڑی سی خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا تھا۔ یعنی احاطے میں گھنے درخت تھے اسکے علاوہ بڑے خوب صورت پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور وہاں بیٹھنے کے لئے چارپائیاں بھی ڈال دی گئی تھیں۔ تانگے والے نے انہیں وہاں اتار دیا اور بولا۔

"یہ رحمت خان کی سرائے ہے۔ آپ کو یہاں جگہ مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" نعمت علی نے جواب دیا اور اس کے بعد تانگے والے کو پیسے ادا کرکے آگے بڑھ گیا۔

"بڑی اچھی جگہ ہے۔" خیر الدین کی آواز ابھری۔

"ہاں۔ جگہ تو واقعی بڑی خوب صورت ہے ماموں۔"

"چلو اندر چلو۔" نعمت علی اندر داخل ہوگیا۔

اندر کا حصہ بھی کافی صاف ستھرا تھا سرائے کو باقاعدہ ایک ہوٹل کی شکل دی گئی تھی۔ بھوج گڑھی کے بارے میں تفصیلات تو معلوم نہیں تھی کہ کس طرح کی جگہ ہے۔ لیکن اب تک جو کچھ دیکھا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کافی سلیقے سے اسے آباد کیا گیا ہے۔ سرائے کے بڑے حصے میں بیٹھنے کے لئے کرسیاں اور میزیں ڈالی گئیں تھیں۔ جو بیشک گھٹیا قسم کی بنی ہوئی تھیں لیکن بہرحال ان کی موجودگی ہی اس بات کا احساس دلاتی تھیں کہ لوگ یہاں آتے جاتے ہوں گے۔ ایک طرف کاؤنٹر بھی بنا ہوا تھا اور اس کاؤنٹر کے پیچھے ایک عمر رسیدہ عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ سخت چہرے کی مالک اور آنکھوں سے چالاکی جھلکتی تھی۔ نعمت علی کو دیکھ کر اس نے مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"آیئے جناب! آجایئے۔" نعمت علی اس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر بولا

"مسافر ہوں۔ کیا تمہارے ہاں قیام کے لئے جگہ مل سکتی ہے۔"

"کیوں نہیں۔ یہ جگہ ہے ہی قیام کے لئے۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"نعمت علی۔"

"واہ، میرے شوہر کے نام سے ملتا جلتا نام ہے۔ میرے شوہر کا نام رحمت خان تھا۔"

"ٹھیک بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، آپ کا نام کیا ہے؟"

"شادرہ۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا؟"

"شادری..... شادری....."

پیار سے مجھے شادری کہتے ہیں۔" عورت نے کہا۔

"خوب! آپ سے بھی کوئی پیار کرتا ہے۔" نعمت علی کے منہ سے نکل گیا اور عورت نے چونک کر نعمت علی کی طرف دیکھا۔

"کیوں..... کیا مطلب ہے آپ کا اس بات سے؟"

"نہیں..... نہیں معاف کیجئے گا۔ بس ایسے ہی منہ سے نکل گیا تھا۔"

"ہوں۔ کرایہ پہلے ادا کرنا ہوگا۔ کتنے دن قیام کریں گے آپ یہاں؟"

"سرائے پسند آگئی تو دو تین مہینے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ دو تین مہینے آپ کے کرائے میں رعایت ہوجائے گی۔ کھانے پینے کا کیا سلسلہ رہے گا۔"

"میرا خیال ہے کھانا کھانے کی چیز ہوتی ہے۔"

"آپ بہت مذاق کرتے ہیں۔ کھانا کہیں سے کھائیں گے؟"

"لیجئے۔ تو اور کیا۔ کھانا مانگنے کے لئے گھروں کے دروازے کھٹکھٹاؤں گا۔" نعمت علی نے کہا اور شادری یا شادرہ ہنس پڑی۔

پھر بولی..... "نہیں..... نہیں..... آپ کو کھانا مانگنے کی ضرورت نہیں ہوگی آپ آرام سے یہاں رہیں۔ میری بیٹی حمیرا۔ آپ کی بڑی اچھی دیکھ بھال کرے گی۔" شادرہ نے ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سامنے سے آنے والی لڑکی سانولے رنگ کی۔ لیکن دلکش نقوش کی مالک تھی۔ اس کی عمر پچیس، چھبیس سال ہوگی۔ چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے بال بہت خوب صورت تھے اور کافی لمبے لگ رہے تھے جنہیں اس نے ایک خاص انداز میں باندھ رکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی قریب پہنچ گئی۔ تو شادرہ نے کہا۔

"حمیرا۔ انہیں کوئی اچھا سا کمرہ دے دو۔ مسافر ہیں۔"

"کہاں سے آئے ہیں۔ آپ جناب؟"

"بس..... دنیا گرد ہوں، کہیں سے نہیں آیا۔ دنیا کی تلاش میں گھوم رہا ہوں۔ اب بھوج گڑھی آیا ہوں۔"

"گویا۔ آپ اپنے بارے میں بتانا نہیں چاہتے۔"

"یہی سمجھ لیں۔"

"چلیں ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہاں۔ کرایہ پیشگی ادا کردیجئے۔"

"یہ لیجئے۔" نعمت علی نے کافی بڑی رقم نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اور عورت نے گہری نگاہوں سے نعمت علی کو دیکھا۔

"دولت مند آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" اس نے دل میں سوچا۔ پھر اس نے اس میں سے کچھ رقم اٹھالی پھر بولی۔ "یہ ایک ہفتے کا کرایہ ہے۔ اگر ایک ہفتے کے بعد آپ نے یہاں رہنا پسند کیا تو آپ کو دوبارہ کرایہ دینا ہوگا۔"

نعمت علی نے باقی رقم اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔ حمیرا بدستور سنجیدگی سے کھڑی ہوئی تھی۔ پھر نعمت علی اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ حمیرا کی چال بہت دلکش تھی۔ حمیرا اسے ایک کمرے میں لے کر پہنچی کمرہ بہت کشادہ اور وسیع تھا۔ اس میں دو سمت کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔

"یہاں پچھلے دروازے سے آپ کو غسل خانے وغیرہ جانا پڑے گا۔ ہمارے ہاں کیونکہ زیادہ رش نہیں ہے۔ اور غسل خانے کئی ہیں۔ اس لئے آپ کو نہ تو نہانے کی تکلیف ہوگی اور نہ کوئی اور تکلیف۔"

"ٹھیک ہے۔ بہت بہت شکریہ۔"

"یہ بتایئے..... ناشتے میں کیا لیں گے؟"

"کیا..... کیا مل سکتا ہے؟"

"بھوج گڑھی ایک درمیانے درجے کی بستی ہے انڈا، مکھن، سلائس، جوس وغیرہ مل جائے گا۔"

"اور چائے.....؟"

"چائے تو ناشتے کا ایک حصہ ہوتی ہے۔" حمیرا نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی کوئی مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی سنجیدہ سی تھیں نعمت علی نے دل میں سوچا کہ پتہ نہیں یہ لڑکی مسکراتے ہوئے کیسی لگتی ہوگی۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ مسکراتی بھی ہے یا نہیں.....

بہرحال اس نے کہا کہ تھوڑی دیر بعد اسے ناشتا دے دیا جائے اور حمیرا باہر نکل گئی۔ نعمت علی نے سامان رکھا اور پھر بولا۔ "ہاں ماموں کیا کہتے ہو؟"

"اچھی جگہ ہے۔"

"مگر لڑکی پتھر کی بنی ہوئی ہے۔"

"شکل صورت کی بھی اچھی نہیں ہے۔ ایسی لڑکیاں موم کی بنی ہوں یا پتھر کی ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کبھی آپ نے اپنے عشق و عاشقی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ماموں۔"

"چھوڑ یار! جو کچھ بتا چکا ہوں وہ ہی کافی ہے۔ زندگی نے اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ اس طرف بھی توجہ دیتا۔ بہرحال چلو۔ اب تو تم میرا آئیڈیل، میرا گوشت پوست میرا دل دماغ، سب کچھ ہو۔ دیکھیں تم کیا تیر مارتے ہو۔"

"ماموں کہیں تیر مارنے کی جگہ ملے تو تیر بھی ماریں گے۔ اب اتنے نکمے اور ناکارہ بھی نہیں ہیں۔"

"اندازہ ہو رہا ہے مجھے۔ فی الحال تو تم رام رتی کے بارے میں سوچو۔"

"ماموں..... ایک بات بتاؤ.....؟" نعمت علی نے مسہری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اسے صاف محسوس ہوگیا تھا کہ سامنے والی کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ اس وقت اسے اپنے بدن میں بھی ہلکا پن محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا مقصد ہے کہ خیرالدین اس وقت اس کے اندر موجود نہیں ہے۔ بلکہ سامنے بیٹھا ہوا ہے۔"

"ہاں..... پوچھو....." خیرالدین نے کہا۔

"زاہد خان نے جو واقعات بتائے ہیں وہ کافی پہلے کے واقعات ہیں اب تو وہ اچھا خاصا عمر رسیدہ ہوچکا ہے۔ ہم اس کے بیٹے کو بھی دیکھ چکے ہیں یقینی طور پر بیٹی بھی جوان ہوگی تبھی تو اس کی شادی ہوگئی تھی ماموں رام رتی کی کیا عمر ہوگی اس وقت....."

"لو..... کیا وہ میری خالہ زاد بہن ہے جو مجھے اس کے بارے میں اتنی تفصیلات معلوم ہوں۔"

”نہیں میرا مطلب ہے اب تو وہ ایک بوڑھی عورت ہوگی......؟“

”کیا کہا جاسکتا ہے۔ یہ تو اس سے ملنے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ مگر اب ذرا یہ بتائے ماموں کہ اب پروگرام کیا ہے؟“

”تم ایسا کرو۔ یہاں آرام سے رہو۔ ہوسکے تو تفریح کے طور پر اس لڑکی سے عشق لڑاؤ۔ میں ذرا بھوج گڑھی کا چکر لگا کر آتا ہوں۔ صورتِ حال کا پتہ لگاؤں گا کہ کیا ہے؟“

”ٹھیک ہے ماموں۔ تمہارے عیش ہیں۔“

”نہیں تمہارے بھی عیش ہوسکتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”ہر چیز کا مطلب۔ فوراً نہ پوچھ لیا کرو۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو وقت خود بہ خود بتاتا ہے۔“

”یار ماموں منطق مت جھاڑا کرو ایک طرف تو اتنی اچھی دوستی کی بات کرتے ہو۔ اور دوسری طرف کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو چھپا کر رکھتے ہو۔ یہ دوہری پالیسی ہے۔“

”صاحبزادے۔ دوہری پالیسی ہی آج کل رائج ہے۔ صاف ستھری طبیعت کو کون پسند کرتا ہے۔ سمجھ رہے ہو۔“

”بس......بس، گاڑھی گاڑھی باتیں۔ میرے ابا جی بھی مجھے سمجھاتے رہتے تھے بیکار ہے ان گاڑھی باتوں کا تذکرہ۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے تم ناشتا کرو۔ میں چلتا ہوں۔“

”ناشتے کے بعد میں سو جاؤں گا ماموں۔“

”تو! میں نے کون سی رکاوٹ ڈالی ہے۔ تمہاری نیند میں۔ آؤں گا جگالوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ نعمت علی کو محسوس ہوا کہ خیرالدین خیری دروازہ کھول کر باہر نکل گیا ہے۔ اس وقت اسے اپنا ذہن بھی اتنا ہلکا محسوس ہورہا تھا۔ وہ ابھی کپڑوں میں مسہری پر لیٹ گیا۔ ٹرین میں خاصی رات گزاری تھی۔ اور سوتا جاگتا رہا تھا۔ لیکن اس وقت بھی اس کی پلکوں پر نیند آرہی تھی۔ اس نے سوچا کہ ناشتا کرنے کے بعد ہی سوئے گا۔ پھر وہ اس لڑکی حمیرا کے بارے میں سوچنے لگا۔

حمیرا اس عورت کی بیٹی ہے۔ لیکن رحمت خان کہاں ہوسکتا ہے وہ کوئی نکما آدمی ہو۔ اور یہ ماں، بیٹی مل کر ہی ہوٹل چلاتی ہوں۔ شادری کافی تیز طرار عورت معلوم ہوتی تھی انہیں باتوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر پچھلے دروازے سے باہر نکلا غسل خانہ دیکھا۔ نہانے کا تو اس وقت کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا موسم بھی خنک تھا اور پھر کپڑے وغیرہ بھی نکالنے پڑتے۔ اس نے سوچا کہ یہ سب کچھ بعد میں کرے گا۔ منہ ہاتھ دھوکر وہ اندر آگیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ خیرالدین اس سے بہتر ہے۔ کہ نہ اسے کپڑوں کی حاجت ہے نہ کھانے پینے کی۔

بڑی عجیب شخصیت تھی۔ خیرالدین کی لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ کہ وہ ایک اچھا دوست تھا۔ پتہ نہیں اس وقت کیا وقت ہوا تھا کہ حمیرا اندر داخل ہوئی اس نے پہلے دروازے پر دستک دی تھی اور اس کے بعد دروازہ کھول کر اندر آگئی تھی۔ ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ اور ٹرے میں چائے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ چائے دانی کی ٹونٹی سے گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اور چائے کی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی اس نے ناشتا لاکر رکھ دیا۔ ابلے ہوئے انڈے۔ دو انڈوں کا آملیٹ، مکھن، اور تازہ ڈبل روٹی تھی۔

”اور کچھ درکار ہو تو بتا دیجیے گا!“

”نہیں حمیرا۔ بہت بہت شکریہ۔“

”دوپہر کے کھانے میں کیا کھائیں گے؟“

”لیجیے......ابھی تو ناشتا ہی کررہا ہوں۔“

”نہیں میرا مطلب ہے۔ ہمارے ہاں۔ ہندو بھی کافی آتے ہیں ان کے لیے سبزی ترکاری بنتی ہے اور گوشت کے لیے خاص طور سے کہنا پڑتا ہے۔“

”میں سبزی، ترکاری ہی کھالوں گا۔ بہت زیادہ گوشت خور نہیں ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ ہمارے ہاں کی سبزی آپ کو بہت پسند آئے گی۔“ حمیرا نے کہا اور مشینی انداز میں واپس چل پڑی۔

نعمت علی نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ناشتے میں مصروف ہوگیا اس نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا۔ چائے کی کئی پیالیاں پیں پھر برتن اٹھا کر ایک طرف رکھ دیئے۔ ابھی تک اس کا ذہن سادہ ہی تھا کوئی اور گہری بات اس نے نہیں سوچی تھی۔

بستر پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور نیند اس طرح آنکھوں میں گھس آئی جیسے اس کے لیٹنے ہی کا انتظار کررہی ہو پھر کوئی ساڑھے بارہ بجے کے قریب حمیرا ہی نے اسے جگایا تھا۔

”اٹھیے جناب! ساڑھے بارہ بج چکے ہیں آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔“ نعمت علی نے آنکھیں کھول کر اس لڑکی کو دیکھا۔ بڑی پراسرار شخصیت لگ رہی تھی اس کی۔ وہ ہنس کر بولا۔

”بھوک لگ رہی ہوتی تو میں خود بہ خود جاگ جاتا۔“

”معافی چاہتی ہوں۔ ایک دو دن آپ یہاں رہیں گے تو مجھے آپ کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوجائیں گی۔ کہ آپ کس وقت کیا چاہتے ہیں؟“

”کچھ تفصیلات اگر ابھی مل سکیں تو بڑی اچھی بات ہوگی۔“

”جی......جی کہیے۔“

”سرائے میں اس وقت کتنے مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”کل پانچ افراد ہیں۔“ تین میاں بیوی۔ دو ایسے لوگ ہیں جو یہاں کپاس خریدنے کے لیے آئے ہیں۔ بھوج گڑھی کپاس کی بڑی منڈی ہے۔ ہمارے ہاں۔ جو مہمان آتے ہیں وہ عام طور سے کپاس کے خریدار ہی ہوا کرتے ہیں۔“

”اور وہ تین جوڑے جن کے بارے میں آپ نے کہا تھا؟“

”شاید۔ وہ بھی کپاس ہی کے خریدار ہوں۔ بعض اوقات خواتین مردوں سے ضد کرتی ہیں کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی چلیں گی۔ یہ میں صرف اپنے اندازے کی بنا پر کہہ رہی ہوں۔“ حمیرا کے بولنے کا انداز کچھ مشینی سا ہی تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرتا تھا۔ نعمت علی نے اس پر کوئی زیادہ توجہ نہیں دی۔

اصل میں وہ بالکل بھی اس پر توجہ نہ دیتا۔ لیکن خیرالدین نے اس کا ذہن بھٹکا دیا تھا۔ اس نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس سے عشق کرے اور ان دنوں نعمت علی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ زندگی کا ایک ہی حصہ نہیں ہوتا بلکہ زندگی کئی حصوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر حصہ اپنی کچھ ضرورتیں چاہتا ہے۔ حمیرا نے کہا۔

”جناب! آپ کھانا کتنی دیر میں کھائیں گے؟“

”دے دینا جب دل چاہے۔“

”کھانا تیار ہوچکا ہے۔ آپ جب حکم دیں گے۔“

”ایک گھنٹے کے بعد۔ میں ذرا نہاؤں گا۔ پتہ نہیں یہ غسل خانہ خالی ہے یا نہیں۔“

”آپ کے کمرے کے سامنے جو غسل خانہ ہے۔ وہ خالی ہی ہوگا۔ میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ یہاں سامنے والی قطار غسل خانوں ہی کی ہے ہم نے اپنے مہمانوں کی آسائش کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔“

”مگر ایک بات بتایئے حمیرا۔ کیا یہاں مہمانوں کی خاطر مدارت کرنے والی آپ تنہا ہیں؟“

”فی الحال تو تنہا ہی ہوں۔ کچھ لوگوں سے ہماری جان پہچان ہے بھوج گڑھی میں بہت زیادہ روزگار نہیں ہے۔ جب ہم ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں مہمان زیادہ ہیں تو وہ ہمارے پاس آجاتے ہیں ہم انہیں کچھ پیسے دے دیتے ہیں۔ جب مہمان کم ہوتے ہیں تو میں ہی ان کی خدمت کرتی ہوں۔“

”حمیرا......آپ......میرا مطلب ہے۔ رحمت

خان۔“

”جی میں رحمت خان کی بیٹی ہوں۔“

”اور شادری ......؟“ نعمت علی نے سوال کیا تو حمیرا نے نگاہیں اٹھا کر نعمت علی کو دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”شادری۔ رحمت خان کی بیوی ہیں۔“

”تمہاری ماں؟“ نعمت علی نے سوال کیا تو حمیرا نے پھر نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بولی۔

”آپ کے لئے اگر کوئی خاص چیز درکار ہو تو لے کر آتی ہوں۔“ وہ واپس مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ لیکن نعمت علی سوچتا رہ گیا۔ کہ اس سوال پر حمیرا کا رویہ کچھ عجیب سا کیوں ہو گیا تھا۔ اگر شادری یا شادرہ رحمت خان کی بیوی ہے تو پھر وہ اس کی ماں کیوں نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے منہ سے اس بات کا اقرار نہیں کیا تھا کہ شادری اس کی ماں ہے۔

بہر حال اپنے ذہن کو الجھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے آواز دی۔

”ماموں...... کہاں ہو!......؟“ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر وہ ہنس کر فوری بولا۔

”ماموں...... مزے کر رہے ہو۔ میں بھی ذرا بھوج گڑھی دیکھنے کے لئے نکلوں گا۔ تم پتہ نہیں کہاں کس چکر میں پھنسے ہوئے ہو۔ کیا رام رتی تک پہنچ گئے۔ لیکن یہ باتیں وہ خود ہی بڑبڑا کر رہ گیا۔ البتہ شام کو تین بجے کے قریب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ باہر جائے گا۔ اور اس کے بعد وہ باہر نکل آیا۔ باہر دروازے میں تالا لگا ہوا تھا۔ جس کی چابی اسے دے دی گئی تھی۔ وہ دروازے کو تالا لگا کر باہر نکل آیا بھوج گڑھی کے بارے میں اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا۔ جب وہ اسٹیشن سے باہر نکلے تھے کہ شہر زیادہ بڑا نہیں ہے لیکن خوب صورت ہے خاص طور سے وہاں سبزہ بے پناہ ہے اور جگہ جگہ لوگوں نے پھلوں کے درخت بھی لگائے ہوئے ہیں۔ شہتوت کی میٹھی میٹھی خوشبو ابھر رہی تھی۔ دیکھنے سے محسوس ہوا کہ یہاں شہتوت کے درخت بہت زیادہ ہیں۔

بہر حال وہ کافی دیر تک بھوج گڑھی کے مختلف علاقوں میں گھومتا رہا۔ راستوں کو اس نے اچھی طرح یاد رکھا تھا۔ خاصا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ جب وہ واپس سرائے میں آیا اندر پہنچنے کے بعد اس نے آواز دی۔

”ماموں...... آ گئے کیا......؟“

”ہاں...... آ گیا ہوں۔“

”کیوں...... کیسا دن گزرا......؟“

”بہت اچھا۔ بھوج گڑھی بہت خوب صورت جگہ ہے۔“

”اور رام رتی......؟“

”وہ کمبخت اتنی ہی خوب صورت ہے۔ بالکل جوان کیا بتاؤں تمہیں بس رس بھری لگتی ہے۔ میرے ذہن میں اس کا یہ ہی نام آیا تھا۔ رام رتی کے بجائے اسے رس بھری ہونا چاہئے تھا۔“

”اماں...... ماموں کیا تمہیں زاہد خان کی سنائی ہوئی کہانی یاد نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”زاہد خان نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ وہ خونخوار بلی بن جاتی ہے۔ اگر تم ایسی صورت میں اسے دیکھ لو ...... تو......؟“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟ میں تو ایک بات پر حیران ہوں بھانجے۔“ ”کیا...... کیا......؟“

”ہماری دن میں بھی یہ ہی بات چیت ہوئی تھی کہ اگر زاہد خان کی عمر اتنی آگے بڑھ چکی ہے تو رام رتی بھی اب بوڑھی ہو چکی ہوگی۔ لیکن تم اسے دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ وہ بالکل نوجوان ہے۔“

”ہوں...... اس سے اندازہ ہوتا ہے ماموں کہ وہ واقعی کوئی خطرناک ہی چیز ہے۔“

”سو فیصد...... سو فیصد...... بڑا شاندار محل بنا رکھا ہے اس نے بڑی عمدہ جگہ ہے۔ اس محل میں بہت سارے لوگ ہیں۔ خاصی معلومات حاصل کر کے آیا ہوں میں اس کے بارے میں۔“

”ٹھیک ٹھیک...... پھر کیا ارادے ہیں ماموں......؟“

”نہیں...... ابھی دو چار دن تک جائزہ لیں گے اور غور کریں گے کہ کون سا ذریعہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم رام رتی تک پہنچ جائیں۔“

”دیکھو بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارا واسطہ عام طور سے روحوں سے پڑا ہے اور ہماری کوشش ہے کہ ہم ان پر قابو پالیں ایسا ہو بھی گیا ہے لیکن رام رتی ایک باقاعدہ جادوگرنی ہے۔ ایک شیطان صفت عورت، زاہد خان جو کچھ بتا چکا ہے اس پر بھی غور کرو۔ وہ اس کے اپنے الفاظ میں خون کا غسل کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ امر ہو جائے پتہ نہیں کیا کیا جادو منتر آتے ہیں اسے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم مار کھا جائیں۔ کسی بھی طرح اس کا جائزہ لینا ہوگا اور یہ سوچنا ہوگا کہ کون سا راستہ ہو سکتا ہے جو ہمیں اس کی گردن تک پہنچا دے۔“

”ٹھیک ہے ماموں! مجھے بھی کیا جلدی ہے۔ میں نے بھی تھوڑا سا بھوج گڑھی کا نظارہ کیا ہے۔ اچھی جگہ ہے ابھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ اس کے بارے میں لیکن میں نے یہ دیکھا کہ یہاں مسلمانوں کو بھی آزادی حاصل ہے اور ہندوؤں کو بھی وہ مندروں میں اپنی پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ اور مسلمان مسجدوں میں اپنی عبادت کرتے ہیں۔“

”ہاں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر تم رام رتی کی بات کرتے ہو تو وہ بھوج گڑھی کی مالک تو نہیں ہے وہ یہاں کی ایک دولت مند عورت ہے ویسے اس کے پتی کا نام سنگرام سنگھ ہے۔ سمجھ رہے ہو ناں تم۔“

”ہاں...... تو پھر؟“

”کیا زاہد خان کی کہانی میں سنگرام سنگھ کا کوئی تذکرہ تھا؟“ خیر الدین خیری نے کہا۔ اور نعمت علی سوچ میں ڈوب گیا۔

”دور کی کوڑی لاتے ہو ماموں! کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”سنگرام سنگھ کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ میں یہ بھی معلوم کرنے میں ناکام رہا ہوں کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اب دنیا ہی میں نہ ہو۔ مگر زاہد خان نے اس کا کوئی خاص تذکرہ نہیں کیا۔ باتیں رام رتی تک ہی رہی تھیں یا پھر اس کا ایک آدھا منہ چڑھا ملازم جیسے بھیم چند...... یا شرما شرما نام لیا گیا تھا۔ اب ان لوگوں کے بارے میں بھی پتہ نہیں کہ زندہ ہیں یا نہیں۔“

”بڑی سنجیدگی سے غور کر رہے ہو۔ استاد محترم۔“

”ظاہر ہے۔ ہم یہاں جھک مارنے تو نہیں آئے۔ بھوج گڑھی اچھی جگہ بے شک ہے۔ لیکن ایسی جگہ بھی نہیں ہے کہ ہم مزے کی زندگی گزاریں۔“

”ایک بات تو تم نے کبھی نہیں بتائی ماموں! اپنے بارے میں۔“

”ہاں...... بولو۔“

”تفریحات کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“

”بتائی تو ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گھما پھرا کر تم مجھ سے میرے بارے میں پوچھا کرتے ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا ناں! کہ زندگی مشکلات ہی میں گزری ہے اور کبھی اپنی ذات کے لئے کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

”اور اب ماموں۔ تم مر چکے ہو۔“

”زندہ ہوں ناں...... میں نے کہا ناں، تمہارے وجود میں زندہ ہوں۔ تم جس چیز سے لطف محسوس کرتے ہو۔ وہ مجھے بھی اچھی لگتی ہے اور میں اپنے آپ کو تمہارے روپ میں ڈھال لیتا ہوں۔“

”مار دیا ماموں! اس کا مطلب ہے کہ ہر چیز میں تمہارا حصہ ہوگا۔“

”نہیں ہونا چاہئے کیا......؟“

”نہیں ماموں نہیں۔ میری جان حاضر ہے۔ تمہارے لئے کیونکہ تم نے جو زندگی مجھے دے دی ہے۔ ماموں وہ کسی بھی طرح مجھے ملنا مشکل تھی۔ نعمت علی نے یہ الفاظ بڑے خلوص سے کہے تھے۔ درحقیقت وہ خود کچھ بھی نہیں تھا۔ اور اس نے محسوس کر لیا تھا کہ خیر الدین خیری نے اپنے علم، اپنی طاقت، اپنی قوتیں، اس میں

منتقل کردی ہیں۔ اس بات کا اندازہ اسے اچھی طرح تھا۔ اور وہ جگہ جہاں وہ خود کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ خیرالدین خیری کی مدد اس کے لئے بڑی کارآمد ہوجاتی تھی۔ بہرحال اس کے بعد خاموشی طاری رہی۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔

پھر وہ مختلف باتیں کرتے رہے۔ اور نعمت علی نے خیرالدین خیری کو بتایا۔

"اس لڑکی! حمیرا سے کئی باتیں ہوئی ہیں۔ بڑی عجیب اور خاموش خاموش سی لڑکی ہے۔ اور ایک خاص بات ماموں میں نے اس سے رحمت خان کے بارے میں پوچھا تھا۔

ابھی تک ہمیں رحمت خان نظر نہیں آیا۔ وہ عورت شادری ہی یہاں کی مالک نظر آتی ہے اور ہر طرح کی دیکھ بھال کرتی ہے حمیرا کو وہ اپنی بیٹی بتاتی ہے اور حمیرا نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ وہ رحمت خان کی بیوی ہے لیکن اس نے یہ بات نہیں مانی کہ وہ اس کی ماں ہے۔"

"اچھا تو پھر؟"

"نہیں بس ایسے ہی ماموں۔ میں نے تذکرے کے طور پر تمہیں بتایا ہے۔ خیرالدین خیری نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ رات کا کھانا بھی کافی اچھا تھا اس کھانے میں اسے تلی ہوئی مچھلی پیش کی گئی تھی۔ جو کافی لذیذ تھی۔ خیرالدین خیری نے یہ ہی کہا تھا کہ یہاں دو چار دن آرام کیا جائے اس موضوع پر بات بھی ہوئی تھی نعمت علی نے پوچھا۔ "تو ماموں میرا یہاں کیا پروگرام رہے گا۔ تم تو ظاہر ہے کہ رام رتی کے بارے میں معلومات حاصل کروگے۔"

"کچھ نہیں...... کچھ نہیں کل سے تم بھوج گڑھی کی سیر کرو۔ کسی بات کی پرواہ مت کرنا مجھے جب بھی آواز دو گے میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ میرا مطلب ہے اگر کسی مشکل میں گھر گئے تو یا کوئی بہت ہی خاص بات دیکھنے کو آئی تو مجھے آواز دے لینا۔"

"ٹھیک ہے...... ماموں دیکھیں کتنے دن لگتے ہیں یہاں؟"

"کیوں دل نہیں لگ رہا کیا؟" خیرالدین خیری نے سوال کیا۔

"ابھی دل لگانے کی کوشش کروں گا ماموں...... ابھی آئے ہوئے وقت ہی کتنا گزرا ہے......؟"

"دل لگانے کے لئے وہ لڑکی بھی کیا بری ہے جس کا نام حمیرا ہے۔"

"دیکھوں گا...... دیکھوں گا۔ ابھی یہ ضروری تھوڑی ہے کہ وہ میری جانب متوجہ ہو ہی جائے۔"

"ایک بات تم سے کہوں۔ بھانجے؟ تم نے کبھی اپنے آپ پر غور ہی نہیں کیا تم بے حد پرکشش نوجوان ہو۔ اکھاڑوں میں ورزش کرتے رہے ہو۔ اس لئے تمہارا جسم بھی بہت خوب صورت ہے تمہیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"

"ہاں...... ماموں! کیوں پھنسا رہے ہو۔ آج تک تو کسی نے گھاس نہیں ڈالی۔"

"گھاس کھانے کا شوق ہے تو باہر چلے جاؤ...... بہت مل جائے گی۔" خیرالدین خیری نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ اور نعمت علی ہنسنے لگا۔

بہرحال اچھا دوست ملا ہوا تھا۔ اسے دنیا کا سب سے حیرت انگیز دوست! اس وقت رات کے کوئی ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ جب اچانک ہی نعمت علی کو سوتے سے جگا دیا گیا۔

"کک...... کک...... کون...... کیا بات ہے......؟"

"اٹھو یار! بعض راتیں سونے کے لئے نہیں ہوتیں اور ہم یہاں کچھ کرنے آئے ہیں بہت سی چیزیں نیند سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔"

"تو تقریر کیوں کررہے ہو۔ مجھے بتاؤ ناں مجھے کیا کرنا ہے۔" نعمت علی نے کہا۔

"جوتے پہنو اور میرے ساتھ آجاؤ۔" خیرالدین خیری بولا۔ اور نعمت علی نے جلدی سے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی خاص ہی بات ہوگی

جو خیرالدین خیری نے اس وقت اسے جگایا ہے۔ خیرالدین خیری کے اشارے پر وہ باہر نکل آیا۔ سرائے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ وہ سرائے کے مین دروازے پر آگئے ابھی تک کچھ علم تو نہیں تھا لیکن لازمی بات تھی کہ رات کو یہ دروازہ اندر سے بند کرلیا جاتا ہوگا۔ لیکن اس وقت دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور شاید اسے باہر سے بند کردیا گیا تھا۔ لیکن بات خیرالدین خیری کی تھی دروازہ کھل گیا۔ اور نعمت علی باہر نکل آیا۔

"چلو...... چلو...... سیدھ میں چلو۔" خیرالدین خیری کی آواز اس کے ذہن میں ابھری اور وہ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ سامنے ایک وسیع و عریض میدان تھا جسے عبور کرنے کے بعد مکانات کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو میدان کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلے ہوئے تھے ان کے درمیان راستے بنے ہوئے تھے مکانوں کا ایک طویل سلسلہ دور تک چلا گیا تھا اور انہیں بڑے سلیقے سے بنایا گیا تھا۔

ان کے اختتام کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ اور ایک لمبی پگڈنڈی دور تک چلی گئی تھی۔ تب نعمت علی نے پہلی بار پگڈنڈی پر کسی انسانی وجود کو دیکھا۔ جو ڈھیلے ڈھالے سیاہ کپڑوں میں ملبوس بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ نعمت علی کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"یہ کون ہے...... استاد محترم!"

"حمیرا۔" خیرالدین کی آواز نے نعمت علی کو چونکا دیا۔ اس کے بعد اس نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ خیرالدین خیری نے اس وقت اسے کیوں جگایا ہے آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اور حمیرا اس وقت نجانے کہاں جارہی تھی...... بات واقعی ذرا سنسنی خیز سی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ خیری سے کوئی سوال کرتا۔ جو کچھ تھا اس کی نگاہوں کے سامنے ہی تھا اور وہ دیکھ سکتا تھا۔

چنانچہ وہ خاموشی سے اس سائے کا تعاقب کرتا رہا۔ خیری کے کہنے پر اس نے یہ بات مان لی تھی کہ وہ "حمیرا" ہے ورنہ اور کوئی ثبوت تو اس کے پاس تھا نہیں کہ وہ اسے حمیرا ہی سمجھ لیتا۔ کافی فاصلہ طے ہوا اور اس کے بعد تاروں کی چھاؤں میں ایک کھنڈر نما عمارت نظر آنے لگی جو دور ہی سے دیکھنے پر بے حد پراسرار اور خوفناک لگتی تھی۔ تاروں بھری رات میں وہ بے حد پراسرار اور بھیانک نظر آرہی تھی۔ حمیرا کا رخ اسی جانب تھا۔ اگر وہ واقعی حمیرا تھی تو...... اور خیری کا کہا ہوا کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا تھا۔ خیرالدین نے کہا۔

"چلو...... وہ اندر داخل ہوگئی ہے۔ رفتار تیز کرو ہمیں اسے نگاہوں میں رکھنا ہے نعمت علی نے دوڑ لگائی اور آن کی آن میں وہ کھنڈرات تک پہنچ گیا سامنے ہی قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اور کالے کپڑوں میں ملبوس سایہ نظر آرہا تھا۔ نعمت علی اس کا تعاقب کرنے لگا عمارت باہر سے قدر بوسیدہ تھی اور اندر سے اتنی خراب نہیں تھی وہ قدیم طرز کی کوئی عمارت تھی پراسرار اور قدیم طرز تعمیر کا نمونہ غلام گردشیں اور محرابیں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں پتہ نہیں اس عمارت کی حیثیت کیا تھی لیکن بہرحال اس میں بہت سے دروازے بھی نظر آرہے تھے نعمت علی انتہائی کامیابی سے حمیرا کا تعاقب کررہا تھا۔ وہ ایک دروازے کے سامنے رکی۔

پھر اس نے کوئی چیز نکالی۔ غالباً موم بتی تھی اس نے موم بتی روشن کی اور دروازے کو کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ اندر پہنچ کر اس نے موم بتی ایک جگہ لگائی اور ایک چارپائی کے پاس پہنچ گئی۔ جس پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

"بابا......" چارپائی پر لیٹا ہوا شخص جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا موم بتی کی ملگجی روشنی میں مدھم مدھم چیزیں نظر آرہی تھیں۔ چارپائی پر جو شخص بیٹھا ہوا تھا اس کا حلیہ بھی آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔ کوئی بوڑھا ہی آدمی تھا بوسیدہ کپڑے بکھرے ہوئے بال، داڑھی، حمیرا کا چہرہ بھی اب اچھا خاصا صاف نظر آرہا تھا وہ بوڑھے آدمی کو پیار کررہی تھی اور پھر اس نے پوٹلی سے کھانا نکالا اور

بوڑھے آدمی کو اپنے ہاتھوں سے کھلانے لگی۔

بوڑھا جلدی جلدی کھانا کھا رہا تھا۔ حمیرا کافی دیر تک اسے کھانا کھلاتی رہی۔ پھر اس نے ایک گھڑے میں سے پانی نکال کر اسے پلانے لگی۔

"چائے..... چائے نہیں لائی بیٹی؟" بوڑھے نے سوال کیا۔

"چائے کل لاؤں گی بابا! بہت دور کا فاصلہ طے کر کے آنا پڑتا ہے ناں؟"

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا اور حمیرا خاموش ہو گئی۔ پھر بولی۔

"چلتی ہوں۔ بابا! آپ کو تو پتہ ہے کہ سرائے سے دور رہنا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"بیٹی..... اللہ تیری حفاظت کرے۔"

"خدا حافظ۔" حمیرا کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی اس کے بعد وہ واپس پلٹی اور دروازے سے باہر نکل آئی۔

نعمت علی خاموش کھڑا رہا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ حمیرا سامنے والی راہ داری سے بھی دور نکل گئی ہے۔ تو نعمت علی نے کہا۔

"اب کیا کریں۔ کیا اس بوڑھے کو دیکھیں؟"

"جانے دو اسے..... دور نکل جانے دو بلکہ آؤ جا کر دیکھتے ہیں کہ وہ چلی گئی کہیں اسے کوئی شبہ نہ ہو جائے یا وہ واپس نہ آ جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" نعمت علی نے کہا اور راہ داری میں آگے بڑھ گیا۔ وہ لوگ کھنڈر کی عمارت سے بھی باہر نکل آئے۔ حمیرا ان کی موجودگی سے بے خبر سیدھی چلی جا رہی تھی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو یہ واپس پلٹ پڑے تھوڑی دیر میں یہ اسی کھنڈر میں کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ گئے جس کے دوسری طرف بوڑھا قیدی موجود تھا وہ اس وقت بھی پلنگ پر دراز تھا غالباً پیٹ بھر کر کھانا مل گیا تھا اس لئے آرام کی نیند سو رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر بوڑھے کے پاس پہنچ گیا تب ہی نعمت علی نے اسے آواز دی۔

"بابا جی.....! اٹھ جاؤ۔" نعمت علی نے بوڑھے کو گھبراہٹ کے عالم میں اٹھتے ہوئے دیکھا وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ رہا تھا۔ کیونکہ لڑکی شمع واپس لے گئی تھی اور کمرے میں مکمل اندھیرا ہو گیا تھا اچانک ہی نعمت علی کو اپنے ہاتھ میں کوئی چیز محسوس ہوئی اس نے اسے ٹٹول کر دیکھا تو موم بتی تھی۔ ساتھ ہی ماچس بھی تھی یہ کام بھلا خیری کے سوا اور کون کر سکتا تھا۔ اس نے موم بتی روشن کر کے ایک بلند جگہ پر رکھی اور بوڑھا آنکھیں پھاڑنے لگا اس نے حیرانی سے نعمت علی کو دیکھا تھا اور بار بار آنکھیں مل مل کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"کک..... کیا ہوا.....؟ کیا بات ہے؟ کون ہو تم بھائی؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کھایا..... میں تو بھوکا ہوں تم یقین کرو میں نے کچھ بھی نہیں کھایا۔" بوڑھے کے انداز میں انتہائی خوف تھا۔ نعمت علی اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگا پھر اس نے کہا۔

"بابا.....! اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارا کوئی دشمن ہوں تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میرا نام نعمت علی ہے اور میں بس یوں سمجھ لو کہ اتفاقیہ طور پر ہی تم تک پہنچ گیا ہوں۔ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری بیٹی تمہارے لئے کھانا لے کر آئی تھی۔ میں مسافر ہوں کہیں دور سے آیا ہوں اور تمہاری سرائے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔

رات کے اس حصے میں مجھے تمہاری بیٹی حمیرا کی حرکتیں کچھ مشکوک سی لگیں تو میں اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ گیا جہاں تک میرا خیال ہے وہ تمہاری بیٹی ہے۔ یا پھر کوئی اور ہے وہ؟"

"تم..... تم..... تم..... بھوج گڑھی کے رہنے والے نہیں ہو؟"

"نہیں بابا! میں کہیں اور سے آیا ہوں۔ بھوج گڑھی میں مجھے کوئی کام تھا۔ میں نے تمہیں بتا دیا ناں، کہ تمہاری سرائے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"تب پھر بھائی! واپس چلے جاؤ۔ یہ جگہ بہت

خوفناک ہے۔ یہاں آنے کے بعد لوگ مشکل ہی سے واپس جاتے ہیں تم چلے جاؤ میرے بارے میں معلوم کر کے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔"

"سنو..... بابا! فضول باتوں سے گریز کرو۔ جو کچھ تم سے پوچھا جا رہا ہے اس کا ایک ایک لفظ صاف صاف بتا دو۔ ورنہ پھر..... بہت سے لوگوں کو بتا دیا جائے گا کہ تمہاری بیٹی رات کو یہاں کھانا پہنچاتی ہے۔"

"ارے نہیں..... نہیں..... میں نے تو اسے بہت منع کیا ہے۔ پر وہ نہیں مانتی وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ وہ میری ہی بیٹی ہے بھائی! مگر کیا نام بتایا تم نے اپنا؟"

"نعمت علی۔"

"ہاں..... نعمت علی۔ تم ان چکروں میں مت پڑو۔ بڑی خطرناک کہانی ہے میری، تمہیں معلوم ہو جائے گی تو بلاوجہ تم ایک دشمنی مول لے لو گے۔"

"آخری بار کہہ رہا ہوں۔ بابا! کہ جو کچھ پوچھ رہا ہوں وہ سب کچھ سچ سچ اور بے دھڑک بتا دو۔ اس کے بعد میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ البتہ تمہاری بیٹی کی مصیبت آ جائے گی۔ کیا میں جاؤں؟"

"نہیں..... نہیں..... تم..... تم میری بیٹی۔ میری بیٹی، بوڑھے کی آواز روہانسی ہو گئی۔

"تو بس پھر جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں وہ مجھے بتا دو۔"

"میرا نام رحمت علی ہے اور اس سرائے کا مالک میں ہی ہوں۔"

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا بھوج گڑھی آ کر یا آنے سے پہلے تمہیں یہاں کی ایک دولت مند عورت بلکہ ایک طرح سے یہ کہنا چاہئے کہ بھوج گڑھی کی مالک رام رتی کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔ کیا تم نے سنگرام سنگھ کے بارے میں کچھ سنا ہے؟"

"ہاں..... میں نے رام رتی کا نام بھی سنا ہے، اور سنگرام کا بھی۔ سنگرام سنگھ کے بارے میں تو میں زیادہ نہیں جانتا، لیکن رام رتی کے بارے میں مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک جادوگرنی ہے۔"

"ایسی ویسی جادوگرنی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کتنی خوف ناک ہے۔"

"مجھے اس کے بارے میں ایک ایک لفظ صاف صاف بتاؤ۔ بابا۔"

"اب میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔ تم نے مجھے جو دھمکی دی ہے وہ میرے لئے بہت زیادہ خوف ناک ہے اللہ تعالیٰ میری بیٹی کو زندہ سلامت رکھے۔ بڑا پیار کرتی ہے مجھ سے بھائی! رام رتی جادوگرنی ہے اور میں اس جادوگرنی کا قیدی ہوں۔"

"قیدی؟"

"ہاں....."

"کیوں۔ اس نے تمہیں کیوں قید کر رکھا ہے.....؟"

"سنو!..... رام رتی بڑی ہی خوف ناک عورت ہے۔ وہ ایک جاپ کر کے خود کو مہان کرنا چاہتی ہے اور اس کے لئے اسے چھ مسلمانوں کا ایمان خراب کرنا ہے اور یہ ذمہ داری وہ مجھے دینا چاہتی تھی۔ چونکہ میں بھی مسلمان ہوں اور یہاں بھوج گڑھی میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جو ہیں بھی تو وہ ذرا بے چارے مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ رام رتی نے مجھے اپنے کام کے لئے منتخب کیا۔ اس نے مجھے میری اس چھوٹی سی سرائے کو ایک محل میں تبدیل کر دینے کا لالچ دیا اور کہنے لگی کہ میں اس کا ایک کام کروں..... میں نے پوچھا کہ "وہ کام کیا ہے؟" تو وہ بولی۔

"تمہاری سرائے میں اجنبی مہمان آ کر ٹھہرتے ہیں۔ اور چونکہ تم ایک مسلمان ہو اس لئے عام طور پر مسلمان ہی تمہاری سرائے میں آ کر ٹھہرتے ہیں اور تمہارے ہاں کھاتے پیتے ہیں تم ان چھ مسلمانوں کو میرا دیا ہوا گوشت پکا کر کھلا دو۔ یہ گوشت مہینے میں ایک دن، مہینے کے پہلے منگل کو جب چاند نکلا ہوا ہو اس وقت یہ گوشت تمہیں پہنچا دیا جائے گا اور تم اسے پکا کر منگل چنڈی کو وہ گوشت اسے کھلا دو۔ وہ مسلمان میرا غلام بن

جائے گا۔ اور میں اس سے اپنا کام لے لوں گی۔ وہ کوئی گندہ جاپ کرنا چاہتی ہے اور وہ گوشت جو مجھے ان مسلمانوں کو کھلانے کے لئے دیتی ہے۔ وہ کسی بہت ہی گندے جانور کا گوشت ہوتا ہے۔ بھائی! میں نے اس کی بات نہیں مانی وہ بہت دن تک کوششیں کرتی رہی۔ اور مجھے طرح طرح سے لالچ دیا۔ مگر میں نے نہیں مانا۔ تب اس نے ایک اور گندہ کام کیا۔ میری صرف ایک ہی بیٹی ہے حمیرا بس دماغ کی خرابی تھی کہ میں شادی کرنا چاہتا تھا میری بیٹی نے بھی مجھے اس کی اجازت دے دی تھی۔

حالانکہ ایسی بات نہیں تھی میں ٹھیک ٹھاک زندگی گزار رہا تھا مگر پھر بھی میرے دل میں یہ خیال آیا اور میں نے کوشش کرنا شروع کر دی تب وہ کمبخت شادرہ یا شادری میرے پاس آئی اس نے اپنے آپ کو لاوارث ظاہر کیا اور بتایا کہ وہ دوسرے شہر سے آئی ہے اور زندگی گزارنے کے لئے اپنا ٹھکانہ چاہتی ہے اچھی شکل وصورت کی مالک تھی میں نے اسے شادی کی پیش کش کر دی۔

وہ تو آئی ہی اس لئے تھی۔ چنانچہ میں نے اس سے شادی کر لی تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو رام رتی ہی کی بھیجی ہوئی ہے رام رتی نے مجھے یہاں قید کر دیا دیکھو! میرے پیروں میں یہ زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ جادو کی زنجیریں ہیں انہیں کوئی کاٹ نہیں سکتا۔ میں یہاں سے فرار نہیں ہوسکتا۔ مجھے یہاں جینا اور مرنا..... شادری کوشش کر رہی ہے کہ منگل چندی کو آنے والے مسلمانوں کو وہ گوشت کھلا کر ان کا ایمان خراب کر دے اور انہیں اپنا قیدی بنا لے۔ مگر حمیرا نے یہ کام نہیں ہونے دیا۔

”وہ کیسے؟“

”بس۔ منگل چندی کو رام رتی کسی بھی آنے والے مہمان کے لئے جب بھی کھانا پکواتی ہے تو حمیرا چالاکی سے وہ گوشت بدل دیتی ہے۔ اور مسلمان مہمانوں کا ایمان خراب ہونے سے بچ جاتا ہے ابھی تک شادری یا رام رتی کو اس بات کا شبہ نہیں ہوسکا ہے کہ حمیرا اس طرح کی چالاکی کرتی ہے۔ بلکہ بس وہ حیران ہوتے ہیں کہ ان کا کام کیوں نہیں ہو رہا۔ میں نے حمیرا سے کہا ہے بھائی! کہ وہ سرائے، ورائے چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

مگر وہ کہتی ہے۔ ”دیکھ لینا بابا! ایک دن میں تمہیں رام رتی کے قبضے سے آزاد کراؤں گی بس مجھے ایسا کوئی مل جائے جو میری مدد کرے۔“

”وہ کیا جاپ کر رہی ہے؟ ایسا کون سا جاپ ہے؟“ خیرالدین کے اشارے پر نعمت علی نے بوڑھے سے سوال کیا۔ اور بوڑھے نے گردن جھکا لی وہ کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

”بھائی! میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو؟“ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میری بیٹی کو کوئی نقصان پہنچے۔ جتنی معلومات مجھے ہے میں اس کے بارے میں تمہیں بتا رہا ہوں میں پڑھا لکھا آدمی ہوں اور میں نے افریقہ کی ایک جادوگرنی کے بارے میں تفصیل پڑھی تھی۔

وہ جادوگرنی صدیوں سے زندہ تھی اور اپنی حسن وجوانی کو قائم رکھنے کے لئے وہ آگ کے شعلوں میں نہا کر پھر سے جوان ہو جایا کرتی تھی اور اس سے وہ لمبی عمر حاصل کر لیا کرتی تھی وہ جو عمل کرتی تھی اس کے بارے میں کسی طرح رام رتی کو معلوم ہو گیا رام رتی نے ایک آتش کدہ بنایا ہوا ہے اور وہ اس آتش کدے میں آگ کا غسل کرتی ہے ابھی تک یہ ہی سنا گیا ہے کہ وہ بھی افریقہ کی اس جادوگرنی کی طرح لمبی عمر حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ لیکن شاید ابھی اس کا کام نہیں بنا وہ اپنے طور پر جاپ کر رہی ہے اور اس کے لئے اسے اپنے دین دھرم سے الگ ایک بندہ درکار ہے یعنی چھ ایسے مسلمان جن کا ایمان خراب کر کے وہ ان کی بھینٹ لے گی اور اس طرح اس کا جاپ مکمل ہو جائے گا میں نے تو یہ ہی سنا ہے بس میرے علم میں یہ بات آ گئی تو میں نے اسے قبول نہیں کیا تو اس نے مجھے یہاں بند کر دیا ہے۔

چوتھے پانچویں دن اس کا کوئی آدمی یہاں آ جاتا ہے اور مجھے گندے گلے سڑے پھل دے جاتا ہے تاکہ میں زندہ رہوں یہ زنجیریں جو اس نے میرے

پیروں میں ڈال رکھی ہیں جادو کی زنجیریں ہیں اور انہیں توڑنا مشکل کام ہے۔“

”ہوں..... تو تمہاری بیٹی حمیرا وہ گوشت بدل دیتی ہے جو وہ دیتی ہے۔“

”ہاں..... بھائی! اگر کسی دن شادری کو پتہ چل گیا تو میری بیٹی کی بھی شامت آ جائے گی دیکھو! اللہ کو کیا منظور ہے۔“

”ٹھیک..... تمہارا نام رحمت خان ہے ناں؟“ نعمت علی نے سوال کیا۔

”ہاں..... بھائی۔ یہ ہی ہے۔ بس اور کیا کریں۔ جتنی زندگی ہے گزار لیں گے یہاں بیٹی کی فکر ہے۔“

”رحمت علی، اگر میں تم سے یہ بات کہوں کہ اب تم حمیرا کی فکر مت کرو، انشاء اللہ تعالیٰ میں اس کی مدد کروں گا اور رام رتی کو فنا کے گھاٹ اتار دوں گا۔“ نعمت علی نے کہا تو بوڑھے رحمت خان نے گردن جھکا لی پھر وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

”تمہارے دل میں یہ عزم ہے تو بس اس کے بارے میں یہ ہی کہوں گا کہ اللہ تمہاری مدد کرے۔ جو کچھ وہ ہے ناں تم نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے۔ اس کی عمر بہت لمبی ہے پتہ نہیں کب سے جی رہی ہے اور میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ اس نے سنگرام سنگھ کو بھی غائب کر رکھا ہے۔ مہاراج سنگرام سنگھ کے بارے میں سنا یہ گیا ہے کہ وہ بھی یاتراؤں پر گئے ہوئے ہیں۔ لیکن بس وہ یاترا کچھ زیادہ ہی لمبی ہوگئی ہے۔ کیونکہ سنگرام سنگھ کبھی واپس نہیں آئے اور کبھی کسی نے یہ سوال کیا تو وہ دوبارہ یہ سوال کرنے کے لئے جیتا نہیں رہا۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات ایسا ہوا ہے اور سنگرام سنگھ کے بارے میں عام طور سے یہ خیال ہے کہ رام رتی نے انہیں کبھی کا موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔“

”حکومت رام رتی کے خلاف کچھ نہیں کرتی؟“

”ہاں..... یہ ہی تو بات ہے، حکومت کے بڑے بڑے ہرکارے رام رتی کے مہمان ہوتے ہیں، وہ انہیں

اپنے جادو کے پھیر میں لے آتی ہے۔ وہ یہاں سے خوشی خوشی جاتے ہیں اور رام رتی کے خلاف آج تک کسی نے کچھ نہیں کیا۔"

"ٹھیک ہے..... بہر حال تم بے فکر رہو۔ تمہاری حمیرا کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور ہم لوگ آخری حد تک کوشش کریں گے کہ رام رتی کا وجود اس دنیا سے مٹ جائے۔" بوڑھے نے بے یقینی سے گردن ہلائی۔ اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا۔

"خدا کرے تم جو سوچ رہے ہو وہی کر سکو۔"

"ہم اب چلتے ہیں۔ ہاں، ایک بات کا تم نے جواب نہیں دیا۔" رام رتی جو تمہارے پاس گلے سڑے پھل بھیجتی ہے ان کا تم کیا کرتے ہو۔"

"چھپا کر رکھ دیتا ہوں۔ جب حمیرا آتی ہے تو انہیں اٹھا کر لے جاتی ہے اور کہیں ضائع کر دیتی ہے۔"

"کیا رام رتی کو آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ تمہاری بیٹی چوری چھپے یہاں آتی ہے۔ وہ بہت مغرور ہے وہ سوچتی ہے کہ دنیا میں کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس لئے اس نے کبھی اس بات پر توجہ نہیں دی۔ اور پھر تم تو دیکھ چکے ہو کہ ایک بالکل معمولی سا غریب سا آدمی ہوں۔ میرے معاملے میں تو وہ کبھی بھی نہیں سوچتی۔ اسی لئے میں اور میری بیٹی آج تک محفوظ ہیں۔"

"چلو یہ اچھی بات ہے۔ تمہارے حق میں جاتی ہے۔" نعمت علی نے کہا اور اس کے بعد وہ وہاں سے چل پڑا۔

بڑا عجیب و غریب انکشاف تھا۔ نعمت علی خاموشی سے اس بارے میں سوچ رہا تھا اور اپنا سفر طے کر رہا تھا اچانک ہی اسے ایک جھپکی سی آئی اور وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ لیکن جب اس نے اپنے آپ کو سنبھالا تو اس نے دیکھا کہ وہ سرائے کے اندر ہے اپنے اسی کمرے میں جہاں ان کا قیام تھا۔ وہ دنگ رہ گیا تھا۔ یہ کیا ہوا تھا سمجھ میں نہیں آیا لیکن اسی لمحے اسے خیرالدین کی آواز سنائی دی۔

"ضروری تھا حمیرا کے یہاں آنے سے پہلے ہمیں پہنچ جانا تھا۔"

"تو پھر؟" نعمت علی نے سوال کیا۔

"پہنچ گئے۔" خیرالدین خیری کی شگفتہ آواز سنائی دی۔

"ماموں! جب تم یہ سب کچھ کر سکتے تھے تو بہت سے معاملات میں مجھے کیوں آگے بڑھا دیتے ہو۔"

"نہیں میرے دوست نہیں غلط فہمی کا شکار نہ ہو اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم دنیا میں کچھ بھی کر لو۔ موت کے بعد تمہیں زیادہ بڑی قوتیں مل جائیں گی تو تمہارا خیال غلط ہے میں نے زندگی میں تھوڑی سی جدوجہد کی ہے بہت سے علوم سیکھے ہیں بس یوں سمجھ لو ان میں سے بھی کبھی کسی علم کا فائدہ اٹھا لیتا ہوں۔ ورنہ یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی عامل ہوں اور وہ سارے کام کر سکتا ہوں۔ جو زندہ افراد اپنی زندگی میں نہیں کر سکتے۔ اگر تم نے یہ سوچا تو خود میرے لئے بھی مصیبت بن جائے گی۔ بیٹھو..... بیٹھ جاؤ۔ حمیرا کو تو ابھی آنے میں دیر لگے گی اور ویسے بھی ہمیں اس سے کوئی کام نہیں ہے۔"

"یار کمال کی شخصیت ہے۔ ماموں تمہاری۔" نعمت علی بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا تو خیرالدین کی آواز سنائی دی۔

"بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں نعمت علی جن میں خدا کی قدرت بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ یہ عورت جس کا نام رام رتی ہے۔ گندے علوم کی ماہر معلوم ہوتی ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ اپنے گندے علوم کے ذریعے اس نے بہت سے مسائل پر قابو پایا ہوا ہے۔ لیکن نعمت علی یہ بھی نہ سوچنا کہ کسی کو اگر عارضی کامیابی مل جاتی ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اس نے زندگی میں سب کچھ حاصل کر لیا نہیں میرے دوست ایسا نہیں ہے کہیں نہ کہیں کوئی ایسا سقم ضرور رہ جاتا ہے جو بعد میں گردن میں رسی کا پھندا بن جاتا ہے اور یہ ہی تقدیر کا کھیل ہوتا ہے جس کی ڈور کہیں اور سے ہی ہلائی جاتی ہے تم نے دیکھا کہ وہ عورت جس کے بارے میں زاہد خان نے

تفصیلات بتائی تھیں۔ آج تک زندہ سلامت ہے نوجوان اور خوب صورت ہے گویا اس نے بوڑھے رحمت خان کے کہنے کے مطابق کچھ ایسی چیزیں ایجاد کر لی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنا حسن و جوانی برقرار رکھے ہوئے ہے افریقہ کی اس پراسرار عورت کی طرح جس کی داستان سرزمین مصر سے چلتی ہے اور افریقہ کے ان پراسرار گوشوں میں شاید آج تک اس کی حکومت قائم ہے رام رتی نے شعلوں کا غسل اسی سلسلے میں کیا ہوا ہے اور اس کے لئے وہ اپنے گندے علوم کا سہارا لے رہی ہے۔

لیکن کیا دلچسپ بات ہے کہ اپنے اس علم کی تکمیل کے لئے اسے مسلمان کے خون کی ضرورت ہے وہ گناہ بھی کرانا چاہتی ہے تو کسی اللہ کے بندے سے سمجھ رہے ہو ناں، تم یقین کرو قیامت تک اسے کامیابی حاصل نہیں ہوگی چونکہ اللہ اپنے دین کی حفاظت خود کرتا ہے۔ تو کس کی مجال ہے کہ جو اس دین میں کوئی تحریف کر جائے۔

بس غلط خیال ہی انسان کو دیوانہ کئے ہوئے ہے اور یہ دیوانگی دیوانگی ہی رہے گی اس سے کبھی دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اب تم دیکھو! میں نے رحمت خان سے گلے سڑے پھلوں کے بارے میں پوچھا تھا تو اس نے بتایا کہ وہ مغرور عورت کبھی اس بات پر غور بھی نہیں کرتی کہ رحمت خان جیسا ناتواں آدمی کبھی اسے کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے یہ ہے خدا کی قدرت اسے غرور دے کر اس سے سب کچھ چھین لیا۔" نعمت علی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے کتنی بڑی بات کی تھی۔ خیرالدین خیری نے۔

واقعی وہی سرکشی گردن کا پھندا بن جاتی ہے جس میں انسان خود کو مکمل سمجھ لیتا ہے۔

"چلو اب چھوڑو۔ ہمارا ایمان ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ سوچ رہی ہے وہ غیر فطری ہے۔ لیکن انسان ابدی زندگی نہیں پا سکتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے فانی رکھا ہے وہ فانی ہی رہے گا آنے کے بعد جانا لازمی ہوتا ہے خیر ہم کن چکروں میں پڑ گئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تقریباً تمام داستان ہمارے سامنے آ چکی ہے۔"

"ہاں....." استاد معظم! میں بھی یہ ہی کہہ رہا تھا کہ رام رتی کی شخصیت سامنے آ چکی ہے۔ میرا خیال ہے اب مجھے اس سے مل لینا چاہئے آپ کی رہنمائی میں۔"

"نہیں..... مناسب نہیں ہوگا کالے علم کی ماہر ہے اس کے پاس بھی جادوئی قوتیں ہوں گی ہمیں اس کے مزاج کے مطابق ہی کھیلنا چاہئے دیکھ بھال نے میں کوئی عامل نہیں ہوں بس تھوڑی بہت سدھ بدھ کچھ معاملات میں ہے اور چونکہ دنیا مجھ سے دور ہو چکی ہے اس لئے تیرا وجود تیری دوستی میرے لئے باعث قدر ہے بہت زیادہ تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا ہو سکتا ہے اس کا کالا علم کہیں ہم پر حاوی بھی ہو جائے لیکن اسے دانہ ڈالنے کے لئے ہمیں کچھ اور کرنا ہوگا۔"

"کیا۔ استاد محترم؟"

"تجھے سادھو بننا ہوگا۔"

"سادھو؟"

"ہاں..... ایک صاحب کرامت سادھو جس کی دھوم بہت جلدی مچ جائے گی اور آخرکار رام رتی کو اس کی جانب متوجہ ہونا پڑے گا اس طرح تو اس کے کھیل میں شریک ہو جانا اور اسے بتانا کہ تو اسے وہ امر شکتی دے سکتا ہے جس کی وہ خواہش مند ہے نعمت علی سنسنی خیز نگاہوں سے سامنے دیکھنے لگا تھا وہ چشم تصور سے خیرالدین خیری کے پراسرار وجود کو دیکھ رہا تھا جس کے نقوش اس کی نگاہوں میں واضح نہیں تھے خیرالدین خیری نے جو کچھ منصوبہ پیش کیا تھا وہ بڑا ہی سنسنی خیز اور صحیح معنوں میں دلچسپ تھا خیرالدین کی آواز ابھری۔

"بس اب سو جاؤ..... میرا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن تمہیں اپنے آپ کو تر و تازہ رکھنے کے لئے وہ تمام انسانی عمل کرنا پڑیں گے جو زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے میں چلتا ہوں تم آرام کرو۔" اور نعمت علی بستر پر لیٹ کر خیرالدین کے بارے میں سوچنے لگا۔

کیا عجیب و غریب ساتھی ملا ہے اسے۔ شاید ہی

کبھی کسی کو ایسے واقعات سے سابقہ پڑا ہو دوسری صبح حمیرا نے ان لوگوں کو ناشتا پیش کیا اس کا رویہ تمام مہمانوں کے ساتھ ایک جیسا ہوتا تھا خیرالدین کا کہیں بھی وجود نہیں تھا اس کا اندازہ نعمت علی کو اپنے بدن کے ہلکے پن سے ہو جاتا تھا جب خیرالدین اس کے وجود میں سمایا ہوتا تو اسے مسلسل یہ احساس رہتا کہ اسکا سر وزنی ہے اور کوئی اس پر مسلط ضرور ہے۔

حمیرا کے اندر کوئی خاص بات نہیں تھی نہ ہی دن کے کسی حصے میں خیرالدین نے اس سے کوئی رابطہ قائم کیا۔ ہاں وہ خود بارہ بجے کے بعد گھومنے کے لئے نکل گیا تھا بھوج گڑھی کی سیر بھی ضروری تھی اس وقت وہ بھوج گڑھی کے نجانے کون سے حصے میں تھا جب اچانک ہی اسے خیرالدین خیری کی آواز سنائی دی۔

”نعمت علی۔ وہ جو سامنے گاڑی جا رہی ہے ناں اس پر بیٹھ جاؤ تمہیں ایک جگہ لے جانا چاہتا ہوں۔“ نعمت علی نے سامنے جاتی ہوئی بیل گاڑی کو دیکھا اور پھر تیز تیز چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا بیل گاڑی والا شکل وصورت سے کوئی مسلمان ہی معلوم ہوتا تھا بیل گاڑی پر سبزی لدی ہوئی تھی نعمت علی نے اسے سلام کیا تو اس نے بیل گاڑی روک لی اور اس کے سلام کا جواب دیا۔

”کہاں جا رہے ہیں بابا؟“

”انمولہ میں رہتے ہیں بھائی ہم بھوج گڑھی سے سبزی لے کر انمولہ جا رہے ہیں۔ انمولہ ہمارے گاؤں کا نام ہے۔“

”مجھے ذرا آگے تک لے جائیں گے؟“

”ہاں...... ہاں بھائی آؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ تمہیں کہاں جانا ہے؟“

”بس ایسے ہی تھوڑا سا آگے تک۔“ نعمت علی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی بان نے کہا۔

”کچھ سبزی کھالو۔ گاجریں ہیں، مولی ہے، ٹماٹر ہیں، اور تو بھیا ہم کیا خاطر مدارت کریں تمہاری۔“

”نہیں بابا جی! ٹھیک ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ انمولہ چھوٹا سا گاؤں ہے؟“

”ہاں بھیا بہت چھوٹا سا کیا تم ان علاقوں کے نہیں ہو۔“

”نہیں...... بس میں ایسے ہی گھوم پھر رہا ہوں ان علاقوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ارے بھیا یہ علاقے دیکھنے والے ہیں کہاں یہاں تو بس موت ہی کا راج ہے۔“

”موت کا راج؟“

”ہاں بھیا پتہ نہیں ہمارے بڑوں نے کون سے ایسے گناہ کئے تھے جس کے نتیجے میں برسوں سے ہم پریشانیاں دیکھ رہے ہیں تم نے رام رتی کا نام سنا ہے۔“ بوڑھے نے کہا اور نعمت علی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں کچھ سنا تو ہے مگر کچھ تفصیل نہیں معلوم اس کے بارے میں۔“

”جادوگرنی ہے سسری لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہے حرام زادی نے نجانے کون کون اس کے ہاتھوں نقصان اٹھا چکا ہے جس کے پیچھے پڑ جائے اس کا جینا حرام کر دیتی ہے بھوج گڑھی کے آس پاس کے جتنے باغ اور کھیت ہیں جو ہر طرح کا اناج اور پھل دینے والے ہیں اس نے اپنے جادو ٹونوں سے ان پر قبضہ جما لیا ہے ان کے مالکوں کو خون کی الٹیاں کرادی ہیں اور وہ بے چارے اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں بس بھیا زندگی عاجز ہے کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی اس کی مشکل کا شکار ہیں۔“ بوڑھا اپنے دل کی باتیں بتاتا رہا کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد خیرالدین نے کہا۔

”بس اب یہاں اتر جاؤ۔“ نعمت علی نے بوڑھے سے کہا۔

”بابا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ مجھے یہیں اترنا تھا۔“

”یہاں...... اس ویرانے میں یہاں کیا کرو گے بھیا اتر کر؟“

”بس ایسے ہی میں نے کہا ناں کہ میں موجی آدمی ہوں۔ تھوڑا سا گھوموں پھروں گا ان علاقوں میں پھر کسی کی بیل گاڑی میں بیٹھ کر آبادی تک پہنچ جاؤں گا۔“

”اچھا شوق ہے۔ بھیا تمہارا وہ جو کہتے ہیں ناں کہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ آزاد پنچھی ہو جہاں چاہو اڑتے چلے جاؤ۔“ نعمت علی نے ہنس کر بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی سے اتر گیا۔ بوڑھے نے بیل گاڑی آگے بڑھا دی تھی جب بوڑھا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو خیرالدین نے کہا۔

”بائیں سمت یہ جو کچی پگڈنڈی جا رہی ہے یہاں سے بائیں سمت آبادی بھی ہے لوگ عام طور سے ادھر سے گزرتے رہتے ہیں وہ سادھو والا کھیل یہاں بہت اچھا رہے گا میں یہاں ایک مٹھ بنائے دیتا ہوں اس جگہ کا انتخاب میں نے ایک خاص وجہ سے کیا ہے۔“

”جیسا آپ کا حکم ماموں۔ جیسا آپ چاہو۔“

”آؤ...... واپس چلتے ہیں۔“

”ارے باپ رے کیسے...... پیدل؟“

”نہیں...... پیدل نہیں تمہارے لئے سواری کا بندوبست کرتا ہوں اچانک ہی پھر نعمت علی کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بچا لیکن جب آنکھ کھلی تو بھوج گڑھی میں اپنی سرائے والے کمرے میں تھا۔

”ماموں...... یار! کھوپڑی کو اتنا مت ہلاؤ کہ پگھل کر پانی ہو جائے جب اس طرح مجھے یہاں لا سکتے ہو اس طرح وہاں تک کیوں نہیں لے گئے۔ جہاں تم نے مٹھ یا استھان بنانے کے لئے کہا ہے۔“

”بھانجے پہلے بھی بول چکا ہوں کہ ہر بات میں مت ٹوکا کرو۔ کچھ مصلحتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں نگاہوں میں رکھنا ہی پڑتا ہے خیرالدین خیری کے ساتھ فائدے ہی میں رہو گے۔ اچھا اب ہمیں ایک کام کرنا ہے میں اس بارے میں بہت کچھ سوچتا رہا ہوں یہ جگہ جو میں نے تلاش کی ہے ناں یہاں تمہاری شہرت بہت جلدی ہو سکتی ہے کیونکہ اس طرف لوگ بہت زیادہ آتے جاتے رہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ ماموں جو تم مناسب سمجھو۔“

”ذرا اس عورت کو دیکھنا ہے۔ اس سے حمیرا کی جان بھی بچ جائے گی۔“

”کون عورت؟“

”شاوری کی بات کر رہا ہوں۔“

”ہاں۔ اس کے بارے میں تو پتہ چل گیا ناں۔ کہ وہ رام رتی کی ہرکارہ ہے اور اس کے لئے شیطانی کام کرنے یہاں آ بیٹھی ہے۔ مسلمانوں کی سرائے ہے پتہ نہیں کب کسے کوئی نقصان پہنچا دے۔“

”اس کا کچھ کریا کرم ہونا ضروری ہے۔“

”کیا کرو گے؟“

”بتاؤں گا۔“ خیرالدین نے کہا۔

پھر کچھ اور وقت گزر گیا۔ خیرالدین اپنے معاملات میں مصروف تھا نعمت علی کو یہاں کوئی خاص لطف نہیں آ رہا تھا وہ جلد سے جلد رام رتی کے مدمقابل آ جانا چاہتا تھا۔ بس اس کا بھی مزاج کچھ ایسا ہی بن گیا تھا۔ بے چارے زاہد خان، اس کے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ جو حادثات اور واقعات پیش آ چکے تھے۔ ان کا تو کوئی ازالہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن رام رتی کے بارے میں ان لوگوں کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ وہ انسانیت کے لئے کتنا بڑا خطرہ ہے۔ اور اس کا آزاد رہنا اور اپنے گندے مقاصد میں کامیاب ہونا سخت نقصان کی بات ہے۔ اور انہیں اس نقصان سے بچانا تھا پتہ نہیں کب آنے والے وقت میں کون بے چارہ اس کا شکار ہو جائے۔

تیسرے دن حمیرا دن کے کوئی گیارہ بجے کے قریب نعمت علی کے پاس آ گئی۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے نعمت علی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں جناب!“

”آیئے...... آیئے......“ نعمت علی کسی قدر حیرانی سے بولا۔

”آپ میرے باپ کے پاس گئے تھے مجھے یقین ہے آپ مجھ سے جھوٹ نہیں بولیں گے۔“

”جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ خیرالدین نے نعمت علی کے کان میں سرگوشی کی۔ ”جی ہاں

گیا تھا۔"

"آپ کو ان کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

"کچھ نہیں جس رات کی بات آپ کے والد صاحب نے آپ سے کی ہے اس رات میں آپ کا تعاقب کرتا ہوا ان کھنڈرات تک پہنچا تھا اور وہاں میں نے دیکھا تھا کہ آپ نے اپنے باپ کو کھانا کھلایا اور اس کے بعد وہاں سے واپس چلی آئیں۔ میں نے آپ کے والد صاحب سے ان کے بارے میں تفصیلات معلوم کیں۔"

"کیوں......؟" حمیرا نے سوال کیا۔

"انسانی فطرت سے مجبور ہو کر۔"

"کیا آپ یہ معلومات رام رتی کو دے کر اپنے لئے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

آپ کو اس انداز میں سوچنا حق بجانب ہے جب انسان پریشان کن حالات سے گزر رہا ہوتا ہے۔ تو اسے ہر طرف اپنے دشمن ہی نظر آتے ہیں لیکن میں آپ کو بتادوں کہ میں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔ میں رام رتی کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم......؟" حمیرا نے نعمت علی کو عجیب سے انداز میں دیکھا۔

"ہاں......میں۔"

"کاش......تم ایسا کرسکو۔"

"اب جب ساری باتیں کھل ہی گئی ہیں۔ تو حمیرا میں آپ سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔" اس بار نعمت علی کے منہ سے جو الفاظ نکلے تھے۔ وہ اس کے نہیں بلکہ خیرالدین کے تھے۔ حمیرا نے چونک کر اسے دیکھا تو خیرالدین نے نعمت علی کے کان میں سرگوشی کی۔

"سامنے والی الماری میں ایک لیموں جیسا پھل رکھا ہوا ہے۔ یہ بے مزہ ہے اور اس میں سے صرف پانی نکلتا ہے اس پھل کا عرق جس طرح بھی ممکن ہوسکے شادری کو پلا دینا ہے تم اس سے یہ بات کرو۔" نعمت علی نے آہستہ سے گردن ہلائی اور بولا۔

"ہاں......حمیرا مجھے یہ معلوم ہوچکا ہے کہ رام رتی نے اس عورت کو جو تمہاری اصل ماں نہیں ہے یہاں اس سرائے میں ایک خاص مقصد کے تحت بھیجا ہے اور اسی نے تمہارے باپ رحمت خان کو اپنے چنگل میں پھانس کر اس بے چارے کو وہاں قید کرا دیا ہے اس پھل کا عرق جو میں تمہیں دینے والا ہوں جس طرح بھی ہوسکے شادری کو پلا دو اس کے بعد ہم دوسرے عمل کا آغاز کریں گے۔" نعمت علی نے وہ پھل نکال کر نعمت علی کو دیتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے......اس سے کیا ہوگا؟"

"حمیرا......اگر تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارے والد صاحب بھی ان مشکلات سے بچ جائیں اور رام رتی جیسی خطرناک عورت کا خاتمہ ہوجائے۔ تو سب سے پہلے تم یہ کام کرو ممکن ہے اس کے بعد بھی تم سے کوئی کام لینے کی ضرورت پیش آجائے۔" حمیرا نے عجیب سی نگاہوں سے نعمت علی کو دیکھا اور پھر وہ پھل لے لیا۔

"مجھے کسی کا ایک جملہ یاد ہے اور اس جملے نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا ہے۔ جملہ یہ تھا۔ "اگر تو اپنے کسی دکھ کے علاج سے مایوس ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تجھے خدا پر یقین نہیں۔" بس اس جملے نے میری زندگی بدل دی ہے مجھے یقین ہے کہ میرے بابا۔ رام رتی کے چنگل سے آزاد ہوجائیں گے اور ہم لوگ ایک بار پھر آرام کی زندگی گزار سکیں گے۔"

"میں انتظار کروں گا کہ جب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اس پھل کا عرق شادری کو پلا دیا ہے۔ کیا یہ مشکل کام ہوگا تمہارے لئے؟"

"نہیں۔" حمیرا نے جواب دیا اور اس کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل گئی دروازے پر رک کر اس نے کہا۔

"میں نے تم پر بھروسہ کرلیا ہے میرے باپ کی زندگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا، تمہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی اور پھر دوسرے ہی دن اس نے اطلاع دی کہ شادری کو اس پھل کا عرق پلا دیا گیا ہے نعمت علی نے خاص طور سے شادری پر نگاہ رکھی دن کے کوئی گیارہ بجے کے قریب شادری سے چیخنے

چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی اور اس کا رنگ نیلا پڑ گیا تھا۔

نعمت علی جانتا تھا کہ یہ اسی پھل کے عرق کا نتیجہ ہے۔

بہرحال بھاگ دوڑ ہوئی۔ بھوج گڑھی میں کوئی وید جی بھی تھے انہوں نے آکر شادری کو دیکھا سمجھ تو کچھ نہیں پائے تھے الٹی سیدھی دوائیں دے کر چلے گئے اور شادری کمرہ نشین ہوگئی بعد میں خیرالدین نے نعمت علی کو بتایا کہ شادری کو فالج ہوچکا ہے۔ اس کا دماغ ماؤف ہے اور بدن بھی اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک کہ اسے زندگی ملی ہے لیکن اس عالم میں جس عالم میں اسے دیکھا جاچکا ہے۔"

"اس شیطان صفت عورت کے لئے ضروری تھا جو مسلمانوں کے ایمان کے درپے تھی بہرحال کام جاری تھا پھر وہ وقت آگیا جب نعمت علی کو سادھو بن کر اس جگہ اپنا کام شروع کرنا تھا۔

سرائے خاموشی سے چھوڑ دی گئی حمیرا کو مزید کچھ کرایہ ادا کر دیا گیا تھا ویسے وہ خوش تھی اور اس نے نعمت علی کا بہت شکریہ ادا کیا تھا اور کہا تھا کہ کم از کم اسے اس اذیت ناک کام سے نجات ملی ہے البتہ وہ اپنے باپ کے لئے دکھی ہے دیکھیں کب رام رتی اس دنیا سے جاتی ہے۔ سرائے حمیرا کو بتا کر نہیں چھوڑی گئی تھی خیرالدین نعمت علی کو لے کر اس جگہ پہنچ گیا جو اس نے اسے ایک بار دکھائی تھی۔ لیکن اس جگہ اب ایک بڑی عجیب و غریب عمارت بنی ہوئی تھی اس کے برابر ہی ایک ڈھیا بنی ہوئی تھی اور یہاں سارے انتظامات کئے گئے تھے نعمت علی کو یہ سب بڑا سنسنی خیز محسوس ہورہا تھا لیکن بہرحال اسے اپنے دوست خیرالدین پر مکمل اعتماد تھا خیرالدین نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تیرا جادو کا پٹارہ موجود ہے اس میں لباس وغیرہ بھی موجود ہے اور دوسری چیزیں بھی حلیہ بدل لے اپنا۔" نعمت علی نے اس کی ہدایت کے مطابق عمل کیا اپنے آپ کو ایک ہندو سادھو کے روپ میں دیکھ کر اسے بڑی ہنسی آئی تھی اس نے کہا۔

"یار ماموں بدلے لے رہے ہو سارے کے سارے یہ تو میں عجیب و غریب ہو کر رہ گیا۔"

"تماشہ دیکھ......تماشہ دیکھ...... ہمارے ساتھ رہے گا تو یہ ہی مزے رہیں گے۔" خیرالدین نے خوشگوار موڈ میں کہا۔ بہرحال یہاں رہنے کے بعد نعمت علی کو احساس ہوا کہ خیرالدین خیری نے کوئی غلط جگہ منتخب نہیں کی تھی۔ یہاں سے تو کافی لوگوں کا آنا جانا تھا۔ گاؤں کے لوگ اسی راستے سے گزر کر بڑی سڑک پر پہنچتے تھے اور وہاں سے ادھر ادھر آیا جایا کرتے تھے چنانچہ لوگوں نے یہ ڈھیا دیکھی مٹھ دیکھا۔ اور آخر کار سادھو مہاراج کے پاس پہنچ گئے۔ خیرالدین بدستور موجود تھا۔ کوئی ایک ہفتے تک یہ تماشہ جاری رہا لوگ آتے اپنی اپنی مشکلیں بیان کرتے اور خیرالدین کی ہدایت پر نعمت علی انہیں ان کی مشکلات کا حل بتاتا بہت سے لوگوں کو ان سے بڑا فائدہ پہنچا تھا۔ چنانچہ پبلسٹی تو ہونی ہی تھی۔ اور آخر کار یہ بات رام رتی تک بھی پہنچ گئی۔

رام رتی ابھی تک بہت سے کھیل کھیل چکی تھی۔ پہلے اس کا دست راست بھیم چند تھا۔ جو خود بھی ایک خوفناک شکل کا آدمی تھا۔ اور اسے بھی بہت کچھ آگیا تھا۔ لیکن رام رتی نے بھیم چند کو سزائے موت دے دی تھی۔ کیونکہ بھیم چند حد سے آگے بڑھنے لگا تھا۔ شرما بھی موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ یوں یہ سارے چکر چل رہے تھے۔ اب اس کے پاس کچھ اور افراد تھے۔ چنانچہ ایک شاندار لمبی سی کار کچے راستے پر اچھلتی کودتی کوئی سو گز کے فاصلے پر رک گئی۔ باادب مسلح پہرے دار نیچے اترے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ اس کے بعد اپنے خاص مصاحب کے ساتھ رام رتی نیچے اتری دو خادموں نے موٹا سا قالین زمین پر ڈال دیا اور رام رتی اس پر چلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی یہ عمل مسلسل جاری تھا۔ خادم پیچھے والا قالین اٹھا کر آگے ڈالتے اور جب رام رتی اس پر سے گزرنے لگتی تو اور قالین اس کے راستے میں بچھا دیئے جاتے۔ اس طرح رام رتی ڈھیا

تک پہنچی تھی۔ جہاں نعمت علی خیرالدین کی ہدایت کے مطابق موجود تھا اس کے ہاتھوں میں ایک کمنڈل تھا جس میں پھول بھرے ہوئے تھے رام رتی جیسے ہی آگے آئی اس نے پھول زمین پر پھینکنا شروع کر دیئے۔

رام رتی غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"رک جایئے مہاراج...... رک جایئے...... رک جایئے میں آپ سے پھولوں کی بھینٹ لینے نہیں آئی۔ پہلے آپ کو میرے کچھ سوالوں کے جواب دینا ہوں گے۔"

"آؤ...... رانی رام رتی...... آؤ...... بڑا نام ہے تمہارا۔ بڑا گیان ہے تمہارا۔ ہم تو معمولی سے سادھو ہیں۔ بس ایسے ہی سنسار میں جہاں جگہ ملتی ہے وہاں تک جاتے ہیں۔ آؤ اس کھاٹ پر بیٹھو۔"

"تم دیکھ رہے ہو کہ میں جوتے بھی اس جگہ رکھتی ہوں جہاں قالین بچھے ہوتے ہیں۔ تم مجھے کھاٹ پر بٹھا رہے ہو۔"

"داس کے پاس تو بس یہ کھاٹ ہی ہے رانی۔"

"بڑا ادھم مچائے ہوئے ہو۔ ان دنوں ٹونے ٹوٹکے کر کے ہماری پرجا کو بے وقوف بنا رہے ہو۔ کیا گیان ہے تمہارے پاس؟"

"رام...... رام...... اور تمہارے سامنے ہم کیا ہیں۔ رانی رام رتی۔ تم ایک مہان رانی اور ہم سادھو سنت۔ تم آکاش پر رہنے والی۔ اور ہم دھرتی کے کیڑے۔"

"ہوں...... پھر اگر تمہارے پاس کوئی گیان تھا۔ تو کیا تمہیں رام رتی کی مملکت میں آنا چاہئے تھا۔"

"چلے جائیں گے رانی۔ آپ کہو گی تو چلے جائیں گے۔ چنتا کیوں کرتی ہو۔" نعمت علی بولا۔

"نہیں ایسے نہیں مہاراج۔ میرا وار، رو کو اس کے بعد دیکھوں گی۔" یہ کہہ کر رام رتی نے پیچھے ہاتھ بڑھایا تو ایک خادم نے اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سا مرتبان دے دیا۔ رانی نے مرتبان میں ہاتھ ڈال کر کسی چیز کی مٹھی بھری اور اسے سامنے کی سمت اچھال دیا۔ نعمت علی نے خوف سے دیکھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے سانپ تھے جو زمین پر رینگ رہے تھے پھر وہ بڑے ہونا شروع ہو گئے نعمت علی کی حالت خراب ہونے لگی تو خیرالدین خیری نے کہا۔

"احمق پاگل ہوئے ہو کیا۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے تماشہ دیکھو۔"

اور اسی لمحے نعمت علی نے دیکھا...... کہ جھیا کے اندرونی حصے سے بے شمار نیولے باہر نکل آئے اور ان سانپوں پر حملہ آور ہونے لگے خونخوار نیولے بہت ہی بھیانک تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سارے سانپوں کو چٹ کر گئے۔ تو رانی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم پہلے امتحان میں کامیاب ہو گئے مہاراج نام کیا ہے تمہارا؟"

"نام سے کیا ہوتا ہے جو کچھ ہوتا ہے کام ہی ہوتا ہے۔"

"دوستی کرو گے؟"

"ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں۔"

"تو ٹھیک ہے کل شام کو ہمارے ہاں مہمان آؤ۔ ہم تمہیں کچھ اور بھی دکھائیں گے۔" رام رتی نے کہا۔

"میں آجاؤں گا۔" نعمت علی نے کہا۔

"حقیقت یہ تھی کہ وہ خود کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔ بس جو آوازیں نکل رہی تھیں وہ اس کے ہونٹوں سے بے شک نکل رہی تھیں۔ لیکن یہ آوازیں خیرالدین کی تھیں رام رتی واپس پلٹی تو اس کے خدام قالین اٹھانے لگے نعمت علی خاموشی سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

"ماموں! یہ تو ایک ہی جواب میں میں ہو گئی۔"

جواب میں خیرالدین خیری کی ہنسی سنائی دی تھی۔

"بھانجے...... وہ جو کہتے ہیں ناں کہ جب تک چل سکتی ہے چلاؤ کل تمہیں دعوت مل گئی ہے۔"

"مجھے؟" نعمت علی نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے۔ اپنے آپ کو مجھ سے الگ سمجھنے لگے ہو کیا؟"

"اماں نہیں ماموں۔ کیسی باتیں کرتے ہو، تم سے الگ ہونے کے بعد میں کیا رہ جاتا ہوں۔"

"سب کچھ رہ جاتے ہو۔ دوستی میں ایسی باتیں مت سوچا کرو۔ مجھے بھی ابھی تم سے بہت سے کام لینے ہیں۔ نعمت علی۔"

"میں حاضر ہوں ماموں!"

"دیکھ لیا تم نے۔ کمبخت ویسی کی ویسی جوان ہے۔ چہرے پر شیطان ناچتا ہے بڑی عجیب سی بات ہے چلو خیر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے انہیں انتظار کرنا پڑا دوسرے دن ایک چار گھوڑوں والی بگھی جو بڑی خوب صورتی سے سجی ہوئی تھی اس جگہ پہنچ گئی ایک شخص نیچے اترا اور اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک کر کہا۔

"جے ہو مہاراج کی۔ آیئے، رانی صاحبہ نے آپ کے لئے گاڑی بھیجی ہے۔"

"ٹھیک ہے، چلو۔" نعمت علی نے کہا اور اس کے بعد وہ بگھی میں آ بیٹھا بگھی راستہ طے کرتی رہی بھوج گڑھی کے خوب صورت راستوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک عالی شان محل نما حویلی کے پاس پہنچ گئے۔ حویلی بہت خوب صورت تھی۔ زاہد خان نے جتنا اس کے بارے میں بتایا تھا وہ حویلی اس سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ مہمان خانہ بھی بہت ہی خوب صورت تھا نعمت علی کو مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا اور کئی خادم اس کی دیکھ بھال کے لئے آ گئے۔ تقریباً سات بجے دو خوب صورت لڑکیاں وہاں پہنچ گئیں انہوں نے بڑے باریک لباس پہنے ہوئے تھے۔ ویسے بھی کافی خوب صورت تھیں۔ بڑے ادب سے انہوں نے نعمت علی سے کہا کہ رانی صاحبہ اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ نعمت علی ان کے ساتھ چل پڑا۔

گھاس کے حسین قطعے سے گزرتا ہوا وہ اس محل نما حویلی کے بغلی حصے میں پہنچا۔ جہاں ایک بڑا سا حوض بنا ہوا تھا اس حوض میں حسین مچھلیاں تیر رہی تھیں ایک پتلا سا راستہ حوض کے درمیانی حصے میں جاتا تھا جہاں بارہ دری کی طرح خوب صورت عمارت بنی ہوئی تھی اور رام رتی ایک خوب صورت سنگھاسن پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے اطراف میں چھ خوب صورت لڑکیاں باادب بیٹھی ہوئی تھیں۔

ان کے ہاتھوں میں خاص قسم کے ساز تھے جو ابھی خاموش تھے رام رتی نے خوش ہو کر اس کا استقبال کیا اور بولی۔

"جے ہو مہاراج کی آیئے بیٹھئے۔" اس نے سنگھاسن پر اپنے برابر جگہ دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہم الگ بیٹھنا چاہتے تھے۔" نعمت علی کے منہ سے نکلا۔

"یہ الفاظ بھی خیرالدین کے تھے۔ فوراً ہی ایک دوسری کرسی لائی گئی۔ اور نعمت علی اس پر بیٹھ گیا۔

"کافی چالاک ہیں مہاراج! پر ابھی تو ہمارے بیچ دوستی یا دشمنی کا کوئی فیصلہ ہی نہیں ہوا۔"

"ہو سکتا ہے۔ رام رتی کہ تمہارے من میں کوئی کھوٹ ہو۔ میں تو دیکھ لو بے دھڑک یہاں چلا آیا۔"

"ہاں یہ بات مجھے پتہ چل گئی ہے کہ آپ ہوشیار لیکن کبھی کبھی ہوشیاری بے وقوفی میں بھی بدل جاتی ہے جیسے...... اب۔" رام رتی نے کہا اور اچانک ہی نعمت علی کے اردگرد شیشے کا ایک خول نمودار ہو گیا انڈے نما خول تھا جو کرسی کے چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ لیکن شیشے کا بنا ہوا لگتا تھا کیونکہ آسانی سے اس کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا نعمت علی بالکل نہیں گھبرایا خیرالدین نے اس کے کان میں کہا۔

"باتیں کرو۔ اس سے باتیں کرو۔ جو دل میں آ رہا ہے کہو کسی چیز سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" رام رتی مسکراتی ہوئی بولی۔

"اب تم یہاں جیون بھر قید رہو گے مہاراج، قید سے نکلنے کی ایک ترکیب ہے۔"

"ہاں...... بولو۔" نعمت علی نے کہا۔

"جتنا گیان تمہارے پاس ہے وہ سب کا سب مجھے دے دو۔ یہ نہیں ہو سکتا گمنام مہاراج کہ رام رتی کے

سامنے کوئی اپنا گیان لے کر آئے۔ اور اس کے بعد جیتا
رہ جائے تمہیں جیون اسی لیے دیا جا سکتا ہے جب تم اپنا
سارا گیان ہمیں بھینٹ دے دو۔"

"رام رتی اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تیرے پاس
تیرا اپنا کوئی گیان نہیں ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"جس طرح تو اپنی اس بے وقوفی کے عمل سے
کام لے کر یہ سمجھ رہی ہے کہ تو نے سچ مچ مجھے قیدی بنا لیا۔
اسی طرح دوسرے کچے گیانوں کو تو اپنا قیدی بنا کر ان
سے ان کا گیان لے لیا ہوگا۔" جواب میں رام رتی خوب
ہنسی پھر بولی۔

"ٹھیک اندازہ لگایا تم نے گمنام مہاراج! ایسا ہی
ہے اور جن لوگوں سے میں نے ان کا گیان لے لیا ہے
ان کا حشر اگر دیکھنا چاہتے ہو۔ تو وہ سامنے دیکھو۔"

رام رتی نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اور نعمت علی
کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں کچھ پجاری قسم کے آدمی چھ
لمبے تڑنگے جوانوں کو ہنٹروں سے مارتے ہوئے اس
طرف لا رہے تھے۔ ان چھ افراد کے جسم زخموں سے
چور تھے۔ ان کے کندھوں پر خاص قسم کے لکڑی کے
کندے رکھے ہوئے تھے جن کے درمیانی سوراخوں سے
ان کے ہاتھ باہر نکال لئے گئے تھے۔ ان کی کمر میں رسی
بندھی ہوئی تھی اور پجاری قسم کے خادم انہیں ہنٹروں سے
مارتے ہوئے لا رہے تھے۔

"یہ گیانی ہیں اپنا گیان ہم پر چلانے آئے تھے
پر جو کچھ تھا ان سے چھین لیا گیا سمجھے؟ یہ تو وہ ہیں جو جیتے
ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے ضد کی...... سو مر گئے
بے چارے۔"

"مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ اگر میں تمہیں اپنا گیان
دے دوں تو تم مجھے جیتا رکھو گی۔"

"سچ کہہ رہی تھی۔ تم اس شیشے کے خول میں
بند ہو اگر تم نے اپنا گیان مجھے نہ دیا تو اسی میں پڑے
پڑے سڑ جاؤ گے۔ اور جب تم سوکھ کر مر جاؤ گے تو ہم
تمہاری چتا بنا کر تمہیں اس میں جلا دیں گے۔"

"ٹھیک...... تو رام رتی تم نے اپنی گیانی کا
مظاہرہ تو پہلے ہی کر دیا۔ لیکن دیکھو! یہ بھی بے وقوفی کی
ایک علامت ہوتی ہے کہ کوئی کسی کی قوت جاننے سے
پہلے اپنے آپ کو طاقتور ثابت کر دے۔"

"کیا مطلب ہے، کیا کہنا چاہتے ہو۔" گمنام
مہاراج رام رتی نے پر مذاق لہجے میں کہا۔

اچانک ہی ایک زوردار آواز ابھری اور شیشے کا وہ
انڈے والا گولا کرچی کرچی ہو گیا۔ رام رتی ایک دم پیچھے
ہٹ گئی تھی اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پیدا
ہو گئے تھے لیکن فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور اس
کے بعد اپنے خوب صورت سفید ہاتھوں سے تالیاں
بجانے لگی۔

"جے ہو مہاراج جے ہو۔" یہ آپ کا دوہرا
امتحان تھا۔" نعمت علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی
اس نے کہا۔

"بہت چالاک بنتی ہے تو رام رتی۔ جب ناکام
ہو جاتی ہے تو ایسے چولا بدل لیتی ہے۔"

"بالکل ایسا نہیں ہے مہاراج۔ بس میرا اپنا ایک
طریقہ کار ہے ذرا ادھر دیکھو......!" اس نے ایک طرف
اشارہ کیا اور ایک بار پھر نعمت علی کی نگاہیں اس طرف اٹھ
گئیں جہاں اس نے چھ مظلوم آدمیوں کو دیکھا تھا لیکن
اب وہ انتہائی خوب صورت لباس میں ملبوس اپنی جگہ
پر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"وہ بس میرا چمتکار تھا جو تم نے دیکھا یہ
تو شہزادے ہیں شہزادے عیش و آرام کا جیون بتا رہے
ہیں چلو خیر میرے اس گھر میں آ کر تم نے مجھے اپنا
چمتکار دکھا دیا...... آؤ...... چائے تیار ہے۔" رام رتی بولی
اور اس کے بعد اٹھ کر اس پیلے سے راستے سے آگے کی
جانب بڑھ گئی۔

لیکن اس کے چہرے کے تاثرات میں کچھ
گھبراہٹ سی تھی اس کی چھٹی حس اسے کسی بڑے خطرے
کا احساس دلا رہی تھی۔

شہرِ وحشت

قسط نمبر: 08

ایم اے راحت

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرہول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دہشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراؤ، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

خیرالدین خیری نے کہا۔ "چلتے رہو۔ چلتے رہو۔ بڑا لطف آرہا ہے یہاں۔" نعمت علی حوض کے راستے سے گزر کر باہر آگیا۔ تب رام رتی اسے ایک ایسی جگہ لے گئی۔ جہاں ایک بڑی سی میز لگی ہوئی تھی۔ اور اس پر طرح طرح کے لوازمات چنے ہوئے تھے۔

"آپ نے مجھے بری طرح متاثر کردیا ہے مہاراج! سچی بات یہ ہے کہ میں آپ جیسے مہان دیوتاؤں کی بڑی قدر کرتی ہوں۔ میرے من میں اب آپ کے لئے کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ بیٹھیے کھانا کھائیے۔ آپ میرے معزز مہمان ہیں۔"

نعمت علی کے منہ سے آواز نکلی۔ "رام رتی! بڑے لوگ ہوتے ہیں، پر ایسے نہیں ہوتے جو گھر بلا کر دھوکے پر دھوکا دیں۔ تو یہ ہی سب کچھ کررہی ہے۔ وہاں بھی تجھے ناکامی ہوئی تھی اور یہاں اپنے گھر میں۔ بلکہ اپنے اس طلسم کدے میں بھی تو وہ نہیں کرپارہی جو تیرا دل چاہتا ہے۔ اب تو یہ کھانا کھلا کر مجھے ہلاک کرنا چاہتی ہے...... کیوں......؟"

"مہاراج سچی بات یہ ہے کہ اب میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے، جس سے میں آپ کو اپنے خلوص کا یقین دلاسکوں۔"

"تیرا خلوص، تو دیکھ تیرے ان برتنوں سے چھلک رہا ہے۔" نعمت علی نے کہا۔ اور ایک عجیب و غریب اور دلچسپ منظر نگاہوں کے سامنے آگیا۔ میز پر چنے ہوئے کھانوں کی کچھ قابوں اور برتنوں سے ایک سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔ گاڑھا گاڑھا سفید دھواں جو فضاء میں منتشر ہوکر پھیلتا چلا جارہا تھا۔ رام رتی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ نعمت علی کی آواز خیرالدین خیری نے کہا۔

"جن برتنوں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ ان میں انتہائی خوفناک زہر کھانوں میں ملا ہوا ہے۔ تو مجھے یہاں بٹھانے کے بعد یہ زہریلا کھانا مجھے کھلاتی۔ یہ تیری آخری کوشش تھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نہیں جانتی کہ تیرے جیسا کوئی جادوئی علم والا اور کوئی ہو۔ رام رتی ہمیں بھوج گڑھی میں نہیں رہنا تھا۔ ہم تو بس یہاں آئے تھے اور یہاں سے آگے بڑھ جاتے۔ آوارہ گردی ہمارا شوق اور ہمارا مشغلہ ہے۔ پھر تو کیوں اپنے آپ کو خراب کررہی ہے۔ میں اگر چاہوں تو تیرا ناس کرکے رکھ دوں۔ پر وہی بات کہ مجھے کیا پڑا ہے۔"

رام رتی کا چہرہ اب دھواں دھواں ہورہا تھا۔

س کی شادابی رخصت ہوتی جارہی تھی۔ وہ بجھی بجھی سی گئی تھی کچھ لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اور دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"مہاراج آخری بار بس آخری بار شما کردیں۔ آخری بار شما کردیں میں نے اپنا کھیل واقعی ختم کردیا ہے۔ مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔ کہ آپ بہت مہان ہیں مجھ سے کہیں بڑے۔ میں کسی بھی طرح آپ کا مقابلہ نہیں کرسکتی بولیں مہاراج کیا آپ مجھے شما کردیں گے؟"

"ہم نے ابھی تک تیرے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی ہے۔ رام رتی جب کہ تو اپنی ہر ممکن کوشش کرچکی ہے بہرحال ہم جارہے ہیں۔ اور بھوج گڑھی بھی ہم بہت جلدی چھوڑ دیں گے۔ تو جو کچھ چاہتی تھی وہ نہیں حاصل کرسکی۔ اس کا ہمیں افسوس ہے۔ لیکن بہرحال اب بھی ہمارے دل میں تیرے لئے کوئی برائی پیدا نہیں ہوئی۔"

"ایک بار مہاراج! بس ایک بار۔ میری بنتی سن لیں، میں آپ کو اپنے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔ مہاراج بڑا لمبا جیون بتالیا ہے میں نے، پر مجھے وہ نہیں مل سکا جو میں چاہتی ہوں وہ نہیں مل سکا مہاراج۔ من کی شانتی کہاں ہے؟ کہاں ہوتی ہے من کی شانتی؟ مہاراج آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کو ساری سچائی بتائے دیتی ہوں۔"

"چل مان لے اس کی بھی۔ بھانجے۔ دیکھ لے کیا کہہ رہی ہے یہ۔ اور فکر تجھے کرنا ہی نہیں ہے۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" خیر الدین خیری کی آواز نعمت علی کے دماغ میں گونجی۔ اور نعمت علی مسکرانے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ چل۔ اب تو جو کچھ کہتی ہے۔ وہ بھی مان لیتے ہیں ہم۔"

"مہاراج درختوں پر لگے پھل تو پوتر ہوتے ہیں۔ آپ انہیں..... توڑ کر اپنے ہاتھوں سے کھا لیجئے۔"

"ہمارے کھانے پینے کی تو فکر مت کر رام رتی۔ بتا کیا کہنا چاہتی ہے۔؟"

"آیئے میرے ساتھ۔" اور رام رتی اُسے بائیں باغ کے ایک گوشے میں لے گئی یہاں بھی ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہوئی تھی۔ وہ عمارت کے پاس رک گئی پھر بولی۔ "میں آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتانا چاہتی ہوں مہاراج۔"

"تیری مرضی ہے۔ رام رتی۔! تو نے ہمیں مہمان بنایا۔ ہم مہمان بن گئے جو بتانا چاہے بتا دے۔ جو نہ بتانا چاہے نہ بتا۔ ہم نے کہہ دیا نہ ہم ایک آدھ دن میں بھوج گڑھی سے واپس چلے جائیں گے۔ پھر تو کہیں اور ہم کہیں۔"

"نہیں..... مہاراج اب میں آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گی۔ آپ جیسا مہان گیانی مجھے ملا ہے۔ تو میں اسے آسانی سے گنوا نہیں سکتی۔ مہاراج میں امر شکتی چاہتی ہوں۔ میں جیون کھونا نہیں چاہتی۔ امر شکتی کا تھوڑا سا راز مجھے مل گیا ہے۔ پر مہاراج میں وہ شکتی چاہتی ہوں۔ جو افریقہ کے پہاڑوں میں رہنے والی ایک عورت کو حاصل تھی۔ اور ہے۔ مہاراج وہ شعلوں میں نہا کر جیون اور جوانی پالیتی ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں۔ کہ میرا جیون امر نہیں ہے۔ میں اس کی طرح کا گیان چاہتی ہوں۔ اور اس کے لئے مجھے ایک گیانی مہاراج نے بتایا تھا مگر تھوڑا سا عمل باقی ہے مہاراج۔ مجھے ایسے دین داروں کی بھینٹ دینی ہے۔ الکھ بھوانی کو۔ جو مسلمان ہوں۔ ایک مسلمان یہ کام کرسکتا تھا۔ پر اس نے میری بات نہیں مانی میں نے بھی اس کا خانہ خراب کر رکھا ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنے ہاتھوں سے میرے لئے ایک بھینٹ دے کر مجھے امر کرسکتا ہے۔ اصل میں، میں رام رتی ہوں ہی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" اس بار خیر الدین بھی چونک پڑا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" رام رتی نے کہا۔ اور اس انوکھی عمارت کا دروازہ کھول دیا۔ جس کی یہاں موجودگی کا بظاہر کوئی جواز نہیں تھا۔ پھر وہ اندر داخل ہوتی ہوئی بولی۔ "آ جاؤ۔ مہاراج۔ اب میں تمہارے ساتھ کوئی

دھوکا نہیں کروں گی یہ میرا وچن ہے۔"

"اور اگر کرے گی بھی تو کچھ نہیں پائے گی۔" نعمت علی کے منہ سے آواز نکلی۔ رام رتی اس عجیب و غریب عمارت کے اندر داخل ہونے کے بعد وہ سیڑھیاں طے کرنے لگی جو نیچے کی سمت جارہی تھیں۔ کافی گہرائی میں پہنچنے کے بعد وہ رکی اور اس نے اندر روشنی کردی۔ ایک بڑا سا تہہ خانہ تھا۔ جس میں سیلن کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ شمع دان لگے ہوئے تھے۔ جن سے روشنیاں چھلک رہی تھیں اور شمع دان کی ان روشنیوں میں دو افراد نظر آئے۔ جو بری طرح خستہ حال تھے۔ اور بڑے لاغر نظر آرہے تھے۔ ان میں ایک عورت تھی۔ دوسرا مرد تھا۔ ان کی عمریں کافی نظر آرہی تھیں۔ بری حالت میں ہونے کے باوجود یہ اندازہ ہوتا تھا۔ کہ وہ اعلیٰ حیثیت کے مالک ہیں۔ رام رتی نے نعمت علی کی طرف دیکھا اور بولی۔

"وہ دیکھو..... وہ رام رتی ہے۔ اور وہ اس کا پتی سنگرام سنگھ۔ اس نے ان دونوں کی جانب اشارہ کیا۔ اور نعمت علی ایک لمحے کیلئے سناٹے میں آگیا۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔

"ہاں..... میرا جیون بھی ایک عجیب و غریب کہانی ہے۔ جو نظر آرہی ہوں وہ نہیں۔ لیکن بچپن ہی سے یہی چاہتی تھی کہ میں سنسار کی سب سے بڑی گیانی بنوں۔ چھوٹی چھوٹی عمر مجھے ناپسند تھی۔ اور میرے من میں یہی جوار بھاٹے اٹھتے رہتے تھے۔ کہ ایسا کون سا عمل ہو جس سے میں امر شکتی حاصل کرسکوں منش سنسار میں۔ اپنی مرضی سے نہیں آتا۔ وہ ایک عمر تک دوسروں کی مرضی پر گزارہ کرتا ہے۔ ماتا پتا ہوں۔ یا دوسرے رشتے دار ہوں۔ ان کے زیر اثر رہتا ہے۔ اور جب وہ اپنے طور پر کچھ کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ تو موت اسے آگھیرتی ہے۔ میں شروع ہی سے یہ سوچتی تھی۔ مہاراج! کہ منش کم سے کم اتنا تو جئے کہ اس کے من کی ساری کامنائیں پوری ہوجائیں۔ یہ چھوٹی سی عمر کیا معنی رکھتی ہے۔ جب بھی میں نے کسی سے اپنی اس بات کا تذکرہ کیا تو میرا مذاق اڑایا گیا۔ پر میں بھی دھن کی پکی تھی۔ میں نے نجانے کہاں کہاں سے بہت ساری شکتیاں حاصل کیں۔ اس کے لئے مجھے کالے علم والوں کی داسی بھی بن کر رہنا پڑا۔

اپنے آپ کو ان کے بیچ لٹانا پڑا تب کہیں جاکر مجھے کچھ شکتی ملی۔ اور اس کے بعد میں نے ایک ہی وار کیا۔ اور یہ وار سنگرام سنگھ اور اس کی پتنی رام رتی پر تھا۔

میں قدرتی طور پر رام رتی کی ہم شکل تھی۔ دیکھو! ذرا اس کا اور میرا چہرہ ایک ہی لگتا ہے یا نہیں۔ بس تبھی سے میرے من میں یہ خیال آیا۔ کہ بھوج گڑھی میری ریاست ہونی چاہئے۔ اور میں نے اس کے لئے کام شروع کردیا۔

"لمبی چوڑی بات ہے مہاراج سنگرام سنگھ اور رام رتی یہاں قید ہیں اور میں پتہ نہیں کب سے رام رتی کی حیثیت سے جیون بتا رہی ہوں۔ سنگرام سنگھ جی کے بارے میں، میں نے لوگوں کو یہ ہی بتایا ہے کہ وہ لمبی یاتراؤں پر گئے ہوئے ہیں۔ اور ان کی واپسی کا کوئی یقین نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کو میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ سادھو بن گئے ہیں۔ اور مندروں کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ کسے پڑی ہے۔ کہ کسی کی کھوج کرے۔ اس کے ساتھ ہی مہاراج میں نے اپنے لئے ایک اگن منڈل بنایا ہے۔ جو میری ساری عمر کی تپسیا کا نچوڑ ہے۔ جب میرے شریر میں سستی آنے لگتی ہے۔ میں اس اگن منڈل میں جلی جاتی ہوں۔ شعلوں میں نہاتی ہوں۔ اور پھر سے جوان ہوجاتی ہوں۔ پر اتنا میں جانتی ہوں کہ یہ امر شکتی نہیں ہے۔ امر شکتی حاصل کرنا چاہتی ہوں مہاراج اور میں نے بڑے بڑے گیانیوں سے یہ گیان حاصل کیا ہے۔ کہ امر شکتی کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔ مہاراج میں نے آپ کو اپنی ساری کہانی سنا دی ہے۔ بڑے بڑے رشیوں، اور منیوں سے میرا واسطہ رہا ہے۔ کالے جادو کے ماہروں سے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ پر مہاراج جو آپ ہو۔ ایسا مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ آپ

مجھے ان سب سے مہان گیانی لگتے ہو......
مہاراج! میں آپ سے سمجھوتہ کرنا چاہتی ہوں
۔ مجھے وہ راستہ دکھایئے جو امر شکتی کا راستہ ہے۔ مجھے تو
یہ بتایا گیا ہے۔ کہ ایک بھینٹ دے کر۔ اور کسی کا دھرم
ایمان لے کر یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں اس میں
ناکام رہی ہوں۔ بڑے ہی کٹھور ہوتے ہیں یہ دین
دھرم والے ویسے تو خوب رنگ رلیاں مناتے پھریں
گے۔ لیکن جب دین دھرم پر بات آجاتی ہے۔ تو
سسرے بالکل ہی پتھر ہو جاتے ہیں۔ ایک بدکردار تھا
جس کا نام زاہد خان تھا۔ میں نے بڑی کوشش کی لیکن
آج تک میرے چکر میں نہیں آیا۔ ایک دفعہ مہاراج
بس ایک دفعہ وہ میری بات مان لے۔ اصل میں اس
کے اندر جو خوبی ہے۔ وہ میں آپ کو بتا دوں۔ وہ نو
چندری جمعرات کو پیدا ہوا ہے۔ اور نوچندری جمعرات کو
پیدا ہونے والوں کے اندر ایک خاص قسم کی شکتی ہوتی
ہے۔ میں نے بڑا تلاش کیا پر اس کے سوا مجھے ایسا کوئی
اور آدمی ملا ہی نہیں مہاراج اگر وہ میرا کام کر دے تو
آپ یوں سمجھ لیجئے۔ کہ مجھے امر شکتی مل جائے گی۔"

نعمت علی دنگ رہ گیا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار ان دونوں
مظلوموں کی طرف اٹھ رہی تھیں لیکن اپنے طور پر وہ کوئی
فیصلہ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد خیر الدین
خیری کی آواز ابھری جو نعمت علی کی آواز نہیں تھی۔

"تو سچ مچ مہان ہے۔ رام رتی تیرا اصلی نام کیا
ہے؟"

"کوئی اصلی نام نہیں ہے۔ اب تو میں اپنا اصلی
نام بھول چکی ہوں۔"

"خیر میں تجھے رام رتی کہہ کر ہی مخاطب کروں
گا۔ رام رتی میں تیری مدد کر سکتا ہوں۔" نعمت علی کے
منہ سے یہ الفاظ...... سن کر رام رتی کا چہرہ خوشی سے
چمک اٹھا تھا۔ پھر اس کا رویہ نعمت علی کے ساتھ کافی
تبدیل ہو گیا۔ نعمت علی کو اس نے ایک بہت ہی عمدہ جگہ
رکھا۔ نعمت علی نے خیر الدین کے منصوبے کے مطابق
رام رتی سے کہا۔

"تین دن کا جاپ کرنا پڑے گا تجھے اور اس
بعد تیرا وہ منصوبہ کامیاب ہو جائے گا۔ تو اس بار امر شکتی
حاصل کر لے گی۔ میرے پاس ایک ایسا جاپ ہے۔ تجھے
جس سے منش جب چاہے۔ اپنا کام کر سکتا ہے۔ تجھے
ایسے لوگ مل جائیں گے جنہیں تو اپنے مقصد کے لئے
استعمال کر سکے۔ میرا جاپ بتاتا ہے۔ کہ یہاں تو نے
مسلمانوں کی ایک سرائے میں ایک لڑکی کو بھیج دیا ہے۔
جہاں وہ اپنا کام کر رہی ہے۔ بس یوں سمجھ لے کہ وہیں
سے میں تیرا کام کروں گا۔" رام رتی یہ باتیں سن کر دنگ
رہ گئی تھی۔ اس نے بڑے خلوص سے نعمت علی کے پاؤں
چھوئے اور بولی۔

"مہاراج! اب میں آپ کو ہمیشہ اپنا گرو مانوں
گی۔ اگر مجھے امر شکتی مل گئی۔ تو جب تک آپ جیتے رہو
گے۔ میں آپ کی سیوا میں سر جھکائے رہوں گی۔ کوئی
کام آپ کی مرضی کے بغیر نہیں کروں گی۔"

"ہمیں جاپ کیلئے کوئی صحیح جگہ بتا دے اور اس
وقت تک کیلئے ہمیں مکمل آزادی دے کوئی ہم سے ملنے
نہ آئے۔ کھانے پینے کی کوئی چنتا نہ کرنا۔ ہم یہ تین دن
کچھ کھائے پیئے بغیر بتائیں گے۔"

"جو آگیا مہاراج" رام رتی نے عقیدت سے
کہا۔

نعمت علی کچھ نہیں سمجھ پایا تھا۔ اور خاموشی سے وہ
کچھ بول رہا تھا۔ جو اس سے بلوایا جا رہا تھا۔ دلچسپ
بات یہ تھی کہ رام رتی نے وہی پر اسرار اور سنسان گوشہ
اس جاپ کے لئے منتخب کیا۔ جس میں وہ عمارت بنی
ہوئی تھی۔ تمام تیاریاں مکمل کرنے کے بعد رام رتی اسے
وہاں چھوڑ کر چلی گئی اپنی دانست میں اس نے ان کے
لئے ایک بہترین ماحول پیدا کر دیا تھا۔ نعمت علی نے
یہاں بیٹھ کر کہا۔

"جی استاد محترم! اب کیا ارادے ہیں۔"

"بس یوں سمجھ لو کہ کام تکمیل کے قریب ہے۔ نعمت
۔ میں نے شاید تم سے پہلے بھی یہ بات کہی ہو۔
علی کہ جو شخص جتنا سیانا ہوتا ہے۔ اتنی ہی آسانی سے

مار کھا جاتا ہے۔ لیکن رام رتی اپنا آخری وقت گزار
رہی ہے۔

"استاد محترم سے مجھے یہی امید رہتی ہے۔ بڑا
کام ہو جائے گا۔ وہ بیچاری لڑکی جس کا نام حمیرا ہے۔ وہ
بھی اس مشکل سے نجات پا جائے گی۔ اس کا باپ آزاد
ہو جائے گا...... اور...... اور...... ان لوگوں کا کیا ہوگا۔
استاد محترم۔ جنہیں ہم نے اس تہہ خانے میں دیکھا
ہے۔"

"آج کی رات ہمیں انہی سے ملاقات کرنی
ہے۔" خیر الدین خیری کی پر اسرار آواز ابھری۔ اور
نعمت علی سنسنی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

نعمت علی نے یہ بات اچھی طرح محسوس کی تھی۔
کہ رام رتی کا رویہ اس کے ساتھ بہت بہتر ہو گیا ہے۔
خود خیر الدین۔ تو گمشدہ کیفیت میں ہی رہتا تھا۔ اس کا
تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ رات کو خیر الدین خیری نے
اسے جگایا اور بولا۔

"آؤ...... چلتے ہیں۔ ان لوگوں سے ملاقات
کرتے ہیں۔" خیر الدین کی ہدایت کے مطابق نعمت علی
چل پڑا۔ کم از کم اسے اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا۔
کہ اس کا دوست جب بھی کوئی قدم اٹھاتا ہے۔ پورے
بھروسے اور اعتماد کے ساتھ اٹھاتا ہے۔ اور اس وقت
کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ اس تہہ خانے تک
پہنچنا مشکل نہیں ہوا۔

حالانکہ اچھی خاصی رات گزر چکی تھی۔ لیکن
سنگرام سنگھ اور رام رتی جاگ رہے تھے۔ دونوں ایک
دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے
سنگرام سنگھ کہہ رہا تھا۔

"بیت گئی۔ تھوڑی سی رہ گئی ہے رام رتی۔ یہ بھی
بیت جائے گی۔ ویسے ایک بات کہوں تم سے رام
رتی؟" میں اپنے ماضی کو یاد کر رہا ہوں۔ ہم سے ضرور
کوئی ایسی بھول ہوئی ہوگی جس کی بنا پر بھگوان نے ہمیں
اس کشٹ میں ڈالا ہے۔ اب تو کوئی امید باقی نہیں رہ گئی
ہے۔ وہ ظالم جادوگرنی ہم سے کھیل رہی ہے۔ اس نے

ہمارے نام پر اپنا سنسار جما رکھا ہے۔ بھلا اسے کیا پڑی
ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرے۔" نعمت علی
۔ خیری کے ساتھ اندر آیا تھا۔ کسی کو اس کی آمد پر شبہ تک
نہیں ہو سکا تھا۔ جب یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ تو خیر
الدین نے اسے آگے بڑھایا۔ اور پھر نعمت علی کے حلق
سے اس کی آواز نکلی۔

"نہیں...... سنگرام سنگھ! گناہ تو انسان ہمیشہ کرتا
ہے، اور اسے اس کی سزا بھی ملتی ہے۔ لیکن جس بڑے
سزا دینے والے کو تم یاد کر رہے ہو۔ اسے اللہ کہو یا بھگوان
وہ اپنے بندوں پر ہمیشہ رحم کرتا ہے۔ گناہوں کی اگر
معافی مانگ لی جائے تو معاف کر دیا جاتا ہے۔" دونوں
میاں بیوی نے سہمی ہوئی نگاہوں سے نعمت علی کو دیکھا۔
دونوں اسے گھورتے رہے۔ پھر رام رتی ہی بولی۔

"بھگوان کی سوگند...... مہاراج ہمیں
تو...... آپ کے آنے کا پتہ ہی نہ چلا۔"

"ہاں...... میں بہت چھپ کر آیا ہوں۔"

"تت...... تو کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں ہے
؟" اس بار سنگرام سنگھ نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"مہاراج! اس نے آپ کو اکیلے یہاں آنے
دیا؟"

"کیوں؟"

"نہیں۔ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ جب بھی
یہاں کوئی آتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسے
خطرہ ہے کہ کوئی ہماری سہائتہ کرنے پر نہ تل جائے۔ وہ
نگاہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اس راج محل میں جتنے لوگ ہیں
سارے کے سارے مجھ سے اور میری دھرم پتنی سے
ہمدردی رکھتے ہیں۔ دو یا تین لوگ ایسے ہیں جو اس کے
ساتھ آتے ہیں۔ بس وہی اس کے نام کی مالا جپتے
ہیں...... میرے بارے میں اس نے یہی کہا ہوا ہے۔
کہ لمبی یاتراؤں پر گیا ہوا ہوں۔ اور جب میرا من
چاہے گا واپس آؤں گا۔ میری یاترا کون سی ہے۔ تم دیکھ
رہے ہو؟" سنگرام سنگھ نے کہا اور پھر ایک دم چونک کر

بولا۔ "مم...... مگر...... تم...... تم...... تم کون ہو؟"

"تمہارا ہمدرد اور تمہیں اس مشکل سے نکالنے کیلئے کام کرنے والا۔" نعمت علی کے منہ سے خیر الدین کی آواز نکلی۔ اور وہ دونوں سحر زدہ سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"اے بھگوان! کیا ایسا ہو سکتا ہے۔ ہم تو ابھی یہ ہی باتیں کر رہے تھے کہ بس جیون کے جتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔ انہیں بھگوان کی یاد میں بتا دیا جائے۔ اب کیا امید رکھی جائے۔ کہ اس جیون میں ہم یہاں سے نکل سکیں گے۔"

"اور اسی بات کا میں نے تمہیں جواب دیا تھا۔ کہ پالن ہار۔ ہر ایک کی مدد ضرور کرتا ہے۔" وہ دونوں آس بھری نگاہوں سے نعمت علی کو دیکھنے لگے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر سنگرام سنگھ بولا۔

"مہاراج! بہت بڑی بات کہہ دی ہے آپ نے۔ ٹوٹی ہوئی آس کو جوڑنا بھی بھگوان کی تپسیا کرنے کی طرح ہے۔ بھگوان آپ کو سکھی رکھے۔ پر ہمیں نظر نہیں آتا کہ ہم اس جادوگرنی کے چنگل سے نکلیں گے۔ اور وہ صاف صاف کہہ چکی ہے۔ کہ جب تک جیون ہے ہم اس کی قدر کریں، جیتے رہیں۔ موت ہمیں یہیں آئی ہے۔"

"تم لوگ اس کے چنگل میں پھنس کس طرح گئے؟" نعمت علی نے سوال کیا۔ وہ دونوں اس دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ جو یہاں اس تہہ خانے میں داخل ہونے کا۔ واحد دروازہ تھا۔ تو نعمت علی نے کہا۔

"فکر بالکل مت کرو۔ وہ یہاں نہیں آسکے گی۔ میں تمہیں اطمینان دلاتا ہوں۔" سنگرام سنگھ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور بولا۔

"بس مہاراج بڑا سکھی جیون بیت رہا تھا۔ کوئی چنتا نہیں تھی آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ کہ بھوج گڑھی میں سنگرام سنگھ کا کیا مقام ہے۔ سب محبت کرتے تھے ہم سے سب کا پریم تھا۔ ہمارے ساتھ۔ گھومتے پھرنے نکلے تھے میں اور رام رتی، شوق تھا ہمیں اس کا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ جاتے تھے۔ پر کبھی بھی خود کو آزاد بھی چھوڑ دیتے تھے۔ ایسے ہی ایک بار میں اور رام رتی گھومتے پھرتے ایک طرف جا نکلے۔ ویران سا علاقہ تھا۔ ہم گھومتے پھرتے وقت کو ہی بھول گئے۔ اور پھر رات ہو گئی۔ ہمارے پاس کھانے پینے کی چیزیں موجود تھیں۔

ہمیں یوں لگا جیسے ہم راستہ بھول گئے ہوں۔ بہت دیر تک ہم ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اور رات گہری ہوتی رہی۔ ہر طرف جنگل بیابان تھا۔ اور اب ہمیں خوف نے گھیر لیا تھا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ پتہ نہیں آنے والا لمحہ ہمارے لئے کیا ثابت ہوں۔ تبھی ہمیں تھوڑے فاصلے پر ایک روشنی دکھائی دی۔ اور ہمارے قدم اس روشنی کی جانب اٹھ گئے۔ ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت تھی۔ لیکن روشنی اور چھت انسان کی ابدی خواہش رہی ہے۔ اور اس سے اسے ایک اعتماد کا احساس ہوتا ہے۔

ہم اس کھنڈر نما عمارت میں داخل ہو گئے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں انسانوں کا گزر نہیں ہے۔ روشنی ایک دیئے کی تھی۔ جو عمارت کے ایک حصے میں روشن تھا۔ اور بس وہی "دیا" حیران کر رہا تھا۔ کہ جب یہاں انسان نہیں ہیں تو "دیا" کس نے جلایا۔ میری دھرم پتنی خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"کہیں یہ بھوت، پلیدوں کا مسکن نہ ہو۔" میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بات ذہن کو الجھانے والی تو تھی۔ ویران، عمارت، اور دیا۔ خاموش اور سنسان ماحول، مگر اس وقت دھرم پتنی کو خوف زدہ کرنا بالکل مناسب نہیں تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔

"اب جو کچھ بھی ہے۔ ہمیں یہاں رات تو بتانی ہی ہے۔" چنانچہ ہم نے ایک صاف ستھری جگہ دیکھی۔ حویلی نما عمارت کے بہت سے حصے مخدوش تھے۔ اور خوف تھا۔ کہ اگر ہم کسی جگہ رکیں اور وہاں اینٹیں وغیرہ گر پڑیں۔ تو ہم زخمی ہو جائیں گے۔ چنانچہ جو جگہ ہم نے منتخب کی وہاں کھلی چھت تھی۔ اور آسمان نظر آ رہا تھا۔ میں نے...... رام رتی کو بہت تسلیاں دیں۔ کھانے پینے

کی چیزیں کھائیں اور باتیں کرنے لگے۔ نیند کا تو خیر کیا ہی سوال پیدا ہوتا تھا۔ میں اپنی بیوقوفی پر غور کر رہا تھا۔ کیسا پاگل پن کا کام ہوا تھا۔ اب اتنا بے خبر بھی نہیں ہو جانا چاہئے تھا۔ رام رتی خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اور سہمی سہمی نظر آ رہی تھی۔

پھر ہمارے کانوں میں ایک مدھم سی آواز گونجی یہ مدھم سروں میں کسی کے گانے کی آواز تھی۔ ہم دونوں چونک کر رک گئے۔ خوف کی وجہ سے ہم پوری عمارت کا جائزہ تو نہیں لے سکے تھے۔ اور سوچا تھا کہ ضرورت ہی کیا ہے رات ہی تو بتانی ہے یہاں۔ تجسس میں پڑ کر کہیں کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جائیں۔ چنانچہ ایک جگہ سمٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ گانے کی آواز پر رام رتی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"یہ آواز...... یہ آواز سن رہے ہو سنگرام؟" میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ باہر چاندنی چٹک اٹھی تھی۔ اور پھر چاندنی میں ہم نے ایک انسانی سایہ دیکھا۔ کوئی آہستہ آہستہ گاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مدہم چاندنی میں صاف پتہ چل گیا کہ کوئی عورت ہے۔ دیہاتی قسم کے لباس میں ملبوس شکل و صورت تو نمایاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن یہ اندازہ ہوتا تھا۔ کہ نوجوان ہے۔ رام رتی سرگوشی میں بولی۔

"یقیناً یہ بھوتنی یا چڑیل ہے۔ ہائے رام۔ اب کیا ہوگا؟" میں بھلا کیا جواب دیتا۔ اچانک ہی گانے کی آواز بند ہو گئی۔ اور وہ رک گئی۔ حالانکہ رام رتی نے یہ الفاظ سرگوشی کے انداز میں کہے تھے۔ پر یوں لگا جیسے اس نے یہ الفاظ سن لئے ہوں۔ اس کا رخ ہماری طرف ہو گیا۔ اور وہ آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھنے لگی۔

رام رتی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ ہمارے قریب پہنچی اور جب وہ ہمارے قریب آئی تو میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اب آپ کو بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے مہاراج وہ پوری، کی پوری، رام رتی تھی۔ وہی قد کاٹھ، وہی چہرہ، وہی نقوش، جو رام رتی کے تھے۔ وہ بھی حیرانی سے رام رتی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ مسکراہٹ ہی رام رتی سے ملتی جلتی تھی اس کی مدہم آواز ابھری۔

"کون ہو تم دونوں؟" ہمارے منہ سے کوئی جواب نہیں نکل سکا تو اس نے رام رتی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "اور تو کون ہے۔ میری بہن تو...... تو میرے ہی جیسی ہے۔ جبکہ سنسار میں میری کوئی بہن نہیں تھی۔ تو کہاں سے آ گئی؟"

"دیکھو! مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔" اس کے میٹھے لہجے اور انداز سے ہمیں بڑا حوصلہ ہوا۔ وہ ہمارے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ پھر اس نے کہا۔

"کیا نام ہے۔ تمہارا؟"

"میرا نام سنگرام سنگھ ہے۔"

"تم سے نہیں۔ اپنی اس بہن سے پوچھ رہی ہوں میں۔" اس نے رام رتی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ اب تک اس نے جس میٹھے لہجے میں بات کی تھی اس نے ہم دونوں کو ہی متاثر کیا تھا۔ رام رتی نے اسے اپنا نام بتایا تو وہ بولی۔ "ہے۔ پربھو! یہ کیا ہو رہا ہے؟ میرا نام بھی رام رتی ہی ہے۔" ہم دونوں کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ وہ ہم سے خوب گھل مل گئی۔ تو میں نے اس سے پوچھا۔ کہ وہ یہاں ان جنگلوں میں کیا کرتی پھر رہی ہے۔ اس نے ایک دکھ بھری کہانی سنائی...... جس میں اس نے بتایا۔ کہ اس کے ماتا، پتا مر چکے ہیں۔ دوسروں کے رحم و کرم پر پل رہی تھی۔ بستی والوں نے اس پر الزام لگا کر اسے بستی سے نکال دیا۔ اور وہ بھٹکتی ہوئی اس طرف آ گئی۔ اور اب وہ بے یار و مددگار پھر رہی ہے۔ وہ ڈرتی ہے کہ اس جنگل میں کہیں وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائے۔ اس نے اس طرح ہم لوگوں پر جادو کیا کہ ہم لوگ اسے اپنے ساتھ یہاں بھوج گڑھی لے آئے۔ اس نے اپنے آپ کو چھپائے رکھا۔ کسی کی نگاہ اس پر نہیں پڑ رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کے لئے اس نے کیا کیا تھا۔ پھر ایک رات ہم دونوں سو رہے تھے۔ کہ وہ ہمارے پاس پہنچ گئی۔ اس دوران وہ یہیں بھوج گڑھی

میں ہمارے ساتھ ہماری اس حویلی میں رہتی تھی۔ وہ کیا کرتی پھر رہی ہے۔ ہمیں اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن اس نے یہ تہہ خانہ دریافت کرلیا تھا۔ جس کا ہمیں بھی علم نہیں تھا۔ قدیم حویلی میں ہمارے پرکھوں نے یہ تہہ خانہ بنوایا ہوگا۔ لیکن مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس نے ہمیں بے ہوش کیا۔ اور پتہ نہیں کس کس کی مدد سے وہ ہمیں اس تہہ خانے میں لے آئی۔ ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

بس اس لمحے سے ہم یہاں قیدی ہیں۔ اور وہ رام رتی کی حیثیت سے بھوج گڑھی پر راج کر رہی ہے۔ اور اب تو اتنا سمے بیت گیا۔ کہ اوپر کی دنیا ہمیں یاد بھی نہیں ہے۔" سنگرام سنگھ خاموش ہوگیا۔ رام رتی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ نعمت علی نے سنگرام سنگھ سے کہا۔

"کیا تمہارے دل میں یہ خواہش ہے کہ تم باہر اپنی دنیا میں جاؤ؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں مہاراج! کس کے من میں یہ خواہش نہیں ہوگی...... ہم سے تو سنسار ہی چھوٹ گیا ہے۔"

"تو پھر حوصلہ رکھو۔ میں تمہاری مدد کرونگا۔ اور اگر ممکن ہوسکا تو میں تمہیں اس جادوگرنی کے چنگل سے نجات دلاؤں گا۔" دونوں امید بھری نگاہوں سے نعمت علی کو دیکھنے لگے۔ نعمت علی نے کہا۔ "اور جب تم اپنی دنیا میں واپس جاؤ گے تو تم یہ ہی کہو گے کہ تم یاتراؤں پر نکلے ہوئے تھے۔ رام رتی ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ سنبھال لیں گی۔ سمجھ رہے ہو ناں تم؟"

"تم ہمیں جھوٹے سپنے دکھا رہے ہو۔ وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گی۔ ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ وہ جادوگرنی ہے۔ کوئی گندی آتما ہے۔ ہم آتما سے کیسے لڑ سکتے ہیں۔"

"یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔" غرض یہ کہ ان دونوں کو تسلی دینے کے بعد خیرالدین نے نعمت علی کو واپس چلنے کے لئے کہا۔ اور وہ اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ نعمت علی نے کہا۔

"کیا کرنا ہے اب ماموں؟"

"میں نے سوچ لیا ہے۔ جو کچھ کرنا ہے میں کر ڈالوں گا۔ لیکن پہلے مجھے اس کے لئے کوشش کرنا ہوگی۔" غرض یہ کہ خیرالدین نعمت علی کے وجود سے باہر نکل گیا۔ جب بھی کسی خفیہ کارروائی میں اسے کام کرنا ہوتا تھا۔ تو وہ نعمت علی کے وجود سے باہر ہو جاتا۔ اور اس وقت نعمت علی کو اپنا سارا بدن بڑا ہلکا سا محسوس ہوتا تھا۔ ورنہ اسے ایک بوجھ لاد کر چلنا پڑتا تھا۔ مدد علی بیچارے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ نعمت علی کو ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اب یہاں صورت حال یہ پیش آگئی تھی۔ غرض یہ کہ وقت گزرتا رہا تین دن کے بعد نعمت علی کو اپنا وجود بھاری محسوس ہوا۔ تو اس نے کہا۔

"استاد محترم! کیا آپ تشریف لے آئے؟"

"ہاں۔"

"اور یقیناً کچھ کرکے ہی آئے ہوں گے؟"

"ظاہر ہے۔ میں آوارہ گردی کرنے نہیں گیا تھا۔"

"تو پھر اب......؟"

"آج کے دن کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"میں کیا جانوں؟"

"پورے چاند کی رات ہے۔ آج وہ آگ کا غسل کرے گی۔"

"رام رتی؟"

"نہیں تمہاری خالہ۔" خیرالدین نے کہا۔ اور نعمت علی ہنسنے لگا۔

بہرحال رام رتی کیا کر رہی تھی۔ اس کا تو کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن نعمت علی خیرالدین کے ساتھ مستعد تھا۔ پھر رات کے تقریباً ڈیڑھ بجے کا وقت تھا چاند پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ خیرالدین خیری نے کہا۔

"آؤ...... نعمت علی کام کا وقت آگیا ہے۔"

نعمت علی باہر نکل آیا۔ انہوں نے رام رتی کو دیکھا۔ جو زرق برق لباس میں ملبوس والہانہ انداز میں ایک طرف

بکھر رہی تھی۔ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ حویلی کے ایک دور افتادہ گوشے کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں عام طور سے کوئی نہیں جاسکتا تھا۔ پھولوں سے بنے خوب صورت دروازے سے وہ اندر داخل ہوئی تو نعمت علی ٹھٹک کر رک گیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" اس کے اندر سے خیرالدین کی آواز ابھری۔

"وہاں آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ ہمیں دیکھ نہ لے۔"

"نہیں دیکھ سکے گی۔ چلتے رہو پھولوں کے دروازے سے گزر کر وہ اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ رام رتی زمین کی گہرائیوں میں بنی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہے۔ بڑی پراسرار جگہ تھی۔ مدھم مدھم سی روشنی پھیل رہی تھی۔ نعمت علی کو اب اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا۔ کہ رام رتی جیسی جادوگرنی بھی اسے نہیں دیکھ سکتی چنانچہ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

یہاں تک کہ رام رتی ایک عجیب وغریب دروازے کے پاس جاکر رک گئی۔ یہ دروازہ کسی موٹی چٹان سے بنا ہوا تھا۔ اور بہت ہی عجیب وغریب انداز سے کھلتا تھا۔ رام رتی نے دروازہ کھولا۔ تو اندر شعلوں کا جہنم نظر آیا۔ اتنی خوف ناک آگ جل رہی تھی اندر کہ وہاں کھڑے ہونا مشکل نظر آرہا تھا۔ لیکن رام رتی بڑی آسانی سے دروازے کے اندر داخل ہوگئی۔ اور دروازہ بند ہوگیا۔

"خدا کی پناہ کیا یہ جل کر راکھ نہیں ہو جائے گی؟" نعمت علی نے کہا۔

"اب ہو جائے گی۔" اس کے اندر سے آواز ابھری۔ اور پھر خیرالدین نے اس عجیب وغریب دروازے پر شاید کوئی عمل شروع کیا تھا۔ کیونکہ اچانک ہی فضا میں ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ اور اس گڑگڑاہٹ سے قرب وجوار کی دیواریں لرزنے لگی تھیں۔ پھر اچانک ہی دروازے کے اوپر ایک

اور وزنی چٹان آ گری۔

نعمت علی اچھل کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ دروازہ جس سے اندر داخل ہوا جاتا تھا اب بند ہو گیا تھا۔ اور اتنی بڑی چٹان نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ جسے ہلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ اندر سے بھیانک چیخیں سنائی دینے لگیں۔

یہ چیخیں باریک مگر بہت دلدوز تھیں۔ نعمت علی کچھ اور پیچھے ہٹا۔ تو خیر الدین کی آواز ابھری۔

"وہ اس آتشی دروازے سے اندر داخل ہوتی تھی۔ یہ دروازہ شعلوں کی سرنگ میں کھلتا ہے۔ جہاں بھیانک آگ روشن ہوتی ہے۔ وہ آگ کا غسل کرتی ہے۔ اور اس کے بعد وہ آتشہ ہو کر باہر نکل آتی ہے۔ لیکن باہر نکلنے کا راستہ بند ہو گیا۔ اور اب وہ اندر ہی اندر راکھ ہو جائے گی یہ راستہ اب دوبارہ کبھی نہیں کھلے گا۔ کیونکہ اسے کھولنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اور وہ ایک مخصوص وقت تک اندر رہ سکتی ہے۔ ہاں جب شعلے اس کے وجود کو بھر دیں گے تو اس کے بعد ان کا آگے کا کام شروع ہو جائے گا۔ اور وہ وہیں راکھ کا ڈھیر ہو جائے گی۔ سمجھ رہے ہو ناں تم؟" نعمت علی کے بدن میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ساری باتیں اپنی جگہ۔ لیکن خیر الدین خیری کی باکمال شخصیت تھی۔ نعمت علی چند لمحے وہاں کھڑا رہا۔ پھر وہ آوازیں بند ہو گئیں۔ تو خیر الدین نے کہا۔

"واپس چلو! ہمیں ابھی آگے کا کام کرنا ہوگا۔"

اس رات انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ اور اپنی آرام گاہ میں آ گئے۔ خیر الدین خیری کی آواز تو پھر دوبارہ سنائی نہیں دی تھی۔ لیکن نعمت علی ساری رات جاگتا رہا تھا۔

صبح ہو گئی۔ داسیوں نے معمول کے مطابق اسے ناشتہ پیش کیا۔ آخر کار نعمت علی نے کہا۔

"استاد محترم! کہاں غائب ہو گئے؟"

"یار! مجھے کہاں غائب ہونا ہے۔ تمہیں آرام کرنے کا موقع دے دیا تھا۔"

"وہ ختم ہو گئی۔"

"تو آؤ دیکھا......؟"

"پھر اب ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں صرف وقت کا انتظار کرو۔" خیر الدین خیری نے کہا۔ شام ہو گئی۔ اور پھر رات ہو گئی۔ رات کو ساڑھے بارہ بجے کے قریب نعمت علی کو خیر الدین کی آواز سنائی دی۔

"چلو۔ اپنے دوستوں سے مل لیں۔" خیر الدین خیری چل پڑا ان کا رخ اس تہہ خانے کی طرف تھا۔ آخر کار وہ اس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں تہہ خانہ تھا۔ اور خیر الدین خیری کے کہنے پر نعمت علی دروازہ کھول کر تہہ خانے میں داخل ہو گیا۔

سنگرام سنگھ اور رام رتی گہری نیند سو رہے تھے۔ نعمت علی نے انہیں جگایا تو دونوں ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ نعمت علی کے وجود میں اب خیر الدین بول رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"سنگرام سنگھ، رام رتی۔ تمہاری مشکلوں کے دن ختم ہو گئے۔ رام رتی تمہیں پہلے تہہ خانے سے باہر نکلنا ہے۔ لیکن اب تمہیں ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ تم اپنی جگہ جاؤ گی۔ اپنے سارے لباس وغیرہ دیکھو گی۔ اپنا حلیہ ٹھیک کرو گی۔ چاہو تو اپنی کنیزوں سے بیماری کا بہانہ کر دینا۔ کیونکہ تمہاری صحت کافی خراب ہو گئی ہے۔ تم کبھی کسی پر ظاہر نہیں کرو گی کہ کوئی انوکھا واقعہ ہوا ہے۔ بلکہ رام رتی بن کر تم ان سب لوگوں کے ساتھ وقت گزارو گی۔ جن میں سے کچھ کو تم جانتی بھی نہیں ہو گی۔ اب یہ سارے کام نہایت ہوشیاری سے کرنے ہیں۔ چھ یا سات دن کے بعد تم اعلان کرو گی کہ سنگرام سنگھ یاتراؤں سے واپس آ رہے ہیں۔ اور سنگرام سنگھ، رام رتی تمہیں نکال کر تمام انتظامات کے ساتھ ایک ایسی جگہ پہنچا دے گی۔ جہاں سے تم ایک یاتری یا سادھو بن کر واپس آ ؤ گے۔ بھوج گڑھی کے لوگوں کو کسی بات کا پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ کیا ہوا تھا۔ کیا ہو گیا ہے۔ رام رتی اور سنگرام سنگھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نعمت علی کو دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ جو

کچھ نعمت علی کہہ رہا ہے وہ درست ہے۔ آخر کار سنگرام سنگھ نے ہی پوچھا۔

"اور وہ......؟"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اسے ختم کر دیا گیا ہے۔" سنگرام سنگھ اٹھ کر نعمت علی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ دونوں بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ آخر کار رام رتی نعمت علی کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔ سنگرام سنگھ کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن طے یہ کیا گیا تھا۔ کہ جب تک رام رتی سارے سلیقے طریقے سے اپنا کام ختم نہ کر لے۔ ان کا قیام یہیں حویلی میں رہے گا۔ رام رتی بہر حال برے وقت سے گزر چکی تھی۔ لیکن بہت ذہین تھی۔ اس نے سارا انتظام سنبھال لیا۔ پھر ساتویں دن مہاراج سنگرام سنگھ بڑے کروفر کے ساتھ بھوج گڑھی میں داخل ہوئے۔ ان کا سواگت کرنے والوں کا ایک بڑا ہجوم موجود تھا۔ وہ بھوج گڑھی کی سرحد سے اندر داخل ہوئے۔ رام رتی نے ان کا سواگت کیا اور انہیں لے کر حویلی کی جانب چل پڑی۔ تو خیر الدین خیری نے کہا۔

"آؤ..... نعمت علی اب ہمارا یہاں کیا کام ہے؟" پورا بھوج گڑھی خوشیاں منا رہا تھا۔ سنگرام سنگھ کی واپسی کی اور نعمت علی اپنے دوست خیر الدین خیری کے ساتھ بھوج گڑھی کی سرحد سے باہر نکل رہا تھا۔

نعمت علی کی تو زندگی بدل گئی تھی۔ خیر الدین خیری صرف ایک روح نہیں تھا۔ بلکہ زندگی میں ایک عامل بھی تھا۔ اور ہر مشکل کا حل تلاش کر لیا کرتا تھا۔ نعمت علی کو اس بات کا سو فیصدی یقین تھا کہ اگر خیر الدین یہ بات کہہ رہا ہے کہ جادوگرنی دوبارہ اس شعلوں کی سرنگ سے واپس نہیں آئے گی۔ تو اس کا مقصد ہے کہ وہ واقعی واپس نہیں آئے گی۔

بہر حال انہیں اس بات پر پورا پورا یقین ہو گیا تھا۔ کہ اب رام رتی اور سنگرام سنگھ کی مشکل حل ہو گئی ہے۔ جو ان مشکلات کا شکار تھے۔

فرقان بیگ اور شکیلہ کے معاملات اب حل ہو جائیں گے اور اس کی اطلاع نعمت علی ہی کے ذریعے پہلے فرقان بیگ کو دی گئی جب نعمت علی وہاں پہنچا تو فرقان بیگ نے بہت پرتپاک طریقے سے اس کا استقبال کیا۔

"شاہ جی! آپ نے میری ساری مشکلیں آسان کر دیں ہیں اب ہمارے سارے معاملات ٹھیک ہو گئے ہیں، لگتا ہے ہمارے ستارے گردش سے نکل گئے ہیں۔"

"اپنے سسر کو اطلاع دے دینا۔ کہ رام رتی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی ہے۔" نعمت علی نے کہا۔

"آپ تشریف لائیے۔ قیام فرمائیے ہمارے ساتھ۔"

"اب نہیں۔ ہمیں اور بھی بہت سے کام ہیں۔" نعمت علی کی آواز میں خیر الدین خیری بول رہا تھا۔ پھر وہ وہاں سے واپس چل پڑے۔ تو نعمت علی نے کہا۔

"اب کیا ارادے ہیں استاد محترم!"

"میرے ایک سوال کا جواب دو نعمت علی۔"

"کیا......؟"

"دیکھو...... ہم جو کچھ کرتے پھر رہے ہیں۔ ان میں میری پسند کا بڑا عمل دخل ہے اور یہی سچی بات ہے۔ میں یہ ہی چاہتا ہوں۔ کہ تمہارے وجود میں رہ کر انسانوں کی مشکلیں حل کرتا رہوں۔ لیکن اگر تم میری قربت سے اکتا گئے ہو۔ تو میں ایک اچھے دوست کی حیثیت سے تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اپنی پسند کی زندگی اختیار کرو۔ جس طرح بھی جینا چاہو گے میں اس میں تمہاری مدد کروں گا۔ ایک دولت مند رئیس کی حیثیت سے زندگی کی دلچسپیوں سے آشنا ہو کر جس طرح بھی تم پسند کرو۔ لیکن شرط یہ ہے۔ کہ دل کی بات سچائی سے مجھے بتا دو۔"

"استاد محترم! ایک دولت مند رئیس کی حیثیت سے تو دنیا میں بے شمار افراد زندگی گزار رہے ہیں۔ لوگوں کی مشکلوں کا حل تلاش کر کے۔ مرجھائے ہوئے چہروں پر خوشی لا کر ان بے کس اور بے سہارا

لوگوں کی مدد کرکے جو روحانی دولت حاصل ہوتی ہے
۔ وہ زندگی کی سب سے قیمتی چیز ہے۔ وہ لوگ جو
اپنے حالات کا شکار ہوکر بے بسی اور بے کسی سے
ہاتھ ملتے ہیں میرے خیال میں ان کے ہونٹوں پہ
مسکراہٹ لانا۔ سب سے بڑی دولت ہے۔ آپ
جب بخوشی میرا ساتھ دیں گے۔ میں آپ کے ساتھ
رہنا پسند کروں گا۔"

"جیتے رہو..... خوب جیو..... اتنے جیو کہ جیتے
جیتے تھک جاؤ۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی ہو
ہی نہیں سکتی۔ سمجھ لو یہی ہماری زندگی ہے۔ اور یہی
ہمارا منصب چلو آؤ..... کسی ایسے کو تلاش کرتے ہیں۔ جو
دکھوں کا مارا ہو۔" خیر الدین نے کہا۔ اور وہ لوگ وہاں
سے چل پڑے۔

نعمت علی کو درحقیقت زندگی کا لطف آگیا تھا۔
ایک طرف تو مدد علی اچھے خاصے درویش بن چکے تھے۔
حالانکہ وہ ایک انتہائی نیک اور ایماندار آدمی تھے اس
نے کبھی یہ کہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کہ وہ کوئی پہنچا ہوا
بزرگ ہے۔ بس اللہ کے نام کے ساتھ کچھ گنڈے اور
تعویذ کردیا کرتے تھے۔

لیکن اب ان عقیدت مندوں کا کیا کرتے جو
ان کے دروازے پہ بھیڑ لگائے رہا کرتے تھے رئیس
خان کے معزز دوست نے رئیس خان کو بتادیا تھا۔ کہ اس
نے جس مقدس بزرگ سے مدد مانگی تھی۔ اس کی
کرامات نے اس پہ سے مشکلات ٹال دی ہیں۔ اور مدد
علی سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ بیٹا اتنا کارآمد نکلے گا انہوں
نے خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا۔

آسیہ بیگم بھی اب فخر سے نعمت علی کا نام لیا کرتی
تھیں۔ ادھر نعمت علی خیر الدین خیری کی معیت میں
زندگی کی دلچسپیوں سے گزر رہا تھا۔ اور طرح طرح لطف
حاصل کررہا تھا۔ صحیح معنوں میں بعض اوقات طاقت کا
نشہ بھی ایسا نشہ ہوتا ہے کہ انسان زندگی سے پوری طرح
لطف اندوز ہوتا رہے۔ طرح طرح کے واقعات اور
کہانیاں ان کے علم میں آرہی تھیں۔ کوئی منزل کوئی

راستہ نہیں تھا۔ بس جدھر دل چاہتا۔ چل پڑتے۔ اور اس
دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک ایسے عجیب و غریب علاقے
سے گزر رہے تھے وہ جس کے بارے میں یہ نہیں کہا
جاسکتا تھا۔ کہ اس کے آس پاس کوئی آبادی بھی ہے۔
لیکن ایک عمارت نمایاں نظر آرہی تھی۔ جو بیشک اس
ویران سے علاقے میں اکیلی تھی۔
لیکن یہ نہیں لگتا کہ وہ انسانی توجہ سے محروم ہے
۔ اور اس وقت بھی ایک بہت ہی اعلیٰ درجے کی قیمتی
کار اس عمارت کی جانب بڑھ رہی تھی غیر ملکی کار تھی۔
جو لیفٹ ہینڈ ڈرائیو تھی۔ اور اس کی چھت کھلی ہوئی
تھی۔ اس کار کو ایک خوب صورت نوجوان ڈرائیو کررہا
تھا۔ ایک بہت ہی حسین سی لڑکی اس کے برابر میں بیٹھی
ہوئی تھی۔

"دیکھو! یقینی طور پر کسی دل چسپ کہانی کا آغاز
ہو رہا ہے، ہوسکتا ہے یہ اس عمارت کا ماضی ہو۔ آؤ
..... ذرا اس کہانی کو دیکھیں۔ راستے طے کرتی ہوئی آخر
کار، یہ کار پتھروں کی بنی ہوئی اس عمارت کے
..... قریب پہنچ گئی۔ جس کے طرز تعمیر سے یہ اندازہ لگایا
جاسکتا تھا۔ کہ شاید وہ کئی سو سال پرانی ہے۔ لیکن اس
کے باوجود انتہائی مضبوط اور خوبصورت تھی۔ اور یقینی طور
پر مقامی آبادی۔ رہن سہن اور واقعات کا اندازہ لگانے
سے یہ پتہ چل سکتا تھا کہ کسی سرمایہ دار نواب، راجہ،
یا رئیس نے اسے تفریح گاہ کے طور پر تیار کرایا ہوگا۔ لیکن
اب وہ عمارت بے اعتنائی کا شکار تھی۔ شاید اس پر پوری
توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ بھوری رنگ کی دیواروں میں
جابجا۔ دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور اس کے اردگرد
اونچی اونچی گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ اگے ہوئے تھے۔ ہاں
یہ اندازہ بے شک لگایا جاسکتا تھا کہ کسی زمانے میں
عمارت کے گرد بکھری ہوئی گھاس اور خوشنما درخت،
شیالے رنگ کے ہوگئے تھے۔
لیکن اپنی قدرتی شادابی کو نہیں کھو پائے تھے۔
ایک خوب صورت باغ کی حیثیت رکھتے ہوں گے
لیکن انسانی عدم توجہی سے وہاں کے سرسبز و شاداب

ماحول میں ایک ویرانی کا احساس ہوتا تھا۔ اور یہ ویرانی
اتنی عجیب لگتی تھی کہ انسانی ذہن خوف کا شکار ہوجائے۔
اس کے بائیں جانب بلند قامت اور گھنے درخت
ایستادہ تھے۔ جن میں یوکلپٹس، املتاس اور آم کے
درختوں کی بہتات تھی۔

دائیں جانب دور افتادہ کونے میں نیم شگفتہ جگہ
انگور کی بیلیں بکھری ہوئی تھیں۔ لیکن ان بیلوں کو پیلے
رنگ کی خونخوار بیلوں نے سانپ کی طرح جکڑ رکھا تھا۔
ماحول میں ایک عجیب سی وحشت ناک کیفیت تھی۔ لیکن
نوجوان نے یہاں آنے کے بعد کار کا انجن بند کردیا۔
اور جو ہلکی ہلکی آواز کار کے اس انجن سے بلند ہورہی تھی
ماحول کے گہرے سناٹے میں ڈوب گئی۔ لڑکی نے خوف
زدہ نگاہوں سے اطراف میں دیکھا۔ اور پھر نوجوان
کے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔

جو بے شک خوش شکل اور صحت مند تھا۔ لیکن
اس کے چہرے کی بناوٹ میں ایسی کرختگی پائی جاتی
تھی جس سے اس کی شخصیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ یعنی
وہ ایک ایسا رئیس زادہ تھا۔ جس کے انداز میں
اوباش اور جس کے حسین اور صحت مند چہرے کے
پیچھے ایک ایسی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ جو اسے عام
لوگوں سے مختلف ظاہر کرتی تھی۔ جو لڑکی اس کے
ساتھ تھی۔ اس کی عمر اٹھارہ سے انیس سال کے قریب
تھی دبلی پتلی کامنی سی۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف کی ہلکی سی
جھلکیاں پائی جاتی تھیں۔ انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کم
از کم اس نوجوان کے پائے کی لڑکی نہیں ہے۔ بلکہ کسی
ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ جو اپنی جگہ چھوڑ کر
بلندی کی جانب چھلانگ لگانے کی فکر میں سرگرداں رہتا
ہے۔ اس ماحول میں چھائی ہوئی وہ خاموشی چند لمحوں
تک سوار رہی پھر لڑکی کی مدہم، بھاری اور گہری آواز
ابھری۔

"یہاں کتنی خاموشی ہے۔ لیکن یہ کون سی جگہ
ہے؟ فرحان!" اس نے سوال کیا۔

"یہ میری آبائی حویلی ہے۔ اب تو اس کا کوئی
نام نہیں رہا لیکن کسی زمانے میں یہ سفید محل کہلاتی تھی۔"
لڑکے نے جواب دیا۔

"واقعی محل ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ
جگہ.....!"

"ہاں۔ میں نے بتایا ناں تمہیں، یہ ہماری آبائی
حویلی ہے۔ وقت نے اس کی کہن سالی میں اضافہ کیا
ہے لیکن اس کا وقار اس کی خاموشی اور اس کا پرغرور انداز
ہمارے خاندان کی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ شاید تمہیں
اس بات کا اندازہ نہ ہو کہ اس حویلی سے بہت سی
داستانیں وابستہ ہیں۔ آؤ۔ نیچے اترو....." فرحان نے
کہا اور لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نظر آنے
لگے۔

"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ یہ جگہ تو..... یہ
جگہ تو باعث خوف ہوسکتی ہے؟"

"اگر میں تمہارے ساتھ ہوں تو کیا خوف نام
کی کوئی چیز یہاں موجود ہوسکتی ہے؟" نوجوان نے پر
غرور لہجے میں کہا۔ اور لڑکی کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

"ل..... لیکن فرحان پتہ نہیں کیوں مجھے یہاں
ڈر لگ رہا ہے۔"

"عجیب ہو تم۔ مجھ سے کہا تھا کہ کسی ایسی جگہ
چلیں جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہو۔ تم جانتی ہو
محبت بھرے یہ الفاظ میرے لئے کس قدر قیمتی ہیں۔ اور
کیا میں نے کسی غلط جگہ کا انتخاب کیا ہے؟"

لڑکی پھیکی سی ہنسی کے ساتھ نیچے اتر آئی۔ وہ
اپنی چال ڈھال سے بہت پرکشش معلوم ہورہی تھی۔
اس نے اردگرد نگاہیں دوڑائیں۔ اور کہنے لگی۔

"اوہ..... شاید یہاں عمارت کا چوکیدار بھی نہیں
ہے۔"

نوجوان جس کا نام فرحان تھا ہنسنے لگا پھر بولا۔
"بہت سی ایسی باتیں ہیں جو آہستہ آہستہ
تمہارے علم میں آئیں گی جیسے میں....."
لڑکی نے ایک نگاہ فرحان کو دیکھا۔ اور بولی

"نہیں تمہیں تو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ لیکن مجھے بہت ہی عجیب لگ رہا ہے یہاں۔"

"آخر کیا ایسی بات ہے جس پر تم مسلسل گفتگو کیے جا رہی ہو؟"

"کیا تم یہ محسوس نہیں کر رہے کہ یہاں درخت پودے تو بے شمار ہیں لیکن کوئی جاندار نظر نہیں آ رہا۔ نہ پرندے اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور نہ ہی حشرات الارض کی آوازیں۔ جب کہ ایسی جگہوں پر جہاں انسانی زندگی کا کوئی گزر نہیں ہوتا۔ حشرات الارض اور پرندے بڑے خوشی سے رہتے ہیں۔"

نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"خوب اندازہ لگایا تم نے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم بہت ذہین ہو۔ واقعی میں نے پہلے کبھی اس پر غور نہیں کیا لیکن آج یہ احساس ہو رہا ہے کہ کچھ ہے۔"

"کیا؟" لڑکی کی آواز میں خوف شامل تھا۔

نوجوان پھر ہنس پڑا۔ اور بولا۔ "کچھ نہیں بس یونہی منہ سے یہ بات نکل گئی تھی۔ آؤ۔ اندر چلتے ہیں۔ یہ میری ملکیت ہے۔ اور میں تمہیں اپنی ملکیت دکھانے لایا ہوں۔ آؤ پلیز!" اس نے کہا۔ لیکن لڑکی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔

شام جھک آئی تھی۔ اور سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ سورج غروب ہونے میں بس کچھ ہی لمحات باقی تھے۔ گھنے درختوں کی وجہ سے عمارت کے اندر تاریکی نظر آ رہی تھی۔

فرحان نے لڑکی جانب دیکھا۔ اور پھر کسی قدر بے چین سے انداز میں بولا۔

"کیا سوچ رہی ہو۔ شرمیلا؟ کیا سوچنے لگیں؟"

"مجھے..... مجھے ڈر لگ رہا ہے فرحان، تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ لیکن یہاں اس ویران حویلی میں جہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے بھی کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ فرحان! جیسے..... جیسے.....اس وقت تمہارے انداز میں کوئی تبدیلی رونما ہوگئی ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو شرمیلا۔ کیا یہاں آنے کے بعد تمہارا مجھ پر سے اعتبار ہٹ گیا؟"

"نہیں ایسی بات تو نہیں ہے۔ ل..... لیکن؟"

"ہاں..... آگے کہو۔" فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری آنکھیں..... کچھ عجیب سی ہو رہی ہیں۔ فرحان ان میں محبت کی مٹھاس اور نرمی نہیں رہی ..... ج..... جو..... ن..... نہ جانے کیوں فرحان۔ کیوں پلیز!..... چلو یہاں سے واپس چلتے ہیں۔"

"سمجھ میں نہیں آ رہا..... تمہاری فرمائش پر تمہیں میں ایسی جگہ لایا ہوں۔"

"تم یقین کرو۔ میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"کمال ہے شرمیلا۔ تم اس سے پہلے تو کبھی اتنی سنجیدہ نہیں ہوتی تھیں۔ آؤ..... میرے اس محل کو اندر سے دیکھو..... اس قدر حسین اور اس قدر پرسکون کوئی بھی میرے اور تمہارے درمیان مداخلت کرنے والا نہیں ہے۔ تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔ جب تم کہو گی یہاں سے واپس چلیں گے۔ کیا جلدی ہے۔ یہاں سے جانے کی....."

"دیکھو! فرحان میں نے تم پر اعتماد کیا ہے۔ میرے اعتماد کو مجروح نہ کرنا۔ ورنہ اس کے بعد میں زندگی بھر تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

"اس سے پہلے کبھی تمہارے اعتبار کو مجروح کیا ہے۔" اور اس وقت فرحان کے لہجے میں تحکمانہ انداز پیدا ہوگیا تھا۔ اور وہ چند قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اب شرمیلا کو اس کے پیچھے چلنا ہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے اس موٹے سے بڑے سے تالے کی چابی

نکالی جو گھاس کے اس میدان سے گزرنے کے بعد اصل عمارت کے دروازے پر پڑا ہوا تھا۔

شرمیلا کے انداز میں خوف پیدا ہوگیا۔ اس نے تو رواداری میں ایسی کسی جگہ کے بارے میں اظہار کر دیا تھا۔ جہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ ہو۔ لیکن فرحان کی جیب میں اس عمارت کی چابی بھی موجود ہے۔ یہ ذرا تعجب خیز بات تھی۔ اس نے بڑے سے تالے کے سوراخ میں چابی ڈالی۔ اور اسے گھمانے لگا۔

تھوڑی سی دقت ہوئی تھی۔ چونکہ تالا بہت عرصے بند تھا۔ لیکن اس لمحے عقب میں پتوں کے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ اور ہوا کے جھونکوں کی سرسراہٹ کے ساتھ ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اور شخص بھی وہاں موجود ہے۔

دونوں کی گردنیں ایک ساتھ ہی پیچھے گھوم گئی تھیں۔ اور ان کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ شخص بھی اس ویرانے کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ عمر رسیدہ اور عجیب سی ہیئت کا مالک۔ وہ آہستہ آہستہ جھاڑ جھنکاڑ سے بھری ہوئی اس روش پر چلتا ہوا ان کی جانب آ رہا تھا۔

اس کے چہرے پر گھنی داڑھی بکھری ہوئی تھی۔ بال بھی بے ترتیب تھے۔ اور کھچڑی نظر آ رہے تھے۔ لیکن جسم خاصا مضبوط محسوس ہوتا تھا۔ وہ بڑے پر اعتماد انداز میں آگے بڑھتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن فرحان کے انداز سے یہ نہیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ شخص اس کے لئے اجنبی ہے۔ فرحان نے تالا کھول کر ایک جانب لٹکا دیا اور پھر آنے والے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کیا بات ہے نعمان خان؟"

"کچھ نہیں مالک۔ آپ کی گاڑی دیکھی تو یہ معلوم کرنے کے لئے آ گیا کہ مجھ سے کوئی کام تو نہیں ہے۔ مالک آپ کتنی دیر یہاں رکیں گے؟"

"کیوں خیریت، کیا مجھے اس بات کا جواب دینے کی ضرورت ہے؟"

"نہیں مالک آپ کا غلام آپ سے صرف اس لئے یہ سوال کر رہا ہے کہ اگر آپ زیادہ دیر یہاں رکیں تو جو کچھ آپ کی ضرورت ہو وہ پوری کرنے کی کوشش کروں۔ آپ کچھ کھائیں گے پئیں گے!"

"اوہ ہاں..... نعمان! میرا خیال ہے۔ تمہیں ہمارے لئے انتظام کرنا چاہئے۔ لو یہ پیسے رکھ لو۔" فرحان نے جیب سے رقم نکال کر نعمان خان کے ہاتھ پر رکھ دی اور پھر مسکراتا ہوا بولا۔

"لیکن صرف کھانے کا انتظام کرنا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو ناں؟"

"جی سرکار!" معمر آدمی مسکرایا پھر بولا۔ "لیکن سرکار یہ پیسے تو رہنے دیں۔"

"رکھ لو..... رکھ..... لو....." فرحان نے رعب دار لہجے میں کہا۔ اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مالک کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کیا.....؟" فرحان نے پوچھا۔

"تنہائی میں۔" نعمان نے پھر کہا۔ اور فرحان نے ایک نگاہ شرمیلا کی جانب دیکھا۔ جس کے چہرے کی پیلاہٹ اور بدن کی سرزشیں اس بات کا احساس دلا رہی تھیں کہ وہ یہاں آ کر بہت خوف زدہ ہے۔ فرحان، نعمان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ نعمان اسے زیادہ دور نہیں لے گیا تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے کہا۔

"مالک آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"ارے بابا کہو تم نے تو بلاوجہ سسپنس پیدا کر دیا ہے۔"

"مالک میں آپ کا نمک خوار ہوں۔ آپ کی زندگی چاہتا ہوں۔ مالک..... آ..... آپ کو یہاں اس طرح نہیں آنا چاہئے تھا۔ میں آپ کی زندگی چاہتا ہوں۔ مالک..... آپ کو اس لڑکی کو یہاں نہیں لانا چاہئے تھا۔ بڑی بات کر رہا ہوں۔..... لیکن بس آپ کی محبت میں کہہ رہا ہوں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو نعمان خان؟"

"آپ کو یہ پتا ہوگا کہ بڑے مالک کا یہ ہی حکم

کبھی نہیں
تھا۔ اور اس کی وجہ سے وہ حادثہ ہوا تھا۔ جسے ہم کبھی نہیں
بھول سکیں گے۔ مالک...... مالک ہمارے دل میں
خوف اترتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے بڑے مالک کا یہ ہی حکم
تھا۔ آپ سب کے لئے آپ کے بڑے بھائی کی موت
کے بعد یہ کہنے کی بات نہیں ہے۔ کہ وہ بھی اس طرح
اس عمارت میں آئے تھے۔ اور یہاں مردہ پائے گئے
تھے۔"

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ یہ عمارت آسیب زدہ
ہے۔ اور جس طرح فردوس علی کو موت کے گھاٹ اتار دیا
گیا اسی طرح میں بھی یہاں موت کا شکار ہو جاؤں گا۔ تم
یہ ہی کہنا چاہتے ہو ناں کہ اس عمارت میں بدروحیں رہتی
ہیں۔ اور یہاں ایسی کوئی محفل ہمارے لئے نقصان دہ
ہو سکتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک چھوٹے مالک! میں تو یہاں رہتا
ہوں اور مجھے وہ سب کچھ معلوم ہے۔ جس کا تعلق اس
عمارت سے ہے۔ ساری زندگی یہیں گزر گئی ہے۔
چھوٹے مالک اور عمارت کے بارے میں جتنا میں جانتا
ہوں اور کوئی نہیں جانتا۔"

"تم مجھے خوف زدہ کر رہے ہو۔ نعمان خان، یہ
ہی بات ہے ناں۔ اور اس طرح تم حق نمک ادا کر رہے
ہو۔ لیکن بات سنو! میں بھی اسی آدمی کا بیٹا ہوں جس کا تم
نمک کھاتے ہو۔" فرحان سخت لہجے میں بولا۔

"میری بات کو غلط نہ سمجھیں چھوٹے مالک!
فردوس علی کی موت کا واقعہ میں ایک ایسی بات ہے۔ جو
میرے اور بڑے مالک کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پولیس تو
اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکی۔"

"کیا مطلب! کون سی ایسی بات ہے؟ کیا تم
نے وہ بات پولیس کو بتائی؟"

"میری زبان صرف اتنا ہی بول سکتی ہے۔
چھوٹے مالک، جتنا بڑے مالک کا حکم ہے۔ اس کے
بعد میری زبان بند ہو جاتی ہے۔"

"ضرور کوئی ایسی بات ہے۔ جس کا تعلق بڑے

"ہاں۔ مالک ایسی ہی بات ہے۔"

"مجھے بتاؤ ایسی کیا بات ہے۔" فرحان نے کسی
قدر کرخت لہجے میں کہا۔ اور بوڑھے نعمان کی نگاہیں
شرمیلا کی جانب اٹھ گئیں۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"جس رات فردوس میاں کی موت ہوئی۔ اس
رات بھی ایک لڑکی ہی تھی مالک اور آپ
مالک...... ہیں...... میں اپنے منہ سے کیا کہوں...... اگر
آپ میری بات کا یقین کریں تو اس لڑکی کی صورت اور
حلیہ اس لڑکی سے ملتا جلتا تھا۔"

"میں تمہاری باتوں پر قہقہے لگاتا۔ نعمان، لیکن
اس وقت اس کا موقع بھی نہیں ہے۔ لیکن تم نے اس لڑکی
کے بارے میں پولیس کو کیوں نہیں بتایا۔ یہ بھی تو ہو سکتا
ہے۔ اس لڑکی نے فردوس علی کا خون کیا ہو؟"

"نہیں مالک اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ تو خود
بھی بے ہوش ہو گئی تھی۔"

"لیکن وہ اس قتل کی عینی گواہ تو ہو گی۔ اس نے
یقیناً قاتل کو دیکھا ہو گا۔ اگر ہم پولیس کو اس کے بارے
میں اطلاع دے دیتے تو یقینی طور پر پولیس اس سے
بہت کچھ معلوم کر سکتی تھی۔ وہ قاتل کو کم از کم جانتی
ہو گی۔"

"شاید وہ جانتی تھی۔ لیکن اس کی زبان بند ہو گئی
تھی۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ قاتل کوئی جیتا
جاگتا انسان نہیں تھا۔"

"اوہ نعمان خان! سارا موڈ چوپٹ کر دیا تم نے
میرا۔ یہ سب جہالت کی باتیں ہیں روحیں اس طرح کی
مصروفیت نہیں رکھتیں ان کے اپنے دوسرے مشاغل
ہوں گے اور تم...... آخر...... تم کیوں یہ فضول باتیں
کر رہے ہو۔ جب میں نے تمہیں نہیں بلایا تو تم یہاں
کیوں آ گئے۔ بلاوجہ میرا سارا موڈ خراب کر دیا۔"

"سن تو لیں مالک...... لڑکی نے جو بات بتائی
تھی۔ اسے یاد کر کے آج بھی میں خوف زدہ ہو جاتا
ہوں حالانکہ عمر گزار چکا ہوں۔ اب زندگی رہ ہی کتنی
ہے۔ لیکن مالک انسان بڑی عجیب چیز ہے۔ آہ۔

"آپ کو کیا بتاؤں لڑکی نے کیا بتایا تھا۔"
"اب وہ بھی بتا دو منحوس آدمی۔" فرحان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اس نے بتایا تھا۔" عمارت کے آتش دان میں جلنے والی آگ سے ایک ننھا سا بچہ نمودار ہوا تھا۔ زندہ سلامت اور ہنستا کھلکھلاتا ہوا۔" اسے دیکھ کر وہ سخت خوف زدہ ہوگئی تھی۔ وہ بے ہوش ہوگئی۔ کیونکہ اسے صرف اتنا یاد رہا تھا کہ وہ بچہ آگ سے نکلا ہے۔ اور یہی بچہ فردوس میاں کی طرف بڑھا تھا۔"

"اور کوئی بکواس اس سے زیادہ اور کوئی ہولناک بکواس۔" فرحان نے دانت پیس کر کہا۔

"نہیں مالک یہ بکواس نہیں ہے۔ بالکل سچ ہے۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اس بچے کو فردوس نے قتل کردیا۔ میں تو آج تک ایک ہی بات سوچتا ہوں۔ مگر تمہارے ان الفاظ کی روشنی میں میرا نظریہ بھی تبدیل ہوگیا۔ لڑکی نے خود فردوس علی کو قتل کیا ہوگا۔ یا پھر اس کے کسی ساتھی نے یہ حرکت کی ہوگی۔ اور بعد میں اس نے اپنی جان بچانے کے لئے یہ من گھڑت قصہ سنا دیا۔ تم نے بڑے مالک کو یہ بات بتائی تھی۔"

"جی سرکار! وہ رات ہی کو یہاں پہنچ گئے تھے۔ اور اس وقت وہ لڑکی میرے کوارٹر میں موجود تھی۔ میرے اس انکشاف پر انہوں نے خود اس لڑکی سے بات کی تھی۔ لیکن جب لڑکی نے آگ سے نکلنے والے بچے کی تفصیل بتائی۔ تو بڑے مالک کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا۔ اور یوں لگا جیسے کسی نے ان کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

بہرحال انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ "نعمان یہ بات کبھی تمہاری زبان سے نہیں نکلنی چاہئے۔ جو کچھ تم نے سنا ہے۔ اسے بھول جاؤ۔ نہ اس لڑکی کے بارے میں۔ تم کسی کو کچھ بتانا۔ اور نہ جو کچھ اس نے بتایا ہے۔ اس کے بارے میں بھی کسی کو کچھ نہ بتانا۔ ویسے بھی یہ لڑکی کسی عزت دار گھرانے کی لگتی ہے۔ قصور فردوس علی کا ہے۔ اس بچی کی بدنامی اس کی پوری زندگی تباہ کردے گی۔" سو اس کے بعد مالک! میں بڑے مالک کے حکم پر اس لڑکی کو شہر چھوڑ کر آیا تھا۔

"یہ راز آج میں پہلی بار کسی کو بتا رہا ہوں۔ کہ آپ بالکل اسی انداز میں یہاں آئے ہیں۔ جیسے فردوس میاں! آئے تھے۔ آج یوں سمجھ لیجئے کہ تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔"

"میں ان فضول باتوں پر کوئی یقین نہیں رکھتا۔ نعمان خان! اور اب تم نے میرے دل میں ایک اور نئی بات پیدا کردی ہے۔ میں دیکھوں گا کہ یہ جو داستانیں چپے چپے پر بکھری ہوئی ہیں۔ جسے دیکھو۔ جنوں اور بھوتوں کے چکروں میں رہتا ہے۔ روحوں کے قصے سناتا ہے۔ سڑکوں پر ہزاروں دکانیں کھل گئی ہیں۔ اس کاروبار کی۔ بے وقوف لوگ ان جگہوں پر آتے ہیں اور ان لوگوں کے پیٹ بھرتے ہیں۔ اور وہ خوب لوٹتے ہیں ان سب کو۔ بھوت جنات اتارنے کے چکر میں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ان باتوں کی حقیقت کیا ہے۔"

"آخری بار کہہ رہا ہوں مالک کہ آپ واپس چلے جائیں۔ آپ کو شاید یہ بھی پتہ نہیں ہے۔ کہ برسوں سے بڑے مالک نے بھی اس حویلی کا رخ نہیں کیا۔ اس کے اندر قدم نہیں رکھا۔ وہ خود یہاں آنے سے خوف زدہ ہوگئے ہیں۔ بس ایک رات انہیں اتفاق سے یہاں آنا پڑا تھا۔ لیکن آپ یقین کریں کہ وہ حویلی میں داخل نہیں ہوئے۔ اور انہوں نے میرے کوارٹر میں ہی رات گزاری۔

لیکن مالک اس رات حویلی کے اندر سے کسی بچے کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بڑی دردناک آوازیں تھیں۔ میں نے اور مالک دونوں نے اپنے کانوں سے یہ آوازیں سنی تھیں۔ اور...... وہ آواز......"

"خدا غارت کرے تمہیں! کیوں خواہ مخواہ میرا ذہن خراب کررہے ہو۔" فرحان اب کسی قدر متاثر نظر

آنے لگا تھا۔ پھر اس نے کہا۔
"اور تم نے بھی وہ آواز سنی تھی؟"

"جی سرکار۔ میں بتا چکا ہوں آپ کو......"

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی آس پاس سے گزر رہا ہو کیونکہ اس علاقے میں خانہ بدوش بھی ڈیرہ لگا دیتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا بچہ رو رہا ہو۔"

"مالک میں پھر وہی کہوں گا۔ کہ ہم سے زیادہ آپ کو اس علاقے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ یہ آواز! اکثر راتوں کو سنائی دیتی ہے۔ اور بھی لوگوں نے یہ آواز سنی ہے۔ میں آپ کے سامنے ان کی گواہی دلوا دوں گا۔"

"اچھا اب دفع ہوجاؤ...... یہاں سے سمجھ رہے ہونا۔ اگر یہ حویلی آسیب زدہ ہے۔ اور یہاں میری زندگی خطرے میں ہے۔ تو میں خود اپنی زندگی کی حفاظت کروں گا۔ چلو جاؤ کھانے کا انتظام کرو...... میں اندر جارہا ہوں۔" نعمان خان کا چہرہ لٹک گیا۔ اور فرحان علی آہستہ آہستہ چلتا ہوا شرمیلا کے پاس پہنچ گیا۔

شرمیلا کسی قدر مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا کہہ رہا تھا وہ......؟"

"پاگل ہے۔ یہ جاہل قسم کے لوگ نہ جانے کیسی کیسی فضول باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنا یقین دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آؤ...... اندر چلیں۔"

"میرے خیال میں تم یہاں سے واپس چلو۔"

"اب یہاں تک آنے کے بعد میں تمہارے خیال سے اتفاق تو نہیں کرسکتا۔" فرحان نے کسی قدر جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور اس کے بعد دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ شرمیلا بہ حالت مجبوری اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔

دروازہ کھول کر وہ دونوں اندر داخل ہوگئے۔ لیکن اندر قدم رکھتے ہی سب سے پہلا غیر معمولی احساس اس سردی کا ہوا تھا۔ جو باہر نہیں تھی۔ موسم بھی معتدل ہی تھا۔ لیکن یہاں یوں لگ رہا تھا۔ جیسے ایئر کنڈیشنر چلتا رہا ہو۔ فرحان شرمیلا کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا ہال کمرے سے گزر کر ایک اندرونی کمرے میں داخل ہوگیا۔ عمارت بے شک قدیم تھی۔ لیکن اس کے اندر جو کچھ نظر آرہا تھا۔ وہ قدیم نہیں تھا۔ اس میں خاص قسم کی نفاست سے کام کیا گیا تھا۔ وڈورک سے کمرے کی دیواریں حسین بنائی گئی تھیں۔ چھت بہت اونچی تھی۔ ایک جانب بڑا آتش دان بنا ہوا تھا۔ جس میں خشک لکڑیوں کا ڈھیر رکھا تھا۔ کمرے میں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

فرحان نے آتش دان پر رکھی ہوئی شمع روشن کی اور پھر لکڑیوں پر تیل ڈال کر انہیں بھی آگ لگا دی۔

"اندر کا ماحول تو بہت ہی سرد تھا۔ بالکل یوں لگ رہا تھا۔ جیسے سردیوں میں برفباری ہورہی ہو۔" شرمیلا نے کہا۔ اور فرحان کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"موسم تو سرد ہے۔ لیکن اس حویلی کو خصوصی طور پر ایسی جدید بنیادوں پر بنایا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا موسم معتدل رہے۔"

"مگر یہ معتدل موسم تو نہیں ہے عجیب سی سردی کا احساس ہورہا ہے ویسے حویلی کافی بڑی ہے۔ اس میں بے شمار کمرے ہوں گے۔"

"ہاں...... بہت سے......"

"یہاں آکر عجیب سا احساس نہیں ہورہا۔" شرمیلا صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"مثلاً؟"

"مثلاً یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی سینے پر سوار ہوگیا ہو۔ ایک عجیب سی سوچ ایک عجیب سا بوجھ ایک عجیب سی اینٹھن دل میں ہورہی ہے۔"

فرحان نے گہری نظروں سے شرمیلا کو دیکھا۔ اور پھر پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آگئی۔ اسے خود بھی بالکل ایسا ہی احساس ہورہا تھا۔ اور یہ بات اس کے لئے باعث حیرت تھی۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ وہ ایک بے فکر اور رنگین مزاج نوجوان تھا۔ اس
پر شاعرانہ قسم کی اداسی کبھی طاری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن
آج پہلی بار اس پر ایک عجیب سی گھبراہٹ مسلط تھی۔
اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی غیر معمولی بات ہونے
والی ہو۔ کوئی ایسی بات جس کے بارے میں وہ نہیں
جانتا۔ دفعتاً اس کا خیال نعمان کی باتوں کی طرف چلا گیا
اور نہ جانے کیوں اس کے بدن میں سرد لہریں سی دوڑ
گئیں۔ بہر حال اس نے شرمیلا کو کوئی نہ کوئی جواب
دینا ضروری سمجھا۔ چنانچہ کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے۔ پرانے مکان کی وجہ سے ہم
ایسا محسوس کر رہے ہیں۔"

"میں نہیں مانتی۔ فرحان مجھے یہاں کچھ اور ہی
لگ رہا ہے۔ میں نے بھی اس سے پہلے پرانے مکان
دیکھے ہیں۔ مجھے بتاؤ...... آخر وہ شخص کیا کہہ رہا تھا۔ وہ
دیکھنے میں بھی مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے
چہرے کے تاثرات سے مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ
تمہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔" شرمیلا بولی۔

"ہاں...... وہ کہہ رہا تھا کہ یہ مکان آسیب زدہ
ہے۔" فرحان نے جواب دیا۔

"ک..... کیا......؟" شرمیلا کی آنکھیں حیرت
سے پھیل گئیں۔ اس نے دہشت بھری نگاہوں سے در
دیوار کو دیکھا۔ خوف سے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ پھر
اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور خوف زدہ انداز
میں بولی۔

"ک..... کک..... کیا..... کہہ رہے
ہو۔ فرحان...... یہ حویلی آسیب زدہ ہے؟"

"ہاں...... شرمیلا، وہ شخص یہ ہی بتا رہا تھا۔ مجھے
لیکن میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا۔ کیا تم آسیب پر یقین
رکھتی ہو؟"

"یقین رکھتی ہو سے تمہاری کیا مراد ہے۔ بھلا
روحوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے لیکن میں ان روحوں کے
بارے میں بات کر رہا ہوں جو انسانوں کو پریشان کرتی
ہیں۔ قبرستانوں اور پرانے مکانوں میں بھٹکتی پھرتی
ہیں۔ اور جن سے عجیب و غریب باتیں منسوب کی جاتی
ہیں۔

"دراصل روح کا لفظ ایک خاص اصطلاح کے
طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن دنیا میں کچھ ایسی غیر
معمولی قوتیں ضرور ہیں جنہیں انسان سمجھ نہیں پاتا ہم
اسے بھوت پریت یا روح وغیرہ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔
لیکن میں ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ سب جاہلوں
اور توہم پرستوں کی خیال آرائیاں ہیں جدید سائنس
آخر اس بارے میں کوئی تفصیلی بات کیوں نہیں بتاتی۔"
فرحان بولا۔

"یہ تو جدید سائنس دانوں سے ہی سوال کیا
جا سکتا ہے۔ مگر پلیز! فرحان دیکھو اگر میری بات مانو!
تو یہاں سے چلو۔ کیا فائدہ ایسی جگہ پر جہاں ہم ذہنی
طور پر مطمئن بھی نہ ہوں۔ یہ حویلی بہت ویرانے میں
بنی ہوئی ہے۔ اور نجانے کب سے خالی پڑی ہے۔
اس کے بارے میں بقول تمہارے عجیب و غریب
باتیں بھی مشہور ہیں پلیز! یہاں سے چلو ملازم کو منع
کر دو کہ وہ کھانا وغیرہ نہ کرے۔" شرمیلا خوف زدہ
لہجے میں بولی۔

"کمال ہے۔ شرمیلا کیا ہم اتنا فاصلہ طے
کر کے اس لئے آئے تھے کہ یہاں سے فوراً ہی واپس
چلے جائیں۔ ہمارا یہی تو مقصد تھا ناں کہ ہم تنہائی میں
بیٹھ کر کچھ دیر پیار و محبت کی تھوڑی باتیں کریں۔ اور پھر
تمہارا گھر جانا مناسب نہیں ہے۔ سارا کھیل اپ سیٹ
ہو جائے گا۔ تم اپنی امی سے یہ کہہ کر آئی ہو کہ تم اپنی
سہیلیوں کے ساتھ فلم کا آخری شو دیکھنے جا رہی ہو۔ اور
آخری شو رات کو بارہ بجے ختم ہوتا ہے۔ ہم یہاں سے
گیارہ بجے تک روانہ ہو جائیں گے۔ اور بارہ سوا بارہ
بجے تک گھر پہنچ جائیں گے۔"

"مم...... مگر میں یہ بھی تو کہہ سکتی ہوں ناں کہ فلم
کا پروگرام کینسل ہو گیا تھا۔ یا ٹکٹ نہیں ملا تھا۔ زیادہ
سے زیادہ فالتو وقت کسی ہوٹل میں گزار سکتے ہیں۔ لیکن

اس ماحول سے مجھے وحشت ہو رہی ہے پلیز!"

"نہیں۔ اصل میں وحشت ہمیں اپنے خیالات
سے ہو رہی ہے۔ اور ان باتوں سے جو ہم نے خواہ مخواہ
شروع کر دی ہیں۔ بس اب یہ موضوع ختم اب اس
موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم بیٹھو، میں ذرا ساتھ
والے کمروں میں بھی شمعیں روشن کر دوں۔"

فرحان اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ شرمیلا نے ایک
گہری سانس لی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے یہ احساس
ہو رہا تھا کہ آج کوئی نہ کوئی خوف ناک بات ضرور ہو کر
رہے گی۔

فرحان اپنی جگہ سے اٹھا اور قالین پر بے آواز
چلتا ہوا ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ بھی ایک
کشادہ بیڈ روم تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری
پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے کمرے کا ایک
دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی
فرحان نے محسوس کیا جیسے کوئی بستر پر لیٹا ہوا ہو۔ اور
گہرے گہرے سانس لے رہا ہو۔"

اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ بات
اس کی سمجھ سے باہر تھی کہ یہاں ان لوگوں کے علاوہ اور
کون ہو سکتا ہے؟...... نعمان خان! اس حویلی کا نگران
تھا۔ لیکن حویلی کے بڑے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔
اور یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ نعمان خان تالے کھول کر کسی
کو اندر آنے کی اجازت دے۔

پھر تالا اس نے اپنے ہاتھ ہی سے کھولا تھا۔ اس
لئے کسی اور کے یہاں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا
۔ اس نے جیب سے ماچس نکال کر تیلی روشن کی۔ اور
کمرے میں پیلی پیلی روشنی پھیل گئی تب اس نے دیکھا
کہ ڈبل بیڈ پر، ایک سیاہ رنگ کی بڑی سی بلی سو رہی ہے
۔ فرحان کے ہونٹوں پر خجالت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔
اس نے خود سے کہا۔

"جب انسان پر دیوانگی سوار ہوتی ہے۔ تو ایسی
ہی چیزیں نظر آتی ہیں۔" اس نے آگے بڑھ کر بلی کو
بھگانے کی کوشش کی۔ "ہش، ہش" بلی جاگ گئی۔ اس
نے اپنی چمک دار آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا۔
پھر منہ سے ہلکی سی آواز نکالی۔ لیکن اپنی جگہ سے ہلی
نہیں۔

اس نے ایک لمحہ کیلئے بلی پر غور کیا۔ پھر اس کی
ہمت نہیں پڑی کہ وہ دوبارہ اس سے کچھ کہے۔ بہر حال
وہ شمع روشن کر کے واپس اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں
شرمیلا موجود تھی۔

شرمیلا کمرے کے عین وسط میں کھڑی ہوئی
تھی۔ اور اس کے بدن پر خوف سے تھرتھری طاری تھی۔

"یہ آواز کس کی تھی؟" اس نے پوچھا۔

"کیسی آواز؟" فرحان تعجب سے بولا۔

"یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی عورت درد سے کراہ
رہی ہو۔"

"اوہ...... ابھی کچھ دیر پہلے بلی نے اپنے منہ
سے میاؤں میاؤں کی آواز نکالی تھی۔"

"نن...... نہیں۔ میں اس کی بات نہیں
کر رہی۔" شرمیلا نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر......؟"

"وہ بلی نہیں ہو سکتی۔"

"آخر کیوں؟"

"تم نے دیکھا نہیں کہ حویلی کے باغ میں ایک
پرندہ تک نظر نہیں آتا...... اور...... بلی آخر یہاں کیسے
آ گئی۔ تم نے کہاں دیکھی بلی؟"

"برابر کے خواب گاہ میں بستر پر لیٹی ہے۔ آؤ تم
خود آ کر دیکھ لو بھئی۔" فرحان نے کہا۔ اور شرمیلا کو ساتھ
لے کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ پھر کمرے میں داخل
ہوتے ہوئے بولا۔

"وہ دیکھو!" لیکن دوسرے لمحے اس کے
چہرے پر پھر حیرت نمودار ہو گئی۔ کیونکہ اب وہاں بلی
نہیں تھی۔"

"کہاں ہے بلی؟"

"ابھی ایک منٹ پہلے میں نے دیکھی تھی۔ شاید
باہر نکل گئی۔ فرحان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے

ہوئے کہا۔ اور شرمیلا کمرے میں نظریں دوڑانے لگی۔ پھر بولی۔
"اس کمرے میں یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ سوائے اس دروازے کے کھڑکیاں ساری بند تھیں۔ اور اگر وہ یہاں سے باہر جاتی تو کیا ہمیں نظر نہ آتی۔"
فرحان خود بھی حیران تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔
"میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ اسی جگہ بیٹھی تھی۔ لیکن ایک منٹ رکو ابھی تصدیق ہو جاتی ہے۔" وہ آگے بڑھا۔ اور اس نے اس جگہ پر ہاتھ رکھا۔ جہاں اس نے بلی کو بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر جلدی سے بولا۔
"ادھر...... آؤ...... شرمیلا!"
شرمیلا، اس کے پاس پہنچ گئی پھر فرحان بولا۔
"دیکھو! یہاں ہاتھ لگا کر دیکھو۔ یہ جگہ ابھی تک گرم ہے۔ جیسے کسی کے بیٹھنے سے ہو سکتی ہے۔"
شرمیلا نے اس کے کہنے پر بستر کو ہاتھ لگا کر دیکھا جگہ واقعی گرم تھی۔ لیکن اس نے مزید تصدیق کرنے کے لئے دوسری جگہ پر ہاتھ لگا کر دیکھا ممکن ہے بستر دوسری جگہ سے بھی اتنا ہی گرم ہو۔ لیکن اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی مختلف جگہوں پر ہاتھ لگا کر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔
"اوہ میرے خدایا! ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے کوئی اس بستر پر سو رہا ہو۔ یہ دیکھو! صرف اتنی سی جگہ گرم نہیں ہے۔ بالکل یوں لگتا ہے جیسے بستر پر کوئی انسانی وجود سوتا رہا ہے۔ کوئی بلی اتنی جگہ نہیں گھیر سکتی۔"
فرحان نے خود بھی اس بات پر غور کیا۔ اور بستر کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہو گئی۔
"تعجب ہے۔ اس نے کہا۔ پھر نہ جانے کس خیال کے تحت وہ باہر کی جانب کھلنے والے دروازے کی جانب گیا۔ اور اس کا بولٹ چیک کیا۔ وہ بھی اندر سے بند تھا۔ کھڑکیاں اور روشن دان بھی اندر سے بند تھے۔ اگر کوئی شخص بستر کے اوپر لیٹا ہوا تھا۔ تو اسے کمرے کے اندر ہی ہونا چاہئے تھا۔ آخر وہ کہاں گیا؟ جبکہ کھڑکیاں اور دروازے سب اندر سے بند ہیں۔
"لیکن شرمیلا میں نے اپنی آنکھوں سے وہ بلی دیکھی تھی۔ ایک منٹ۔" وہ پھر بولا۔ اور اس بار وہ آگے بڑھ کر شمع دان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے جلتی ہوئی شمع اٹھائی۔ پھر پہلے بستر کے نیچے جھانکا پھر لکڑی کی الماری میں اور پردوں کے پیچھے دیکھا۔ لیکن کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ اور کوئی ایسا وجود نظر نہیں آتا تھا۔ جسے جاندار وجود کہا جا سکے۔
شرمیلا مسلسل کانپ رہی تھی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔
"فرحان! خدا کے لئے یہاں سے نکل چلو۔ یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔"
فرحان کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس کے اندر ایک عجیب سی کیفیت ابھر آئی۔
"اس طرح تو جانا مناسب نہیں ہوگا۔ شرمیلا، میں ذرا دیکھتا ہوں۔ کہ یہ سب کچھ کیا چکر ہے؟ اگر روح والی بات بھی سچ ہے۔ تو میں اس سے ملاقات کر کے ہی واپس جاؤں گا۔ آؤ...... تم میرے ساتھ آؤ۔ پلیز! شرمیلا ضد نہ کرو۔ بعض اوقات ضد مجھے مزید ضد پر آمادہ کر دیتی ہے۔"
شرمیلا بادلنخواستہ اس کے ساتھ واپس چل پڑی۔ اور پھر وہ دونوں اپنی پہلی نشست گاہ میں واپس آ گئے۔ فرحان کی پیشانی پر نظر آنے والی شکنوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔
"شرمیلا تم ایک منٹ یہاں ٹھہرو...... میں کار میں سے ایک چیز لے آؤں۔"
"کک...... کک کیا؟" شرمیلا نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں میں ابھی آتا ہوں۔"
"مجھے بھی ساتھ لے چلو...... فرحان پلیز!"
"ابھی آتا ہوں...... شرمیلا۔"
"نن۔ نہیں میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"
شرمیلا کسی طور وہاں تنہا رکنے پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ فرحان نے شانے ہلائے اور اس کے بعد دونوں آہستہ آہستہ باہر نکل آئے۔
باہر گہری تاریکی ہو گئی تھی۔ درختوں کے نیچے گہرا پراسرار سناٹا طاری تھا۔ خشک پتے ان کے قدموں کے نیچے آ کر آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ فرحان نے کار کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر کار کے ایک خفیہ خانے سے پستول نکال لیا۔
شرمیلا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اس نے پھر اسی انداز میں پوچھا۔
"اس کی کیا ضرورت تھی فرحان!"
"شرمیلا، انسان کو ہر طرح سے تیار رہنا چاہئے۔ ویسے بھی معاف کرنا میں کسی شیخی کے تحت نہیں کہہ رہا۔ ہم کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ اور ہم سے بلاوجہ کی دشمنی نکالی جاتی ہے۔ میں کچھ ایسے لوگوں پر غور کر رہا ہوں۔ جو ہمارے خاندانی دشمن ہیں، ہو سکتا ہے ہمارے خاندانی دشمن کوئی ایسا چکر چلا رہے ہوں جس سے ہم خوف زدہ ہو جائیں۔"
"تت، تو تمہارا مطلب ہے کہ اس وقت اور کوئی شخص بھی ہمارے علاوہ عمارت کے اندر ہو سکتا ہے۔"
"نہیں میرا مطلب بالکل یہ نہیں ہے۔"
"تو پھر یہ پستول کیوں نکالا ہے۔ تم نے......؟"
"کمال ہے۔ عورت کے اندر یہ خوبی سنی تھی۔ میں نے لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ وہی زبردستی ضد اور فضول باتیں کرنے والی۔ میں بس اتنا کہنا چاہتا ہوں۔ تم سے کہ انسان کو کسی بھی وقت اپنی حفاظت سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔"
"میرا دل تو بیٹھا جا رہا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم آج اس دیوانگی کا شکار ہو جاؤ گے تو میں کبھی تمہارے ساتھ نہ آتی۔" اس نے کہا۔ لیکن فرحان پر ایک جنون سا سوار تھا۔
وہ دونوں پھر اندر آ گئے۔ اور اس کمرے میں پہنچ گئے۔ ویسے فرحان کو نعمان بابا کی مداخلت پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اگر وہ یہ فضول باتیں اس کے کانوں میں نہ ڈالتا تو بات اتنی آگے نہ بڑھتی۔ یہاں تو وہ کسی اور ہی مقصد کے تحت آیا تھا۔ ایک طویل پروگرام کے تحت، بہت دنوں سے شرمیلا اس کی لسٹ پر تھی وہ اس کی کالج کی ساتھی تھی۔ حالانکہ دونوں کی دوستی کو بہت زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ لیکن فرحان کی نگاہوں میں وہ گہرائیوں تک اتر گئی تھی۔ اور فرحان اس کے وجود سے سیراب ہونا چاہتا تھا۔
شرمیلا ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد ملازمت کرتے تھے۔ معمولی آمدنی تھی۔ جس سے سفید پوشی برقرار رکھی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ فرحان، شرمیلا کو اپنے جال میں پھانسنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک بار شرمیلا نے اسے اپنے والدین سے بھی ملا دیا۔ اس نے فرحان کے بارے میں تمام تفصیل اپنے اہل خانہ کو بتائی تھی۔ حالانکہ شرمیلا کی ماں نے اس کو بعد میں سمجھایا بھی تھا کہ فرحان اس کی سطح کا انسان نہیں ہے۔ اس لئے ہوشیار رہے لیکن شرمیلا نے آہستہ سے کہا۔
"اماں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ فرحان ایک اچھا انسان ہے اور پھر میں معافی چاہتی ہوں۔ اماں! ہمارے گھر کا ماحول جس قسم کا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے بارہا میں نے سوچا کہ میں اس قسم کے ماحول میں زندگی نہیں گزاروں گی مجھے اپنی زندگی گزارنے کے لئے کوئی بہتر راستہ درکار ہوگا۔ اماں، آپ اطمینان رکھیں۔ میں ایک شریف لڑکی ہوں۔ آپ کی عزت کو داغدار نہیں ہونے دوں گی۔ لیکن اگر...... فرحان...... فرحان......"
ماں بھی خاموش ہو گئی تھی۔ اور باپ بھی۔ اس

میں کوئی شک نہیں تھا کہ فرحان کو دیکھ کر ان کے دلوں میں بھی ایک شمع روشن ہوگئی تھی۔ وہ اپنے طور پر لاکھ کوشش کرتے لیکن بیٹی کے لئے ایسا رشتہ تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ اگر فرحان واقعی شرمیلا سے متاثر ہو جاتا ہے۔ تو یہ بہتر ہوگا کہ شرمیلا کو آزادی دے جائے۔ البتہ ماں نے بیٹی کو سمجھایا تھا کہ رئیس زادے بگڑی ہوئی طبیعت کے مالک ہوتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں اسے تکلیف برداشت کرنی پڑے۔ اور شرمیلا نے ماں باپ کو اطمینان دلایا تھا۔ کہ وہ ایک مضبوط لڑکی ہے۔ البتہ فرحان کے لئے اس کے گھر کے راستے کھل گئے تھے۔ اور پھر اس نے بہت سے تحفے تحائف ان لوگوں کو دیئے۔ یہ حقیقت تھی کہ شرمیلا جیسی سادہ لوح لڑکی فرحان جیسے اوباش نوجوان کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

فرحان دولت مند خاندان کا لڑکا تھا۔ محبت نام کی کوئی شے اس کے دل کے کسی گوشے میں نہیں تھی۔ اس کے خیال میں محبت ٹائپ کی حماقت صرف وہی لوگ کرتے ہیں۔ جو دوسرے کام نہیں کر پاتے۔ بہرحال شرمیلا کو پوری طرح اپنی محبت کے جال میں پھانس کر آج وہ ایک مذموم ارادے کے تحت اسے سفید محل لایا تھا۔ اور سفید محل بہت عرصے سے ایسی داستانوں کا امین تھا۔

وہ اپنے ذہن سے ان باتوں کو جھٹکنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور پھر نعمان خان کی آمد نے انہیں مزید کچھ مطمئن کر دیا۔ نعمان بابا کھانا لے کر آئے تھے۔ فرحان نے کہا۔

''نعمان بابا! کیا تم نے کوئی بلی پال رکھی ہے؟''

''بلی.....؟ نہیں جی۔ اس علاقے میں کبھی کوئی بلی نظر نہیں آئی آپ کو کیا بلی کی ضرورت ہے؟''

''نہیں بابا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے خواب گاہ میں ایک سیاہ رنگ کی بلی دیکھی تھی پھر پتہ نہیں وہ کہاں غائب ہوگئی۔''

''کک۔ کک کالی، بلی۔'' نعمان بابا کے لہجے میں ایک دم عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی۔

''ہاں۔ کالی تھی۔''

''پتا نہیں مالک، ہوسکتا ہے۔ آپ کو دھوکا ہوا ہو۔ کیونکہ مجھے یہاں کبھی کوئی بلی نظر نہیں آئی۔''

''نہیں نعمان بابا! میں نے وہ بلی دیکھی ہے۔ خیر کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں ظاہر ہے بلی کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو کہیں آ جا نہ سکے۔ ہوسکتا ہے کہیں سے راستہ بھٹک کر ادھر آ نکلی ہو۔''

''جی۔'' نعمان خان نے کہا۔ اور باہر نکل گیا۔

لیکن فرحان مطمئن نہیں تھا۔ اس نے بلی کو اپنی آنکھوں سے بستر پر لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ اور دوسرے ہی منٹ میں غائب ہوگئی تھی۔ پھر بستر کا گرم ہونا بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال وہ اپنے طور پر ہوشیار رہنا چاہتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دشمنی پر ہر شخص ہی آمادہ ہوسکتا ہے۔ جیسے نعمان بابا۔''

کھانے کے بعد جب نعمان خان برتن لے کر واپس چلا گیا تو فرحان نے بیرونی دروازہ اچھی طرح بند کر دیا۔ پھر اندر نشست گاہ کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ شرمیلا ایک بار پھر خوف زدہ ہوگئی تھی۔ اس کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

''فرحان! اب یہاں کیوں رکے ہوئے ہو؟''

''شرمیلا ظاہر ہے میں اس لئے نہیں آیا۔''

''تت..... تو پھر؟''

''شرمیلا میں اپنے اور تمہارے درمیان دوری کے تمام راستے ختم کر دینا چاہتا ہوں۔''

''یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم..... فرحان!''

''ہاں شرمیلا! دیکھو زندگی میں چند ہی لمحات ایسے ملتے ہیں جو اس قسم کی روحانی حیثیت رکھتے ہیں ان لمحات کو کھو دینا مناسب نہیں ہوگا۔ شرمیلا۔ میں اس سے زیادہ وضاحت نہیں کر سکتا۔ تم یہ سمجھو شرمیلا..... کہ..... کہ.....'' فرحان نے آگے بڑھ کر شرمیلا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شہر وحشت

ایم اے راحت

قسط نمبر: 09

رات کا گھٹا ٹوپ اندھرا، پرھول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دھشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراٹو، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کھانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

"**شرمیلا** بہرحال لڑکی تھی۔ بہت کچھ سمجھتی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"فرحان! میں اپنے آپ کو تمہاری امانت سمجھتی ہوں۔ میں مکمل طور پر تمہاری ہوں۔ لیکن...... لیکن...... نیکی اور بدی کی تمیز بھی ہونی چاہئے۔ اور مجھے بھی۔"

"شرمیلا...... میں دقیانوسی انسان نہیں ہوں۔ زندگی کے کچھ لوازمات ہوتے ہیں دلوں کی کچھ طلب ہوتی ہے جس کا اظہار وقت سے کچھ پہلے کردیا جائے تو غلط نہیں ہے۔ جب ہم دل سے ایک دوسرے کو اپنا مانتے ہیں تو پھر یہ سب کچھ بے کار ہے۔ اور شرمیلا میں شاید تمہارا گریز برداشت نہ کرسکوں۔"

"میں تمہارا احترام کرتی ہوں فرحان، لیکن پلیز! دیکھو مجھے اپنے احترام سے ہٹ جانے پر مجبور نہ کرو۔ میں نے اپنے والدین سے بھی وعدہ کیا ہے کہ میں ایک پاک باز لڑکی ہوں اور پاک بازی ہی کو اپنی زندگی بنا کر رکھوں گی۔"

"لیکن شرمیلا میں پاک باز نہیں ہوں اور جس بات کو تم پاک بازی تصور کرتی ہو۔ وہ میرے نزدیک صرف زندگی کی ایک ضرورت ہے اور میں تمہیں یہاں اس لئے لایا ہوں کہ اپنی ضرورت پوری کروں۔" اور اس کے بعد فرحان کے اندر کی شیطانیت ابھر آئی اور شرمیلا کے ہوش وحواس جواب دینے لگے۔

"فرحان پلیز! جو کچھ تم چاہتے ہو۔ وہ ممکن نہیں ہے۔ اور اگر تم نے ضد کی تو شاید میں تمہارے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوجاؤں۔"

"مرد جانتی ہو کسے کہتے ہیں۔ مرد اسے کہتے ہیں جو کچھ سوچے اور اس کی تکمیل کر ڈالے" فرحان کا لہجہ بے حد زہریلا ہوگیا تھا۔

"فرحان دیکھو...... میں نے...... میں نے تمہاری شکل میں معیار اور وقار کا ایک مینار تعمیر کیا ہے۔ میں نے تمہیں ایک ایسی شخصیت سمجھا ہے۔ فرحان جو میری زندگی کے ہر لمحے کی مالک ہے۔ اور تم...... فرحان تم ایک چھوٹی سی بات کو...... فرحان میرے ضمیر کو داغدار مت کرو، جو وعدے میں نے کئے ہیں۔ کسی سے تم ان کی تکمیل کرو۔ دیکھو۔ فرحان انسان میں بھی ہوں، ان تمام ضرورتوں سے آشنا جو انسانی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ لیکن فرحان ہر چیز کا ایک معیار ایک وقت ہوتا ہے۔"

"کیا لیکچر دینے بیٹھ گئیں۔ کیوں میرا موڈ خراب کررہی ہو۔ ایک تو اس کم بخت بڈھے نعمان بابا نے سب کچھ چوپٹ کردیا۔ اور تم...... تم......"

"فرحان سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"میں کچھ نہیں سمجھتا۔" سمجھیں۔ بس اب اس کے بعد مروت کے تمام راستے تم نے خود بند کردیئے ہیں!"

فرحان کی آنکھوں میں اترنے والا جنون شرمیلا کو یہ احساس دلا رہا تھا کہ "صورت حال بگڑ گئی ہے۔ وہ ہونے والا ہے۔ جو الم ناک داستانوں کا موضوع ہوتا ہے۔ آہ، یہ...... یہ غلطی تو میری تھی۔ مجھے اس قدر اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ فرحان! پر۔ آخر یہاں تک آنے کا جواز کیا تھا؟ میں نے...... میں نے خود بھی تو غلطی کی ہے۔" اس نے عاجزی سے کہا۔

"فرحان...... فرحان۔" فرحان پر اب دیوانگی طاری ہوگئی تھی۔ اس نے شرمیلا کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ اور پھر کہنے لگا۔

"شرمیلا! بس زندگی اسی میں ہے کہ تم میری ہر آرزو کی تکمیل کردو۔ ورنہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں تمہیں زندگی ہی سے محروم کردوں۔"

"تم نے اپنی اصل شکل دکھادی ہے۔ فرحان! آہ! مجھے اس کا افسوس نہیں ہے کہ...... کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ زندگی میں کتنا بڑا دھوکا کھایا ہے میں نے۔"

"تو پھر یوں سمجھ لو کہ تم جیسی دھوکا کھانے والی لڑکیاں ہی خودکشی کرتی ہیں۔" شرمیلا کا دل ڈوب گیا۔ یہ آخری الفاظ تھے۔ فرحان اپنی اصلیت کے ساتھ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ شروع ہی سے اسے بے وقوف بنا تا رہا تھا اب اسے یہ بھی امید نہیں رہی تھی۔ کہ وہ اپنی بدنامی کا داغ دھو ڈالے گی۔ لیکن اب وہ کش مکش میں تھی اب فرحان اس کا دشمن تھا۔ بدترین دشمن جس سے زندگی بچانا اس کا اولین مقصد تھا۔ لیکن اس وقت اس کے کانوں میں ایک ایسی دلدوز چیخ گونجی کہ دونوں ایک لمحے کے لئے ساکت رہ گئے۔

یہ چیخ اس قدر کرب ناک، اس قدر وحشت ناک تھی کہ ان کے دل دہل کر رہ گئے تھے۔ فرحان کے اعصاب بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اور وہ شدت حیرت سے گنگ شرمیلا کی صورت دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے منہ سے لرزتی ہوئی آواز نکلی۔

"یہ آواز...... یہ آواز کیسی ہے۔" شرمیلا نے جواب دیا۔ فرحان خود بھی آہستہ آہستہ کھڑا ہوگیا۔ اور اس کا ہاتھ پستول والی جیب میں پہنچ گیا۔ ہلکی ہلکی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ عجیب سی آوازیں تھیں جیسے کوئی انتہائی کرب کے عالم میں کرررہا ہو۔

"کسی عورت کی آواز معلوم ہوتی ہے۔" فرحان نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ آواز اسی خواب گاہ میں سے آرہی تھی۔ جس میں انہوں نے بلی دیکھی تھی۔ شرمیلا بھی کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر دہشت بکھری ہوئی تھی، فرحان نے پستول نکال لیا اور پھر آہستہ آہستہ خواب گاہ کی جانب بڑھ گیا۔ شرمیلا لاشعوری طور پر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے منہ سے نکلا۔

"یہ...... کیا یہ انسانی آواز ہے۔ فرحان؟"

"دیکھتا ہوں۔" فرحان نے کہا۔ اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ چند لمحات پہلے جو ڈراما ہو رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ فرحان نے خواب گاہ کے دروازے میں قدم رکھا تو یہ آواز بند ہوگئی۔ کمرے میں شمع بدستور روشن تھی اور بستر خالی پڑا ہوا تھا۔

"کون ہے؟" فرحان گرجا "جو کوئی بھی ہے۔ سامنے آجائے ورنہ گولیوں سے چھلنی کردوں گا۔" اس کی آواز فضا میں گونج کر رہ گئی۔ لمحے بھر انتظار کرنے کے بعد اس نے نادیدہ دشمن کو خوف زدہ کرنے کے لئے ایک فائر بھی کیا۔ فائر کی آواز پر شرمیلا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اور وہ آہستہ سے آگے بڑھ کر فرحان ہی کے بازو سے لپٹ گئی۔ اس وقت فرحان اس کا دوست تھا یا دشمن، یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ خوف کے عالم میں تھی۔ پھر اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"فرحان! کوئی نہیں ہے یہاں۔ نعمان بابا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ حویلی بھٹکی ہوئی روحوں کا مسکن ہے۔ اور تم روحوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے فرحان، خدا کے لئے یہاں سے نکل چلو...... فرحان یہاں سے نکل چلو۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ یہاں آنے کے بعد تم پر یہ دیوانگی سوار ہوئی ہے...... ورنہ...... ورنہ تم ایسے انسان نہیں تھے۔

"سب فراڈ ہے۔ میرے دشمنوں کا چلایا ہوا چکر، میں اس فراڈ کو ختم کرکے رہوں گا۔" اس نے ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی پستول والا ہاتھ نصف دائرے کی شکل میں دائیں بائیں گھوم رہا تھا۔ اور انگلی ٹریگر پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ وہ ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اور شرمیلا اس کے ساتھ چپکی ہوئی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ فرحان نے کمرے کا ایک ایک کونہ چھان مارا۔ نشان تو کجا کوئی حشرات الارض تک نظر نہیں آیا۔ یہاں تک کہ فرحان نے باہر کھلنے والے دروازے کو کھول کر دیکھا۔ آسمان پر اب پورا چاند نکل آیا تھا۔ اور اجڑا ہوا باغ پراسرار سکوت میں لپٹا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا پتوں میں سرسراہٹ پیدا کررہی تھی۔ درخت اور پودے اداس کھڑے ہوئے تھے۔

"کوئی ہے۔" فرحان نے آواز لگائی۔ پھر اور زور سے چیخا۔

"نعمان بابا۔" لیکن اس کی آواز سناٹے میں تحلیل ہوگئی تھی۔ فرحان پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اب تک اس کا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ کہ یہ کوئی آسیبی چکر ہے۔ یقیناً اس کے خلاف کوئی سازش ہورہی ہے۔ کوئی اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ پھر اچانک رات کا سناٹا کسی ننھے سے بچے کے رونے کی آواز سے درہم برہم ہوگیا۔ وہ آواز کسی بالکل ہی معصوم بچے کی تھی۔ چند روز کے بچے کی اور حویلی کے اندر سے آرہی تھی۔ شرمیلا کا حلق خوف سے خشک ہوگیا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز نہیں نکل سکی...... بمشکل تمام اس نے کہا۔

"سن رہے ہو۔ فرحان سن رہے ہو۔ کوئی بچہ رو رہا ہے۔"

"نہیں یہ تو بلی کی آواز ہے۔" فرحان نے کہا۔ بلی جب روتی ہے تو اس کی آواز بچے جیسے ہی لگتی ہے۔"

"نن...... نہیں...... فرحان سنو...... یہ آواز بچے ہی کی ہے۔"

"ہرگز نہیں یہ وہی بلی ہے۔ جسے میں نے بستر پر بیٹھے دیکھا تھا۔"

"ہوسکتا ہے۔" شرمیلا آہستہ سے بولی۔

"آؤ...... شرمیلا اندر آؤ۔ میں دیکھوں کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ میں بھی ہار ماننے کو تیار نہیں ہوں۔" وہ ایک بار پھر اندر آ گیا۔

دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ اس نے بس یوں ہی کواڑ بھیڑ کر خواب گاہ سے ہوتا ہوا نشست گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ شرمیلا اس کی تقلید کررہی تھی۔ لیکن بچے کے رونے کی آواز بدستور آرہی تھی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آئے اور پھر جیسے ہی ان کی نظر آتش دان میں بھڑکنے والی آگ میں پڑی ان کی رگوں میں خون منجمد ہوگیا جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ انتہائی پرہیبت اور ناقابل یقین تھا۔ شعلوں کے اندر ایک ننھا سا بچہ دونوں ہاتھ پھیلائے رو رہا تھا۔ اور یہ منظر دیکھ کر دونوں پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ بچہ بڑی معصوم آواز میں رو رہا تھا۔ جیسے وہ آگ کے شعلوں سے خوف زدہ ہو۔ حسین اور پھول جیسا بچہ۔

"آہ...... یہ...... یہ جل رہا ہے۔" شرمیلا نے دل سوزی سے کہا۔ ایک لمحے کے لئے وہ ماحول کی وحشت بھول گئی۔ اور اس کے اندر کی عورت جاگ گئی تھی جو ممتا سے بھرپور ہوتی ہے۔ وہ تیزی سے آتش دان کی طرف لپکی تو فرحان نے عقب سے اسے پکڑلیا۔

"کیا کررہی ہو۔"

"فرحان وہ بچہ......"

"وہ بچہ نہیں ہے۔" فرحان کے منہ سے آواز نکلی۔

"وہ جل جائے گا۔" شرمیلا کراہی۔ "دیکھو کتنا معصوم ہے بالکل نوزائیدہ بچے کی مانند۔" شرمیلا پھر آگے بڑھی لیکن فرحان نے اسے سختی سے پکڑلیا......

"فرحان ایک معصوم بچے کی زندگی۔" شرمیلا نے فرحان کا چہرہ دیکھا اور وہ سہم گئی۔ فرحان کا چہرہ

انگارے کی طرح سرخ ہورہا تھا۔ اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ ہونٹ مڑ گئے تھے۔

پھر اچانک آتش دان میں تحریک ہوئی اور شرمیلا نے بچے کو آگ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے پیروں سے چلتا ہوا ان کی سمت آرہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے تھے۔ اور چہرہ بے تاثر تھا۔

شرمیلا اب اپنی دہشت بھری چیخوں کو نہ روک سکی۔ اس نے دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن پیروں سے بدن کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ البتہ فرحان نے دیوانگی کے عالم میں فائرنگ شروع کردی تھی۔

گولیاں بچے کے جسم میں پیوست ہورہی تھیں۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہورہا تھا۔ وہ بدستور قدم قدم فرحان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فرحان کا پستول خالی ہوگیا۔ شرمیلا کا چیختے چیختے گلا خشک ہوگیا۔ اس کے حواس ساتھ چھوڑتے جارہے تھے۔ اچانک بچہ فرحان کے قریب پہنچ کر اچھلا اور اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے فرحان کی گردن دبوچ لی۔ شدید جدوجہد ہورہی تھی۔ فرحان نے پستول پھینک دیا تھا۔ اور اب وہ بچے کو اپنی گردن سے جدا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ لیکن اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ آنکھیں حلقوں سے باہر نکل پڑی تھیں۔ زبان نیچے لٹکتی جارہی تھی۔ شرمیلا تو پہلے ہی زمین پر گر کر بے ہوش ہوچکی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد فرحان ساکت ہوگیا۔ اس کا جسم زندگی سے محروم ہوگیا تھا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بوڑھا نعمان بابا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ شمع روشن تھی۔ اور آتش دان میں سلگتی ہوئی آگ پورے کمرے کے ماحول کو اجاگر کئے ہوئے تھی۔ نعمان بابا نے پرسکون نظروں سے پورے ماحول کو دیکھا۔ پھر اس کے منہ سے نکلا۔

''یہی سب ہونا تھا۔ یہ اس حویلی کی داستان ہے۔ مجھے اپنا فرض پورا کرنا چاہئے۔ بڑے مالک اپنے بڑے بیٹے کی طرح اس بار بھی اپنے چھوٹے بیٹے کی لاش کے ساتھ کسی لڑکی کو دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔''

''وہ جھکا۔ اس نے پہلے پستول اٹھایا پھر بے ہوش شرمیلا کو پھر ان دونوں کو لئے ہوئے پر اطمینان قدموں سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

نعمت علی حیران رہ گیا تھا۔ اس نے بے اختیار سوال کیا۔

''کیا کہانی ختم ہوگئی استاد محترم۔''

''نہیں...... کہانیاں اتنی جلدی کہاں ختم ہوتی ہیں۔ ابھی تو کہانی کا آغاز ہوا ہے۔ ذرا ادھر دیکھو!''

اچانک ہی نعمت علی کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اور منظر بدل گیا۔ اسے ایک اسپتال نظر آیا تھا۔ اور جو شخصیت اس کی نگاہوں کے سامنے آئی وہ ایک نوجوان ڈاکٹر تھی۔ شاید اس نے پیشے سے متعلق زندگی کا آغاز ہی کیا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی معصومیت اس کی نوعمری کا پتا دیتی تھی۔

لیبر روم سے نکل کر اس نے نرس سے کہا۔ ''نرس! تمام انسٹرومنٹس میرے بیگ میں رکھ دو اور بیگ ڈیوٹی روم میں پہنچا دو۔''

''یس میڈم۔'' نرس نے کہا اور وہ ڈیوٹی روم میں پہنچ گئی۔ ڈاکٹر فراز وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولے۔

''آیئے۔ ڈاکٹر ماہ رخ، کیسا رہا آپ کا کیس۔''

''بالکل ٹھیک سر!''

''کوئی مشکل۔''

''بالکل نہیں سر۔''

''گڈ! بیٹھیے آپ کب روانہ ہورہی ہیں؟''

''سر کل صبح۔''

''کتنے گھنٹے کا سفر ہے آپ کا۔''

''آٹھ گھنٹے لگتے ہیں سر۔''

''ہوں۔ اپنے گھر جانے کی بہت خوشی ہوتی ہے ناں۔'' ڈاکٹر فراز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی سر! آپ کو علم ہے۔ کہ وہاں میری والدہ ہیں چھوٹے بہن بھائی ہیں اور میرے منگیتر بھی آرہے ہیں اپنے والدین کے ساتھ۔''

''اوہو...... اچھا...... تب تو ضرور کوئی اہم مسئلہ ہوگا۔ بہرحال ڈاکٹر ماہ رخ پیشگی مبارکباد۔''

''نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس وہ لوگ یونہی ملنے آرہے ہیں، میرے دور کے رشتے دار بھی ہیں۔ میں پہلے بھی آپ کو بتا چکی ہوں کہ ہم لوگ نئے سرے سے اپنی زندگی تعمیر کررہے ہیں۔''

''ہاں۔ آپ نے مجھے بتایا تھا۔ کہ والد کے انتقال کے بعد آپ نے بڑی جدوجہد کی ہے۔''

''میں نے نہیں سر۔ میری والدہ نے۔ انہوں نے انتھک محنت کرکے مجھے ڈاکٹر بنایا ہے۔ اور اب میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے محنت کررہی ہوں۔''

''محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ڈاکٹر ماہ رخ آپ جائیں۔ ایمبولینس آپ کو گھر چھوڑ دے گی۔'' اسی دوران نرس نے اس کا میڈیکل بکس لاکر رکھ دیا تھا۔

''یہ میں اس لئے لے جارہی ہوں۔ کہ ممکن ہے گھر میں رکنے کے دوران مجھے کوئی کیس مل جائے۔''

''یقیناً۔ بے شک'' ڈاکٹر فراز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور وہ اپنا بیگ سنبھال کر نکل آئی۔

باہر شام جھک آئی تھی فضاؤں میں اندھیرے اتر رہے تھے۔ اور موسم بھی ابر آلود تھا۔ وہ ایمبولینس کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی ڈرائیور جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ چنانچہ اس نے ایمبولینس اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی۔

یہ ایک پہاڑی شہر تھا۔ اور لالہ جان کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ خاصی آبادی تھی۔ اور ڈاکٹر فراز اس اسپتال کے سرجن تھے۔ جہاں ماہ رخ نے ہاؤس جاب مکمل کیا تھا۔ اس کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر فراز نے اسے اپنے ہاں لالہ جان میں ملازمت کی پیش کش کردی۔ جسے ایک معقول تنخواہ کے عوض اس نے قبول کرلیا۔ اور لالہ جان آگئی۔ ڈاکٹر نے اسپتال سے کچھ دور اس کی رہائش گاہ کا انتظام بھی کردیا تھا۔ جہاں اس کے ساتھ دو نرسیں اور ڈاکٹر فرخندہ بھی رہتی تھیں۔ اس کی والدہ نے بلایا تھا۔ اور بتایا تھا کہ شہروز بھی اپنے خاندان کے ہمراہ آرہے ہیں۔ وہ دس پندرہ دن کی چھٹی لے کر آجائے۔

اچانک وہ اچھل پڑی۔ یہ ایمبولینس ابھی تک رکی کیوں نہیں۔ اتنا فاصلہ تو نہیں ہے۔ جتنی دیر سفر کرتے ہوگئی ہے۔ اسی وقت ایمبولینس رک گئی۔ اس نے باہر جھانکا اور اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے یہاں تو چاروں طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔

''ڈ...... ڈرائیور......'' اس نے کپکپاتی آواز میں کہا، اسی وقت ایمبولینس کا عقبی دروازہ کھلا اور دو افراد کھڑے نظر آئے دو اجنبیوں کو اس ویران مقام پر دیکھ کر ڈاکٹر ماہ رخ کی گھگھی بندھ گئی تھی۔

''نیچے اتر آیئے میڈم'' ان میں سے ایک نے نرم لہجے میں کہا۔

''کک...... کون ہیں آپ لوگ؟'' وہ آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

''میڈم ہم شریف لوگ ہیں۔ آپ ہی کے شعبے سے ہمیں کام ہے۔ آپ کا کچھ وقت لیں گے اس کے بعد عزت واحترام کے ساتھ جہاں آپ چاہیں گی آپ کو پہنچا دیا جائے گا۔ اس کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔''

''کک...... کیا بکواس...... کررہے ہو۔'' وہ چیخی۔

''کالج گرلز کی طرح بات نہ کیجئے۔ آپ ایک ذمے دار پیشے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم آپ کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ آپ کا مکمل احترام کیا جائے گا۔ عقل سے سوچیں تو آپ کو احساس ہوجائے گا کہ یہاں اس جگہ آپ کسی بھی سنگین صورت حال سے دوچار ہوسکتی ہیں۔ یہ ایک ویران جگہ ہے۔ بہتر ہے۔ ہم سے تعاون کریں، آپ کو ایک ایسی خاتون کی مدد کرنی ہے۔ جو اس وقت آپ کی مدد کی طالب ہے۔ آپ ہماری بات سمجھ گئی ہوں گی اور بہتر ہے آپ وقت ضائع نہ کریں۔''

صورت حال واقعی سنگین تھی۔ حالات کا ہمت

سے مقابلہ کرنا چاہئے ۔ اس نے سوچا۔ ایمبولینس ڈرائیور نے یہ سب کچھ کیا ہے۔یا کچھ اور ہوا ہے۔کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے نیچے اتر آئی۔

''آپ کا میڈیکل بکس۔''

''وہ ہے۔میں......''

''بس آپ تکلیف نہ کریں۔'' ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر میڈیکل بکس اٹھالیا۔ وہ چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''یہ تو ایک ویران جگہ ہے۔''

''آیئے......'' وہی شخص بولا ۔ تب اس نے تاریکی میں کھڑی ایک کوسٹر دیکھی۔ وہ اس طرف جارہے تھے۔ وہ دل سے دعائیں مانگتی ہوئی کوسٹر میں جا بیٹھی۔ کوسٹر کے شیشے گہرے تاریک تھے ۔ باہر گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تاحد نظر روشنی کی کوئی رمق نہیں نظر آرہی تھی۔

کوسٹر کا سفر کوئی چالیس منٹ تک جاری رہا۔ پھر وہ کسی ناہموار راستے پر اتر گئی۔ اور کچھ دیر کے بعد رک گئی۔ وہ نیچے اتر کر اس کے پاس پہنچ گئے۔

''آیئے۔''

''یہ آپ لوگ مجھے۔''

''بالکل فکر مند نہ ہوں ۔ آیئے پلیز!......'' میڈیکل بکس اٹھانے والے نے کہا۔ اور وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور اسی طرح کانپتی ہوئی وہ اس قدیم محل نما عمارت کے چوبی دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔ عمارت اندر سے بھی تاریک تھی۔ لیکن ایک غلام گردش طے کرنے کے بعد اسے کسی دروازے کے شیشوں سے روشنی جھلکتی ہوئی نظر آئی۔

''یہ بکس لیجئے......اندر چلی جایئے۔'' اس شخص نے بکس اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔ ماہ رخ نے ایک لمحے سوچا پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ حالانکہ اس کے دل میں شدید وسوسے جاگے ہوئے تھے ۔ ایسی ویران جگہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا تھا۔ لیکن بہر حال وہ ایک باہمت لڑکی تھی۔ اور جب سے اس نے اپنے گھر کی ذمے داریاں سنبھالنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اس کے اندر قوتیں بیدار ہوگئی تھیں۔ اور وہ اپنے آپ کو سنگین حالات سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار پاتی تھی۔ اب یہاں جو کچھ بھی ہوگا اللہ مالک ہے۔ اپنے طور پر تو مدافعت کی پوری پوری کوشش کرے گی اور اب اس بات کے بھی امکانات ہیں۔ کہ جو اندازہ اس نے لگایا ہے۔ وہ غلط ہی نکلے ۔ اندر پہنچی تو ایک بڑا سا کمرہ نظر آیا۔ اس کمرے میں کوئی موجود تھا۔ لیکن جو کوئی بھی تھا۔ اس نے اپنا رخ تبدیل کیا ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر ماہ رخ نے اسے عقب سے دیکھا تھا۔

وہ ایک دراز قد آدمی تھا۔ انتہائی خوب صورت لباس میں ملبوس، اس کے ہاتھوں میں جو انگشتریاں پڑی ہوئی تھیں ان میں بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان ہیروں کی کرنیں خصوصی طور پر منور ہورہی تھیں۔ کمرے میں جو مدھم روشنی تھی۔ وہ شمع دانوں سے ابھر رہی تھی اور اس کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن کمرے سے ملحق کمرے میں جو غالباً کوئی خواب گاہ معلوم ہوتا تھا۔ روشنی بھی تھی۔ اور اندر سے مدھم مدھم آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ جن کا کوئی واضح مفہوم ڈاکٹر ماہ رخ کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی تو اندر موجود آدمی کی آواز گونجی جو نہایت پاٹ دار اور رعب دار تھی۔

''ڈاکٹر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو اس انداز میں یہاں بلایا لیکن بعض اوقات مجبوریاں ایسی غیر اخلاقی حرکتیں کرنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ آپ نے یہاں تک آنے کی جو زحمت کی ہے اور جو اس کا انداز رہا ہے۔ اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ یہ سامنے تپائی پر ایک لفافہ رکھا ہوا ہے۔ اس میں پچیس ہزار روپے موجود ہیں جو آپ کی اس زحمت کا معاوضہ ہیں۔ براہ کرم پہلے اسے قبول کیجئے۔ اور اس کے بعد اس دروازے سے اندر داخل ہوجایئے۔ آپ کو پتہ چل جائے گا کہ آپ کو یہاں کیا کرنا ہے؟''

آواز میں ایک ایسا دبدبہ ایک ایسی کیفیت تھی۔

جو ڈاکٹر ماہ رخ اچھی طرح محسوس کررہی تھی۔ لیکن اس آواز میں رعونت بھی تھی۔ دولت کی چمک بھی البتہ ڈاکٹر ماہ رخ نے اپنے طور پر سوچا کہ اگر واقعی کوئی مشکل مرحلہ ہے۔ تو پھر اسے زندگی کا انعام ہی کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ پیسہ اس کی اہم ضرورت تھا۔ بے شمار مسائل رکے پڑے تھے۔ اپنی فطری خودداری، کی بنا پر اس نے کبھی ڈاکٹر فراز سے اپنی کسی مالی پریشانی کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر فراز اسے ایک معقول تنخواہ دیتے تھے۔ لیکن اگر پچیس ہزار روپے کی یہ رقم کسی ایسے کام کے عوض ہاتھ آجائے جس میں اسے کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ تو بہر حال یہ ایک اچھا عمل ہے۔ اور اس تصور نے اس کے دل میں ایک امنگ سی پیدا کردی تھی۔

''آپ شاید اس تذبذب کا شکار ہیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کے پس پردہ کچھ اور ہے۔ تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دیجئے ۔ ڈاکٹر، ایسی کوئی بات نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ کو وقت بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ براہ کرم یہ لفافہ اٹھالیجئے، تاکہ آپ کو ذہنی طور پر تسلی رہے کہ آپ کا جو وقت ضائع ہوا ہے۔ وہ بے مقصد نہیں رہا ہے۔ پلیز! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ اس پر عمل کیجئے......! دیر نہ کیجئے۔''

''آپ، آپ...... اِدھر رخ تو بدلیے۔''

''ڈاکٹر...... یہ روپے رخ بدلوانے کے لئے نہیں ہیں بہتر ہے آپ مجھ سے اس کی فرمائش نہ کریں ۔کیونکہ میں نے رخ بدلا تو آپ کے لئے نقصان دہ بھی ہوسکتا ہے۔'' ماہ رخ کے بدن میں ایک بار پھر سرد لہریں دوڑنے لگیں ۔ واقعی درشت لہجہ گفتگو کبھی کبھی شدید نقصان کا باعث بنتی ہے ۔ اس نے آگے بڑھ کر تپائی سے لفافہ اٹھایا اب اس میں جو کچھ بھی تھا۔ اسے دیکھنے اور گننے کا موقع تو کسی طور نہیں تھا۔ اور ویسے بھی یہ ایک چھچھوری حرکت ہوتی۔

چنانچہ اس نے لفافہ اٹھا کر احتیاط سے اپنے لباس کے اندر رکھ لیا اور پھر اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے خاموشی سے دروازہ کھول کر اس کمرے میں چلی گئی جس کی جانب اشارہ کیا گیا تھا۔ یہ ایک وسیع خواب گاہ تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک دروازہ باہر کی جانب بھی کھلتا تھا، آتش دان کے اوپر شمع دان روشن تھے ۔ اور کئی شمعیں جل رہی تھیں۔ بستر پر ایک دبلی پتلی لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے انداز میں شدید بے چینی اور تکلیف کا احساس پایا جاتا تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں ۔ اور بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدل رہی تھی۔ ڈاکٹر ماہ رخ نے اس کے ناہموار جسم کو دیکھ کر ایک لمحے میں اندازہ لگالیا کہ صورت حال کیا ہے۔ ویسے اس گفتگو سے پہلے بھی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا ۔ کہ ممکن ہے یہ جرم اور گناہ کی ایسی کہانی ہو جن کی داستانیں اخبار میں پڑھی جاتی ہیں۔ اور ایسے کھیل ایسی ہی بڑی بڑی حویلیوں کے رہنے والے رئیس لوگ کھیلا کرتے ہیں ۔ لیکن بہر حال اب اسے اس بات کا احساس نہیں تھا ۔ کہ صورت حال کیا ہے۔ اس کے سامنے ایک ایسی مریضہ موجود تھی ۔ جس کی بے چینی اور کرب بتاتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزر رہی ہے۔ ڈاکٹر ماہ رخ نے اپنا بیگ میز پر رکھا اور اندر سے ضروری سامان نکال کر لڑکی کا معائنہ کرنے لگی۔ لڑکی کا چہرہ بدستور سیاہ شال سے ڈھکا ہوا تھا۔ ماہ رخ نے اس کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا نام ہے۔ تمہارا؟'' کوئی جواب نہیں ملا تو ڈاکٹر ماہ رخ نے پھر کہا۔

''اپنا نام بتاؤ۔''

''نہیں میرا کوئی نام نہیں ہے۔ بس تم مجھے ایک بری لڑکی کے طور پر پکار سکتی ہو۔''

''ہوں۔ میں سمجھ رہی ہوں۔ لیکن اگر تمہیں برائی کا احساس ہے۔ تو تم یقیناً بری لڑکی نہیں ہو کیا۔ اس شخص کے بارے میں بتاسکتی ہو۔ جو تمہارے ساتھ والے کمرے میں کھڑا ہوا ہے۔''

''اوہ۔ کچھ نہیں ۔ کچھ نہیں ۔ میں مررہی ہوں ۔ مجھے اس زندگی سے نجات دلادو ڈاکٹر۔ میں مررہی ہوں۔''

''تم نہیں مررہی ہو۔ تم زندہ ہو اور زندہ رہو گی

۔لیکن میں تم سے جو سوال پوچھ رہی ہوں تم اس کا جواب دو اگر تم مناسب سمجھو تو اس کا جواب دو، وہ جو شخص ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ کیا اسے اپنی برائی کا کوئی احساس نہیں ہے۔ حالانکہ منہ اس نے بھی چھپایا ہوا ہے ۔لیکن......لیکن بہر حال ٹھیک ہے۔"

ڈاکٹر ماہ رخ اس پر متوجہ ہوگئی ۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"ذہن کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرو۔ اور یہ شال اپنے چہرے سے ہٹا دو تاکہ سانس لینے میں آسانی ہو۔"

"نہیں ڈاکٹر ۔ میرا یہ منحوس چہرہ چھپا ہی رہنے دو، خدا کے لئے میری رونمائی نہ کرو۔ میں میں شاید تمہارے چہرے کا سامنا نہ کر پاؤں گی۔"

"لڑکی مجھے اپنا ہمدرد سمجھو، میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ اور ویسے بھی ڈاکٹر کبھی کسی کے دشمن نہیں ہوتے ۔تمہیں شاید یقین نہ آئے کہ میں اس وقت اپنی زندگی کی بہترین خوشیاں سمیٹے، مگر چھوڑو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اگر میں اپنی یہ مختصر سی کہانی سناؤں گی ۔ تو تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

بس یوں سمجھ لو میں صرف تمہاری وجہ سے یہاں آ گئی ہوں اور میں تمہیں کسی طور برا نہیں سمجھتی ۔"

"ڈاکٹر تمہارا شکریہ لیکن انسان اپنی برائیوں کو خود بھی جانتا ہے۔"

"سنو..... تمہارا سانس لینا بہت ضروری ہے۔ کھلی فضا میں سانس لینا اس عمل میں بہت ضروری ہے۔ جس کا تم شکار ہو۔"

"ڈاکٹر نہیں میں اپنا چہرہ نہیں کھولوں گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں واپس جا رہی ہوں۔"

ڈاکٹر ماہ رخ نے اس کے بدن سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے۔

"خدا کے لئے ڈاکٹر میں، میں....." لڑکی اپنا جملہ پورا نہیں کر سکی۔

"تو پھر اپنا چہرہ کھول دو۔ یہ ازحد ضروری ہے۔"

چند ہی لمحات کے بعد لڑکی نے اپنے چہرے سے شال ہٹا دی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور رنگت گلابی تھی۔ چہرہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا لیکن اس کے نقوش اس کے خدوخال بے حد خوب صورت تھے ڈاکٹر ماہ رخ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"خدا کی پناہ، تمہاری عمر بہت کم ہے۔ یہ تم نے کیا کر ڈالا ہے، بے وقوف لڑکی کیا کیا.....تمہارے والدین کو اس بات کا علم ہے؟"

"اوہ ...... مجھ سے کچھ نہ پوچھو..... کچھ نہ پوچھو۔"

"دیکھو۔ ڈاکٹر سے کبھی کچھ نہیں چھپانا چاہئے۔ میں ایک بار پھر تم سے یہی کہوں گی کہ میں تمہاری ہمدرد ہوں۔ کیا تمہارے ماں باپ کو اس کا علم ہے؟"

"صرف ماں کو ہے۔ باپ کو نہیں۔"

"کیا نام ہے۔ تمہارا؟" ڈاکٹر ماہ رخ نے سوال کیا لیکن اسی وقت دروازے کے باہر سے وہی گونجدار آواز سنائی دی۔

"ڈاکٹر تم حد سے زیادہ تجاوز کر رہی ہو تمہیں جس کام کے پیسے دیئے گئے ہیں صرف وہ کام کرو۔ نجی نوعیت کے سوالات کئے تو شاید میں اپنی شرافت کی ضمانت نہ دے سکوں میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں۔ تم نے ایک بار مجھ سے اپنا رخ تبدیل کرنے کی درخواست کی تھی ۔ تو میں نے تمہیں سمجھایا تھا ۔ لیکن اب.....اب تم پھر وہی عمل کر رہی ہو۔ میں ایک بار پھر تمہیں وارننگ دیتا ہوں۔"

ماہ رخ نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ شخص دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔ لیکن اب بھی اس کا رخ دوسری جانب تھا۔ اور اس کی گردن کا تناؤ اس بات کا احساس دلاتا تھا۔ کہ اسے اپنے گناہ کا احساس نہیں ہے ۔وہ صرف اپنی دولت کے بل پر دنیا کی ہر شخصیت کو زیر کرنے کا تصور اپنے دل میں سجائے ہوئے ہے۔ بہر حال اس وقت لڑکی کی کیفیت ایسی تھی کہ ڈاکٹر ماہ رخ اس سے گریز نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ وہ خاموشی سے

اپنے کام میں مصروف ہوگئی اور ایک گھنٹے کے بعد ایک خوبصورت بچے کے رونے کی آواز کا اس ماحول میں اضافہ ہوا، بچے کی آواز سنتے ہی اس شخص کی آواز ابھری۔

"سنو ڈاکٹر یہ بچہ میرے پاس لے آؤ۔" اس کے بعد اس نے اس خوبصورت سے ننھے بچے کو نہایت احتیاط کے ساتھ کپڑے میں لپیٹا اور دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ وہ شخص آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کا مقصد تھا کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ ماہ رخ دروازے سے باہر نکل آئے اور وہ آگے بڑھ گئی۔ اور چند لمحات کے بعد اسی دوسرے بڑے کمرے میں پہنچ گئی۔ جہاں وہ پر رعونت شخص آتشدان کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ سامنے کی دیوار پر اسکا سایہ شعلوں کے بھڑکنے کی وجہ سے عجیب انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ ڈاکٹر ماہ رخ آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گئی۔

"میں بچے کو لے کر آئی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ اور اس شخص نے اپنا ہاتھ پشت کی طرف بڑھا دیا۔

"لاؤ.....اسے مجھے دے دو۔" وہ بولا۔ اور ڈاکٹر ماہ رخ نے بچہ آگے بڑھا دیا۔ وہ بچے کو لے کر دوسری جانب رخ کرکے بدستور کھڑا رہا۔ اور اس کی نگاہیں شاید آتشدان میں بھڑکنے والے شعلوں کو دیکھ رہی تھیں۔ لیکن پھر جو کچھ ہوا اس نے ڈاکٹر ماہ رخ کو ذہنی طور پر ایک لمحے کے لئے ناکارہ کر دیا۔

وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ اور پھر اس نے بچے کو نہایت بے دردی اور وحشت و درندگی کے ساتھ آتشدان میں اچھال دیا۔ یہ ایک ایسا ناقابل یقین عمل تھا۔ کہ ڈاکٹر ماہ رخ کو اپنے پیروں پر اختیار نہ رہا تھا۔ بے اختیار اسکا دل چاہا کہ زمین پر بیٹھ جائے ۔ "آہ...... کیسا درندہ نما انسان ہے۔ یہ انسان ہے بھی یا نہیں۔" اس نے دل میں سوچا۔ اسکے پورے بدن پر رعشہ طاری تھا۔ اور یہ پر ہیبت منظر اس کے رگ و پے میں ناقابل بیان وحشت طاری کر رہا تھا۔ اسکی آواز بند ہوگئی تھی۔ آنکھیں باہر ابل پڑی تھیں۔ اور جسم کسی ریت کی طرح ساکت ہو گیا تھا۔

آگ میں پڑتے ہی بچے کے جسم پر لپٹا ہوا کپڑا جلنا شروع ہو گیا۔ کپڑا جلتے ہی ۔ وہ نرم و نازک بچہ حیرت انگیز انداز میں سیدھا ہوا۔ اور دونوں ہاتھ سامنے پھیلا دیئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ ابھی اس آتشدان سے چلتا ہوا باہر آ جائے گا۔ لیکن ظاہر ہے۔ ایسا ممکن نہیں تھا۔ آگ کی تپش کے سبب اسکے پٹھوں میں کھنچاؤ پیدا ہوا تھا اور وہ چند لمحات کے لئے سیدھا ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد گوشت جلنے کی بو فضاء میں ابھری۔ اور اسکے بدن کی ہڈیاں نمایاں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر ماہ رخ شدید وحشت کے عالم میں اپنی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک ناقابل یقین بات تھی۔

"آہ...... کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ اور اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ تبھی وہ شخص اسی انداز میں الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور اس نے ایک اور لفافہ ڈاکٹر ماہ رخ کی جانب پشت کی طرف ہاتھ کرکے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس میں بھی پچیس ہزار ہیں ۔ اور یہ پچیس ہزار تمہیں یہ منظر بھول جانے کے لئے ادا کئے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر ماہ رخ۔" ڈاکٹر ماہ رخ کے بدن میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ وہ تو اس وحشت ناک ماحول سے بری طرح متاثر ہو گئی تھی ۔ تب اس نے لفافہ اس کے پیروں میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر سنو!...... میں نے تمہاری دونوں فیسیں ادا کر دی ہیں تمہیں تھوڑی سی نصیحت بھی کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یہاں جو کچھ بھی پیش آیا ہے۔ اس جگہ سے باہر نکلنے کے بعد اسے بھول جانا ہوگا ۔ اسے یاد رکھنے کی کوشش تو تمہیں اس نوجوانی میں موت سے ہمکنار ہونا پڑے گا۔ میں کون ہوں۔ کیا ہوں؟ یہ جاننے کی کوشش نہ کرنا وہ تمہارے لئے کسی طور پر بہتر نہ ہوگی۔ اور بعض اوقات کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں مان

بیٹے ہی میں فائدہ ہوتا ہے۔ اور اس سے اعتراف سمجھ لو...... اپنے لئے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے لڑکی کی دیکھ بھال کرلو۔ اسکی جو ضرورتیں ہیں اسے پورا کرلو۔ اور اس کے بعد باہر نکل آؤ وہ لوگ جو تمہیں یہاں تک لے کر آئے ہیں واپس اسی جگہ پہنچا دیں گے۔ جہاں تم جانا چاہتی ہو۔ اور اس کے بعد تمہیں کچھ یاد نہیں رہے گا۔"

اس نے بڑے دروازے کی جانب قدم بڑھائے اور ماہ رخ کی جانب رخ کئے بغیر تیز قدم اٹھاتا ہوا۔ اس دروازے سے باہر نکل گیا۔ کمرے میں مسلسل گوشت جلنے کی سڑانڈ پھیلی ہوئی تھی۔ بمشکل تمام ڈاکٹر ماہ رخ کے ہوش وحواس واپس آسکے اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ اس کے بعد یہاں رکنا اسکے لئے ممکن نہیں تھا۔

ایک قدم آگے بڑھایا تو پاؤں اس سفید لفافے سے ٹکرایا۔ اور لفافہ کئی قدم آگے بڑھ گیا۔ اس نے لفافہ دیکھا جھک کر اسے اٹھایا اور ایک بار پھر اسی خوابگاہ کی جانب چل پڑی جہاں بدنصیب لڑکی اپنے گناہوں کا عذاب بھگت رہی تھی۔ جو کچھ ڈاکٹر ماہ رخ نے دیکھا تھا۔ وہ اسے قیامت تک نہیں بھول سکتی تھی۔ آہ انسانی زندگی کا اس قدر برا انجام، انسانیت کی اتنی تذلیل۔ کیا انسان ایسا بھی ہوتا ہے۔ میرے مالک وہ معصوم بچہ جو دنیا میں آکر دنیا کو دیکھ بھی نہیں پایا تھا۔ اس طرح جہنم کی آگ میں جل گیا۔ خبیث انسان تو نے مجھے بے شک دھمکیاں دی ہیں۔ لیکن، لیکن بہت سی باتیں مجھ پر قرض ہوگئی ہیں۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ لیکن یہاں ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ ایک اور بچہ لڑکی کے پاس موجود تھا۔

ڈاکٹر ماہ رخ نے پلکیں جھپکائیں اور پھر ساری صورت ایک لمحے میں اس پر منکشف ہوگئی۔ لڑکی نے جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔ اور جب وہ پہلے بچے کو لے کر اس ظالم شخص کے پاس گئی تھی تو اسی اثناء میں دوسرے بچے کی نمود بھی ہوگئی تھی۔ اس نے برق رفتاری سے آگے بڑھ کر اپنا عمل شروع کردیا۔ اور اس کے ننھے سے وجود کو کپڑے میں لپیٹ کر اپنے سینے سے لگالیا۔ لیکن لڑکی نیم بیہوشی کی کیفیت کا شکار تھی۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال گزرا۔ اگر اس شیطان کو اس بات کا علم ہوجائے کہ اس کے گناہ کا ایک اور پھل اس دنیا میں آگیا ہے۔ تو وہ اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا۔

چنانچہ اس بچے کی زندگی بچانا اس پر فرض ہے۔

پھر اس نے جھک کر لڑکی کو دیکھا۔ اور آہستہ سے بولی۔

"سنو...... میری بات۔ اس وحشی انسان نے تمہارے ایک بچے کو ہلاک کردیا ہے۔ لیکن ایک اور بچہ اس دنیا میں آگیا ہے۔ اگر اس کی زندگی بچانی ہے تو میرا ساتھ دو۔ میں اس کے ساتھ وہ سلوک نہیں ہونے دوں گی۔ جو پہلے کے ساتھ کیا گیا ہے۔ میں اس بچے کو یہاں سے لے جارہی ہوں۔ کیا یہاں سے نکلنے کا اور کوئی راستہ ہے؟" لڑکی نے آنسو بھری نگاہیں اٹھائیں اسے دیکھا اور پھر ایک جانب اشارہ کردیا۔ بچے کی ہلاکت کی خبر نے کہ اس کے چہرے پر جو تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ اس نے ڈاکٹر ماہ رخ کے دل پر زخم لگادیئے تھے۔ لیکن بہرحال اس وقت یہ سب کچھ سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ اس بچے کی زندگی بچانا چاہتی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"یہ راستہ کیا مجھے باہر لے جاسکتا ہے۔" جواب میں لڑکی نے اثبات میں گردن ہلادی تھی۔ ڈاکٹر ماہ رخ نے پھر کہا۔

"کیا تم اپنی ماں کا پتا بتا سکتی ہو۔"

"نہیں۔ اس بچے کو تم اگر اپنے ساتھ لے جارہی ہو۔ تو اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا کسی کو یہ نہیں بتانا کہ یہ میرے گناہ کی نشانی ہے۔ میری ماں کے پاس بھی نہیں لے جانا ورنہ میں خودکشی کرلوں گی؟"

"بدبخت لڑکی کم از کم مجھے اس بچے کے باپ کا نام تو بتاؤ۔"

"آپ اسے دیکھ چکی ہیں ڈاکٹر۔"

"وہ بدنما شخص، وہی خبیث، وہی بدروح۔"

"لیکن میں اس کا نام نہیں جانتی۔"

"اس نے اپنا نام بتانے سے منع کیا ہے۔ اوہ کاش میں...... میں......"

"سنو...... میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔ خدا کے لئے مجھے اس شخص کا نام بتادو۔ اگر وہ واپس آگیا۔ اور اسے اس بات کا علم ہوگیا کہ ایک اور بچہ میرے پاس ہے تو وہ اسے بھی آگ میں پھینک دے گا۔"

"کیا......؟" لڑکی کے چہرے پر شدید خوف ابھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا اس نے میرے بچے کو آگ میں ڈال دیا ہے۔"

"ہاں...... اس وحشی نے یہی سلوک کیا تھا۔ تمہارے اس بچے کے ساتھ آتش دان کی آگ میں جلا دیا ہے۔ اس نے تمہارے بچے کو۔ اور تم اب بھی اس کا نام بتانے میں پس وپیش کررہی ہو۔" لڑکی کی آنکھیں آنسو برسا رہی تھیں۔ اس کی ہچکیاں بلند ہورہی تھیں۔ اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل پارہی تھی۔

ڈاکٹر ماہ رخ نے کہا۔

"خدا کیلئے جلدی کرو...... زیادہ دیر ٹھہرنا کسی طور مناسب نہیں ہے۔"

"وہ...... وہ عرفان علی ہے۔ اس علاقے کا بہت بڑا زمیندار بڑا صاحب حیثیت انسان ہے۔ وہ...... یوں سمجھ لو کہ وہ...... وہ......" باہر قدموں کی مدھم سی چاپ سنائی دی تو ماہ رخ نے جلدی سے بچے کو لپیٹ لیا۔ اور اپنے سینے سے لگایا۔ اور پھر اپنا تمام سامان وغیرہ وہیں چھوڑ کر وہ عقبی دروازے سے باہر نکل گئی۔

دروازے کے باہر کھلی جگہ تھی۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا۔ اور ماحول سردی سے ٹھٹھرا ہوا تھا۔ حویلی کے سامنے ایک سرسبز باغ تھا۔ جس کی صاف ستھری روشیں چاندنی میں ایک عجیب سی پراسرار کیفیت پیش کررہی تھیں۔ ڈاکٹر ماہ رخ کو اس علاقے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ جس انداز میں وہ لوگ اسے لے کر آئے تھے۔ اس کے بعد بھلا علاقے کا کیا پتہ چل سکتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ اور اسے کہاں جانا ہے؟ لیکن اس وقت اس کے ذہن میں صرف ایک تصور تھا۔ جس طرح بھی ممکن ہو اس جگہ سے دور نکل جانا چاہئے۔ اتنی دور کہ وہ لوگ اس کا تعاقب نہ کرسکیں۔

ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ بچے نے اپنی مخصوص آواز میں رونا شروع کردیا رات کے سناٹے میں اس کی آواز دور دور تک پھیل گئی۔

ماہ رخ گھبرا گئی بچہ شاید بھوک کی وجہ سے رو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے وہ جلدی سے ایک گھنے درخت کے نیچے رکی اور تذبذب کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنا انگوٹھا بچے کے منہ میں دے دیا اور اس کے ساتھ ہی بچے کے رونے کی آواز بند ہوگئی۔

خاموشی ہوتے ہی اس کے کانوں میں پتوں کے چرچرانے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ یہ آوازیں حویلی کے صدر دروازے کی جانب سے آرہی تھیں۔ پھر اس نے ایک ہیولے کو دیکھا جو حویلی کے ایک گوشے سے نمودار ہوا تھا۔ اور رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ اس نے شاید اس بچے کی رونے کی آواز سن لی تھی۔ اور یہ معلوم کرنے کے لئے آیا تھا کہ اس طرف کون آگیا ہے جو رو رہا ہے۔ پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔

"کون ہے۔ اُدھر؟ کون ہے؟" اس کی آواز خاصی زوردار تھی۔ ڈاکٹر ماہ رخ خاموش کھڑی رہی پھر اچانک ہی اس نے ایک دوسرے ہیولے کو دیکھا جو اس شخص کے پیچھے سے نمودار ہوا تھا۔

"کیا بات ہے۔ کس کو آواز دے رہے ہو؟"

"پتا نہیں مالک ابھی کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی تھی۔"

"کیا بکواس کررہے ہو۔ دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔"

''نن...... نہیں مالک...... بس...... میں نے یہ آواز سنی تھی۔ اس نے کہا۔ اور اس شخص نے کہا۔

''بچے کے رونے کی آواز؟''

''مالک رات کا سناٹا پھیلا ہوا ہے۔ اور میرے کان بہت تیز ہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ کسی ننھے سے بچے کے رونے کی آواز ہی تھی۔

''ننھے سے بچے کے رونے کی آواز'' اس شخص نے سوچنے والے لہجے میں کہا۔ پھر آواز سنائی دی۔

''تو یہاں رک کوئی نظر آئے تو اسے جانے نہ دینا۔ میں ابھی آتا ہوں اور اس کے بعد ڈاکٹر ماہ رخ نے تیزی سے اس ہیولے کو واپس مڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بدن میں خوف کی لہریں دوڑ گئیں۔ اب کسی بھی لمحے اس کے فرار کا راز فاش ہوسکتا تھا۔

بہرحال یہاں سے جتنی دور نکل جایا جائے۔ یہ ہی بہتر ہے۔ چنانچہ وہ انتہائی احتیاط سے اپنے قدموں کی آواز پیدا کیے بغیر درختوں، اور پودوں کی اوٹ میں چلتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی۔ باغ کے اختتام پر قد آدم جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ان جھاڑیوں میں پہنچتے ہی۔ اس نے دوڑنا شروع کردیا۔ انتہائی ڈراؤنی اور پرخطر جگہ تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ایسی خطرناک جگہ پر قدم بھی نہ رکھ سکتی تھی۔ لیکن اس وقت موت کا خطرہ ہر قسم کے خطرات پر حاوی تھا۔ وہ بچے کو سینے سے چمٹائے۔ جھاڑیوں سے بچتی بچاتی۔ برابر آگے کی جانب بڑھ رہی تھی۔

چند لمحات کے بعد ہی اسے حویلی کی طرف سے مدھم سے شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

غالباً عرفان علی نے تمام ملازموں کو جگا دیا تھا۔ اور ان کی آوازوں کے درمیان۔ ڈاکٹر ماہ رخ نے کار اسٹارٹ ہونے کی بھی آواز سنی تھی۔ ارے کیا حقیقت کا علم ہوگیا۔ کیا وہ لوگ اس کے فرار سے واقف ہوگئے ہیں؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پوری جان سے لرز گئی۔ لیکن اب جو کچھ ہونا تھا۔ وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ اس کی اپنی زندگی بھی خطرے میں تھی۔ اور یہ معصوم بچہ جو اس کی آغوش میں تھا اس کی پوری توجہ کا طالب تھا۔

چنانچہ اس وقت اسے بڑی ہمت کے ساتھ کام کرنا تھا۔ رات سنسان تھی۔ اور ہوا بالکل ٹھہری ہوئی تھی۔ آسمان پر ستاروں کا کھیت تھا۔ کسی طرف سے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ ممکن ہے۔ اس طرف کوئی آبادی ہو۔ لیکن وہ اس آبادی کی جانب جانے کی ہمت نہیں کرسکی۔ اسے علم تھا کہ اگر وہ آبادی کے قریب گئی تو بستی کے سب آوارہ کتے اسے گھیر لیں گے۔ پھر اچانک ہی اسے عقب میں کسی کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ آواز بے شک دور تھی۔ لیکن بتدریج قریب ہوتی جارہی تھی۔ وہ یقینی طور پر عرفان کا کوئی آدمی ہی ہوگا۔ اور یقینی طور پر اس طرف آرہا ہے۔ ماہ رخ نے پہلے تو اپنی رفتار تیز کردی۔ لیکن پھر سوچا کہ اس طرح وہ تعاقب کرنے والوں کی نگاہوں میں آسکتی ہے۔ اور اس کے بعد بچنا محال ہوجائے گا۔ اس لئے چھپ کر کہیں بیٹھ جانا زیادہ مناسب ہے۔ دوسرا ڈر یہ بھی تھا۔ کہ بچہ کہیں رونا شروع نہ کردے۔

بس اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور ایک بڑی سی جھاڑی کے اندر گھس گئی۔ اس نے نہ تو اس وقت جھاڑی میں چھپے ہوئے کیڑوں مکوڑوں کی پرواہ کی اور نہ ہی۔ ان خراشوں کا خیال کیا۔ جو اس کے چہرے اور بازوؤں پر آئی تھیں۔ اس کا اندازہ بالکل درست نکلا تعاقب کرنے والا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کے قریب آگیا۔ وہ بہت تیز دوڑ رہا تھا ڈاکٹر ماہ رخ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ کہ کہیں وہ اسے دیکھ نہ لے۔ وہ اس کے قریب سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ کچھ دور جاکر وہ رک گیا۔ اور اپنے داہنی سمت دیکھنے لگا۔ لمحے بھر کے بعد اسی طرف سے ایک اور آدمی بھی دوڑتا ہوا آیا۔ اور اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور ڈاکٹر ماہ رخ آنے والوں کی گفتگو سن سکتی تھی۔ کیونکہ رات کے سناٹے خاموشی کو کچھ زیادہ ہی بلند بنا کر پیش کررہے تھے۔

''کچھ نظر آیا؟'' آنے والے نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے۔ وہ دریا کی طرف گئی ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

''پتا نہیں کیا مصیبت ہے۔ اب بتاؤ۔ کیا کریں'' پہلا آدمی بولا۔

''کرنا کیا ہے۔ نہیں ملی۔ تو کوئی ہم اسے زمین کھود کر تو نہیں نکال سکتے۔ رات کتنی ہوچکی ہے۔ ہم بھی آخر انسان ہیں۔''

''یہ مالک بھی عجیب ہیں، خوامخواہ آدھی رات کو بھاگ دوڑ لگوادی۔''

''بس یار! سب ہی عجیب ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ نہیں ملی، ورنہ اس وقت اس کی قبر بھی کھودنی پڑتی۔'' یہ الفاظ سن کر ڈاکٹر ماہ رخ کے بدن میں جھرجھری سی آگئی۔ اس نے سوچا کہ انسان کتنا وحشی ہوتا ہے اپنے عیش و آرام کے لئے دوسروں کی زندگی لے لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔''

''مگر وہ تھی کون؟'' پہلے نے پوچھا۔ وہ اسی طرف واپس آرہے تھے۔

''اب کوئی بھی ہو۔ ظاہر ہے ہمیں بتا کر تو کوئی یہاں نہیں لایا جاتا۔ اس حویلی میں لڑکیاں تو آتی رہتی ہیں۔'' پھر ان کی آوازیں مدہم ہوتی چلی گئیں۔ اور وہ دور نکل گئے۔ تب ڈاکٹر ماہ رخ نے بچے کو اپنے سینے سے لگایا اور وہاں سے نکل کر ایک جانب چل پڑی۔

بڑا خطرہ ٹل جانے کے بعد چھوٹے خطرے انسان کو پریشان کرنے لگتے ہیں اب اسے اس بات کا خوف تھا کہ اس ویرانے میں کہاں بھٹکتی پھرے گی کون جانے آبادی کس طرح ہے۔ کیا کرنا چاہئے کدھر کا رخ کرنا چاہئے ماحول میں بھی سردی اچھی خاصی تھی وہ ان جھاڑیوں کے درمیان رات نہیں گزار سکتی تھی۔ ابھی تک تو خیر انسانوں کے علاوہ اور کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوا تھا لیکن کیا جانے آگے کیا ہو۔ چنانچہ چلتے چلتے وہ ایک کچے راستے پر پہنچ گئی۔

دوسری طرف سرسبز کھیت دور دور تک پھیلے

ہوئے تھے۔ یہاں رک کر اس نے سوچا کیا کیا جائے۔ اچانک ہی بائیں طرف ایک ٹمٹماتی سی روشنی نظر آئی روشنی متحرک تھی۔ اور پھر اسے ننھی ننھی گھنٹیوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ غالباً کوئی بیل گاڑی تھی۔ جو اس طرف سے گزر رہی تھی۔ پہلے تو اس نے لمحہ بھر سوچا پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور اس گزرگاہ پہ آ کھڑی ہوئی، جہاں سے وہ بیل گاڑی آ رہی تھی۔

بیل گاڑی میں ایک لالٹین لٹکی ہوئی تھی۔ جو آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ اس کے علاوہ گاڑی بان دھیمے سروں میں کوئی گیت بھی الاپ رہا تھا۔ پھر وہ قریب پہنچا تو ڈاکٹر ماہ رخ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی گاڑی بان رات کے ویرانے میں خوب صورت عورت کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا تھا۔ غالباً اسے وہ قصے یاد آ گئے تھے۔ جو چڑیلوں وغیرہ کے بارے میں مشہور تھے۔ کہ کس طرح چڑیلیں نوجوان اور خوب صورت عورتوں کا روپ دھار کر چاندنی راتوں میں مسافروں کو اپنے پیچھے لگا کر لے جاتی ہیں اس کے خوف و دہشت کا یہ عالم ہوا کہ اس نے گاڑی روک دی۔ بیل پرسکون تھے۔ پھر ماہ رخ کو یہ احساس ہوا کہ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگ جائے۔ لیکن اچانک اس کی گود میں دبے ہوئے بچے نے کلبلا کر رونا شروع کر دیا۔ بچے کی آواز سن کر گاڑی بان رک گیا تھا۔ پھر اس کی خوف زدہ آواز ابھری۔

"کک...... کون ہو تم۔ کون ہو۔؟" اس کی آواز میں شدید خوف کا تاثر پایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ماہ رخ دو قدم آگے بڑھی اور بولی۔

"بھائی میں ایک پریشان حال عورت ہوں۔ راستہ بھٹک گئی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاؤں میرے ساتھ میرا بچہ بھی ہے۔ میں سخت پریشان ہوں۔"

"راستہ بھٹک گئی ہو۔" گاڑی بان حیرانگی سے بولا۔ "لیکن راستہ کیسے بھٹک گئیں۔ آخر یہاں نکل آنے کا مطلب کیا ہے۔ کس طرح آ گئیں۔ یعنی اس علاقے میں نہ تو کوئی پکی سڑک ہے اور نہ ہی کوئی ایسی جگہ جیسے ریلوے اسٹیشن وغیرہ تم یہاں تک کیسے پہنچیں۔"

"بڑی لمبی کہانی ہے بھائی۔ یوں سمجھ لو کہ تقدیر کی ماری ہوں یہ بتاؤ کہ لالہ جان یہاں سے کتنی دور ہے۔"

"لالہ جان تو یہاں سے کافی دور ہے۔ کوئی تیں میل دور ہوگا۔"

"کیا وہاں جانے کے لئے کوئی بس وغیرہ مل جائے گی۔" ڈاکٹر ماہ رخ نے پوچھا۔

"اس وقت تو بہت مشکل ہے۔ ویسے بھی پکی سڑک یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔ رات کے وقت ٹرک چلتے رہتے ہیں۔ لیکن...... ت...... تم......" وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"دیکھو...... کسی ٹرک پر بیٹھ کر سفر کرنے کی کوشش مت کرنا۔ ڈرائیور اچھے لوگ نہیں ہوتے تم اکیلی ہو۔ ایسا نہ ہو کسی عذاب میں گرفتار ہو جاؤ۔"

ڈاکٹر ماہ رخ نے محسوس کیا کہ دیہاتی گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا ہے۔ وہ بھی ایک نوجوان آدمی تھا۔ پھر وہ بولی۔

"یہاں آس پاس کوئی آبادی نہیں ہے بھائی۔"

"بس تھوڑی دور ہمارا گاؤں ہے۔"

"کیا وہاں تمہارے گاؤں میں مجھے رات گزارنے کا ٹھکانا مل جائے گا کوئی ایسی سرائے وغیرہ جہاں صرف ایک رات گزاری جا سکے۔"

"کہاں کی بات کر رہی ہو بی بی...... یہاں دیہاتوں میں سرائے ورائے کوئی نہیں ہوتی۔ لیکن تم ہو کون؟ بس مجھے ایک بات بتا دو۔"

"کیا؟"

"کہیں کوئی چڑیل وغیرہ تو نہیں ہو۔" گاڑی بان نے اس قدر سادگی سے کہا کہ ان حالات کے باوجود ڈاکٹر ماہ رخ کو ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا۔

"اب میں کیا جانوں کہ میں چڑیل ہوں یا نہیں۔" پھر اس نے گاڑی بان کو نیچے اترتے ہوئے دیکھا۔ وہ ڈرے ڈرے سے انداز میں ڈاکٹر ماہ رخ کے قریب پہنچا تھا۔ اور پھر اس نے جھک کر اس کے پیروں کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"پیر تو سیدھے ہیں۔ یہ بچہ تمہارا ہی ہے۔"

"ہاں......" ڈاکٹر ماہ رخ نے جواب دیا۔

"سمجھ گیا۔"

"کیا؟"

"ضرور خصم سے جھگڑا کر کے نکل آئی ہو۔ ہے ناں۔ یہی بات؟ میں بھی کتنا بدھو ہوں۔ کتنی دیر میں سمجھا۔ مگر کہاں کی رہنے والی ہو؟ شہری ہو نا، اصل میں شہر کے رہنے والے ہی ایسے کام کر سکتے ہیں۔ ہم دیہاتی لوگ تو ایسی چیزوں کو بہت برا سمجھتے ہیں، خیر چلو بیٹھ جاؤ۔ گاڑی میں۔ کتنے دن کا ہے تمہارا یہ بچہ۔" ڈاکٹر ماہ رخ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"بہت چھوٹا سا ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے اب جب ہم تمہیں لے جا رہے ہیں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے چلو آ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔" ڈاکٹر ماہ رخ بمشکل تمام گاڑی میں بیٹھ سکی تھی۔ گاڑی بان خود بھی گاڑی پر چڑھ گیا پھر بولا۔

"اب جبکہ تم ہمارے ساتھ چل ہی رہی ہو تو کسی قسم کی فکر مت کرنا۔ میاں سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہو ہی جائے گا۔ جتنے دن چاہو ہمارے پاس رہ سکتی ہو۔ میرا نام جبار خان ہے۔ تمہارا نام کیا ہے۔"

"بس میرا نام...... میرا نام میراں ہے۔"

"نازوں کی پلی معلوم ہوتی ہو۔ صورت شکل بھی اچھی خاصی معلوم ہوتی ہے۔ اصل میں پہلے تو ہم تم سے ڈر رہے تھے۔ اب جب ہمیں پتہ چلا ہے کہ تم چڑیل نہیں ہو تو بس کیا کہیں۔ تمہاری شکل تو بہت ہی اچھی ہے۔ اور کپڑے بھی بہت اچھے پہنے ہوئے ہیں تم نے، پتا لگ گیا ہے شہر ہی کی ہو۔ ہم تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ شہر ہی کی لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں۔ مگر تمہارا بچہ بہت ہی چھوٹا ہے۔"

"بس مجبوری ہے بھائی جبار خان۔"

"یہ کیا بھائی بھائی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ خالی جبار خان بھی کہہ سکتی ہو تم، ویسے اچھا ہوا جو ہمیں مل گئیں۔ آج ہم بہت دیر تک کام کرتے رہے۔ اگر ہم ادھر نہ آتے تو جانے تمہارا کیا بنتا۔ خیریت نہ ہوتی تمہاری۔ اور تمہارے بچے کی، بچے کا نام کیا رکھا ہے۔"

"بس ابھی کچھ نہیں رکھا۔"

"ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔" بہرحال گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ اور جبار خان نہ جانے کس قسم کا آدمی تھا۔ ویسے بڑا تندرست و توانا تھا۔ اور ذرا بے تکلف ہی معلوم ہوتا تھا۔ ضرورت سے زیادہ باتیں کر رہا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کسی قسم کی مشکل بن جائے۔ لیکن بہرحال آبادی تک پہنچے، مشکلات تو اب زندگی کا حصہ بن گئی ہیں۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہی۔ اس کے بعد جبار خان نے کہا۔

"سنو میراں...... میراں ہی نام بتایا ناں تم نے۔"

"ہاں۔"

"کتنے دن رہو گی؟"

"بس جبار خان صبح واپس چلی جاؤں گی بلکہ اگر تم میرا ایک کام کر دو تو میں صبح ہونے سے پہلے ہی واپس چلی جاؤں گی۔"

"کیسا کام۔"

"تم نے لالہ جان کا وہ اسپتال دیکھا ہے۔ جس کے مالک ڈاکٹر فراز ہیں۔ فراز کلینک کے نام سے مشہور ہے۔"

"نہیں ہم نے نہیں دیکھا۔ مگر کیوں؟"

"بس۔ وہاں ذرا سا کام ہے۔"

"کیا کام ہے؟"

"تمہیں اسپتال جانا پڑے گا ایک پرچہ لکھ کر دوں گی میں، اسے اسپتال کی نرس کے پاس لے جانا وہ تمہیں ایک سوٹ کیس دے دے گی۔ اسے لے کر

واپس آجانا۔"

اس وقت جانتی ہو کہ رات کا کیا بجا ہے۔ وہ تو دیر ہوگئی ہمیں ورنہ ہم خود اتنی رات کو سفر نہیں کرتے زندگی کا خطرہ ہوتا ہے۔ چور لٹیرے کہیں بھی مل جائیں تو بھلا زندہ چھوڑیں گے نا بی بی بس ہمارے ساتھ چلو اگر کوئی کام ہے بھی تو دن میں دیکھا جائے گا۔ کردیں گے تمہارا کام۔"

ڈاکٹر ماہ رخ خاموش ہوگئی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ بہر حال اب جو کچھ بھی ہے۔ رات تو گزارنی ہی پڑے گی۔ بس نہ جانے کیسے کیسے خیالات اس کے ذہن میں آرہے تھے۔ بہر حال اب جو کچھ بھی ہے۔ دیکھا جائے گا۔ وہ سفر کرتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔

اس کے ساتھ ہی کہیں کہیں اکا دکا روشنیوں کے ٹمٹماہٹ بھی نظر آئی۔ غالبًا اس کی بستی قریب آگئی تھی۔ بیل گاڑی آگے بڑھتی رہی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک کچے مکان کے سامنے جاکر رک گئی۔ جبار خان نے کہا۔

"اول تو کوئی جاگتا ہوا ملے گا نہیں۔ لیکن اگر کوئی مل بھی جائے تو منہ چھپا کر بیٹھ جانا۔ میں کوئی نہ کوئی بہانا کردوں گا۔"

اس نے کہا۔ اور پھر نیچے اتر گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی ڈاکٹر ماہ رخ بھی نیچے اتر آئی تھی۔ جبار خان نے پہلے بیل کھولے۔ انہیں کھرلی میں باندھا اور پھر دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ ڈاکٹر ماہ رخ اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ کچھ لمحوں بعد دروازہ کھلا اور لالٹین کی روشنی باہر جھانکنے لگی لالٹین کی روشنی کے عقب میں ایک انسانی جسم نظر آیا۔ جسے ایک لمحے میں دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ کہ کسی نوجوان لڑکی کا جسم ہے۔

"ابا۔ بڑی دیر کردی آج تم نے؟" لڑکی کی آواز سنائی دی اور جبار خان اندر داخل ہوگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر ماہ رخ اندر پہنچی تھی۔ لڑکی نے کسی اور کو محسوس کیا تو ایک دم چونک کر بولی۔

"ارے یہ کون ہے ابا؟"

"مہمان ہے۔ بیچاری کو کہیں کوئی جگہ نہیں ملی تم اسے جگہ دے دو رات کو پڑنے کے لئے۔ چھوٹا سا بچہ ہے اس کا۔"

"مم...... مم مگر ابا...... یہ تمہارے ساتھ۔"

"اب باتیں ہی بنائے جائے گی یا اندر بھی چلے گی۔ دن بھر کا تھکا ہارا آرہا ہوں۔ تم لوگوں کو نہ جانے سوالات کرنے کا اتنا مرض کیوں ہے۔" جبار خان نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور لڑکی خاموش ہوگئی۔ ماہ رخ اس کے ساتھ اندر داخل ہوگئی۔ جبار خان بولا۔

"کچھ کھاؤ...... پیوگی...... بھوکی ہو۔"

ڈاکٹر ماہ رخ کو ایک دم احساس ہوا کہ وہ بھوکی ہے۔ جو ہوشربا واقعات پیش آئے تھے۔ ان میں بھوک پیاس کا بھلا کیا تصور رہ گیا تھا۔ لیکن اب ایک ٹھکانا مل جانے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ وہ واقعی بھوکی ہے اس نے لجاجت سے کہا۔

"بھائی جبار جس طرح تم نے میری مدد کی ہے اس کے لئے میں تمہاری بے حد احسان مند ہوں۔ اگر گھر میں کچھ ہو تو تھوڑا سا مجھے دے دو۔ بڑی مہربانی ہوگی اور تھوڑا سا دودھ اس ننھے بچے کے لئے۔"

"بندوبست ہوجائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

"زرین۔"

"جی ابا۔"

"اسے اندر کمرے میں لے جاؤ۔ اور اس کے آرام کے لئے جگہ بنادو۔ میرے لئے کھانا تو رکھا ہے ناں۔"

"ہاں ابا کیوں نہیں۔"

"تھوڑا سا انہیں بھی دے دو۔ آخر مہمان ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ابا۔"

"آؤ بی بی" زرین نے کہا۔ اور ڈاکٹر ماہ رخ اس کے ساتھ چل پڑی۔

کچا سا مکان تھا۔ کافی وسیع و عریض تھا۔ کئی

کمرے بنے ہوئے تھے جس کمرے میں زرین نامی لڑکی اسے لے کر گئی۔ وہ بھی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ہوا کے لئے ایک کھڑکی بنائی گئی تھی۔ جس پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ اور کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ بہر حال ان گاؤں والوں کی زندگی شہری زندگی سے کہیں زیادہ پرسکون ہے گھر میں کچھ ہے ہی نہیں جو دروازوں پر تالے لگانے کا خیال آئے البتہ ہوا ہی اندر آسکتی ہے۔ ایک جھلنگا سی چارپائی۔ پر میلی سی چادر بچھائی ہوئی تھی۔ زرین نے اس کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"آپ ادھر آرام کرو جی ہم کھانا گرم کرکے لاتے ہیں۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ زرین۔" ڈاکٹر ماہ رخ نے کہا۔ اور لڑکی چونک کر رک گئی۔

"ارے آپ کو ہمارا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"تمہارے بابا نے ابھی ابھی تو تمہارا نام لیا تھا۔" ڈاکٹر ماہ رخ نے مسکرا کر کہا۔

"آپ شہر کی ہوناں جی۔ شہر کے لوگ بڑے سمجھدار ہوتے ہیں۔ میں ابھی آپ کے لئے کھانا لاتی ہوں۔"

زرین باہر آئی تو اس نے دادی کو جاگتے ہوئے دیکھا۔ باپ سے باتیں کررہی تھی۔ اور شاید غصے میں تھی۔

"یہ کیا آدھی رات کو کھد بد لگا رکھی ہے۔ سونے بھی نہیں دیتے ہو چین سے۔"

"اماں، اب یہ عمر تیرے سونے کی ہے۔ جاکر جاکر اللہ اللہ کیا کر اتنی گہری نیند سونا اچھی بات نہیں ہے۔"

"مگر تجھے اتنی دیر کیسے ہوگئی۔"

"بس اماں منڈی ہی میں دیر ہوگئی۔ اب کیا کیا جائے۔"

"ہوں۔"

"اتنی سی دیر میں زرین ان کے قریب پہنچ گئی۔ تو جبار خان نے کہا۔

"پہنچا دیا اسے اندر۔"

"ہاں۔ کھانا گرم کرتی ہوں۔ اسے بھی دوں گی اور تمہیں بھی ابا۔"

"کسے؟" جبار خان کی ماں نے چونک کر پوچھا۔

"ارے وہ بس اماں ایک بے چاری مصیبت زدہ راستے میں مل گئی۔ ننھے سے بچے کی ماں ہے۔ اب سارا قصہ کیا ہے۔ یہ تو اللہ ہی جانے پر بیچاری مصیبت کی ماری تھی۔ کہنے لگی رات بھر کے لئے جگہ دے دو۔ صبح ہوتے ہی کہیں نہ کہیں چلی جاؤں گی۔"

"تیرا ستیاناس جبار تو ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ ارے کہاں سے مل گئی تھی؟"

"بس اماں بیکار کی باتیں نہ کیا کر، تجھے اللہ اللہ کرنے سے واسطہ ہے یا پھر اس قسم کی باتوں سے وہ شہباز خان ابھی آیا یا نہیں۔"

"آوارہ ہو تم سارے کے سارے راتوں کو مارے مارے پھرتے ہو وہ بھی ابھی تک نہیں پہنچا۔"

"خیر اس کی تو بات ہی الگ ہے۔ بادشاہ ہے بادشاہ۔ اری تو کہاں کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔ زرین جا کھانا لا سب کے لئے۔ اور اسے بھی دے دے بیچاری کو۔" جبار خان نے بیٹی سے کہا۔

"ہے کون کیا کہتی ہے۔ کہاں جائے گی؟"

"اتنی ساری باتیں تو میں نے نہیں پوچھیں۔ کہتی ہے صبح چلی جائے گی شہر کی ہے۔ ہاں...... یہ بھی کہہ رہی تھی ایک پرچہ دے گی مجھے شہر اسپتال کے لئے۔"

"شہر میں اسپتال کے لئے۔"

"لالہ جان کی بات کررہا ہوں۔"

"ہاں ہاں وہ تو میں سمجھ گئی۔ مگر کیسے پرچہ دے گی۔"

"خدا تیرا بھلا کرے اماں، ارے بابا تو جاکر آرام کر سوجا۔ جاکر۔ اس ساری کہانی کے چکر میں کیوں پڑی ہوئی ہے۔"

"اس لئے پڑی ہوئی ہوں کہ جوان بیٹی کا باپ

ہے تو کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے۔"

"نہیں پھنسوں گا۔ اور اگر مصیبت میں پھنس جاؤں تو تو میری کوئی مدد نہ کرنا، جا سو جا، اب تجھے خدا کا واسطہ مغز کھانے کی تجھے عادت ہے۔ اماں۔" جبار جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"اور جب تو بچپن میں میرا مغز کھاتا تھا۔ تو میں نے تو تجھ سے کبھی نہیں کہا کہ سو جا۔ ٹھیک ہے۔ سوئے جاتی ہوں۔ بھاڑ میں جا چولہے میں جا۔ مجھے کیا پڑی ہے۔ جو میں تیری مصیبت میں پڑوں۔"

بڑی بی بکتی جھکتی چلی گئی۔ اور جبار خان ہنسنے لگا۔

اماں کو بس نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ بڑھاپے میں سارے لوگ بس ایک جیسے ہی ہو جاتے ہیں مگر بات اس کی بھی سچ ہے۔ میں نے بھی بچپن میں اسے تنا ہی پریشان کیا ہوگا۔" جبار خان ہنستا رہا۔

"باورچی خانے سے چھن چھن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ زرین دال میں بگھار لگا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایک ڈلیا میں کھانا اور پانی کا گلاس اسکے سامنے رکھا۔ اور بولی۔

ابا میں اس کے لئے کھانا لے کر جا رہی ہوں۔ تم کھا کر برتن ادھر ہی رکھ دینا۔ اور سو جانا۔"

"تو ایسا کر زرین اس کے پاس جا کر یہ کہہ دینا کہ پرچہ مجھے دے دے صبح میں نکل جاؤں گا۔ اچھا ہے۔ بے چاری کا بھلا ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے ابا میں کہہ دوں گی۔"

"بس تو جا میں برتن رکھ دوں گا۔"

زرین باورچی خانے میں گئی۔ پلیٹ میں دال نکالی۔ ڈلیا میں روٹیاں رکھیں مہمان کی وجہ سے ذرا دال پر بگھار وغیرہ لگا لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے تھوڑا سا دودھ اور چمچہ بھی لے لیا تھا۔ ننھے بچوں سے اسے خاصی محبت تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو جہاں بھی ملتے گود میں کھلاتی اور خوب پیار کرتی۔"

وہ واپس پلٹی اور پھر لالٹین روشن کر کے اندر لے گئی۔ لالٹین کو ایک جگہ رکھا اور کہنے لگی۔

"لاؤ بچہ مجھے دے دو، میں اسے دودھ پلاتی ہوں۔"

ڈاکٹر ماہ رخ نے مسکراتی نگاہوں سے زرین کو دیکھا اور بچے کو اس کی طرف بڑھا دیا۔

اچانک ہی زرین کی نظر ڈاکٹر ماہ رخ کے چہرے پر پڑی اور وہ ایک لمحے کے لئے رک گئی۔ ڈاکٹر ماہ رخ اس کی طرف بچہ بڑھائے ہوئے تھی۔ زرین اسے حیرت و دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ بولی۔

"ارے ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر ماہ رخ کا بدن کانپ گیا۔ اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے زرین کو دیکھا تو زرین مسکرا رہی تھی۔ وہ مسرت کے عالم میں بولی۔

"آپ نے مجھے نہیں پہچانا ڈاکٹر صاحب۔"

"تم...... تم...... میں سچ مچ نہیں پہچانی۔"

"آپ ڈاکٹر ہو ناں لالہ جان کے اسپتال میں ڈاکٹری کرتی ہو نا۔"

"ہاں۔ مگر تم۔"

"ارے مجھے بھول گئیں۔ ابا لے کر آیا تھا مجھے تمہارے پاس...... میری طبیعت خراب تھی۔ مجھے پیلیا ہو گیا تھا۔ تم نے میرا علاج کیا تھا۔ بھول گئیں ڈاکٹر صاحب۔"

ڈاکٹر ماہ رخ نے غور سے اس لڑکی کو دیکھا اب خدوخال میں کچھ مانوسیت نظر آنے لگی تھی۔ اس نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

"ہاں زرین میں اسپتال میں ڈاکٹری کرتی ہوں۔ یہ بچہ تم پکڑ لو، بے چارہ پیدائش کے بعد سے اب تک بھوکا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"زرین...... کیا بتاؤں۔"

"کیا...... آپ کا بچہ نہیں ہے۔ یہ؟"

"ہاں...... نہیں...... میرا بچہ نہیں ہے۔ بس کسی کا ہے۔ میں اسے لے کر اسپتال جاؤں گی۔ بے چارے کی ماں۔" ڈاکٹر ماہ رخ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"[illegible] مر گئی [illegible]" زرین نے افسوس سے پوچھا۔

"ہاں......" اور ڈاکٹر ماہ رخ نے سوچا کہ وہ لڑکی جو دو بچوں کو جنم دے کر کنواری ماں بن چکی ہے۔ مر ہی چکی ہے۔ اب اس میں زندگی کے امکانات کہاں باقی ہیں۔ اور پھر وہ بدبخت لوگ نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

"آپ نے بتایا نہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ!"

"ہاں۔ بیچاری مر گئی۔"

"اور یہ بچہ۔"

"لاوارث چھوڑ گئی۔"

"کیا اس کا باپ نہیں ہے؟"

"نہیں وہ پہلے ہی مر چکا ہے۔" ڈاکٹر ماہ رخ نے کہا۔

"تو پھر اس کا کیا کرو گی آپ؟"

"بچے کو کسی خیراتی ادارے میں داخل کرا دوں گی۔"

"ہائے اللہ کیسا بدنصیب ہے۔ مگر کتنا پیارا ہے" زرین نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ اور پھر وہ بیٹھ کر اسے چھوٹے سے چمچے سے دودھ پلانے لگی۔ اور ڈاکٹر ماہ رخ نے سامنے جو کچھ رکھا ہوا تھا۔ اسے کھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ زرین نے چونک کر کہا۔

"ابا کہہ رہا تھا کہ آپ اس کے لئے پرچہ لکھ کر دے دو۔ صبح ہی صبح نکل جائے گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ زرین کہیں سے کاغذ اور قلم مل سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں مل سکتا؟ میں بھی پانچ جماعتیں پڑھ چکی ہوں۔ اور اپنے گھر میں تمام حساب کتاب میں خود ہی کرتی ہوں۔ ابھی لاتی ہوں۔ بچے کو لے جاؤں؟"

"لے جاؤ۔" ڈاکٹر ماہ رخ نے کہا۔

وہ اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کر رہی تھی ورنہ جن ہوشربا واقعات سے نکل کر یہاں تک پہنچی تھی اور ابھی تک جن حالات کا شکار تھی اس نے اس کے اعضاء کو مفلوج کر رکھا تھا۔ اور اس کے اعصاب لمحہ بہ لمحہ ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ لیکن ہمت ہی اس وقت زندگی بچا سکتی تھی۔ جو عمل اس نے کیا تھا۔ اور جو عزم اس کے دل میں پل رہا تھا۔ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہمت کا سہارا لینا بہت ضروری ہوگا۔ ذرا بھی کہیں کچا پن رہا تو مار کھا جائے گی اور پھر زندگی نہ جانے کس نہج تک پہنچے۔

تھوڑی دیر کے بعد زرین کاغذ اور قلم لے آئی۔ ڈاکٹر ماہ رخ نے مختصر سے الفاظ میں ڈاکٹر فراز کے لئے پرچہ لکھا اور اسے بتایا کہ وہ کن حالات کا شکار ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ وہ بیل گاڑی میں جبار خان کے ساتھ لالہ جان خود بھی آ سکتی تھی۔ لیکن راستے خطرناک ہوں گے کیونکہ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ فوری طور پر پولیس کی مدد لے کر جبار خان کے ساتھ یہاں تک پہنچنا تاکہ اس کی گلوخلاصی ہو سکے۔ یہ پرچہ لکھ کر اس نے زرین کو دیتے ہوئے کہا۔

"زرین تم اپنے ابا کو سمجھا دینا کہ وہ احتیاط سے اسپتال تک پہنچے فراز کلینک ہے۔ اس اسپتال کا نام۔"

"ہم نے دیکھا ہے جی۔ ابا نے بھی دیکھا ہے وہ تو جا چکا ہے جی۔ پہچانا نہیں ہوگا آپ کو۔"

"ہاں وہ رات کے اندھیرے میں مجھے ملا تھا۔ اور اندھیرے ہی میں...... میں یہاں تک پہنچی تھی۔ بھلا ہم دونوں ایک دوسرے کو کیسے پہچان سکتے تھے"

"ٹھیک ہے۔ آپ اطمینان رکھو۔"

"ویسے زرین یہاں کون کون ہے؟"

"بس جی میں ہوں۔ ابا ہے۔ ہمارا ایک چاچا ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ اور اماں...... میرا مطلب ہے۔ ابا کی اماں ہے۔ یعنی میری دادی۔"

"اچھا...... تو تمہاری ماں۔"

"وہ تو کب کی مر چکی ہے جی۔ اس وقت تو میں صرف چار سال کی تھی۔"

"تمہارے ابا نے دوسری شادی نہیں کی۔"

"نہیں جی..... غریبوں سے کون شادی کرتا ہے جی۔ ایک دفعہ ہو جائے تو بڑی بات ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔ کیا کرتے ہیں تمہارے بابا۔"

"بس جی سبزی ترکاری کا کام کرتے ہیں۔ کھیتوں سے مال اٹھاتے ہیں اور منڈی لے جا کر بیچ دیتے ہیں۔ جن لوگوں کا مال اٹھاتے ہیں وہ انہیں پیسے دیتے ہیں اور باقی میں گھر کا خرچ چلتا ہے۔" زرین نے سادگی سے بتایا۔ اور ڈاکٹر ماہ رخ گردن ہلانے لگی۔ پھر اس نے کہا

"تمہارا بے حد شکریہ زرین۔ اب جا کر آرام کرو۔"

"ہاں جی۔" زرین نے کہا۔ اور برتن اٹھا کر لے کر نکل گئی۔ ڈاکٹر ماہ رخ سر پکڑ کر اس جھلنگا پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

دوسرے دن اسے اپنے گھر جانا تھا۔ تمام تیاریاں ہو چکی تھیں۔ ٹکٹ وغیرہ بھی آ گیا تھا۔ لیکن وہ اس افتاد کا شکار ہو گئی تھی۔ آہ کبھی کبھی انسان پر کیسی بری گھڑی آ پڑتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں پریشانی کی پرچھائیاں ابھر رہی تھیں۔

پھر اس کو اس وحشی انسان کا خیال آیا۔ اور ایک بار پھر اس کا بدن کانپ گیا۔

اب تک وہ اپنے آپ کو نجانے کس کس طرح سنبھالے ہوئے تھی۔ لیکن اب اس کا تصور کر کے ایک بار پھر اس کے دل میں وحشت ابھر آئی تھی۔ آہ کس قدر بھیانک تھا وہ۔ اور۔ اور اسے۔ میری تلاش ہے۔ خدایا۔ میری مدد کر اگر میں اس کے ہاتھ لگ گئی تو نہ جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔"

خوف دہشت کے سائے اس کے دل کو لرزاتے رہے۔ اور وہ عجیب سی وحشت میں مبتلا ہو گئی۔

"کیا بنے گا میرا کیا ہو گا؟ خدایا رحم کر مجھ پر۔" معصوم سے بچے کو اس نے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ یہ فطرت کا تقاضا تھا۔ مامتا عورت کے دل میں ہوتی ہے۔ عورت اس جذبے سے کبھی کسی بھی شکل میں محروم نہیں رہتی۔ اس بچے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن اب اس کی زندگی بچانے کے لئے وہ اپنے آپ کو داؤ پر لگانے کے لئے تیار تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ذرا سا بہتر موقع نصیب ہو جائے۔ وہ ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑے گی جو اس کے ذمہ دار تھے۔ کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو آخر قانون بھی کوئی چیز ہوتا ہے وہ سوچ رہی تھی حالانکہ اس بد بخت انسان نے اسے دھمکیاں دیتے ہوئے کہا تھا کہ "اگر اس نے اس کے خلاف کوئی کارروائی کی تو بد ترین مصیبتوں کا شکار ہو جائے گی۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اس دھمکی سے خوف زدہ تھی۔ لیکن اس کے اپنے دل میں انتقام کی جو آگ سلگ رہی تھی وہ بھی اس قدر طاقت ور تھی۔ اور وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی۔ لیکن اس کے لئے شرط تھی کہ ہمت اور ذمہ داری کے ساتھ یہاں سے نکل کر اسپتال پہنچ جائے اس کے بعد اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر فراز اس کی پوری پوری مدد کریں گے۔"

نیند کا تو تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ اس بھیانک ماحول کو ذہن سے نکالنا ناممکن تھا۔ جس میں ایک وحشی انسان نے ایک جیتے جاگتے نوزائیدہ بچے کو آگ میں پھینک دیا تھا۔ وہ معصوم جس نے دنیا میں آنکھ کھولی ہی تھی۔ شعلوں کی نذر ہو گیا۔ کسی بھی طور اس سزا کا مستحق نہیں تھا۔ دنیا میں آنے کے لئے، خود تو اس نے کوئی جدوجہد نہیں کی تھی۔ یہ تو ایک وحشی کا گناہ تھا۔ مگر وہ لڑکی نجانے کون بد بخت تھی؟ نہ جانے کس طرح اس بھیانک انسان کا شکار ہو گئی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اور ڈاکٹر ماہ رخ بچے کو گود میں لئے خاموش بیٹھی تھی۔ معصوم بچہ سو گیا تھا۔

پھر اچانک ہی ڈاکٹر ماہ رخ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

دروازے کی زنجیر بجی تھی۔ اور رات کی تاریکی میں اس کی آواز نمایاں طور پر سنائی دی تھی۔

"یا خدا....." وہ ہول کر رہ گئی، "کہیں کوئی میری تلاش میں تو نہیں آیا ہے۔ ورنہ رات کا یہ حصہ اور کسی کی آمد..... خدایا! کیا کروں؟" اس نے سوچا تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی اور اس کے بعد باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں غالباً دروازہ کھولا گیا تھا۔ بوڑھی عورت جسے اماں کہہ کر پکارا گیا تھا۔ چیخ رہی تھی۔

"ارے تم لوگوں نے گھر کو کیا بھٹیار خانہ بنا رکھا ہے۔ کوئی بارہ بجے چلا آ رہا ہے تو کوئی چار بجے آ رہا ہے۔ آخر یہ گھر ہے۔ انسان کی طرح گھر میں آیا جایا کرو۔"

"دھت تیرے کی۔ اماں تو نے کبھی خیریت تو پوچھی ہی نہیں بس لگی اپنا رونا پیٹنے۔ ارے بابا تو جا کر سو جا۔ تیری نیند اتنی کچی کیوں ہے۔ میں آ جاتا کسی نہ کسی طرح زرین دروازہ کھول دیتی۔ بھائی دروازہ کھول دیتا۔"

"بہت زیادہ باتیں بنانے لگا ہے تو۔ میں کہتی ہوں یہ آنے کا وقت ہے۔"

"اماں نوکری کرتا ہوں۔ نوکری اور پھر نوکری بھی کس کی! اللہ ہی بس بچائے یہ نوکری نہیں غلامی ہے۔ گردن میں پھندا ہے۔"

"تو پھر تو کیوں نہیں چھوڑ دیتا نوکری۔ نواب عرفان آخر تجھے دیتا ہی کیا ہے؟" ڈاکٹر ماہ رخ کا دل ایک بار پھر دھڑک اٹھا تھا۔ عرفان علی، عرفان علی۔ عرفان علی۔"

"اماں خیر دیتا تو اتنا ہے کہ تو خود بھی جانتی ہے۔"

"مگر یہ آدھی آدھی رات تک آخر تو کرتا کیا ہے؟ اس کے لئے۔"

"اب جو کچھ کرتا ہوں تجھے کیا بتاؤں۔ اب یہ بتا سونے دے گی یا سوالات ہی کئے جائے گی۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم سارے میں تو عاجز آ گئی ہوں کہیں کم بخت کوئی جانے کی جگہ بھی نہیں جو چلی جاؤں تم لوگوں سے نجات تو ملے گی۔"

"ایسا کر کہ اپنے کمرے میں چلی جا اور دروازے کو بند کر لے۔ بس۔" اس آدمی نے مدھم لہجے میں کہا۔ غالباً جبار خان بھی جاگ گیا تھا۔ پھر جبار خان کی آواز ابھری۔

"مگر تو اتنی دیر میں آیا کہاں سے ہے؟"

"کیا بتاؤں۔ بڑے بھیا عرفان علی کو تو تم جانتے ہی ہو۔ بس دوڑ لگوا دی تھی۔ ایک لڑکی بھاگ گئی ہے۔ اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔"

"ڈاکٹر ماہ رخ کو چکر آنے لگے..... آہ..... آہ یہ عرفان کا ملازم ہے ان لوگوں میں شامل ہے۔ جو اس کو تلاش کر رہے تھے۔ تقدیر کیا دکھانا چاہتی ہے۔ مجھے آخر تقدیر کیا دکھانا چاہتی ہے۔ مجھے۔ اب کیا کروں یہ تو بہت برا ہوا۔ یہ تو مصیبت آ گئی میری۔"

اچانک ہی بچے نے رونا شروع کر دیا۔ اسے اپنی نیند میں مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر ماہ رخ نے جلدی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اور بچے کی آواز رک گئی۔ اس کے کان باہر کی جانب لگے ہوئے تھے۔

"یہ آواز کس کی ہے؟ یہ تو بچے کے رونے کی آواز ہے۔ ہمارے گھر میں سے آ رہی ہے۔"

"ہاں۔"

"کیسے؟"

"بس ایک عورت مل گئی تھی راستے میں، بڑی دکھیاری ہے۔ ایک بچے کی ماں..... ایک رات کی پناہ مانگی ہے۔ کل چلی جائے گی۔"

"عورت۔"

"ہاں....."

"ایک بچے کی ماں۔ کہاں سے ملی ہے؟"

دوسری آواز چونکی ہوئی تھی۔ تب جبار خان نے پوری تفصیل بتا دی۔ اور کہا۔

"یہ ایک پرچہ لکھ کر دیا ہے کہتی ہے کہ لالہ جان کے اسپتال پہنچا دو۔"

"ڈاکٹرنی ہے؟"
"پتہ نہیں۔"
"بچہ بہت چھوٹا ہے؟"
"آواز سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"
"کہاں ہے؟"
"اندر کمرے میں ہے۔"
"کون سے کمرے میں؟"
"اندر والے۔"
"ارے بڑے بھیا۔ کام بن گیا۔"
"کیسا کام۔"
"تم بھی کیا یاد کرو گے نواب صاحب سے انعام دلاؤں گا تمہیں، تم ایسا کرو مگر میں ہی کرتا ہوں۔ وہ پرچہ کہاں ہے؟"
"یہ رہا میرے پاس۔"
"مجھے دو۔"
"تم کیا کرو گے؟"
"دو تو سہی۔"
"یہ لو۔"
"میں جا رہا ہوں۔" دروازے کی کنڈی باہر سے چڑھا دو۔ اس کا خیال رکھنا نکلنے نہ پائے۔"
"کہاں جا رہے ہو۔"
"حویلی۔"
"کیوں؟"
"بڑے مالک کو خبر کرنے۔"
"کیا خبر کرنے؟"
"بڑے بھیا ساری باتیں صبح کو بتاؤں گا۔ تم بس اس کو نکلنے نہ دینا کسی کو اس کے بارے میں کچھ بھی نہ بتانا۔"
"ٹھیک ہے۔"
پھر کچھ اور آوازیں آئیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر ماہ رخ نے اپنے کمرے کی زنجیر باہر سے بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ وہ اب بھی دروازے کے پاس کھڑی تھی، اعصاب شل ہو گئے تھے۔ جو کچھ اس نے سنا تھا۔ وہ کوئی دھوکا نہیں تھا۔ ایک بار پھر روح فرسا واقعات کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ وہ قید ہو گئی تھی۔ اور اب......"

ہوا کے تیز جھونکے نے بدن چھوا تو وہ چونک کر پلٹی۔ کھڑکی کا پردہ ہوا سے اڑ رہا تھا۔ اور اس کے دوسری طرف آزادی کا سورج نظر آ رہا تھا۔ وہ چونک پڑی، اوہ! یہ تو رہنمائی ہے۔ قدرت کی طرف سے ہوا کے اس جھونکے نے اسے باہر جانے کا راستہ دکھایا ہے۔ پھر جدوجہد۔ اپنی اور اس معصوم وجود کی زندگی بچانے کی جدوجہد۔

اس تصور نے بدن میں برق دوڑا دی۔ تقدیر نے امتحان میں ڈالا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں اس کے امتحان میں پورا اترنے کی بھرپور جدوجہد کروں گی۔

وہ آہستہ قدموں سے دیوار کے اس سوراخ کی طرف بڑھ گئی جو ہوا کے لئے بنایا گیا تھا۔

ادھر جبار خان کا بھائی شہباز خان رات کی تاریکی میں حویلی کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ اس کے پاس عرفان علی کے لئے ایک اہم اطلاع تھی۔ وہ عرفان علی کی بدکاریوں میں اس کا معاون تھا۔ اور خود بھی عیش کرتا تھا۔ اسے تنخواہ کے علاوہ زبان بند رکھنے کا انعام بھی ملتا تھا۔ عرفان علی حویلی میں آتا تو ہر اونچ نیچ کو سنبھال لینا اس کی ذمہ داری ہوتی تھی۔

آج بھی عرفان علی نے ان لوگوں کی ڈیوٹی لگائی تھی مگر آج کا کیس سنگین ہو گیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ اسے لالہ جان سے اغواء کر کے لایا گیا تھا۔ اور کوئی خاص معاملہ تھا۔ اسے خاص معاملوں کی زیادہ معلومات نہیں ہوتی تھیں۔ صرف اتنا جانتے تھے۔ جتنا ضروری ہوتا ہے۔ اور آج کی ضرورت یہ تھی کہ وہ لیڈی ڈاکٹر جو اغواء کر کے لائی گئی تھی۔ بچے کو لے کر بھاگ گئی ہے۔ اور اسے تلاش کرنا ہے۔

چنانچہ وہ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ تلاش میں لگا دیا گیا تھا۔ اور آدھی رات کو تھک کر گھر واپس لوٹا تھا۔ لیکن کامیابی اس کے گھر میں داخل ہو گئی تھی۔ اور وہ ایک سنسنی خیز خبر لے کر حویلی جا رہا تھا۔

(جاری ہے)

ایم اے راحت

قسط نمبر: 10

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرہول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دہشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراؤ، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

رات کی تاریکیوں میں آخرکار اس کا سفر مکمل ہوا اور وہ نئی حویلی پہنچ گیا۔ بڑے دروازے پہ پہرے دار بہادر، اور فیروز خان ڈیوٹی دے رہے تھے۔ شہباز خان گھوڑے سے اترا تو انہوں نے بندوقیں تان لیں۔

"بے وقوفو۔ میں شہباز خان ہوں۔" شہباز نے کہا۔

"ارے شہباز خان۔ خیر ہے؟"

"مالک آگئے؟"

"ہاں۔ بہت دیر ہوگئی۔"

"مجھے ان سے ملنا ہے۔"

"دماغ خراب ہوا ہے کیا؟"

"کیوں؟"

"وہ سوگئے ہوں گے۔"

"میں جگالوں گا۔"

"آخر مصیبت کیا پڑی ہے؟"

"مصیبت ہی ہے۔ ورنہ اتنی رات میں کیوں آتا۔"

"ہمارے لئے مصیبت نہ کھڑی کردینا۔"

"تم فکر مت کرو۔ یہ گھوڑا سنبھال لو۔ میں اندر جارہا ہوں۔"

"سوچ لو۔ شہباز خان تم ذمے دار ہوگے۔"

"ہاں۔ میں ذمے دار ہوں۔ تم فکر مت کرو۔" شہباز خان نے کہا اور اندر داخل ہوگیا۔ بڑی ہمت کرکے وہ بڑی مشکلوں کے بعد اس نے عرفان کو جگایا تھا۔ عرفان نے اسے سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"کیوں موت نازل ہوئی ہے۔ تجھ پر؟"

"آپ نے ہماری ڈیوٹی لگائی تھی مالک۔"

"ہاں۔ اور تم سارے نکمے مل کر اسے تلاش نہ کرسکے۔"

"وہ بہت چالاک ہے مالک۔"

"یہی اطلاع دینے آئے ہو؟"

"نہیں مالک۔ وہ مل گئی۔ تقدیر نے ہماری مدد کی ہے۔"

"مل گئی۔"

"ہاں۔"

"کہاں ہے؟"

"یہاں گاؤں میں۔ میرے گھر میں۔"

"کیا بکواس کررہے ہو۔ اسے وہاں کیوں پہنچایا ہے تم نے؟" عرفان نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے نہیں پہنچایا مالک۔ وہ خود وہاں پہنچی ہے۔" شہباز خان نے بتایا۔

”کیسے؟“ عرفان نے پوچھا اور شہباز خان نے اسے پوری کہانی سنادی۔

”تو اسے لے کیوں نہیں آئے۔ بے وقوف۔ پرانی حویلی لے جاتا۔“

”ٹھیک نہ ہوتا مالک۔ آپ خود سوچیں۔“

”ہوں۔ باہر جا کر بیٹھ۔ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔ اور ہاں باہر چوکیدار سے کہہ دے۔ کہ نور شاہ اور شبراتی کو جگا کر لے آئیں وہ ہمارے ساتھ جائیں گے۔“

”جی مالک۔“ شہباز خان باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر کے بعد عرفان علی اپنی قیمتی گاڑی میں بیٹھے شہباز خان کے گاؤں جا رہا تھا۔ راستہ مکمل خاموشی میں کٹا۔ پھر وہ گاؤں پہنچ گئے۔ شہباز خان نے یہ سفر گھوڑے پر ہی طے کیا تھا۔ اور پھر گھوڑے کو گھر کے باہر باندھ دیا تھا۔

”ان دونوں کو اندر لے جا۔ اور لے آ اسے۔“

”جی مالک۔ آؤ۔“ شہباز خان نے کہا۔ اور پھر اس نے دروازہ بجایا۔ دیر کے بعد جبار خان نے دروازہ کھولا تھا۔ پھر چونک پڑا تھا۔

اندر سے ماں کی آواز آئی۔ بیڑہ غرق ہو ان کا۔ ستیاناس ہو جائے۔ سونا حرام کر دیا ہے۔“ لیکن شہباز خان سب کچھ نظر انداز کر کے آخری کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ زنجیر باہر سے چڑھی ہوئی تھی۔

”اس کا منہ بند کر لینا۔ چیخنے نہ پائے۔ ورنہ گاؤں والے جاگ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے فکر مت کرو۔“ شبراتی نے کہا۔ اور شہباز خان نے کنڈی کھول دی۔ اندر لالٹین جل رہی تھی۔ لیکن کمرہ خالی تھا۔

”ارے۔“ شہباز کے منہ سے نکلا۔ پھر اس کی نظریں کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ اس کی طرف دوڑا اور باہر نکل گیا۔ لیکن تاحد نظر خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

”مر گئے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

☆......☆......☆

لالہ جان پولیس اسٹیشن کا انچارج ایک ادھیڑ عمر اور تجربہ کار شخص تھا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے شریف آدمی تھا۔ پتہ نہیں بزدل تھا یا عقل مند۔ بس دنیا سازی جانتا تھا۔ پولیس اسٹیشن کے احاطے میں اس نے نواب عرفان علی کی کار رکتے دیکھی تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”خدا خیر کرے۔“ پھر اس نے بڑے پرتپاک انداز میں عرفان علی کا استقبال کیا تھا۔

”میرے لئے بڑی شرمندگی کا باعث ہے نواب صاحب کہ آپ خود یہاں آئیں۔ حضور خود تکلف سے کام لیتے ہیں۔ بس ایک ہرکارے کو دوڑا دیا کریں۔ یا ایک فون کر دیا کریں۔ خادم خود حاضر ہو جایا کرے گا۔“

”محبت ہے۔ آپ کی ظفر صاحب! لیکن کبھی کبھی آپ سے ایسے بھی ملاقات ہوتی رہنی چاہئے۔“

”یہ آپ کی بڑائی ہے۔ نواب صاحب میرے لئے کوئی خدمت ہو تو فرمایئے۔“

”ہاں۔ خدمت ہے۔“

”دل و جان سے۔“ انچارج نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔

”بس ظفر علی۔ یہ دولت دوستوں سے زیادہ دشمن پیدا کرتی ہے۔ لوگ نہ جانے کیوں۔ ایک دوسرے سے جلتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”حسد، بس حسد۔“ ظفر علی نے کہا۔

”اب ہمارے کچھ کرم فرما پھر ہمارے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گئے ہیں ہم کہتے ہیں کہ یہاں، مردوں کی طرح میدان میں آ کر لڑو۔ لیکن کوئی بزدل سامنے نہیں آتا۔ مذموم سازشوں کے جال بچھاتے رہتے ہیں۔ ایسی سازشیں جو ہمیں ہر طور سے پریشان کر دیتی ہیں۔“

”آپ صرف نام بتا دیں ان کا۔“

”یہ ہی تو ہم آپ سے کہہ رہے تھے۔ ظفر صاحب نام پتہ چل جائے تو بات ہی کیا ہے۔“

”پوشیدہ کردار کر رہے ہیں۔“

”ہاں۔“

”آپ مجھے تفصیل بتایئے۔“ انچارج نے کہا۔

”ایک انکشاف ہوا ہے۔ یہاں کوئی فراز کلینک ہے۔“

”جج۔ جی ہاں ہے۔“ انچارج نجانے کیوں اُلجھ گیا تھا۔

”اس میں کوئی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ شاید ڈاکٹر ماہ رخ ہے اس کا نام۔“

”جی۔ آپ فرمایئے۔“

”اب یہ تو میں نہیں جانتا کہ اسے کس نے ہمارے خلاف بھڑکایا ہے۔ لیکن پچھلے کئی دنوں سے وہ ہمیں بلیک میل کر رہی ہے۔ کہتی ہے کہ ہماری عزت دو کوڑی کی کر دے گی۔“

”ارے۔ لیکن کیوں؟“

”کچھ چاہتی ہو گی بھئی، کھل کر کہتی تو اس کی آرزو پوری کر دیتے ہمارا کیا بگڑتا لیکن۔“

”لیکن کیا؟“

”وہ ہمیں صرف بدنام کرنا چاہتی ہے۔“

”یہ اتنا آسان تو نہیں ہو سکتا۔ آپ بس حکم کریں۔“

”نہیں ظفر علی۔ ہم نے آج تک کسی بکری کے بچے کو بھی نقصان نہیں پہنچایا۔ کسی کو تکلیف دینا ہمارا مسلک نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں چاہتے کہ کوئی ہمیں کرب میں مبتلا کرے۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا نواب صاحب! آپ کا خادم زندہ ہے۔“

”بڑا بھروسا کرتے ہیں ظفر علی آپ پر ہم۔ ہم نے بات آپ کے کانوں تک پہنچا دی۔ خیال رکھئے گا۔ اگر آپ تک بات پہنچے تو اسے دیکھ لیجئے گا۔“

”آپ بے فکر رہیں جناب۔“

”بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ آپ ہماری یہ شکایت درج ہی کر لیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں۔ تو۔ ورنہ پھر سب کچھ آپ پر منحصر ہے۔“

”میری درخواست ہے کہ آپ یہ شکایت درج نہ کرائیں۔ آپ نے مجھے یہ خبر کر دی کافی ہے۔ بات مجھ تک آنے دیں۔ پھر میں دیکھ لوں گا۔ جو بھی صورت حال سامنے آئی اسے الٹا کر دوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔“

”چلیئے ٹھیک ہے۔ البتہ اگر کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو تو آپ ایک کام تو کریں۔“

”حکم نواب صاحب۔“

”اس لیڈی ڈاکٹر کے مکمل کوائف ہمیں فراہم کریں۔ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ تعلق کہاں سے ہے؟ خاندان کون سا ہے؟ اصل میں اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس کی پشت پر کون ہو سکتا ہے؟“

”صاحب یہ میری ذمے داری ہے۔“

”بس ٹھیک ہے۔ ہم بے فکر ہو گئے۔ اچھا بہت بہت شکریہ اجازت۔“

”بہت بہتر آپ آرام کریں۔“ انچارج اسے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ گاڑی میں اس کے مسلح گارڈ بیٹھے ہوئے تھے۔ انچارج کا سلام لے کر عرفان علی نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اور گاڑی تھانے کی عمارت کے احاطے سے باہر نکل گئی۔ انچارج اپنی جگہ خاموشی سے کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر وہ واپس مڑا تو اس نے سب انسپکٹر نواز علی کو پیچھے کھڑے پایا۔

”کیا بات ہے نواز علی؟“

”بھیڑیا دیکھ رہا تھا۔ سر۔ یہ خونی درندے کس طرح آبادیوں میں گھسے پھرتے ہیں اس پر حیرت ہوئی ہے۔“

”اپنے جذبات پر قابو رکھو۔ نواز علی۔ بال بچوں والے ہو۔ ایسے لوگ خونی ہوتے ہیں اپنے مخالفوں کو تباہ کر دینا ان کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔“

”جانتا ہوں۔ سر!“ نواز علی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”آؤ...... ظفر علی نے کہا۔ وہ کسی فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ آفس میں داخل ہو کر اس نے کہا ”نواز علی، ڈاکٹر فراز کو جانتے ہو۔ فراز کلینک والے۔“

”کیوں نہیں سر! وہ فرشتہ صفت آدمی ہیں۔

مجھے یاد ہے۔ بیگم صاحبہ کا کیس۔ انہوں نے کس طرح رات دن ایک کردیا تھا۔"

"ان کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔ نواز علی انہوں نے میری بیوی کو نئی زندگی دی تھی۔"

"بات کیا ہے۔ صاحب جی؟"

"میرے خیال میں وہ خطرے میں ہے۔ کچھ کرنا پڑے گا۔ اس کے لئے۔" ظفر علی نے کہا پھر اس نے مختصراً نواز علی کو پوری تفصیل بتادی۔

"سر جی۔ یہ سب کچھ بے مقصد نہیں ہوسکتا۔ کوئی جال بُن رہا ہے۔ ان کے خلاف۔"

"ضمیر بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ نواز علی۔ کوئی ترکیب نکالو کچھ کرنا پڑے گا۔" ظفر علی نے سوچتے ہوئے کہا۔ اور دونوں کے چہرے غور وفکر میں ڈوب گئے۔

☆......☆......☆

"یہ آج ڈاکٹر ماہ رخ کہاں غائب ہے۔ ناشتا نہیں کرے گی۔ کیا، رات کو کچھ ایسی تھکی ہوئی تھی کہ جلد سوگئی۔ اور میں نے اسے نہیں دیکھا۔"

"ڈاکٹر صاحبہ، ڈاکٹر ماہ رخ تو رات کو واپس ہی نہیں آئیں۔" نرس جمیلہ نے کہا۔

"کیا؟"

"صاحب، ہم لوگ بہت دیر انتظار کرتے رہے۔ پھر سوگئے۔ میں نے فرزانہ سے کہہ دیا تھا کہ ذرا خیال رکھے۔ آج ڈاکٹر ماہ رخ کو دیر ہوگئی۔ ہوسکتا ہے۔ کلینک میں کوئی کام ہو۔"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ آج تو اسے اپنے گھر جانا تھا۔ رات کو تو وہ کہہ رہی تھی۔ کہ میں جلدی واپس آجاؤں گی تیاریاں بھی کرنی ہیں۔ کہاں رہ گئی وہ اور ایسا تو آج تک کبھی نہیں ہوا۔ کہ ڈاکٹر فراز نے اسے رات کو روک لیا ہو۔"

ڈاکٹر نرگس دیر تک سوچتی رہی اور اس کے بعد ٹیلی فون کی جانب بڑھ گئی کلینک میں فون کیا۔ اور استقبالیہ سے بات ہوئی۔

"میں ڈاکٹر نرگس بول رہی ہوں۔"

"جی ڈاکٹر صاحبہ۔" دوسری طرف سے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"یہ ڈاکٹر ماہ رخ کہاں ہے؟"

"جی وہ تو یہاں نہیں ہیں۔"

"کیا جاچکی ہے؟"

"جی میرے علم میں نہیں۔ شاید رات ہی کو چلی گئی تھیں۔"

"کلینک میں نہیں ہے وہ؟"

"نہیں جی بالکل نہیں۔"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔؟"

"جی ڈاکٹر صاحبہ، خیریت؟" لڑکی نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"وہ واپس نہیں آئی۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی رات کو وہ واپس نہیں آئی۔"

"نہیں جی، کلینک میں تو نہیں۔ آپ کہیں تو ڈاکٹر جنید سے پوچھ لوں۔"

"پلیز! ذرا پوچھو۔ اور مجھے بتاؤ۔ میں ہولڈ کیے ہوئے ہوں۔"

"جی میں ابھی بتاتی ہوں۔ آپ کو۔"

"تھوڑی دیر کے بعد استقبالیہ کلرک کی آواز سنائی دی۔

"نہیں جی رات کو وہ چلی گئی تھیں۔ یہاں سے جیسے جاتی ہیں معمول کے مطابق چلی گئی تھیں۔

"ارے پھر کیا ہوا۔ وہ یہاں تو نہیں آئی؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحبہ یہاں ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر فراز تو نہیں آئے ابھی؟"

"نہیں اتنی جلدی وہ کہاں آجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نرگس نے کہا۔ اور سلسلہ منقطع کرکے ڈاکٹر فراز کے گھر ٹیلی فون کرنے لگی۔ ڈاکٹر فراز کا قیام بھی کلینک کے پیچھے حصے میں ہی تھا۔ اور انہوں نے گھر میں الگ ٹیلی فون لگوا رکھا تھا۔ ٹیلی فون ڈاکٹر فراز نے ہی ریسیو کیا تھا۔

"ہیلو..... میں ڈاکٹر نرگس بول رہی ہوں۔"

"ہاں..... نرگس خیریت؟ کوئی مریض ہے کیا؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب میں گھر سے بول رہی ہوں۔"

"کہو کیا بات ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب وہ ڈاکٹر ماہ رخ رات کو واپس نہیں آئی۔"

"کیا.....؟"

"جی وہ رات کو گھر واپس نہیں آئی۔ میں سمجھی شاید آپ نے روک لیا ہو۔ لیکن کلرک بتاتی ہے کہ وہ رات ہی کو چلی گئی تھی۔ اور کلینک میں بھی نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر ماہ رخ"، ڈاکٹر فراز کے لہجے میں ایک عجیب سا احساس تھا۔

"ڈاکٹر صاحب یہ بات بالکل طے ہے۔ کہ وہ رات کو یہاں نہیں آئی۔"

"کیا بات کرتی ہیں ڈاکٹر نرگس اسے تو آج اپنے گھر جانا تھا۔ بہت مضطرب اور بے چین تھی۔ وہ اپنے گھر جانے کے لئے۔ کہیں چلی تو نہیں گئی۔ ذرا معلوم کرو۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب، ایسے بھلا جاسکتی ہے وہ!"

"اوہ...... تعجب کی بات ہے۔ اچھا یوں کرو کہ ذرا صحیح معلومات حاصل کرنے کے بعد کلینک پہنچو۔ میں بھی پہنچ رہا ہوں۔"

"جی اچھا۔"

پھر کافی دیر کے بعد ڈاکٹر نرگس تمام تر معلومات اکٹھی کرکے کلینک پہنچ گئیں ڈاکٹر فراز وہاں موجود تھے۔ پورے کلینک میں چہ میگوئیاں ہورہی تھیں۔ کیونکہ ڈاکٹر فراز نے آتے ہی ڈاکٹر ماہ رخ کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ لیکن یہاں بھی ایک انوکھی بات سامنے آئی تھی۔

ایمبولینس ڈرائیور نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر ماہ رخ معمول کے مطابق کلینک سے گھر کی جانب روانہ نہیں ہوئی اس نے کہا تھا۔ کہ رات کو تو ڈاکٹر ماہ رخ سے اس کی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔

"لیکن ایمبولینس تو گئی تھی رات کو؟"

"نہیں صاحب جی گاڑی تو وہیں کی وہیں کھڑی ہوئی ہے۔"

"اور تم نے یہ پوچھا بھی نہیں کہ ڈاکٹر ماہ رخ گھر واپس جائے گی یا نہیں؟"

"صاحب جی! ایسا کبھی نہیں ہوا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحبہ کو جانا ہوتا تھا تو وہ ہم سے کہہ دیتی تھیں۔"

"مگر یہ تو روز کا معمول تھا۔"

"صاحب جی ہم نے غور ہی نہیں کیا۔"

"ڈاکٹر نرگس کو دیکھ کر ڈاکٹر فراز اس کی طرف پلٹا تھا۔

"ہاں۔ نرگس کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں سر۔ اس کا سامان پیک رکھا ہوا ہے۔ کچھ چیزیں اس نے اپنے گھر لے جانے کے لئے خریدی تھیں۔ ان کے پیکٹ بھی وہیں رکھے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا ٹکٹ رکھا ہوا ہے۔"

"تب وہ کہاں گئی؟"

"سر مجھے کچھ بھی نہیں معلوم اس کے بارے میں۔"

"اب تو میں اس سلسلے میں تشویش کا شکار ہوگیا ہوں۔ جس قدر ذمے دار شخصیت کی مالک ہے۔ وہ اس کے بعد تو یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ اس طرح کہیں غائب ہوجائے۔"

"اور وہ بھی پوری رات سر!"

"کیا ہوسکتا ہے۔"

"سر میں خود حیران ہوں۔"

"بہرحال انتظار کرنا پڑے گا۔ رات تک اگر وہ واپس نہ آئی تو پھر کچھ کرتے ہیں اس کے گھر کا ایڈریس ہے تمہارے پاس؟"

"جی میرے پاس ہے۔"

"مجھے دو۔"

"اور ڈاکٹر نرگس نے ڈاکٹر ماہ رخ کے گھر کا پورا پتہ ڈاکٹر فراز کو بتادیا پھر رات تک انتظار کیا گیا کوئی ایسی

کارروائی نہیں کی گئی تھی جو ڈاکٹر ماہ رخ کے لئے مشکل کا باعث بن جائے۔ جیسے پولیس میں اس کے بارے میں رپورٹ وغیرہ درج کرنا، پہلے اس سلسلے میں تحقیقات کرلی جائیں کہ واقعہ کیا ہوا ہے؟ جب رات تک اس کا کوئی پتہ نہیں چلا تو ڈاکٹر فراز نے دوسرے دن وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ حالانکہ کلینک کو چھوڑ کر جانا ایک مشکل امر تھا۔

ماہ رخ ظاہر ہے۔ دوسرے شہر جاتا تھا۔ وقت اچھا خاصا لگ جاتا لیکن ڈاکٹر فراز کو ڈاکٹر سے خاصی دلچسپی تھی۔ ویسے بھی وہ ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔ اور اس کے کردار کے بارے میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر فراز کو مجبوراً روانہ ہونا پڑا اور ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد آخرکار وہ پتہ وغیرہ معلوم کرکے ڈاکٹر ماہ رخ کے گھر پہنچ گیا۔

درمیانہ درجے کے اس مکان پر ایک نوعمر لڑکے نے ان کا استقبال کیا تھا۔

''میرا نام ڈاکٹر فراز ہے۔''

''جی کس سے ملنا ہے؟''

''ڈاکٹر ماہ رخ سے۔''

''باجی تو نہیں آئیں۔''

''کک..... کیا مطلب؟''

''انہیں آنا تھا۔ یہاں سب لوگ ان کا انتظار کررہے ہیں۔ اور پریشان ہیں۔ اماں بھی پریشان ہیں۔''

''میں تمہاری اماں سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم ڈاکٹر ماہ رخ کے بھائی ہوناں؟''

''جی۔''

''مجھے اپنی والدہ سے ملاؤ۔'' پھر ڈاکٹر فراز کی ملاقات فاخرہ بیگم سے ہوئی۔ فاخرہ بیگم کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر فراز کا نام سن کر فوراً ہی ان سے ملاقات کی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب ماہ رخ کو آنا تھا۔ یہاں اس کے سسرال والے بھی آئے ہوئے ہیں۔ سارے کے سارے پریشان ہیں۔ آج واپس جانے کو بھی کہہ رہے ہیں۔''

''فاخرہ بیگم ایک عجیب و غریب حادثہ ہوگیا ہے۔''

''کیا؟'' فاخرہ بیگم ششدر لہجے میں بولیں۔

''ڈاکٹر ماہ رخ کلینک سے معمول کے مطابق چلی تھیں۔ لیکن پھر وہ گھر نہیں پہنچیں ٹکٹ وغیرہ بھی خرید لیا تھا۔ اس نے لیکن اس کے بارے میں کوئی معلومات بھی حاصل نہیں ہوسکی۔ میں پریشان ہوکر یہاں آیا ہوں۔''

''کیا۔؟'' فاخرہ بیگم کا چہرہ فق ہوگیا۔ اس وقت ایک کرخت صورت مرد، ایک قبول صورت نوجوان اور ایک عمر رسیدہ خاتون اندر داخل ہوگئیں۔

''یعنی ڈاکٹر صاحب! وہ وہاں سے چلی تھی۔ اور یہاں نہیں پہنچی۔'' خاتون نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''آپ کون ہیں؟''

''میں اس کی ہونے والی ساس ہوں۔ یہ سسر، اور یہ شہریار ہے۔''

''کیا قصہ ہے ڈاکٹر صاحب، یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اتفاق سے ہم نے سن لیا۔ آپ ذرا یہ بتائیے، سارا قصہ کیا ہے؟''

''وہ جناب بس ذرا عجیب سی پریشانی ہے۔ پتا نہیں ڈاکٹر ماہ رخ کہاں غائب ہوگئیں ہیں؟''

''ہوں۔ کوئی پتہ نہیں ہے۔ آپ کو؟''

''نہیں جناب۔''

''معاف کیجئے گا ڈاکٹر صاحب! اصل میں وہ لڑکی ہمارے خاندان میں آرہی تھی۔ اور ہم اس کے بارے میں اتنا زیادہ جانتے بھی نہیں ہیں۔ یہ بس ہمارے صاحبزادے ہیں۔ جو کچھ زیادہ ہی اس سے متاثر ہوگئے ہیں۔ خیر یہ ایک الگ بات ہے۔ آپ تو بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ آپ کے ہاں کام کرتی تھی۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ اس کا کردار کیا تھا؟''

''آپ نہایت نامعقول آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں اس کے لئے پریشان ہوں۔ اور آپ اس کے کردار کی تفتیش کررہے ہیں۔ مجھ سے۔''

''آپ کی پریشانی برحق ہے۔ لیکن ہماری پریشانی بھی غلط نہیں ہے۔ بس تقدیر کا لکھا بھگت رہے ہیں۔ کم از کم آپ تو ہماری مدد کردیجئے۔''

''براہ کرم مجھے فاخرہ بیگم سے بات کرنے دیجئے۔ آپ اس کمرے سے باہر چلی جائیں۔''

''معاملہ دراصل ہم سے بھی متعلق ہے۔'' شہریار کے والد خاصے گھٹیا قسم کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ کہنے لگے۔ ''میرا نام جمال ہے اور میں ایک بڑا کاروباری ہوں۔ آپ براہ کرم مجھے ڈاکٹر ماہ رخ کے بارے میں تفصیلات بتایئے۔''

''فاخرہ بیگم آپ کے مہمان میرے لئے کچھ عجیب سی شخصیت کے مالک ثابت ہورہے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے تنہائی میں اپنی بیٹی کے بارے میں بات کیجئے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ.....؟''

''آیئے ڈیڈی۔ آیئے باہر آیئے۔ یہ کیا آپ لوگوں نے شروع کردیا۔'' شہریار نے ماں باپ سے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا چلو۔ ظاہر ہے کسی کے ذاتی معاملات میں ہم لوگ دخل انداز نہیں ہوسکتے لیکن ہمارے بھی کچھ ذاتی معاملات ہیں۔'' جمال صاحب نے کہا۔ اور باہر نکل گئے۔

شہریار انہیں چھوڑ کر واپس آگیا تھا۔ ''معاف کیجئے گا ڈاکٹر صاحب میں ماہ رخ کا منگیتر شہریار ہوں۔ براہ کرم آپ مجھے کچھ بتایئے۔''

''شہریار کوئی تفصیل نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کل جارہی ہے۔ اس کے منگیتر وغیرہ بھی آرہے ہیں اور بڑا اہتمام تھا۔ لیکن وہ نہ جانے کہاں چلی گئی؟ بات ہی کچھ سمجھ میں نہیں آرہی۔''

''تو پھر اب کیا کریں گے؟''

''ظاہر ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو اطلاع دے دی ہے۔ اس کے بعد اس کا انتظار ہی کرسکتا ہوں۔''

''براہ کرم آپ اس کے بارے میں ہم سے رابطہ رکھیں۔ یہ میرا ٹیلی فون نمبر ہے آپ مجھ سے رابطہ رکھیئے گا۔ میں بھی آپ سے رابطہ رکھوں گا۔ آپ براہ کرم مجھے اپنا ٹیلی فون نمبر دے دیجئے۔''

''جی..... ضرور، ویسے ایک بات بتاؤں شہریار صاحب، ڈاکٹر ماہ رخ جیسی لڑکی آپ کو شاید دوبارہ نہ مل سکے دعا کیجئے کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہوگئی ہو، ویسے میں بھی اس کی طرف سے غافل نہیں رہوں گا۔ لیکن براہ کرم جیسے ہی اس کے بارے میں علم ہو آپ فوراً اطلاع دیجئے گا۔''

''آپ مطمئن رہیں۔''

''مجھے اجازت دے دیجئے۔''

''ارے ڈاکٹر صاحب ابھی کچھ دیر تو بیٹھیں، کہاں جائیں گے؟''

''کلینک چھوڑ کر آیا ہوں۔ بھائی جس طرح سے بھی بن پڑا پہلی فرصت میں کلینک پہنچوں گا۔ آپ لوگوں کو اطلاع دینا ضروری تھا۔ اور اب آپ پر بھی یہ فرض لازم ہے کہ جونہی اس کے بارے میں کوئی اطلاع ملے مجھے فوراً اطلاع دیں ہوسکتا ہے۔ بعد میں ہمیں پولیس وغیرہ کا بھی سہارا لینا پڑے۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحب پلیز! ابھی آپ پولیس وغیرہ کے چکر میں نہ پڑیئے میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔ اس کے لئے اور میرے لئے جس قدر مشکلات پیدا ہوگئی ہیں آپ کو شاید اس کا اندازہ نہیں ہے۔'' شہریار نے کہا۔ بہرحال ڈاکٹر فراز وہاں سے اجازت لے کر رخصت ہوگیا تھا۔

شہریار کے لئے واقعی مشکلات پیدا ہوگئی تھیں۔ اصل میں وہ ڈاکٹر ماہ رخ سے محبت کرتا تھا۔ اور اس کے والد جمال احمد ایک بہت بڑے کاروباری تھے۔ بیٹے کے سلسلے میں ان کے ذہن میں بہت سے خواب تھے۔ وہ اسے اپنی پسند کی جگہ منسوب کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن میں یہ ہی خیال تھا کہ ان کا بیٹا جس حیثیت کا مالک ہے۔ انہیں اس کے ہم پلہ ہی رشتہ ملنا چاہئے۔ لیکن جب اس سلسلے میں شہریار سے معلومات حاصل کی گئیں تو اس نے نہایت صاف گوئی سے کہہ دیا۔ کہ اس نے اپنا سہارا تلاش کرلیا ہے۔

ماں باپ سے پوچھنے پر اس نے ڈاکٹر ماہ رخ کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔ ایک ڈاکٹر سے شادی

۔لیکن ڈاکٹر ماہ رخ کا جو پس منظر تھا۔ وہ ان کے لئے نا قابل قبول تھا۔ وہ کسی بڑے خاندان کی فرد نہیں تھی۔ اور اس بات سے نہ صرف جمال احمد صاحب کو اختلاف تھا۔ بلکہ ان کی بیگم بھی اس رشتے کی مخالف تھیں۔ لیکن بیٹے کی ضد سے مجبور ہو کر آخر کار انہیں ڈاکٹر ماہ رخ سے شہریار کی منگنی کرنا پڑی۔

لیکن ماں باپ دونوں اس رشتے سے خوش نہیں تھے۔ اس چھوٹے سے خاندان میں بھلا شادی کا کیا تصور کیا جا سکتا تھا۔ جو اپنی کفالت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور بیٹی کے شانوں پر گزارہ کر رہا تھا۔ لیکن بہرحال بیٹے کی ضد، کے آگے انہوں نے سر جھکا دیا۔ شہریار ہی اس وقت ان لوگوں کو یہاں لایا تھا۔ اس کو ڈاکٹر ماہ رخ کے بارے میں تمام تفصیلات معلوم تھیں۔ کہ وہ اس وقت کہاں کام کر رہی ہے؟ لالہ جان۔ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ لیکن بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

شہریار نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا۔ کہ شادی کے بعد وہ ڈاکٹر ماہ رخ کے لئے اپنے سرمائے سے کلینک کھولے گا۔ اور والدین کی تمام آرزوئیں پوری کر دے گا۔ خود بھی وہ اپنے طور پر اچھا نوجوان کاروباری شمار ہوتا تھا۔ اور پھر وہ یہاں آ گئے تھے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد جو کچھ واقعات پیش آئے تھے۔ وہ شہریار کے لئے انتہائی پریشان کن تھے۔

ڈاکٹر فراز کے چلے جانے کے بعد جمال احمد صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تو کہاں گئی تمہاری ڈاکٹر ماہ رخ؟"

"نہ جانے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ڈیڈی، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"دیکھو بیٹے دنیا کو میں نے تم سے بہت زیادہ دیکھا ہے۔ اور بہرحال تجربے کی آنکھ بہت وسیع ہوتی ہے۔ جو لڑکیاں گھر سے باہر نکل جاتی ہیں۔ اور وہ بھی اس طرح کہ انہیں شام کو گھر واپس نہ آنا پڑے ان کا طرز زندگی بہت بدل جاتا ہے۔"

"مہذب الفاظ میں آپ اسے ایک بازاری لڑکی کہنا چاہتے ہیں؟"

"حالانکہ تمہارے سامنے مجھے مہذب بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بہرحال تمہارے کہنے سے میں نے اس لڑکی کو اپنی عزت و آبرو کی شکل میں اپنے گھر میں دیکھنا تھا۔ بتا سکتے ہو۔ اس وقت میری عزت و آبرو کہاں ہے؟" جمال احمد نے سخت لہجے میں کہا۔

اور شہریار کے چہرے پر خجالت کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے خود پر قابو پا کر کہا۔

"ڈیڈی ہو سکتا ہے۔ اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔"

"جن لڑکیوں کو گھر سے باہر حادثے پیش آ جاتے ہیں اس کے بعد تمہارا خیال کیا ہے۔ کیا وہ شریف گھرانوں کی بہو بننے کے لائق رہ جاتی ہیں؟"

"آپ بالکل غیر اخلاقی باتیں کر رہے ہیں ڈیڈی۔"

"اور تم انتہائی احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔ بہت ہو گیا شہریار۔ اب یہ سب کچھ میرے لئے نا قابل برداشت ہے۔ مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو ڈاکٹر فراز اس کی تلاش میں کیوں آیا تھا؟"

"آپ کے علم میں تمام باتیں ہیں۔"

"جو باتیں میرے علم میں ہیں۔ وہ مجھے بہت دور تک لے جا رہی ہیں۔ فرض کرو۔ اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ تو اگر ایک نوجوان لڑکی کو کوئی حادثہ پیش آتا ہے۔ تو اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟"

"آپ خدا کے لئے خاموش ہو جایئے۔ ڈیڈی میں خود بے حد پریشان ہوں۔"

"ہم بھی تمہاری اس بے وقوفی کی وجہ سے بہت پریشان ہیں شہریار۔ تمہیں اس بارے میں سوچنا ہوگا۔ اور اس کے بعد سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔"

"دیکھئے ڈیڈی پلیز! ممی آپ انہیں سمجھایئے۔ اس وقت آنٹی پر کیا گزر رہی ہوگی۔ چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں اس کے۔"

"تو میاں۔ سب کو پالو گے کیا؟" جمال احمد

نے طنزیہ لہجے میں کہا اور شہریار کمرے سے باہر نکل گیا۔ لیکن اس کی پریشانی عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ ادھر فاخرہ بیگم کی بری حالت تھی۔ وہ کسی ویران لق و دق صحرا کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں فضا میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ بیٹی پر انہوں نے جو محنت کی تھی۔ اس کے بارے میں ان کا دل ہی جانتا تھا۔ اس کے بعد بیٹی کے حسین مستقبل کے لئے انہوں نے نجانے کیا کیا خواب دیکھے تھے۔ مجبور تھیں بیچاری بالکل مجبور تھیں۔ ورنہ کون اپنی آنکھوں کے نور کو آنکھوں سے جدا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ماہ رخ ان کے گھر کا ستون تھی۔ اور اب یہ گم شدہ ستون نہ جانے کہاں تھا۔؟

بہرحال شہریار ان سے کوئی ایسی بات نہ کہہ سکا جس سے ان کی دلجوئی اور دلسوزی ہوتی۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ پھر جس طرح یہاں وقت گزرا اسے وقت گزارنے والوں کا دل ہی جانتا تھا۔ فاخرہ بیگم سارا دن اور ساری رات دروازے پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی تھیں اور نہ جانے کیسے کیسے وسوسے میں مبتلا رہی تھیں۔ جمال احمد اور ان کی بیگم اپنے کمرے میں گھسے رہے۔ شہریار ایک الگ گوشے میں رہا۔ اور وہ بھی تقریباً ساری رات جاگتا ہی رہا تھا۔ لیکن فاخرہ بیگم کی کیفیت سے وہ بہت افسردہ تھا۔ رشتہ ایسا تھا کہ وہ انہیں کوئی تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اور بہرحال ماں باپ کا معاملہ بھی تھا۔ بڑا عجیب مسئلہ تھا۔ وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں وقت گزارتا رہا تھا۔ پتہ نہیں کس کس پر کیا گزر رہی تھی۔ بہرحال فاخرہ بیگم کی حالت ہر لمحے مزید خراب ہوتی جا رہی تھی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو خون جگر دے کر پروان چڑھایا تھا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ، نہ جانے کہاں تھی۔ وہ......

پھر دوسرے دن جمال احمد صاحب نے واپسی کا پروگرام بنا لیا۔ اور وہ شہریار کو لے کر چلے گئے۔ شہریار، فاخرہ بیگم کو تسلی بھی نہیں دے سکا تھا۔ اور فاخرہ بیگم ایک عجیب و غریب مشکل میں گرفتار ہو گئی تھیں۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ ڈاکٹر ماہ رخ کو غائب ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ڈاکٹر ماہ رخ کے بارے میں ہزار کوششوں کے باوجود کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ لیکن فاخرہ بیگم کا دل گواہی دیتا تھا کہ ماہ رخ زندہ ہے۔ اور وہ ضرور واپس آئے گی۔ وہ دن رات اپنی بیٹی کے لئے دروازے پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہتی تھیں۔ ملنے جلنے والوں کو بھی اس بات کا علم ہو گیا۔ تھا کہ ڈاکٹر ماہ رخ پراسرار طور پر گم ہو گئی ہے۔ اور اس کا کوئی پتہ نہیں چل رہا ہے۔

بہرحال اس سلسلے میں افواہیں بھی پھیل رہی تھیں۔ اور افواہوں کو کون روک سکتا ہے۔ پھر ایک رات فاخرہ بیگم اداس بیٹھی ہوئی تھیں کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اور ان کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دستک کچھ جانی پہچانی سی تھی۔ فاخرہ بیگم جلدی سے اٹھ کر دروازے کی جانب دوڑیں۔

اور انہوں نے دروازہ کھولا تو ان کی توقع کے مطابق ڈاکٹر ماہ رخ ایک سیاہ شال میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی۔

دروازہ کھلتے ہی وہ اندر داخل ہوئی۔ اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ فاخرہ بیگم کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ انہوں نے ایک چیخ ماری اور ماہ رخ سے لپٹ گئیں۔ تب انہیں احساس ہوا کہ ڈاکٹر ماہ رخ کی اس کالی اوڑھنی کے پیچھے کوئی اور بھی ہے۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئیں۔ اوڑھنی کا ایک حصہ کھلا تو ڈاکٹر ماہ رخ کے سینے سے لپٹا ہوا ایک ننھا سا بچہ انہیں نظر آیا۔

فاخرہ بیگم کو ایک دم یوں محسوس ہوا جیسے وہ بچہ نہیں بلکہ ڈاکٹر ماہ رخ کے سینے سے لپٹا ہوا کوئی سانپ ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگیں۔ پھر ان کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"ماہ...... ماہ...... رخ...... یہ......"

"کچھ نہیں اماں...... مجھے ذرا سنبھل تو جانے دو۔"

"مم...... مم مگر یہ......؟"

"چلو اندر چلو یا یہیں پر کھڑی رہو گی۔" ماہ رخ نے کہا۔ اور بچے کو سینے سے لگائے آگے بڑھ گئی۔ پھر وہ دالان میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ فاخرہ بیگم خاموش کھڑی ہوئی تھیں۔ جب ماہ رخ اطمینان سے بیٹھ گئی تو وہ بولیں۔

پچھ......؟"

"اماں تم تو ایسے بات کررہی ہو۔ جیسے تمہیں مجھ پر کوئی شک ہو؟"

"اب بھی شک کا کوئی پہلو رہ گیا ہے؟" فاخرہ بیگم کی ٹوٹی ہوئی آواز ابھری۔

"کیا کہنا چاہتی ہو۔ اماں؟" ڈاکٹر ماہ رخ نے کہا۔

"میں...... میں کیا کہوں گی ماہ رخ۔ جو کچھ کہنا تھا دنیا کہہ چکی ہے۔ اور اب دنیا کی تمام باتوں کی تصدیق ہوجائے گی۔"

"آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے اماں۔ آپ۔ آپ مجھ پر الزام لگارہی ہیں۔"

"ماہ رخ کیسے ہوا یہ سب کچھ۔ کیوں کیا تو نے یہ سب کچھ۔ کیا، کیا دوسرے لوگ سچ کہتے تھے؟"

"کیا کہتے تھے؟" ماہ رخ نے خونی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ اسی وقت بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اور ڈاکٹر ماہ رخ اسے بہلانے لگی۔ فاخرہ بیگم نے رونا شروع کردیا تھا۔

انہیں یقین ہوتا جارہا تھا کہ یہ بچہ ماہ رخ کا ہی ہے۔ لوگ سچ کہہ رہے تھے۔ "وہ بدکردار ہے...... وہ بدکردار ہے۔"

ادھر ڈاکٹر ماہ رخ حیران تھی کہ اتنے عرصے کی جدائی کے بعد ماں کا جو رویہ ہونا چاہئے تھا۔ وہ نہیں ہے۔ وہ جن جن مشکلات سے گزری تھی۔ اس کے بارے میں اس کا دل ہی جانتا تھا۔ جس طرح اپنے آپ کو روپوش کرتی پھری تھی۔ اس کی ایک طویل کہانی تھی۔ ماں نے اس سے اس کی داستان پوچھنے کے بجائے اس پر الزامات لگانے شروع کردیئے تھے۔ اس بات نے اس کے دل کو شدید دھچکا پہنچایا تھا۔ اور اب وہ یہ سوچ رہی تھی۔ کہ "ماں بھی کچھ بتانے کے قابل نہیں ہے۔"

بہرحال یہ اس کا ٹھکانا تھا۔ وہ اپنی بپتا کسی کو بھی نہیں سنانا چاہتی تھی۔ جو گزری ہے۔ اس سے خود ہی

[illegible] سمجھنا ہوگا۔ جیسا بھی ہوسکے۔ جس طرح بھی ہو [illegible] ماں کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ ایسے [illegible] میں پاس پڑوس کے لوگ ایک دوسرے کے گھروں [illegible] کچھ زیادہ ہی دل چسپی رکھتے ہیں۔ اور پھر یہ [illegible] تو تمام لوگوں کو ہی معلوم تھی کہ ڈاکٹر ماہ رخ پراسرار طور پر غائب ہوگئی ہے۔ اور یہ گھرانہ بے آسرا ہوگیا ہے۔

دوسری صبح ڈاکٹر ماہ رخ کے چھوٹے بھائی نے بہن کو دیکھا تو خوشی سے اس سے لپٹ گیا۔

"تم آگئیں باجی۔ تم آگئیں۔"

"ہاں...... میں آگئی ہوں۔"

"یہ...... یہ کتنا پیارا بچہ ہے۔ یہ کس کا ہے۔ کیا تمہارا ہے باجی؟"

"ایسا۔"

"کیا یہ تمہارا بچہ ہے باجی؟"

"ہاں۔ میرا ہی سمجھ لو......" اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور بچہ خوشی سے اچھلتا ہوا چلا گیا۔ "باجی اپنے بچے کے ساتھ آئی ہے۔ باجی اپنے بچے کے ساتھ آئی ہے۔"

بچے کی زبان اور گھر کے دروازے۔ ساتھ والی پڑوسن نے دروازے سے اندر داخل ہوکر کہا۔

"اے فاخرہ بیگم! کیا سن رہی ہوں میں؟" پھر فاخرہ بیگم کے افسردہ چہرے کو دیکھ کر وہ خاتون پھر بولیں۔

"بی بی! بیٹیوں کی کمائی کوئی شریف آدمی تو نہیں کھاتا، چاہے کتنا ہی عزت کا مقام دیا جائے انہیں۔ لیکن جب جوان لڑکیاں گھروں سے باہر رہتی ہیں تو بس پھر کیا کیا جائے۔ ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ کیا واقعی جو کچھ سنا ہے میں نے سچ ہے؟"

"آپ اپنے گھر جائیے۔ کیا یہ سب مناسب ہے؟"

"میں تو خیر چلی جاؤں گی بہن۔ لیکن بہرحال مجھے افسوس ہے۔ میں تمہیں اسی دن کے لئے سمجھایا کرتی تھی۔"

"بھئی آپ اپنے گھر جائیے۔" فاخرہ بیگم نے

نخی سے کہا۔ اس کے بعد یہ بات محلے میں پھیل گئی۔ اور اڑتے اڑتے یہ بات جمال احمد صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ جمال احمد صاحب نے بڑے طنزیہ انداز میں شہریار کو اس سلسلے میں مبارک باد دی تھی۔ اور کہا تھا۔

"لو میاں! بہو بیگم ماشاءاللہ صاحب اولاد ہوگئی ہیں۔ وہاں سے اطلاع ملی ہے۔"

"آپ کو شرم نہیں آتی ڈیڈی ایسا کہتے ہوئے۔"

"بکواس کرتا ہے۔ مجھ سے زبان چلاتا ہے۔ شرم مجھے آنی چاہئے کہ تجھے۔ بے غیرت انسان جس لڑکی سے تو منگنی کیئے بیٹھا ہے۔ اب وہ بچے کی ماں بن گئی ہے۔"

"کیا وہ آپ کے پاس بچے کو لے کر آئی تھی؟"

"وہ تو نہیں آئی تھی۔ لیکن تو خود وہاں جاکر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔"

شہریار شدید غصے کے عالم میں ڈاکٹر ماہ رخ کے گھر پہنچا تھا۔ اسے کرید تو لگی ہوئی تھی۔ اور اس نے اس سلسلے میں کافی معلومات بھی حاصل کی تھیں۔ وہ وہاں پہنچا تو اسے سب سے پہلے فاخرہ بیگم ہی نظر آئیں۔ اور فاخرہ بیگم کا چہرہ دیکھتے ہی اسے اس بات کی صداقت کا یقین آگیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جمال احمد کے کانوں تک پہنچی ہوئی بات غلط ہے۔ ڈاکٹر ماہ رخ نے شہریار کو دیکھا تو سسکتی ہوئی سامنے آگئی۔

"شہریار۔ تم کیا کہتے ہو؟"

"بچہ کہاں ہے؟" شہریار نے سرد لہجے میں کہا۔

"اندر سو رہا ہے۔"

"ہوں! لیکن ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے۔ تمہارا؟"

"ماہ رخ اگر ایسی کوئی بات تھی تو مجھے بتادیتیں۔"

"کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"ایسا اچانک تو نہیں ہوتا۔"

"وہ میرا بچہ نہیں ہے۔ شہریار۔ حماقت کی باتیں مت کرو۔"

"تو پھر کس کا بچہ ہے؟"

"یوں سمجھ لو بن ماں کا بچہ ہے۔ کوئی ماں نہیں ہے اس کی۔"

"ماہ رخ تمہارے چہرے سے تمہارے جھوٹ کا بھرم کھل رہا ہے۔ آخر کون ہے اس کی ماں۔ کون ہے اس کا باپ۔ کیا ڈاکٹر فراز کو اس کا علم ہے؟"

"ڈاکٹر فراز؟"

"ہاں۔ تمہارے باس۔ اس اسپتال کے مالک جہاں تم کام کرتی ہو۔"

"نہیں شہریار کسی کو علم نہیں ہے۔ اس کے بارے میں۔ ابھی میں اس کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتاسکتی۔"

"ماہ رخ ایک جھوٹ چھپانے کے لئے ہزاروں جھوٹ بولنے پڑتے ہیں ایسے جھوٹ چھپائے ہی جاتے ہیں۔ اگر تم اس حد تک کہیں نکل گئی تھیں تو کم از کم اپنے گناہ کی اس نشانی کو ختم کرنے کے بعد ہی یہاں آئی ہوتیں۔"

"تم بھی وہی باتیں کررہے ہو۔ جو سب لوگ کررہے ہیں۔"

"میرے باتیں کرنے یا نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تم دنیا کو لاکھ بتاتی پھرو لیکن دنیا جو کچھ سمجھے گی یا جو کچھ کہہ رہی ہے۔ اسے کیسے جھٹلا سکو گی۔"

"خدا کے لئے بات تو سن لو میری۔ مجھے بات کرلینے دو۔"

"بے کار۔ بالکل بے کار ہے۔ ویسے تم نے بہت بڑا صدمہ پہنچایا ہے مجھے میں کیا سنوں اور کیا کہوں، میرے والدین تو پہلے ہی اس شادی سے برگشتہ تھے، نہ جانے کیسے کیسے میں نے انہیں تمہارے باکردار ہونے کا یقین دلایا تھا۔ وہ سب کچھ بھلانے پر تیار ہوگئے تھے۔ لیکن اس کے بعد ماہ رخ کیا اس کے بعد بھی کوئی گنجائش ہے؟"

"اس کا فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ شہریار۔"

سمجھے، اندھا، لونگا، اور بہرہ مت سمجھو۔انسان ہوں۔مرد ہوں اور مرد کا عورت پر ایک ہی مان ہوتا ہے۔اگر وہ مان ٹوٹ جائے تو اور پھر تم جو کچھ کہو۔دنیا جو کچھ کہے گی۔وہ الگ ہی ہوگا۔''

''مجھے دنیا کی فکر نہیں ہے۔تم اپنی بات کرو۔''

''میں بھی اسی دنیا کا ایک حصہ ہوں۔ماہ رخ۔''

''اوکے، اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے۔شہریار میں تمہیں دوسروں سے مختلف سمجھتی تھی۔مگر تم بزدل انسان ہو۔حقیقتوں سے نگاہیں چرانے والے، میں جن حالات کا شکار ہوئی ہوں ان میں سچ جانو......اپنے گھر کے بعد میری نگاہیں تمہاری جانب اٹھ رہی تھیں۔میں سمجھتی تھی۔کہ تم مجھے سہارا دو گے۔لیکن ایک شخص جو دنیا کی باتوں پر توجہ دے اس پر یقین کرے۔اور اپنی معذوری کا اظہار کردے کبھی بہتر محافظ ثابت نہیں ہوسکتا۔لہٰذا تم یہاں سے فوراً دفعان ہوجاؤ۔میں بے گناہ ہوں۔اور تم بزدل ہو۔تم اور تم جیسے بہت سے دوسرے لوگ حقیقتوں کو جانے بغیر صرف وہ کرتے ہیں۔جو ان کے اپنے ذہن میں آئے تم جاسکتے ہو۔''

شہریار، ماہ رخ کی یہ کیفیت دیکھ کر متاثر ہوا تھا۔چند لمحات وہ اسے دیکھتا رہا۔پھر بولا۔

''مجھے بتاؤ......آخر کوئی تو ہوگا۔اس بچے کا باپ، کوئی تو ہوگی اس کی ماں؟ لیکن تم ماں کی طرح اسے سینے سے لگائے ہوئے ہو۔ڈاکٹر ماہ رخ میں نے بہت سی ڈاکٹر لڑکیاں دیکھی ہیں۔ایک عجیب سا عزم ہوتا ہے۔ان کے چہرے پر۔ایک انوکھا غرور۔لیکن معاف کرنا تمہارے چہرے پر ایک جرم نظر آرہا ہے۔پھر بھی مجھے پوری بات بتاؤ؟''

''جاؤ......شہریار اب یہاں رکنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔میں اپنے گھر آئی تھی یہ سوچ کر کہ یہ میری پناہ گاہ ہے۔لیکن پناہ گاہ نہیں ہے۔میں یہ گھر بھی چھوڑ رہی ہوں۔جلد ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔لیکن مجھے ابھی نہیں بتانا۔ہاں۔جاؤ اور اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ آخر کار ایک دن اصل حقیقت دنیا کے سامنے آئے گی۔تمہارے سامنے بھی۔''

''ماہ رخ ہم وقت کے ہاتھ نہیں پکڑ سکتے۔دنیا کی زبان نہیں پکڑ سکتے۔میں بہر حال کوشش کروں گا کہ وقت کا انتظار کروں۔دیکھوں گا۔حالات کون سا رخ اختیار کرتے ہیں۔بہر حال میں چلتا ہوں۔''

شہریار وہاں سے نکل گیا۔ڈاکٹر ماہ رخ اسے دیکھتی رہی۔پھر اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں۔اس نے بچے کو سینے سے لگایا۔اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر خاموشی سے گھر سے باہر نکل گئی۔

اس کا رخ کس جانب تھا۔یہ اندازہ نہیں ہوسکا۔لیکن خیال کی آنکھوں نے زمین ہلتی ہوئی دیکھی۔اور یوں لگا جیسے زمین نے اپنا رخ بدل لیا ہو۔وہ جو نظر آرہا تھا۔وہ ماضی کا قصہ پارینہ اور زمین جس انداز میں اپنا رخ تبدیل کررہی تھی اس میں نیا ماحول نظر آرہا تھا۔یہ گردشیں، ذہن کو لرزاتی رہیں۔اور ایک بار پھر سفید محل کا دروازہ نگاہوں کے سامنے عریاں ہوگیا۔ہاں یہ وہی سفید محل تھا۔لیکن ماضی میں جو کچھ نظر آیا تھا۔اس کا حال اس سے مختلف تھا۔زیادہ ویران، زیادہ خراب، اس سے کچھ فاصلے پر جو ایک چھوٹی سی جگہ بنی ہوئی تھی۔وہاں اس وقت عجیب تماشا ہورہا تھا۔

اس جگہ کے چاروں طرف بڑی بڑی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ایک جھونپڑی نما احاطہ بنا ہوا تھا۔اور اس احاطے کے درمیان ایک انسانی جسم چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔جس کے اوپر سفید چادر پڑی ہوئی تھی۔اور اس چادر کے نیچے کوئی گہری نیند سو رہا تھا۔نہ جانے کون لیکن اس سے تھوڑے فاصلے پر نعمان بابا ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا سنبھالے متفکر بیٹھا ہوا تھا۔

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کی آنکھیں دور دور تک کا جائزہ لینے لگتی تھیں۔اور گھور اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔البتہ آسمان پر چمکنے والا چاند حسرت کی نگاہوں سے اس بوسیدہ عمارت کو دیکھ رہا تھا۔جو کبھی صحیح معنوں میں سفید محل کہلاتی تھی۔

لیکن اب ایک اجڑی ہوئی عمارت تھی۔اس

کے باغ میں ہلکی ہلکی سرسراہٹوں کے علاوہ کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔رات گہرے گہرے سانس لے کر گہری نیند سوتی چلی جارہی تھی۔پھر تھوڑی دیر کے بعد کافی فاصلے پر دو روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں اور نعمان بابا سنبھل کر ڈنڈا لے کر کھڑا ہوگیا۔اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ کون آرہا ہے؟

وہ ایک لمبی اور شاندار پجارو تھی۔جو اچھلتی کودتی اسی طرح آرہی تھی۔اس میں کون کون تھا؟ اس کا اندازہ نہیں ہوپارہا تھا۔لیکن نعمان بابا کے اس جھونپڑے سے تھوڑے فاصلے پر وہ رکی۔تو نعمان بابا اس کے قریب پہنچ گیا۔

پجارو سے جو آدمی اترا تھا۔گو گزرے ہوئے وقت نے اس کے چہرے پر لاتعداد تبدیلیاں پیدا کردی تھیں لیکن اب بھی وہ شاندار شخصیت نظر آتا تھا۔لمبا اونچا قد، گٹھا ہوا جسم، چال میں انتہائی شاہانہ وقار لیکن غور سے دیکھنے پر وہ چہرہ عرفان علی کا چہرہ ہی نظر آتا تھا۔نعمان بابا نے اسے دیکھا۔اور جھک کر سلام کیا۔عرفان نے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔

البتہ اسکی گونج دار آواز ابھری۔

''میں نے جو کچھ سنا ہے۔کیا وہ سچ ہے۔نعمان خان؟'' جواب میں نعمان بابا نے گردن جھکالی۔

''زیادہ فضول حرکات مت کرو۔جو کچھ میں نے سنا ہے کیا وہ سچ ہے؟'' نعمان بابا نے گردن گھما کر دیکھا۔اور پھر انگلی سے اس جانب اشارہ کردیا۔عرفان علی کی نگاہیں بھی اس کی جانب اٹھ گئیں۔وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس چارپائی کے قریب پہنچ گیا۔عرفان علی کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔اب بھی، اس عالم میں بھی اس کے چہرے کی کرختگی نمایاں تھی۔وہ چارپائی کے قریب پہنچا اور اس نے چادر کا پلو ہٹادیا۔

چادر کے نیچے سے فرحان علی کی لاش برآمد ہوئی تھی۔نواب عرفان علی جھک کر بیٹے کی لاش دیکھنے لگا۔اس کے چہرے کے عضلات تن گئے تھے۔اس نے جھک کر فرحان کی گردن پر ننھی ننھی انگلیوں کے نشانات تلاش

...ل بھی نعمان بابا کے ذریعے اسے ملی تھی۔
اور آخر کار ان نشانات کو تلاش کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ہلکے سے خوف کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو دھاڑیں مار مار کر بیٹے کی لاش سے لپٹ جاتا۔ کیونکہ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ایسا ہی واقعہ اس کے بڑے بیٹے فردوس علی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ فردوس علی کی تدفین کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ آخر کار برائی کا دوسرا نتیجہ بھی ظاہر ہو گیا۔ فرحان جو اس کا آخری بیٹا تھا۔ وہ بھی آخر کار سفید محل کا شکار ہو گیا۔

لیکن اس بد بخت کے ذہن میں بڑے سنگین خیالات رقصاں تھے۔ فردوس کے بعد فرحان بھی ختم ہو گیا۔ اور اب ایک بار پھر وہ تن تنہا، اس کے بعد اس کا وارث کوئی نہیں تھا۔ کچھ دیر وہ بیٹے کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کی سنگینی بتاتی تھی کہ وہ سفید محل سے زیادہ سخت اور پتھر دل انسان ہے۔ پھر اس نے فرحان کی لاش کو کپڑے سے ڈھکا اور نعمان بابا کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''اندر جھونپڑے میں سرکار۔'' نعمان بابا نے جواب دیا۔ اور عرفان علی اس جانب چل پڑا۔ نعمان بابا بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔ اس سے پہلے عرفان علی اس کمرے میں داخل ہوا جو جھونپڑی نما تھا۔ یہاں بھی ایک چار پائی موجود تھی۔ اور اس چار پائی پر وہ لڑکی بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

''یہ اب بھی بے ہوش ہے؟''

''جی مالک یہ ہوش میں نہیں آئی۔'' نعمان بابا نے جواب دیا تب عرفان علی اس کی جانب گھوما۔ اور بولا۔

''میں نے تم سے کہا تھا۔ نعمان خان کہ اب یہاں محل میں کوئی نہ آئے۔ فرحان کے لئے بھی میں نے منع کیا تھا۔ تم سے فردوس کی موت کے بعد میں نے تمہیں سخت احکامات دیئے تھے کہ میرا بیٹا یہاں نہ آنے پائے۔ اور خاص طور سے کسی لڑکی کے ساتھ۔''

''مالک، آپ کو پتہ ہے۔ میں تو غلام ہوں۔ میں نے چھوٹے مالک کو روکنے کی بہت کوشش [illegible] لیکن انہوں نے میری کوئی بات نہیں سنی۔ بلکہ [illegible] اڑایا۔ میرے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ مالک [illegible] تھا۔ اس کے بعد.....''

''ہوں..... یہ واقعہ کتنے بجے پیش آیا تھا؟'' عرفان علی نے پوچھا۔ ''سرکار ساری تفصیل [illegible] نے آپ تک پہنچا دی تھی۔ میں تمام انتظامات کرنے کے بعد واپس یہاں جھونپڑے میں آ گیا تھا۔ چھوٹے مالک نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں واپس جاؤں۔ یہاں آنے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا تھا۔ میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ میں بھاگتا ہوا محل میں داخل ہوا۔ بڑا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دوسرے میں جا کر دیکھا۔ تو سونے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور پھر اندر کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ چھوٹے مالک ہلاک ہو چکے تھے اور لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ دونوں کے قریب خالی پستول پڑا ہوا تھا۔ میں دونوں کو باری باری اٹھا کر یہاں لے آیا اور پھر آپ کو اطلاع دی۔''

''پستول کہاں ہے؟''

''میرے پاس ہے مالک، یہیں اس جھونپڑے میں، میں نے کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔''

''شام نگر میں تم نے دل محمد کو کیا بتایا تھا؟''

''یہی سب کچھ مالک۔''

''ہوں۔ دل محمد کے علاوہ تو کسی کو اس معاملے کی خبر نہیں؟''

''نہیں، سرکار۔'' نعمان بابا نے کہا۔ پھر ایک دم چونک کر بولا۔

''ایک بات بڑی عجیب ہوئی تھی سرکار۔ پہلے میں لڑکی کو اٹھا کر یہاں لایا تھا۔ اور پھر بعد میں جب میں چھوٹے مالک کی لاش اٹھا کر لا رہا تھا تو حویلی کے اندر سے کسی بچے کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔''

ایک لمحے کے لئے عرفان علی کے بدن میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی۔

اس نے اچانک ہی رخ تبدیل کر لیا تھا۔ پھر [illegible] نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ یہ لڑکی کون ہے؟''

''نہیں مالک پہلی بار ہی دیکھا ہے۔ اسے میں [illegible] نے۔''

''اور کیا یہ بات مجھے تمہیں بتانا پڑے گی کہ ان باتوں کا علم کسی کو نہیں ہونا چاہیے؟''

''مالک کا حکم نعمان کی زندگی ہے۔ دل محمد کو بس یہ بات معلوم ہوئی ہے۔ میں نے اسے بھی اس لئے بتایا کہ اسی کے ذریعے آپ تک اطلاع پہنچائی تھی۔ چھوٹے مالک کی لاش یہاں موجود تھی۔ اور یہ بے ہوش لڑکی بھی ورنہ میں خود آپ کے پاس پہنچتا۔''

''ہوں..... ٹھیک ہے۔ نعمان خان، میں اس سلسلے میں بندوبست کرتا ہوں۔ لیکن تم ان تمام واقعات میں سے کسی واقعے سے باخبر نہیں ہو۔ دل محمد بھی اگر تم سے کچھ پوچھے تو اسے بھی کچھ تفصیل نہ بتانا۔ کہنا جو کچھ تمہیں معلوم تھا۔ وہ تم نے بتایا۔ اس کے علاوہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔''

''جی مالک۔ آپ کا حکم کبھی نہیں ٹال سکتا۔''

اسی وقت اچانک لڑکی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ اور وہ دونوں چونک گئے۔ نواب عرفان علی نے پلٹ کر لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اور وحشت زدہ نگاہوں سے چھت کو گھور رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اسے جیسے گزرا ہوا وقت یاد آ گیا۔ وہ بے اختیار اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس کے منہ سے دہشت زدہ آوازیں نکلنے لگیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اسے کچھ نظر آ رہا ہو۔ وہ اندھوں کی طرح فضا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ اور اس کے حلق سے وحشت زدہ آوازیں نکلنے لگیں۔

''بچاؤ..... مجھے بچاؤ..... خدا کیلئے مجھے بچاؤ..... ہٹاؤ..... اسے ہٹاؤ۔ بچالو مجھے بچالو.....'' نعمان بابا نے نواب عرفان علی کی طرف دیکھا۔ اور اس کے اشارے پر آگے بڑھ کر لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے۔ کیا بات ہے۔ گھبراؤ نہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

''وہ..... وہ میرا گلا گھونٹ ڈالے گا، روکو اسے، روکو..... خدا کیلئے اسے روکو.....'' نواب عرفان علی کے چہرے پر عجیب تاثرات نمایاں ہو گئے تھے ماضی کو کسی لمحے بھی نہیں بھلایا جا سکتا تھا۔ بار بار کیوں تازہ ہو جاتا ہے۔ فردوس کے ساتھ بھی یہ ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ اور اب فرحان اس کا لخت جگر، دو جوان بیٹوں کا غم اٹھایا تھا۔ اس نے دو جوان بیٹوں کا غم۔ یہ بہت پرانی بات تھی۔ بہت ہی پرانی بات۔ اس کا کردار بھی اپنے بیٹوں سے مختلف نہیں تھا۔ بلکہ فطرتاً وہ اپنے بیٹوں سے کچھ زیادہ ہی بدکار اور بدکردار تھا۔

وہ گزرا ہوا وقت آہ، وہ گزرا ہوا وقت جو کبھی واپس نہیں آ سکتا تھا۔ سب کچھ یاد تھا۔ بھلا کون بھول سکتا تھا۔ اپنے ماضی کے بدکردار اسے اچھی طرح یاد تھا۔ کہ اس نے اپنے گناہ کے نشان کو آتش دان میں پھینک دیا تھا۔ اور اس ڈاکٹر لڑکی کو وہاں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس کے ایک ملازم نے باغ میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنی تھی۔ اور اس کے بعد وہ لیڈی ڈاکٹر بھی غائب ہو گئی تھی۔ پھر اس کے بعد نجانے کیا کیا کوششیں کر لی تھیں اس نے لیکن نہ تو لیڈی ڈاکٹر کا کوئی پتہ چلا اور نہ بچے کا۔ کیا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ سب کے سب ناکام ہو گئے تھے۔ اور اس کے بعد طویل عرصے تک نواب عرفان علی یہ ہی سوچتا رہا تھا۔ کہ وہ کیا اسرار تھا۔ ڈاکٹر کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اور وہ بچہ کون تھا؟''

اس کو تو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے آتش دان میں پھینکا تھا۔ اور اس کے گوشت کے جلنے کی چراند سونگھی تھی۔ بہرحال یہ ماضی کا کھیل تھا۔ حال کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔

ادھر نعمان بابا لڑکی کو دلاسہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہاں کوئی بچہ نہیں ہے لڑکی! اور بھلا ایک ننھا

سا بچہ کی تو کیا نقصان پہنچائے گا؟“

”اوہ میرے خدا، میرے خدا، جو کچھ میں نے دیکھا تھا۔ وہ کیا تھا۔ فرحان، فرحان، فرحان کہاں ہے؟“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔“ نعمان بابا نے کہا۔ تبھی نواب عرفان علی نے نعمان بابا سے کہا۔

”نعمان خان! اس لڑکی کے لئے ایک گلاس پانی لاؤ۔ کچھ پلاؤ اسے، لڑکی چیخنے کی کوشش مت کرو۔ سنو کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ مجھے جانتی ہو؟“ لڑکی نے پہلی بار نواب عرفان علی کو دیکھا۔ اور پھر اس کے چہرے پر نفرت کے آثار پھیل گئے۔

”تم......تم فرحان کے باپ ہو۔ تم فرحان کے باپ ہو۔ اس ذلیل انسان کے باپ جو مجھے بے آبرو کرنے اس حویلی میں لایا تھا۔ خبردار مجھ سے دور رہو۔ تم اس بد باطن شخص کے باپ ہو۔ کہاں مر گیا وہ، بلا کر لاؤ اسے، اس نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ آہ، اس نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ میں تو اسے ایک شریف انسان سمجھتی تھی۔ اور اس نے مجھ سے شرافت کی زندگی گزارنے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی وعدے پر میں نے اعتماد کیا تھا۔ اور وہ مجھے یہاں لے آیا۔ اگر قدرت میری حفاظت نہ کرتی تو میں، میں زندگی بھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔“

”بکواس مت کر لڑکی تجھے احساس ہے۔ کہ تو کس سے بات کر رہی ہے۔ تیری زبان تیرے حلق سے نکال کر تیرے قدموں میں پھینک دی جائے گی۔ سمجھ رہی ہے ناں کیا سمجھتی ہے۔ تو اپنے آپ کو۔ جس کی بات کر رہی ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ اور تجھ جیسی دو ٹکے کی لڑکیاں اس کے قدموں پر لوٹتی ہیں۔“

”شرم آنی چاہئے تجھے جانور۔ وہ جانور تیری ہی اولاد ہے۔ اس جانور نے مجھے نہ جانے کیسے کیسے سبز باغ دکھائے تھے۔ سب سے لڑ گئی تھی۔ میں اس کے لئے۔ میں نے کہا تھا۔ کہ وہ مجھے عزت و آبرو کی زندگی دینا چاہتا ہے۔ لیکن......لیکن وہ تو......اوہ [illegible] آ گیا۔ سب کچھ یاد آ گیا۔ کیا وہ ذلیل کتے کی موت [illegible] گیا۔ اس کے ساتھ یہ ہی ہونا چاہئے تھا۔ وہ ننھا سا [illegible] کون تھا؟ جس نے اسے زندگی سے محروم کر دیا۔“

”لڑکی اتنا بول رہی ہے تو کہ اس کے بعد زندگی تیرے لئے مشکل ہو جائے۔“

”میرے لئے تو زندگی مشکل ہو ہی چکی ہے۔ جو وقت میں یہاں گزار چکی ہوں جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کے بعد زندگی میرے لئے بے وقعت ہو گئی ہے لیکن تو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ کمینے انسان اگر تو اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے تو بگاڑ لے میرا جو تجھ سے بگاڑا جا سکے۔“

اتنی دیر میں نعمان بابا پانی کا گلاس لے کر آ گیا تھا۔ اس نے یہ تمام باتیں سنی تھیں۔ اور پھر وہ مدہم لہجے میں بولا۔

”مالک یہ ہوش میں کہاں ہے۔ یہ تو پاگل ہو رہی ہے۔ خوف سوار ہے اس کے ذہن پر۔ اس کی بات پر توجہ نہ دیں مالک۔“

”اس کے ہوش ٹھکانے لگائے جا سکتے ہیں نعمان خان ہوش آ جائے گا اسے۔“

”تو کیا بگاڑ لے گا میرا۔ کیا بگاڑ لے گا تو“ لڑکی کا جنون بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ دیوانی ہو گئی تھی۔ واقعی دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے آگے بڑھ کر نواب عرفان علی کا گریبان پکڑ لیا۔

”بول کیا کرے گا۔ تو میرا۔ تیرے پاس عزت ہے۔ دولت ہے۔ لیکن دیکھ لے۔ لیکن دیکھ لے یہ عزت۔ یہ دولت اس وقت تیرے کسی کام کی نہیں۔ تیرا بیٹا مر چکا ہے۔ ایک ننھے سے بچے نے ایک ننھے سے آسیب نے اسے زندگی سے محروم کر دیا۔ آہ کاش ایسا ہی ہوا ہو۔ بول کیا بگاڑ لے گا تو میرا؟“

نواب عرفان علی پر ایک دم سے جنون سا طاری ہو گیا۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ لڑکی کے گال پر رسید کیا۔ اور وہ چارپائی پر جا گری۔

”میں تجھے زندہ دفن کرا دوں گا۔ سمجھی۔ میں تجھے

ابھی چھوڑا ہے پر زندہ دفن کرا دوں گا، تو جانتی نہیں ہم کون ہیں۔ یہاں کون ہماری برابری کر سکتا ہے؟ سب ہمارے غلام ہیں۔ سب جھک جھک کر ہمیں سلام کرتے ہیں۔ ہم تجھے سڑک پر چھوڑ دیں گے۔ تو لوگوں کے سامنے چیختی پھرے گی۔ اپنی ناپاک کہانی سناتی پھرے گی۔ اور لوگ تیرا مذاق اڑائیں گے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ یہ پاگل ہے۔ تو وہ تجھے پاگل تسلیم کر لیں گے۔ پتھر ماریں گے تجھے اور ہم ان سے کہیں گے۔ کہ اسے مار مار کر ہلاک کر دو۔“

”کتے تو جو کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کر لیکن اب کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تو میرا، کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ تو، میں میں تجھے بھی، میں تجھے بھی......“ لڑکی نے ایک بار پھر نواب عرفان علی کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نعمان خان آگے بڑھا۔ اور اس نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”مالک پاگل کے منہ نہ لگیں۔ مالک اسے کچھ نہیں پتہ کہ یہ کیا بک رہی ہے۔ مالک یہ کچھ نہیں جانتی۔“

”تو بکواس مت کر بے غیرت بوڑھے۔ مجھے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ تو۔ تو۔ جانتا تھا کہ وہ ایک بدکار شخص کا بدکار بیٹا تھا۔ یہ آدمی مجھے کسی بھی طرح معزز اور شریف آدمی نہیں لگتا۔ تو دیکھ۔ اس کی صورت دیکھ۔ لعنت برس رہی ہے۔ اس کے چہرے پر۔ میں تم دونوں سے زیادہ ہوش میں ہوں۔ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تو میرا۔ نواب عرفان علی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تیرے بیٹے نے بھی یہ ہی تکبر کیا تھا۔ تلاش کر اسے، اس کی لاش یہیں کہیں سڑ رہی ہوگی۔ اب وہ انگلی بھی نہیں ہلا سکتا ہوگا۔ دیکھ نواب عرفان علی اپنے اس غرور کو ختم کر دے۔ کچھ بھی نہیں ہوگا میرا۔ کوئی بھی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

”نعمان خان۔“ نواب عرفان علی نے سرد لہجے میں کہا۔

”جی مالک۔“

”نعمان خان جا باہر چلا جا۔ اور خبردار اول تو کوئی اس طرف آئے گا نہیں لیکن آئے تو اس کو منع کر دینا۔ جا چلا جا۔ میں اس لڑکی کا غرور ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں اور کیا کر سکتا ہوں۔“

”مالک معاف کر دو۔ اسے، میں آپ سے کہہ چکا ہوں مالک۔“

”کچھ ضرورت سے زیادہ نہیں بول رہا تو نعمان خان، جانتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ بولنے والے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ فوراً یہاں سے باہر نکل جا۔ فوراً اور جو کچھ میں نے کہا ہے۔ اس پر عمل کرنا۔“

نعمان بابا نے بے بسی سے شرمیلا کی طرف دیکھا۔ اور پھر افسردگی سے گردن ہلاتا ہوا دوسری جانب مڑ گیا۔ لیکن ابھی وہ اپنی جھونپڑی کے دروازے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ اچانک ایک ننھے سے بچے کی دردناک چیخ رات کے سناٹے میں ہوا کے دوش پر سنائی دی۔

انتہائی واضح اور پرسوز چیخ تھی۔ نہ جانے اس چیخ میں ایسا کیا اثر تھا کہ اچانک ہی نواب عرفان علی کے پورے بدن پر تھرتھری سوار ہو گئی۔ اس نے متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور پھر آہستہ سے بولا۔

”نعمان خان۔“

”مم......مم......مالک مالک۔“ نعمان بابا کی آواز میں بھی وحشت تھی۔

”دیکھو......نعمان خان یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ ذرا دیکھو۔“

نعمان بابا نے باہر نکل کر دور دور تک پھیلی چاندنی میں چاروں طرف دیکھا۔ لیکن اسی وقت اسے اپنے عقب سے کسی ننھے سے بچے کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ پہلی بار آواز رونے کی آواز تھی۔ لیکن دوسری بار ہنسنے کی آواز تھی۔ شرمیلا پر واقعی جنون طاری تھا۔ آواز اس نے بھی سنی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر خوف کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح آنکھیں پھاڑے نواب عرفان علی کو

رہی تھی۔ اور نواب عرفان علی کا بدن یکبار گی بالکل ہی ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

”نعمان خان کچھ پتہ چل رہا ہے؟“

”نہیں مالک...... بالکل نہیں۔“

”مم...... مگر آواز تو واضح ہے۔“

”مالک...... مالک۔“ نعمان بابا کی آواز میں بھی خوف کی جھلک نمایاں تھی۔

دفعتاً شرمیلا کا قہقہہ فضا میں ابھرا۔ ”نواب یہ وہی آواز ہے۔ وہی آواز ہے۔ یہ جس نے میری آبرو بچائی تھی۔ یہ وہی آواز ہے یہ سن لے نواب عرفان ایک بار پھر وہی آواز سن لے۔ ہاں یہ غیبی آواز ہے۔ غیبی امداد ہے میرے لئے بول اب کیا کہتا ہے۔ بول نواب عرفان اب کیا کہتا ہے۔ انتقام لے مجھ سے۔ بدتمیزی کی ہے۔ میں نے تجھ سے۔“

”دیکھ لڑکی تجھے خدا کا واسطہ، خاموش ہو جا، نواب صاحب کے غصے کو ہوا نہ دے۔“

”ارے چھوڑو!۔ بوڑھے خادم! چھوڑ بوڑھے غلام، مجھے سمجھا رہا ہے۔ کیا بگاڑ لے گا۔ یہ میرا، نواب ہوگا اپنے گھر کا اس سے کہہ بگاڑ لے میرا جو کچھ بگاڑ سکتا ہے۔“

شرمیلا واقعی دیوانی ہو رہی تھی۔ اور اب نواب عرفان علی بغلیں جھانک رہا تھا بچے کے کبھی ہنسنے اور کبھی رونے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی یہ آواز ایک فریاد بن جاتی تھی۔ اور کبھی اس میں انتقام کی بے چینی محسوس ہوتی تھی۔ اور نواب عرفان علی کا چہرہ زرد پڑ جاتا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہلا۔ اور اس نے نرم لہجے میں کہا۔

”نعمان خان! اسے سمجھا۔ اسے سمجھا۔ اس سے کہہ دے کہ تو اسے گھر پہنچانے کا انتظام کر دے گا۔ اس سے کہہ دے کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ نعمان خان باہر گاڑی میں دل محمد اور اس کا ایک ساتھی موجود ہیں۔ انہیں بلا لے اور اس لڑکی کو اس کے گھر پہنچا دے۔ لڑکی جو کچھ میں تجھ سے کہہ رہا ہوں اسے غور سے سن۔ تو جو کوئی بھی ہے میں شاید تیرے بارے میں اتنا نہیں جانتا۔ باہر چار پائی پر فرحان کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ تجھے یہاں کیوں لایا تھا۔ ظاہر ہے۔ تو بھی اپنی مرضی سے یہاں آئی ہوگی۔ تجھے اغواء کر کے نہیں لایا گیا۔ جس طرح کے نعمان خان بتاتا ہے۔ اور تو خود بھی کہہ رہی ہے۔ کہ وہ تجھے دھوکا دے کر لایا تھا۔ تو کہہ رہی ہے کہ تیری آبرو بچ گئی۔ دیکھ تو جوان لڑکی اگر ایک عورت ایک بار سے آبرو ہو جائے۔ یا بدنام بھی ہو جائے۔ تو کوئی اس پر کبھی بھی یقین نہیں کر سکتا۔ خاموشی سے اپنے گھر چلی جا۔ اور جو کچھ ہوا ہے۔ اسے ہمیشہ کے لئے بھول جانا۔ کوئی بہانہ کر دینا اپنے گھر میں۔ اس سے آگے اگر کچھ تو نے کیا تو یہ سچ ہے کہ ہم ہر اس شخص کا منہ بند کر دیں گے۔ جو ہمارے خلاف کچھ کہے گا۔ لاکھوں لٹا دیں گے ہم، اور تو ہماری دولت کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

ہم عزت سے تجھے تیرے گھر واپس جانے دے رہے ہیں۔ خبردار اپنے آپ کو ان واقعات سے ملوث بالکل ظاہر نہ کرنا۔ یہی تیرے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر اس کے علاوہ تو نے کچھ بھی کیا تو پھر شاید ہم تجھ سے مقابلہ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ بات سمجھ میں آ گئی ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اس کے بعد تجھے آزادی ہے کہ جو تیرا دل چاہے۔ وہ کر لے۔ ہم ہر قسم کے حالات سے نمٹنا جانتے ہیں۔“

شرمیلا کے چہرے پر نفرت کے آثار بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”واہ، مغرور انسان۔ واقعی تو شیطان کا دوسرا روپ ہے اور کیوں نہ ہو۔ اس بیٹے کا باپ ہے جو کتے کی موت مر گیا ہے۔ اور اب تو مجھے اس کی موت کی اطلاع دے رہا ہے۔ ٹھیک ہے تو اپنی عزت نوٹوں کے انبار میں چھپا سکتا ہے۔ لیکن ہم غریب لوگوں کے پاس نوٹوں کے انبار نہیں ہوتے، ہم تو وہی کرنے پر مجبور ہیں۔ جو تجھ جیسے دولت والے کہیں۔ مجھے میرے گھر پہنچانے کا بندوبست

کر دے۔ اور سن لے ایک بات اگر اس کے خلاف کچھ بھی ہوا۔ تو پھر میں سب کچھ بھول جاؤں گی۔ عزت ہماری تھی۔ بچ گئی۔ اسے ہی غنیمت جان کر خاموش ہو رہی ہوں۔ لیکن اگر اس پر کوئی حرف آیا۔ تو پھر میں اس دنیا کے سامنے اپنی زبان بند نہیں رکھوں گی۔“

نواب عرفان علی نے اسے ایک نگاہ دیکھا۔ اور اس کے بعد دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے چہرے پر سخت غصے کے اثرات تھے۔ زندگی میں ایسے مواقع بہت کم آئے تھے۔ جب اسے کسی کے سامنے لاجواب ہونا پڑا ہو یا کسی نے اس سے بدزبانی کی ہو۔ اور اس کے بعد اس کی زندگی محفوظ رہ گئی ہو۔ لیکن جو واقعات اس کے سامنے آئے تھے۔ انہوں نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ انسان اپنا ماضی کبھی نہیں بھولتا، جو برائی وہ کرتا ہے۔ وہ اس کے سینے میں محفوظ رہتی ہے۔

دنیا کی نگاہوں سے بے شک اپنے گناہ چھپا لئے جائیں لیکن اندر کا محافظ ہمیشہ ان گناہوں کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ بیس بائیس سال قبل اس نے جو کچھ کیا تھا۔ وہ آج تک نہیں بھولا تھا۔

سفید محل میں جو واقعات پیش آئے تھے۔ وہ اس کے ذہن کو ہمیشہ کچوکے لگاتے رہتے تھے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اس ماحول سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ اس نے اپنی رہائش گاہ بے شک الگ بنا رکھی تھی، اور یہ رہائش گاہ بہت ہی شاندار تھی۔ اس کے شایان شان۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ لالہ جان کے لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے۔ کون تھا جو اس کے مقابلے میں آنے کی کوشش کرتا۔ بارہا اس نے سفید محل کو فروخت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یوں لگتا تھا۔ جیسے یہ عمارت فروخت نہ ہونے کے لئے ہو۔

بائیس سال پہلے جس مظلوم لڑکی کے ساتھ یہ سنگین حادثہ پیش آیا تھا۔ اور جسے اس نے زندگی کے ایسے بدترین حالات سے دوچار کیا تھا کہ شاید ہی کسی انسان نے کبھی کسی انسان کے ساتھ ایسا کیا ہو۔ وہ ننھا سا بچہ جو اس کا اپنا خون تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے آگ کی نذر کر دیا تھا۔

لیکن بہت سے واقعات اب بھی ذہن میں معمہ بنے ہوئے تھے۔ وہ ڈاکٹر لڑکی جس کے پاس ننھا سا بچہ دیکھا گیا تھا۔ ایسی گم ہوئی تھی کہ پھر کبھی اس کا سراغ نہیں لگا تھا۔ اس دور میں جو انسپکٹر موجود تھا۔ اس نے اس سے بھی بڑے کام لئے لیکن اس لڑکی کا سراغ نہ لگا سکا۔ بعد میں نواب عرفان علی نے خود اپنے طور پر بھی بے شمار معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ جن میں ڈاکٹر فراز کا وہ کلینک بھی شامل تھا۔ وہاں ڈاکٹر اور دو نرسیں جو ڈاکٹر ماہ رخ کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ مستقل طور پر اس کا نشانہ بنی رہی تھیں۔ لیکن کسی سے پتہ نہ چل سکا تھا۔ پھر اس نے اپنے طور پر ڈاکٹر ماہ رخ کے گھر سے معلومات حاصل کرائی تھیں۔

وہاں سے اسے جو تفصیلات معلوم ہوئیں وہ یہ تھیں۔ کہ ڈاکٹر ماہ رخ ایک ننھے سے بچے کے ساتھ وہاں پہنچی تھی۔ اور گھر والوں کے طعنوں سے بیزار ہو کر اور اپنے منگیتر کی بے وفائی سے دل برداشتہ ہو کر اس نے اپنا گھر ہی چھوڑ دیا تھا۔

پھر اس کے بعد گھر والوں کو بھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ یہ واقعات نواب عرفان علی کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں کوئی گداز پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی اسی قدر سنگ دل اور وحشی صفت تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے سینے میں دل کی جگہ کوئی پتھر رکھا ہوا ہو۔ جس میں کبھی کوئی نرم یا گداز لمحہ پیدا نہ ہوا ہو۔ آج بھی اس کے دل میں شیطنیت موجود ہے اور وہ اپنے ہر مدمقابل اور مخالف کو زندگی سے محروم کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا تھا۔

ایک ایسے شخص کی سنگ دلی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا بڑا بیٹا بھی اسی سفید محل میں انہی روایات کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ جو اس سے منسوب تھیں۔ یہ سفید محل، یہ عمارت جس سے وہ ہر قیمت پر جان چھڑانا چاہتا تھا۔ آج بھی اس کے لئے وبال جان بنی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اس کی زندگی کا دوسرا

پڑا اس کی مل کردیا۔

بہرحال باپ تھا۔ ایک عورت کا شوہر بھی تھا۔ جو صرف اس لئے زندہ تھی کہ اس سے نواب عرفان علی کا نکاح ہوا تھا۔ اپنے بڑے بیٹے کی موت کے بعد وہ تقریباً اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی۔ اور ایک الگ گوشے میں خاموش پڑی رہا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اب فرحان بھی زندگی سے محروم ہوگیا تھا۔ اور حالات بالکل وہی تھے۔ اس وقت شرمیلا کی زندگی صرف اس بچے کی آواز کی وجہ سے بچ گئی تھی۔ ورنہ شاید ایک ایسا بھیانک المیہ رونما ہوتا جو اس لڑکی کی زندگی بھی چھین لیتا۔ لیکن اس کی مدد کی گئی تھی۔

☆......☆......☆

بہت ہی شان دار عمارت تھی۔ لاتعداد ملازمین اس میں اپنے کاموں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ نواب عرفان علی نے اپنی نشست گاہ اس قدر خوب صورت بنائی ہوئی تھی کہ دیکھنے والا اسے ایک نگاہ دیکھے اور ششدر رہ جائے اس وقت وہ اپنی اس حسین عمارت کے سامنے والے باغ میں سوئمنگ پول کے سامنے بیٹھا خلاء میں نظریں جمائے ہوئے تھا کہ ایک قیمتی گاڑی بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ بالکل اجنبی گاڑی تھی۔ نواب عرفان علی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ کون ہے، کون آسکتا ہے؟ ویسے تو اس کے شناساؤں میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ لیکن یہ کار اس کے لئے اجنبی تھی۔ پھر جو اس سے نیچے اترا۔ اسے دیکھ کر نواب عرفان علی تھوڑی دیر تک اسے پہچان ہی نہیں سکا اور پھر جب اس کا سراپا اس کی نگاہوں میں مکمل طور پر سما گیا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوگیا۔ یہ ڈاکٹر فیضان تھا۔

ڈاکٹر فیضان اس کا کالج کے زمانے کا دوست ایک انتہائی بہترین شخصیت کا مالک۔ ڈاکٹر فیضان پہلے لالہ جان میں ہی رہا کرتا تھا۔ لیکن اس کے بعد اپنی تعلیم وغیرہ مکمل کرکے وہ لندن چلا گیا تھا۔ دوبارہ آیا تھا۔ نواب عرفان کے گناہوں کا شریک تھا۔ اور اسی کی فطرت کا انسان تھا۔ اس بار وہ بارہ تیرہ سال کے بعد واپس آیا تھا۔ آخر کار عرفان علی نے اسے پہچان لیا اور ڈاکٹر فیضان کے آنے سے اسے خوشی ہوئی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھا۔ اور کافی دور آ کر ڈاکٹر فیضان کا استقبال کیا۔ جو ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس اس کی جانب آ رہا تھا پھر دونوں گلے مل گئے۔ نواب عرفان علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ابے! تو نے اپنا یہ کیا حلیہ بنالیا۔ تو تو بہت اسمارٹ ہوا کرتا تھا۔ اور میں ہمیشہ تیری اس جسامت سے حسد کیا کرتا تھا۔''

''بس عرفان! تیری ہی نظر لگی ہے...... لندن کی فضاؤں نے مجھے موٹا کردیا۔''

''حالانکہ لندن میں تو اسمارٹ رہنے کے بڑے مواقع ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی۔ کب واپسی ہوئی؟''

''کمال ہے۔ یعنی یہ بھی سوال کرنے کی بات ہے۔ بس سمجھ لے دو گھنٹے پہلے آیا ہوں۔ حالانکہ اہل خاندان چیختے ہی رہ گئے کہ ابھی پسینہ بھی خشک نہیں ہوا۔ کہاں بھاگ رہے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے زندگی عزیز ہے۔ اگر عرفان کو معلوم ہوگیا۔ کہ میں آیا ہوا ہوں۔ اور اس تک نہیں پہنچا۔ تو مجھ پر کلاشنکوف کے برسٹ مار دے گا۔'' دونوں ہنسنے لگے۔ نواب عرفان علی اسے لئے ہوئے وہیں آ بیٹھا اور بولا۔

''یہ بتاؤ تھکے ہوئے ہو۔ کیا کرنا ہے؟''

''دو گھنٹے یہاں آ کر بس تمہارے پاس آنے کی تیاریوں ہی میں تو صرف کیے ورنہ اتنی دیر کیوں لگتی، بیٹھوں گا۔ اور تم سے باتیں کروں گا۔'' فیضان نے کہا۔ اور عرفان علی کے ساتھ اس طرف بڑھ گیا جہاں خوب صورت کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ نواب عرفان علی نے ملازمین کو بلا کر بہترین قسم کی کافی بنانے کے لئے کہا۔ اور پھر فیضان کو دیکھنے لگا۔

''ویسے حلیہ بتاتا ہے کہ لندن نے تمہیں قبول کرلیا ہے۔''

''ایسا ویسا۔ اہل لندن عاشق ہیں تمہارے یار کے۔''

''سنا ہے۔ اپنا کلینک کھولا ہے تم نے وہاں پر؟''

''آج کی بات کہاں۔ تقریباً آٹھ یا نو سال ہوگئے۔ آہستہ آہستہ ہی قدم جما پایا ہوں۔''

''مطمئن ہو؟''

''ضرورت سے کہیں زیادہ۔؟'' ڈاکٹر فیضان نے جواب دیا۔ اور پھر نواب عرفان علی کو دیکھتا ہوا بولا۔

''لیکن تمہارے چہرے پر تردد کی یہ جو چند لکیریں ہیں یہ بتاتی ہیں کہ تم اتنے مطمئن نہیں ہو۔'' نواب عرفان علی نے ایک گہری سانس لی۔ اور آہستہ سے بولا۔

''خیر زندگی میں کسی بھی چیز کی میں نے کبھی زیادہ پرواہ نہیں کی لیکن کبھی کبھی کچھ ایسی فضولیات سوہان روح بن جاتی ہیں کہ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے۔''

''فیضان موجود ہے۔ اپنی ساری مشکلات اسے دے دو۔ میرا سینہ بہت چوڑا اور بہت مضبوط ہے۔''

''بس، بس جتنے چوڑے سینے کے مالک ہو میں جانتا ہوں۔''

''مطلب کیا ہے؟''

''چھوڑو یار۔ اتنے عرصے کے بعد ملے ہو۔ تمہاری بزدلی کی پرانی داستانیں دہراؤں گا تو خواہ مخواہ شرمندہ ہو جاؤ گے۔''

''بزدلی نہیں عقل کہو، عقل۔'' فیضان نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اور دونوں ہنسنے لگے۔

''وہی نظریہ ہے ناں۔ ہمارا کہ جنگ کا بہترین اصول یہ ہے کہ جہاں اپنے آپ کو پٹنے کا موقع دیکھو۔ وہاں سے بھاگ جاؤ۔ یہی دلیری ہے۔'' دونوں قہقہے لگانے لگے۔ تب فیضان نے کہا۔

''کچھ اہل خاندان کے بارے میں بتاؤ؟''

''اصل بات پوچھ ہی لی تم نے۔ اہل خاندان ہی نہیں رہا۔''

''کیا مطلب؟''

''فردوس علی کی موت کے بارے میں، میں نے تمہیں لکھا تھا۔'' عرفان علی نے کہا۔

''ہاں۔ اور ایک عجیب بے تکی کہانی سنائی تھی۔ جسے میری عقل تسلیم نہیں کرتی۔'' ڈاکٹر فیضان بولا۔

''لندن میں ہو۔ یہاں ہوتے تو عقل مان بھی لیتی۔ اور خود بھی مان لیتے۔'' عرفان علی بولا۔

''بہرحال وہ ایک المیہ تھا۔ جس پر میں آج تک افسردہ ہوں۔''

''اور دوسرا المیہ بھی رونما ہو چکا ہے۔'' نواب عرفان علی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ عجیب و غریب انسان تھا۔ دو جوان بیٹے کھو چکا تھا۔ لیکن کیا مجال کہ اس کے چہرے پر کوئی شکن ہو۔ عمر سے کہیں چھوٹا لگتا تھا۔ حالانکہ خاصی عمر تھی۔ لیکن دیکھنے والا مجال ہے۔ اندازہ لگا سکے۔ جبکہ اس کی نسبت اس سے عمر میں کم ڈاکٹر فیضان اب بوڑھا معلوم ہونے لگا تھا۔

ڈاکٹر فیضان سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا تو نواب عرفان علی نے کہا۔

''میرا دوسرا بیٹا فرحان بھی سفید محل کی پر اسراریت کا شکار ہوگیا۔''

''کیا مطلب؟'' ڈاکٹر فیضان اچھل پڑا۔

''بالکل وہی واقعات پیش آئے۔ اصل میں یہ بچے انتہائی احمق ہیں۔ حالانکہ میں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ سفید محل ایک آسیب زدہ عمارت ہے۔ اس طرف کا رخ بھی نہ کیا جائے۔ لیکن بدبختوں کو عیاشی کرنا بھی نہیں آتی، کسی لڑکی کو لے کر سفید محل چلا گیا تھا۔ اور وہاں پر بالکل وہی واقعات پیش آئے۔''

''یعنی آج بھی تم ان واقعات کی حقیقت کے معترف ہو؟'' ڈاکٹر فیضان نے کہا۔ اور نواب عرفان علی آنکھیں بھینچ کر پیشانی ملنے لگا۔ پھر بولا۔

''کان اور آنکھ اگر دھوکا دیں تو پھر انسان کو کس بات پر بھروسا کرنا چاہئے۔''

''مطلب؟''

''چھوڑو۔ یار۔ کیوں میرے ذہن کو پراگندہ کررہے ہو۔؟ اتنے عرصے کے بعد ملے ہو بہتر یہ ہے

کر لندن کی باتیں کریں۔ ویسے یہ بتاؤ لندن میں شوق جاری ہے؟''

''ارے کیا پوچھتے ہو کتنی بار تمہیں دعوت دی کہ لندن آؤ۔ پھر دیکھو دنیا کیا چیز ہے۔ حسینان لندن اس قدر تنگ دل نہیں کہ کسی کی عمر کا تعین کریں۔ یا کسی پر یہ غور کریں کہ اس کی شخصیت کیا ہے۔ بس ان کی خواہشات وضروریات پوری کردو۔ وہ تمہیں جتنی عمر کا نوجوان چاہو، اتنی عمر کا نوجوان سمجھ لیں گی۔''

ڈاکٹر فیضان کے ان الفاظ پر نواب عرفان علی ہنسنے لگا پھر بولا۔

''بہت دل چاہتا ہے۔ لیکن بس یہاں کے معاملات۔ اصل میں بات صرف اتنی سی ہے کہ دشمن پر سے ایک لمحے کے لئے نظر ہٹالو۔ تو پھر اسے کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور یہی میں نہیں چاہتا۔''

''لیکن تمہارے دشمن کون ہیں؟ کہاں سے دشمن پال لئے ہیں؟''

''دشمن پالے نہیں جاتے۔ ان کی پیدائش خود بخود ہوتی ہے۔ اور اس پیدائش کو روکنا بڑا مشکل کام ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں اپنے دشمنوں سے کبھی شکست نہیں ہوئی۔''

''اصل میں اسی فتح کو برقرار رکھنے کے لئے ہی تو سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔ ورنہ باقی تو سب ٹھیک ہے۔''

''مگر فرحان کی موت؟''

''ہاں۔ دو ہی بیٹے تھے میرے لیکن اب کچھ نہیں ہے۔ بیوی کے بارے میں تم جانتے ہو۔ اس کا وجود ایک بوجھ ہے۔ جو کسی بھی وقت میرے سر سے ہٹ جائے گا۔ وہ نہ عورت رہی ہے۔ کچھ بھی نہیں رہی ہے وہ۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ بقیہ زندگی کے لئے کیا کیا جائے؟ بہر حال کچھ نہ کچھ نام نہاد بھی ہوتا ہے۔ مگر میرے پاس تو اس کا سہارا بھی نہیں ہے۔''

''فرحان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟''

''بالکل وہی، وہی انداز، اگر تم ہوتے تو اس کی [illegible]ش کو دیکھتے، اس کے گلے پر ننھی ننھی انگلیوں کے نشانات صاف پائے جاتے تھے۔'' ڈاکٹر فیضا[illegible] سے آنکھیں جھپکانے لگا۔ پھر بولا۔

''گویا اب تک تم پر وہی سب کچھ مسلط [illegible]''

''میں اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔''

''چھڑا سکتے ہو۔ میرے دوست، غلطی تک تمہاری ہی ہے۔''

''کیسے۔؟'' نواب عرفان علی نے پوچھا[illegible]

''سفید محل فروخت کیوں نہیں کردیتے؟''

''تم خرید لو۔''

''میں واقعی خرید لیتا اگر میرے تمام معاملا[illegible] لندن سے منسلک نہ ہوتے۔ لیکن میں تمہاری اس با[illegible] سے اتفاق نہیں کرتا۔''

''تو پھر اسے بکوادو۔''

''ہاں۔ یہ آسان ہے۔ تم نے کوشش کی؟''

''کئی بار۔ کچھ لوگوں سے رابطے کئے لیکن لوگ ا[illegible] عمارت کو دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ کوئی خریدار نہیں ملتا۔''

''تعجب کی بات ہے۔ واقعی۔ حیرت کی بات ہے۔ بہت ہی عجیب ویسے وہ واقعہ، واقعی تمہاری سنگ دلی کا ثبوت ہے۔''

''کیا فضول باتیں کرتے ہو، سنگ دلی کیا چیز ہوتی ہے۔ تم خود سوچو کیا میں اس بچے کو زندہ رہنے دیتا؟''

''ہوں۔ کچھ اور بھی سوچا جاسکتا تھا۔ لیکن تم نے کسی سے مشورہ کئے بغیر اس وقت خود ہی فیصلے کرلئے تھے۔''

''مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔ اس عورت کا جس کا نام ڈاکٹر ماہ رخ تھا۔ پتہ نہیں کم بخت کہاں مر گئی۔ میرے ذہن میں ہمیشہ وہ خلش باقی رہے گی کہ وہ بچہ کون تھا؟ جو اس کے پاس دیکھا گیا تھا۔ اور اس کے بعد سے اب تک کے واقعات کیوں پیش آرہے ہیں؟''

''ایک مشورہ دوں تمہیں؟''

''ہاں دو۔'' نواب عرفان علی نے کافی کے برتن جو ملازم نے لاکر رکھے تھے، سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ دونوں کافی پیتے ہوئے کچھ سوچتے رہے تھے۔

(جاری ہے)

شہرِ وحشت

ایم اے راحت

قسط نمبر: 11

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرہول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دہشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراؤ، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کومبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیروشر کی انوکھی کہانی

چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ پھر ڈاکٹر فیضان نے کہا۔

"اگر تم واقعی یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ تو پھر کسی خوبصورت سی لڑکی سے شادی کرلو۔ لاولد رہو گے۔ دو بیٹے کھو چکے ہو۔ وہ تو خدا نے تمہیں عجیب وغریب قوت برداشت دی ہے۔ ورنہ جس کے دو جوان بیٹے موت کا شکار ہو جائیں۔ اس کے چہرے پر یہ تر وتازگی نا قابل یقین کہی جاسکتی ہے۔"

"اصل میں میرے سوچنے کا انداز مختلف ہے۔ ہر شخص ہر ذی روح اپنی مرضی سے جیتا ہے۔ نہ اس کی زندگی پر کوئی پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ نہ اسکی موت پر، میرے دونوں بیٹوں نے کیا مجھ سے پوچھا تھا کہ عیاشی کے لئے اس سفید محل کی طرف رخ کیا جائے۔ پوچھتے تو میں انہیں منع کر دیتا۔ اس کے بعد بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ چوری چھپے ادھر جاتے۔ یا نہیں جاتے۔ میرے لئے کس قدر مصیبتیں کھڑی کرتے رہے ہیں وہ۔ مجھے اسکا اندازہ ہے۔ بارہا۔ ایسے سنگین واقعات پیش آئے ہیں۔ اور ہر دفعہ مجھے اپنی حیثیت سے کام لینا پڑا۔ ورنہ وہ دونوں بارہا مشکل کا شکار ہو جاتے۔ انہوں نے کبھی کوئی بات ہی نہیں مانی میری۔ تم خود ہی بتاؤ۔ ڈاکٹر فیضان میں ایسے بیٹوں کے لئے کیا افسردہ رہوں۔"

نواب عرفان نے کہا اور ڈاکٹر فیضان پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

"بہرحال میں تو تمہیں یہ ہی مشورہ دوں گا کہ اپنی زندگی کے لئے کوئی عمدہ سا ساتھی منتخب کرلو۔"

"تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ ایسا سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک خوف جاگزیں ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ خوف میرے دل پر بیٹھ گیا ہے۔"

"مجھے بتانا پسند کرو گے۔؟"

"بس ایک عجیب وغریب احساس، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میری شادی کے لئے لاتعداد لوگ خوشیاں منا رہے ہیں۔ میں شادی کرلیتا ہوں۔ اور جب اپنی نئی دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتا ہوں تو مجھے وہی چہرہ نظر آتا ہے۔ بالکل وہی۔ اور اسکی گود میں ایک معصوم سا ننھا سا بچہ لیٹا ہوا ہے۔ جو میری جانب خوفناک نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر فیضان! یہ خواب میں اکثر جاگتی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ اور نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہوتا ہے۔ کہ اب اس بچے کے ہاتھ میری گردن کی جانب بڑھیں گے۔ اور اسکے بعد وہ مجھے ہلاک کردے گا۔

پھر میری گردن پر بھی اسکی انگلیوں کے نشانات پائے جائیں گے۔ شاید ایک نفسیاتی خوف میرے دل میں بیٹھ چکا ہے۔"

"سو فیصد، سو فیصد۔ لیکن ہر خوف کا ایک علاج ہوتا ہے۔ ہر بیماری ہر خوف کا، ہر مرض کا، کوئی نہ کوئی علاج ضرور ہوتا ہے۔ میں ابھی یہاں ہوں میرا خیال ہے۔ میں اس سلسلے میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔ اگر تمہارے دل و دماغ سے یہ خوف دور ہو جائے بلکہ ایسا کرو۔ اگر ممکن ہو سکے تو کوشش کرکے میرے ساتھ لندن جانے کا پروگرام بناؤ۔"

"مشکل ہے۔ ڈاکٹر فیضان بہت مشکل ہے۔ میں نے بارہا اس بارے میں سوچا ہے۔ لیکن تم یقین کرو۔ جس دن میں نے لالہ جان چھوڑ دیا اس دن کے بعد سے میرے خلاف وہ سازش شروع ہوں گی۔ کہ شاید اس کے بعد میں لالہ جان واپس نہ آسکوں۔" ڈاکٹر فیضان پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔

لیکن خود بھی اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

بہر حال رات کو ڈاکٹر فیضان نے کھانا عرفان ہی کے ساتھ کھایا اور اس کے بعد ملتے رہنے کا وعدہ کرکے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ عرفان گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ ڈاکٹر فیضان کی باتیں اس کے ذہن میں نئے نئے خیالات جگا رہی تھیں۔ یہ حقیقت تھی کہ اپنے دونوں بیٹوں کی موت کا اسکے دل میں کوئی احساس نہیں تھا۔ شرمیلا کا معاملہ ہموار ہو گیا تھا۔ اور اس لڑکی نے اپنی آبرو بچ جانے پر ہی خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ ورنہ یہ ہی سوچا تھا نواب عرفان نے کہ اسکا کوئی نہ کوئی انتظام کر ہی دیا جائے گا۔ اگر وہ یہ بات نہ مانی تو...... یہ سب کچھ تو ممکن تھا لیکن ماضی کے ان نقوش کو وہ کبھی نہیں مٹا سکتا تھا۔ جس میں لا تعداد داستانیں چھپی ہوئی تھیں۔ جیسے ڈاکٹر ماہ رخ، زندگی کے مشکل حالات گزارنے کے بعد اسے سکون حاصل ہوا تھا۔ ڈاکٹر فراز ایک مہربان اور شفیق انسان تھا۔ اور اس نے ڈاکٹر ماہ رخ کو اپنی بیٹیوں جیسا مقام دے رکھا تھا۔ وہ شدید محنت سے کام کر رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ جلد ہی زندگی کو ایک ایسا محور مل جائے گا۔ جو ماں، اور بہن بھائیوں کے مستقبل کے لئے دی گئی قربانیوں کا بہترین صلہ ہوگا۔

لیکن تقدیر کے فیصلے مختلف ہوتے ہیں۔ اچانک ہی سب کچھ چھین گیا تھا۔ ماں کا رویہ جیسا تھا۔ وہ بھی دیکھ چکی تھی۔ اسکی آنکھ میں اگر شک پیدا ہو جائے تو دنیا میں اور کوئی کردار ایسا نہیں ملتا جس پر بھروسہ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ شہروز نے جو گفتگو کی تھی۔ وہ بھی ناقابل برداشت تھی۔ دنیا اسے کچھ اس طرح دل برداشتہ ہوئی تھی کہ اگر یہ ننھا سا معصوم اور مظلوم وجود اسکی آغوش میں نہ ہوتا تو شاید دنیا ہی چھوڑ دینے پر غور کرتی۔ گھر سے نکلی تھی اور اس انداز سے نکلی تھی۔ کہ نگاہوں میں نہ کوئی منزل تھی اور نہ ذہن میں کوئی تصور بس چل پڑی تھی۔

خود اپنے آپ سے برگشتہ تھی۔ اور نجانے کس طرح اسکے قدم ریلوے اسٹیشن کی جانب اٹھ گئے تھے۔ بس ایسی کچھ نفرت ہو رہی تھی اسے اس دنیا سے کہ وہ اس دنیا کو چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ ٹرین میں سوار ہو گئی اور ٹرین چلنے کے بعد کھوئی کھوئی آنکھوں دوڑتے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔

وقت گزر رہا تھا۔ نجانے کون کون اس کی جانب متوجہ ہوا۔ لیکن وہ پتھرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ہوش و حواس کی منزلیں واپس آنے لگیں۔ ننھا سا بچہ گود میں کلبلایا تو اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ ایک معمر خاتون جو بہت دیر سے اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھیں۔ اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔

"بچے کو دودھ نہیں پلاؤ گی...... کتنی دیر سے سفر کر رہی ہو...... معصوم سا بچہ ہے بھوکا ہے۔"

اس نے چونک کر عمر رسیدہ خاتون کی جانب دیکھا۔ اور اسکی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی۔

"میں سمجھ رہی ہوں۔ کچھ اندازہ ہے مجھے۔" معمر خاتون نے اور وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ معمر خاتون پھر بولیں۔

"میرے پاس دودھ تو نہیں ہے۔ لیکن تھرماس میں چائے ضرور ہے۔ کیا تمہارے پاس بچے کو پلانے کے لئے فیڈر بھی نہیں ہے؟"

"اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ اور معمر خاتون سوچ میں ڈوب گئیں۔ ننھا سا بچہ ان کی نگاہوں کے سامنے نمایاں تھا۔ کہنے لگیں۔

"نومولود ہے۔ اس وقت یوں کرو۔ اسے کپڑے سے دودھ پلا دو...... میرا مطلب ہے۔ چائے، کوئی حرج نہیں ہے۔ ٹھہرو۔ میں انتظام کرتی ہوں۔"

معمر خاتون نے تھرماس میں سے چائے نکال کر اسے ٹھنڈا کیا۔ پھر ململ کا ایک کپڑا نکالا غالباً دوپٹہ تھا۔ اسے انہوں نے تھوڑا سا پھاڑا اور اس کے بعد بچے کو لینے کے ہاتھ بڑھا دیئے۔ ڈاکٹر ماہ رخ نے بچہ ان کی آغوش میں دے دیا۔ انسانی ہمدردیوں سے انسان ابھی تک اتنا مایوس نہیں ہوا ہے۔ کہ دنیا ہی کو دشمن سمجھ لے۔ خاتون گود میں بچے کو لٹا کر کپڑے کے پھوہے سے چائے کے قطرات بچے کو پلانے لگیں۔ اور معصوم بچہ شکر شکر کرکے غذا حاصل کرنے لگا۔ وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ معمر خاتون بچے کو دیکھتے رہیں۔ ان کی آنکھوں میں محبت کے آثار تھے۔ پھر وہ آہستہ سے بولیں۔

"لو اسے سنبھالو۔ کیا میں تمہارے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟"

"جی۔" ڈاکٹر ماہ رخ نے کہا۔ ایک لمحے میں اسے احساس ہو گیا تھا۔ کہ معمر خاتون اب اس سے بچے کے بارے میں سوالات کریں گی۔ اور اسے ان سوالات کے جواب دینے ہیں۔ سب کچھ علم میں آچکا تھا۔ اس وقت دشمن چاروں طرف موجود تھا۔ اپنے آپ کو چھپانے کے لئے ایسا ہی طریقہ کار اختیار کرنا پڑے گا کہ کوئی شک نہ کر سکے۔ حالانکہ وہ جھوٹ بہت کم بولتی تھی۔ لیکن ضرورت سب کچھ کرا لیتی ہے۔ اس سے خود ہی اپنے ذہن میں ایک کہانی تیار کر لی۔ اور معمر خاتون نے اس کی توقع کے مطابق ہی سوال کر دیا۔

"گھر سے...... لڑ کر بھاگی ہو۔؟" شوہر سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے دیکھو۔ میں تمہاری ہمدرد ہوں۔ اتنی کم سن ہو کہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اتنی سی عمر میں شوہر سے لڑائی جھگڑا بھی ہو سکتا ہے۔ شادی کو ابھی سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہیں ہوا ہوگا۔ مجھے بتانا پسند کرو گی کہ کیا قصہ ہے۔؟"

اس نے آنسو بھری نگاہیں معمر خاتون کی جانب اٹھائیں اور پھر آہستہ سے بولی۔

"بس ستم رسیدہ ہوں۔"

"اس کا تو مجھے اندازہ ہے۔ لیکن کیا جھگڑا ہوا تھا۔ شوہر سے؟"

"میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ایں۔ ارے کیسے۔؟"

"بس ایک حادثے کا شکار ہو گئے اور اس کے بعد ان کے خاندان نے مجھے زمانے بھر کی منحوس عورت قرار دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔"

"اف میرے خدا! کیسے دیوانے لوگ ہوتے ہیں۔ انسان سے انسان کی دشمنی یقین کرو میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ تو پھر کہاں جا رہی ہو؟"

"کچھ پتہ نہیں۔ بے آسرا، ہوں۔ والدین پہلے ہی انتقال کر چکے ہیں۔ رشتے کے ایک چچا نے پرورش کی تھی۔ چچی ویسے ہی جان کی دشمن تھی۔ شادی کرکے انہوں نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا اور اب کوئی پرسان حال نہیں ہے۔"

"مگر کہاں جا رہی تھیں۔"

"میں نے کہا ناں۔ مجھے خود بھی نہیں پتہ۔ کوئی منزل نہیں ہے میری۔"

"اچھا یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ بہت دکھ ہوا مجھے تمہاری کہانی سن کر۔ دیکھو میرا نام شہانہ بیگم ہے۔ ڈاکٹر شہانہ یہاں سے کافی فاصلے پر ایک شہر ہے۔ شاید تم نے اسکا نام سنا ہو۔ دریا پور کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دریا پور میں میرے شوہر ایک کلینک چلاتے ہیں۔ میں بھی ڈاکٹر ہوں۔ بچے بھی ہیں ہمارے، اگر تم چاہو تو ہمارے گھر میں پناہ لے سکتی ہو۔ میں تمہیں خوشی سے اپنے ساتھ رکھنا چاہوں گی۔"

اس نے ممنون نگاہوں سے معمر خاتون کو دیکھا۔ اور ٹوٹا ہوا اعتماد پھر بحال ہونے لگا۔ دنیا پر ایک بار پھر بھروسہ ہونے لگا۔ جھوٹ کا سہارا بے شک لیا تھا۔ اس نے لیکن دوسری طرف کی پیش کش میں کہیں کوئی فریب نہ تھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ تو ڈاکٹر شہانہ نے کہا۔ ''نہیں بیٹی! زندگی میں مصائب تو آتے ہی رہتے ہیں۔ جن جاہل لوگوں نے تمہیں اس انداز میں گھر سے نکال دیا۔ قدرت ان سے خود انتقام لے گی لیکن تم خود فکر مت کرو۔ میں ویسے بھی ڈاکٹر ہوں۔ اور تم شاید یہ بات نہیں جانتیں کہ ڈاکٹروں کے دل میں انسانیت کا درد کس طرح ہوتا ہے۔ ہم گلے سڑے جسموں کی چیر پھاڑ کر کے انہیں زندگی کی طرف لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ کبھی کبھی ان کے اپنے لواحقین بھی ان کے زخموں سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن ہم ان تمام باتوں سے بے پرواہ ہو کر ان کی تیمارداری کرتے ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے۔ بیٹی۔ میں تمہیں بھی ایک اچھی زندگی دینے کی کوشش کروں گی۔ فکر مت کرنا۔ تمہیں زندگی گزارنے کے لئے کوئی بہتر موقع فراہم کیا جائے گا۔ اور تمہارے بچے کی پرورش بہتر انداز میں ہی ہوگی۔''

''جی۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ اس سہارے کو اس نے انتہائی غنیمت جانا تھا۔

پھر ڈاکٹر۔ شہانہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ دریا پور واقعی خاصا بڑا شہر تھا۔ اور آبادی بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھی شہانہ کے شوہر انتہائی نرم گو اور نرم مزاج آدمی تھے۔ کلینک بہت بڑا تھا۔ ڈاکٹر شہانہ نے ان سے ماہ رخ کا تعارف کرایا۔ جس نے اپنا نام زریں بتایا تھا۔ زرین اس کے ذہن میں یوں رہ گئی تھی کہ شہباز کی بہن کا نام زرین تھا ......اور یہی نام اسے فوراً سوجھ گیا تھا۔

بہر حال وہ زرین کی حیثیت سے یہاں مقیم ہو گئی تھی۔ اس کلینک میں نرسوں کے لئے ایک کیس بھی بنایا گیا تھا۔ جس میں چھ نرسیں، رہتی تھیں۔ ڈاکٹر۔ شہانہ نے ان سب سے ڈاکٹر ماہ رخ کا تعارف کرایا اور زریں کی حیثیت سے وہ ان سب سے روشناس ہو گئی۔ انہوں نے اس کے بارے میں سب کو سادگی سے سب کچھ بتا ہی دیا تھا۔ جسکی وجہ سے نرسوں کو بھی اس سے کافی ہمدردی ہو گئی تھی۔ اور ننھا سا معصوم بچہ سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ ان نرسوں کے ساتھ اپنے کمرے میں رہنے لگی۔ ڈاکٹر شہانہ نے اس کے لئے تمام انتظامات کر دیئے تھے۔ اور زندگی کافی آسان ہو گئی تھی۔ لیکن اپنے پیچھے جو کچھ چھوڑ آئی تھی۔ اسے بھولنا اسکے بس کی بات نہیں تھی۔

اس بھیانک رات کے بعد سے اب تک تو زندگی بھاگتے ہوئے ہی گزری تھی۔ اور وقت نے موقع ہی نہیں دیا تھا کہ بیٹھ کر سوچتی۔ حالانکہ جن مشکلات کا شکار رہی تھی۔ اور جس طرح اپنے گھر پہنچی تھی۔ اس کے بعد اس نے یہ ہی سمجھا تھا کہ اب گھر اس کی بہترین پناہ گاہ ہے۔ اور تمام مصائب کا خاتمہ اس گھر کی دہلیز پر پہنچنے کے بعد ہو جائے گا۔ لیکن وہاں زندگی کا نیا مشاہدہ ہوا تھا۔ نہ صرف دوسرے بلکہ ماں بھی شکوک و شبہات کا شکار ہو گئی تھی۔

بہر حال انسانی فطرت کی کمزوریوں سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ شہروز بھی تمام انسانوں جیسا ہی نکلا تھا۔ اور اب کیا رہ گیا تھا۔ اس گھر میں اس کے لئے۔ چنانچہ اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے اس بد باطن شخص سے جس کا نام نواب عرفان تھا۔ شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

آہ، کیا ہی سنگدل اور درندہ صفت انسان تھا۔ کس درندگی کے ساتھ اس نے معصوم سے بچے کو جس نے اس دنیا میں آنکھ کھول کر کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ نذر آتش کر دیا تھا۔ آہ، کیا ہی بھیانک قدم تھا، اس کا اور یہ معصوم، یہ بھی اس کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ کسی قیمت پر اس کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ لیکن بہر حال اب صورت حال مختلف ہے۔ کچھ بھی ہو۔ میں اسے پروان چڑھاؤں گی۔ اور پھر......اور پھر اگر تقدیر نے ساتھ دیا۔ تو اس درندے سے یہی انتقام لے گا۔ ہاں نواب عرفان۔ تجھ سے انتقام یہ ہی بچہ لے گا۔

تب اس کے بعد اس نے زندگی کے بارے میں مختلف انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ زندگی کسی ہمدردی کے سہارے نہیں گزاری جا سکتی۔ اپنا منصب پانے کے لئے انسان کو محنت کرنا ہوتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے ڈاکٹر شہانہ سے کہا۔

''ڈاکٹر شہانہ میں کلینک میں کام کرنا چاہتی ہوں۔''

''کلینک میں کیا کام کرو گی۔''

''میں نرس کا کام بہت اچھی طرح کر سکتی ہوں۔''

''کیا......؟'' ڈاکٹر شہانہ مسکرائی۔

''جی ہاں۔ اب مجھے ٹرائی کرنا چاہیں تو......!''

''نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ تم نے کوئی تربیت وغیرہ لی ہے اس کی۔؟''

''نہیں۔ ڈاکٹر لیکن مجھے یقین ہے میں یہ کام کر سکتی ہوں۔''

''اور بچہ۔''

''نرسوں کی ڈیوٹیاں مختلف ہوتی ہیں۔ یہ سب میری اچھی دوست بن گئی ہیں۔ جب میری ڈیوٹی ہو گی ان میں سے کوئی نہ کوئی میرے بچے کو سنبھال لے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ اچھا یہ بتاؤ۔ تم نے بچے کا نام کیا رکھا ہے۔ آخر؟''

''اسکا نام میں نے ہارون رکھا ہے۔ ڈاکٹر۔''

''اچھا بہر حال جیسی تمہاری مرضی۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں ہے زریں۔ کیا ہے۔ کون سے خاص اخراجات ہیں تمہارے؟''

''میں جانتی ہوں ڈاکٹر صاحبہ! آپ بہت اچھی ہیں۔ لیکن مستقبل میں میرے بچے کے تو بہت سے اخراجات ہوں گے۔''

''ارے ان کا بھی بندوبست ہو ہی جائے گا۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحبہ! میں اپنے بچے کو بہتر مقام دینا چاہتی ہوں۔ آپ خود سوچئے جب وہ شعور کو پہنچے گا تو کیا یہ نہیں سوچے گا کہ اس کی پرورش کس انداز میں ہوئی ہے۔''

''جذبہ بہت اچھا ہے۔ میں تمہیں اس سے نہیں روکوں گی۔'' ڈاکٹر شہانہ نے کہا۔ اور ماہ رخ نے کلینک میں کام کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ایک ڈاکٹر ایک کوالیفائڈ ڈاکٹر، نرس کا کام کر رہی تھی۔ وہ تربیت، وہ ذہانت، وہ انداز کہاں جاتا۔ جسے وہ لاکھ چھپانے کی کوشش کرتی کبھی کسی کی بینڈیج کی تو اس طرح کہ ڈاکٹر دردانہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ جاتی۔ انجکشن لگایا تو اس طرح سے کہ مریض کو خود بھی پتہ نہ چل سکا۔ ہر کام اس انداز میں کرتی تھی۔ کہ ڈاکٹر شہانہ خود بھی ششدر رہ جاتی تھی۔ دو تین بار اس نے اس سے پوچھا بھی تھا۔

''تم تو کہتی ہو۔ کہ تم نے کبھی نرسنگ کی ٹریننگ نہیں لی۔''

''جی۔''

''لیکن جو کچھ تم کر رہی ہو یہ بات بھی نا قابل یقین ہے۔'' ایک بار تو خود ڈاکٹر مہروز یعنی ڈاکٹر شہانہ کے شوہر بھی حیران رہ گئے۔ ایک مریض کی تشخیص کر رہے تھے بعد میں انہوں نے کچھ دوائیں لکھیں۔ ایک انجکشن لکھا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب ان دواؤں سے تو کنٹراسٹ ہو جاتا ہے۔''

''ڈاکٹر مہروز نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''کیا مطلب؟''

''دیکھئے ناں۔ یہ، یہ، اور اس کے بعد اسکا ری ایکشن بھی ہو سکتا ہے۔'' ڈاکٹر مہروز کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہوں نے شدت حیرت سے اسے دیکھا اور بولے۔

''زرین بات تو تم بالکل سچ کہہ رہی ہو لیکن یہ بتاؤ تمہیں اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

جناب، میں نرس کا کام کر رہی ہوں۔ آپ کے تجربات سے فائدہ نہیں اٹھاؤں گی تو کیا ہوگا۔''

''مگر میں نے تو کبھی تمہیں......اوہ مائی گاڈ! تم مجھے بار بار حیران کر دیتی ہو۔ زریں......بات بالکل درست ہے۔ ان دواؤں کے ساتھ یہ انجکشن غلط ہو جائے گا۔''

''جی ڈاکٹر صاحب۔''

''بعد میں ڈاکٹر مہروز نے شہانہ سے اس کا تذکرہ کیا۔'' تو شہانہ بھی حیرت سے بولی۔

"واقعی مہروز یہ لڑکی جب بھی کوئی کام کرتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے مشاق ہاتھ مصروف عمل ہوں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"بہر حال جب بات سمجھ میں نہیں آتی تو اسے نظر انداز کردینا ہوتا ہے۔ کیونکہ زریں کے ساتھ بہر حال کوئی غلط تصور قائم نہیں تھا۔ یوں وقت گزرتا چلا گیا۔

سوچنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ تنہائیوں میں جب راتوں کو وہ اپنے بستر پر لیٹتی تھی تو نہ جانے کیا کیا کچھ یاد آجاتا تھا۔ زندگی نے ایک ایسا عجیب رخ اختیار کیا تھا۔ کہ سب کچھ ملیا میٹ ہوگیا لیکن اس سب کچھ کو ملیا میٹ کردینے والا نواب عرفان تھا۔ آہ، وہ درندہ! کس طرح میرے ہاتھ لگے؟ اور کس طرح میں اس سے اپنا انتقام لوں، اس کا دل آگ میں جھلسنے لگتا تھا۔

لیکن زندگی کی کہانی عجیب ہوتی ہے۔ ڈور ہلانے والا آسمان کی انتہائی بلندیوں پر تصور کی حد سے پرے انسانی زندگی کے لئے فیصلے کرتا رہتا ہے۔ اور یہی فیصلے انسانی زندگی پر محیط ہوتے ہیں اور انہی کے ذریعے وہ سب کچھ ہوتا ہے۔ جو بعد میں کہانی بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر شہانہ ایک نیک دل خاتون تھیں۔ ایک دن وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لے کر آئیں۔ ڈاکٹر ماہ رخ تو اس وقت ڈیوٹی پر تھی۔ اپنے گھر میں انہوں نے اس لڑکی کو لے جانے کے بعد رات کو نرسوں سے متعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک بے سہارا لڑکی ہے۔ اور برے حالات کا شکار ہے۔ میں نے اسے آیا کے طور پر ملازم رکھ لیا ہے۔ اسکا نام نازش ہے۔ اور میں یہ کہنا چاہتی ہوں۔ کہ تم لوگ بھی اس کے ساتھ تعاون کرنا۔"

نازش کو رہنے کے لئے نرسوں کے آفس میں ہی جگہ دی گئی تھی۔ رات کو جب ڈاکٹر ماہ رخ ڈیوٹی آف کرکے واپس آئی تو نازش کو دیکھ کر اس کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ شدت حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی۔

نازش اس کی شناسا تھی۔ جانی پہچانی شکل حالانکہ کافی طویل عرصے کے بعد اسے دیکھا تھا۔ ہارون اس وقت تقریباً سوا سال کا ہو چکا تھا۔ لیکن نازش کی شکل ڈاکٹر ماہ رخ کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ نجانے کیوں نازش اسے پہچان نہ سکی۔ غالباً اس کے ذہن پر وہ روح فرسا لمحات عذاب بن گئے تھے۔ اور اس وقت ڈاکٹر کا چہرہ اسے یاد نہیں رہا تھا۔ جس نے اسے اس مشکل سے نجات دلائی تھی۔ نرسیں چلی گئیں۔ ڈاکٹر ماہ رخ کو یہ اندازہ ہوگیا تھا۔ کہ نازش اسے پہچان نہیں سکی ہے۔ لیکن جب اسے تنہائی ملی تو وہ اس کے قریب پہنچ گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ نازش نے حیران ہوکر ڈاکٹر ماہ رخ کی صورت دیکھی۔ اور کسی قدر بوکھلا سی گئی تب ڈاکٹر ماہ رخ نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے پہچانتی ہو۔؟"

"نہیں...... آپ۔"

"غور کرو...... غور سے میرا چہرہ دیکھو......" ڈاکٹر ماہ رخ بولی۔ اور نازش کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہوگئے۔ پھر اس کے اندر ایک ہیجان سا برپا ہوا۔ اور اس نے کہا۔

"لل...... لیکن...... لیکن...... آپ...... آپ...... چہرہ۔" وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکی۔

"اس وقت تم نے مجھے اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔"

"کک...... کس وقت۔؟"

"جب تم سفید محل میں ایک سنگدل انسان کی سنگدلی کا شکار ہوئی تھیں۔" نازش کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

"تب تو...... تب تو آپ...... ڈاکٹر صاحبہ۔"

"ہاں...... میں وہی ہوں۔"

"اوہ۔ خدا کے لئے...... خدا کے لئے۔"

"میں نے کہا ناں اس وقت تو مجھے تمہارا نام تک نہیں معلوم تھا۔ اب پتہ چلا ہے کہ تمہارا نام نازش ہے۔"

"میرا اصلی نام نازش بھی نہیں ہے۔ لیکن آپ مجھے نازش ہی کہیں۔ آپ یہاں کیسے۔؟"

"تمہیں یاد ہے۔ نازش۔ نواب عرفان نے تمہارے پہلے بچے کو آگ میں جھونک دیا تھا۔"

"یاد ہے۔ یاد ہے مجھے۔" وہ غمناک لہجے میں

بولی۔ اور پھر ایکدم اچھل پڑی تھوڑے فاصلے پر ہارون سو رہا تھا۔ اس کے اندر شاید ہیجان پیدا ہوا۔ اور وہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گئی۔

"یہ...... یہ...... یہ"

"ہاں...... یہ تمہارا بچہ ہے نازش! اسے لے کر میں وہاں سے بھاگ آئی تھی۔"

"میرا بچہ...... میرا بچہ۔" نازش نے سوتے ہوئے ہارون کو گود میں اٹھا لیا۔ پھر اس طرح بھینچا اس طرح چوما، چاٹا، کہ ڈاکٹر ماہ رخ بھی اس کی جذباتی کیفیت پر اپنے آنسو نہیں روک سکی۔ نازش اسے دیوانوں کی طرح چوم رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"یہ میرا بچہ ہے ناں۔ میرا ہی بچہ ہے ناں ڈاکٹر صاحبہ؟"

"ڈاکٹر نہیں مجھے نرس کہو...... نازش جذباتی کیفیت سے نکل آؤ۔ میں تمہیں بہت سے سنگین حقائق سے آگاہ کروں گی۔"

"آہ۔ میرا بچہ۔ میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کبھی اپنے بچے کی صورت دیکھوں گی۔ آہ...... یہ تو کمال ہے۔ یہ تو واقعی کمال ہے۔" وہ بچے کو چومتی رہی۔ چاٹتی رہی۔ بمشکل تمام جب اس کی یہ کیفیت بحال ہوئی تو ڈاکٹر ماہ رخ نے اس سے کہا۔

"نازش یہ ایک عجیب اتفاق ہے۔ کہ تم دوبارہ مجھے مل گئی ہو۔ سنو۔ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں۔ اسے غور سے سنو۔ بڑے عجیب و غریب حالات سے واسطہ پڑا ہے مجھے، میں تمہیں اپنے بارے میں بتادوں۔ پھر تم سے تمہارے بارے میں پوچھوں گی۔ وہ وہ...... شخص۔ نواب عرفان وہ درندہ! کیا تم اس بات کا یقین کروگی۔ کہ جب بچے کو لے کر میں باہر نکلی تو وہاں موجود لوگوں نے بچے کے رونے کی آواز سن لی۔ اور اس کے بعد وہ میرا تعاقب کرتے رہے۔" ڈاکٹر ماہ رخ نے شروع سے آخر تک نازش کو وہ سنگین داستان سنادی۔ اور نازش شدت حیرت سے آنکھیں پھاڑے ڈاکٹر۔ ماہ رخ کی یہ روداد سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر اس نے غمناک لہجے میں کہا۔

"تو میری وجہ سے۔ آہ کتنا نقصان اٹھانا پڑا ہے تمہیں میری وجہ سے۔ آہ۔ میں بہت بدنصیب ہوں۔"

"بہر حال حالات کا مقابلہ کرتی ہوئی میں یہاں تک آگئی ہوں۔ یہ لوگ مجھے میرے اصلی نام سے نہیں جانتے۔ یہاں مجھے زریں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سنو نازش! تم بھی سب کچھ بھول جاؤ۔ میں نے اس بچے کا نام ہارون رکھا ہے۔ تمہارا ہارون تمہاری تحویل میں رہے گا۔ تم اس طرح اسے اپنے آپ سے قریب کرنا کہ میں اسے ماں نہ محسوس ہوں۔ یہ تمہاری امانت ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میں اسے تمہارے حوالے کرنے میں کامیاب ہو رہی ہوں۔ یہ بھی تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔ لیکن نازش ہمیں بہر حال اپنے تحفظ کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہماری یہ کہانی کبھی منظر عام پر نہ آئے۔"

"ڈاکٹر صاحبہ! کیا ایسے انسان بھی ہوتے ہیں۔؟ میں تو انسانوں میں اچھائی کا تصور بھی کھو بیٹھی ہوں۔"

"میری کیفیت بھی تم سے کم نہیں ہے نازش لیکن بہر حال ہم دونوں ہی ظلم کا شکار ہوئی ہیں۔ ہم دونوں پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور نازش اگر تمہارے سینے میں ایک عورت کا دل ہے۔ اگر تمہارے وجود میں تھوڑی سی بھی شرافت باقی ہے۔ تو ہمیں عرفان سے انتقام لینا ہے۔ سمجھیں! ہمیں نواب عرفان سے انتقام لینا ہے۔"

"آہ۔ اگر مجھے موقع مل جائے تو تم یقین کرو۔ ایسا بدترین انتقام لوں گی اس سے کہ تاریخ میں درج ہو جائے گا۔"

"نازش! ہمیں یہ کرنا ہے۔ لیکن اس کے لئے ہمیں ایک طویل مجاہدہ کرنا ہوگا۔ اتنا طویل کہ شاید تمہیں جواب دے جائیں۔"

"اگر زندہ رہی تو میری ہمت کبھی جواب نہیں دے گی۔"

"سوچ لو۔ نازش۔"

"سوچ لیا ہے۔"

”پھر یوں سمجھ لو کہ نواب عرفان کو آخر کار ہارون ہی کے ہاتھوں کتے کی موت مرنا پڑے گا۔“

”آہ کاش! ایسا ہو جائے۔ میں یہی چاہتی ہوں تم یقین کرو میں یہی چاہتی ہوں۔“

”تب پھر ہمیں آج ہی سے اپنی محنت کا آغاز کر دینا چاہئے۔“

پھر نازش نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ کس طرح وہ نواب عرفان کے جال میں پھنس گئی۔ اور پھر کس طرح زمانے کی ٹھوکروں میں ہوتی ہوئی آخر کار اپنے پورے گھر سے جدا ہو گئی۔ اور اب وہ ایک عجیب و غریب زندگی گزار رہی تھی۔ گناہ سے بھاگتی رہی تھی۔ اور اس کے بعد ڈاکٹر شہانہ اسے مل گئی۔ اور یہاں اسے آیا کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔

”کچھ لوگ نیکیاں کرنے کے لئے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اور نیکیاں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے ساتھ وہ نیکیاں کرتے ہیں۔ کبھی کبھی انہیں ان سے اس قسم کا جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ کہ خود ان کا دل بھی داغدار ہو جائے۔ لیکن یہ داغ ہم جیسوں کو اپنے سینے پر برداشت کرنا پڑتے ہیں۔“

ہارون تقریباً سات سال کا ہو چکا تھا۔ وقت نے اپنے دھارے اس طرح تبدیل کئے تھے کہ انسان سوچ بھی نہ سکے۔ ننھا ہارون نازش کو ماں کہتا۔ اور ڈاکٹر ماہ رخ کو آنٹی۔ نرسیں ہنستی تھیں۔ حیران ہوتی تھیں۔ خود ڈاکٹر، شہانہ بھی حیران رہ جاتی تھی۔ لیکن نازش جس طرح بچے کو پیار کرتی تھی۔ اور جس طرح اسے چومتی چاٹتی تھی۔ اور جس طرح اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس سے ڈاکٹر شہانہ کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا۔ کہ یہ صرف جذباتی باتیں نہیں۔ اور زریں کھلے دل کی باظرف عورت ہے۔ جس نے اپنا سب کچھ نازش کے حوالے کر دیا ہے۔

معاملہ ایسا تھا کہ اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ بظاہر یوں لگتا تھا جیسے وقت پرسکون ہو گیا ہے۔ لیکن اگر وقت پرسکون ہو جائے تو اسے وقت کا نام ہی کیوں دیا جائے۔ زندگی تو ہلچل کا نام ہے۔ اور ہلچل کسی نہ کسی شکل میں پیدا ہو جاتی ہے۔“

ایک دن ڈاکٹر ماہ رخ اپنے فرائض میں مصروف تھی کہ ڈاکٹر فیروز اپنے کسی دوست کے ہمراہ ایک وارڈ کا معائنہ کرنے آئے۔ اور وہ لوگ جب معائنہ کرتے ہوئے دوسرے وارڈ میں داخل ہوئے تو آنے والے مہمان کا سامنا ڈاکٹر ماہ رخ سے ہو گیا۔ ڈاکٹر ماہ رخ تو کچھ ایسے مصروف تھی کہ اس نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔ لیکن سامنے جو شخص تھا۔ اس نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

”ڈاکٹر ماہ رخ،۔۔ یہ ڈاکٹر ماہ رخ ہے۔ ڈاکٹر مہروز۔“

ڈاکٹر مہروز نے چونک کر ڈاکٹر فراز کو دیکھا۔ اور کہا۔

”کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں آپ ڈاکٹر فراز۔؟“

”میں اس خاتون کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ وہ جو سامنے مریض کے ساتھ مصروف ہیں۔ یہ ڈاکٹر ماہ رخ ہیں۔“ ڈاکٹر فراز نے کہا۔ پھر اس نے دو قدم آگے بڑھا کر ڈاکٹر ماہ رخ کو آواز دی۔ ”ڈاکٹر۔ ماہ رخ۔ میری بات سنیئے۔“

اور اتنے عرصے کے بعد کسی کے منہ سے اپنا نام سن کر ڈاکٹر ماہ رخ نے چونک کر سامنے دیکھا۔ اتنا وقت گزر گیا تھا۔ کہ وہ خود اپنے نام سے نامانوس ہو گئی تھی۔ لیکن یہ چہرہ جو اسکی نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ اس سے وہ کسی طور نامانوس نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ڈاکٹر فراز تھے۔ جو اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ وہ نرس کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ڈاکٹر مہروز نے فوراً ہی دخل اندازی کی۔

”نہیں ڈاکٹر فراز! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ڈاکٹر نہیں نرس ہے۔ اور اسکا نام زرین ہے۔“ ڈاکٹر فراز نے چونک کر ڈاکٹر مہروز کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

”نرس۔“

”ہاں۔! کیا اس شکل کی کوئی لڑکی تمہیں ڈاکٹر ماہ رخ کے نام سے کبھی ملی تھی۔؟“

”کیا بات کرتے ہو ڈاکٹر مہروز! ڈاکٹر ماہ رخ کیا ہے۔ یہ سب کچھ...... اور تم...... بیٹے تم......“ ڈاکٹر ماہ رخ کے بدن سے جان نکل گئی تھی۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ اور ڈاکٹر مہروز اس کی یہ کیفیت دیکھ کر حیران تھا۔

”کیا ہے بھئی یہ سب کچھ کیا؟ کیا قصہ ہے یہ؟“

”ایں......“ ڈاکٹر فراز چونک پڑا۔ گزرے واقعات اسے اچھی طرح یاد آ گئے تھے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ اور ڈاکٹر ماہ رخ کے قریب جا کر بولا۔

”میں نہیں جانتا کہ تم کن حالات سے دوچار ہو۔ لیکن کیا میرے سامنے بھی تم اس بات سے انکار کرو گی۔ کہ تم ڈاکٹر ماہ رخ ہو......؟“ ڈاکٹر ماہ رخ کی زبان گنگ ہو گئی۔ ادھر ڈاکٹر مہروز کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت چھا گئی تھی۔ وہ ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور بولا۔

”میرے کمرے میں آؤ...... دونوں میرے کمرے میں آؤ......“ اور پھر ڈاکٹر فراز نے پرشفقت انداز میں ڈاکٹر ماہ رخ کا ہاتھ پکڑا اور دونوں ڈاکٹر مہروز کے کمرے میں پہنچ گئے۔

”بیٹھو...... کیا قصہ ہے یہ۔؟ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے واقعی کوئی بہت بڑا انکشاف ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر فراز کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ لڑکی......“

”یہ ڈاکٹر ماہ رخ ہے۔ اور میرے کلینک میں کافی عرصے تک کام کرتی رہی ہے۔“

”اوہ...... میرے خدا۔!“

”تم لوگ اسے کس نام سے پکارتے ہو۔؟“ ڈاکٹر فراز نے پوچھا۔

”زرین...... اور یہ ہمارے اسپتال میں نرس ہے۔ اور اس بات کو تقریباً سات سال یا اس سے کچھ زیادہ ہی ہو گئے ہیں۔“ ڈاکٹر فراز پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا تھا۔ جبکہ ڈاکٹر ماہ رخ اس طرح ذہنی صدمے سے دوچار ہوئی تھی۔ کہ اس کی قوت گویائی ہی سرد ہو گئی تھی۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر فوراً ہی یہاں سے بھی اٹھا گیا۔ اور ڈاکٹر مہروز ان کے ساتھ اپنی رہائش گاہ میں داخل ہو گیا۔

وہ شدید حیران تھا۔ ویسے بھی پراسرار لڑکی اس کے لئے اب تک ایک معمہ ہی بنی ہوئی تھی۔ کیونکہ نرس کی حیثیت سے وہ جو کچھ کر رہی تھی۔ وہ ناقابل یقین سا تھا۔ اس قدر ماہر، اس قدر ذہین کہ کبھی کبھی ڈاکٹر مہروز بھی اس کے سامنے اپنی تمام ذہانت کھو بیٹھتا تھا۔ ڈاکٹر شہانہ بھی آ گئیں۔ اور اس کے بعد ڈاکٹر فراز کی زبانی انکشافات ہونا شروع ہو گئے۔

”ہاں...... یہ ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر ماہ رخ کے نام سے اور میں اس کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہوں۔ کہ شاید اب یہ بھی نہ جانتی ہو۔“ ڈاکٹر شہانہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ماہ رخ پر اب بھی وہی کیفیت طاری تھی۔

”میں جانتا ہوں ڈاکٹر ماہ رخ کہ تم کس کیفیت کا شکار ہو۔ لیکن بیٹے میں خود تمہارا مجرم ہوں۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے۔ اس بات پر کہ میں نے بارہا۔ اپنے آپ کو تمہارا مجرم پایا۔ اور یہ سوچتا رہا ہوں کہ جو وعدے میں نے تم سے کیے تھے۔ میں ان کی تکمیل نہیں کر پایا۔“ ڈاکٹر ماہ رخ کے انداز میں جنبش پیدا ہوئی۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے ڈاکٹر شہانہ کو دیکھا۔ پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ تو ڈاکٹر فراز نے کہا۔

”نہیں...... یہ میرے اپنے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔، شہانہ میری کزن ہے۔ اور یہ شخص میرا بہنوئی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ میرا دوست۔ ہم دونوں نے میڈیکل کی تعلیم ساتھ ہی ساتھ حاصل کی تھی۔ اور میں واقعی بہت عرصے کے بعد اس کے پاس آیا ہوں۔ بس اس کی یاد مجھے یہاں کھینچ لائی۔ ورنہ شاید میری مصروفیت مجھے اس کی اجازت نہ دیتی۔“

”مگر یہ ڈاکٹر ماہ رخ۔“

”ہاں...... میں تمہیں سناتا ہوں، یہ ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہے۔ اپنی محنت اپنی لگن، اپنی ذہانت، سے اس نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد ایک اسپتال میں ہاؤس جاب کرنے لگی، جب اس کا ہاؤس جاب مکمل ہوا تو میں اس اسپتال سے نوکری چھوڑ رہا تھا۔ لالہ جان میں، اپنا کلینک قائم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کلینک قائم کیا۔ اور ڈاکٹر ماہ رخ کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔

لیکن ایک رات، جب یہ وہاں سے گھر جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اچانک لاپتہ ہوگئی۔ اور اس کے بعد۔ آج میں پہلی بار اسے دیکھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر ماہ رخ کیا مجھے اپنے بارے میں کچھ تفصیل بتانا پسند کروگی۔" تب ڈاکٹر ماہ رخ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ اور پھر آنسوؤں کی روانی کے ساتھ اس نے رندھے ہوئے لہجے اپنی داستان سنانا شروع کردی۔ اور کہانی کے آخری حصے تک پہنچ گئی۔

اس نے بتایا کہ "اس بچے کی ماں اب بھی اس کے ساتھ موجود ہے۔ اور یہاں آیا کی حیثیت سے یہاں ملازمت کرتی ہے۔ وقت نے ان دونوں کو یکجا کردیا ہے۔ میں نے اس عورت کا بیٹا مکمل طور پر اس کے حوالے کردیا ہے۔ لیکن میں اپنا جو کچھ کھو چکی ہوں۔ وہ شاید کبھی نہ پاسکوں۔" ڈاکٹر فراز نے ساری تفصیل سننے کے بعد کہا۔

"نہیں بیٹا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ کہانی اس کے بعد ہی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ بدبخت زندہ ہے۔ عیش وعشرت سے زندگی بسر کررہا ہے۔ اور نجانے کتنی لڑکیوں کو اس نے اس طرح اپنی وحشت کی بھینٹ چڑھایا ہوگا۔ ہاں...... نواب عرفان اب بھی زندہ ہے۔"

اس وقت یوں ہوا کہ ہم تمہارے بارے میں شدید تشویش کا شکار ہوئے۔ پہلے تو ہم یہی کوشش کرتے رہے کہ ہم اپنی پوری کوششیں اور اثر ورسوخ استعمال کرکے تمہیں تلاش کرسکیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی ہے تو اسے ہموار کرلیا جائے۔

بعد میں نواب عرفان کے اشارے پر اس وقت اس علاقے کا انسپکٹر جس کا نام ظفر علی ہے مجھ سے ملا۔ اس نے مجھے ساری تفصیل سنائی۔ لیکن ظفر علی مجھ سے بھی عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے کہا۔

"اگر ڈاکٹر ماہ رخ کہیں مل جائے تو اسے خاموشی سے کہیں روپوش کردیا جائے۔ ورنہ اس کے بعد حالات بہت خراب ہوجائیں گے۔ لیکن تم ہمیں دستیاب نہ ہوسکیں۔

خود ظفر علی نے بھی بہت کوشش کی لیکن تمہارا پتہ نہیں چل سکا، بات آہستہ آہستہ ختم ہوگئی۔ اور اب تقریباً سب کے ذہنوں سے نکل چکی ہے۔ تمہاری والدہ، بہن اور بھائیوں کے حالات بھی زیادہ خراب نہیں ہیں۔ قدرت سب کا ہی انتظام کردیتی ہے یہ وہ داستان ہے۔ جو اب تک میرے علم میں ہے۔" سب لوگ حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر ماہ رخ کی آنکھیں آنسو برسا رہی تھیں۔ تمام صورتحال تقریباً سب ہی کے علم میں آچکی تھی۔ ڈاکٹر مہروز اور ڈاکٹر شہانہ اس لڑکی سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اور اب بھی اس کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ ڈاکٹر شہانہ نے کہا۔

"کاش تم ہمیں یہ سب بتادیتیں ڈاکٹر ماہ رخ۔ تو ہم بہرحال تمہیں ایک نرس کی حیثیت سے کام نہ کرنے دیتے۔"

"نہیں یہ اس کی عظمت ہے کہ اس نے اس حیثیت میں بھی آپ لوگوں کو مطمئن رکھا۔"

"ہم تو واقعی کبھی کبھی پاگل ہوجاتے تھے، ڈاکٹر ماہ رخ کی کارکردگی دیکھ کر۔"

"خیر اب یہ سب کچھ تو ہے۔ مجھے بتاؤ۔ ڈاکٹر ماہ رخ میں تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں۔"

"ڈاکٹر فراز! اب جبکہ یہ سب کچھ سامنے آچکا ہے۔ تو پھر میرے لئے یہاں رہنا بھی مناسب نہیں ہوگا وہ لڑکی میرے پاس موجود ہے۔ جو اس بچے کی ماں ہے۔ اور ہارون اچھے طریقے سے پل رہا ہے۔ لیکن لیکن...... لیکن......"

"نہیں بی بی! میں نے تم سے ایک خاص محبت محسوس کی تھی ہمیشہ اور اسی محبت سے مجبور ہوکر میں تمہیں لالہ جان اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ میں خود بھی تھوڑی سی ذمہ داری محسوس کرتا ہوں۔ ڈاکٹر مہروز حقدار کو حق ملنا چاہئے۔ ہم ڈاکٹر ماہ رخ کے لئے کیا کرسکتے ہیں۔؟"

"پہلا کام تو یہ کہ اسے زرین ہی رہنے دیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ میں یہاں قریب ایک شہر میں ایک کلینک قائم کررہا ہوں۔ ڈاکٹر ماہ رخ یا زرین اب وہ کلینک سنبھالیں گی، میں انہیں مکمل طور پر وہاں کی ذمہ داریاں

سونپ دوں گا۔"

"یہ بہت بہتر ہوگا۔ کیونکہ یہاں جو ان کے شناسا موجود ہیں۔ ان کے سامنے وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے جاتے ہوئے کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کریں گی۔"

"بے شک مجھے اس کا احساس ہے۔" ڈاکٹر فراز سے اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔ ماہ رخ نے ماں اور بہن کے لئے ڈاکٹر فراز سے کچھ خاص قسم کی باتیں کیں۔ اور ڈاکٹر فراز نے وعدہ کیا کہ ان لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں ہونے پائے گی۔ پھر اس کے بعد ڈاکٹر فراز، ڈاکٹر ماہ رخ کی زندگی میں نیا انقلاب برپا کرکے وہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔

اچھے لوگوں کو اچھے لوگ مل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مہروز اور ڈاکٹر شہانہ درحقیقت ڈاکٹر ماہ رخ کے لئے بہترین مستقبل ثابت ہوئے۔ جو وقت گزر چکا تھا۔ اسکی ایک الگ داستان تھی۔ اور اس کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ صورتحال کیا ہے۔

بہرحال یہ لوگ وہاں سے شفٹ ہوگئے۔ اور اب ایک چھوٹے سے شہر میں انہوں نے زندگی کا آغاز کیا۔ یہاں زیادہ سکون تھا۔ بہت ہی خوبصورت کلینک بنایا گیا تھا۔ جسے ڈاکٹر ماہ رخ اور نازش کی محنت نے چار چاند لگائے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہاں کا بول بالا ہوگیا۔ ڈاکٹر ماہ رخ اب ڈاکٹر زرین کی حیثیت سے زندگی بسر کررہی تھی۔ اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے بعد اسے جو کچھ حاصل ہوا تھا۔ وہ حقیقتاً اس کا حق تھا۔ ایک پروقار شخصیت کی مالک تو وہ پہلے ہی تھی۔ اب اس کی شخصیت میں اور نکھار پیدا ہوگیا تھا۔

حلیہ بھی کافی تبدیل ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر زرین کی حیثیت سے وہ اپنے شہر اپنے علاقے کے بڑے بڑے لوگوں میں بے حد ممتاز تھی۔ کلینک اچھی طرح چل پڑا تھا۔ اور اب اس میں ڈاکٹر ماہ رخ برابر کی حصہ دار تھی۔ سرمائے کا کوئی خاص خرچ نہیں تھا۔ ہارون کی شخصیت بھی انتہائی حسین نکل رہی تھی۔ دو ماؤں کی نگرانی میں اس کی پرورش ہورہی تھی۔ اور وہ ہنس کر کہتا تھا۔

"میں فیصلہ نہیں کرسکتا کہ میری اصل ماں کون ہے؟" نازش بھی ڈاکٹر ماہ رخ کی شکر گزار تھی۔ کہ اس نے اس کے بچے کے لئے جو کچھ کیا وہ ناقابل یقین تھا۔

بہرحال یہ ایک عجیب الجھی ہوئی کہانی تھی۔ نازش کا تو خیر مسئلہ ہی کچھ اور تھا۔ وہ ایک ہوس کار درندے کی بھینٹ چڑھی تھی۔ لیکن ڈاکٹر ماہ رخ کی کہانی تو بڑی دلچسپ اور عجیب تھی۔ بس ایک اتفاقیہ حادثے نے اس کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ ماں، بہن، بھائی یہاں تک کہ وہ محبوب جو اس کا منگیتر تھا۔ اور اگر حالات ہموار رہتے تو اس وقت وہ زندگی کے انتہائی خوشگوار دور سے گزر رہی ہوتی۔ لیکن وقت نے ایک ایسا جال ڈالا تھا۔ کہ اب وہ بالکل ہی تبدیل شدہ شخصیت بن کر رہ گئی تھی۔

نازش کے دل میں انتقام کی آگ اس قدر شدید نہ ہو جس قدر اس کے دل میں تھی۔ بہرحال اس آگ کے سہارے زندگی بسر ہوتی رہی۔ ہارون کو بہترین تعلیم سے آراستہ کیا گیا۔ دونوں کی کاوشیں اس کے ساتھ تھیں۔ باقاعدہ ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اس شہر سے دور چلا گیا تھا۔ اور وہ دونوں انتہائی محنت کرکے ہارون کا مستقبل تعمیر کررہی تھیں۔ سال، ڈیڑھ سال میں ہارون ایک بار آتا، پھر ان دونوں کی عقیدت اس کے دل میں ہوتی تھی۔ اب اس کی سوچیں آہستہ آہستہ جوان ہوتی جارہی تھیں۔ ویسے تو زندگی کے مختلف شعبے تھے۔ تعلیم، ہاسٹل کے دوست اپنی زندگی کی بہترین تفریحات، لیکن اس کے ساتھ کبھی کبھی اس کے دل میں کبھی کبھی عجیب وغریب خیالات رقصاں ہوجاتے تھے۔ یہ مائیں ایک عجیب کیفیت کی حامل ہیں۔ لیکن کبھی انہوں نے میرے باپ کا تذکرہ نہیں کیا۔

غرض یہ کہ معاملات چلتے رہے۔ جوانی کی سرحدیں عبور کیں۔ اور زندگی کی اس منزل میں داخل ہوگیا۔ جہاں سوجھ بوجھ بے پناہ بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر، زرین اور اس کی ماں دونوں ہی اس کی نگاہ میں انتہائی پراسرار شخصیتیں تھیں۔ بارہا۔ دل میں خیال آیا تھا۔ کہ معلومات حاصل کرے کہ آخر وہ کون ہے؟ زندگی کے دوسرے شعبے بھی تھے۔ اور زندگی کی وہ تمام ضرورتیں بھی جو بہرحال عمر

کی دین ہوتی ہیں۔

اور عمر کی اس دین میں فرحین اس کی زندگی میں شامل ہوئی۔ ایک بھولی بھالی سی کانچ کی لڑکی جو حسن و جمال میں اپنی مثال آپ تھی۔ بہت ہی خوشگوار شخصیت کی مالک۔ ایک بار گفتگو ہو جائے تو بار بار بات کرنے کو جی چاہے۔ فرحین اس شہر میں رہتی تھی۔ جہاں ہارون تعلیم حاصل کرتا تھا۔ دونوں کے درمیان یگانگت بڑھی اور اس کے بعد ایک بار فرحین، ہارون کو اپنے گھر لے گئی۔ بہت ہی بولڈ لڑکی تھی۔ اس نے ہارون کو اپنے والدین سے ملایا۔ اور شہروز نے پرتپاک انداز میں ہارون کا خیر مقدم کیا۔ ہارون کی شخصیت ایک نگاہ میں اس کے دل کو بھا گئی۔

''ڈیڈی یہ ہارون ہیں۔ میرے کالج کے ساتھی، میں نے آپ سے ان کا تذکرہ کیا تھا ناں....؟''

''ہاں......بالکل بھلا اس انداز میں تعارف کرانے کی کیا ضرورت ہے، ہارون تو خود اپنا تعارف ہیں۔''

''ہارون اپنے ڈیڈی کے بارے میں، میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ وہ میری ممی ہیں۔''

''آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اصل میں فرحین سے آپ کے اتنے تذکرے سنے ہیں۔ کہ آپ لوگ یقین کیجئے۔ کہ میں نے آپ کی صورتیں تک اپنی آنکھوں میں بسالی ہیں۔''

''ہارون میاں! مستقبل کا کیا پروگرام ہے....؟''

''تجارت کی طرف مائل ہے ذہن، امی، اور آنٹی کا کہنا ہے کہ وہ مجھے تاجر بنائیں گی۔''

''بہت سمجھدار خواتین ہیں۔ آپ کی ممی اور آنٹی اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ملازمت کسی پیمانے پر کر لی جائے، ملازمت ہی ہوتی ہے۔ جبکہ تجارت میں انسانی زندگی کے لئے اتنے مواقع ہوتے ہیں کہ کہیں اس کے راستے نہیں رکتے، بڑی اچھی سوچ ہے آپ کے ڈیڈی کیا کرتے ہیں....؟''

''ڈیڈی لاپتہ ہیں۔''

''کیا مطلب....؟''

''جناب کوئی حادثہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ اصل میں کچھ عجیب صورتحال ہے میری پرورش کنندگان میری ممی اور آنٹی ہیں۔ یوں لگتا ہے، جیسے انہوں نے میری پرورش کے علاوہ اس دنیا میں کچھ نہیں کیا ہے۔ ڈیڈی کا نام اتنا پر اسرار رکھا گیا ہے کہ آج تک کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ بارہا دل چاہا کہ اس بارے میں ان سے معلومات حاصل کروں لیکن آپ یقین کریں میری زبان پر تالا لگ جاتا ہے۔ اس وقت جب میں ان کے بارے میں پوچھتا ہوں۔''

''حادثہ'' شہروز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''جی ہاں۔ میری ممی آپ یقین کریں کہ ایک بہت اچھی خاتون ہیں اس لئے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں ان کی کوئی لگاوٹ ہوں۔ یا ان کا گناہ ہوں۔ یقیناً کوئی ایسی ہی بات ہے۔ جو آج تک مجھے بتائی نہیں گئی۔ اصل میں جناب۔

معاشرے میں مجھ جیسے شخص کا معاملہ بڑا الجھا ہوا ہوتا ہے۔ ایک دوبار فرحین سے بھی اس بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور میں نے فرحین سے کھل کر کہا ہے کہ فرحین کہیں ایسا نہ ہو کہ میں معاشرے کی ناپسندیدہ شخصیت قرار پاؤں۔ اور دنیا سے میرا رابطہ ٹوٹ جائے۔ لیکن جناب بہر حال جو حقیقتیں ہیں۔ ان سے گریز نہیں کیا جاسکتا۔'' شہروز حیران رہ گیا تھا۔ اتنے صاف الفاظ میں اپنے بارے میں بیان کر دینے والا نوجوان اندر سے کس قدر شفاف ہے۔ اس کا اندازہ اس کی گفتگو سے ہوتا تھا دنیا کے سامنے اگر وہ یہ الفاظ کہتا تو لوگ اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے لیکن کوئی صاحب دل اس بات کی حقیقت کی گہرائیوں کو چھان سکتا تھا۔ اور شہروز انہی لوگوں میں سے تھا۔ اس نے ہارون کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹے بات بہت عجیب ہے۔ سماج کے بنائے ہوئے بہت سے قوانین میرے ذہن میں بڑا اضطراب پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک ایسا نوجوان جس کی اپنی شخصیت بڑی مستحکم ہو۔ وہ سچ بولنا جانتا ہو۔ اس کا کردار بے داغ ہو۔ لیکن بعد میں پتہ یہ چلے کہ وہ کسی ایسے حادثے کی بناء پر دنیا میں آیا جو سماج میں جرم یا سماج کی نگاہوں میں اس کا ایک گندہ مقام ہے۔ تو آج تک مجھے

کوئی یہ بتانے میں ناکام رہا ہے کہ اس نوجوان کا اس حادثے میں کتنا ہاتھ ہوتا ہے۔ خیر، ہارون! میں ذرا مختلف قسم کا انسان ہوں۔ سنو، خدانخواستہ تمہاری زندگی میں اگر کوئی ایسا حادثہ ہے تو تم یقین کرو۔ کہ میں تمہیں اس سے قطعی طور پر بری الذمہ قرار دوں گا۔ بیٹے۔ ان الفاظ کو یاد رکھنا۔'' ہارون سحر زدہ رہ گیا تھا۔ شہروز کے ان جملوں نے اس کے دل میں شہروز کے لئے ایک انوکھا مقام پیدا کر دیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''جناب! کوئی قسم تو نہیں کھاؤں گا میں، کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن شاید یہ الفاظ میری زندگی کی انتہا تک میرے ذہن میں وہ راستے کھولنے کا باعث بن گئے ہیں۔ جن کے تحت اگر کوئی گمنام نوجوان مجھ تک پہنچا یا کوئی لڑکی میرے قریب آئی تو میں اسے عزت کا وہی مقام دوں گا۔ جو عام انسانوں کا ہوتا ہے۔''

ہارون کے جانے کے بعد شہروز نے کہا۔

''وہ ایک آئیڈیل نوجوان ہے۔ فرحین اور یقین کرو کہ مجھے بے حد پسند ہے۔ اس جیسی شخصیت کے لئے اس کی ذات کی ہر کمی کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔'' فرحین باپ کے ان الفاظ سے سرشار ہو گئی تھی۔ بہت اچھے لوگوں کا ساتھ ملا تھا اسے، بہت ہی اچھے لوگوں کا ساتھ......بہر حال ہارون بھی بہت ہی متاثر ہوا تھا۔ فرحین نے جب اسے اپنے باپ کے خیالات کے بارے میں بتایا تو ہارون نے کہا۔

''فرحین! قابل قدر ہو تم کہ ایک اتنے عظیم گھرانے میں پیدا ہوئی ہو۔''

بہر حال معاملات چلتے رہے۔ ہارون کے ذہن میں ایک کریدی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی کوئی ایسی بات ہو۔ جوان لوگوں کے لئے ناقابل بیان ہو۔ جن کا نام زرین، اور نازش تھا۔ لیکن اس بار جب وہ گھر آیا تو اس نے انتہائی سنجیدگی سے ڈاکٹر زرین سے کہا۔

''آنٹی! آپ لوگوں کے لئے میرے دل میں کیا مقام ہے۔ نہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اور بیان کر کے میں آپ کو یا آپ کی شخصیت کو ہلکان نہیں کرتا

چاہتا۔ آپ میرے لئے جو کچھ بھی ہیں۔ اب میں اسکا تجزیہ کرنا جانتا ہوں۔ میری عمر اب بائیسویں سال میں ہے۔ اور اب میرا ذہن اس قدر ناپختہ نہیں رہا۔ کہ میں اپنے اور آپ کے بارے میں نہ سوچ سکوں۔ دیکھیے۔ آنٹی، دیکھیے ممی بات کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر انسان کو اپنے بارے میں جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اس کے اپنے مستقبل کا آغاز ہوتا ہے۔ میں آپ لوگوں سے اپنے بارے میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ تصور ہے۔ کہ یہ معلومات مجھے کسی جذباتی ہیجان میں مبتلا کردیں گی۔ تو پہلے سن لیجئے۔ کہ ایسا نہیں ہوگا۔

کیونکہ میں ایک ٹھوس شخصیت کا انسان ہوں۔ حقیقتوں کی گہرائیوں تک پہنچنا جانتا ہوں۔ انسان سے ہر کمزوری سرزد ہوسکتی ہے۔ کیونکہ وہ انتہائی کمزور شخصیت کا ملک ہے۔ ممی، آنٹی، اگر وہ کمزوری ضرورت سمجھ کر خود پر مسلط کرلی جائے تو صحیح معنوں میں اس وقت وہ گناہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی مجبوری، کوئی ایسا واقعہ جو انسان کے اپنے بس میں نہ ہو۔ کسی شکل میں رونما ہوجاتا ہے۔ تو خدا کی قسم میں اسے صرف ایک حادثہ سمجھتا ہوں۔ اور شاید میں اس پر بالکل توجہ نہ دے سکوں۔

میرا خیال ہے۔ میں نے اپنے احساسات کو واضح الفاظ میں آپ کے سامنے بیان کردیا ہے۔ اب بھی اگر میں آپ لوگوں کو اپنا مافی الضمیر سمجھانے میں ناکام رہا ہوں۔ تو اسے اپنی بدقسمتی کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" نازش نے ڈاکٹر ماہ رخ کی جانب دیکھا۔ اور ڈاکٹر ماہ رخ نے اسے، چند لمحوں کے لئے دونوں کے چہروں پر ایک عجیب سی کیفیت چھائی رہی۔ اس کے بعد ڈاکٹر ماہ رخ نے کہا۔

"میں تسلیم کرتی ہوں۔ ہارون! کہ اب واقعی وہ وقت آگیا ہے۔ کہ جب ہم تمہیں تمہاری کہانی سنادیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ ساتھ ہی تمہیں وہ اہم فریضہ انجام دینا ہے جسے اپنے دل میں رکھ کر ہم نے اتنی طویل زندگی انتظار کیا ہے۔ فیصلہ کرنے کا حق تمہیں حاصل ہے ہارون! مکمل طور پر تمہیں۔ لیکن ایک بار ضرور سن لینا ہم نے جو فیصلہ تمہاری ذات سے منسوب کرکے کیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اسی پر عمل کریں۔ لیکن اگر تم کسی طور سے اس سے منحرف ہوگئے تو یہ مت سمجھنا کہ ہمارے اور تمہارے تعلق میں کوئی کمی آجائے گی۔ لیکن اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ ہمیں کرنا وہی ہے۔ جو ہم نے سوچا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ تمہارا تعاون حاصل نہیں ہوا تو ہم اپنے طور پر کوئی اور منصوبہ بنائیں گے۔ انسان زندگی میں جوا، کھیلتا ہے اور ہارتا رہتا ہے۔ جیتتا بھی ہے۔ لیکن ہارنے کے بعد جیتنے کے لئے جدوجہد کرنا ہی اس کے جذبوں کی سچائی کا اظہار ہوتا ہے اور ہم اپنے ان جذبوں کو سچا کرنے میں اپنی آخری کوشش بھی صرف کردیں گے۔

"میں تمہیں ساری تفصیل بتاتی ہوں اور اس کے بعد تمہیں بھی دوٹوک فیصلہ کرنا ہوگا۔" ہارون خاموشی سے ڈاکٹر ماہ رخ کی صورت دیکھ رہا تھا۔ تب ڈاکٹر ماہ رخ نے کہانی اس رات سے شروع کی جب اسے اپنے گھر کے لئے روانہ ہونا تھا۔ امنگوں اور آرزوؤں کے دامن میں سفر کرتے ہوئے اور اس کے بعد کہانی اختتام کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"ڈاکٹر فراز سے میرا رابطہ ہے۔ ڈاکٹر فراز مجھے اس شیطان کے بارے مسلسل تفصیل بتاتے رہے ہیں۔ اسے سزائیں مل رہی ہیں۔ لیکن وہ بدبخت اس قدر بے حس اور بدترین فطرت کا مالک ہے۔ کہ ان سزاؤں کو وہ کھاتے ہی میں نہیں لارہا، دو جوان بیٹے ہلاک ہوچکے ہیں۔ اس کے اور ڈاکٹر فراز کا تجزیہ ہے کہ جوان کے بارے میں مشہور کیا گیا ہے۔ وہ غلط ہے۔ ان کی موت انتہائی پراسرار اور اچانک ہے۔ اور اس پر نواب عرفان کی خاموشی اس بات کا مظہر ہے کہ اس نے اپنے بیٹوں کی موت کی اصل حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے۔ جیسا باپ ویسے بیٹے۔ یقیناً ان اموات کا تعلق کسی کی بربادی سے ہوگا۔" ڈاکٹر ماہ رخ نے ہارون کا چہرہ دیکھا۔ جو، سپاٹ، خاموش، اور پرسکون تھا۔

☆......☆......☆

عرفان کی حویلی میں ڈاکٹر فیضان عرفان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

"مجھے خوشی ہے کہ میں تمہاری نفسیاتی گرہ کھولنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے۔ میرے دوست کہ زندگی جب تک وفا کرے انسان کو زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہیے۔"

"یار مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میرے لئے کسی حسین لڑکی کا انتخاب کون کرے گا؟"

"میں۔" ڈاکٹر فیضان نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم۔!"

"ہاں۔ میں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے اور میں تم سے اس کی توقع بھی رکھتا ہوں۔ لیکن ایک بات سنو، کیا۔ لڑکی کے بارے میں کوئی تصور ہے۔ تمہارے ذہن میں؟"

"ہاں۔ ہے۔"

"کیا؟"

"تمہاری امنگوں اور آرزوؤں کے مطابق۔ اصل میں تم نہیں جانتے میرے تعلقات ایک شخص سے ہیں۔ نام ہے۔ منصور کاروبار بہت شاندار ہے۔ اور یوں سمجھ لو کہ لڑکی بھی شعلہ جوالہ ہے۔ بالی سی عمر یا، پتلی سی کمریا، حسین، نازک اندام، زندگی کی لطافتوں سے بھرپور، چہرے پر کھلتی شفق، آنکھوں میں مسکراتی ہوئی چمک، بس یوں سمجھ لو کہ دیکھو گے تو سرشار ہوجاؤ گے۔" نواب عرفان کی آنکھوں میں پھر وہی پرہوس چمک لہرائی اس کے بعد اس نے کسی قدر افسردگی سے کہا۔

"یہ ساری کہانی تو تم نے سنادی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا؟"

"یہ سوال جو پیدا ہوتا ہے ناں۔ اسے ڈاکٹر فیضان پر چھوڑ دو...... بس مسئلہ طے کرنا میرا کام ہے۔ اور مسئلے کو خوبصورتی سے آگے بڑھانا ہے تمہارا۔"

"تو پھر تم سمجھ لو...... کہ اس ڈرامے کے ڈائریکٹر تم ہوگے۔"

"دل و جان سے منظور ہے۔ بہت جلد ملاقات کرادوں گا تمہاری۔"

"ارے ہاں یوں لگتا ہے کہ تقدیر کچھ بہتری کی طرف مائل ہے۔ ایک پراپرٹی ڈیلر ہے جس سے میں نے سفید محل کو فروخت کرنے کی بات کی تھی۔ اس نے کوئی گاہک بھی پیدا کرلیا ہے۔" نواب عرفان نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھ کر کہا۔ "شاید آنے ہی والا ہو۔"

"کون ہے؟"

"ظاہر ہے۔ یہ تو پراپرٹی ڈیلر نہیں بتا سکتا۔ انتظار کرلو۔ تمہارے سامنے ہی یہ مسئلہ طے ہوجائے۔ اصل میں میرے ذہن پر سفید محل کا نفسیاتی اثر ہے۔ جسے دور کرنا واقعی آسان کام نہیں ہوگا۔ سفید محل کی کہانی میری زندگی سے نکل جائے تو یوں سمجھ لو کہ زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوجائے گا۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے میں بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ اگر سفید محل کا کھیل ختم ہوجائے تو پھر وہ تمہاری زندگی سے نکل جائے گا۔ اور تم زیادہ بہتر اور پرسکون زندگی گزار سکو گے۔"

باہر سے کسی ملازم نے کچھ ملاقاتیوں کے آنے کی اطلاع دی تو نواب عرفان علی نے کہا۔

"وہی لوگ ہوں گے۔" اس کے بعد ڈاکٹر فیضان اور نواب عرفان علی نے جن دو شخصیتوں کا استقبال کیا۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر تو نواب عرفان عجیب سی کیفیت کا شکار ہوگیا۔ بہت ہی خوبصورت نوجوان تھا۔ تیکھے نقوش، بلند و بالا قد، نہ جانے اس کے چہرے پر کیا چیز تھی کہ اسے دیکھ کر نواب عرفان کھوسا گیا۔ آنے والوں میں سے ایک پراپرٹی ڈیلر تھا۔ جس نے اپنی پیشہ وارانہ گفتگو کا آغاز فوراً کردیا کہنے لگا۔

"حضور نواب صاحب! اتنا تو میں جانتا ہوں۔ کہ حضور والا کو بھلا کسی چیز کو فروخت کرنے سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ یہ آپ کا نہیں میرا معاملہ ہے۔ ظاہر ہے آپ ہی کے رحم و کرم پر جیتے ہیں۔ یہ ہارون صاحب، کون ہیں۔ کیا ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟ یہ تو نہیں معلوم لیکن بہرحال سفید محل کو خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔"

نواب عرفان چونک سا پڑا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھیئے آپ۔"

"شکریہ۔" ہارون سامنے بیٹھ گیا۔

"ہارون صاحب سفید محل دیکھ لیا ہے۔ آپ نے۔؟"

"جی، جواد صاحب نے مجھے وہ حسین عمارت دکھائی ہے۔"

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے خریدنے میں آپ کا کیا جذبہ اور کیا تصور ہے۔؟"

"اصل میں کہانی ذرا طویل ہو جاتی ہے۔ آپ چند الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ مجھے قدیم عمارتوں کا شوق ہے۔ اور میں ایسی عمارتوں سے بے پناہ دلچسپی رکھتا ہوں۔ سفید محل دیکھنے کے بعد بلکہ یوں سمجھیں کہ ایک بار میرا ادھر سے گزر ہوا۔ تو میں نے اسے دیکھا۔ اور میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوگئی۔ کہ اس عمارت کو خریدنا چاہئے۔ اگر یہ اپنی ملکیت ہو تو میں اس میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کروں۔ بس میں نے کھوج شروع کردی ہے۔ اور آخر کار جواد صاحب کے ذریعے آپ کا پتہ معلوم ہوگیا۔"

"اصل میں بہت قدیم عمارت ہے۔ ہماری جدی پشتی سمجھ لیجئے۔ لیکن اب ہمارے لئے یہ بے مقصد اور بے مطلب ہوگئی ہے۔ بے کار پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ کسی صاحب نظر کے ہاتھ فروخت کردوں۔ جو اس کی اصلیت کو جانتا ہوں۔"

"براہ کرم مجھے اس کی مناسب قیمت بتا دیجئے گا۔"

"آپ خود اس کی قیمت لگایئے اور بات ختم کر دیجئے۔"

"نہیں جناب! آپ کی ملکیت ہے۔"

"میں نے کہا ناں شاید آپ کو میرے نام سے مکمل واقفیت نہ ہو۔ تھوڑے بہت کم پیسے یا زیادہ پیسے میرے لئے اہمیت نہیں رکھتے۔ بس دل میں جو ٹھان لی۔ سو ٹھان لی۔"

"پھر بھی۔؟"

"پھر..... پھر بھی فیضان تم فیصلہ کردو۔ مجھے تو ہر قیمت منظور ہے۔" اور اس کے بعد ایک قیمت کا تعین ہوا۔ اور ہارون نے بغیر کسی جھجک کے اسے منظور کرلیا۔

"ویری گڈ! تو پھر ایسا کرو۔ جواد صاحب کہ اس کے تمام کاغذات تیار کرادو۔ اور عمارت کی پوزیشن انہیں دے دو۔ لین دین کے مسئلے کو بھی ہارون صاحب کی پسند کے مطابق ہی طے کرلیا جائے۔"

"بہت بہتر جناب۔"

"اجازت دیجئے۔" ہارون نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو..... کچھ کھاؤ..... پیو۔ خوشی ہوگی مجھے" نواب عرفان نے کہا۔

"اطمینان سے جناب اطمینان سے بلکہ میں خود آپ کو سفید محل کے حصول کی خوشی میں دعوت دوں گا۔ اور اس وقت آپ وعدہ کیجئے کہ آپ ضرور شرکت کریں گے۔"

"ضرور ہم وعدہ کرتے ہیں۔" نواب عرفان علی نے شاہانہ شان سے کہا۔ اور اس کے بعد ہارون ان سے اجازت لے کر اٹھ گیا۔ نواب عرفان کھوئی کھوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ فیضان پر بھی ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ پھر دونوں چونکے اور فیضان نے کہا۔

"کیا دلکش شخصیت کا نوجوان تھا۔ لڑکیوں کے دلوں کو تو یہ اس طرح اپنی مٹھی میں لے لیتا ہوگا کہ لڑکیاں سوچ بھی نہ پاتی ہوں گی۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے۔" اس نے میرے دل پر بھی ایک عجیب سا اثر چھوڑا ہے۔"

"واقعی کچھ حسین قدرت اپنے ہاتھ سے تشکیل دیتی ہے۔ لیکن تم کسی شخص سے بہت کم متاثر ہوئے ہو۔"

"یہی تو میں کہنے والا تھا۔ فیضان، زندگی میں واقعی میں بہت کم کسی سے متاثر ہوا ہوں۔ جتنا اس نوجوان سے، یقین کرو۔ اگر سفید محل کی قیمت کے طور پر مجھے یہ ایک پیسہ بھی نہ دیتا تو میں سفید محل کو اس کی ملکیت بنائے بغیر نہ رہتا۔"

"کیا بات ہے۔ نوابوں والی بات ہے۔ بھائی اب ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" فیضان نے کہا اور خود بخود ہنسنے لگا۔ لیکن نواب عرفان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔ نہ جانے کیوں یہ نوجوان اس کے دل کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔

فیضان چلا گیا۔ بہت سے احساسات چھوڑ گیا تھا۔ ایک بار پھر زندگی میں ایک حسین تصور بیدار ہوگیا تھا۔ ایک ایسا تصور جو حسن و جمال کے دلکش پیراہن سے آراستہ تھا۔

یوں تو زندگی میں لاتعداد نشیب و فراز آتے ہیں۔ لیکن آگے بڑھتا ہوا وقت اور بھی بہت سے احساسات جگاتا ہے اور نواب عرفان بھی ان احساسات کی گرفت میں آگیا تھا۔

اپنی کیفیات سے لاکھ منحرف ہونے کے باوجود اعصاب اسے احساس دلاتے تھے کہ اب عمر کی برتری قبول کرلی جائے۔ زندگی کی وہ رنگینیاں جنہیں وہ اب تک قائم رکھے ہوئے تھا۔ رنگ بدلتی جارہی تھیں۔ اور کبھی کبھی ان میں لغزشوں کا احساس ہوتا تھا۔ وہ لغزشیں جو کبھی کسی نازک وجود کے احساس سے دل میں پیدا ہوتی تھیں۔ اب دوسری شکل اختیار کرگئی تھیں۔ ان میں ایک خوف کا ہلکا سا احساس پیدا ہوتا تھا۔

ڈاکٹر فیضان نے جس حسین پیکر کی تصویر کھینچی تھی وہ ذہن کو مضطرب کررہا تھا۔ خواہش تو یہ تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہوسکے یہ مرحلہ طے کرلیا جائے۔ ویسے پچھلے کافی عرصے سے نواب عرفان سوچ رہا تھا۔ کہ زندگی کی یہ بے کلی جواب ایک مسلسل خلش بنی رہتی ہے۔ کس طرح دور کی جاسکتی ہے۔ اصل میں جو دوسرے معاملات ہوتے تھے ان کے لئے تو رہائش گاہ چھوڑنی پڑتی تھی۔

کیونکہ بہرحال اپنا ایک مقام بھی رکھنا ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ تر وقت رہائش گاہ ہی میں بسر ہوتا ہے۔ اور وہاں تنہائی کا وہ احساس جو کبھی کبھی بڑی شدت سے ابھرتا تھا۔ جان لیوا بن جاتا تھا۔

چنانچہ یہ خیال بہت عرصے سے اس کے دل میں پیدا ہورہا تھا۔ کہ اس حویلی کو اس طرح غیر آباد نہیں رہنا چاہئے۔ اس رات بھی ڈاکٹر فیضان کے جانے کے بعد جب وہ اپنی خوابگاہ میں پہنچا۔ اور لباس وغیرہ تبدیل کرکے اپنے بستر پر لیٹا تو نہ جانے کیوں یہی تمام احساسات اس کے ذہن میں ابھر آئے۔ اور اس کے بعد بے کلی کے اس دور کا آغاز ہوگیا۔ جو کئی بار ایک دورے کی شکل میں اسے پریشان کرچکا تھا۔ اس نے اپنے دل کو ایک سفید محل کی طرح ایک سنگین چٹان میں تبدیل کرلیا تھا۔ لیکن یہ صرف عارضی بہلاوے ہوتے ہیں۔ انسان اپنی فطرت سے بھلا الگ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ گوشت کا لوتھڑا جسے دل کہتے ہیں۔ ہمیشہ گوشت کا لوتھڑا ہی رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ اس پر سیاہی کے غلاف چڑھا لئے جائیں۔ لیکن یہ غلاف پھٹتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی کسی احساس کے ساتھ کبھی کسی احساس کے ساتھ کہیں نہ کہیں دل کی اصل شکل نمودار ہو جاتی ہے۔ اور وہ سیاہ دل جو اپنے آپ کو دنیا سے دور ہٹا چکے ہوتے ہیں اس وقت بڑی بے چینی اور اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جب ان پر دلی کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے۔ سو اس وقت نواب عرفان پر بھی یہی غلبہ ہوا تھا۔ جو کھو چکا تھا۔ اسے پانے کی آرزو کبھی نہیں کی تھی۔ لیکن ان کے لئے دل میں گداز بھی پیدا نہیں کیا تھا۔ آج نجانے کیوں اسے اپنے اہل خانہ یاد آرہے تھے۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ زندگی گزارنے کا جو فیصلہ اس نے کیا۔ کیا وہ غلط تھا۔؟ ابتداء جیسے بھی ہوئی ہو۔ برائی کا آغاز جہاں گزارا ہو کہیں کہیں محبتوں کا تصور بھی نمودار ہوا تھا۔ مثلاً اس کے اپنے بیٹے، بیوی، تو خیر ایک عورت کی حیثیت سے بے مقصد ہوگئی تھی۔ کیونکہ نت نئے شکار کا رسیا۔ ایک بدن پر قناعت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بدن حسین کا ہر نقش اس کی آنکھوں میں تھا۔

چنانچہ اس عورت کا تصور بھی دل میں کوئی خاص ہلچل پیدا نہیں کرسکا تھا۔ وہ ذرا پریشان کن ہوتا تھا۔ اور یہ سوچ دل میں نمودار ہو جاتی تھی کہ اس محبت کا کوئی معیار ضرور ہے۔ لیکن وہ محبت جو قدرتی طور پر دل میں اولاد کے لئے دی گئی ہے وہ ذرا الگ نوعیت کی حامل تھی۔ اپنے

دونوں بیٹوں پر اس نے کبھی بہت زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن یہ خیال ضرور رکھا تھا۔ کہ انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اور وہ عیش وعشرت سے پرورش پائیں۔ اور شاید یہ تصور کسی فرض کی ادائیگی سے وابستہ نہیں تھا۔ بلکہ دل میں وہی قدرتی عناصر ہلچل پیدا کرتے رہتے تھے۔ اس نے کبھی اپنے بیٹوں کا راستہ نہیں روکا تھا۔ ہاں۔ ایک بہت بڑی انسانی کمزوری ہمیشہ مانع رہتی تھی۔ یعنی جو کچھ وہ خود کرتا تھا۔ جوان ہونے کے بعد جب بیٹوں نے اس کا آغاز کیا تو اس کے اندر وہ ہمت پیدا نہ ہو پائی جس کے تحت وہ اپنے بیٹوں کو ان راستوں پر جانے سے روکے۔

چنانچہ نواب فردوس علی نے جب پہلی بار اس کے سامنے شراب کے نشے میں چور گھر میں قدم رکھا تو اسے بہت برا محسوس ہوا۔ اور اس کا دل چاہا کہ اس کے منہ پر تھپڑ لگا دے۔ اور اسے روکے۔ لیکن سامنے ہی رکھی ہوئی شراب کی بوتلوں پر نگاہ پڑتے ہی اس کی یہ کیفیت ختم ہوگئی۔ بوتلیں اس کی اپنی ملکیت تھیں۔ انہی کا سیال وہ اپنے سینے میں اتارتا تھا۔ اور نواب فردوس بھی یہ ہی کرکے آیا تھا۔

اندر کے احساس نے اسے بزدل بنا دیا۔ اور وہ بیٹے سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اور پھر جب ایک بار نواب فردوس شراب کے نشے میں اس کے سامنے آ گیا تو پھر اس کا حجاب بھی کھل گیا۔ بات یہیں تک محدود نہیں تھی۔ اس کے علم میں وہ واقعات آتے رہے تھے۔ جو نواب فردوس سے منسوب تھے۔ خوبصورت لڑکیاں نواب فردوس کے قرب میں دیکھی جاتی تھیں۔ اور حویلی میں نواب فردوس نے جو اپنا الگ تھلگ حصہ بنا رکھا تھا۔ وہ خاصی حد تک مشکوک ہوگیا تھا۔ یہاں نواب عرفان نے اس سلسلے میں مداخلت کی کیونکہ اپنے تجربے کی بنیاد پر وہ اس حویلی کو بدنام نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس کے لئے سفید محل موجود تھا۔

چنانچہ اس بات پر اس نے نواب فردوس سے سخت باز پرس کی اور آخرکار نواب فردوس نے اپنی رنگ رلیوں کا دائرہ کار وسیع کر دیا۔ اور پھر سفید محل اس سنگین واردات کا شکار ہوگیا۔ بیٹے کی موت کو کچھ وقت کے لئے نواب عرفان نے محسوس کیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کی اپنی ذات سفید محل کے سنگین واقعات میں ملوث تھی۔ اس لئے اس نے فردوس کی موت کو ایک نیا ہی رنگ دے ڈالا۔ اور بات چھپ گئی۔

اس کے بعد فرقان بھی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اور طریقہ کار وہی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ سفید محل کی جو سنگین کہانیاں ان کے سامنے آئیں۔ وہ بڑی خوفناک تھیں۔ نواب عرفان علی جو دنیا میں کبھی کسی چیز سے نہیں ڈرا تھا۔ سفید محل سے خوف زدہ ہوگیا۔ اسے رہ رہ کر یہ احساس ہو رہا تھا کہ کاش سفید محل اس کے پاس نہ رہتا۔ اور اس کے بیٹے اس طرف کا رخ نہ کرتے۔ تو آج وہ اس دنیا میں ہوتے اور ممکن ہے۔ اعضاء کے اضمحلال کے بعد وہ بیٹے ہی اس کی توجہ کا مرکز ہوتے۔ آج اسے اپنے خالی ہاتھوں کا احساس ہو رہا تھا۔ واقعی اردگرد کوئی نہیں ہے۔

یوں تو دولت خرچ کرکے بے شمار ہمدرد، محبت کرنے والے اور دوست پیدا کیے جاسکتے ہیں بلکہ خریدے جاسکتے ہیں۔ لیکن وہ جو زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں وہ جن کے بدن سے اپنے خون کی مہک آتی ہے۔ ان کا وجود اس دنیا سے مٹ گیا تھا۔ کیا یہ ایک سنگین خسارہ نہیں تھا۔ لیکن یہ سوچ شاید پہلی بار اس کے ذہن میں بیدار ہوئی تھی۔ تب سوچ کے دائرے وسعتیں اختیار کرتے گئے اور ہارون کی صورت اس کی نگاہوں میں ابھری۔

"کیا ہی خوبصورت نوجوان ہے۔ میرے بیٹوں کی مانند جس طرح، فرحان، فردوس تھے۔ اس طرح یہ شخص بھی بلند وبالا قد وقامت کا مالک اور بہت ہی کم عمر ہے۔ کیا اسے سفید محل کی خریداری سے روکا جانا چاہیے۔" لیکن پھر دوسرے احساس نے اس تصور کو ذہن سے نکال دیا۔ سفید محل ایک زبردستی کی ملکیت بنا ہوا تھا۔ وہ ادھر کا رخ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن بار بار سفید محل اس کی نگاہ میں آ جاتا تھا۔

اگر وہ اس کی گرفت سے نکل رہا ہے۔ تو اس سے اچھی بات اور کوئی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے۔ آنے والے وقت میں سفید محل کا ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ بہترین تبدیلیاں رونما ہو جائیں۔ لیکن اب ہونے کے لئے رہ کیا

گیا تھا۔ تنہائی، چاروں طرف تنہائی، اور اس کے بعد وہی تصور تھوڑی سی روشنی پیدا کرتا تھا۔ یعنی ڈاکٹر فیضان کا کہنا کہ اب وہ اپنی زندگی میں کسی اور کو بھی شامل کرلے۔ ہاں اس احساس کے ساتھ ایک اور احساس بھی دل میں زبردستی ابھر رہا تھا۔ اسے دبانے کی کوشش میں وہ اس وقت ناکام ہو رہا تھا۔

ایک نوجوان نوخیز لڑکی اس کی خوابگاہ میں آئے گی ارمانوں کی سیج پر بیٹھی ہوگی۔ اور جب وہ یہ دیکھے گی کہ ایک ایسا شخص جو اس کے بزرگوں میں سے کوئی ہوسکتا ہے۔ اس کے شوہر کی حیثیت سے اس کے قریب آتا ہے۔ تو کیا وہ اسے اپنی محبت کا وہ جذبہ دے سکے گی۔ ہوسکتا ہے کہ جس لڑکی کے بارے میں فیضان نے سوچا ہے۔ اسے اس بات کا علم ہو جائے کہ نواب عرفان علی ایک عمر رسیدہ شخص ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ایسے ہی حالات کا شکار ہو کر نواب عرفان کی ملکیت میں آنا قبول کرے۔ لیکن یہ قبولیت دل سے تو نہیں ہوگی۔ دلوں میں جو تصور بنتا ہے۔ وہ ایک الگ ہی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس طرح تو وہ لڑکی پھر وہ عام سی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ جس طرح نواب عرفان کی دولت کے بل پر بہت سی حسین لڑکیاں اس کی خلوت میں آتی رہتی ہیں۔

بیوی کا تصور تو ایک الگ ہی تصور رکھتا ہے اگر ایسی ہی کسی لڑکی کو اپنے قریب لاتا ہے۔ تو کیا ضروری ہے۔ کہ اسے حویلی میں آباد کیا جائے۔ یہ بہت سے احساسات نواب عرفان کو پریشان کرتے رہے۔ اور پھر ان پریشانیوں کا ایک ہی حل اسکے ذہن میں آیا۔ شراب کی وہ بوتل جو اسے دنیا سے بیگانہ کر دیتی تھی۔ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے شراب خانے کی جانب چل پڑا۔

پھر نجانے کتنی دیر تک پیتا رہا۔ یہاں تک کہ شراب اس کے حواس پر غالب آ گئی۔ اور ایک انتہائی دولت مند اپنے اعلیٰ ترین بیڈروم کے قالین پر بے سدھ ہوکر سو گیا تھا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر زرین کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے چمکدار نگاہوں سے ہارون کو دیکھا اور بولی۔

"تم بذات خود اس سے ملے تھے۔؟"

"ہاں۔ آنٹی۔"

"کیسا نظر آ رہا تھا وہ۔؟"

"بس۔ جیسے دولتمند لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ایک اور شخص بھی اس کے پاس موجود تھا۔ جیسے وہ شاید فیضان کے نام سے مخاطب کر رہا تھا۔"

"تمہارے ساتھ رویہ کیسا رہا۔؟"

"رویہ تو بہت اچھا تھا۔ اچھی دلچسپی سے اس نے مجھ سے گفتگو کی۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے ہارون پھر یوں کرو کہ جس قدر جلد ممکن ہوسکے سفید محل کی خریدار کے معاملات مکمل کرلو۔ زندگی انسان کو بہت کم موقع دیتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ زندگی مجھے اتنا موقع عطا نہ کرے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں آنٹی۔"

"نہیں۔ ایک حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ ویسے تو انسان کبھی اپنی موت کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچتا۔ لیکن جب کوئی دیرینہ آرزو تکمیل کی منزل میں پہنچ رہی ہوتی ہے تو خدشات اسے گھیر لیتے ہیں۔ شاید یہی تصور میرے اس احساس کی وجہ ہو۔"

"آنٹی میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ موت کوئی غیر فطری چیز ہے۔ لیکن ہمیں ہر طرح کے حالات کا سامنا پامردی سے کرنا چاہیے۔ کسی بھی مسئلے پر یا کسی بھی مرحلے پر اپنے دل میں برے خیالات کو جگہ دینا میرے خیال میں مناسب نہیں ہوتا۔"

"اچھا جناب! اب ہمیں نصیحت نہ کیجئے گا آپ۔ ہم نے جو کہا ہے وہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس پر آپ کو کوئی اعتراض ہو۔"

"میں اعتراض نہیں کر رہا۔ آنٹی ٹھیک ہے۔ میں اس سلسلے کو ذرا تیز کر دیتا ہوں۔"

بہر حال معاملات چلتے رہے اور سفید محل فروخت ہوگیا۔ اب اسے ہارون کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ ہارون نے وہ تمام کاغذات ڈاکٹر زرین کے سامنے رکھے

اور ڈاکٹر زرین زہریلی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے ہارون سے کہا۔

"اور اب تمام معاملات چھوڑ کر ہمیں سفید محل کی ترتیب کرنا ہوگی۔ تمہیں سب سے پہلا کام یہ کرنا ہے کہ سفید محل کے آس پاس اور اس کے اطراف میں جو لوگ بکھرے ہوئے ہیں۔ ان سے وہ جگہ خالی کرالو۔"

"ہوجائے گی آنٹی۔"

"تو پھر یہ کام کرو۔ اور مجھے اس کے بارے میں اطلاع دو۔" ہارون مصروف ہوگیا۔

سفید محل تو خالی تھا۔ ہارون نے نواب عرفان کو پیش کش کی تھی کہ اس میں سے جو کچھ نکالنا چاہے نکال سکتا ہے۔ بہت سا قیمتی فرنیچر جو انتہائی اعلیٰ درجے کا تھا۔ وہاں موجود تھا۔ ایسے بہت سے ڈیکوریشن ہیں جن کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ وہ بھی وہاں موجود تھے۔ ہارون نے نواب عرفان سے ملاقات کرکے یہ پیش کش کی تو نواب عرفان مسکرا کر بولا۔

"تم نے ایک نواب سے سفید محل کا سودا کیا ہے۔ کسی بنیا سے نہیں۔"

"میں سمجھا نہیں جناب۔"

"اس میں جو کچھ ہے۔ وہ اب تمہارا ہے۔"

"لیکن میں نے اس کا جائزہ لیا ہے وہاں تو بہت سی قیمتی اشیاء موجود ہیں۔"

"میں نے کہا ناں۔ میں ان میں سے کچھ نہیں لینا چاہتا۔"

"آپ پھر بھی یوں کریں ایک نگاہ اسے دیکھ لیں۔"

"نہیں بیٹا! میں وہاں جانا بھی نہیں چاہتا۔"

"کیا مطلب۔؟"

"بس جو چیز اپنی نہ رہے اس سے لگاؤ نہیں رکھنا چاہئے۔"

"لیکن جناب! آپ نے وعدہ کیا ہے کہ جب ہم سفید محل میں منتقل ہوں گے تو آپ ہماری تقریب میں شریک ہوں گے۔"

"ہاں..... میں اس سے گریز نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے ویسے ہارون میاں! آپ سے بہت سی ایسی ذاتی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے جو ہوں گی تو عجیب ہی۔ لیکن بس دل تو دل ہی ہے۔"

"مثلاً جناب۔"

"میں تمہارا خاندانی پس منظر جاننا چاہتا ہوں۔"

ہارون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس کے لئے مناسب وقت آنے دیجئے۔"

"مناسب وقت۔"

"جی ہاں۔ ظاہر ہے۔ آپ سے تعلقات تو منقطع نہیں ہو جائیں گے۔ پھر آپ جیسی عظیم شخصیتوں کی قربت تو ویسے بھی دل کو فرحت بخشتی ہے۔"

"کون کون ہے تمہارے ساتھ ہارون۔؟"

"میں نے عرض کیا ناں..... میری ممی ہیں۔ آنٹی ہیں۔ بس یہ ہی سمجھ لیجئے آپ۔"

"اور کیا کرتے ہیں یہ تمام لوگ۔؟"

ہارون پھر مسکرا دیا اور بولا۔

"یہ بات پہلے بھی ہو چکی ہے کہ تفصیلات پھر کسی مناسب وقت پر، میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ ایک نگاہ اس پر ڈال کر آپ وہاں سے جو کچھ نکلوانا چاہیں نکلوالیں۔ اس کے اطراف میں جھاڑیاں وغیرہ ہیں۔ کچھ جھونپڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس میں کچھ لوگ رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ وہاں سے صاف ہوجائے۔"

"جو لوگ وہاں رہتے ہوں تم چاہو تو انہیں وہیں رہنے دو۔ سفید محل کے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ میرے قدیم ملازمین ہیں۔ ہوسکتا ہے۔ تمہیں کبھی ایسی ضرورت پیش آجائے۔ جس میں وہ لوگ تمہاری مدد کرسکیں۔"

"نہیں جناب! دراصل میرا بھی کچھ طریقہ کار ہے۔ جب کسی چیز کو میں اپنی ملکیت تصور کرتا ہوں۔ تو پھر یہ چاہتا ہوں کہ وہاں کی ایک بھی شے ایسی نہ ہو۔ جو میری ملکیت نہ ہو۔"

"کچھ ضدی لگتے ہو۔ خیر ظاہر ہے اب تو سب کچھ ہو چکا ہے۔ میں اس کی قیمت وصول کرچکا ہوں۔

چنانچہ یہ سب کچھ تمہاری خواہش کے مطابق ہی ہوگا۔ ہاں میں یہ بات پھر سے عرض کردوں کہ تمہیں وہاں کوئی چیز ناگوار گزرتی ہو تو بہت بڑی جگہ ہے وہ وہاں بڑا سا اسٹور بنواؤ۔ اور وہ تمام اشیاء جو تمہیں ناپسند ہوں۔ وہاں سے ہٹوادو۔ اور اسٹور میں ڈلوادو۔ اب میں اس میں سے کچھ نہیں لینا چاہتا۔"

ہارون ہنسنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ "آپ بھی عجیب ہیں جناب۔"

"کیا کہا۔؟"

"سوری! میرا خیال ہے۔ میں کچھ غلط کہہ گیا۔"

"نہیں۔ تمہارے اس جملے میں ایک عجیب سی محبت تھی۔"

"بہر حال میں آپ کا احترام تو کرتا ہوں۔" ہارون نے کہا۔

"کاش ایسا ہوسکے کہ میرے اور تمہارے درمیان تعلقات وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جائیں۔"

"اور اس میں کوئی مشکل نہیں ہوگی جناب۔ اگر آپ مجھے اپنے آپ سے ملاقات کرنے کی اجازت دیں گے تو میں آپ سے ملتا رہوں گا۔"

"ہاں بیٹا! اگر ممکن ہو تو مجھ سے ملتے رہا کرو۔ تم سے مل کر نہ جانے کیوں دل کو سکون کا ایک احساس سا ہوتا ہے۔" نواب عرفان علی کو خود بھی اپنے الفاظ پر حیرت تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کے لئے یہ الفاظ ادا کئے تھے۔

بہر حال ہارون وہاں مصروف عمل رہا۔ بہت سے مزدور لگالیے گئے۔ اور سفید محل کی تزئین تو ہوتی رہی۔ نواب عرفان یا کوئی دوسرا شخص سفید محل کے قرب و جوار میں موجود نہیں تھا۔ پھر ایک رات زرین نے ہارون کو ساتھ لیا۔ اور نازش کو بھی اصرار کرکے ساتھ لے لیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ سفید محل روانہ ہوگئی۔ نازش کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اور خود ڈاکٹر زرین پتہ نہیں کن کیفیات سے دوچار تھی۔ ویسے تو عام راستے بھولے بھی جاسکتے ہیں۔ لیکن جن راستوں پر زندگی کا پیچھا لمحہ لمحہ موت نے کیا ہو۔ ان راستوں کی کہانی کو آسانی سے نہیں بھلایا جاسکتا۔

ایک یاد، ایک تصور، ان راستوں سے وابستہ تھا۔ اور ڈاکٹر زرین ان رستوں کو اچھی طرح سے پہچان رہی تھی۔ تب وہ سفید محل پہنچ گئے۔

ڈاکٹر زرین نے خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ نازش کی جو کیفیت تھی۔ وہ بس اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ ڈاکٹر زرین نے آہستہ سے کہا۔

"نازش۔"

"جی۔ ڈاکٹر صاحبہ!"

"تم میرے ساتھ ہو۔"

"مجھے اندازہ ہے۔"

"اور اس وقت سے ہو جب میں نے تمہاری پہلی بار مدد کی تھی۔"

"ڈاکٹر خدارا ان لمحات کا ذکر نہ کیجئے۔"

"نہیں..... میں ان لمحات کا ذکر ضرور کروں گی۔"

"کیوں ڈاکٹر صاحبہ....." نازش عجیب سے لہجے میں بولی۔

"اس لئے کہ اب وقت آگیا ہے۔ جب ہم ماحول پر حکمران ہیں۔ اور اور....." دور سے ہارون آتا دیکھا۔ اور زرین خاموش ہوگئی۔

"ویسے آنٹی اس میں شک نہیں کہ اس عمارت میں رہتے ہوئے ہم عجیب سی کیفیت محسوس کریں گے۔" زرین نے مسکراتی نگاہوں سے ہارون کو دیکھا۔ اور بولی۔

"کیا تم اس عمارت میں رہنا پسند کروگے۔"

"اگر آپ کی اجازت ہوئی آنٹی تو۔"

"نہیں ہارون۔ یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں ہے میں تو بس اپنا ایک تصور پورا کرنا چاہتی ہوں۔ جو میں نے اس عالم میں کیا تھا۔ جب میں اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"میں جانتا ہوں۔ آنٹی" ہارون نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ہارون۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ آؤ پہلے

ہم یہ طے کرلیں کہ یہاں ہمیں کیا کیا تبدیلیاں کروانی ہیں، میرا خیال ہے تمہارے لئے یہ دلچسپ مشغلہ ہوگا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے آنٹی کہ یہ مشغلہ دلچسپ ہے۔ اور جو کچھ میرے کانوں میں پہنچ چکا ہے۔ آپ کے ذریعے اس کے بعد میری دلی خواہش ہے کہ ہم اپنے اس مقصد کی تکمیل کریں۔ لیکن آنٹی کیسی تعجب کی بات ہے۔ ایک ایسی خواہش کی تکمیل کے لئے جو صرف میرے دل میں ایک پرتاثر جذبہ رکھتی ہے ہم نے کتنے بڑے اخراجات ادا کئے ہیں۔"

"دیکھو! ہارون! میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ انسان کی زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی انسان بے مقصد زندگی گزار رہا ہو۔ تو اس سے زیادہ مظلوم شخصیت میری نگاہ میں اور کوئی نہیں۔"

"لیکن آنٹی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ لاتعداد افراد اپنی زندگی کا مقصد پورا نہیں کر پاتے۔"

"لاتعداد کیا۔ بلکہ یوں سمجھ لو ان کی تعداد حد سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن تقدیر اگر کسی ایک شخص کو اس کی پوری زندگی کی آرزو کی تکمیل کا موقع دے دے تو میں سمجھتی ہوں کہ وہ دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت انسان ہوتا ہے اور ہارون میں اس دنیا کی خوش نصیب انسان ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں شدید ترین جدوجہد کر کے یہ مقام حاصل کیا ہے۔"

"آنٹی میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"تو پھر سنو..... جو کچھ میں تمہیں بتاؤں وہ تمہیں سرانجام دینا ہے۔"

"جی آنٹی۔"

"اور آج میں پہلی بار یہاں آئی ہوں اور آخری بار اس وقت آؤں گی۔ جب ہم سفید محل میں دنیا کے سامنے اپنی رہائش کا افتتاح کریں گے۔"

"جی آنٹی۔"

اور پھر وہ کافی دیر تک مختلف کمروں میں گھومتے رہے۔ نازش اس دوران بالکل ہی خاموش تھی، نجانے کیوں اس کے دل پر خوف و دہشت کے سائے لرزاں تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی تھی۔

ڈاکٹر زرین نے دو تین بار اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ نازش کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اور اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ لیکن اس نے نازش کو تسلی دیتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"نازش۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی میں تم سے کہ جو کہہ چکی ہوں۔ براہ کرم اپنے آپ کو سنبھالو۔ ہمیں ہمت سے اپنے مقصد کی تکمیل کرنا ہے۔" پھر اس کے بعد ہارون کو تمام ہدایات دے کر یہ لوگ وہاں سے واپس چل پڑے۔

ہارون تو اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ لیکن ڈاکٹر زرین بہت دیر تک نازش کو سمجھاتی رہی تھی۔ نازش نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"آپ کو خود پتہ ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ..... آپ کو میری ذہنی کیفیت کا پتہ ہے۔ کاش..... کاش....."

"ہاں میں سمجھتی ہوں۔ لیکن براہ کرم میرا ساتھ دو نازش۔ اس میں تمہاری تھوڑی سی غلطی بھی تھی۔ مجھے معاف کرنا میں اس واقعے کو دہرانا نہیں چاہتی۔ لیکن کیا کیا جائے۔ تمہیں سمجھانے کے لئے کرنا پڑ رہا ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"لیکن مجھے دیکھو..... میں تو کچھ بھی نہیں کر رہی تھی۔ اس وقت میں تو بالکل اتفاقیہ طور پر ایک ایسی مصیبت کا شکار ہو گئی تھی۔ نازش جس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ مجھ سے سب کچھ چھین گیا۔ بہت کچھ چھین گیا مجھ سے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی۔"

"جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"اوکے۔ اوکے نازش، دیکھو اب اپنے آپ کو سنبھالے رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو تمہاری اس بزدلی سے میں بھی ٹوٹ جاؤں۔"

نہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ ایسا نہیں ہوگا۔" نازش نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ اور زرین گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

(جاری ہے)

شہر وحشت

ایم اے راحت

قسط نمبر: 12

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرہول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دہشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراؤ، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل و دماغ کو مبہوت کرتی خوف و حیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر و شر کی انوکھی کہانی

آخر کار وہ تمام کارروائیاں مکمل ہوگئیں۔ جو سفید محل میں ہارون کو کرانی تھیں ہارون نے ڈاکٹر زریں کو اس بارے میں تفصیلات بتائیں تو اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہارون اب اپنی پسند کا کوئی دن مقرر کرلو۔ تاکہ میں اس مسئلے کو آخری مرحلے میں داخل کرلوں۔''

''یہ بھی آپ ہی کی پسند پر ہوگا۔ آنٹی۔''

مشترکہ طور پر ایک دن مقرر کیا گیا اور پھر ڈاکٹر زریں نے کہا۔

''ہارون اب ہمیں چند مخصوص لوگوں کو اس تقریب میں شرکت کی دعوت دینی ہے۔ میں نے اس دوران ان کے بارے میں معلومات مکمل کررکھی ہیں اور میں تمہیں اس کی تفصیلات بھی بتارہی ہوں۔ براہ کرم نوٹ کرلو۔''

''جی آنٹی۔''

''اس سلسلے میں جو پہلی شخصیت ہے۔ وہ ڈاکٹر فراز کی ہے۔ ڈاکٹر فراز شہر میں اپنا کلینک کرتے ہیں۔ اور وہاں کی بہت مشہور شخصیت ہیں۔ تم انہیں یہ دعوت نامہ دوگے اور اس بات پر آمادہ کردگے کہ وہ ضرور وہاں پہنچیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''دوسرے شہروز صاحب ہیں۔'' ڈاکٹر زریں نے شہروز کے بارے میں تفصیلات بتائیں تو ہارون حیران رہ گیا۔

''آنٹی آپ انہیں جانتی ہیں۔''

''ہاں۔ بہت اچھی طرح۔ وہ بھی مجھے جانتے ہیں۔''

''کیا ڈاکٹر ماہ رخ کی حیثیت سے؟''

''ہاں۔ لیکن سوری ہارون تم ڈاکٹر ماہ رخ کا تصور تک ذہن میں نہیں لاؤ گے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ شہروز صاحب کو کس طرح اس دعوت میں شرکت کے لئے مجبور کرسکتے ہو۔''

''آنٹی کیسا عجیب اتفاق ہے!''

''کیا؟''

''شاید میں آپ سے تذکرہ تو کرچکا ہوں۔ یا شاید نہیں کرسکا۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں ہے۔ شہروز صاحب کو میں بذات خود اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ اصل میں ان کی بیٹی فرحین میرے ساتھ کالج میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ اور ہم دونوں کے درمیان بہت دوستی ہے۔ ان کی مسز کا نام تو فی الحال مجھے یاد نہیں البتہ

شہروز صاحب بذات خود ایک انتہائی نفیس انسان ہیں۔"

ڈاکٹر ماہ رخ کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات ابھر آئے لیکن وہ اپنے ان تاثرات کو پی گئی اور اس نے کہا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہوسکے تو فرحین اور اس کی والدہ کو بھی اس تقریب میں مدعو کرلینا۔"

"آنٹی باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ اس دن میں نے آپ سے اپنے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کا ایک پس منظر تھا۔"

"کیا پس منظر تھا۔"

"وہ بھی آپ کو نہیں بتاؤں گا اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس کے بارے میں مجھ سے پوچھیں گی بھی نہیں کیونکہ بہرطور آپ کی تربیت آپ کی پرورش کے تھوڑے سے اثرات میری شخصیت پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔ یعنی تھوڑی سی ضد کسی مسئلے میں، میں بھی کرسکتا ہوں۔"

ماہ رخ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تم سے تمہاری شخصیت چھیننے کی کوشش نہیں کروں گی۔"

"اس کے علاوہ آنٹی......"

"اس کے علاوہ ایس پی..... ظفر علی یہ اس وقت فاروق آباد میں متعین ہیں۔ ایس پی ظفر علی سے رابطہ کرکے تم انہیں یہاں تک پہنچنے کی دعوت ضرور دو گے۔ یہ سمجھ لو کہ ان لوگوں کو آمادہ کرنا تمہارا کام ہے۔"

"ٹھیک ہے! آنٹی آپ اس سلسلے میں مجھ پر اعتماد کریں۔"

"تو پھر مقررہ دن کے لئے ان تمام حضرات کو دعوت نامے پہنچا دو اور یہ بات تو کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سلسلے میں سب سے اہم شخصیت نواب عرفان کی ہے۔"

"جی آنٹی آپ مطمئن رہیں۔"

"آخر کار ہارون نے اپنے کام کا آغاز کردیا۔ اس کارروائی میں سب سے پہلے اس نے ڈاکٹر فراز سے ملاقات کی۔ معمر لیکن متحمل مزاج اور نرم خو ڈاکٹر فراز نے اس خوب صورت نوجوان کو دیکھا۔

"کیا بات ہے بیٹے۔ کسی مرض کے سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں جناب۔ میں آپ سے کچھ ذاتی وقت لینے کا خواہش مند ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں کہو۔ کیا بات ہے؟"

"ڈاکٹر فراز صاحب ایک بہت ہی انوکھی شخصیت نے آپ کو دعوت نامہ بھجوایا ہے۔ میرے ذریعے اور درخواست کی ہے کہ براہ کرم آپ اس دعوت کو قبول کیجئے۔ وقت کافی ہے۔ رات کو اپنے شیڈول میں سے وقت نکالنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

"کیسی دعوت؟"

"شاید آپ کو علم ہو کہ لالہ جان سے کچھ فاصلے پر ایک عمارت سفید محل کے نام سے منسوب ہے۔" ڈاکٹر فراز نے چونک کر ہارون کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"ہاں شاید نواب عرفان کی ملکیت ہے وہ۔"

"جی وہ نواب عرفان کی ملکیت تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"اسے میں نے خرید لیا ہے۔"

"تم نے؟"

"جی۔"

"کسی خاص مقصد کے لئے؟"

"نہیں۔ خیال تو یہ ہی ہے کہ اس میں رہائش اختیار کی جائے۔"

ڈاکٹر فراز کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"خیر ٹھیک ہے۔ آگے کہو۔"

"ہم اس عمارت کا افتتاح کررہے ہیں۔"

"مبارکباد دینے کے علاوہ اور کیا کرسکتا

ہوں۔" ڈاکٹر فراز عجیب سے لہجے میں بولے۔

"نہیں۔ مبارکباد کے علاوہ بھی آپ کو کچھ کرنا ہے۔"

"کیا؟"

"آپ کو مقررہ تاریخ پر اس عمارت میں ہمارے ساتھ کچھ وقت گزارنا ہے۔"

"مجھے؟"

"جی ہاں۔"

"مگر بیٹے تم نے خاص طور پر مجھے یہ اہمیت کیوں دی ہے؟"

"میں نے نہیں بلکہ اس شخصیت نے جو آپ کو اس تاریخ کو وہاں دیکھنے کی خواہش مند ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"ڈاکٹر صاحب اس نے کہا ہے کہ وقت سے پہلے آپ کو اس بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔"

"کیا یہ ایک پراسرار بات نہیں ہے؟" ڈاکٹر فراز نے سوال کیا۔

"بے شک ہے۔ لیکن آپ اپنے مکمل اطمینان کے ساتھ وہاں تشریف لاسکتے ہیں۔"

"لیکن بیٹے۔"

"نہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔ میں آرزو مند ہوں کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔"

"کس وقت مجھے وہاں پہنچنا ہوگا۔"

"شام کو چار بجے۔"

"دیکھو اصل مسئلہ......"

"نہیں ڈاکٹر صاحب خدارا اس سلسلے میں انکار نہ کیجئے آپ یوں سمجھ لیجئے کہ اس کا تعلق میری زندگی سے ہے۔"

"مگر بات میری سمجھ میں تو آئے۔"

"آپ یقین کیجئے وہاں پہنچ کر آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔"

"کچھ اور لوگ بھی وہاں آئیں گے؟"

"جی ہاں۔ باقاعدہ ایک اجتماع ہے جس میں ممکن ہے آپ کے شناسا بھی ہوں۔" خود نواب عرفان اس دعوت میں شرکت کررہے ہیں۔"

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب یہ ذمہ داری آپ کو نبھانا ہوگی۔ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ کچھ لوگوں کی زندگی کا سوال ہے۔"

"تم مجھے الجھن میں ڈال رہے ہو بیٹے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ جو کچھ بھی سمجھیں لیکن یوں سمجھ لیجئے کہ زندگی میں بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن سے انسان کا براہ راست تعلق نہیں ہوتا، لیکن دوسروں کے لئے زندگی ہی کا مسئلہ ہوتا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں پہنچوں گا۔"

"آپ براہ کرم ڈائری میں نوٹ کرلیجئے گا۔"

"ہاں۔ میں نوٹ کرلیتا ہوں۔"

"ڈاکٹر فراز سے فراغت حاصل کرنے کے بعد۔ ہارون نے ایس پی ظفر علی سے ملاقات کی تھی۔ اور کسی نہ کسی طرح انہیں بھی اس بات پر آمادہ کرلیا تھا۔ ظفر علی نے ایک طویل عرصہ لالہ جان میں ایس ایچ او کی حیثیت سے وقت گزارا تھا۔ اس لئے وہاں کی یادیں تازہ کرنے پر آمادہ ہوگئے اور پھر اس پراسرار نوجوان کی دعوت کو انہوں نے ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے بھی قبول کرلیا تھا اور یہ تجسس ان کے ذہن میں بیدار ہوگیا تھا کہ یہ اس قدر اصرار کیوں کررہا ہے۔ ظفر علی کا معاملہ بھی تقریباً مکمل ہوگیا تھا۔ تو ہارون نے شہروز سے رجوع کیا۔

شہروز نے اس کا استقبال نہایت خوش دلی سے کیا تھا۔ چنانچہ ابتدائی خاطر مدارات کے بعد ہارون نے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا۔ وہ بھی آنے کے لئے تیار ہوگیا۔

یہ تمام مسائل طے ہونے کے بعد ہارون نے ڈاکٹر ماہ رخ اور نازش کو اس سلسلے میں ساری تفصیلات بتادی تھیں۔ اور ان لوگوں کے چہروں پر سنسنی کے آثار

پھیل گئے تھے۔

آخرکار وہ ڈرامہ اپنی تکمیل کی آخری منزل پر پہنچ گیا۔ جس کا آغاز نجانے کب سے ہوا تھا۔ ایک انتہائی طویل عرصہ، کچھ لوگوں نے اس ڈرامے کی تکمیل کو اپنی زندگی دے دی تھی اور اب وہ وقت آگیا تھا۔ جب یہ ڈرامہ اسٹیج کیا جاتا تھا۔

☆......☆......☆

بہت عرصے کے بعد نواب عرفان سفید محل کی طرف جارہا تھا۔ اپنے دوسرے بیٹے کی موت کے بعد اس نے سفید محل کا رخ نہیں کیا تھا۔ اس کے دل پر ہمیشہ ایک دہشت سوار رہتی تھی۔ سفید محل یقینی طور پر ایک آسیب زدہ عمارت تھی۔ اور اس بات کو نواب عرفان کے علاوہ اور کون جان سکتا تھا۔ اپنی شاندار پجارو میں سفید محل کی طرف جاتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی طاری تھی۔ فیضان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دل نہیں چاہ رہا تھا تو کیا مصیبت نازل ہورہی تھی تم پر سفید محل فروخت ہوگیا، تمہارا جھگڑا ختم ہوگیا، اس قدر اخلاقیات برتنے کے تم اس سے پہلے تو عادی نہیں تھے۔"

"اپنی دلی کیفیت کا اظہار تم پر کرچکا ہوں۔ فیضان۔ دعوت اگر وہ نوجوان نہ دیتا تو شاید میں کبھی بھی قبول نہ کرتا۔ لیکن اس کی شخصیت میں ایک کشش ہے کہ میں نہ جانے کیوں اس کے سامنے بے بس ہوجاتا ہوں۔"

"یار برا نہ ماننا یہ تو بڑے کمال کی بات ہے۔ یعنی تم نے اپنے بیٹوں کو کھونے کے بعد کسی کمزوری کا اظہار نہیں کیا اور ایک اجنبی کے سامنے اس قدر کمزور پڑگئے۔"

"ہاں۔ میں نے اعتراف کیا ہے تمہارے سامنے مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ خود کوئی آسیب ہو۔ دوسروں کو مسحور کرلینے والی شخصیت کا مالک ہیں واقعی اس کے سامنے بے بس ہوگیا ہوں۔"

تو پھر ڈرائیور سے کہو کہ پجارو واپس موڑ لے سفید محل ہمارا جانا ضروری نہیں ہے خواہ مخواہ کسی مشکل میں پڑنے سے کیا فائدہ۔

"مشکل۔" نواب عرفان نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"تو اور کیا...... ذہنی طور پر اس قدر مضمحل ہورہے ہو اور اس کے باوجود وہاں جانے پر آمادہ ہو۔"

"نہیں۔ فیضان جانا تو ہے۔ وعدہ کرلیا ہے۔ وہ برا مانے گا۔"

"تو پھر کم از کم چہرے پر خوش دلی تو پیدا کرو۔ یہ احساس تو ہونے دو کہ خوش دلی سے کسی کی خوشی میں شریک ہورہے ہو۔"

"اس میں شک نہیں کہ آج بھی سفید محل میں قدم رکھتے ہوئے میری روح کانپتی ہے۔"

"ماضی بہرحال انسان کے دل ودماغ سے چپکا ہوتا ہے۔ اسے بھلانا بے حد مشکل کام ہے اور پھر ماضی بھی وہ جس میں بہت سی تلخ یادیں چھپی ہوئی ہوں۔" فیضان نے کہا۔ اور نواب عرفان ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

سفید محل کے اطراف کی ویرانی آج بھی اس طرح تھی۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس عمارت میں زندگی موجود ہے۔ اگر یہاں کوئی رہنے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو یا تو وہ بھی کوئی آسیب ہی ہے اور یا پھر کوئی ذی ہوش انسان ہے۔ تو اس کے ہوش پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی، جھاڑ جھنکار، درخت، لمبی لمبی گھاس، خودرو پودے ان کے درمیان دوڑتے ہوئے جانور، جھاڑیوں میں چھپے ہوئے حشرات الارض۔

یہ سفید محل کے اطراف کی آبادی تھی۔ اب تو وہ جھونپڑی بھی نیست ونابود ہوچکی تھی۔ جس میں نعمان بابا رہتا تھا۔ نعمان بابا جو سفید محل میں ہونے والی ہر کہانی کا رازداں تھا۔ لیکن اب وہ بھی یہاں موجود نہیں تھا۔

بہرحال سب سے پہلے شہروز اور اس کی بیگم اور بیٹی نازش سفید محل پہنچے تھے۔ شہروز کی بیگم نے حیرانی

سے اطراف میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور وہ لوگ یہاں رہنے کے خواہش مند ہیں۔"

"یہ تو واقعی بڑی انوکھی جگہ ہے۔ کس قدر ویرانی برس رہی ہے یہاں، حالانکہ یہ درخت گھاس اور پرندے جھاڑیوں میں دوڑتے جانور زندگی رکھتے ہیں، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان پر کوئی نحوست طاری ہے، بھئی میں تو ہارون کو یہاں رہنے کا مشورہ کبھی نہیں دوں گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کوئی خاندان اگر اس ہولناک حویلی میں رہے، تو آسیب کا معاملہ تو اپنی جگہ چور، ڈاکو، لٹیرے کے لئے اس سے اچھی جنت اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ چند دنوں میں اس کا صفایا کردیں گے اور انسانی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہوگا۔"

"ہارون سے بات کریں گے۔" مسز شہروز نے اس لہجے میں کہا کہ فرحین کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ماں باپ اسی کے حوالے سے ہارون کے لئے بات کررہے ہیں۔ اصولی طور پر وہ اپنی بیٹی کو رخصت کرکے اس گھر میں نہیں دے سکتے۔ حویلی کے عظیم الشان دروازے پر صرف ہارون تھا جو ان لوگوں کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ خوب صورت رنگ کے سوٹ میں ملبوس اپنی وجیہہ شخصیت کے ساتھ دیکھنے والوں کے لئے انتہائی پرکشش اس نے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا تھا اور پھر آگے بڑھ کر شہروز سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ یقین کیجئے انکل اس وقت میں اپنے آپ سے شرط لگا کر جیت گیا ہوں۔"

"واہ یہ اپنے آپ سے شرط لگانا تو شاید بالکل نئی اصطلاح ہے۔"

"جی ہاں۔ نجانے کیوں مجھے یہ یقین تھا کہ سب سے پہلے مہمان آپ ہوں گے۔"

"مہمان۔ میرا خیال ہے۔ میں یہاں میزبان کی حیثیت سے آیا ہوں۔ اسی لئے یہاں سب سے پہلے پہنچا ہوں۔ وہ تمہاری آنٹی اور مما نظر نہیں آرہیں۔"

"جی ہاں۔ تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ذرا دیر میں پہنچیں گی بلکہ اب تو میرے لئے یہ باعث خوشی ہے کہ آپ ان کی میزبانی کریں گے۔ آیئے فرحین آنٹی آپ بھی آیئے۔"

اور پھر ہارون انہیں لے کر سامنے وسیع وعریض برآمدے میں پہنچ گیا۔ جہاں بیٹھنے کے لئے بندوبست کیا گیا تھا۔ مسز شہروز نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہارون یہ جگہ تو بالکل سنسان ہے۔ تم تو کہہ رہے تھے کہ تم اس حویلی کا افتتاح کررہے ہو۔"

"جی آنٹی۔"

"مگر میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ یہاں تو تم نے مرمت وغیرہ بھی نہیں کروائی یہ کائی زدہ دیواریں اور یہ بوسیدہ در و بام، یہاں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں انسانی قدم ہی مشکل سے پہنچے ہوں گے۔"

"آنٹی۔ اس سلسلے میں میرا ایک پروگرام ہے جو بعد میں آپ کے سامنے پیش کروں گا اور ہمارے کچھ اور معزز مہمان آگئے ہیں۔" آنے والی دوسری شخصیت ظفر علی کی تھی۔ آج بھی وردی میں ملبوس تھے۔ لیکن مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ہارون نے کہا۔

"انکل ظفر علی آپ کی آمد کا دلی طور پر شکر گزار ہوں۔ ویسے وردی میں آکر آپ نے ہمیں خوفزدہ کردیا...... لیکن بہرحال۔"

"بھئی خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈیوٹی سے آیا ہوں اور ڈیوٹی پر واپس بھی جانا ہے۔ تم سے وعدہ پورا کرنا ضروری تھا۔"

ہارون نے شہروز کی فیملی سے ظفر علی کا تعارف کرایا اور پھر ڈاکٹر فراز اور ڈاکٹر نرگس کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نرگس آج تک ان کے ساتھ تھی اور دونوں مل کر کلینک چلا رہے تھے۔ ان لوگوں کا بھی استقبال کیا گیا تھا۔

"کیا بات ہے نواب صاحب کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ کی۔" ظفر علی نے کہا۔

''اوہو۔ ظفر علی، بھئی واہ، تم تو بڑے شاندار ہوگئے ہو۔ سنا ہے۔ ایس پی لگے ہوئے ہو۔ آج کل کہاں پوسٹنگ ہے۔'' نواب عرفان علی نے کہا۔ اور خاصی دیر تک یہ رسمی گفتگو جاری رہی۔ جس میں ڈاکٹر صاحب بھی شریک رہے تھے۔ پھر نواب عرفان علی نے ہارون کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔

بھئی ہارون! یہ کیا ہے۔ تم نے تو کوئی انتظام وغیرہ نہیں کروایا۔ ویسی کی ویسی ہے۔ یہ عمارت اور تمہارے اہل خانہ کہاں ہیں۔''

''آپ ہی کا انتظار تھا۔ نواب صاحب! تشریف لایئے۔ ہم نے اندر بندوبست کیا ہے۔'' ہارون نے کہا۔

''گویا۔ اور مہمان نہیں آئیں گے؟''

''اہم ترین مہمانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ وہ آگئے ہیں۔ میرے لئے آپ ہی سب کچھ ہیں۔ آیئے۔''

اور اس کے بعد انہوں نے آگے قدم بڑھادیئے۔ نجانے کیوں عرفان کے قدموں پر لرزش تھی۔ فیضان نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''عرفان بھئی بری بات ہے۔ تم جیسی آہنی شخصیت کسی کمزوری کا مظاہرہ کررہی ہے۔''

''یہ...... یہ...... یہ بیوقوف لڑکا۔ کیا بندوبست کیا ہے۔ اس نے۔ اندر، تو سب کا سب ویران ہی ہے اور یہ کون سے کمرے کا دروازہ کھول رہا ہے۔'' نواب عرفان علی نے کہا۔

''پلیز۔ عرفان اپنے آپ کو سنبھالو۔''

''وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ جو اس کوٹھی کا سب سے بھیانک اور ہولناک کمرہ تھا۔ یعنی وہ جس میں آتش دان تھا اور اس وقت بھی آتش دان میں مدہم مدہم آگ سلگ رہی تھی۔ سب نے حیرت سے اس آگ کو دیکھا شہروز نے کہا۔

''یعنی اس موسم میں آگ کا کیا موقع ہے؟''

''براہ کرم آپ تشریف رکھئے۔ یہ آگ بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے ایک انوکھی کہانی وابستہ ہے۔''

''ہارون کے کہنے پر وہ سب عارضی طور پر لگائی گئی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ لیکن نواب عرفان علی کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہوگئے تھے۔

''کچھ ڈرامائی کیفیت نہیں محسوس ہوتی اس ماحول میں۔'' ظفر علی نے تبصرہ کیا۔

''یوں لگتا ہے۔ جیسے ہارون کوئی خوفناک ڈرامہ اسٹیج کرنا چاہتے ہیں۔''

''نہیں جناب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' ہارون نے کہا۔

اسی وقت عقب میں دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور سب چونک کر پیچھے دیکھنے لگے۔

''یہ دروازہ کس نے بند کیا ہے؟''

''یہاں میں تنہا نہیں ہوں۔ آپ لوگ یہ کیوں سمجھ رہے ہیں کہ یہاں صرف میں ہوں۔'' ہارون نے ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ہارون کہ تم نے ایک سنسنی خیز افتتاح کیا ہے اور ہم سب کو ششدر کردیا ہے۔ ڈاکٹر فراز نے تبصرہ کیا۔ ڈاکٹر نرگس لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''ڈاکٹر فراز میرا تو یہاں دم گھٹ رہا ہے۔''

''تھوڑی دیر صبر کرلو۔''

''لیکن یہ آگ کیوں روشن کی گئی ہے؟''

''خدا جانے۔'' ڈاکٹر فراز نے آہستہ سے کہا۔

ڈاکٹر نرگس گہری گہری سانس لینے لگی تھی۔

نواب عرفان علی نے کسی قدر چیختی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہارون یہ کیا تماشہ لگا رکھا ہے تم نے میں کہتا ہوں اب ہمیں یہاں کیا کرنا ہے۔'' تمہارے اہل خاندان کہاں ہیں۔ کیا کرنا چاہتے ہو تم اور یہ عقب میں دروازہ کیوں بند ہوگیا ہے۔''

''سوری نواب صاحب بس ایک منٹ۔ صرف ایک منٹ۔'' ہارون نے معذرت آمیز لہجے میں کہا اور نواب عرفان خاموش ہوگیا۔ فیضان نے اس کے شانے

پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دباؤ ڈالا اور سرگوشی میں کہا۔

''عرفان۔''

''کیا...... عرفان...... عرفان لگا رکھی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ......'' لیکن پھر انہیں اچانک خاموش ہونا پڑا۔ کسی عورت کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز برابر کے کمرے سے آرہی تھی۔ ایک عجیب سی آواز جیسے کوئی تکلیف میں ہو۔ وہ سب چونک پڑے تھے اور ان کے چہروں پر حیرت کے نقوش پھیل گئے تھے۔ کسی کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ کراہنے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ تب ظفر علی نے کھڑے ہوکر کہا۔

''یہ کیسی آواز ہے؟''

''صرف چند لمحے ایس پی صاحب اس آواز کا راز آپ کو بھی معلوم ہوجاتا ہے۔'' ہارون نے پراسرار لہجے میں کہا۔ اور اسی وقت برابر کا دروازہ کھلا اور ان سب کی گردنیں۔ اس طرف گھوم گئیں۔ ایک عورت اندر داخل ہورہی تھی۔ لیکن اس کا جو حلیہ تھا۔ اسے دیکھ کر وہاں موجود تمام افراد کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ بال بکھرے ہوئے۔ لباس بے ترتیب اور...... اور ایک عجیب سا حلیہ اختیار کیا ہوا تھا اس نے۔ نواب عرفان نے اسے دیکھا اور اس کا سانس پھولنے لگا۔

فیضان بھی ادھر ہی متوجہ تھا۔ اس نے اچانک ہی محسوس کیا کہ نواب عرفان کی حالت خراب ہورہی تھی۔ عورت آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور پھر آتش دان کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ آتش دان کے شعلے اس ماحول میں عورت کے چہرے کو ایک عجیب سی کیفیت میں پیش کررہے تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں اٹھائیں اور پھر اس کی نظریں نواب عرفان پر آکر جم گئیں۔ پھر اس کے حلق سے پھنکارتی ہوئی آواز نکلی۔

''عرفان! مجھے پہچان رہے ہو۔ عرفان یقیناً تم جانتے ہوگے کہ میں کون ہوں؟ پہچانو عرفان! میں تمہاری درندگی کا شکار ہوں۔ پہچان لو...... میں کون ہوں؟ معزز مہمانوں۔ مجھے دیکھو! اور اس بھیڑیے کو دیکھو۔ جس کا نام نواب عرفان ہے۔ نہ جانے کیسے کیسے لالچ اور فریب دے کر اس نے مجھے اپنی جانب رجوع کیا۔ میری کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ مجھے بالکل بے بس کردیا۔

پھر...... پھر اس نے مجھ سے میری عزت چھین لی۔ مجھے داغدار کردیا۔ اس نے یہاں تک کہ میں...... میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوگئی۔ یقیناً میرا جرم بھی تھا۔ تسلیم کرتی ہوں کہ میں اپنی نادانی کا شکار ہوگئی تھی لیکن اس کے بعد آپ لوگ جانتے ہیں اس نے کیا کیا۔ جانتے ہیں آپ لوگ...... یہ...... مجھے اس حویلی میں لایا اور یہاں لاکر اس نے...... اس نے...... اس نے......'' عورت کی آواز رندھ گئی اور وہ سسکیاں لینے لگی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

''میں نے اس کے بچے کو جنم دیا۔ اس لعین نے اس ناپاک انسان نے اپنا خون اپنا بچہ...... اپنی ناجائز ہوس کا ثبوت اس آتش دان کی آگ میں ڈال دیا۔ آپ لوگ سن رہے ہیں ناں میری بات۔ میں ایک مظلوم عورت ہوں۔ ظلم کیا گیا ہے مجھ پر۔ مجھ پر ظلم کیا گیا ہے۔''

''بکواس کررہی ہے یہ۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں اسے نہیں جانتا۔ ہارون یہ کیا کھیل کھیلا ہے تم نے۔ کیا تم نے مجھے ذلیل کرنے کے لئے بلایا تھا؟ یہ عورت مجھ پر بہتان لگا رہی ہے۔ آپ سب لوگ سن لیجئے میں نے ایسا کوئی عمل نہیں کیا۔ میں نے ایسا کوئی عمل نہیں کیا۔''

جھوٹ بولتا ہے تو ناپاک کتے، جھوٹ بولتا ہے۔'' بائیں سمت کے دوسرے دروازے سے آواز آئی۔ اور ایک بار پھر وہاں موجود لوگ سنسنی کا شکار ہوگئے۔ دوسرے دروازے سے ڈاکٹر ماہ رخ باہر نکلی تھی۔ ڈاکٹر ماہ رخ کو پہچان کر ڈاکٹر فراز کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ڈاکٹر نرگس شدت حیرت سے کھڑی ہوگئی۔

''ڈاکٹر ماہ رخ۔'' نرگس اور ڈاکٹر فراز کے منہ سے ایک دم نکلا۔

''آپ لوگ تشریف رکھئے' میں اس رات کو اپنے گھر جانے کے لئے تیار تھی۔ میں اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ سمجھ رہے ناں۔ آپ۔ میں اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ کچھ لوگ اس وقت وہاں میری تاک میں لگے ہوئے تھے۔ جب میں کلینک سے باہر نکلی تھی، وہ ایمبولینس جو مجھے میری رہائش گاہ پر چھوڑتی تھی۔ مجھے لے کر چل پڑی۔

لیکن اس ایمبولینس میں اس کا ڈرائیور موجود نہیں تھا۔ جو اسپتال سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے بعد مجھے دھمکیاں دے کر اس حویلی میں لایا گیا۔ اس حویلی میں نواب عرفان علی بلکہ یہ کمینہ انسان موجود تھا۔ اس نے مجھے ایک بڑی رقم کی پیشکش کرکے اس کمرے میں بھیجا۔ جہاں کسی عورت کے کراہنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر اس عورت نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔

اس لعین، اس شیطان نے مجھ سے کہا تھا کہ بچہ پیدا ہو تو اسے لے کر اس کے پاس پہنچایا جائے، اور خدا کو حاضر و ناظر جان کے میں اس بات کی گواہی دیتی ہوں کہ اس نے بچہ میرے ہاتھ سے لے کر اس آتش دان میں پھینک دیا تھا۔ اور میرے سامنے وہ وجود اس آگ میں زندہ جل گیا۔ جس نے دنیا میں ابھی صحیح طور پر آنکھ نہیں کھولی تھی۔ اس معصوم وجود کے گوشت کے جلنے کی بو اس کمرے میں پھیل رہی تھی۔

اور یہ سنگدل خاموش کھڑا ہوا تھا۔

میں وحشت کے عالم میں وہاں سے واپس پلٹ پڑی اور اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں یہ عورت موجود تھی۔ جو آپ لوگوں کے سامنے نوحہ کناں ہے۔ وہاں یہ موجود تھی۔ یہ بدبخت سمجھا کہ بات ختم ہوگئی۔ لیکن تقدیر کچھ اور بھی دکھانا چاہتی تھی۔ اس ناپاک انسان نے ایک بچہ نذر آتش کردیا تھا لیکن قدرت اس کا نعم البدل بھی چاہتی۔

چنانچہ کچھ ہی لمحوں کے بعد اس عورت نے دوسرا بچہ جنم دیا۔ یہ جڑواں بچوں کی ماں بنی مجھے خدشہ ہوا کہ یہ ظالم شخص دوسرے بچے کو بھی فنا کردے گا جس طرح اس نے پہلے کو کیا ہے۔ چنانچہ اس وقت کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اس معصوم کی زندگی بچانے کے لئے میں۔ اس کو لے کر وہاں سے فرار ہوجاؤں۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن اسے کسی طرح شبہ ہوگیا میں وہاں سے نکلی تو اس نے اپنے آدمیوں کو میرے پیچھے لگا دیا۔ اور اس کے بعد...... اس کے بعد مجھے زندگی کے بدترین لمحات سے گزرنا پڑا۔

پھر زمانے کی ٹھوکروں میں نجانے کہاں کہاں چکراتی رہی۔ یہاں تک کہ زندگی کو ایک بار پھر سہارا ملا اور میں نے اپنے لئے ایک جگہ منتخب کرلی۔ بس اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو بھلا دیا اور دنیا سے مقابلہ کرنے لگی میں نے اس بچے کو اپنے بچے کی مانند پروان چڑھایا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد مجھے وہ عورت بھی مل گئی جس کو میں اچھی طرح سے پہچانتی تھی۔ وہ ایسے راستوں کی طرف جارہی تھی۔ جو تباہی کے بھیانک راستے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا بھلا کیا سوال تھا کہ وہ مجھے مل جائے اور میں اس۔ مظلوم کی مدد نہ کروں۔

چنانچہ میں نے اس کا بچہ اس کی آغوش میں ڈال دیا اور اسے پیشکش کی کہ وہ میرے ساتھ مل کر اس کی پرورش کرے۔ اپنے دل میں، میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس بھیانک انسان سے ایک بھیانک انتقام لوں گی اور آپ لوگ یقین کریں۔ میں اسی انتقام کی آگ میں پروان چڑھتی رہی اور میں نے اپنا ایک مستقبل متعین کرلیا۔ سمجھ رہے ہیں ناں آپ لوگ؟''

اور یہ بتانے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ کہ وہ شخص نواب عرفان علی ہے اور وہ بچہ...... وہ بچہ ہارون ہے۔''

ہارون جس نے سفید محل کو صرف اس لئے خریدا ہے کہ ان نابینا لوگوں کے سامنے حقائق لائے۔ جنہوں نے حقائق سے چشم پوشی کررکھی ہے۔ اور وہ نابینا لوگ کون ہیں۔ وہ آپ لوگ ہیں۔ ہاں۔ وہ آپ لوگ ہیں۔''

''بکتی ہے۔ یہ۔ بکواس کرتی ہے۔ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ ظاہر ہے میں ایک دولت مند آدمی ہوں۔ میرے دشمنوں کی تعداد انگلیوں پر نہیں گنی جاسکتی۔ لاتعداد دشمن ہیں میرے، جو میرے خلاف ناپاک سازشوں میں مصروف رہتے ہیں۔ کیا ثبوت ہے۔ اس عورت کے پاس کہ یہ جو کچھ کہہ رہی ہے۔ سچ ہے؟''

''ایس پی ظفر علی نے آہستہ سے کہا۔

''نواب صاحب ایک ثبوت تو میں خود ہوں۔''

''تم......؟'' نواب عرفان علی نے خونی نگاہوں سے ایس پی ظفر علی کو دیکھا۔

''ہاں۔ اس وقت میں اس علاقے کا ایس ایچ او تھا۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے براہ راست مجھے حکم دیا تھا کہ ایسی کسی عورت کو پکڑ کر آپ کے سامنے پیش کیا جائے۔ جو آپ کو بدنام کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کررہی ہے۔''

''مجھے یاد نہیں ہے۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔''

''اور یہ بچہ...... اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟'' میری مراد ہارون سے ہے۔

''میں...... میں اپنے دو بیٹوں کو کھو چکا ہوں، یہ ان لوگوں کی سازش ہے۔ انہوں نے اس کے ذریعے سازش کی ہے اور میں نہیں جانتا کہ اس سازش کی ڈور کہاں سے ہلائی جارہی ہے۔ میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ ڈرامہ ہے۔ ایک سنگین ڈرامہ۔'' ایس پی صاحب آپ کا تعلق قانون سے ہے۔ اور میں ایک معزز آدمی ہوں۔ آپ ان مجرموں کو دیکھئے۔ اگر یہ ڈرامہ نہیں ہے تو مجھے بتائیں کہ اس کمرے میں یہ کھیل کیوں کھیلا جارہا ہے۔ یہ عورت۔ یہ رخ اختیار کرکے سامنے کیوں آئی ہے؟'' میں آپ سے سوال کررہا ہوں۔ آپ مجھے جواب دیجئے۔''

''میں آپ کو جواب ضرور دوں گا۔'' نواب عرفان علی صاحب لیکن ان لوگوں سے کچھ سوالات کرلوں۔''

''یہ عدالت نہیں ہے۔ نہ ہی پولیس اسٹیشن۔ میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ یہ دروازہ کھلوائیں اور دروازہ کھلنے کے بعد مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔

فیضان اٹھو۔ ان لوگوں نے میرے خلاف سازش کی ہے۔ اور یہ لڑکا ہارون...... میں...... میں...... میں سب کو دیکھ لوں گا۔ ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔"

"بیٹھ جائیں۔ نواب عرفان علی بیٹھ جائیں۔ اس وقت آپ اپنی جاگیر میں نہیں بلکہ سفید محل کی عدالت میں ہیں۔ جہاں آپ نے اپنی سنگین وارداتیں کی ہیں۔ آپ کو ان کا جواب دینا ہوگا۔ ڈاکٹر ہارون نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر اس نے دوبارہ کہا۔

"میں گواہی دیتا ہوں۔ اس رات کی جب ڈاکٹر ماہ رخ اپنے گھر جانے کو نکلی تھیں اور اس کے بعد لاپتہ ہوگئی تھیں۔"

ان تمام باتوں کے دوران شہروز خاموشی سے ڈاکٹر ماہ رخ کی صورت دیکھتا رہا تھا۔ اس کی منگیتر، اس کی محبوب جسے بھلانے میں اس نے برسوں لگا دیئے تھے اور شاید آج تک نہیں بھلا سکا تھا۔ ڈاکٹر ماہ رخ کی مہربانی تھی کہ اس نے اپنی گفتگو کے دوران شہروز کا نام نہیں لیا تھا۔ ورنہ شہروز کی نجی زندگی تباہ ہوجاتی۔ اس کی بیوی بہرحال ایک عورت تھی۔ اور فرحین اس کی بیٹی اپنی زندگی کے لئے ہارون کا انتخاب کرچکی تھی۔ ڈاکٹر ماہ رخ کا ایک اشارہ شہروز کی زندگی کو تہہ و بالا کرسکتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر ماہ رخ نے شہروز کا نام نہیں لیا تھا بلکہ اشارتاً گواہی دی تھی اور اس وقت شہروز کا دل مچل رہا تھا کہ وہ ان تمام واقعات میں اپنا کردار کیسے ادا کرے۔ ویسے ڈاکٹر ماہ رخ نے جن افراد کو ادھر مدعو کیا تھا وہ سب ہی ان تمام باتوں کے چشم دیدہ گواہ تھے۔

ڈاکٹر فراز، ڈاکٹر نرگس، ظفر علی اور شہروز سب کے سب ان واقعات کے بارے میں جانتے تھے اور یقینی طور پر انہیں اسی لئے یہاں زحمت دی گئی تھی۔

اب نواب عرفان علی اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

"دیکھو! دروازہ کھلوا دو۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"سب سے پہلے آپ اپنے جرم کا اعتراف کریں نواب صاحب آپ نے اس لڑکی کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے۔ اس اعتراف کے بغیر یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔"

"جھوٹ ہے۔ جھوٹ ہے۔ بالکل بکواس ہے۔ میں اس بکواس کو تسلیم نہیں کرتا۔"

"گویا آپ یہ سب کچھ ماننے کو تیار نہیں۔" ایس پی ظفر علی بولا۔

"بالکل نہیں۔ بلکہ میں آپ کو حکم دیتا ہوں۔ ایس پی ظفر علی ایک معزز شخصیت کی حیثیت سے میرے خلاف ہونے والی اس گھناؤنی سازش کا سراغ لگایئے۔ ان دونوں عورتوں اور اس لڑکے کو گرفتار کرلیں۔ اس کے بعد مجھے بتایئے کہ اس سازش کے پیچھے کون تھا۔"

وہ سب خاموش ہوگئے۔ ہال میں پرسکوت خاموشی طاری ہوگئی۔ لیکن پھر اچانک ہی آتش دان میں شعلے بھڑکنے لگے۔ اچانک ہی شعلوں کا بھڑکنا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گوشت کے جلنے کی بو فضا میں ابھری اور وہ سب اپنی ناکیں بند کرنے لگے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ انسانی گوشت جل رہا ہے اور پھر دیکھنے والوں نے جو دیکھا۔ وہ ان کی زندگی کا سب سے ناقابل یقین واقعہ تھا۔ ایسا واقعہ جسے قصے کہانی کا نام تو دیا جاسکتا ہے۔ افسانے کی شکل میں تو بیان کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھنا ناممکنات میں سے ہے۔

وہ ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ ننھا سا معصوم سا بچہ۔ جس کے رونے اور سسکنے کی آوازیں اچانک ہی وسیع و عریض کمرے میں ابھرنے لگی تھیں۔ ان سب کی نگاہیں آتش دان کی طرف اٹھ گئیں۔ پھر اچانک ہی انہوں نے اس ننھے سے بچے کو آگ کے شعلوں میں سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل آتش دان سے باہر نکل آیا تھا۔ بہت ہی معصوم ننھا سا وجود وہاں پر موجود لوگوں کے دل لرز گئے۔ ان کے چہرے خوف دہشت سے سفید پڑ گئے۔

اچانک ہی بچے کی قلقاری فضا میں گونجی اس نے ایک نگاہ عرفان کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے ... ہوگیا۔ دہشت نے ان سب کے چہروں کو ...

کردیا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر دیوار سے جا لگے تھے۔

نواب عرفان پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے سے پشت لگائے آتش دان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فیضان جو عرفان علی کا بہت ہی گہرا دوست تھا۔ اب اس کے پاس سے ہٹ کر دور جا کھڑا ہوا تھا۔

"روکو...... روکو...... اسے روکو...... خدا کے لئے اسے روکو...... یہ کون ہے۔ یہ کون ہے۔؟" نواب عرفان کے ذہن میں وہ تمام داستانیں زندہ ہوگئیں۔ جو اب تک وہ سنتا چلا آیا تھا۔ فرحان اور فردوس علی کی موت کے واقعات بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئے تھے۔ اور پھر اس زمانے میں گزری ہوئی کہانیاں۔

"آہ...... یہ بچہ...... آہ یہ بچہ......" وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔ بچہ آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا اور نواب عرفان علی کے اعصاب شل ہوتے جارہے تھے۔ یہاں تک کہ معصوم سا ننھا سا بچہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور پھر اس نے اپنا ننھا ہاتھ آگے بڑھایا۔ نجانے وہ کون سی قوت تھی جس نے نواب عرفان کے جسم کو بھی متحرک کیا اور اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر بچے کے ہاتھ میں دے دیا۔ تب بچہ واپسی کے لئے مڑا اور نواب عرفان علی اس کے ساتھ چل پڑا۔

اب وہ ایک سحر زدہ شخص تھا۔ اس کی اپنی سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہوگئی تھیں اور دیکھنے والے شدت حیرت سے گنگ اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ نازش بھی حیرانی سے دیوار سے جا لگی تھی اور ڈاکٹر ماہ رخ بھی...... ڈاکٹر ماہ رخ سے زیادہ بھلا کون اس ننھے سے معصوم بچے کو پہچان سکتا تھا۔ جسے اس کے سامنے نذر آتش کردیا گیا تھا۔

بچہ نواب عرفان علی کا ہاتھ پکڑے ہوئے۔ آتش دان کے قریب پہنچا اور پھر نجانے کس طرح آتش دان کے شعلے نواب عرفان کے بدن سے لپٹ گئے۔

ڈاکٹر فیضان حیرت سے چیخ پڑا۔ لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اس بھیانک ماحول میں بھی وہ نواب عرفان کی کچھ مدد کرسکتا۔ وہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے نواب عرفان علی کے پورے بدن کو جلتا ہوا دیکھ رہے تھے اور کمرے میں بچے کی قلقاریاں گونج رہی تھیں۔ وہ سب شدید حیرت میں مبتلا تھے۔

☆......☆......☆

نعمت علی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اسے یوں محسوس ہوا جیسے اب تک وہ خود بھی انہی کرداروں کے درمیان گردش کرتا رہا ہو۔ خیر الدین خیری کی موجودگی کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے آپ کو اپنے ماحول کو بھی بھول گیا تھا۔ تبھی خیر الدین کی آواز سنائی دی۔

"ہاں تم دیکھ رہے ہو ناں؟ رنگ کائنات کس قدر عجیب ہے۔ بہت ہی عجیب غور کرو تو دنیا سے نفرت ہوجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بہت ہی غیر حقیقی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ کتنا بیوقوف ہے حالانکہ زندگی بہت مختصر ہوتی ہے۔ اس کا ایک انداز ہے۔ جینے کا ایک ڈھنگ ہے اور خالق کائنات نے انسان کو وہی سکھایا ہے۔ پھر جب وہ اس سے ہٹتا ہے تو بھٹک جاتا ہے اور اس کے بعد بقیہ عمر صرف تلاش کی ہوتی ہے۔ اس منزل کی جسے وہ خود نمائی سے پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ حقیقتوں سے منحرف ہوکر، ذات انسانی ایک گورکھ دھندہ ہے اور اس تحقیق کنندہ کا کھیل ہے جس نے کائنات سجائی ہے تجھے صرف اتنا علم دیا گیا ہے اس کائنات کا جسے تو برداشت کرسکے اپنی پہنچ سے آگے نکلے گا تو دیوانہ ہوجائے گا۔ اور ہر ایک کے ساتھ یہی سب کچھ ہے کیا تو نہیں جانتا کہ دنیا کیسے جئے گی۔ کیا تو ایک کسی ننھے سے کیڑے کا جنم داتا بن سکتا ہے۔ جو دھوپ سے جل کر مرجاتا ہے۔ کیا سمجھا؟ اپنے آپ کو جتنی بھی سانسیں تجھے اس زندگی کی ملی ہیں۔ انہیں بس اگر ہوسکے تو انسانی بہتری کے لئے بسر کر۔ کہ یہی راہ نجات ہے اور اسی میں سارے فائدے چھپے ہوئے ہیں۔ سمجھ رہا ہے نا میری بات کو۔ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ہے نہ سمجھ میں آئے تو بدنصیبی...... بدنصیبی،

بدنصیبی صرف بدنصیبی......"

"تمہاری باتیں بہت بلند ہیں خیر الدین...... شاید میرا ذہن تو چھوٹا سا ہے۔ میں نے اس دنیا میں ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔"

"میں یہ ہی کہہ رہا تھا تجھ سے یہی کہہ رہا تھا۔ موت شاید زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ ہاں۔ اگر زندہ ہے اور ضمیر کی موت ہوجائے تو پھر وہ سمجھ لے کہ وہ زندگی ایک گناہ ہوتی ہے۔ ضمیر تو ہماری روح کی آنکھ ہے۔ اصل میں روح انسانی جسم کا وہ پاکیزہ تصور ہے جس سے انسان کا سارا وجود وابستہ ہے۔ یہ روح کیا چیز ہے۔ انسانی جسم انتہائی خوشنما ہوتا ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے کسی کو دیکھ کر اس کے حسن و جمال کا تعین کرتے ہیں۔ خوب صورتی اور بدصورتی کا ایک مقام اپنے ذہن میں ترتیب دیتے ہیں لیکن کتنا ناپائیدار تصور ہے یہ وہ جسم جو تمہاری نگاہوں میں انتہائی حسین ہوتا ہے روح سے محروم ہونے کے بعد کس طرح تعفن زدہ ہوجاتا ہے کہ لوگ اس سے گھن کھانے لگتے ہیں۔

روح سے محروم اجسام کو اس دنیا سے جلد از جلد دور کردیا جاتا ہے۔ کہیں اسے زمین کی گہرائیوں میں دفن کردیا جاتا ہے۔ کہیں آگ میں جلادیا جاتا ہے۔ کہیں پانی میں بہادیا جاتا ہے۔ اس قدر حقیقت ہے یہ حسین جسم جس سے تم حسن کا تعین کرتے ہو۔ اصل چیز اس جسم کے اندر روح ہے اگر روح خوب صورت ہوتو صحیح معنوں میں انسان کی شخصیت کا تعین کیا جاتا ہے۔ تمہاری تحقیق میں یہ تصور شامل ہونا چاہئے کہ ضمیر روح کی آنکھ ہوتا ہے۔ پاکیزہ جذبوں کی پاکیزہ آنکھ۔ تم نے بیمار روحیں دیکھی ہوں گی، کیسے حسین چہرے ہوتے ہیں لیکن ذہن میں شیطان بستا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر ضمیر کی آنکھ سے تمہیں کوئی اشارہ ملتا ہے تو سمجھو کہ وہی تمہارے لئے مناسب ہے لیکن لوگ ضمیر کو قتل کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ضمیر قتل نہیں ہوتا وہ بیمار ہوجاتا ہے۔ روح کے ساتھ اور اس کے بعد انسانی عمل بالکل مختلف ہوجاتا ہے۔

خیر الدین خیری کے الفاظ برچھیوں کی طرح نعمت علی کے دل میں چبھ رہے تھے۔ نعمت علی نے سچ مچ دنیا میں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ خیر الدین خیری کی آواز پھر ابھری۔

"دیکھو! دیکھو...... تمہیں کتنی آسانیاں حاصل ہوگئی ہیں۔ میری موجودگی میں جو چاہتے ہو کرلیتے ہو۔ لیکن میں تمہیں سچ بتاؤں، ابھی تک تم نے وہ نہیں کیا جو تمہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"استاد محترم، میں نے تو اپنے آپ کو آپ کے سپرد کردیا ہے۔ جس طرح آپ چاہیں میرے راستوں کا تعین کریں۔ میں خود کبھی آپ سے منحرف نہیں ہوں گا۔" نعمت علی نے متاثر لہجے میں کہا اور دوسری طرف خاموشی طاری ہوگئی۔

کچھ دیر یہ خاموشی اسی طرح رہی۔ پھر اس کے بعد خیر الدین کی آواز ابھری۔

"یہ ہندوستان ہے سمجھے؟ یہ ہندوستان ہے۔ جادو ٹونوں کی سرزمین پاکستان سے بالکل مختلف، پاکستان میں بھی کچھ لوگ یہ کھیل کھیلتے ہیں لیکن ہندوستان میں یہ ان کی تاریخ ان کے مذہب کا ایک حصہ ہے اور یہاں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو تم تصور بھی نہیں کرسکتے!"

"استاد محترم! اب ہمارا آگے کا کیا پروگرام ہے۔ کیا پاکستان واپس چلیں۔"

"جانا چاہتے ہو؟"

"میں تو آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ جس طرح پسند فرمائیں۔"

"تو دیکھو! اجنبی دنیا کی اجنبی کہانیاں۔ آؤ میں تمہیں ہندوستان دکھاؤں۔"

نعمت علی تو بس لکیر کا فقیر تھا جس طرف خیر الدین خیری کا اشارہ ہوا ادھر ہی اس کا دن گزرا۔ خیر الدین کو تو خیر دنیاوی چیزوں کی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن نعمت علی نے ایک نان بائی کی مدد سے پیٹ کے پائے اور روٹی کھائی اور شکم سیر ہوگیا۔

"وزنی ہوگئے۔ یہ ایک مکمل طور پر ہندو بستی ہے۔ تمہیں ایک عجیب تماشہ دکھاؤں ادھر آؤ......"

تھوڑی دیر کے بعد نعمت علی ایک عجیب وغریب ویران جگہ پہنچ گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک جگہ مدھم مدھم آگ روشن تھی۔ خیر الدین خیری کی آواز ابھری۔

"یہ شمشان گھاٹ ہے۔ ہندو مردوں کو یہیں جلایا جاتا ہے۔ وہ دیکھو! ایک چتا سلگ رہی ہے۔ ارے یہ کیا...... یہ کیا ہورہا ہے؟" خیر الدین خیری نے کہا۔ اور نعمت علی کے قدم اس چتا کی طرف اٹھ گئے۔

چتا کے عقبی حصے میں پیپل کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ جس کے نیچے ایک بہت بڑا چبوترا بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے کو چونے سے پوتا گیا تھا۔ پیپل کے درخت کی چھاؤں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور اس وقت جو منظر ان کے سامنے آیا تھا اور جسے دیکھ کر خیر الدین خیری چونکا تھا وہ عجیب وغریب تھا۔ چتا کے گرد سات سائے گردش کررہے تھے۔ نعمت علی آہستہ آہستہ پیپل کے درخت کے عقبی حصے سے خیر الدین کے ایما پر چبوترے پر چڑھ گیا۔ اس نے رخ کی طرف آکر دیکھا۔ تو ہیولے اسے نمایاں نظر آنے لگے۔

چتا کی صورت میں ... کی روشنی میں وہ سات عورتیں تھیں۔ ان کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔ اور وہ اس چتا کے گرد رقص کررہی تھیں جبکہ ان کے علاوہ وہاں کسی ذی روح کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ چتا جلانے والے واپس جاچکے تھے۔ خیر الدین خیری کی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ان سات عورتوں کا رقص بہت بھیانک تھا۔

اچانک ہی خیر الدین خیری کی نگاہیں رقص کرنے والیوں کے پیروں کی جانب پڑیں۔ اور وہ ایک جھٹکے سے چونک پڑا۔

... ان حالات میں اسے بہت معلومات تھیں ان ساتوں کے پاؤں الٹی سمت تھے۔ ... کر چہروں کی طرف اور پنجے پیچھے کی ... کی آواز ابھری۔

"ٹھیک سوچا تم نے نعمت علی۔ یہ چڑیلیں ہیں۔ سات چڑیلیں اور یہ شخص جس کی چتا جل رہی ہے۔ اپنی موت نہیں مرا ہے۔ شاید، تمہیں اس بات پر حیرت ہو کہ اسے زندہ جلایا گیا ہے۔"

"زندہ......؟"

"ہاں، مگر، میری آنکھیں اسے تلاش کررہی ہیں جو اس کارروائی کا محرک ہے۔ اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسا ایک جال سا نعمت علی کے اوپر آپڑا ہو ایک سایہ سا اس پر لپکا تھا۔ اور دوسرے ہی لمحے نعمت علی نے اپنے آپ کو ایک عجیب سے جال میں گرفتار پایا۔

"ہو...... اوہو...... اوہو......" خیر الدین خیری کی آواز کسی قدر خوفزدہ تھی۔ اس سے پہلے کبھی خیر الدین خیری کی آواز میں خوف کا عنصر نظر نہیں آیا تھا۔ ظاہر ہے وہ دنیاوی تکلیفوں سے دور تھا۔ وہ کس چیز سے خوفزدہ ہوتا۔ لیکن نعمت علی اس جال میں اسے عجیب سا محسوس ہورہا تھا۔ جس میں آنے کے بعد اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس نے جال پر ہاتھ پاؤں مارے اور ایک لمحے کے اندر اس جال سے باہر نکل گیا۔ لیکن جال ایک انسانی خول کی شکل میں موجود تھا۔ اس کے اندر سے گھٹی گھٹی سی آوازیں آرہی تھیں۔ جو خیر الدین خیری کی آواز کے علاوہ کسی اور کی نہیں تھیں بلکہ اس کا بدن اب اپنے آپ ہلکا پھلکا ہوگیا تھا اور اس ہلکے پھلکے بدن سے یہ احساس ہوا تھا کہ اس وقت خیر الدین خیری اس کے وجود میں موجود نہیں ہے۔ یا یہ سایہ ممکن نہیں ہے۔

"استاد محترم کہاں ہو تم؟" نعمت علی نے آواز دی لیکن تین چار آوازیں دینے کے باوجود اسے کچھ سنائی نہ دیا۔ تبھی پیپل کی بلندی سے کوئی نیچے اترنے لگا، ایک انسانی جسم جو انتہائی ہولناک اور بھیانک تھا۔ یہ سادھو کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ لمبے لمبے بال، لمبی داڑھی، انگارہ آنکھیں، تقریباً نیم برہنہ بدن، گلے میں منکوں کی مالائیں پڑی ہوئیں، وہ کوئی بہت ہی خوفناک شخصیت معلوم ہورہی تھی۔ دفعتاً اس کے حلق سے ایک قہقہہ نکلا۔

''چل...... یہ تو میرا بیر ہے۔ پر تو کون ہے رے؟'' یہ سوال نعمت علی سے کیا گیا تھا۔ آواز اتنی بھیانک تھی کہ نعمت علی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔

''منش ہے تو۔ جیتا، جاگتا منش، پر یہ ہاہاہا...... رے کون ہے رے تو؟ اپنے بارے میں تو بتا دے کم از کم تو۔'' سادھو نما شخص نے اس بار اس جالی کی طرف رخ کر کے کہا تھا جس سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی انسانی جسم کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔

اور دفعتاً سادھو نما شخص کا لہجہ خوفناک ہوگیا۔

''جواب دے...... جواب دے کون ہے تو؟، اب تو تو میرے جال میں ہے، میرا بیر۔ تو۔ جواب نہ دیا تو چنگاریاں پھینک کر بھسم کر دوں گا۔ سسرے، کون ہے تو؟

''میں تیرا بیر ہوں۔ سمجھا۔ میں تیرا بیر ہوں۔''

آواز نعمت علی کی ہی تھی۔

''مجھے جانتا ہے۔ میں کون ہوں؟''

''تو سنت پردھان سنگھ ہے۔''

''ہا...... ہا...... ہا...... ہا......''

''اور تو کون ہے؟''

''میرا نام خیرالدین ہے۔ خیرالدین خیری۔''

''ہیں...... ارے...... ارے......'' سادھو کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر حیرت زدہ آواز میں بولا۔

''تو مسلمان ہے...... ارے مسلّا ہے تو؟''

''ہاں......''

''دھت تیرے کی......'' تو کہاں پھنس گیا رے میرے جال میں۔ ارے واہ رے واہ...... واہ رے واہ...... یہ تو مزہ آگیا...... یہ تو مزہ آگیا۔ تو کدھر سے پھنس گیا میرے جال میں۔ بابا۔ خوب ہوئی یہ تو خوب ہوئی۔ اسے کہتے ہیں۔ چپڑی او...... دو...... دو...... اب مزہ آئے گا۔ ارے دیکھوں گا۔ اب ان لوگوں کو بھی جو تعویذ گنڈے کر کے ہمارا راستہ کاٹتے ہیں۔ لوہے کو لوہا کاٹے گا۔ لوہے کو لوہا کاٹے گا۔ چل تجھ سے بعد میں تیرے بارے میں پوچھوں گا کہ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ اب تک...... پر یہ کون ہے سسرا...... ارے کون ہے رے تو؟......'' اس بار سادھو نما شخص نے جس کا نام سنت پردھان سنگھ لیا گیا تھا۔ نعمت علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن نعمت علی کے منہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔

''ارے بولے گا نہیں تو......؟''

''تو کون ہے؟'' اس بار نعمت علی نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''سنت پردھان سنگھ مہان۔ سمجھا۔ بہت بڑے ہیں۔ ہم بڑے مہان ہیں۔ اور اب اور مہان ہوگئے ہیں۔ کیا سمجھا؟''

''اور یہ کیا ہوا ہے؟''

''میں بتاتا ہوں تمہیں...... میں بتاتا ہوں۔ نعمت علی۔'' یہ آواز خیرالدین خیری کی تھی۔'' نعمت علی اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''ذرا سی چوک ہوگئی نعمت علی۔ اسی شخص نے اس مرے انسان کو جلایا ہے۔ اور اسے جلا کر یہ ایک جادو ٹونا کر رہا تھا۔ اس نے سات چڑیلیں اپنے قبضے میں کر لی ہیں۔ جو اس کے گرد ناچ رہی تھیں۔ یہ چڑیلیں اس گندی روح کے قبضے میں تھیں۔ جسے اس شخص نے جلا کر بھسم کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی یہ ایک منتر بھی پڑھ رہا تھا۔ [illegible] سے ایسی روح کو قید کرتا تھا وہ روح جو اس کی بیر بن جائے۔ اس لئے ایک دائرہ بنایا ہوا تھا۔ پیپل کے پیڑ کے گرد اور اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اس دائرے پر غور نہیں کیا۔ یہ جادو منتر کا دائرہ تھا۔ اور اس دائرے سے گزرنے والی کوئی بھی روح اس کے قبضے میں آ جاتی، اور ہم دیکھے بغیر اس دائرے سے گزر کر آگے آ گئے کیونکہ ہمیں ان ناچنے والیوں کا تجسس تھا۔ تو تو خیر انسان ہے۔ اس لئے اس کے جال میں نہیں آیا لیکن میں...... میں اس کے چنگل میں پھنس گیا۔''

''استاد محترم! آپ نکل آئیں۔ یہ آپ سے زیادہ طاقتور تو نہیں ہے۔''

''نہیں نکل سکتا...... نہیں نکل سکتا میں۔'' نعمت علی، آہ میں پھنس گیا۔ آہ...... میں پھنس گیا مجھے بڑا افسوس ہے۔ لیکن غلطی میری بھی نہیں۔ بس ہوگیا۔ بالکل اتفاق ہے۔ ہوگیا یہ...... سب کچھ۔'' خیرالدین خیری کی آواز میں اضمحلال تھا۔ نعمت علی کا دل بھی ڈوبنے لگا۔

''تو پھر اب کیا تم اس کے قیدی رہو گے؟''

''نہیں۔ اس کا ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ اس منتر سے، ایک میعاد ہوتی ہے۔ کتنی میعاد ہے مجھے نہیں معلوم۔ لیکن آخرکار مجھے رہائی مل جائے گی اور جب یہ رہائی مل جائے گی تب ہی میں تجھ تک پہنچوں گا۔ نعمت علی مجھے اندازہ ہے کہ صورت حال خراب ہوگئی ہے۔ تمہارے لئے میرا مشورہ ہے کہ تم پاکستان چلے جاؤ۔ اور وہاں جا کر خاموشی سے وقت گزارو۔ تمہاری ایک ساکھ بنی ہوئی ہے۔ لوگ تمہارے والد مدد علی کو ایک عامل سمجھتے ہیں اس ساکھ سے فائدہ اٹھاؤ اور وہ پانچ سو روپے روزانہ جو تمہارے والد کو ملتے ہیں ملتے رہیں گے۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی کیونکہ وہ ایک چلے اور وظیفے کے نتیجے میں ملتے ہیں۔ بس یہ سارا سلسلہ ہے۔ میں اس کمبخت کے قبضے میں جکڑا جا چکا ہوں۔ اور اب جب تک یہ میعاد ختم نہیں ہو جائے گی۔ میں اس کے قبضے میں رہوں گا۔ تمہیں اکیلے رہنا ہوگا۔ میرے دوست! وہ وقت گزر گیا۔ خیال رکھنا اس چیز کا کہ جب تم ہر چیز پر قادر تھے اور ہم دونوں ساتھ۔ اب ہمارے درمیان تھوڑی سی جدائی رہے گی۔'' نعمت علی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ دفعتاً اس کے بدن میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔

''یہ سادھو...... یہ سادھو نما شخص۔'' اور نعمت علی بے اختیار ہوگیا۔ اس نے غراتے ہوئے۔ سادھو پر حملہ کر دیا۔ ''لیکن یہ کیا...... وہ سادھو کے قریب پہنچا تو اس کے بدن سے دوسری جانب نکل گیا۔ سادھو کا جسم ٹھوس حیثیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ وہ واپس پلٹا اور اس نے سادھو کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن سادھو دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''واہ، رے واہ...... کیا۔ پاگل ہے تو؟ مجھے پکڑ رہا ہے سنت پردھان سنگھ کو۔ جس کے قبضے میں سات چڑیلیں اور ایک بیر آ چکا ہے۔ اور تو مجھ پر حملہ کر کے مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ جا بھاگ جا۔ میرا تجھ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ مجھے میرے مطلب کی چیز مل گئی۔ ارے واہ رے واہ۔ چپڑی اور دو دو...... ایک تو مسلمان اور دوسرے روح...... کیا بات ہے۔ اب تو دیکھنا، کیا کیا تماشے دکھاتا ہوں میں۔ چل جا بھاگ میں بھی جا رہا ہوں۔''

اچانک ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور دوسرے ہی لمحے وہ نعمت علی کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کے بعد پھر مزید اقدامات ہوئے۔

اچانک ہی نعمت علی کو یوں لگا۔ جیسے اس کی پلکیں جھپک گئی ہوں۔ اس نے گھبرا کر گردن جھٹکی اور جب آنکھ کھولی تو نہ اس کے سامنے وہ شمشان گھاٹ تھا نہ پیپل کا وہ پیڑ اور نہ وہ سات ناچنے والیاں اور نہ وہ چتا۔'' وہ تو ایک عجیب و غریب ہی جگہ کھڑا ہوا تھا اور اسے جگہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

اس کی پھٹی پھٹی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ خیرالدین خیری بیچارہ بڑی عجیب سی ناگہانی کا شکار ہوا تھا۔ لیکن وہ بھی اس کی معلومات میں ایک اضافہ تھا کہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے۔

ہندو سادھو جادو منتر کر رہا تھا اور اس جادو منتر کے ذریعے اسے کسی روح کو قبضے میں کرنا تھا۔ جسے وہ اپنا بیر بنا کر اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کر سکے۔ خیر اس بات کا تو نعمت علی کو یقین تھا کہ خیرالدین خیری کسی بھی ایسے ناپاک عمل کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ چاہے اسے کتنی ہی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔ جو کسی مسلمان کے خلاف ہو۔ لیکن پھر بھی بیچارہ عجیب و غریب مشکل میں گرفتار ہوگیا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نعمت علی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

نعمت علی نے بیچارگی کے عالم میں وہاں سے آگے قدم بڑھا دیئے۔ نامعلوم اور سنسان راستے پر وہ سفر کرتا رہا۔ نجانے ہندوستان کا کون سا علاقہ تھا۔ لیکن سرزمین اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی۔ حالانکہ کافی دن

سے یہاں موجود تھا۔ اور بڑی بڑی ہنگامہ آرائیاں ہوچکی تھیں۔ لیکن پھر بھی اسے ابھی ذاتی طور پر کسی بھی جگہ سے مانوسیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بس وہ تو خیر الدین خیری کے سہارے چل لیا تھا۔ جدھر اس کا رخ ہوتا۔ وہ چل پڑتا۔ لیکن اب صاف صاف پتا چل گیا تھا کہ خیر الدین خیری اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ ہاں۔ ایک عزم اس کے دل میں ضرور جاگا تھا۔ یہاں ہندو سادھو سنت جادو منتر کرتے ہیں۔ ان جادو منتروں کے نتیجے میں خیر الدین خیری اس سنت پردھان سنگھ کے قبضے میں تو آ گیا تھا۔ لیکن سنت پردھان سنگھ اکیلا ہی تو جادو کی دنیا کا بادشاہ نہیں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کوئی اس سے بڑا مجھے مل جائے اور میں اسے سنت پردھان سنگھ کے مقابلے پر لا کھڑا کردوں۔ اور اس طرح خیر الدین خیری کو سنت پردھان سنگھ کے چنگل سے آزادی دلاؤں۔

اصل میں نعمت علی کو وہ بات یاد آ گئی تھی کہ ایک زندہ انسان کو جلا کر سنت پردھان سنگھ نے اپنا ور دھان حاصل کیا تھا۔ تو اب کوئی اور ایسا انسان بھی مل سکتا تھا۔ جو سنت پردھان سنگھ کو جلا کر اپنا مطلب حاصل کرسکے۔

بہرحال نعمت علی چلتا رہا۔ ہندوستان کے دیہی علاقوں کے مخصوص مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ غالباً ایسی جگہ تھی۔ جہاں انسانی وجود موجود نہیں تھا۔ پھر اس نے ایک پگڈنڈی کا رخ اختیار کیا۔ اس پگڈنڈی پر قدموں کے نشانات مل رہے تھے اور آخر کار اسے ایک شخص بھی نظر آ گیا۔ جو دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ اس نے کندھے پر کلہاڑی رکھی ہوئی تھی بڑی بڑی مونچھیں اور مخصوص قسم کی داڑھی تھی۔ اس کا چہرہ کافی خطرناک نظر آ رہا تھا۔ دائیں رخسار پر زخم کا ایک گہرا نشان تھا۔ اس نے پلٹ کر نعمت علی کو دیکھا اور رک گیا۔ غالباً اسے بھی یہاں کسی اور انسان کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ نعمت علی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ شخص غور سے نعمت علی کو دیکھ رہا تھا۔

"کون ہے رے تو؟" اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"مسافر ہوں بھائی راستہ بھٹک گیا ہوں۔"

"اوہو...... کدھر جانا ہے تجھے؟"

"بس آگے جو بھی آبادی آ جائے؟"

"ہری پور ہے۔ ہری پور۔ ہری رام پور۔ ہری رام پور جائے گا؟"

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔" نعمت علی بولا۔

"تو چل...... میرے ساتھ آ جا۔ میں تجھے ہری رام پور کی سڑک پر چھوڑ دوں گا۔ مجھے وہاں سے آگے جانا ہے۔ ہری رام پور کی نہر آ جائے گی تو تو اس سے گزر کر چلے جانا۔" اس نے کہا۔ اور اس کے بعد قدم آگے بڑھا دیئے۔

بہرحال ایک ہمسفر کی ضرورت تھی اور آبادیوں کا رخ تو کرنا ہی تھا۔ چنانچہ نعمت علی اس شخص کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ راستے میں کچھ گفتگو کرنے کے لئے اس سے پوچھا۔

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟"

"بس ہری رام پور سے تھوڑے فاصلے پر ہمارا بھی گاؤں ہے۔"

"ٹھیک۔ کوئی نام نہیں ہے۔ تمہارے گاؤں کا؟"

"ارے چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جس کی مرضی آتی ہے اس کا اپنی پسند کا نام رکھ لیتا ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔ عجیب سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کوئی آدھے یا پونے گھنٹے تک دونوں چلتے رہے اور پھر اس کے بعد باغوں اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

آگے چل کر بہت سے درخت نظر آ رہے تھے۔ درختوں سے آگے بڑھنے کے بعد کچھ میدان نما چیز نظر آئی تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔ اس لئے دھوپ بھی کچھ ناگوار نہیں گزر رہی تھی۔ نعمت علی کو اندازہ نہیں تھا کہ سفر کتنا طویل ہوگا۔

بہرحال اس کے بعد پھر آگے۔ درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور وہ درختوں میں داخل ہوگئے۔ عجیب د

غریب جگہ تھی۔ نعمت علی کو بڑے تجربات ہو رہے تھے۔ جنگل کے اندر ایک پتلا سا کچا راستہ دکھائی دے رہا تھا جس میں بیل گاڑیاں چلنے کی وجہ سے دونوں سمت گہرے گڑھے بن گئے تھے۔ اس راستے پر مٹی اڑ رہی تھی۔

"ہری رام پور کا سفر کتنا ہوگا؟"

"ارے بھیا، یہاں کوئی رکھا ہے۔ رام پور ابھی تو خاصا فاصلہ ہے۔"

"یہاں جنگل میں درندے تو نہیں ہوتے؟"

"کبھی کبھار جناور نظر آ جاتے ہیں۔ ویسے ان اندرونی علاقوں میں ڈاکو بھی ہوا کرتے ہیں۔ آگے چل کر جنگل صاف ہے۔ اب کیا جا سکتا ہے۔ جیون کے لئے تو ہر جگہ خطرے موجود ہوتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہاں درندے بھی آ جاتے ہیں۔"

"تیری بات بابا...... ارے بابا درندے تو ہر جگہ ہی نظر آ جاتے ہیں۔ کیا جنگل کیا شہر۔ بس شکلیں بدلی ہوتی ہیں۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ پڑھا لکھا ہے تو کچھ......"

"پانچ جماعت پاس ہوں۔ پورے گاؤں میں سب کے خط میں ہی لکھتا اور پڑھتا ہوں۔" اس نے شاہانہ انداز سے کہا۔

"یہاں لوٹ مار بھی ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ ہمیں بھی ایک دفعہ ان سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ یہ دیکھو ناں۔ یہ زخم اصل میں وہ بہت زیادہ تھے۔ اور ہم اکیلے تھے۔ پر لیلا ہے بھگوان کی ہم ان کا گھیراؤ توڑ کر نکل گئے۔ البتہ کچھ چوٹیں لگ گئی تھیں۔"

بہرحال نعمت علی خاموش ہوگیا۔ بڑا عجیب سا۔ عدم تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے جنگلی شیر کی طرح دندناتا پھرتا تھا۔ لیکن اب خیر الدین خیری کا ساتھ نہیں تھا۔ تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی رہی جنگل میں کہیں کہیں بکریوں کے ریوڑ بھی نظر آ جاتے تھے اور ان کے ساتھ چرواہے بھی۔ انہیں دیکھ کر نعمت علی کے دل سے خوف کچھ کم ہوگیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب ڈرنے کی بات بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ بھی تو انسان ہیں۔ غرض یہ کہ سفر طے ہوا۔ اونچی اونچی جھاڑیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور کافی لمبا سفر ہو چکا تھا۔

نعمت علی محسوس کر رہا تھا کہ اس کے ہمسفر کے انداز میں بڑا اطمینان ہے اور ذرا بھی تھکن نہیں ہے۔ ایک بار پھر اس نے سوال کیا۔

"اب اور کتنا سفر باقی ہے؟"

"بس زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چھوٹی نہر آ جائے گی۔ ادھر سے میں دوسری طرف چلا جاؤں گا اور تم ادھر سے ہری رام پور میں داخل ہو جانا۔"

بہرحال تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ چھوٹی نہر تک پہنچ گئے۔ یہاں سے راستہ دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ لیکن اس مقام پر جنگل کچھ زیادہ ہی گھنا لگتا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ آسمان پر سورج بھی نہیں نکلا ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر آخر کار نعمت علی کا ہمسفر اس سے رخصت ہوگیا اور نعمت علی نہر کے کنارے کنارے اس پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ جس پر کہیں بیل گاڑیوں کے نشانات نظر آ جاتے تھے۔ جھاڑیوں میں کیڑے مکوڑوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ماحول کافی خوفناک ہوگیا تھا۔ نعمت علی نے سوچا کہ اکیلے زندگی بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ واقعی اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ دن پہلے ہی کی بات تھی کہ خیر الدین خیری نے اسے راج رجا رکھا تھا۔

اچانک نعمت علی کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس کا ہمسفر مسافر یہ کہہ کر گیا تھا کہ نہر سے تھوڑا سا آگے بڑھے گا تو ہری رام پور آ جائے گا۔ لیکن ابھی دور دور تک ہری رام پور کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ نعمت علی کے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ ابھی مشکل سے وہ پندرہ بیس منٹ ہی چلا ہوگا کہ اچانک ہی اس کے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں اس کے سر پر سے دو پرندے خوفزدہ سی آوازیں نکالتے ہوئے ایک طرف اڑتے چلے گئے۔ ان کی پرواز بہت نیچی تھی۔

پرندوں کی شکل وصورت بھی نامانوس تھی۔ کبوتر سے کسی قدر بڑے ہوں گے کوئی لمحہ بھر کے بعد ہی ان

پرندوں نے پھر رخ تبدیل کیا۔ اور ویسی ہی نیچی پرواز کرتے ہوئے نعمت علی کی سمت بڑھے۔ اس بار ان کے حلق سے نکلنے والی آوازیں۔ بہت زیادہ خوفناک تھیں۔ نعمت علی تھوڑا سا نیچے جھک گیا۔ نجانے کیوں ایک دم اسے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ اس کے سر پر چونچ مارنے والے ہیں۔ وہ آگے جا کر جھاڑیوں کے جھنڈ میں غائب ہوگئے۔

سامنے بہت بڑے بڑے جھاڑ نظر آرہے تھے۔ پھر اچانک ہی نعمت علی کے کانوں نے ایک ایسی آواز سنی کہ اس کے پاؤں رک گئے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ چاروں طرف ہولناک سناٹا پھیلا ہوا تھا اور ماحول میں خنکی پیدا ہوگئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی کے قدموں کی چاپ ابھر رہی ہو۔ یہ پتہ نہیں انسانی قدموں کی آواز تھی یا پھر کسی جانور کی۔ لیکن پھر ایک اور احساس ہوا۔ قدموں کی آواز کے ساتھ ہی چٹ چٹ کی آوازیں بھی آرہی تھیں اور اچانک ہی اسے جھاڑیوں کے ایک شگاف کی طرف کوئی چیز متحرک نظر آئی۔ دوسری طرف کسی قدر کھلا میدان تھا۔ جو چیز اسے نظر آئی تھی۔ وہ قد میں کسی گدھے کے برابر تھی۔ رنگ بھورا اور گردن پر لمبے لمبے بال تھے۔ جب کہ اس کی تھوتھنی سیاہ رنگ کی تھی۔ اور دم کافی گھنی۔ ایک لمحے میں اسے دیکھ کر نعمت علی کے دل میں کسی بھیڑیے کا احساس جاگا تھا۔ جنگلی بھیڑیوں کے بارے میں اس نے سنا بھی تھا۔

ابھی وہ سوچنے سمجھنے کے قابل بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے اس جانور کے پیچھے ایک اور جانور ابھرتا ہوا نظر آیا۔ وہ بھی اسی قد و قامت کا تھا۔ گویا وہ دو تھے۔ ہوسکتا ہے نر اور مادہ ہوں۔ حالانکہ اس شخص نے نعمت علی کو یہ بتا دیا تھا کہ اس علاقے میں کبھی کبھی درندے نظر آجاتے ہیں۔ لیکن ان دو خوفناک درندوں کو دیکھ کر نعمت علی کے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دور دور تک سناٹا طاری تھا۔

اور اس کے دونوں طرف درخت سر اٹھائے رات کے منتظر تھے۔ درختوں کی چوٹیوں پر سے دھوپ رخصت ہو رہی تھی اور پورا جنگل جھینگروں کی آوازوں سے گونجنے لگا تھا۔ نعمت علی اپنے لئے کوئی پناہ گاہ تلاش کرنے لگا۔ اس کو اندازہ نہیں تھا کہ ان درندوں نے اسے دیکھا ہے۔ یا نہیں۔ وہ الٹے قدموں واپس چلے تو شاید ان سے بچ سکے۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اسے رہ رہ کر اس دیہاتی پر غصہ آرہا تھا۔ جس نے اسے اس طرح مصیبت میں لا کر ڈال دیا تھا۔ پھر اس نے راستہ تبدیل کرلیا اور پیچھے ہٹ کر بائیں سمت کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے پورے وجود میں سناٹے پھیلے ہوئے تھے اور وہ اس خوف کا شکار تھا کہ اس کے قدموں کی آہٹ کہیں ان درندوں کو اس کی جانب متوجہ نہ کردے۔

اچانک ہی درندوں کی خوفناک غراہٹ سنائی دی اور نعمت علی پر کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی کہ اس نے بے اختیار دوڑنا شروع کردیا۔

اب اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی طلسمی وادی میں آکر پھنس گیا ہو۔ بہت بری حالت کا شکار تھا وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن اس طرح کا آجائے گا کہ اس پر ایسی بپتا پڑے گی۔ حالانکہ خیر الدین خیری صرف ایک روحانی وجود تھا۔ لیکن اب نعمت علی کو کیا معلوم کہ اس پر اسرار دنیا کے عوامل کیا ہوتے ہیں۔ جو انسانی عقل و فہم سے بہت دور کی دنیا ہے۔ وہاں کیا کیا ہوتا ہے اور کیسے کیسے ہوتا ہے۔ یہ بات بھی اس نے سوچی ہی نہیں تھی۔ ورنہ اس کو بھی ذہن میں رکھتا۔ بہت بڑا دوست۔ مصیبت میں پھنس گیا تھا جبکہ نعمت علی کا خیال تھا کہ اس پر کبھی کوئی ایسی مصیبت آ ہی نہیں سکتی۔ آہ۔ لیکن مصیبت آ ہی گئی تھی اور اب پتہ نہیں کیا ہو رہا تھا۔ ست پردھان سنگھ نے خیر الدین خیری کو اپنے جنگل میں پھانس لیا تھا۔

اور نعمت علی کے لئے اس سے زیادہ دکھ کی بات اور کوئی نہیں تھی کہ وہ اپنے اس بہترین دوست کی کوئی مدد نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے دل میں غم کے سائے لرزاں تھے۔ لیکن اس وقت تو اسے اپنی زندگی ہی کی پڑی ہوئی تھی۔

ہری رام پور اسے تو یوں لگتا تھا۔ جیسے کہ ایک کہانی ہو اور اس سے زیادہ کچھ نہیں...... اوہ...... آبادیاں کہاں ہیں۔ وہ دوڑتا رہا اور اسے یوں لگا جیسے وہ دونوں درندے اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ پھر کافی فاصلے پر اسے کچی مٹی سے بنے ہوئے گھر کے آثار دکھائی دیئے۔ لیکن یہ گھر بھی تنہا اور ویرانے میں تھا۔

''اوہ...... کوئی اس میں رہتا ہوگا۔'' نعمت علی نے رفتار تیز کردی۔ پھر ایک جگہ ذرا رک کر اس نے آہٹ لینے کی کوشش کی۔ پیچھے آنے والی آوازیں اب کچھ مدھم پڑتی جارہی تھیں۔ ڈرتے ڈرتے اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا اور اس کا خون جم کر رہ گیا۔ وہ دونوں درندے اس سے کوئی سو گز کے فاصلے پر درختوں کے بیچ کھڑے تھے۔ ان کی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں بھوک نظر آرہی تھی۔

لیکن ان کا اس طرح رک جانا نعمت علی کے لئے حیرت کا باعث تھا۔ سامنے والے گھر کی دیواریں اب تھوڑے ہی فاصلے پر تھیں اور ان دیواروں میں اسے ایک لکڑی کا پھاٹک نظر آرہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس پھاٹک کو کھولنے کی کوشش کرنا تو بڑا ہی خطرناک ہوگا۔

بہرحال اگر اچھل کر اس پر چڑھ جائے۔ تو ہوسکتا ہے کہ ان درندوں کی گرفت سے بچ جائے۔ زندگی جب خطرے میں ہوتی ہے تو انسان کے اندر بہت سی اجنبی قوتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ نعمت علی کی ایک لمبی چھلانگ اسے احاطے کی دیوار پر لے گئی۔ لیکن وہ اس دیوار پر اپنے آپ کو روک نہیں سکا تھا اور خود بخود اندر جا پڑا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اگر ان درندوں نے بھی اسی کی طرح پھرتی کا مظاہرہ کردیا تو ابھی چند لمحوں کے اندر اندر وہ بھی اس کے پیچھے اندر پہنچنے والے ہوں گے۔

اندر گرنے سے کوئی چوٹ نہیں لگی تھی۔ خوف دماغ میں بری طرح بسا ہوا تھا۔ بہرحال وہ کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مکان ہی تھا۔ کافی وسیع احاطہ تھا۔ سامنے گھر نظر آرہا تھا۔ جو کچی مٹی کا بنا ہوا تھا اور اس تک پہنچنے کے لئے مٹی ہی کی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھی۔ جو بے شک آڑی ٹیڑھی بنی ہوئی تھیں۔ لیکن صاف ستھری اور پوری عمارت ہی کی طرح مضبوط تھیں۔ اس نے سوچا کہ یہ خونخوار درندے بھی اب دیوار عبور کرنے والے ہی ہوں گے اس لئے اب جتنی پھرتی سے اس مکان کے اندر داخل ہوجائے تو اسے پناہ مل سکتی ہے۔ چنانچہ وہ برق رفتاری سے اس نے دروازے کو کھول کر دیکھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ پھر اس کی نگاہیں گیٹ کی جانب اٹھ گئیں اور اس نے ان ہولناک درندوں کو دیکھا جو گیٹ کے سامنے کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے ان دونوں کو اپنے شکار کے نکل جانے پر سخت غصہ ہو۔ وہ خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے اس مکان کی طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی، چند لمحے انتظار کرنے کے بعد نعمت علی نے دروازے پر دستک دی۔ اسے امید نہیں تھی کہ دروازہ کھل جائے گا۔ لیکن اچانک ہی اسے دوسری طرف سے آہٹ محسوس ہوئی اور دروازہ کھول دیا گیا۔ نعمت علی کی نگاہیں سامنے کی جانب اٹھ گئیں۔ اس تنہا، ویران اور کچے مکان میں رہنے والا شخص ایک بلند و بالا قامت کا مالک تھا۔ اس نے باریک ململ کی دھوتی باندھی ہوئی تھی اور سلک کا قیمتی کرتا پہنے ہوئے تھا۔ چہرے کے نقوش تیکھے تھے اور آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ اس کی مدھم اور پاٹ دار آواز ابھری۔

''آیئے۔ اندر تشریف لے آیئے؟'' اس کا یہ انداز بھی ناقابل یقین تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے نعمت علی کا ہی انتظار ہو اور ویسے بھی جیسے ہی اس نے دستک دی تھی دروازہ کھل گیا تھا۔ جیسے دروازہ کھولنے والا دروازے کے قریب ہی کھڑا ہوا ہو۔ بہرحال اس وقت نعمت علی کو ان درندوں سے پناہ درکار تھی۔ چنانچہ وہ کسی تعرض کے بغیر اندر داخل ہوگیا اور اس شخص نے دروازہ اندر سے بند کردیا۔ اندر گھور تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن جس جگہ نعمت علی کھڑا تھا۔ وہ اس کے اندازے کے مطابق کوئی بہت بڑی ہال نما جگہ تھی۔ کچھ لمحوں بعد آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہوگئیں

اور نعمت علی نے دیکھا کہ قریب ہی ایک اور کمرہ موجود ہے۔ جس کے روشن دانوں سے اچانک ہی روشنی چھننے لگی تھی اور ماحول کافی نمایاں ہوگیا تھا۔ دھوتی، کرتے والا شخص اس دروازے کی طرف بڑھ گیا اور پھر اس نے وہاں رک کر نعمت علی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

نجانے کیوں نعمت علی کو یہ احساس ہورہا تھا کہ جیسے اس کے اعصاب اس کی آواز کے تابع ہوگئے ہوں۔ اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ اس پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ دوسرے کمرے میں کافی روشنی تھی اور اس روشنی کا مرکز چھت پر لگا ہوا وہ فانوس تھا۔ یہ کمرہ بھی کافی کشادہ تھا، ایک جانب بڑا سا تخت پڑا ہوا تھا۔ اس پر گاؤ تکئے لگے ہوئے تھے۔ دوسرے کونے میں بڑی سی میز موجود تھی۔ جس پر ایک بہت ہی خوب صورت گلدستہ رکھا ہوا تھا۔

دیواروں پر قدیم طرز کے ہتھیار بڑی خوب صورتی سے سجے ہوئے تھے۔ پورے کمرے میں ایک عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوشبو کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ لیکن ماحول انتہائی منفرد لگ رہا تھا۔ سب سے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس جنگل نما جگہ جہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ یہ مکان کیا حیثیت رکھتا تھا۔

اچانک ہی اس شخص کی آواز ابھری۔

''آؤ بیٹھو...... تمہاری زندگی تھی کہ تم بچ گئے۔''

نعمت علی نے چونک کر اسے دیکھا اور وہ پھر بولا۔ ''اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے دروازہ کھولتے وقت یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ دونوں، درندے دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ بیٹھو تکلف نہ کرو۔ میں پانی کا انتظام کرتا ہوں۔ منہ ہاتھ دھولو...... وہ مڑا اور کمرے کے ایک بغلی دروازے میں غائب ہوگیا۔

نعمت علی تخت کی ایک جانب ٹک کر اسے دیکھنے لگا۔ اسی وقت اسے وہی آواز سنائی دی۔

''وشالی...... وشالی...... مہمان کو اندر بلالو۔ میں نے پانی اندر رکھ دیا ہے...... وشالی۔'' نعمت علی کے کانوں میں یہ آواز دوبارہ ابھری۔ یقیناً وشالی کسی عورت یا لڑکی کا نام ہی ہوسکتا تھا۔ پھر وہی دروازہ کھلا اور اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

وہ لڑکی نہیں جیسے چاند کا ٹکڑا تھی۔ جو زمین پر اتر آیا ہو۔ انتہائی مناسب قد و قامت، گداز بدن، سرخ سفید رنگت، کمر سے نیچے تک لہراتی ہوئی چوٹی، وہ بے پناہ حسین تھی اور سفید رنگ کی گلابی کناری والی بوتی باندھے ہوئے تھی۔ اس کی حسین آواز ابھری۔

''آیئے مہاراج اندر آجایئے اور ہاتھ منہ دھولیجئے۔ سارے بال گرد سے اٹے ہوئے ہیں۔''

نعمت علی کو یوں لگا جیسے کوئی نغمہ فضا میں ابھرا ہو۔ ستار کی تاروں پر کسی نے ہاتھ پھیر دیا ہو۔ اور وہ آواز بن گئے ہوں۔ وہ کچھ بولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن آواز نہیں نکل سکی۔ تو وہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑا۔

دروازے کے ایک طرف ایک کمرہ اور موجود تھا جس کا ایک دروازہ جنگل کی سمت کھلتا تھا۔ وہیں وہ بلند و بالا قامت والا شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس نے نعمت علی کو دیکھ کر تانبے کے بنے ہوئے ایک بڑے سے لوٹے کی جانب اشارہ کیا۔ جو ایک مخصوص ہندوستانی طرز کا لوٹا تھا۔

''آپ اطمینان سے منہ ہاتھ دھولیجئے پھر آپ سے باتیں کریں گے۔'' بمشکل تمام نعمت علی کی زبان کھلی۔

''معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو میری وجہ سے بڑے مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' وہ شخص مسکرا دیا۔ پھر بولا۔

''منہ ہاتھ دھولیجئے۔ آپ خود غور کریں گے کہ آپ کو اپنی بات پر ہنسی آنی چاہئے آیئے۔ آپ کے لئے دروازہ کھولنا اور اس کے بعد اندر تک لے آنا۔ اگر کوئی مشکل سی بات ہے تو بے شک، مجھے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ورنہ اس کے علاوہ اور میں نے کیا کیا ہے۔''

نعمت علی خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

منہ ہاتھ وغیرہ دھونے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ باہر آیا تو وہ شخص اسے ایک اور کمرے میں لے

گیا۔ جہاں ایک بڑی سی میز کے گرد کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور میز پر بہت سے پھل سجے ہوئے تھے۔

''بیٹھئے مہاراج۔ میرا نام شنکر دیال ہے اور یہ میری چھوٹی سی ننھی سی بہن وشالی ہے۔ ہم لوگ یہیں رہتے ہیں۔ اصل میں ہم دونوں تنہائی پسند ہیں اور یہاں جو تنہائی موجود ہے وہ کہیں اور نہیں مل سکتی۔'' نعمت علی نے فرض سمجھا کہ اسے اپنے بارے میں بتادے۔ اس نے کہا۔

''معاف کیجئے گا۔ میرا نام نعمت علی ہے۔ اور میں۔ میں بستی ہری رام پور جارہا تھا کہ راستے میں یہ درندے نظر آگئے۔

''اچھا۔ اچھا...... ہاں...... کچھ دن سے اس علاقے میں یہ درندے نظر آنے لگے ہیں۔ پر جلدی ہی گاؤں والے انہیں بھگادیں گے یا ماردیں گے۔ پچھلے دنوں انہوں نے بہت سے لوگوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ گاؤں کے لوگ انہیں تلاش کررہے ہیں۔ آپ۔ اس بات کی چنتا نہ کریں کہ یہ ہمارے گھر کی چیزیں ہیں۔ آپ مسلمان ہیں۔ پھل تو بھگوان کے دیئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں کسی انسان کا ہاتھ نہیں لگتا۔''

''نہیں...... نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔''

''چلو تو پھر۔ آپ ان میں سے کچھ پھل لیں۔ دوسری چیز دودھ ہوتی ہے۔ وشالی آپ کے لئے دودھ لے آتی ہے دودھ بھی آپ خود جانتے ہیں کہ ایک شب چیز ہے۔ یہ بھی بھگوان کی دین ہوتا ہے۔''

''میں آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ رات کا سفر آپ جانتے ہیں کتنا خطرناک ثابت ہوگا اور ہم آپ کو اجازت بالکل نہیں دیں گے۔'' شنکر دیال نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ خود نعمت علی ان درندوں کے تصور سے بے حد خوفزدہ تھا۔

اس دوران وشالی بھی یہیں موجود تھی۔ اس کی من موہنی صورت بند آنکھوں سے بھی دیکھی جاسکتی تھی۔ پھلوں میں سے کچھ پھل کھانے کے بعد نعمت علی نے ہاتھ روکے تو شنکر دیال نے کہا۔

''رات کے کھانے میں اگر ہم بھاجی ترکاری تیار کردیں۔ تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا۔''

''آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ بے شک میں مسلمان ہوں۔ لیکن انسان تو ہوں۔''

''واہ...... اچھا لگا۔ چلیں پھر آئیں۔ میں آپ کو اپنی اس رہائش گاہ کی سیر کراؤں۔ آیئے۔'' اس نے کہا اور نعمت علی کرسی سے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

وہ اس کچے مکان کی سیر کرنے لگا۔ جس کے اندر کی وسعتیں بے پناہ تھیں۔ پھر وہ اسے اپنی کتابوں کی لائبریری میں لے گیا۔ جہاں بہت ساری قدیم کتابیں موجود تھیں۔ نعمت علی نے ان کتابوں کو دیکھا اور بولا۔

''آپ کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔''

''ہاں...... ہم صدیوں پرانے لوگ ہیں اور یہ کتابیں بھی ہماری عمر جتنی ہی پرانی ہیں۔'' نعمت علی نے اس کے الفاظ پر غور نہیں کیا تھا۔

تب اس نے ایک کتاب کی طرف اشارہ کیا...... اور اسے نکال کر اس کے اوراق کھولنے لگا۔ اس وقت شام کے تقریباً چھ بجے تھے۔ کھڑکی سے باہر کا جنگل صاف نظر آرہا تھا۔ دن بالکل تاریک ہوچکا تھا۔ پوری فضا میں کیڑے مکوڑوں کی آوازوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ نعمت علی کو کافی دیر تک اپنی کتابیں دکھاتا رہا۔ اچانک ہی وشالی اندر داخل ہوئی اور اس نے کہا۔

''بھیاجی! کھانا تیار ہے۔''

''آؤ۔ میرے معزز مہمان!'' شنکر دیال نے محبت سے کہا اور نعمت علی کو اٹھا کر کھانے کے کمرے میں لے آیا۔

کمرے میں زبردست خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔

(جاری ہے)

شہر وحشت

ایم اے راحت

قسط نمبر: 13

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرہول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دہشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراؤ، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل و دماغ کو مبہوت کرتی خوف و حیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر و شر کی انوکھی کہانی

کھانے پینے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شنکر دیال نے نعمت علی کو آرام کرنے کے لئے کہا۔ اور اس کچے مکان کے ایک خوبصورت کمرے میں اسے سونے کے لئے جگہ دے دی گئی۔ نعمت علی حالانکہ تھکن سے چور تھا۔ لیکن اس آرام دہ بستر پر لیٹنے کے بعد اسکے ذہن میں خیرالدین خیری آ گیا۔

ایک بے نقش وجود جس کا نہ کوئی چہرہ تھا نہ کوئی بدن بس ایک احساس تھا۔ لیکن اس احساس نے نعمت علی کو زندگی کا سب سے بڑا سکون اور مان دیا تھا۔ وہ بے نقش وجود جس کے بارے میں یہ خیال تھا۔ کہ وہ لازوال ہے۔ ایک روح جسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ایک ہوا۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس ہوا کے لئے بھی ایک قید خانہ موجود ہے۔

''آہ......'' نعمت علی کا یہ آہ...... خیرالدین خیری کا اپنا کیا حال ہوگا۔ نعمت علی کو یوں لگا۔ جیسے اسکی زندگی میں سب سے بڑا خلاء پیدا ہوگیا ہو۔ نجانے کب تک کیسے کیسے احساسات ذہن و دل میں آتے رہے۔ اور آخرکار نیند نے مہربانی کی اور وہ سو گیا۔ جب وہ صبح کو اٹھا۔ تو اسے قریب کے کمرے سے روشنی کا احساس ہوا ۔ پھر اچانک ہی جلترنگ بج اٹھے۔

''آپ جاگ گئے۔؟''

''ہاں۔'' وہ ہڑبڑا کر بولا۔

''نیند تو سکون کی آئی۔؟''

''ہاں...... آپ لوگ بہت اچھے ہیں۔ میں آپکو زندگی میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔'' کوئی جواب نہ ملا نعمت علی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے بہترین ناشتہ کرایا گیا تھا ۔ اور اس کی میزبان اس وقت وشالی ہی تھی۔

''آپ ناشتہ نہیں کریں گی وشالی۔؟''

''نہیں۔''

''کر چکی ہیں۔'' نعمت علی نے سوال کیا۔ لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا اس نے نظریں اٹھا کر وشالی کا حسین چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کے آثار تھے۔ نعمت علی کہنے لگا۔

''دل تو یہ چاہتا ہے کہ آپ سے بار بار ملا جائے۔ لیکن پتہ نہیں آپ لوگ مجھے دوبارہ ملیں گے یا نہیں۔''

''نہیں۔ ہم تمہیں دوبارہ نہیں مل سکیں گے۔''

''کیوں۔؟'' نعمت علی نے کسی قدر متعجب لہجے میں پوچھا۔

''بس ہم......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ شنکر دیال آ گیا اور اس نے کہا۔ سفر کے لئے بہترین

وقت ہے۔ مہمان ہری رام زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو آیئے ہم آپ کو تھوڑی دور تک چھوڑ دیں۔'' عجیب سی بات تھی۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ لوگ نعمت علی کو یہاں سے بھگانا چاہتے ہوں۔

بہر حال وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اسے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لوگ اسے کافی دور تک چھوڑنے آئے۔ اور اس کے بعد دونوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے الوداع کہا۔

وہ کچا گھر تھوڑے فاصلے پر موجود تھا۔ یہاں رک کر انہوں نے کہا۔

''ہمیں یاد رکھنا مہمان۔'' نعمت علی نے آنکھیں بند کرلیں۔ وشالی اور شنکر دیال کا تصور ایک عجیب سی کیفیت رکھتا تھا۔ چند لمحے آنکھیں بند کرنے کے بعد اسے اپنے آپ پر قابو ہوا۔ تو اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''آپ لوگ.....'' لیکن اس کے بعد وہ ناچ کر رہ گیا۔ وہ دونوں وہاں پر موجود تھے۔ اور نہ ہی وہاں نظر آنے والا کچا مکان۔ وہاں صرف ایک خاموش جنگل نظر آ رہا تھا۔ البتہ اسے سر کے اوپر دو پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی اس نے اوپر دیکھا۔ آہ..... یہ وہی دونوں پرندے تھے۔ جو اسے پہلے بھی نظر آئے تھے۔ لیکن وہ مکان کہاں چلا گیا۔ مکان کہاں چلا گیا۔ اور پھر اچانک ہی نعمت علی کے دل پر ایک خوف سا طاری ہو گیا۔ اسے یہ محسوس ہوا کہ ان دونوں کی شخصیت میں کوئی ایسی عجیب بات ضرور تھی جو رات سے اسے الجھا رہی تھی۔ وہ انسان نہیں تھے۔ شنکر دیال نے اس سے کہا تھا۔ کہ وہ ماضی کے لوگ ہیں۔ آہ، یہ بات اسے پہلے سمجھ کیوں نہیں آئی۔ وہ زندہ انسان نہیں تھے۔ وہ صرف روحیں تھیں۔ صرف آتمائیں۔ نعمت علی نے غور کیا۔ اور اسکے دل میں دکھ کے دریا موجیں مارنے لگے۔ اسکے ذہن کے دریچوں میں وشالی کا چہرہ آیا۔

لعنت ہے مجھ پر اتنی سی بات ذہن میں نہیں آسکی۔ وشالی.....وشالی.....ایک روح تھی ایک آتما تھی۔ اور اس کا بھائی شنکر دیال بھی وشالی کی آنکھوں کی تحریر نعمت علی کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ آنکھیں تو مسلسل اسے کچھ یاد دلا رہی تھیں۔

''اوہ، غلطی ہو گئی۔ غلطی ہو گئی۔'' وہ تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ اور باہر کا ماحول اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ ایک طلسماتی رات تھی۔ صرف ایک طلسماتی رات۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بس قدم خود بخود آگے بڑھ گئے۔ اب نہ کسی درندے کا خوف تھا۔ نہ اچانک کسی پیش آ جانے والی مصیبت کا۔ کچھ وقت کے لئے وشالی کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔

پھر تھوڑے ہی فاصلے پر ایک آبادی نظر آنے لگی۔ یقیناً یہ ہری رام پور ہی تھا۔ چھوٹے سے قصبے نما آبادی تھی۔ زندگی کی بہت سی سہولتیں یہاں موجود تھیں۔ لیکن ان سہولتوں سے کیا فائدہ اٹھایا جائے۔ نعمت علی آگے بڑھا۔

اسے ایک راستہ مڑتا ہوا ملا۔ ریلوے پھاٹک تھا۔ جو بند تھا۔ ٹرین گزرنے والی تھی۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ جب ٹرین چلی گئی تو آگے بڑھ گیا۔ وجود پر ایک عجیب سی تھکن سوار تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ کہیں لیٹ جائے۔ ویسے بھی کافی لمبا سفر پیدل طے کیا تھا۔ آبادی میں داخل ہوا تو اسے ایک جگہ رام سرائے لکھا ہوا نظر آیا۔ سرخ اینٹوں کی اس عمارت میں اسے ایک کمرہ حاصل ہو گیا۔ اور وہ تھکے تھکے انداز میں ایک میلے کچیلے بستر پر لیٹ گیا۔

زندگی میں پہلی بار ایسا مرحلہ در پیش ہوا تھا۔ کہ اس کے دل نے آنکھوں تک آنسوؤں کی سپلائی شروع کر دی تھی۔ بہت پرانی بات تھی۔ اس وقت جب وہ ایک آزاد پنچھی کی طرح فضاؤں میں اڑ رہا تھا۔ مدد علی نے اسے حلیہ کشی کے لئے چھت پر بھیجا تھا۔ جہاں اسے شاہدہ نظر آئی تھی۔

اور اس نے شاہدہ میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ بعد میں حالات نے اسکی عاقبت درست کر دی۔ اس کے بعد سے اب تک جب تک خیر الدین خیری نے

ساتھ رہا کبھی اس کے ذہن پر کسی لڑکی نے رسائی حاصل نہیں کی۔ اور اس نے خیر الدین خیری کے ساتھ زندگی کے جو لطف اٹھائے۔ وہ اب نا قابل یقین سے لگنے لگے تھے۔

اور اب بالکل بے یار و مددگار تھا۔ اور اسے زندگی کی بہت سی حقیقتوں کا احساس ہو رہا تھا۔ اور ان میں سب سے بڑی حقیقت اس وقت وشالی تھی۔ جس نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ جما لیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا۔

بہر حال وقت گزرتا رہا۔ یہاں اس قصبے میں اس کی کوئی شناسائی نہیں تھی۔ جس سے دل بہلتا یا کوئی امید کی کرن نظر آتی۔ اور پھر یہاں سے طبیعت اکتائی تو ایک دن ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ اور ٹرین کا ٹکٹ لے کر ٹرین میں جا بیٹھا۔ بے منزل بے نشان کوئی منزل تو تھی نہیں۔ کہ کہاں جانا تھا۔ کئی بار پاکستان جانے کے بارے میں سوچا لیکن پھر بہت سی باتوں نے عقل پر ٹھو کے دیئے۔ نہ پاسپورٹ، نہ کوئی اور کاغذ خیر الدین خیری کی بات الگ تھی۔ وہ تو خود ایک پاسپورٹ تھا۔ ویزہ تھا۔ لیکن اب سیدھا سیدھا ایک کام ہو گا۔ اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے۔ اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام بھی لگا دیا جائے۔

زندگی جیل ہی میں گزر جائے گی۔ موت کی سزا بھی مل جائے موت کوئی خاص چیز نہیں تھی لیکن کیوں موت حاصل کی جائے۔ بہر حال جس ڈبے میں سوار ہوا تھا۔ اس میں اچھے خاصے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد ٹرین چل پڑی۔

شام کے سائے فضا میں اتر رہے تھے۔ اور وہ پورے ماحول سے بے نیاز بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کہ کہاں جائے گا ٹرین جہاں بھی جا کر رک جائے بس اسے میں اپنی منزل بنا لوں گا۔ خیر الدین خیری کو چھوڑ کر تو یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ ابھی یہ بات بالکل ذہن میں نہیں آئی تھی کہ خیر الدین خیری کو اس مشکل سے بچانے کے لئے کیا کیا جائے۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات بیٹھے ہوئے تھے۔ نعمت علی کے بالکل سامنے والی سیٹ پر ایک بہت ہی اچھی شکل کے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دو بار انہوں نے نگاہیں اٹھا کر نعمت علی کو دیکھا بھی تھا۔ بڑا پر وقار چہرہ تھا۔ ایسے لوگ بڑے با اصول اور معتبر نظر آتے ہیں۔ وہ لوگ خاموشی سے بیٹھے رہے۔ لیکن رات کو جب انہوں نے کھانے کا سامان کھولا تو انہوں نے ایک پلیٹ میں اپنا کھانا رکھا۔ اور دوسری پلیٹ بنا کر نعمت علی کی طرف بڑھا دی۔

''کھانا کھایئے۔ صاحبزادے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ کہ نہ تو آپ نے کھانا طلب کیا اور نہ آپ نے کھانے کی کوشش کی ہے۔ نعمت علی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

کوئی تعارف تھا۔ نہ کوئی بات چیت۔ بہر حال اسے معذرت تو کرنی چاہئے تھی۔ اس نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ، آپ بسم اللہ کیجئے۔''

''کیوں آپ کھانا نہیں کھاتے۔'' انہوں نے عجیب سے انداز میں سوال کیا۔

''کھانا نہیں کھاؤں گا تو زندہ کیسے رہوں گا۔'' نعمت علی بولا۔

''اچھا تو اب زندہ رہنے کا ارادہ نہیں ہے۔'' انہوں نے کسی قدر شگفتگی سے پوچھا۔

''نہیں جناب خودکشی کرنے کے لئے اس ٹرین میں بیٹھنا ضروری تو نہیں تھا۔ وہ تو کہیں بھی کی جا سکتی تھی۔''

''واہ.....اچھا جواب ہے خودکشی آپ بے شک نہیں کریں گے محترم لیکن کھانا کھائے بغیر جینا بھی تو مشکل ہو جاتا ہے۔ براہ کرم وقت ضائع نہ کیجئے کھانا کھایئے۔ بیٹا! کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ لو۔ پلیٹ پکڑو۔'' نعمت علی نے وہ پلیٹ قبول کر لی۔

بہر حال کھانا کھایا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد انہوں نے گزرتے ہوئے چائے والے سے چائے طلب کی۔ اور نعمت علی کو بھی ایک کپ پیش کیا۔

''اب دیکھو! ہمارا تعارف تو اس کھانے اور

جائے نے کرادیا ہے۔ مزید تعارف کے لئے ضروری ہے کہ آپ مجھے اپنا نام بتایئے اور یہ بتایئے کہ کہاں جارہے ہیں۔ اور پھر سفر میں کوئی الجھن کتنی ہی گہری ہو۔ ہم سفر سے باتیں کرنے سے کٹ جاتی ہے۔

''بس جناب ایک بے نشان سا آدمی ہوں۔ ایسے ہی زندگی کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔''

''ارے واہ۔ کیا بات ہے۔ زندگی کے پیچھے تو کائنات بھاگ رہی ہے۔ تم اس زندگی کی بقاء کے لئے کروگے کیا۔؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''کہیں نوکری تلاش کروں گا۔''

''خوب۔ بہت مزہ آیا تمہاری باتیں سن کر۔ زندگی ضرور تلاش کرنی چاہئے بیٹے کیونکہ یہ اللہ کی امانت ہوتی ہے۔ اسے کھونے میں نقصان ہی نقصان ہے۔ بلکہ اسے جدوجہد کرکے بہتر بنانے کی کوششیں کرنی چاہئے۔ یہ میرے اللہ کا حکم ہے۔ اور یہ تم جانتے ہو کہ اللہ کا حکم مانو تو اس میں اس کی مدد بھی شامل ہوجاتی ہے۔ خیر اللہ تمہاری خواہشوں کو پورا کرے۔'' نعمت علی کو ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اسے مددعلی یاد آئے تھے۔ آسیہ بیگم یاد آئی تھیں۔ خدا کرے وہ سکون کی زندگی گزار رہے ہوں۔

بہر حال اس کے بعد ساری تفصیلات معلوم ہوئیں۔ ان کا نام محمد علی تھا۔ اور وہ ایک اچھے خاصے جاگیردار کے ہاں، ملازمت کرتے تھے۔ اور ان کی زمینوں کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ جاگیردار صاحب کا نام انہوں نے اقبال احمد بتایا تھا۔

کافی دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ نعمت علی ان سے کافی متاثر ہوگیا تھا۔ پھر شاید انہیں نیند آنے لگی۔ انہوں نے اپنی برتھ سیدھی کی اور اس پر لیٹ کر ایک چادر سی اوڑھ لی نعمت علی اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور مسافروں کے درمیان سے گزرتا ہوا ٹرین کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ تھوڑا سا دروازہ کھول کر اس نے باہر جھانکا تو تاریک رات بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ لیکن اچانک ہی اس کے بدن میں سرسراہٹیں پیدا ہوگئیں۔

اس نے کوئی ایسی چیز دیکھ لی تھی۔ جس نے اسے چند لمحوں کے لئے حواس باختہ سا کردیا تھا۔ یہ صرف وہم نہیں تھا۔ تاریک رات میں سفید لباس میں ملبوس ایک سایہ ٹرین کے ساتھ دوڑتا نظر آرہا تھا۔

یہ وشالی تھی۔ ٹرین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دوڑ رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں نعمت علی کے دل کی رفتار تہہ و بالا ہونے لگی۔ وشالی کے انداز میں بھی بے بسی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح دوڑ رہی تھی۔

''اوہ۔ کیسے ٹرین رکواؤں۔''

بے اختیار اس کا دل چاہا کہ ٹرین سے نیچے کود جائے۔ وشالی کو بازوؤں میں لے لے۔ لیکن یہ دیوانگی ہوتی ایسا کیسے ممکن تھا۔

پہلی بار وہ عشق کی لذت سے آشنا ہوا تھا۔ پہلی بار دل میں کسی کے پیار نے انگڑائی لی تھی۔ آہ ''وشالی۔''

یہ آواز بے خیالی میں چیخ کی شکل میں نکلی تھی۔ دروازے کے برابر واش روم کا دروازہ تھا۔ جس سے ایک آدمی باہر نکل رہا تھا۔ بے اختیار زوردار چیخ سن کر وہ بری طرح اچھل پڑا۔

اور غڑاپ سے واپس واش روم میں چلا گیا۔ نعمت علی خود بھی ایک دم سنبھل گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا خجل ہوگیا تھا۔ ذرا سا رخ تبدیل ہوا تھا۔ پلٹ کر دیکھا۔ تو وشالی غائب تھی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور دروازے کے پاس سے ہٹ گیا۔ واش روم میں گھسے ہوئے آدمی نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اور جب امن کی فضاء پائی، تو باہر نکل آیا۔

''کیا ہوگیا تھا بھائی۔؟'' اس نے ناخوشگوار لہجے میں پوچھا۔ نعمت علی کو جواب دینا مشکل ہوگیا۔ تاہم اس نے اطمینان سے کہا۔

''کچھ نہیں بھائی۔ میرا۔ ہاتھ دروازے میں دب گیا تھا۔''

''یار! اتنی رات گئے۔ کیا کررہے ہو یہاں کھڑے ہوئے۔ ہوا بھی تیز چل رہی ہے۔ جاؤ اپنی سیٹ پر جاؤ۔'' نعمت علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسکی نظریں بار بار دروازے کے باہر جارہی تھیں۔ لیکن اب وشالی وہاں موجود نہیں تھی۔ فضاء میں خاموشی اور تاریک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر ستارے چمکے ہوئے تھے۔ اور موسم بڑا خوبصورت تھا۔ نعمت علی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اسکے دل میں ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ دلی خواہش تھی۔ کہ وشالی دوبارہ نظر آئے۔ پہلی بار ایک نئی شکل سے دوچار ہوا تھا۔ اب تک تو بالکل کھنڈروں جیسی زندگی گزاری تھی۔

لیکن اب محبت کا زخم کھایا تھا۔ اور حقیقتوں سے بھی آشنا تھا۔ جانتا تھا کہ وشالی صرف ایک فریب تھی۔ ایک آتما۔ وہ دونوں پرندے وشالی اور شنکر دیال تھے۔ جو اسے اپنی رہائش گاہ تک لائے تھے۔ پتہ نہیں ان کے ماضی کی کہانی کیا تھی۔

بڑا دکھی دکھی سا ہوگیا تھا۔ کبھی خوابوں میں نہیں سوچا تھا۔ کہ اس طرح خیرالدین خیری سے رابطہ ٹوٹ جائے گا۔ اور وہ ہندوستان کی سرزمین پر کٹی پتنگ کی طرح ڈولتا پھرے گا۔ لحہ لحہ خوف سے آشنا کچھ دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ اور اسکے بعد واپس آکر اپنی برتھ پر لیٹ گیا۔

دوسری صبح اس وقت آنکھ کھلی جب کافی دن چڑھ گیا تھا۔ نعمت علی کے نیچے کی برتھ کا مسافر بھی بیچارہ سامنے والی برتھ پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اوپر والی برتھ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ نعمت علی جلدی سے اٹھ گیا اور اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''معافی چاہتا ہوں۔ آپ لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔''

''کوئی بات نہیں۔ آپ اب بھی چاہو تو آرام سے لیٹے رہو نیچے والی برتھ کے مسافر نے کہا۔ لیکن نعمت علی نے جلدی سے نیچے اترنے کے بعد برتھ بند کی اور غسل خانے کی جانب بڑھ گیا۔ جب وہ واپس آیا۔ تو محمد علی صاحب ناشتے کا سامان لگائے ہوئے اسکا انتظار کررہے تھے۔ بولے۔

''سلائس پر مکھن لگا کر کھاتے ہو یا سادہ......؟''

''جی۔'' نعمت علی حیرت سے بولا۔

''چلو بھئی! آجاؤ۔ جلدی کرو۔ بھوک لگ رہی ہے۔''

''آپ...... آپ کیوں یہ تکلیف کررہے ہیں۔ میں ناشتا منگوالیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بھائی۔ اب اتنی بار تم سے کہہ چکے ہیں۔ اب بھی اگر تکلف ہے تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ ویسے ایک بات پر مسکراؤ۔ ہم سے تو ہمارا نام پوچھ لیا تم نے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا۔؟''

''ارے...... میرا نام نعمت علی ہے۔''

''واہ...... واہ...... اللہ کی نعمت کو ٹھکراتے ہو۔ بھئی تم اپنا نام بدل لو۔ اب آرہے ہو یا لگاؤں ایک تھپڑ منہ پر......'' عجیب سا انداز تھا۔ بالکل مددعلی جیسا۔'' نعمت علی کا دل ایک لمحے کے لئے بھر آیا۔ پھر یاد آیا۔ وہ خاموشی سے محمد علی صاحب کے سامنے جا بیٹھا۔

''بھئی اور تو کوئی بات نہیں ہے۔ ہر انسان کی اپنی کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔ میں بھی کچھ کمزوریوں اور محرومیوں کا شکار ہوں۔ بیٹا نہیں ہے کوئی میرا۔ کبھی کبھی بڑی حسرت ہوتی ہے۔ اور یقین کرو۔ ایسا حسرت زدہ انسان بے لوث بے غرض، بہت سے چہروں میں اپنائیت تلاش کرتا ہے۔ بس کسی کو اپنا سمجھنے کو دل چاہتا ہے۔'' نعمت علی چونک کر محمد علی کو دیکھنے لگا۔

ان کی اس بات سے اسے ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ناشتہ ختم ہوگیا۔ باہر مناظر بھاگ رہے تھے۔ ٹرین اپنا سفر بدستور کررہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشن گزر رہے تھے۔ بڑے اسٹیشنوں پر وہ رک جاتی تھی۔ محمد علی صاحب نے بہت دیر کے بعد کہا۔

''یہ سچ ہے کہ انسان اپنے طور پر فیصلے کرتا ہے۔ اسے کس سے زیادہ روابط بڑھانے چاہئیں۔ اور کس سے نہیں۔ شاید ہم تمہیں متاثر نہیں کرسکے۔'' نعمت علی چونک پڑا۔

اسے احساس ہوا کہ نعمت علی صاحب اس کی خاموشی سے بددل ہوگئے ہیں وہ جلدی سے بولا۔

"نہیں...... محمد علی صاحب۔ بس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں بھی زندگی کے مشکل لمحات سے گزر رہا ہوں۔"

"ہم پڑھ رہے ہیں تمہاری شخصیت کو...... آخر ہمارا بھی کوئی تجربہ ہے۔"

"میری کوئی شخصیت نہیں ہے۔ محمد علی صاحب! بہت سے ناکارہ انسانوں کی طرح ایک ایسا انسان ہوں جس کی شخصیت قابل ذکر نہیں۔"

"ہوں...... سمجھ گیا۔"

"کیا سمجھ گئے۔ ذرا مجھے بھی بتا دیجئے" نعمت علی کے ذہن میں مزاحت جاگ اٹھی۔

"بتاؤں۔" محمد علی صاحب بچوں کی سی شوخی سے بولے۔

"جی۔"

"بس میاں! وہی مسئلہ ہے۔ جو ہندوستان کے اسی فیصد نوجوانوں کا ہے۔ پندرہ فیصد وہ ہیں جن کے والدین ان کے لئے بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ پانچ فیصد وہ ہیں جو کچھ کرتے نہیں ہیں۔ یعنی کوئی کام دھندہ نہیں ہوتا ان کے پاس تم بھی انہی میں سے ایک ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

"جی۔ جی۔" نعمت علی نے گردن ہلا دی۔

"تو اب یہ بتاؤ۔ جا کہاں رہے ہو۔؟"

"وہی تو مسئلہ کی بات ہے۔ سوچ رہا ہوں کہاں جاؤں؟ تھوڑا سا وقت کہیں گزاروں گا۔ کھلے آسمان کے نیچے ہی سہی۔ اور اس کے بعد کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔"

'واہ...... واہ اور کیا اس بات سے انکار کرتے ہو۔ کہ انسان سے انسان کا رشتہ نہیں ہوتا۔"

"جی......" نعمت علی نے کہا۔

"تو بس یہ سمجھ لو کہ تمہاری رہائش گاہ کا انتظام ہو گیا ہے۔" میں ہوں ناں! جب میرے دل میں یہ بات آ گئی اور علم میں بھی آ گئی۔ تو یہاں تمہارا کوئی شناسا نہیں ہے۔ تو پھر مجھ پر کیا ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ بتاؤ ذرا مجھے۔"

"ارے، کتنا بوجھ اٹھائیں گے آپ خود پر میری وجہ سے" نعمت علی نے کہا۔ اور محمد علی صاحب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ یوں لگا جیسے انہیں یہ بات ناگوار گزری ہو۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہے۔ پھر بولے۔

"ذرا مجھے سمجھاؤ۔ سمجھاؤ۔ کیا کہا ہے تم نے؟"

"جناب...... یہ ٹرین کا سفر ہے۔ اور زندگی کے سفر میں ایسے بے شمار لوگ ملتے ہیں۔ ہر ایک کو یہ پیشکش نہیں کی جا سکتی۔ کون جانے میں کون ہوں اور آپ مجھے اپنے گھر لے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ آپ کو میری طرف سے کوئی نقصان پہنچ جائے۔"

"اور تم مجھے بیوقوف سمجھتے ہو۔ گویا۔ ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید کئے ہیں۔ کیوں۔؟"

چلو! ٹھیک ہے ہم تمہیں چیلنج کرتے ہیں کہ آؤ، ہمیں نقصان پہنچاؤ تم جب ہمیں نقصان پہنچاؤ گے تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ کیا سمجھے۔؟" نعمت علی کو بے اختیار ہنسی آ گئی تھی۔ بڑے عجیب سے انسان تھے۔ محمد علی صاحب۔

اس نے متاثر لہجے میں کہا۔ "آپ...... بہت عجیب ہیں۔"

"عجیب ہی نہیں بیٹا، غریب بھی ہوں۔ بڑا ٹوٹا ہوا انسان ہوں۔" رشتوں کو ترسا ہوا۔ ہر ایک سے رشتے قائم کرتا رہتا ہوں۔ ہر جگہ محبت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں۔ اور جب محبت نہیں ملتی تو بے چین ہو جاتا ہوں۔ لیکن سنبھلنا تو پڑتا ہی ہے۔ آہستہ آہستہ تمہیں بھی اسی لئے پیشکش کی ہے۔ محبت کے جواب میں بیٹا، صرف میں محبت چاہتا ہوں۔ اگر کہیں سے کوئی لالچ تمہارے سامنے آئے۔ تو سب سے پہلے مجھ پر لعنت بھیج کر چلے جانا۔ بھلا تمہیں کون روک سکتا ہے۔"

محمد علی صاحب کا ایک ایک لفظ نعمت علی کے سینے پر برچھی کی طرح لگ رہا تھا۔ آخر کار اس نے گردن ہلا کر کہا۔

"آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔"

"دل خوش ہو گیا تم سے۔ یہ نہیں کہتا کہ تم ساری

عمر میرے قبضے میں رہو۔ جب بھی تمہاری بہتری کے لئے کوئی مسئلہ سامنے آئے گا۔ تمہیں خوش دلی کے ساتھ رخصت کر دوں گا۔" اس کے بعد بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ سفر طے ہوتا رہا۔ ظاہر ہے۔ نعمت علی انہیں اپنے بارے میں صحیح تفصیل تو نہیں بتا سکتا تھا۔ بس الٹی سیدھی کہانیاں سنا کر انہیں مطمئن کر دیا۔ سیدھے سادھے معصوم سے انسان تھے۔ خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد ایک بہت بڑے شہر کا اسٹیشن آ گیا۔ یہیں پر انہیں رکنا تھا۔ محمد علی صاحب نے نیچے اترنے کے بعد ٹیکسی روکی اور اس کے بعد ایک بہت ہی شاندار کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"یہ اقبال احمد صاحب کی کوٹھی ہے۔ ہمارے مالک کی۔"

"اچھا مگر...... ٹیکسی تو یہاں سے آگے بڑھ گئی۔"

"ہاں...... لوگوں کے کوارٹر پیچھے کی سمت ہیں۔ یہ کوارٹر اقبال احمد صاحب ہی نے دیئے ہیں۔ اپنے خاص خاص ملازموں کے لئے، اندر سے بھی ایک راستہ کوٹھی میں جاتا ہے۔"

"اچھا...... اچھا" نعمت علی نے کہا۔ ٹیکسی رک گئی۔ محمد علی صاحب نے کرایہ ادا کیا۔ اور اس کے بعد نعمت علی کو لے کر اندر چل پڑے۔ ایک کوارٹر کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے بیل بجائی۔ دروازہ کھل گیا۔

محمد علی صاحب اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے بغلی سمت کا دروازہ کھولا۔ یہ شاید مہمان خانہ تھا۔ اسے ڈرائنگ روم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بہرحال یہاں بھی ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ تھوڑی سی لکڑی کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک طرف غسل خانہ بھی تھا۔

"اب تم ذرا آرام کر لو۔ میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔"

"جی۔" نعمت علی نے کہا۔ اور محمد علی صاحب اندر چلے گئے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی۔

بہرحال ذہن پر بوجھ اپنی جگہ تھا۔ خاص طور پر رات کو جو واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ یہ وشالی کون تھی۔ اور اس کا تعاقب کیوں کر رہی تھی؟ اس سوال کا جواب اس کے پاس بالکل نہیں تھا۔ زندگی کیونکہ بے شمار واقعات کے درمیان گزری تھی۔ اس لئے اس پر اسرار واقعے نے اسے خوفزدہ نہیں کیا تھا۔ لیکن ایک بات وہ خاص طور سے محسوس کر رہا تھا۔ وشالی اسے بہت یاد آتی ہے۔

بہت ہی انوکھے انداز میں کاش! وہ ایک بار پھر سامنے آ جائے۔ مجھے اپنے بارے میں بتائے۔" نعمت علی نے حسرت بھرے انداز میں سوچا اور اچانک ہی اسے آہٹیں سنائی دیں۔ اور اس کا سارا وجود سنسنی میں ڈوب گیا۔ کوئی آیا تھا۔ کیا وشالی؟ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور اس خوبصورت بچی کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ جس کے چہرے پر شرارت اور معصومیت پھیلی ہوئی تھی۔

وہ اس کے پاؤں کے نزدیک چپلوں کا ایک جوڑا رکھتے ہوئے بولی۔

"اصولی طور پر تو پہلے مجھے آپکو سلام کرنا چاہئے لیکن چپلیں دونوں ہاتھ میں لے کر سلام کے لئے ماتھے تک ہاتھ کیسے لے جایا جائے۔ اس لئے اب...... السلام وعلیکم۔"

"کون ہیں بھئی آپ۔؟" نعمت علی کو بچی بہت پیاری لگی تھی۔

"ہوں تو انسان ہی۔ یہ الگ بات ہے کہ چھوٹی ہوں۔"

"مجھے تو آپ بڑی دادی اماں معلوم ہوتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ چاہیں تو مجھے دادی اماں کہہ لیں۔ ویسے میرا نام...... نیلا ہے۔ اب بتائیں۔ دادی اماں کہنا پسند کریں گے یا نیلا"

"نہیں۔ دادی اماں نہیں...... نیلا......"

"بڑی اچھی بات ہے۔ اور ہم آپ کو کہیں گے بھائی جان، نام آپ چاہیں تو بتائیں، یا نہ بتائیں، بھائی جان کہنا کافی ہے۔ ہمارے لئے۔"

"کون سی کلاس میں پڑھتی ہیں آپ۔ نیلا......؟"

"پانچویں کلاس میں۔"

''میں نے کہا ناں...... آپ مجھے ایم اے پاس معلوم ہوتی ہیں۔ اتنا ذہین ہونا ٹھیک نہیں ہے۔ اس عمر میں۔''

''ارے واہ، لوگ تو کہتے ہیں۔ ذہانت اللہ کی دین ہوتی ہے۔''

''آپ سے بات کرنا تو بڑا مشکل کام ہے۔ چلئے، ہماری ننھی سی، چھوٹی سی، پیاری سی نیلا۔ اب آپ بتایئے۔ ہم آپ کے لئے کیا کریں۔؟''

''بس آپ صرف ہم سے محبت کیجئے اور ہم آپ کے لئے لا رہے ہیں۔ ناشتہ۔'' وہ شرارت سے بولی۔ اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

نعمت علی کو آج یہ احساس ہوا۔ کہ حسین بچے قدرت کا ایک ایسا انعام ہوتے ہیں۔ کہ انسان ان کے سہارے مشکلات سے گزر جاتا ہے۔ اس بچی نے ذہن میں تازگی پیدا کر دی تھی۔

بہر حال اس کے بعد نعمت علی نے جوتے اتارے اور چپلیں پہن کر غسل خانے کی جانب چل پڑا۔ نیلا نے اس کے ذہن کے گوشوں میں خوشگوار تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اور منہ ہاتھ دھوتے ہوئے اسے اس کی بڑی بڑی باتوں پر ہنسی آ رہی تھی۔ غرض یہ کہ تھوڑا سا وقت گزر گیا۔ اور جب وہ غسل خانے سے باہر نکلا۔ تو سامنے رکھی ہوئی ٹرے میں ایک کیتلی رکھی ہوئی تھی۔ اور دھوئیں کی پتلی سی لکیر اس سے بلند ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی تھیں جو ناشتے کے لئے تھیں۔ اور ساتھ ہی محمد علی صاحب بھی ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''یہ تلے ہوئے تو بس ابلے ہوئے انڈے، صرف تمہارے لئے ہیں بھائی ورنہ ہم تو رات کا بچا ہوا سالن اور گلناز کے ہاتھ کے پراٹھے کھا کر یوں سمجھتے ہیں۔ جیسے پورے دن کے لئے اللہ تعالیٰ نے نعمت کا بندوبست کر دیا ہو۔ ارے...... ہاں...... نام تو میں نے لے دیا۔ گلناز میری بڑی بیٹی ہے۔ اور نیلا تو تم سے مل ہی چکی ہے۔ جب سے تمہارے پاس سے گئی ہے۔ تعریفیں کئے جا رہی ہے۔ ابو...... اگر ایسے بھائی اور مل جائیں تو پانچ دس اور لا دیجئے۔ کتنے پیسوں کے مل جاتے ہیں۔ میں نے گلے میں پیسے جمع کئے ہوئے ہیں۔ باتیں بہت بناتی ہے۔ اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھدار ہے۔ تم دیکھو گے کہ تم نے ذرا سا پیار کیا تو تمہارے کان کھا جائے گی۔''

''میری دعا ہے محمد علی صاحب کے اللہ تعالیٰ اسے صحت اور سلامتی کی زندگی عطا کرے۔ اس کی تقدیر کے ستارے اس قدر روشن ہوں کہ وہ کبھی تاریکی میں نہ آئے۔ بہت پیاری بچی ہے۔ نعمت علی نے خلوص دل سے کہا۔ اور محمد علی صاحب بہت متاثر ہوئے۔ ایک لمحے کے لئے ان کے جسم میں ایک ہلکی سی لرزش محسوس کی تھی۔ نعمت علی سے اپنے احساس چھپانے کے لئے کیتلی اٹھائی۔ اور چائے کی پیالی میں چائے انڈیلنے لگے۔ پھر کسی قدر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''چلو بھئی ناشتہ شروع کرو۔'' نعمت علی ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ بہر حال اس نے خاموشی سے ناشتہ شروع کر دیا۔

''کیا ہو گیا۔ ضرورت سے زیادہ خاموش ہو گئے۔''

''نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ بس آپ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بے لوث اور بے غرض۔ کیا کسی کو اتنا پیار دیا جا سکتا ہے۔ بہت سے مسئلے ذہن میں آ رہے تھے اس کے، بات اس وقت کچھ بھی نہیں تھی۔

اس کی اپنی مشکل تو الگ ہی تھی۔ لیکن بس محمد علی صاحب نے جس طرح اس کا استقبال کیا تھا۔ اور اسے پیار دیا تھا۔ اس نے نعمت علی کو بہت متاثر کیا تھا۔ ابھی وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک بہت ہی پاکیزہ شکل کی پر وقار خاتون اندر آ گئیں۔ ان کے بارے میں اندازہ تو نہیں ہو سکا کہ وہ کون ہیں لیکن، یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ نیلا کی والدہ ہو سکتی ہیں۔ بہر حال محمد علی صاحب نے کہا۔

''یہ ہیں بھئی ہمارے نعمت علی، ویسے صحیح بات یہ ہے کہ مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ لیکن ہم آپ سے

یہ کہیں گے کہ یہ ایک مستقل نعمت ہیں ہمارے لئے۔''

''بیٹا آپ یہاں کوئی تکلیف نہ اٹھایئے گا۔ جو مشکل ہو وہ بتایئے گا۔''

''اچھا ہم تو چلتے ہیں۔ عائشہ ان کا ذرا خیال رکھنا۔ میرا خیال ہے۔ انہیں سو جانا چاہئے۔ آؤ...... اور ہاں...... نعمت علی صاحب آپ آرام کیجئے۔ وہ دونوں باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ وہ حسین چہرہ نظر آیا۔ جو واقعی اپنی مثال آپ تھا۔ اور جسے دیکھ کر آنکھوں میں تازگی پیدا ہو جاتی تھی۔ اور وہ تھی نیلا۔''

''سوچا تھا آپ سو گئے ہوں گے۔ دیکھنے آئے تھے کہ آپ نیند میں کیسے لگتے ہیں۔''

''تو اندر آ کر دیکھئے ناں۔'' نعمت علی نے کہا۔

''ہاں...... اب تو مجبوری ہے۔ اگر واپس جائیں گے۔ تب بھی غیر اخلاقی حرکت ہو گی۔''

''بالکل...... تشریف لایئے۔'' نعمت علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ مسکرانا جانتے ہیں۔ ویسے مسکرانے والے اللہ کو بھی پسند ہوتے ہیں۔ خدا محفوظ رکھے ایسے لوگوں سے جو مسکرانے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ جیسے حیات ماموں۔''

''اور یہ حیات ماموں کون ہیں۔؟''

''اللہ رکھے رشتے دار ہی ہیں۔ بس ہر وقت شکل بنائے بیٹھے رہتے ہیں۔'' نیلا نے کہا۔ اور نعمت علی بے اختیار ہنس پڑا۔

اسی وقت باہر سے آواز ابھری۔

''نیلا کیا بکواس کر رہی ہو۔؟'' یہ آواز...... یہ آواز نجانے کیوں نعمت علی کے ذہن میں ایک جھنجھناہٹ سی پیدا کر گئی تھی۔ لہجہ شگفتہ تھا۔ لیکن یہ آواز وشالی کے سوا کسی کی نہیں تھی۔ سو فیصدی وشالی۔ سو فیصدی وشالی۔'' نعمت علی کے بدن میں ایک کپکپاہٹ سی سوار ہو گئی۔ یہ آواز یہاں کہاں سے سنائی دی۔ دوسری آواز نہیں آئی تھی۔ چنانچہ نیلا اپنی جگہ سے اٹھی۔ باہر جھانکا اور پھر اندر آ گئی۔

''کون تھا نیلا۔ کیا دیکھنے گئی تھیں۔؟''

''ارے وہی ہماری بوڑھی باجی ہیں۔ گلناز صاحبہ!!'' ابھی نیلا نے اتنا ہی کیا تھا۔ کہ عائشہ بیگم کمرے میں داخل ہو گئیں۔

''نیلا تم باز نہیں آؤ گی ناں۔؟''

''لگا ڈالی ناں۔ میری شکایت۔ ایک تو میں ان گلناز باجی سے تنگ ہوں۔ ہمیشہ میری مخالف بات کرتی ہیں۔''

''تم نے انہیں سوتے سے کیوں جگایا۔؟''

''آپ پوچھ لیجئے جاگ رہے تھے۔ کیوں آپ مجھے بتائیں بھائی جان آپ جاگ رہے تھے ناں۔''

''ہاں...... ہاں...... جاگ رہا تھا میں آنٹی۔ واقعی جاگ رہا تھا۔''

''بیٹے...... ! بڑی مشکل ہو جائے گی تمہیں۔ اگر اسے زیادہ سر چڑھایا تو۔ بہت تیز ہے یہ۔ ہر وقت تمہارے کان کھایا کرے گی۔''

''نہیں...... آنٹی...... ایسی کوئی بات نہیں۔''

''ایک بات اور بھی ہے بیٹے! اصل میں اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ ترسی ہوئی ہیں بھائی کے لئے۔''

نعمت علی کوئی جواب نہیں دے پایا تھا۔ بہر حال وقت گزرتا رہا۔ خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی یہاں سب سے لیکن آج تک کبھی گلناز سامنے نہیں آئی تھی۔ البتہ اس کی آوازیں کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھیں۔ اور ان آوازوں کو سن کر نعمت علی عجیب سی کیفیتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ کئی مرتبہ اس کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی۔ کہ ایک نگاہ گلناز کو دیکھے۔ لیکن پھر یہی سوچا کہ محمد علی صاحب نے اس پر اندھا اعتماد کیا ہے۔ اگر انہیں یہ بات پتہ چل گئی۔ تو پھر شاید ایک لمحہ بھی یہاں رہنے کے لئے مناسب نہ ہو۔ کسی کا اعتماد ٹوٹے گا۔ اور نعمت علی یہ اعتماد نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

اس دن بارش ہو رہی تھی۔ اچانک ہی بارش بہت تیز ہو گئی تھی۔ محمد علی صاحب اپنے کام پر گئے ہوئے تھے۔ اور شاید تیز بارش کی وجہ سے ابھی تک واپس نہیں

آئے تھے۔ بارش تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ اسی وقت اندر سے ایک آواز سنائی دی۔

"اندر آجایئے۔ باہر بہت سردی ہورہی ہے۔ بھیگ گئے تو بیمار ہوجائیں گے۔" نعمت علی کے بدن پر ایک بار پھر لرزشیں طاری ہوگئیں۔ یہ آواز سوفیصدی وشالی کی آواز تھی۔ وشالی کی آواز تھی۔ وہ ہیجانی انداز میں کھڑا ہوگیا۔ اس کے کانوں نے دھوکہ نہیں کھایا تھا۔ وہ ہیجانی انداز میں کھڑا ہوگیا۔ اس کے کانوں نے دھوکہ نہیں کھایا تھا۔ سوفیصدی وشالی ہی کی آواز تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا دروازے کے پیچھے سے آواز آئی تھی۔

دل بری طرح تڑپنے لگا کہ اندر چلا جائے۔ دیکھے تو سہی یہ آواز کیسی ہے۔ یہ الفاظ کس کے منہ سے نکلے ہیں۔ وہ اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندر جانے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ ذرا سی سرزش ہوجاتی تو بات بالکل ٹھیک نہ ہوتی۔ وہ اندر نہ گیا۔ کچھ دیر کے بعد محمد علی صاحب بھی آگئے۔ بیگم صاحبہ بھی آگئیں۔ لیکن اس دن نعمت علی کی بے چینی انتہائی عروج پر تھی۔ بارش بند ہوگئی تھی لیکن آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

رات بھی وقت سے پہلے ہی ہوگئی تھی۔ رات کا کھانا بھی بس واجبی سا کھایا۔ محمد علی صاحب کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"آج طبیعت پر کچھ گرانی محسوس ہورہی ہے۔ اگر آرام کرنے چلا جاؤں تو بور تو نہیں ہوگے۔"

"نہیں..... آرام کیجئے آپ۔" نعمت علی نے جواب دیا۔ اور محمد علی صاحب چلے گئے۔ ماحول بہت عجیب سا ہورہا تھا، ایک بے چینی سی اس کے دل میں گھر کیے ہوئے تھی۔ بہت دیر اسی طرح گزر گئی۔ اچانک اس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر نکل گئیں۔ کوئی سایہ سا، سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ چہرہ سفید رنگ کے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ نعمت علی چونک پڑا پھر زور سے بجلی چمکی اور اس نے سفید کپڑے میں لپٹے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ اور اس کے سارے وجود میں ایک ہیبت ناک سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وشالی کے حسین پیکر کو لاکھوں میں کیا کروڑوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہی تھی۔ سوفیصدی وہی تھی۔ نجانے کیا ہوا اس کے سارے وجود میں آگ سی دوڑ گئی۔ اور اس کے بعد وہ بے اختیار ہوگیا۔

وشالی صحن سے باہر نکل گئی تھی۔ نعمت علی نے کوئی انتظار نہ کیا۔ اور خود بھی باہر نکل آیا۔ وہ اس راز کو جاننا چاہتا تھا۔ باہر اس نے گلی کے آخری سرے پر وشالی کا سایہ دیکھا۔ سر پر سفید کپڑا اور بدن پر اوڑھا ہوا سفید لباس نعمت علی کی راہنمائی کررہا تھا۔

باہر گلی میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اور اس کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ نعمت علی آگے بڑھ کر اس کا تعاقب کرتا رہا۔ اور تو کچھ نہیں کرسکا تھا۔ بس اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ گلی کے آخری سرے پر پہنچنے کے بعد وہ سڑک پہ آگئی۔

"کہاں جارہی ہے وہ؟" اس وقت وہ تمام احساسات سے آزاد ہوگیا تھا۔ بہت سا فاصلہ طے ہوگیا۔ اس دوران یہاں کے بہت سے علاقے دیکھ چکا تھا۔ لیکن جس علاقے کی سمت وشالی جاکر مڑی تھی وہ آگے جاکر بائیں سمت مڑ رہا تھا۔ اور پھر اس کا سلسلہ قدیم کھنڈرات پر جاکر ختم ہوجاتا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے یہ کھنڈرات یقینی طور پر تاریخ کا حصہ ہوں گے۔ لیکن وہ ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ وہ تعاقب کرتا رہا۔ وہ سایہ ایک کھنڈر میں جاکر غائب ہوگیا۔ نعمت علی پر ایک سحر کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ یہ بات جاننا چاہتا تھا کہ وشالی اور گلناز میں کیا مماثلت ہے۔ اور اگر وہ وشالی ہے۔ تو وہاں کیا کرنے آئی ہے۔

بہرحال وہ تیز رفتاری سے چلتا ہوا اسی کھنڈر میں داخل ہوگیا۔ اور بھی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں تھیں۔ جن کے بارے میں نعمت علی کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ تو بس حیرت کا شکار تھا۔ سب سے بڑی حیرت یہ تھی کہ گلناز ایک نیک اور دیندار مسلمان کی بیٹی تھی۔ اور وشالی شنکر دیال کی بیٹی، ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والی۔ بے شک وہ ایک روح تھی صرف ایک روح، جس کا اعتراف ان لوگوں نے کرلیا تھا

۔ لیکن پھر یہ ایک مسلمان لڑکی کے روپ میں کہاں سے آگئی۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ وشالی کھنڈروں میں آکر گم ہوگئی تھی۔

رات گہری سے گہری ہوتی چلی گئی۔ نعمت علی نے پورے کھنڈر کی تلاشی لے ڈالی۔ اور جب وہاں کچھ نظر نہ آیا تو باہر نکل آیا۔ آسمان پر گہرے بادلوں کی وجہ سے ستارے بھی نہیں نکلے تھے۔ تاریکی اتنی گھور تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے اس تاریکی میں ان کھنڈرات کی عجیب وغریب شکلیں صرف محسوس کی جاتی تھیں۔ لگتا تھا جیسے بہت سے آسیب گردن جھکائے بیٹھے ہوں۔ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی ایکدم وہ چونکا اگر محمد علی صاحب یا عائشہ بیگم کسی ضرورت کے تحت ادھر نکل آئیں تو اسے غائب پاکر حیران ہوجائیں گی۔ کسی کے گھر میں رہنا بھی آسان کام نہیں ہے، جب وہ گھر میں داخل ہوا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔

دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ بھی نہیں پتہ تھا۔ کہ گلناز واپس آئی ہے یا نہیں۔ بہرحال بڑی پریشانی کے عالم میں پوری رات گزر گئی۔ صبح آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور جسم ہلکے ہلکے بخار میں مبتلا تھا۔ لیکن اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ بڑی شرمندگی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اب یہاں کسی دوسرے کے گھر پر اس طرح پڑ کر زندگی نہیں گزاری جاسکتی تھی۔ بہرحال وہ سوچتا رہا۔ محمد علی صاحب معمولات سے فارغ ہوکر چلے گئے۔ تو وہ بھی گھر سے باہر نکل آیا۔ اور رات کے راستے پر غور کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ وہ ان جگہوں کو تلاش کرنے میں ناکام نہیں ہوا۔ جہاں سے وشالی یا پھر گلناز گزری تھی۔ اور ان کھنڈرات تک پہنچ گیا۔ ان کھنڈرات کی تاریخ کا اسے کوئی علم نہیں تھا۔

وہ بہت دیر تک گھومتا رہا۔ اور پھر ایک جگہ جاکر بیٹھ گیا۔ اس کی سوچیں بہت منتشر تھیں۔ اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ لیکن چہرہ تک دیکھ لیا تھا اس نے کیا کروں۔ کیا نہ کروں، اس نے سوچا کہ مجھے اب یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔ آہ، کن مشکلات میں گرفتار ہوگیا ہوں میں۔ خیرالدین خیری۔ تم یقین کرو۔ تمہارے ساتھ زندگی کا سنہری دور گزر رہا تھا۔ لیکن اب تمہاری گمشدگی سے مجھے یہ احساس ہورہا ہے۔ کہ جیسے میرا کوئی بہت بڑا اثاثہ گم ہوگیا۔

تم نے میرے لئے دنیا کا ہر کام کیا۔ میرے گھر کی حالت سدھار دی۔ لیکن تمہیں مشکلوں سے نہیں بچا سکا۔ میں تمہیں اس شیطان کے چنگل سے نہیں بچا سکا۔ جس کا نام پردھان سنگھ تھا۔ آہ، میں کیا کروں۔ کس طرح سے تمہیں ان مشکلات سے نجات دلاؤں۔ کیا میرے سنہری دن کبھی واپس نہیں آسکتے۔ انہی سوچوں میں گم تھا۔

یہاں کھنڈرات میں کوئی نشان تک نہیں ملا تھا۔ چنانچہ گھر واپس آگیا۔ دروازہ نیلا نے کھولا تھا۔ نعمت علی کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔

"تشریف لایئے جناب! آپ تو بس مہمان بن کر رہ گئے ہیں حالانکہ ہم نے آپ کو مہمان کے بجائے بھائی جان بنایا تھا۔"

"کوئی غلطی ہوگئی مجھ سے نیلا؟"

"بہت بڑی غلطی لیکن بتائی نہیں جاسکتی۔"

"پھر تو مجھے افسوس ہوگا۔ اس بات کا۔"

"سوچ لیجئے! آپ ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کررہے۔"

"نیلا..... نیلا..... کیوں فضول بکواس کرتی رہتی ہو تم۔ خاموش نہیں رہ سکتیں۔" اندر سے آواز آئی۔

"چلئے خاموش ہوجاتے ہیں۔" نیلا نے کہا۔ لیکن نعمت علی کے دل ودماغ میں پھر وہی کیفیت ہوگئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ آواز گلناز کی ہے۔ لیکن یہ آواز اس کی نہیں وشالی کی آواز تھی۔ اس وقت وہ بے اختیار ہوگیا۔ وشالی یا گلناز دروازے کے باہر تھیں۔ وہ دروازے سے باہر نکل آیا۔ اور ایک لمحے کے اندر اندر اس کا گلناز سے سامنا ہوگیا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹی اور ایک دیوار سے ٹک کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اس کے

چہرے پر خوف کے آثار دیکھے لیکن وہ چہرہ...... وہ چہرہ وشالی کا تو نہیں تھا۔

اس وقت نیلا بھی حیران رہ گئی تھی۔ اور گلناز بھی۔ بے اختیار نعمت علی کے منہ سے دیوانہ وار آواز نکلی۔

”مجھے بول کر دکھاؤ...... بول کر دکھاؤ مجھے۔“

”جج...... جی۔“ گلناز خوفزدہ انداز میں بولی۔

”بول کر دکھاؤ مجھے۔ میں تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں۔“ نعمت علی نے جنونی آواز میں کہا۔ اور گلناز کے چہرے پر انتہائی خوف کے آثار نظر آنے لگے۔

دوسری طرف نیلا بھی حیرانی سے کھڑی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں عائشہ بیگم کہاں تھیں۔ گلناز کی سہمی ہوئی آواز ابھری۔

”مم...... مم...... میں...... آپ سے پردہ کرتی ہوں۔ اور ابو نے بھی مجھے یہی حکم دیا ہے۔ کہ میں آپ سے پردہ کروں۔ آپ براہ کرم اندر چلے جایئے۔“ گلناز کی آواز ابھری۔

لیکن یہ آواز سو فیصدی وشالی کی آواز تھی۔ نعمت علی سخت وحشت زدہ ہو گیا۔ اپنے جنون میں جو عمل اس نے کر ڈالا تھا۔ وہ انتہائی خوفناک تھا۔ بیچاری گلناز کیا سوچ رہی ہوگی۔ ادھر نیلا کے چہرے کی رونق بھی سمٹ گئی تھی۔ نعمت علی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھا۔ اور پھر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

بستر پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی کیفیت دیوانوں جیسی تھی۔ نجانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا۔ کنپٹیاں جلنے لگیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ لیکن اس دوران کوئی ایسی خاص بات نہیں ہوئی۔ پھر اچانک ہی عائشہ بیگم کی آواز سنائی دی۔ اندر کسی بات پر بول رہی تھیں۔ لیکن وہ اس کے کمرے میں واپس نہیں آئیں۔ البتہ دوپہر کو کھانا لے کر آئیں۔ اور خاموشی سے ٹرے رکھ کر واپس چلی گئیں۔ ان کے رویے سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں صورتحال کا علم ہو گیا ہے۔ نعمت علی نے زور سے گردن جھٹکی۔

”برا ہو گیا ہے۔ یار! برا ہو گیا ہے۔ ویسے تو خیر یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اصولی طور پر میں یہاں رہ بھی کتنا سکتا ہوں۔ خاموشی سے نکل جانا ضروری ہے۔ لیکن اس نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں ساری تفصیلات بتانے کے بعد ہی وہ یہاں سے جائے گا۔ پتہ نہیں شرمندگی سے یا حالات کی وجہ سے اسے تیز بخار ہو گیا تھا۔ لیکن اسے اس بات کی پرواہ نہیں تھی۔ البتہ اس سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں گیا تھا۔ وہ اپنے آپ میں جھلس رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ وشالی اس سے کیا چاہتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے کیا کیا ہوگا۔ اور دوسری صبح اس نے محسوس کیا۔ کہ محمد علی صاحب کام پر نہیں گئے۔ وہ اس کے پاس آئے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔

”رات کا کھانا نہیں کھایا۔ نعمت علی۔؟“

”جی ہاں۔“

”کیا بات ہے۔ چہرہ کیسا ہو رہا ہے۔“ انہوں نے سوال کیا۔ اسی وقت ان کی بیگم بھی اندر آ گئیں۔ ان کا چہرہ بھی ستا ہوا سا تھا۔ نعمت علی کو یہ محسوس ہوا۔ جیسے وہ دونوں اس سے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عائشہ بیگم واپس جانے لگیں۔ تو نعمت علی نے کہا۔

”آنٹی! تھوڑا سا وقت دیں گی مجھے۔ عائشہ بیگم نے محمد علی صاحب کی طرف دیکھا۔ اور محمد علی صاحب نے سامنے اشارہ کر کے کہا۔

”بیٹھو......“ عائشہ بیگم بیٹھ گئیں۔ تو نعمت علی نے کہا۔

”محمد علی صاحب میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔“

”ہاں۔ بولو......“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”واقعہ ہوا ہے۔ اس کا تھوڑا سا پس منظر بتانا چاہتا ہوں۔ مجھے پتہ ہے آپ کو اس کا علم ہو گیا ہے۔ لیکن اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ بتانا ضروری ہے۔ میرے بارے میں جو کچھ گلناز نے بتایا ہے۔ یا نیلا نے۔ لیکن دونوں اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔ جن کا تعلق میری زندگی سے ہے۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں۔ لیکن آپ کی محبتوں کے جواب میں میرا یہ عمل مجھے خود اپنے آپ سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیتا۔ چنانچہ میں نے یہ نہیں کیا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ کہ جیسے ہی موقع ملے۔ میں آپ کو ساری حقیقت بتا دوں۔ محمد علی صاحب میں آسیب زدہ ہوں۔ میری زندگی میں کچھ ایسے واقعات شامل ہو گئے ہیں۔ جو نہ میری سمجھ میں آتے ہیں۔ اور نہ ہی میں کسی کو سمجھا سکتا ہوں۔ ایک ایسی روح میرا تعاقب کر رہی ہے۔ جسے میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ میں اسی کی وجہ سے در بدر ہوں۔ بس میں جس مشکل کا شکار ہوں۔ اس کی تفصیل آپ کو کیا بتاؤں۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی جس کا نام وشالی تھا۔ مجھے ایک جگہ ملی تھی۔ بہر طور آپ کو حیرت ہوگی کہ گلناز کی آواز وشالی سے ملتی جلتی ہے۔ اور کل اتفاق کی بات کہ آنٹی موجود نہیں تھیں۔

نیلا مجھ سے کچھ بات کر رہی تھی کہ گلناز نے نیلا کو پکار کر کچھ کہا۔ اور یہ آواز سو فیصدی وشالی کی آواز تھی۔ میں بے اختیار باہر نکل آیا۔ اور میں نے گلناز کو دیکھا۔ گلناز کی آواز وشالی سے ملتی ہے۔ لیکن چہرہ بالکل نہیں ملتا۔ میرے پاس اپنی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ میں آپ کو یہ بتا دوں۔ اس بات کے کھل جانے کے بعد میں یہاں سے بھاگ جاتا۔ لیکن میں نے سوچا کہ جس پیار سے آپ نے مجھے اپنے پاس رکھا ہے۔ اس کی توہین ہوگی۔“ محمد علی صاحب اور عائشہ بیگم۔ ہمدردنگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ تب عائشہ بیگم نے کہا۔

”مگر بیٹے! یہ کیفیت کب سے ہے تمہاری۔؟“

”تھوڑا عرصہ گزر گیا...... بس مجھے اتنا ہی بتانا تھا۔ آپ یہ نہ کہیں کہ میں نے آپکو دھوکہ دیا۔ شاید وقت میری باتوں کی تصدیق کر دے۔“ نعمت علی نے یہ تمام باتیں محمد علی صاحب کو بتائیں۔ دونوں میاں بیوی بہت متاثر ہوئے۔ محمد علی صاحب نے نعمت علی کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ بیٹے، غلط فہمی انسانی فطرت میں شامل ہے۔ لیکن ہمیں تمہاری بات پر یقین ہے۔ تم بے فکر رہو۔

میرے ایک بزرگ دوست ایک مسجد میں رہتے ہیں۔ تھوڑے بہت عملیات سے بھی واقف ہیں۔ میں تمہارے بارے میں ان سے بات کروں گا۔ اور وہ یقیناً کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔" نعمت علی مسکرا کر خاموش ہوگیا۔

وقت اس کے خلاف تھا۔ وہ پاکستان جانے کے لئے جدوجہد بھی کرسکتا تھا لیکن جس نے زندہ انسانوں سے زیادہ نعمت علی کی مدد کی تھی۔ مشکل میں گرفتار تھا۔ اسے چھوڑ کر پاکستان جانے کے لئے جدوجہد بھی نہیں کرسکتا تھا۔ نعمت علی نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ قدرت نے ماں باپ کے لئے تو انتظام کر ہی دیا ہے۔ مدد علی اور آسیہ بیگم کو پانچ سو روپے روزانہ مل جایا کرتے ہیں۔ جب تک زندہ ہیں۔ وہ زندگی گزار ہی لیں گے۔ نعمت علی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ سوچیں گے۔ کہ وہ کہیں موت کا شکار ہوگیا۔ اس کا اپنا فرض پورا ہوگیا ہے۔ ان دونوں کا کام چلتا رہے گا۔ لیکن اگر خیرالدین خیری کو وہ اس طرح چھوڑ کر چلا گیا تو دوستی کی اس سے زیادہ توہین اور کوئی نہیں ہوگی۔ لیکن اب محمد علی صاحب کے پاس بھی نہیں رہا جاسکتا تھا۔ اس نے کچھ فیصلے کیے اور اس کے بعد اسی رات خاموشی سے وہاں سے نکل آیا۔ اور نکلنے کے بعد چلتا رہا۔ نجانے کتنا فاصلہ طے کیا۔ جب اسے ریلوے اسٹیشن نظر آیا۔ اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔ اپنے آپ سے اور حالات سے بھاگ جانے کا۔ چنانچہ وہ ٹرین میں بیٹھ گیا۔ یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔ اور کہاں تک جائے گا۔ بس ٹرین چل پڑی تھی۔

اور وہ خاموشی سے راستوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ مناظر اسے کہاں لے جاتے ہیں۔ یہ اندازہ نہیں تھا۔ نجانے کتنے گھنٹے سفر کرتے گزر گئے۔ وہ نیم خوابی کا شکار ہوگیا تھا۔ ٹرین کی مسلسل آواز غنودگی لانے کی وجہ بن گئی تھی۔ پھر جب ٹرین کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ تو وہ جاگ گیا۔ کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ٹرین کسی اسٹیشن پر پہنچے رک گئی تھی۔ بہت دور روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ لیکن ٹرین کسی پلیٹ فارم پر کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ باہر بہت سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اور پھر اچانک ہی ٹرین کے ایک ڈبے میں بہت سے پولیس والے گھس گئے۔ انہوں نے جلدی سے کمپارٹمنٹ کے دوسرے دروازے پر بھی پہرہ لگادیا۔ اور اس کے بعد وہ ایک ایک شخص کا جائزہ لینے لگے۔ ان میں کچھ کانسٹیبل بھی تھے۔ اور کچھ اعلیٰ افسران بھی اور کچھ ایسے وردی پوش جو کسی خاص ڈیپارٹمنٹ کے معلوم ہوتے تھے۔

پھر ایک وردی پوش نعمت علی کے پاس آکر رکا۔ اور پھر اچانک ہی اچھل پڑا۔ اس نے اپنے ہولسٹر میں لگا ہوا پستول نکال لیا۔ اور دونوں پستولوں کا رخ نعمت علی کی طرف کرکے بولا۔

"ہاتھ اٹھاؤ...... ورنہ گولی ماردوں گا۔" نعمت علی کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ اٹھادیئے تھے۔

"لو...... سنبھالو اسے...... سنبھالو......" اس نے کہا۔ اور بہت سے پولیس والے نعمت علی پر ٹوٹ پڑے۔ لاتیں، تھپڑ، گھونسے، نعمت علی کے ہوش و حواس رخصت ہونے لگے۔ کمپارٹمنٹ کے تقریباً سارے ہی لوگ جاگ گئے تھے۔

اور سہمی ہوئی نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ نعمت علی کی سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ پولیس والوں کی مار کھا رہا تھا۔ اور اس کے حواس جواب دیتے جارہے تھے۔ پھر وہ شاید نیم غشی کا شکار ہوگیا۔ اور نجانے کب تک یہ غشی اس پر طاری رہی۔ ہوش آیا تو ایک بڑے سے کمرے میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اور دونوں پاؤں بھی شاید دن کی روشنی ہورہی تھی۔ کمرے میں اسی طرح کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ وہ خوف و دہشت کے عالم میں۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگا۔ بڑا بدنما کمرہ تھا۔ دیواروں کا پلاسٹر جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ اور انتہائی مکروہ شکلیں نمایاں ہوگئی تھیں۔

پھر کچھ افراد اندر آئے۔ اس کے پاؤں کھولے گئے۔ اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا گیا۔ نعمت علی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا تھا۔ اس کا پورا بدن دکھ رہا تھا۔ کافی مار لگائی تھی ان لوگوں نے آخرکار وہ اسے اس کمرے سے نکال کر ایک دوسرے کمرے میں لے کر آگئے۔ جہاں ایک بڑی سی میز کے پیچھے کچھ اعلیٰ افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔

نعمت علی کو اس کرسی پر بٹھادیا گیا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

"ہوں...... شکل تو وہی ہے۔ اسکرین دکھاؤ۔" میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے کہا۔ اور ایک طرف لگے ہوئے بڑے سے اسکرین پر ایک چہرہ نمودار ہوگیا۔ جو کسی پروجیکٹر پر دکھایا جارہا تھا۔ نعمت علی اپنی شکل دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لیکن اسے یہ احساس بھی ہوا کہ یہ شکل ہے تو اسی کی لیکن بری طرح بدلی ہوئی۔ کوئی ایسی تبدیلی اس میں تھی جو نعمت علی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

چند لمحوں تک اس کا چہرہ اسکرین پر رہا۔ اور پھر کہا گیا۔ "ٹھیک ہے...... اب تو زبان کھولے گا نہیں تو ہم تیری زبان گدی سے کھینچ کر باہر نکال دیں گے۔" نعمت علی نے حیران نگاہوں سے بولنے والے کو دیکھا اور بولا۔

"میں سمجھا نہیں سر!"

"نام بتا۔ اپنا؟"

"نن...... نن...... نن نام...... نام۔" نعمت علی کے دماغ کی کیسٹ ایک دم گھومی۔ اس نے سوچا۔ اصل نام بتا کر مصیبت میں گرفتار ہوجائے گا۔ چنانچہ وہ ایک لمحے کے اندر بولا۔

"گگ...... گگ، گگ...... گوپال......"

"کوئی شناخت نامہ ہے۔ تیرے پاس؟"

"نہیں۔"

"اصلی نام بتا۔ کیوں موت آئی ہے تیری۔"

"اصلی۔ اصلی نام یہی ہے یہ۔"

"کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"بب...... بب...... بب...... بیجاپور کا۔"

"جھوٹ بولتا ہے۔ کتے۔ تو پاکستانی ہے۔ پاکستانی جاسوس۔ ہم تیری تلاش میں کب سے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ تو اب ہاتھ لگا ہے۔"

"جج...... جج...... جج...... جاسوس۔"

"ہاں...... صحیح بات اگل دے۔ کس نے بھیجا ہے تجھے اور کس مقصد کے لئے۔ آیا تھا۔ اگر ساری بات نہیں بتائی تو زندہ دفن کردوں گا۔ تجھے۔"

"مم...... میری بات تو سنو...... میری بات تو سنو، تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کوئی جاسوس و اسوس نہیں ہوں۔"

"ہندو ہے۔ تو......"

"ایں......" نعمت علی کے منہ سے یہ نہیں نکل پارہا تھا کہ وہ ہندو ہے۔"

"چلو...... اسے لے جاؤ۔ بلکہ لے کر جاؤ۔ ننگا کرو سالے کو۔ ابھی پتہ چل جائے گا ہندو ہے یا مسلمان۔" اس شخص نے کہا۔ اور نعمت علی کے اوسان خطا ہوگئے۔ یہ کیا افتاد پڑگئی۔ پاکستانی تو وہ تھا لیکن جاسوسوں سے اس کا واسطہ نہیں تھا۔ ابھی وہ یہ ہی بات کررہا تھا کہ باہر سے ایک شخص بھاگا ہوا اندر آیا۔

"سس...... سس...... سر! وہ...... سر وہ پنڈت دیپ ناتھ جی!"

"ہیں...... کیا مطلب؟"

"پنڈت جی آئے ہیں۔"

"یہاں۔"

"ہاں...... باہر موجود ہیں۔"

"ارے...... بلاؤ انہیں بلاؤ۔" پنڈت دیپ ناتھ شاید کوئی بہت بڑی چیز تھے۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی جس نے سفید رنگ کا ڈھیلا ڈھالا چوغہ پہن رکھا تھا۔ جس کے بال بہت لمبے اور داڑھی بھی لمبی تھی۔ اور جس کی آنکھیں نہایت جاندار تھیں۔ ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوا اور وہ سب لوگ کھڑے ہوگئے۔

”ارے پنڈت جی! آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں کی ہمیں بلا لیا ہوتا وہاں۔“ دیپ ناتھ نے نعمت علی کی طرف دیکھا۔ اور مدھم لہجے میں بولا۔

”یہاں آنا ضروری تھا۔ کیونکہ تم ایک غلط بندے کو پکڑ لائے ہو۔“

”غلط بندہ؟“

”ہاں...... کیا کہتا ہے یہ اپنے بارے میں۔ گوپال نام بتاتا ہے۔ لیکن پنڈت جی یہ پاکستانی جاسوس ہے۔ ہمارے پاس اس کی تصویریں وغیرہ موجود ہیں۔“

”تیز روشنی کرو۔ میں تمہاری تسلی کیے دیتا ہوں۔“ پنڈت دیپ ناتھ نے کہا۔ نعمت علی حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت تو یہ فرشتہ رحمت بن کر ہی آیا تھا۔ حالانکہ فرشتہ رحمت ہندو نہیں ہوتے۔ لیکن اس شخص نے اس وقت اس کی مدد کی تھی۔

”ہاں...... کیا ثبوت ہے۔ تمہارے پاس اس کا کہ یہ پاکستانی جاسوس ہے۔“ دیپ ناتھ نے سوال کیا۔ اور اسکرین کو دوبارہ روشن کر دیا گیا۔

”پنڈت جی! آپ اس کا اور اس اسکرین پر لگا ہوا چہرہ دیکھئے؟“

”دیکھ لیا...... دیکھ لیا۔ ایک بات جو سب کے لئے اہمیت کی حامل ہے۔“

”جی پنڈت جی بتایئے۔“

”کیا تمہارے پاس اس کے ہاتھوں کی لکیروں کے پرنٹ ہیں۔“

”ایں...... جی پنڈت جی ہیں۔“

”تو پھر...... وہ چیک کرو۔ سب کچھ مل جاتا ہے۔ ہاتھوں کی لکیریں کبھی نہیں ملتی۔ اس کے پرنٹ لو۔ اور انہیں چیک کرو۔“

”پنڈت جی ٹھیک کہتے ہیں یہ کام کرلو...... ویسے تو پنڈت جی کا یہ کہنا کافی ہے کہ یہ......“

”ہاں...... یہ گوپال ہی ہے، میں اس کی گواہی دیتا ہوں۔“ بہرحال کارروائی ہوتی رہی پنڈت جی کو ایک آرام دہ کرسی پیش کی گئی تھی اور وہ اس پر بیٹھ گئے تھے۔ نعمت علی کے ہاتھ بدستور بندھے ہوئے تھے۔ یہ پراسرار واقعات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اور وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ پنڈت جی جو اچانک ہی نمودار ہو گئے ہیں یہ کون ہیں۔ اور اس کے ہمدرد کیسے ہو گئے ہیں؟

بہرحال اس کے ہاتھوں کے پرنٹ لئے گئے۔ پھر تھوڑی دیر کی کارروائیوں کے بعد پرنٹ ملائے گئے۔ جو اس پاکستانی جاسوس سے بالکل مختلف نکلے۔

”تسلی ہو گئی تمہاری۔؟“

”جی پنڈت جی۔“

”میں اسے اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ اس کے نام سے جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اسے کاٹ دو۔“

”جی...... پنڈت جی۔“ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن نعمت علی نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اس کے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ اور پھر باہر سے دو آدمی اندر آئے۔ جو اسے بازوؤں سے پکڑ کر باہر لے چلے۔ نعمت علی کو اپنے پاؤں سے چلنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن ان لوگوں نے اسے اس طرح تھام رکھا تھا جیسے اس کے بھاگ جانے کا خطرہ ہو۔ باہر ایک بہت شاندار مرسڈیز کھڑی ہوئی تھی۔ اسے اس میں بٹھایا گیا۔ اس کے بعد پنڈت جی اس کے پیچھے بیٹھے۔ اور گاڑی اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔

بہرطور نعمت علی جو ایک بھیانک کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ اپنے بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے توبہ کی کہ اللہ تعالیٰ بحالت مجبوری مجھے اپنا نام گوپال بتانا پڑا ہے۔ میری اس مجبوری کو معاف کر دینا۔

مرسیڈیز جس شاندار عمارت میں داخل ہوئی تھی۔ وہ بالکل ایک محل معلوم ہوتی تھی۔ ویسے بھی پنڈت دیپ ناتھ بہت اہم شخصیت کے مالک لگتے تھے۔ کئی ملازم مرسڈیز کی جانب دوڑ پڑے دیپ ناتھ اترے اور انہوں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

”آؤ...... گوپال۔“ نعمت علی بھی نیچے اتر گیا تو

پنڈت جی نے کہا۔

”میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔“ نعمت علی خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑا حویلی باہر ہی سے اتنی شاندار تھی۔ اندر سے دیکھنے کے قابل تھی۔ پنڈت جی اسے لئے ہوئے ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ پھر وہ بولے۔

”گوپال...... گوپی یا کچھ اور۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ دین دھرم سب کچھ ٹھیک ہے جب انسان پیدا ہوتا ہے تو نہ وہ ہندو ہوتا ہے۔ نہ مسلمان نہ عیسائی ہوتا ہے۔ پھر وقت اسے بتاتا ہے۔ کہ وہ کس کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ ہندو مسلمان یا عیسائی کے گھر میں۔ وہ وہی مذہب اپناتا ہے۔ جو اس کے ماتا پتا کا ہوتا ہے۔ کیا کسی پیدا ہونے والے بچے نے یہ بات کہی ہے۔ کہ وہ ہندو نہیں مسلمان ہے۔ مسلمان نہیں، کرسچن ہے۔ نہیں کہی۔ یہ بس سمے کا پھیر ہے۔ جو اسے دین دھرم سکھاتا ہے۔ لیکن پھر پیدا ہونے والے بچے کو سب سے پہلے بھوک لگتی ہے۔ وہ روتا ہے۔ اور اپنی ماتا سے دودھ مانگتا ہے۔ کیا مانگتا ہے۔ دودھ...... تو اس کی سب سے بڑی ضرورت اپنا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔

پیٹ، بھر جانے کے بعد پھر دوسری ضرورتیں، شروع ہوتی ہیں۔ کسی ننھے سے بچے کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی، کہ اس کے بدن پر کپڑے ہیں یا نہیں...... وہ تو بس اسے کپڑے پہننا سکھایا جاتا ہے۔ گویا یہ فطرت کی مانگ نہیں ہے۔ بلکہ منش کا اپنا کھیل ہے۔ چلو مان لیتے ہیں اس کھیل کو اس کے بعد اس کی ضرورتوں کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ سر پر سامان کا ٹوکرہ رکھ کر، پھٹے حال، پھٹے ہوئے کپڑوں سے جیون بتائے۔ وہ چمکتی دمکتی گاڑیوں کو دیکھتا ہے۔ اور اس کے من میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کہ ان میں سے ایک گاڑی اس کی بھی ہو۔ گویا بنیاد پیسہ ہے۔ دولت اور اس کے بعد سب کچھ میں نے تمہیں کب دیکھا اور کہاں دیکھا اس کا انکشاف بعد میں کروں گا۔ پہلے تو مجھے بتاؤ۔ گوپال تمہارا اصلی نام ہے۔؟“ صرف ایک لمحے کے اندر اندر نعمت علی نے فیصلہ کیا۔ کہ اسے اصلیت بتانی چاہیئے۔ یہ شخص بہت زیادہ شاطر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اصلیت بھی اس حد تک جتنی ممکن ہو۔ اس نے کہا۔

”جی نہیں۔ میرا نام گوپال نہیں ہے۔“ جواب میں دیپ ناتھ ہنس پڑا پھر بولا۔

”پہلا سچ۔ پہلی خوشی ہوئی مجھے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ تم ہندو نہیں ہو...... مسلمان ہو۔؟“

”چلو چھوڑو...... ان باتوں کو۔ گوپال تمہارا اچھا نام ہے۔ اور کچھ نہیں پوچھنا مجھے تم سے۔ بس ایک شناخت ہے۔ تمہاری۔ گوپال...... گوپال...... گوپال...... ہماری ایک سمسیا ہے۔ ایک منڈلی ہے۔ ہماری۔ اور ہم تمہیں اس منڈلی میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ میں تم سے تمہارے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔ بس تمہیں سچائی کے ساتھ اس منڈلی میں آنے کے لئے کہتا ہوں۔ بولو...... تم کیا کہتے ہو۔“ نعمت علی بہت پریشان تھا۔ اس نے کہا۔

”میں آپ کے ساتھ شامل ہونے کے لئے تیار ہوں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ اب تم ہمارے قبیلے میں آ جاؤ۔ کیا سمجھے؟ آ جاؤ...... یہاں تقریباً چھ سات دن گزر گئے۔ دنیا کا کون سا ایسا عیش تھا۔ جو نعمت علی کو حاصل نہیں تھا۔ پھر ایک دن دیپ ناتھ نے اس سے کہا۔

”تمہیں گیان شکتی کے لئے گوئلا کے پاس جانا ہوگا۔ وہ تمہیں پاتال کنڈ لے جائے گی۔ جہاں تمہیں ہمارے قبیلے کا ممبر بنایا جائے گا۔ کیا سمجھے۔؟“

”ٹھیک ہے۔“ نعمت علی نے کہا۔ ان چھ سات دنوں میں اس نے بہت کچھ سوچا تھا۔ اس کے پاس اب کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کہ وہ اس خوفناک ماحول سے اپنا بچاؤ کر سکے۔ ہندوستان سے باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون تھا۔ جسے اس کے دھوکے میں پکڑ لیا گیا تھا یعنی اسے پاکستانی جاسوس کہا گیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوبارہ اس چکر میں دھر لیا جائے۔ جاسوس کی سزا تو موت ہوتی ہے۔ سینکڑوں واقعات سن چکا تھا۔ اور پھر

اس وقت تک ہندوستان سے جانے کا تصور بھی دل سے نکال چکا تھا۔ جب تک کہ خیر الدین خیری کو مشکل سے نہ نکال دے۔

اگر اس طرح دیپ ناتھ کے ساتھ قبیلے وبیلے کا چکر چلتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اب تک کوئی مشکل بھی پیش نہیں آئی۔ گوٹلا کیا تھی۔ اور کون تھی۔ اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ لیکن اسے تفصیلات بتادی گئی تھیں۔ آخر کار اسے ایک پتہ بتایا گیا۔ اور کہا گیا کہ وہ وہاں چلا جائے گوٹلا سے وہیں ملاقات ہوگی۔ مطلوبہ پتے پر جا کر نعمت علی نے ایک خوشنما بنگلے کی بیل بجائی۔ اور کچھ لمحوں بعد دروازہ آہستہ آہستہ کھل گیا۔ دروازے سے جو شخصیت ظاہر ہوئی۔ وہ کسی قدر پراسرار شکل کی مالک تھی۔ چہرہ چڑیلوں جیسا، لمبی ناک چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ نعمت علی ایک دم سنبھل گیا۔ اس نے کہا۔

''میں گوٹلا سے ملنا چاہتا ہوں۔؟''

''کون ہو۔؟ اور یہاں کیوں آئے ہو۔؟''

''مجھے پنڈت دیپ ناتھ نے بھیجا ہے۔''

''آؤ۔۔۔۔اندر آجاؤ۔۔۔۔'' چڑیل نما عورت نے کہا۔ اور نعمت علی اس کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ اندر ایک تاریک سا ہال۔ اور اس میں ایک کمرہ اور اس کمرے میں ایک مدھم سا لیمپ روشن تھا۔ یہاں فرنیچر بھی پڑا ہوا تھا۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرکے نعمت علی سے کہا۔

''بیٹھ جاؤ۔۔۔۔'' نعمت علی کرسی پر بیٹھ گیا۔ عورت کی نظر پوری طرح اس پر لگی ہوئی تھی۔ اور اس کا چہرہ جذبات سے عاری لگ رہا تھا۔ نعمت علی نے اس سے کہا۔

''کیا آپ ہی گوٹلا ہیں؟''

''ہاں۔۔۔۔''

''پنڈت، دیپ ناتھ کو جانتی ہیں؟''

''ہاں۔ جانتی ہوں۔''

''آپ کی عمر کتنی ہے۔؟'' نجانے کیوں یہ سوال نعمت علی کے منہ سے نکل گیا تھا۔

''تقریباً گیارہ سو سات سال۔'' اس نے جواب دیا اور نعمت علی اپنا سر کھجانے لگا۔ اسے اپنی سماعت پر شبہہ ہوا تھا۔ یا پھر اس نے یہ سمجھا تھا کہ عورت اس سے مذاق کررہی ہے۔''

''ذرا پھر سے کہئے۔؟''

''گیارہ سو سات سال۔ پانچ مہینے، پینتالیس دن۔''

''کیا آپ مذاق کررہی ہیں۔''

''میرا تم سے مذاق کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''آپ کے مشاغل کیا ہیں۔؟''

''جادوگری۔'' نعمت علی پھر چکرا گیا۔ عورت جس سنجیدگی سے بات کررہی تھی۔ وہ مذاق ہی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ بالکل سنجیدہ تھا۔

''مجھے آپ کے پاس کیوں بھیجا گیا ہے۔؟''

''تمہیں خود نہیں بتایا گیا کہ تمہیں ہمارے قبیلے میں شامل ہونا ہے۔''

''بتایا گیا ہے۔''

''تو پھر کیوں یہ سوال کررہے ہو۔''

''آپ ہیں کون گوٹلا؟''

''میں شیطان کی بیٹی ہوں۔ اور میں نے اپنی عمر تمہیں بالکل صحیح بتائی ہے۔''

''مجھے اب کیا کرنا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ جانا چاہو تو جاسکتے ہو۔'' وہ بولی اور نعمت علی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے دروازے کی طرف رخ کیا۔ لیکن اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کا رخ صحیح سمت نہیں ہے۔ دروازہ ادھر نہیں ہے۔ پھر اس نے دروازے کی تلاش میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور یہ دیکھ کر اس کے ہوش گم ہوگئے۔ کہ اس بڑے سے نیم تاریک ہال میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ دروازہ آخر گیا کہاں؟ وہ آگے بڑھ کر اس جگہ پہنچا جہاں سے وہ اندر داخل ہوا تھا۔ لیکن وہاں سپاٹ دیوار کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ کوئی غلط فہمی تو نہیں ہورہی اسے لیکن اصل میں اس طرح کے واقعات سے اس کا بہت سی بار واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس لئے اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے حیران نگاہوں سے گوٹلا کی طرف دیکھا۔ تو وہ بولی۔

''میں نے تم سے کہا تھا ناں۔ کہ مہمان اپنی مرضی سے آتے ہیں لیکن جاتے میزبانوں کی مرضی سے۔ بیٹھو۔۔۔۔ابھی تو میرے اور تمہارے بیچ میں کوئی بات چیت بھی نہیں ہوئی۔'' اس کی آواز بہت عجیب سی تھی۔ نعمت علی حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''مگر آپ مجھے بتایئے! کہ مجھے کرنا کیا ہے؟''

''اپنی خوش نصیبی کا انتظار۔''

''کیا مطلب؟''

''ہاں۔۔۔۔خوش نصیبی اتنی آسانی سے نہیں آتی۔ کیا سمجھے؟'' نعمت علی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ سب کچھ ہی عجیب تھا۔ دیپ ناتھ نے اسے یہاں بھیجا تھا۔ اور دیپ ناتھ نے جو کچھ کیا تھا۔ وہ بھی نعمت علی کو یاد تھا۔ بہرحال اس نے عجیب سے انداز میں ایک بار پھر گوٹلا کو دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر حقیقت میں اس کے رونگٹے کھڑے ہوئے لگے۔ کہ گوٹلا کا چہرہ بدل رہا تھا۔ وہ بہت ہی خوفناک شکل اختیار کرتی جارہی تھی۔ اس کے سر کے دونوں طرف لمبے لمبے سینگ ابھرنے لگے تھے۔ اور وہ ایک وحشت ناک صورت اختیار کرنے لگی تھی۔ سیاہ بال، بیچ سے نکالی ہوئی مانگ موزوں قدوقامت، لیکن اب جو کچھ ہورہا تھا۔ وہ ناقابل یقین تھا۔ اس کی ناک کسی چونچ کی مانند مڑی ہوئی تھی۔ آنکھیں تیز اور چھوٹی، اور یہ کیفیت کچھ دیر تک رہی۔ اور اس کے بعد وہ نارمل ہوتی چلی گئی۔ پھر اس نے کہا۔

''اصل میں اب میرا کاروبار ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ سمجھے، بالکل نرم۔''

''کاروبار۔؟'' نعمت علی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں۔۔۔۔کالے جادو کا کاروبار پہلے بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ لیکن اب لوگ جادو کو بھی سائنس ہی سمجھنے لگے ہیں۔ اور ہمارا کاروبار تقریباً ختم ہوتا جارہا ہے۔ کیونکہ لوگ اب اس پر یقین نہیں رکھتے۔ تم یقین کرو میں نے کتنے عرصے سے جادو کا کوئی پتلا نہیں بنایا۔''

''جادو کا پتلا۔؟''

''ہاں۔۔۔۔آٹے کی ایک گڑیا بنائی جاتی ہے۔ اور اس میں سوئیاں چبھو کر کسی بھی جانب رکھ دی جاتی ہیں۔ اور اب تو یہ کام انجام دینے کی نوبت بھی نہیں آتی یہ سالوں پہلے کی بات ہے کہ لوگ اپنے دشمنوں کو اس طرح ختم کرتے تھے۔ اب تو خدا کرے اس سائنس کو کہ صورتحال ہی بدل گئی ہے۔ بس دو گولیاں چلاؤ۔ اور انسان تباہ۔ اور اگر زیادہ لوگوں کو مارنا ہو تو بم پھینک دو۔ اس کے علاوہ کرائے کے قاتل بھی جگہ جگہ دندناتے پھرتے ہیں۔ اور معمولی سے معاوضے پر وہ یہ کام کر ڈالتے ہیں۔ جو ہم سے لیا جاتا تھا۔ اب ان کاموں کے لئے ہمارے پاس کوئی نہیں آتا۔ بلکہ ان کرائے کے قاتلوں کے پاس جاتا ہے۔ ارے۔۔۔۔تم کیا میری صورت دیکھ رہے ہو۔''

''دیکھ رہا ہوں کہ آپ کس سنجیدگی سے مذاق کررہی ہیں۔''

''ہاں۔۔۔۔تم اسے مذاق سمجھ لو۔ یہ تمہاری مرضی کی بات ہے۔ مگر میں نے تم سے ابھی کہا ہے۔ کہ تم یہاں سے نہ جاؤ۔''

''تو پھر مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا۔''

''تم نہیں جاسکتے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ کیا سمجھے؟'' کیا پنڈت جی نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ تمہیں ہمارے قبیلے میں شامل ہونا ہے۔ تو قبیلے میں ایسے ہی شامل تھوڑا ہی ہوا جاتا ہے۔''

''تو پھر؟''

''تمہیں کالی سبھا جانا ہوگا۔''

''کالی سبھا۔؟''

''ہاں۔۔۔۔نجات حاصل کرنے کے لئے مجھے بھی تمہاری ضرورت ہے۔''

''کیسی نجات۔؟''

"بتاتی ہوں۔ تھوڑی دیر رک جاؤ۔ لیکن کیا تمہیں اس بات کا علم ہے۔ کہ مہا کالی نے اپنے مہا پیروں کو کیا احکامات دیئے تھے۔"

"مم......مم......مہا کالی۔؟" نعمت علی کے منہ سے نکلا۔

"اوہو......چلو ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔ ہر انسان کی سمجھ میں آہستہ آہستہ ہی کچھ آتا ہے۔ ہم کالی سبھا چلنے والے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ مہا کالی کے دوار......"

"مم......مگر میں؟" نعمت علی نے کہا۔

"یہاں آئے تو ظاہر ہے۔ تم نے میرا وقت بھی لیا ہے۔ ویسے تمہیں وہ جگہ پسند آئے گی۔ جہاں یہ سبھا لگے گی۔"

"کون سی جگہ ہے وہ؟"

"ایک پہاڑی پر۔ اس کے لئے ہمیں ایک لمبا سفر کرنا ہوگا۔ چلو تیار ہو جاؤ......"

"نہیں میں نہیں جانا چاہتا۔"

"جاؤ گے تم......جاؤ گے۔ کون کہتا ہے۔ تم نہیں جاؤ گے۔" اس نے کہا۔ اور پھر وہ نعمت علی کو گھورنے لگی۔

نجانے کیوں نعمت علی کو یہ احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں سے روشنی کی لہریں نکل کر اس کے وجود میں داخل ہو رہی ہیں۔ وہ آنکھیں ایسی تھیں کہ کچھ دیر قبل جو باتیں مذاق لگ رہی تھیں۔ لیکن اب یہ لگ رہا تھا کہ یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔ یہ عورت یقینی طور پر کالے جادو کی ماہر ہے۔" نعمت علی کا دل لرزنے لگا۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"خیر الدین خیری۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اس طرح کسی برے وقت میں میرا ساتھ چھوڑ دو گے۔ آہ، دیکھو! میں کتنا اکیلا ہو گیا ہوں اور کس طرح یہ شیطانی قوتیں۔ میرے گرد اپنا حصار قائم کیے جا رہی ہیں۔" تبھی عورت کی آواز ابھری۔

"اب میں تمہیں تیار کرنے کے لئے اپنی ایک خاص دوست کو بلاتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دیوار کی طرف دیکھا۔ اور بولی۔

"آؤ......اسے تیار کرو۔" اچانک ہی نعمت علی کو لگا جیسے دیوار سے روشنی پھوٹی اور پھر وہ روشنی اندر داخل ہو گئی لیکن جو کوئی اندر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر نعمت علی خوف سے سکڑ کر رہ گیا۔

ایک چھوٹے سے قد کی نوجوان عورت تھی۔ جس کے پورے جسم پر لمبے لمبے سیاہ بال تھے۔ وہ عجیب سے انداز میں پھدک کر فرش پر چل رہی تھی۔ اور نعمت علی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تب اس کی آواز ابھری۔

"مجھے کیا کرنا ہے؟" مہا دتی۔" اس نے یہ الفاظ عورت کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

"ہم جے دیوی کی سبھا میں شرکت کرنے جا رہے ہیں۔ اور تمہیں اسے تیار کرنا ہے۔" نعمت علی خاموشی سے یہ سب مناظر دیکھتا رہا۔ لیکن ایسا ہی ماحول اس میں کوئی شک نہیں کئی مرتبہ ان کے سامنے آ چکا تھا۔ لیکن ہر بار ایک نئی صورت حال سامنے آ جاتی تھی۔

بہر حال وہ عجیب و غریب پر اسرار عورت جو چھوٹے قد کی مالک تھی نعمت علی کے پیروں کے نزدیک پہنچ گئی۔ اور اچانک ہی یوں لگا جیسے چپٹی سی چیز اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی ہو۔ پھر کیفیت کچھ تبدیل ہوئی اور یوں لگا۔ جیسے اچانک پورا بدن شعلوں میں گھر گیا ہو اس نے اندھیاری آنکھوں سے دیکھا۔ کہ کوٹلا بھی اپنا لباس تبدیل کر رہی ہے۔ اور اس کی شخصیت ایک دم سے بدلتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ لمبے ہو کر گھٹنوں تک لٹک گئے تھے۔ چہرے کی رنگت بھی بدل گئی تھی۔ کچھ لمحوں بعد وہ آگے بڑھی۔ اور اس نے نعمت علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ نعمت علی کو یوں لگا جیسے وہ فضاء میں بلند ہوتا جا رہا ہو۔ اسے اپنے چاروں طرف اندھیروں کے بادل لٹکے ہوئے لگے۔ یوں لگا جیسے رات ہو گئی ہو۔

اس نے جھٹک کر ہاتھ چھڑانا چاہا۔ لیکن اس کا پورا بدن بے جان ہو گیا تھا۔ ایسے لگا جیسے فضاء میں کافی بلند ہو گیا ہو۔ وہ جس نے آج تک کبھی ہوائی جہاز میں سفر نہیں کیا تھا۔ لیکن آج اسے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ جیسے کسی جہاز کی بلندی سے نیچے زمین کو دیکھ رہا ہو۔ ہواؤں کی شائیں شائیں گونج رہی تھی۔ اور نیچے مدہم مدہم روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔

وہ سیاہ اور ہولناک اندھیرے میں یہ سفر کرتا رہا۔ اور اندازہ نہیں ہو سکا کہ یہ انوکھی پرواز کتنی دیر تک جاری رہی۔......پھر اچانک اس کے بدن کو جھٹکا لگا اور جب اس کے قدم زمین پر لگے تو اس نے اپنے آپ کو کسی بے پناہ بلندی پر پایا۔ اس کے اطراف میں کالی کالی پہاڑ کی چوٹیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔

اور وہ حیران و پریشان اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ تو سارا کا سارا ماحول بالکل ہی الگ تھا۔ یہ سب کیا ہو گیا۔ پنڈت دیپ ناتھ کیا چیز تھا؟

بہر طور اچانک اسے یوں بھی لگا تھا۔ جیسے کوٹلا اب اس کے پاس موجود نہ ہو۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑنے لگا۔ لیکن رفتہ رفتہ روشنی ہونے لگی۔ اور تب اسے اپنے اردگرد بہت سی پرچھائیاں رقصاں نظر آئیں اور وہ نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ ایک نہیں بلکہ کئی افراد تھے۔ لیکن سب کے سب عجیب و غریب صورتوں کے حامل۔ ان کے چہرے بھی انسانوں جیسے نہیں تھے۔

ان چہروں پر نگاہیں جمانا مشکل کام تھا۔ اور پھر ایک اور منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ چند انوکھے وجود جن کا جسم انسانوں جیسا تھا۔ لیکن چہرے مختلف، کسی کا چہرہ گائے کا، کسی کا بکرے کا، کسی کا کتے کا، لیکن وہ لوگ جن لوگوں کو پکڑ کر لا رہے تھے۔ وہ لوگ چھوٹی چھوٹی عمر کے دس، دس گیارہ، گیارہ سال کے بچے تھے۔ جن پر ایک عجیب سا سحر طاری تھا۔ انہیں کوئی نشے کی چیز کھلا کر بے خود کر دیا گیا تھا۔ ان کے قدم لڑکھڑاتے ہوئے انداز میں اٹھ رہے تھے۔ بچے کافی خوبصورت تھے اور ان کے چہروں کی معصومیت دلوں پر اثر انداز ہوتی تھی۔

نعمت علی کے بدن میں ایک دم سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔؟" اس نے خوف بھرے انداز میں سوچا۔ ان لوگوں کے ارادے ٹھیک معلوم نہیں ہوتے تھے۔ نعمت علی کے بدن میں اینٹھن ہونے لگی۔ اگر ان بچوں کو کوئی نقصان پہنچایا گیا۔ تو شاید وہ برداشت نہ کر سکے۔ لیکن ایسا ہی ہونے والا تھا۔ وہ بچوں کو ایک جگہ کھڑا کر کے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ اور پھر ان میں سے ایک آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت لمبا پھل والا چاقو دبا ہوا تھا۔ جو چمک رہا تھا۔ اس نے اچانک ہی ایک بچے کو زمین پر گرایا۔

اور اسے دبوچ کر اس طرح اس کے سینے پر اپنا گھٹنا رکھ کر بیٹھ گیا۔ جیسے اسے ذبح کرنا چاہتا ہو۔ اور اب نعمت علی کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اگر اس معصوم بچے کی گردن پر چھری پھر گئی تو لعنت اس زندگی پر، کم از کم زندگی قربان کی جا سکتی ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک پہاڑی پتھر سامنے نظر آیا۔ اور یہی اس وقت اس کے لئے ہتھیار بن سکتا تھا۔ اس سے قبل کے اس جلاد کی چھری اس بچے کی گردن پر پھر جاتی۔ نعمت علی کے ہاتھ سے زناٹے کے ساتھ وہ پتھر نکلا اور کیا پوری قوت سے وہ پتھر اس شخص کی پیشانی پر پڑا تھا۔ کسی کے سر کو اس طرح ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے ہوئے شاید ہی کبھی کسی نے دیکھا ہوگا۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ نعمت علی آگے بڑھا۔ اور اس نے ان باقی بچوں کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ تو اس کی خوفناک آواز ابھری۔

"کیا ہو رہا ہے۔ یہ؟۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" نعمت علی نے وہ چاقو اٹھا لیا۔ جو اس زخمی شخص کے ہاتھ میں تھا۔ بچوں کو وہ اپنی پناہ میں لئے ہوئے تھا۔ اچانک ہی ایک گرد و غبار فضاء میں بلند ہوا۔ لیکن نعمت علی نے ان بچوں کو پیچھے نہ ہٹنے دیا۔ اسی وقت کوٹلا آگے بڑھی اور اس نے نعمت علی کے سامنے پہنچ کر غراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ تو کیا کر رہا ہے کمینے، یہ تو کیا کر رہا ہے؟"

"پیچھے ہٹ جا کوٹلا......ان بچوں کو اگر کسی نے نقصان پہنچایا۔ تو مجھ سے برا اور کوئی نہیں ہوگا۔" نعمت علی کی غراہٹ ابھری۔

(جاری ہے)

شہروحشت

ایم اے راحت

قسط نمبر:14

رات کا گھٹا ٹوپ اندھرا، پرھول ماحول، ویران اجاڑ علاقه اور وحشت و دهشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکته طاری کرتا لرزیده لرزیده سناٹا، نادیده قوتوں کی عشوه طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکرائو، کالی طاقتوں کی خونی لرزه بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیده دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری هوجائے گی، برسوں ذهن سے محو نه هونے والی اپنی مثال آپ کهانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیروشر کی انوکھی کہانی

ہر آنکھ میں نعمت علی کیلئے نفرت اہل رہی تھی۔ وہاں موجود بھیانک شکلیں خوفناک انداز میں اسے گھور رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اگر انہیں ذرا بھی موقع مل جائے تو وہ نعمت علی کو کچا چبا جائیں۔ اسی وقت گوٹلا آگے بڑھی۔ اور اس نے نفرت بھری آواز میں کہا۔

”یہ کیا کررہا ہے تو؟ ہمارا سب کچھ کیا دھرا مٹی میں ملائے دے رہا ہے۔“

”میں تجھے بھی مٹی میں ملادوں گا۔ سمجھی؟“ نعمت علی خود بھی آپ سے باہر ہونے لگا تھا۔ ان معصوم بچوں کا یہ حال دیکھ کر اس کے دل میں محبت کا سمندر امنڈ آیا تھا۔ کیسی کیسی معصوم شکلیں تھیں۔ جو سہمی ہوئی نگاہوں سے اس ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان میں کون ہندو تھا۔ کون مسلمان، کون کرسچن، اس وقت ان تمام باتوں کی تحقیق کا وقت نہیں تھا یہ سب انسانوں کے بچے تھے معصوم اور بے گناہ، نہ انہوں نے کسی مسلمان کو ہندو بن کر نقصان پہنچایا تھا۔ اور نہ کسی مسلمان بچے نے کسی ہندو بچے کا۔

یہ سب تو ابھی ان تمام باتوں سے بے نیاز تھے۔ اور نہ بھی ہوتے اس وقت نعمت علی ماحول کا حکمران تھا۔ کیونکہ اس کے اندر جذبے کی دیوانگی پیدا ہوچکی تھی۔ وہ اپنی زندگی دینے پر تل گیا تھا۔ اور زندگی کی قیمت پر ان بچوں کو نقصان پہنچنے دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن گوٹلا ایک بھیانک شکل اختیار کرتی جارہی تھی۔ اس کا جسم پھولتا جارہا تھا۔ اور چہرہ انتہائی خوفناک ہوگیا تھا۔ دفعتاً ہی، نعمت کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔

مدد علی نے مار پیٹ کر اسے کتنی ہی بار کلام پاک پڑھایا تھا۔ اور کلام پاک وہ چیز ہے کہ جس کا ایک بھی لفظ ذہن پر نقش ہو جائے۔ تو موت کے وقت تک وہ نقش نہیں مٹ سکتا۔ اس وقت اسے ایک آیت یاد آ گئی تھی اور سچی بات یہ ہے کہ جب انسان مصیبت میں گھر جاتا ہے۔ اور اگر وہ کسی اہل ایمان کی اولاد ہوتا ہے۔ تو کلام الٰہی کا ایک لفظ بھی اس کے لئے مددگار ثابت ہو جاتا ہے۔ اور وہ ضرور اس کے ذہن میں ابھر آتا ہے۔ چنانچہ نعمت علی نے ایک آیت کا ورد شروع کیا۔ اور ظاہر سی بات ہے کہ شیطانی عمل اللہ کے کلام کے سامنے بے بنیاد ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی قوت کیوں نہ رکھتا ہو۔ گوٹلا جو ایک بھیانک بدن اور بھیانک شکل اختیار کرتی جارہی تھی، اور یقینی طور پر اس لئے کہ وہ آگے بڑھ کر نعمت علی پر حملہ کرے، اور اس کو زیر کرکے اس کا خاتمہ

کردے۔

لیکن اچانک ہی یوں لگا جیسے کسی غبارے میں سوئی چبھ جاتی ہے۔ اور گوٹلا کا پھولتا ہوا بدن ایک دم پچکنے لگا۔ اور اس کے بعد اس میں سے ہوا نکلتی چلی گئی۔ گوٹلا خود پاگلوں کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اور نعمت علی کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کلام پاک کی آیت پڑھ رہا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ سب لوگ جو یہاں موجود تھے۔ چیختے چلاتے۔ جدھر جس کا منہ اٹھا، دوڑتے چلے گئے تھے۔

وہ بچے جو سہمے ہوئے تھے۔ اب حیران نگاہوں سے ان منتشر ہونے والے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ گوٹلا صرف ایک فٹ کی رہ گئی۔ اور اس کی باریک باریک چیخیں فضاء میں گونجنے لگیں۔ وہ زمین پر گر کر لوٹنے لگی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ بالکل ہی پست ہوگئی۔ اب وہاں اس کی ننھی سی لاش پڑی ہوئی تھی۔ معصوم بچے سہمی ہوئی نگاہوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ اب انہیں اس بات کا پتہ چل گیا کہ ان کی مدد کرنے والا انہیں موت سے بچانے والا کون ہے؟ چنانچہ وہ پیار بھرے انداز میں آگے بڑھے اور نعمت علی کے پاس پہنچ گئے۔ نعمت علی کے دل میں بھی محبت کا سمندر امنڈ آیا تھا۔ اس نے بچوں کو پیار کیا۔ اور پھر ان سے ان کے بارے میں پوچھنے لگا۔ چند بچوں نے اپنے بارے میں تفصیل بتائی۔

جو یہ تھی کہ انہیں جگہ جگہ سے اغواء کیا گیا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ سے ملنے کیلئے رونے لگے۔ تو نعمت علی نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بچو! رونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں تمہارے گھروں تک پہنچادوں گا۔“ اس وقت نعمت علی کے دل میں اور کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ بس ان معصوم بچوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ ماضی میں جو کچھ ہو چکا تھا۔ اس نے اس کو نظر انداز کردیا تھا۔ چنانچہ وہ احتیاط سے بچوں کو لیکر اس پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ اسے نہیں معلوم تھا۔ کہ یہ کون سی جگہ ہے اور پہاڑی کے دامن میں کیا ہوگا۔ بس وہ احتیاط کے ساتھ بچوں کو سنبھالے ہوئے پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ قدرت بھی ایسے موقعوں پر پوری پوری مدد کرتی ہے۔ آپ نیکیاں کرکے تو دیکھیں۔ آپ کے راستے ابتداء میں بہت مشکل ہوتے ہیں لیکن آخر کار آسان ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ان بچوں کو پہاڑی سے اتار کر نیچے تک لانا نعمت علی نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ اور پھر نجانے کتنا وقت گزرا۔ صبح کا اجالا پھوٹنے لگا تھا۔ اور ماحول روشن ہوتا جارہا تھا۔ جب وہ پہاڑی کے دامن میں پہنچا تو سورج نکل آیا تھا۔ اور سامنے ہی ایک بستی نظر آرہی تھی۔ کون سی بستی تھی؟ کیا نام تھا اس کا اس بارے میں نعمت علی کچھ نہیں جانتا تھا، نہ ہی اس نے ان معصوم بچوں سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ بہر حال بچوں کے ساتھ وہ آبادی میں داخل ہوگیا۔ تب اسے پہلی بار ایک پولیس کانسٹیبل نظر آیا۔ جو ہندوستانی پولیس کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں ڈنڈا اٹھائے گشت کررہا تھا۔

نعمت علی کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اور وہ آگے بڑھ کر اس کے پہنچ گیا۔

”سنیئے بھائی صاحب!“ اس نے کہا۔ اور کانسٹیبل اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ان بچوں پر نگاہ ڈالی۔

”ابے کیا ان بچوں کو اغواء کرکے لایا ہے۔؟“

”ہاں..... آپ مجھے پولیس اسٹیشن لے چلیں۔“ نعمت علی نے جواب دیا اور وہ حیرانی سے نعمت علی کو دیکھنے لگا۔

”قصہ کیا ہے۔ بتائے گا نہیں۔؟“

”بھائی! میں نے اغواء کرنے والوں سے ان بچوں کو چھڑایا ہے۔ اور میں انہیں ان کے ماں باپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ تم مجھے پولیس اسٹیشن کا راستہ بتاؤ۔ یا مجھے خود پولیس اسٹیشن لے چلو۔“ پولیس والا کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

”آؤ.....“ اور وہ آگے آگے چل پڑا۔ نعمت علی بچوں کے ساتھ چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک بڑے پولیس اسٹیشن میں داخل ہوگئے کانسٹیبل نے اسے وہیں روکا۔ اور روکنے کے بعد اندر چلا گیا۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اندر پہنچ کر اس نے پولیس اسٹیشن کے انچارج سے کہا۔

”صاحب جی! بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے میں نے؟“ انچارج نے اسے دیکھا اور غصیلے لہجے میں بولا۔

”کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے تو نے؟“

”صاحب جی! پچھلے دنوں جو بچوں کے اغواء کے کیس ہو رہے تھے۔ میں نے اغواء کرنے والوں کے سربراہ کا پتہ لگالیا ہے۔“

”کب، کہاں، کیسے۔؟“ انچارج نے حیرت سے کہا۔ اور کانسٹیبل کو گھورنے لگا۔

”صاحب جی! بس یوں سمجھ لیجئے کہ میں نے سپر مین کا کردار ادا کیا ہے۔ چلو بھئی چلو میرا ساتھ دو۔ اسے اندر لے آؤ۔ کانسٹیبل نے کہا اور پھر وہ بچوں کے ساتھ نعمت علی کو لیکر اندر داخل ہوگیا۔

”یہ ہے وہ بندہ سر جی! جو بچوں کو اغواء کرکے لے جارہا تھا۔ بس میں نے اسے کور کرلیا۔ اور یہاں تک لے آیا۔“ انچارج نے ان بچوں کو دیکھا۔ اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

”ارے یہ تو سیٹھ دھرم لعل کا بیٹا ہے اس کے اغواء کی رپورٹ اور یہ..... یہ..... کاشی ناتھ کا بیٹا ہے۔ اوہو..... تو نے تو بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا جگت تیری، ترقی ہو جائے گی۔ پرواہ مت کر۔ تجھے ہیڈ کانسٹیبل بنوادوں گا۔ اور اسے پکڑ د..... پکڑو..... یہ بھاگنے نہ پائے۔“ انچارج صاحب نے پولیس والوں سے کہا۔ اور پولیس والے نعمت علی کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔

نعمت علی حیران نگاہوں سے انچارج کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”سر! میں نے ان بچوں کو اغواء نہیں کیا ہے۔ میں نے اسے یہ بتایا تھا کہ میں تو انہیں اغواء کرنے والوں کے چنگل سے چھڑا کر لایا ہوں۔ آپ ان بچوں سے پوچھ لیجئے۔“

”پوچھوں گا بیٹا۔ اچھی طرح پوچھوں گا۔“ انچارج نے کہا۔ اور پھر نعمت علی کو مزید کچھ کہے بغیر لاکر میں بند کردیا گیا۔ جبکہ انچارج صاحب بچوں کو لیکر دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔ نعمت علی حیران حیران سا اپنی جگہ بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ کہ کیا اس کی نیکیوں کا اسے یہی صلہ ملے گا۔ مگر کوئی بات نہیں اس نے جو کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اس کے بعد چاہے کچھ بھی ہوجائے۔ اس کا دل اور ضمیر تو مطمئن رہے گا۔

دوپہر تک وہ لاک اپ میں بند رہا۔ کوئی تین بجے کے قریب اسے لاک اپ سے نکال کر انچارج کے کمرے میں لایا گیا۔ یہاں ایک ایس پی صاحب! اپنے ماتحت ڈی ایس پی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے نعمت علی کو دیکھا۔ اور ایکدم حیران سے ہوگئے۔ پھر انہوں نے ڈی ایس پی کے کان میں کچھ کہا۔ اور ڈی ایس پی بھی نعمت علی کو گھورنے لگا۔ ایس، پی صاحب نے کہا۔

”جاؤ۔ ذرا فائل لے کر آؤ جلدی سے یا کسی سے منگواؤ۔“

”جی سر!..... جی سر!“ ڈی ایس پی نے کہا۔ اور سیلوٹ کرکے باہر نکل گیا۔

”اسے قبضے میں رکھو..... دروازے بند کردو۔“ ایس پی صاحب نے کرخت لہجے میں کہا۔ بھاری بدن اور بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ ان کا چہرہ بہت خطرناک نظر آرہا تھا۔ اور نعمت علی سوچ رہا تھا کہ اب کوئی نئی کہانی آغاز ہو رہی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ کوئی آدھے گھنٹے تک اسے ایک جگہ کھڑے رہنا پڑا۔ اسے بیٹھنے تک کیلئے نہیں کہا گیا تھا۔

پھر ڈی ایس پی، صاحب ایک فائل لے کر اندر آئے۔ اور ایس پی صاحب کے سامنے پیش کردیا۔

ایس پی صاحب اسے کھول کر دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر تک وہ فائل دیکھتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے بھاری لہجے میں کہا۔

”ہوں..... تو یہ بات ہے۔؟“ کیا بات تھی۔ یہ بات نعمت علی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ایس پی صاحب نے کہا۔

”تو تم پاکستانی جاسوس ہو۔ پاکستان سے آئے ہو۔“ نعمت علی کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔ آیا تو وہ پاکستان سے ہی تھا۔ بے شک جاسوس نہیں تھا۔ لیکن کتنی ہی بار اس کے دل میں خیال آیا تھا۔ کہ اسے جب بھی پکڑا جائے گا اسے پاکستانی جاسوس سمجھا جائے گا۔ لیکن اسے اس بات کی امید نہیں تھی کہ اس کا باقاعدہ فائل بن گیا ہوگا۔

وہ اس بات پر حیران رہ گیا تھا ایس پی صاحب نے فائل پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”اور اب تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ یہ بچے تمہیں کہاں سے ملے اور..... اور.....؟“ ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے۔ کہ اچانک دروازے پر کچھ ہنگامہ سا ہوا۔ اور پھر کوئی اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک دراز قامت عورت تھی۔ جس کا بدن بھی بھاری تھا۔ لیکن چہرہ انتہائی دلکش بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ پر سحر تھا۔ اسے دیکھ کر دل پر ایک عجیب و غریب سا احساس ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ دو عورتیں اور بھی تھیں۔ جو خاص قسم کا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ جیسے وردی ہو۔ لیکن ان کی کمر میں بندھی ہوئی پیٹی میں ہولسٹر لگے ہوئے تھے۔ اور ان میں پستول تھے۔ گویا وہ اس عورت کی باڈی گارڈز تھیں، چہرے سے وہ بھی کافی خطرناک نظر آتی تھیں۔

ایس پی نے انہیں دیکھا۔ اور ایکدم کھڑا ہو گیا۔

”ارے، ارے دیوی جی! آپ..... آپ یہاں کیسے؟“ ایس پی نے حیرانی سے کہا۔ اور عورت نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا پھر بولی۔

”اور تم جانتے ہو، ایس پی کہ جب میرے کسی آدمی پر کوئی مشکل پڑتی ہے تو میں فوراً اس کی مدد کیلئے آ جاتی ہوں۔ تمہیں سب سے پہلے اس سے یہ پوچھنا چاہئے تھا۔ کہ یہ کون ہے؟“ عورت نے کہا۔ اور نعمت علی کی طرف دیکھ کر بڑی احتیاط سے ایک آنکھ دبائی۔ نعمت علی نے اس کی آنکھ دیکھ لی تھی۔ لیکن کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔ ایس پی نے حیرت سے کہا۔

”میں سمجھا نہیں دیوی جی! آپ آیئے براہ کرم بیٹھئے۔“ ایس پی نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ لیکن عورت سرد لہجے میں بولی۔

”نہیں ایس پی۔ تمہارا نام راجکمار ہے ناں۔؟“ تمہیں راجکمار میں بیٹھنے کیلئے نہیں آئی۔ تم نے میرے آدمی پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس نے ایک اچھا کام کیا اور تم نے اسے جاسوس قرار دے دیا۔“ عورت نے کہا اور ایس پی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”مم..... مم..... میں سمجھا نہیں.....“

”اس کا نام شنکر ہے۔ اور یہ اٹھارہ سال سے میرے پاس رہتا ہے۔ یہ بچے اسے کونگی پہاڑی پر ملے تھے۔ ان کے ساتھ انیائے ہو رہا تھا۔ اس نے انہیں بچایا۔ اور خود انہیں لے کر پولیس تھانے پہنچ گیا تمہارے سپاہی نے جھوٹ بولا ہے تم سے اور اس کے بعد یہ ایس ایچ او صاحب جو خود کو بہت مہان سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔ یہ جاسوس نہیں ہے۔ اٹھارہ سال سے میں اسے جانتی ہوں۔ اگر کبھی شکلیں مل جائیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم کسی بے گناہ پر شک کرنا شروع کر دو۔

”نہیں..... نہیں..... دیوی جی!..... آپ..... آپ چاہیں تو یہ فائل دیکھ لیں۔“

”میرے سامنے یہ فائل کیا تو اسے پھاڑ کر پھینک دوں گی۔ لاؤ دکھاؤ مجھے کہاں ہے فائل۔“ عورت نے کہا۔

نعمت علی یہ سارا ہنگامہ حیران نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”د..... دد..... دیکھ لیجئے۔ میرا دوش نہیں ہے۔“ ایس پی صاحب نے کہا۔ اور فائل آگے بڑھا دیا۔ نعمت علی تو یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن فائل میں

جو تصویر لگی ہوئی تھی۔ وہ سو فیصدی اسی کی تھی۔ لیکن اچانک ہی بدل گئی تھی۔ اب اس تصویر میں بڑی بڑی نوکدار مونچھیں تھیں۔ ایک آنکھ بھینگی تھی۔ اور ایک بالکل ہی بدلی شکل کا آدمی نظر آ رہا تھا۔

عورت نے نعمت علی کی طرف دیکھا اور پھر ایس پی کی طرف۔

”میرا خیال ہے۔ آپ لوگوں کی آنکھیں بری طرح خراب ہو گئی ہیں۔ اے ادھر آؤ۔“ اس نے نعمت علی کو اشارہ کیا۔ اور پولیس کے وہ سپاہی جو نعمت علی کو پکڑے کھڑے ہوئے تھے۔ جلدی سے اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔

”سنا نہیں تم نے ادھر آؤ۔“ عورت نے کہا نعمت علی بے اختیار آگے بڑھ گیا اسے یہ عورت جادوگرنی معلوم ہو رہی تھی۔ جس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ حیران کن تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ عورت نے ایس پی سے کہا۔

”اب ذرا یہ چہرہ ملاؤ۔ ڈی ایس پی۔ تم بھی ادھر آؤ..... اور تم بھی..... دانشور.....“ عورت نے طنزیہ لہجے میں۔ ایس ایچ او، سے کہا۔ وہ لوگ تصویر پر جھک گئے۔ اور پھر حیرت سے آنکھیں پھاڑنے لگے۔ ایس پی نے کہا۔

”بھ..... بھ..... بھگ، بھگوان کی سوگندھ..... بھگوان کی سوگندھ..... یہ..... یہ..... یہ کیا ہوا۔ اس میں تو ابھی ابھی اس بندے کی تصویر لگی ہوئی تھی۔“

”اس میں تو تصویر نہیں لگی ہوئی تھی۔ راجکمار جی! مجھے منسٹر صاحب سے بات کرنی پڑے گی۔ کہ وہ آپ کی آنکھوں کا چیک اپ کرائیں۔ اور یہ بتائیں کہ آپ اس عہدے کے قابل ہیں بھی یا نہیں۔“

”ش..... شش..... شما کر دیجئے، دیوی جی! مم..... مم..... معافی چاہتا ہوں۔ آپ..... سے۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔“ ایس پی صاحب بری طرح گڑگڑانے لگے۔ اور عورت آگے بڑھ کر بولی۔

”شنکر اندر آؤ..... میرے ساتھ۔ آؤ..... سنا نہیں تم نے۔“ اس نے نعمت علی سے کہا۔ اور نعمت علی نے اس وقت یہی غنیمت سمجھا۔ کہ اس عورت کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ باہر ایک ایک بہت خوبصورت گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ جس کا ڈرائیور اس کے پاس موجود تھا۔ اس کے پیچھے ایک دوسری گاڑی بھی کھڑی ہوئی تھی۔

عورت آگے بڑھی تو ڈرائیور نے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ تو عورت نے کہا۔ ”تم ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔“ یہ الفاظ نعمت علی کو مخاطب کر کے کہے گئے تھے۔

نعمت علی کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ کہ عورت کے احکامات پر عمل کرے۔ اور وہ ڈرائیور کے برابر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں باڈی گارڈ عورتیں دوسری گاڑی میں بیٹھ گئی تھیں۔ یہ شان و شوکت اور یہ انداز دیکھ کر ہی نعمت علی کو یہ پتہ چل گیا تھا۔ کہ عورت بہت بڑی شخصیت کی مالک ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ کہ وہ پر اسرار حیثیت بھی رکھتی ہے۔ دو کام ہوئے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ عین اس وقت پہنچی تھی۔ جب نعمت علی کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والا تھا۔ دوسری بات یہ کہ وہ تصویر ایس پی نے نعمت علی کو بھی دکھائی تھی۔ جو سو فیصدی نعمت علی کی تھی لیکن دوسری بار اس تصویر کے نقوش بدل گئے تھے۔ یہ کوئی معمولی عمل نہیں تھا۔ لیکن بہرحال اس عمل نے فوری طور پر نعمت علی کو فائدہ پہنچایا تھا۔ اور اب آگے کیا ہوتا ہے کہ اچھی خاصی تفریح کی زندگی گزار رہا تھا۔ سارے معاملات بہتر سے بہتر چل رہے تھے۔ کہ اچانک ہی زندگی میں خیر الدین خیری داخل ہوا۔ اور اس کے بعد کایا ہی پلٹ گئی۔

بڑے شاندار اقدامات ہوئے۔ بہت کچھ ملا۔ لیکن اب جب بگڑا تھا تو بنائے نہیں بن رہی تھی۔ لیکن بس ایک عزم اس نے اپنے ذہن میں زندہ رکھا تھا۔ اور تنہائیوں میں بار بار کہتا تھا۔ ”خیر الدین خیری۔ دوست! تم اس دنیا سے جا چکے ہو۔ لیکن تمہاری روح نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

میرے گھر کے حالات بہتر ہو گئے۔ میری اپنی شخصیت پتہ نہیں کیا سے کیا ہو گئی۔ اور اب تم مشکل میں

پڑے ہو تو یہ مت سمجھنا کہ نعمت علی ایک خود غرض دوست ہے۔ اور تمہیں چھوڑ کر ہندوستان سے پاکستان واپس چلا جائے گا۔ اول تو اس کے امکانات ہی مشکل نظر آ رہے ہیں۔ لیکن اگر وقت نے اس کا موقع بھی دیا۔ تو تم یقین کرو۔ کہ نعمت علی تمہاری روح کے ساتھ ہی اپنے وطن واپس جائے گا۔"

گاڑیاں سفر کرتی رہیں۔ یہ عورت کون ہے۔ اور اس سے کیا چاہتی ہے۔ اور اسے شنکر کہہ کر کیوں مخاطب کیا ہے؟

یہ سوالات بھی نعمت علی کے ذہن میں تھے۔ لیکن سارے سوالات کے جوابات فوراً ہی نہیں مل جاتے البتہ جس حویلی میں عورت داخل ہوئی تھی۔ وہ خالص ہندوانہ طرز کی پرانی حویلی بنی ہوئی تھی۔ عورت جس قدر شان و شوکت کی مالک تھی۔ اس کے مطابق حویلی کو بھی ویسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ گیٹ کھلا اور دونوں گاڑیاں اندر داخل ہو گئیں۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور عورت نیچے اتری۔ تو نعمت علی بھی نیچے اتر آیا۔ عورت نے کہا۔

"شنکر جی مہاراج کو مہمان خانے میں لے جاؤ۔ اور ایک معزز مہمان کی حیثیت سے ان کے سارے کام کرو۔ جایئے شنکر جی!"

"لیکن میڈم! آپ......؟"

"کچھ نہیں شنکر مہاراج! ہماری میزبانی کا لطف اٹھایئے۔ ہم آپ سے ملیں گے اور بہت سی باتیں کریں گے۔ جایئے۔" عورت نے پاٹ دار لہجے میں کہا۔ اور نعمت علی کے جواب کا انتظار کئے بغیر اندر حویلی میں چلی گئی۔

"جبکہ وہ دونوں باڈی گارڈ عورتیں۔ نعمت علی کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔"

"آیئے شنکر جی! مہاراج" انہوں نے بھی اسے شنکر ہی کے نام سے مخاطب کیا۔ نعمت علی یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ عورت کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا پھر اس کے پس منظر میں کچھ گہرائیاں ہیں۔ لیکن پھر بہر حال جن حالات سے وہ ایکدم گزرا تھا۔ ان کے تحت اسے اس عورت سے تعاون ہی کرنا تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے عزیز میں پٹنہ تھا۔ اور خیر الدین خیری کے ساتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ جس مہمان خانے میں اسے لایا گیا تھا، وہ کسی بھی طرح ایک شاندار حویلی سے کم نہیں تھا۔

ایک بہت ہی بڑا کمرہ، جس میں موٹا قالین بچھا ہوا تھا۔ کئی جگہ تخت بچھے ہوئے تھے۔ ایک چھپر کھٹ تھا۔ پرانی طرز کی کھڑکیاں اور دروازوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ چھت پر فانوس لٹکا ہوا تھا۔ غسل خانہ البتہ جدید طرز کے مطابق کمرے کے ایک کونے میں موجود تھا۔ یہاں ہر آسائش فراہم کر دی گئی تھی۔ دونوں باڈی گارڈ عورتوں نے کہا۔

"آپ کی سیوا کے لئے ہم کسی کو مقرر کئے دیتے ہیں۔ جو ضرورت ہو۔ آپ انہیں بتا دیجئے گا۔" یہ کہ کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گئیں تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک خوبصورت جوان عورت جس کی عمر تیس بتیس سال کے قریب تھی۔ ہاتھوں میں لباس لئے اندر داخل ہوئی۔ یہ لباس دھوتی اور کرتے پر مشتمل تھا۔

"شنکر جی مہاراج! کپڑے بدل لیجئے آپ۔؟"

"مم......مم......مجھے دھوتی باندھنا نہیں آتی۔"

بے اختیار نعمت علی کے منہ سے نکل گیا۔ عورت بے اختیار ہنس پڑی۔

"میں سکھائے دیتی ہوں۔"

"تت......تم......؟"

"تو کیا فرق پڑتا ہے۔ آیئے۔" عورت نے کہا۔

"نہیں......نہیں تم جاؤ۔ میں جو کچھ بھی ہوگا کرلوں گا۔" نعمت علی نے کہا اور عورت ہنستی ہوئی واپس چلی گئی۔

نعمت علی نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ پھر وہ اس لباس کو دیکھنے لگا۔ بہت ہی خوبصورت اور قیمتی سلک کا کرتا تھا۔ اور باریک ململ کی دھوتی تھی۔ اسے ہنسی آنے لگی۔ پنڈت کا روپ دھارتے ہوئے تو اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ گیروا لباس پہنا تھا۔ لیکن اب

دھوتی اور کرتا۔ یہ ذرا ٹیڑھی چیز تھی۔ لیکن بہر حال ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس نے یہاں ہندوؤں کو دھوتی باندھے ہوئے دیکھا تھا۔

آدھے گھنٹے تک کوشش کرتا رہا لیکن دھوتی صحیح نہیں بندھی تو اس نے تہمند کے انداز میں جسم پر لپیٹ لیا۔ اور اوپر سے کرتا پہن لیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہی عورت واپس آئی۔ اور نعمت علی کو دیکھ کر ہنس پڑی۔

"یہ آپ نے دھوتی باندھی ہے۔"

"بس جیسی باندھنا آتی تھی باندھ لی۔"

"دیکھئے میں آپ کو اس کی ترکیب بتائے دیتی ہوں۔" عورت نے کہا۔

"مم......میں نے منع کیا ہے ناں تمہیں۔"

"میں بتاتی ہوں آپکو۔" اس نے کہا اور باہر رخ کر کے آواز دی۔ "دھونی۔ اندر آؤ۔" ایک ادھیڑ عمر کا شخص اندر داخل ہو گیا۔

"شنکر جی مہاراج کو دھوتی باندھنا سکھاؤ۔ میں باہر جا رہی ہوں۔" غرض یہ کہ دھونی نے اپنا لباس اتار کر جس کے نیچے وہ زیریں لباس پہنے ہوئے تھا۔ کئی بار دھوتی باندھ کر دکھائی۔

"یہ زیریں لباس نعمت علی کو بھی دیا گیا تھا۔"

نعمت علی نے بہر حال یہ غنیمت سمجھا کہ دھونی سے یہ سب کچھ سیکھ لے۔ اور اس کے بعد اسے دھوتی باندھنا بھی آ گیا۔ دھونی نے مطمئن انداز میں مسکرا کر گردن ہلائی اور بولا۔

"اور ایک دو بار سیکھ لیں مہاراج۔"

"نہیں......بس ٹھیک ہے۔"

"آپ بہت سندر لگ رہے ہیں۔ کتنے سندر ہیں آپ۔" "جا بھائی......باہر جا......میں سندر ہوں یا سندر لال۔ تو تو باہر جا......" دھونی خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد دوپہر کا کھانا آ گیا۔

سبزی پکی ہوئی تھی۔ پوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف حلوہ تھا۔ بڑی سی تھالی میں یہ کھانا لگا ہوا تھا۔ کئی قسم کے اچار اور چٹنیاں بھی تھیں۔ نعمت علی نے اس پر تعرض نہیں کیا۔ اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اسے اپنی آنکھوں میں بوجھ محسوس ہونے لگا۔ بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اور تھوڑی دیر میں اسے نیند آ گئی۔

شام کو پانچ بجے تھے۔ جب اسے، اس خوبصورت عورت نے پھر سے جگایا اور بولی۔

"جاگ جایئے مہاراج، اشنان کر لیجیے۔ آپ کا دوسرا لباس اندر موجود ہے۔"

"اب مجھے ہر گھنٹے کے بعد لباس بدلنا پڑے گا۔"

"آپ کی مرضی ہے مہاراج ویسے آپ ان کپڑوں میں بھی بڑے سندر لگ رہے ہیں۔" عورت بڑی ڈھیٹ قسم کی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھوں میں حیاء نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ بہر حال نعمت علی غسل خانے میں داخل ہو گیا۔

غسل خانہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ نعمت علی نے سوچا جتنا وقت اس عورت کے ساتھ گزرتا ہے۔ گزار لیا جائے۔ کم از کم اسے تحفظ حاصل تھا۔ ورنہ بڑا مسئلہ ہو جاتا اسے کسی بھی طرح پہچان لیا گیا تھا۔ اور نجانے کیوں اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگا دیا گیا تھا۔

کافی دیر تک غسل کرتا رہا۔ باہر آیا تو وہی عورت چائے لئے موجود تھی۔ اور یہ چائے انتہائی خوبصورت ٹرالی میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے حسب معمول مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ چاہیں تو باہر کھلی فضاء میں بھی چائے پی سکتے ہیں۔" نعمت علی نے سوچا کہ اب بلا وجہ اس سے گریز کرنا حماقت ہے۔ "اس نے کہا۔

"نہیں، یہیں ٹھیک ہے۔ تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"بھگوان کا شکر ہے۔ آپکو خیال تو آیا۔ شنکر جی مہاراج۔ میں شانتی ہوں۔"

"ٹھیک۔" شانتی مجھ سے باتیں کرو گی۔؟"

"کیوں نہیں۔؟" جو باتیں آپ کرنا چاہیں گے تو کروں گی۔"

"تو بیٹھ جاؤ......"

''جی۔'' اس نے کہا۔ اور سامنے آرام سے بیٹھ گئی۔
''میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں شانتی! کہ میں کس کا مہمان ہوں؟''
''رانی پورن وتی کا۔''
''رانی......؟''
''ہاں...... وہی جو آپکو یہاں لے کر آئی ہیں۔''
''کہاں کی رانی ہیں یہ؟''
''بس سمجھ لیجئے۔ سنسار بہت بڑا ہے۔ کہیں نہ کہیں کی تو ہوں گی ہی۔''
''نہیں شانتی اگر مجھ سے دوستی کرنا چاہتی ہو۔ تو سب کچھ سچ سچ بتادو۔ ورنہ تمہاری مرضی۔''
''دوستی تو ہے۔ ہماری شنکر مہاراج مجھے آپ کی سیوا پر لگایا گیا ہے۔ داسی ہوں آپ کی مگر اگر آپ داسی کے بجائے دوست کہنا چاہتے ہیں تو کہہ لیجئے۔ میں تو ہر حالت میں آپ سے تعاون کروں گی۔''
''تو پھر مجھے بتاؤ کہ رانی پورن وتی کہاں کی رانی ہیں۔؟''
''کہیں کی بھی نہیں ہیں۔ بس رانی کہلاتی ہیں۔ کیوں کہ رانیوں جیسی ہیں۔ بہت بڑی شخصیت ہے ان کی۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ساری حکومت میں ان کا بڑا عمل دخل ہے۔ جو کچھ مجھے معلوم ہے۔ اس سے آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ کہ لوگ کس طرح ان کی عزت کرتے ہیں۔''
''کیا تم جانتی ہو۔ میں کون ہوں۔؟''
''نہیں ...... میری اتنی حیثیت نہیں ہے۔ بس رانی جی! نے آپ کا نام شنکر جی بتایا سو ہم نے مان لیا۔ اس سے آگے کی جاننے کی ہمیں کوئی آ گیا نہیں ہے۔'' نعمت علی سوچ میں ڈوب گیا۔
عورت کا نام معلوم ہوگیا تھا۔ یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ بہت بڑی شخصیت کی مالک ہے۔ اور کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ شانتی سے اور کیا کہے چنانچہ فیصلہ یہی کیا کہ خاموش رہا جائے۔ اور وقت کا انتظار کیا جائے۔
یہاں اسے ہر طرح کی آسائشیں حاصل تھیں۔ سب کچھ مل گیا تھا اسے لیکن ایک خوف ایک احساس اب بھی دل میں موجود تھا۔ وہ یہ کہ ہندوستان کی حکومت اسے پاکستانی جاسوس سمجھتی ہے۔ اس کی تلاش جاری ہے۔ یہ تو نہیں پتہ چل سکا تھا اسے کہ اگر وہ گرفتار ہوگیا۔ تو اس پر کیا بیتے گی۔ لیکن بہت ساری باتیں صرف سوچنے کیلئے ہوتی ہیں۔ اور انہیں آسانی سے سوچا جاسکتا ہے۔ اسے پتہ تھا کہ اگر اس کی اصل حیثیت نمایاں ہوگئی۔ تو پھر اس پر کیا گزرے گی۔
خیر ان تمام باتوں کیلئے جو بھی آنے والا وقت کہے وہ دیکھا جائے گا۔ لیکن کچھ بھی ہو جائے۔ خیر الدین خیری کو چھوڑ کر بھاگنا ناممکن ہے۔ غالباً یہاں آئے ہوئے پانچواں دن ہوگیا تھا۔ اس شام موسم ابر آلود تھا۔ آسمان پر گھرے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضاء میں ایک سونی سونی سی کیفیت تھی۔ بدن میں اینٹھن ہورہی تھی۔ جس کمرے میں اسے رکھا گیا تھا۔ وہ مہمان خانے کا ایک بہت ہی روشن کمرہ تھا۔ دائیں جانب ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ جولان کی جانب کھلتی تھی۔ اور یہاں سے خوبصورت پھولوں کا نظارہ بہت ہی خوبصورت لگتا تھا۔
پھول بھی رانی پورن وتی نے بہت ہی خوبصورت لگائے ہوئے تھے۔ غالباً اسے پھولوں کا شوق تھا۔ شام ہوگئی۔ پھر ہلکی ہلکی بوندا باندی، ہونے لگی، اور پھر اچانک ہی شانتی اس کے پاس پہنچ گئی۔
''رانی جی نے آپ کو بلایا ہے۔ شنکر جی مہاراج!''
''ایں......'' نعمت علی اچھل پڑا۔
''جی۔ اصل میں انہیں بارش کی بوندیں بہت پسند ہیں۔ اگر ہلکی ہلکی بارش ہورہی ہو تو پھر انہیں چین نہیں آتا۔ شاید آپ کو وہ اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتی ہیں۔''
''کہاں ہیں وہ؟''
''باہر باغ میں۔''

''مجھے باغ میں بلایا ہے؟''
''ہاں۔''
''تم میری راہنمائی کرو۔'' نعمت علی نے کہا۔ اور شانتی اسے لے کر چل پڑی۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ باغ میں داخل ہوگئی۔ بہت ہی خوبصورت اور حسین لان بنا ہوا تھا۔ اور اس لان کے ایک خوبصورت پھولوں والے گوشے میں رانی پورن وتی نظر آرہی تھی۔ سفید رنگ کی ململ کی ساری باندھے ہوئے۔ خود بھی سفید اور پھولوں جیسی کھلی ہوئی۔ نظر آرہی تھی ہلکی ہلکی بوندوں میں اس کی سفید ساڑی بھیگ گئی تھی۔ اور جگہ جگہ سے اس کے سفید بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ ساڑی کے نیچے سے اس کا گلابی رنگ اس طرح جھلک رہا تھا۔ کہ اس پر نگاہیں ٹکانا مشکل ہو جائے۔ نعمت علی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اسے دشالی یاد آگئی۔ وشالی ہی تو اس کی محبت تھی۔ اور وہ اسے بہت بار یاد کر چکا تھا۔ لیکن چونکہ خود برے حالات کا شکار تھا۔ اس لئے محبت کو کوئی جنون نہیں مل سکا تھا۔
رانی پورن وتی اسے دیکھ کر مسکرائی۔
اس کی مسکراہٹ میں بڑی لگاوٹ تھی۔ ویسے بھی انتہائی حسین نقوش کی مالک تھی۔ اور اس وقت تو بادلوں کی چھاؤں میں بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر اس کے پاس پہنچ گیا۔
''آؤ...... نعمت علی، آؤ......'' اس بار رانی نے اسے اس کے اصل نام سے پکارا تھا۔ اور نعمت علی کو بہرصورت اس بات پر حیرت ہونی ہی تھی۔
''آؤ...... بیٹھیں۔ گیلی گھاس بری تو نہیں لگے گی۔''
''نہیں۔ پورن وتی جی!'' نعمت علی نے بھی اسے اس کے نام سے مخاطب کیا۔ اور وہ ہنس پڑی۔
''واہ...... تم نے مجھے میرے نام سے پکارا ہے۔ اچھی بات ہے۔ ویسے لوگ مجھے یہاں دیوی کہتے ہیں۔''
''میں بھی آپکو دیوی کہوں گا۔''
''نہیں بابا...... نہیں۔ کون کہتا ہے تم سے یہ بات سب نے دیوی کہہ کہہ کر میری مت مار دی ہے۔ کوئی تو ایسا ہے جو مجھے پورن وتی کہہ کر پکارے۔ بلکہ ایک کام کرو۔؟''
''جی۔؟''
''دوست، تم مجھے صرف پورن کہو۔ کہو گے؟''
''اگر آپ کا حکم ہوگا تو ضرور کہوں گا۔''
''چلو بیٹھو...... ویسے ایک بات سچ...... سچ کہوں دھوتی کرتے میں تم بڑے پیارے نظر آرہے ہو۔''
''میں بھی ایک بات کہوں آپ سے، پورن جی۔''
''بولو...... بولو......؟''
''یہ سب آپ نے مجھے پہنا دیا ہے۔ ورنہ......''
''ورنہ...... کیا......''
''ورنہ مجھے سچ سچ یہ لباس پہننا بھی نہیں آتا تھا۔''
''مجھے بہت سندر لگ رہے ہو۔ اور پھر اس وقت بادلوں کی چھاؤں میں تو تم بہت ہی پیارے لگ رہے ہو۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں غلط جذبے سے یہ سب کچھ کہہ رہی ہوں۔ اچھے دوست، اچھے ہی لگتے ہیں۔''
''تو کیا آپ نے مجھے دوستی کا درجہ دیا ہے۔''
''ہاں ...... دینا چاہتی ہوں۔ اگر تم سویکار کرو۔''
''میری خوش قسمتی ہوگی۔''
''تم بیٹھو تو سہی۔ خوش قسمت۔'' پورن وتی نے کسی قدر شوخ لہجے میں کہا۔ اور خود بھی گھاس پر بیٹھ گئی۔ نعمت علی کی نگاہ خود بخود اس کی جانب اٹھ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ کہ اگر غور سے پورن وتی کو دیکھا جاتا تو ایمان ڈگمگانے لگتا تھا۔ اس نے پہلے کبھی کسی کو ایسی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اب دل چاہ رہا تھا کہ پورن وتی کے ایک ایک نقش کو غور سے دیکھتا رہے۔ پورن وتی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور ہنس پڑی۔
''تو دیکھو ناں۔ منع کس نے کیا ہے تمہیں۔؟'' وہ بولی، اور نعمت علی ایک دم جھینپ سا گیا۔ پورن وتی ہنس پڑی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"تمہیں تعجب ہو رہا ہوگا کہ تمہارے من کی باتیں کیسے پڑھ رہی ہوں۔"

"میں حیران ہوں۔ پورن جی۔"

"یہ "جی" بھی نکال دو۔ پورن کے آگے سے مجھے خوشی ہوگی۔"

"جیسی آپ کی مرضی......"

"اصل میں، میں، بھانا سیوک ہوں۔ سمجھ رہے ہونا؟" بھانا سیوک۔

"میں نہیں جانتا۔"

"میرے گرو بھانا مہاراج ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت سی شکتیاں دی ہیں۔ انہوں نے مجھے انوکھی شکتی بھی دی ہے۔ اس انوکھی شکتی کے ذریعے میں، من کی باتیں جان لیتی ہوں۔ اور بھی بہت سے گن دیئے ہیں انہوں نے مجھے، اور انہی گنوں کی بنا پر مجھے تمہارا پتہ ملا۔"

"اب جب آپ نے اتنی بات کہی ہے پورن تو میں آپ سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"آج میں نے تمہیں اسی لئے اپنے پاس بلایا ہے۔ پوچھو۔"

"آپ مجھے کتنا جانتی ہیں۔"

"بہت زیادہ نہیں۔ جب میں نے اپنے گیان سے یہ پوچھا۔ کہ میں جو کچھ چاہتی ہوں اس کے لئے کوئی ایسا کردار مجھے بتایا جائے۔ جو میرے کام آسکے تو اس میں تمہارا نام نکل آیا۔

پھر میں نے سوچا کہ تم مجھے کہاں ملو گے تو میرے گیان نے مجھے بتایا کہ اس لمحے تم تھانے میں ہو۔ اور مشکل کا شکار ہو۔ میں نے تمہاری مشکل کا پتہ لگایا۔ اور آخر کار میں وہاں پہنچ گئی۔ اور تمہیں ان کے چنگل سے نکال لائی۔"

"کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے۔ پورن! کہ میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔"

"ہاں...... میں جانتی ہوں۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں یہاں کیسے آپھنسا۔؟"

"نہیں...... یہ مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا آپ نے معلوم نہیں کیا؟"

"کیا تھا...... پر ایک بات کہوں۔؟" "تم بھی لال چادر میں لپٹے ہوئے ہو۔"

"لال...... چادر؟" نعمت علی نے سوال کیا۔

"ہاں۔ ہمارے گیان میں کچھ باتیں ایسی ہیں۔ جن کے بیچ ہم دخل نہیں دے سکتے۔ بھانا جی مہاراج نے مجھے بتایا ہے کہ اگر کوئی تمہیں لال چادر میں لپٹا نظر آئے تو اس کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش مت کرو۔ ہاں...... اگر تمہیں اس سے کوئی کام ہے۔ تو دوستوں کی طرح سیوا کر کے اس سے اپنا کام نکالو۔"

"مم...... مگر...... م...... میں...... تو اس لال چادر کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"پتہ نہیں۔ یہاں میں یہ نہیں کہہ سکتی۔ کہ تمہارے من میں جھانک کر میں سچ اور جھوٹ کا پتہ چلا سکوں۔" نعمت علی کے دل میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ ممکن ہے یہ لال چادر اس کی اپنی ذات سے تعلق رکھتی ہو۔ اور اس کا تعلق خیر الدین خیری سے ہو۔ جس نے اسے بھی تھوڑی بہت قوتوں میں لپیٹ دیا ہے، کیونکہ وہ ایک آدمی نہیں تھا۔ بلکہ ایک عالم تھا۔

ایک لمحے کے لئے یہ بات اس نے سوچی۔ اور پھر چونک کر پورن وتی کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ ان کے ذہن کو پڑھ تو نہیں رہی۔

"کوشش کر رہی تھی۔ مگر جب میں نے تمہارے من میں جھانکا۔ تو مجھے لالی، ہی لالی نظر آئی۔ اس لمحے تم اپنی اس چادر کے بارے میں سوچ رہے ہو۔" نعمت علی کا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔

بڑی پراسرار شخصیت ملی تھی اسے۔ پورن وتی اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"چلو آؤ...... ایک معاہدہ کریں۔"

"کیا......؟" نعمت علی نے سوال کیا۔

"اگر تمہارے پاس۔ لال چپٹی ہے۔ تو تم اسے مجھ پر استعمال نہیں کرو گے۔ اور میں تمہارے من میں

جھانکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ سیدھے سیدھے باتیں کرتے ہیں ہم لوگ۔"

"آپ کہہ لیجئے پورن، پر میں آپ کو سچ بتاؤں۔ میرے پاس کوئی شکتی نہیں ہے۔ سیدھا سادھا سا آدمی ہوں۔ ہاں! کسی چکر میں پڑ کر پاکستان سے ہندوستان چلا آیا تھا۔ میرا ایک ساتھی تھا۔ جو یہاں آ کر مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ یوں سمجھ لو پورن کہ وہی سب کچھ تھا۔ میں تو بس اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اور کچھ نہیں......"

"تم سچ کہہ رہے ہو۔ ایک بات اور کہوں۔ میرے سامنے جھوٹ بولنے والے کی آنکھوں کا رنگ گہرا نیلا ہو جاتا ہے۔ اور جو سچ بولتا ہے۔ اس کی آنکھیں سفید ہی رہتی ہیں۔ میں نے وعدے کے مطابق تمہارے من میں نہیں جھانکا۔ لیکن تمہاری آنکھوں میں ضرور دیکھتی رہی ہوں۔ اور تمہاری آنکھیں بتاتی ہیں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو۔ سچ کہہ رہے ہو۔ جو کوئی بھی تمہارے ساتھ تھا۔ میں اس کے بارے میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔ کیونکہ وہی لال شکتی والا تھا۔ وہ کہاں گم ہو گیا یہ بھی بھگوان ہی جانے۔ خیر...... تو میں تم سے کہہ رہی تھی کہ میرے گیان نے مجھے تمہارا نام بتایا۔ اور میں تمہیں تلاش کرتی ہوئی تھانے پہنچ گئی۔ اور وہاں سے یہاں لے آئی۔

اصل میں نعمت علی۔ تنہائی میں میں تمہیں نعمت علی کے نام سے ہی پکاروں گی۔ کیونکہ مجھے تمہاری ہی ضرورت تھی۔ ایک مسلمان کی۔" نعمت علی کو گزرا ہوا وقت یاد آ گیا۔

جادوگروں کی سرزمین ہندوستان پراسرار قوتوں کا مرکز یہاں تو قدم قدم پر ایسی ہی شخصیتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بالکل ایسے ہی کردار سے وہ کچھ عرصے پہلے خیر الدین خیری کی معیت میں نمٹ چکا تھا۔ اور اس نے کچھ لوگوں کو مشکلات سے نجات دلائی تھی۔ پورن وتی بھی تقریباً ویسی ہی تھی۔ لیکن اب صورتحال بالکل مختلف تھی۔ کیونکہ خیر الدین خیری اس کے ساتھ نہیں تھا۔ جہاں تک اس سرخ قوت کے بارے میں پورن وتی نے بتایا تھا۔ اس سے پہلے نہ تو نعمت علی کو اس کا کوئی تجربہ ہوا تھا۔ اور نہ اسے اس بارے میں معلوم تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خیر الدین خیری نے اسے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن یہ تو خوشی کی بات تھی کہ خیر الدین خیری کی کوئی قوت اس کے پاس موجود ہے۔ یعنی اگر کوئی اس بات کو جاننے کی کوشش کرے کہ وہ کس طرح پاکستان سے ہندوستان آیا۔ اور یہاں کیسے کیسے مسائل میں گرفتار ہوا۔ تو کوئی جان نہیں سکے گا۔ اس بات نے اسے بڑا سکون بخشا تھا۔ اب اسے اپنی ذہانت سے کام لے کر پورن وتی سے فائدہ اٹھانا تھا۔

چنانچہ اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"آپ مجھے بتایئے...... میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں۔"

"ہاں۔ وہی سوچ رہی ہوں۔ دیکھو! ہم گیان شکتی والے لوگ ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ ہمارے پاس کالی طاقتیں بھی ہوتی ہیں۔ اور روشنی والی قوتیں بھی۔ میں کالی شکتی کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ جو میرے لئے بہت زیادہ ہے۔ اور تمہیں ایک بات بتاؤں کہ بھانا سیوک ہونے کی وجہ سے میرے گرو۔ بھانا جی مہاراج میری حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ وہ پاپی اب تک مجھے کھا چکا ہوتا۔"

"کون پاپی؟" نعمت علی نے سوال کیا۔ تو اچانک ہی پورن وتی کی آنکھوں کا رنگ بدلنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک دانت پیستی رہی۔ اور اس کے بعد آہستہ سے بولی۔

"پرمیت سنگھ، راجہ پرمیت سنگھ، یہ نام نعمت علی کے لئے اجنبی تھا۔ اس نے کہا۔

"کون ہے یہ راجہ! پرمیت سنگھ۔؟"

"بڑا ہی پاپی ہے۔ کالے جادو کا ماہر۔ سنسار میں نجانے کیسے کیسے نقصان پہنچا چکا ہے، بہت ظالم ہے۔ پر بڑا دھرماتما بنا ہوا ہے۔ یہ میں ہی جانتی ہوں کہ وہ اندر سے کیا ہے؟"

"ہوں۔ تو پھر؟"

"میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ وہ خود تو جو کچھ بھی ہے۔ سو ہے ہی۔ مگر ایک اس کا مددگار بھی ہے۔ جس نے اسے صحیح معنوں میں کالی شکتی دی ہوئی ہے۔ اصل مسئلہ اس مددگار کا ہے۔ وہ مددگار اسے ہر طرح کی طاقتیں دیتا ہے۔ اور وہ اسی کے بل پر جو کچھ کرتا ہے۔ سو کرتا ہے۔ وہ مددگار اس کا گرو ہے۔ اور کون جانے وہ شیطان ہی ہو۔ بس کالی شکتی اس کے ذریعے پرمیت سنگھ کو پہنچتی ہے۔"

"پرمیت سنگھ ہے کہاں؟"

"ریاست "الور" میں۔ تم نے اس ریاست کا نام سنا ہوگا۔"

"ہاں۔ شاید کبھی میرے کانوں سے گزرا تو ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اصل میں، میں تمہیں یہ بتانا چاہتی تھی۔ کہ تم نے جس طرح ان بچوں کو بچایا ہے۔ اس میں تمہارے ایمان کی شکتی شامل تھی۔ اور ایمان کی وہ شکتی صرف تمہارے ہی پاس ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق تمہارے دین دھرم سے ہے۔" ایک بار پھر نعمت علی چکرا کر رہ گیا تھا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ پہاڑی پر اس نے گوٹلا کے چنگل سے ان بچوں کو بچانے کے لئے۔ کلام پاک کی ایک آیت پڑھی تھی۔ جو اسے بچپن سے یاد تھی۔ اور اس آیت ہی کی وجہ سے اسے گوٹلا پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ اور وہ معصوم بچے بچ گئے تھے۔ اس نے کہا۔

"تو پھر...... پورن؟"

"ایک اور بات تم سے کہوں۔؟" میرے پاس اتنی ہی شکتی ہے۔ پر میں تمہیں اپنے کام کیلئے مجبور نہیں کر سکتی، ہاں۔ اگر تم میرا ساتھی بن جاؤ۔ تو میں تم سے پوچھوں گی کہ تم کیا چاہتے ہو۔ میں تمہارا وہ کام کر دوں گی۔ اور میری ایک اور پیشکش سن لو۔ تم اگر پاکستان جانا چاہتے ہو تو میں تمہیں پوری عزت آبرو کے ساتھ پاکستان کی سرحد پار کرا سکتی ہوں۔ سرکاری طور پر بھی کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اور اگر تم سرحد پار ویسے جانا چاہو گے۔ تو کوئی بھی تمہیں نہیں روک سکتا۔ سمجھ رہے ناں تم۔؟ لیکن میں یہ اس وقت کروں گی۔ جب تم میرا کام کر دو گے۔" نعمت علی اسے یہ تو نہیں بتا سکا۔ کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ لیکن اس نے اپنے طور پر دل میں یہ سوچا کہ ذرا سا وقت گزرے گا تو پورن وتی سے ہی یہ پوچھے گا۔ کہ کیا وہ اسے اس کے ساتھی کی تلاش میں مدد دے سکتی ہے۔ لیکن مسئلہ تو یہ تھا کہ خیر الدین خیری بیچارہ کہیں گم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کی روح ایک شیطان کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔

پھر اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ ممکن ہے۔ یہ جادوگر عورت اسے ایسی کوئی ترکیب بتا سکے جس سے خیر الدین خیری کی روح کو آزاد کرایا جا سکے۔ بہتر یہ ہے کہ پورن وتی سے تعاون کیا جائے۔ اس وقت پورن وتی۔ گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے نہ تو اس کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش۔ وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔

نعمت علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"تو کیا تم یہ سمجھتی ہو پورن! کہ اگر تم مجھے راجہ پرمیت سنگھ کے مقابلے پر بھیجو گی تو میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"بس یہ خیال میرے من میں ہے۔ بلکہ مجھے اس کیلئے ہوشیار بھی کیا گیا ہے۔ کہ اگر تم دل سے میری معاونت کیلئے تیار ہو جاؤ۔ تو میرا کام بن سکتا ہے۔"

"مجھے سوچنے کیلئے کچھ وقت دو گی پورن وتی۔"

"ہاں...... ابھی تو سمے ہی سمے ہے۔ تو تم اس کام کا آغاز اماوس کی رات سے کرو گے۔ جب کالی شکتیاں پر پھیلائے ہر طرف ناچتی پھرتی ہیں۔ اس سمے تمہیں ان کے بیچ سے گزرنا ہوگا۔ اور تبھی میں تمہیں راجہ پرمیت سنگھ کی راجدھانی الور پہنچانے کی کوشش کروں گی۔"

"راجدھانی...... تو کیا وہ سچ مچ وہاں کا راجہ ہے؟"

"ارے نہیں۔ ریاستیں...... اب ریاستیں کہاں رہی ہیں۔ پر اس کے پرکھے راجہ تھے۔ اور انہوں نے لوگوں پر خوب ظلم کیے ہیں۔ اور اب وہ راجہ جیسا بنا ہوا ہے۔ حکومت میں بھی اس کی بات ہے اصل میں حکومت میں ان سب کی بات ہوتی ہے۔ جن کے پاس کوئی شکتی

ہوتی ہے۔ راجہ پرمیت سنگھ، مجھ سے میری شکتی چھین لینا چاہتا ہے۔ اور میں اس سے اس کی۔ پر میں نیک ارادوں سے اسے نیچا دکھانا چاہتی ہوں۔ جبکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ اس نے کھیل ہی نیارے کئے ہوئے ہیں۔ وہ بہت ظالم ہے۔ اور دھرماتما بنا ہوا ہے۔ جب تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو تمہیں پتہ چلے گا۔ میں یہ سب باتیں تمہیں اس لئے بتا رہی ہوں کہ اگر تم میرے کام کیلئے تیار ہو جاؤ۔ تو یہ صرف میرا کام ہی نہیں ہوگا۔ بلکہ نیک کام ہوگا۔ ابھی تم نے مجھ سے سمے مانگا ہے۔ میں خود بھی تمہیں کہہ چکی ہوں کہ چاند ڈوبنے میں ابھی بہت دن باقی ہیں۔ تم کوئی صحیح فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے پورن۔ میں ایسا ہی کروں گا۔"

"اور میں تمہیں بتاؤں۔ میں بار بار تمہارے سامنے نہیں آؤں گی۔ بات یہ ہے کہ میں بھی انسان ہوں۔ میرے من میں بھی انسانی کھوٹ ہے۔ تم بہت سندر ہو۔ دھوتی اور کرتے میں تم راجکمار لگ رہے ہو۔ ہو سکتا ہے میرے من میں تمہارے لئے کبھی کوئی برائی آ جائے۔ اگر کوئی ایسی برائی میرے من میں آئی تو تم میرے کسی کام کے نہیں رہو گے۔"

"اوہ...... ٹھیک ہے۔"

"پر شانتی تمہاری پوری پوری دیکھ بھال کرے گی۔ اور تمہیں ہر طرح کی آسانیاں دے گی۔ تم اس سے من کی ہر بات کہہ سکتے ہو۔ وہ میرے بھروسے کی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پورن۔"

"دیکھو...... موسم کتنا اچھا ہے۔ اس سندر موسم میں ایک سندر شہزادہ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ حالانکہ میں بارش کی دیوانی ہوں۔ پر یقین کرو۔ من میں کھوٹ آ رہی ہے۔ تمہارے لئے۔ تم اگر چاہو تو چلے جاؤ۔ یا پھر اس موسم میں رکنا چاہتے ہو۔ تو رکو۔ میں جا رہی ہوں۔ لیکن ٹھہرو...... میں ہی جا رہی ہوں۔ مجھے جانے دو میں شانتی کا رس پیوں گی۔ تاکہ مجھے سکون مل جائے۔" وہ کچھ کہے سنے بغیر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اس نے نعمت علی کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر آنکھیں بند کئے کئے ہی واپس مڑ گئی۔

نعمت علی اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ اس کے اندر عورت جاگ رہی تھی۔ اور وہ اس عورت کو قابو نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ واپس پلٹی۔ سفید ساڑی اب اس کے پورے بدن سے چپک گئی تھی۔ اور تھوڑی دور نکلنے کے بعد یوں لگا۔ جیسے وہ ساڑی بھی اس کے بدن پر نہ ہو۔ نعمت علی اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

اچانک ہی کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تو وہ اچھل کر پیچھے دیکھنے لگا۔ لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے حلق سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

"ک...... کون ہے؟ کون ہے؟" لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے پلٹ کر پورن وتی کو دیکھا۔ تو اس کا وہاں کوئی وجود نہیں تھا۔ جبکہ اتنی دیر میں وہ کسی بھی طرح حویلی کے اس دروازے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جہاں سے اندر داخل ہوا جا سکے۔ نعمت علی ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

ان تمام حالات نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی اسے اس طرح کے واقعات پیش آ چکے تھے۔ لیکن پراسرار واقعات کا نیا نیا سلسلہ ہر بار منفرد ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ وہیں کھڑا بارش کی بوندوں میں بھیگتا رہا۔ یہ بوندیں اسے بھی اس وقت اچھی لگ رہی تھیں۔ پھر اچانک ہی اس کے دل میں ایک پرسوز احساس جاگا۔ یہ وشالی کا احساس تھا اور اس کے منہ سے ایک مدھم سی آواز نکلی۔

"وشالی! تو نے مجھے زندگی کی اس مشکل سے روشناس کرایا ہے۔ جس میں کبھی نہیں پڑا تھا میں۔ تو مجھے بہت یاد آتی ہے۔ کون ہے کہاں ہے۔ میں نہیں جانتا۔" وہ وہاں سے واپس چل پڑا اور آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اپنی رہائش گاہ کے اندر داخل ہو گیا۔

مہمان خانے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ہاں شانتی اس کے کمرے کے دروازے پر بیٹھی ہوئی تھی

۔اس نے مسکراتے ہوئے نعمت علی کو دیکھا۔اور بولی۔

”مل آئے رانی جی! سے؟“

”ہاں......“

”بھیگ گئے ہو پورے کے پورے۔“

”کپڑے بدل لوں گا۔“

”ہاں...... میں نے دوسرے کپڑے رکھ دیئے ہیں۔تولیہ بھی وہیں ہے،میرے لئے اگر کوئی سیوا ہو تو مجھے بتاؤ۔“اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

نعمت علی نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹالیں۔اور کمرے میں داخل ہوگیا۔اس نے شانتی کا چہرہ نہیں دیکھا۔جو پرسوز آگ سے سلگ رہا تھا۔اندر داخل ہوکر اس نے لباس تبدیل کیا۔اب اسے دھوتی باندھنا بھی آگیا تھا۔نیا کرتا اور دھوتی پہن کر وہ مسہری پر جا بیٹھا۔

اور مسہری پر پاؤں لٹکائے لٹکائے پورن ولی سے اس ملاقات کے بارے میں سوچنے لگا۔بڑی انوکھی لیکن دلچسپ کہانی اس کے سامنے آئی تھی۔راجہ پرمیت سنگھ۔ایک نیا نام جس کے بارے میں پورن ولی نے بتایا تھا کہ”بڑا ظالم آدمی ہے۔کالے جادو کا ماہر ہے۔“

دیکھیں تو سہی یہ سب کچھ کیا ہے؟ ویسے حقیقت یہ ہے کہ پورن ولی نے بھی نعمت علی کے دل پر ایک عجیب سا نقش چھوڑا تھا۔اگر استاد محترم ساتھ ہوتے تو ان سے اس بارے میں معلومات حاصل کی جاتی۔خیر الدین تیری کا خیال بھی ایکدم اس کے دل میں آیا۔اور اسے یوں لگا جیسے اس کی کوئی بہت ہی عزیز ہستی اس سے رخصت ہوگئی ہو۔اچانک ہی شانتی نے کمرے میں جھانک کر کہا۔

”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔؟“شنکر مہاراج“

”نہیں۔تم جاکر۔آرام کرو۔میں بھی آرام کرنا چاہتا ہوں۔“نعمت علی نے بے رخی سے کہا۔اور اس نے شانتی کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر دیکھا۔وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی واپس مڑ گئی تھی۔

دروازہ اس نے خود ہی بند کردیا تھا۔

نعمت علی کچھ دیر سوچتا رہا۔پھر اس کے بعد مسہری پر لیٹ گیا۔نجانے کب اسے نیند آگئی تھی۔عجیب عجیب خواب نظر آتے رہے تھے۔مدد علی اور آسیہ بیگم کو بھی خواب میں دیکھا۔وہ دونوں مطمئن تھے۔اور پرسکون وقت گزار رہے تھے۔ان کے اپنے مسائل تو حل ہو ہی چکے تھے۔صبح تک وہ خوابوں میں گھرا رہا۔دوسرا دن معمول کے مطابق تھا۔شانتی اسے ہر چیز دے رہی تھی۔لیکن شام کو کچھ عجیب واقعات پیش آئے۔اس کے کمرے کی ایک کھڑکی پائیں باغ کی جانب کھلتی تھی۔اور اگر کھڑکی کھول دی جاتی تو اس میں سے پھولوں کی خوشبو کے ایسے جھونکے آتے۔کہ سارا کمرہ معطر ہو جاتا۔

رات کے کوئی ساڑھے گیارہ پونے بارہ بجے تھے۔تمام کاموں سے فراغت ہوگئی تھی۔پورن ولی اس سے روزانہ ملاقات نہیں کرتی تھی۔بس جب بھی کبھی ملنا چاہتی اسے اطلاع بھجوا دیتی تھی۔شانتی ہی اس کی ہر طرح کی دیکھ بھال کرتی تھی۔اتنی رات گئے شانتی بھی آرام کرتے چلی گئی ہوگی۔

نعمت علی کو نیند نہیں آرہی تھی۔اس نے کھڑکی کے پاس جاکے کھڑکی کھول دی۔کمرے کی روشنی بند تھی۔اس کھڑکی میں سلاخیں وغیرہ نہیں تھیں۔بلکہ اس طرح شیشے لگے ہوئے تھے کہ اگر دروازے کھول دیئے جاتے تو کھڑکی میں سے آنے جانے کا راستہ ہو جاتا تھا۔اس کے علاوہ کھڑکی سے نیچے کی زمین بھی اتنی گہری نہیں تھی کہ کود کر جانے میں کوئی دقت ہوتی اور اس وقت کھڑکی سے باہر جو منظر نعمت علی نے دیکھا وہ خاصا دلچسپ تھا۔

اس نے دیکھا کہ پورن ولی ایک درخت کے نیچے آسن جمائے بیٹھی ہوئی ہے۔اس نے یوگا کے انداز میں آسن جما رکھا تھا۔اور اس کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔آنکھیں بند تھیں۔کافی دیر تک وہ اسی طرح جاپ کرتی رہی۔اس وقت چاند نکلا ہوا تھا۔اور اس کی روشنی پورن ولی پر پڑ رہی تھی۔

پورن ولی درحقیقت اس وقت آکاش کی

اپسرا ہی لگ رہی تھی کافی دیر تک وہ جاپ کرتی رہی۔اور اس کے بعد اس نے آسن بدلا۔زمین پر دونوں ہاتھ ٹکائے اور دونوں گھٹنوں کے بل عجیب سے انداز میں ہوگئی۔لیکن پھر نعمت علی نے ایک انتہائی حیرت انگیز منظر دیکھا۔

پورن ولی کا بدن چھوٹا ہوتا جارہا تھا۔چھوٹا، چھوٹا، اور چھوٹا۔اس وقت بھی وہ ایک خاص قسم کی ساڑی باندھے ہوئے تھی لیکن نعمت علی کو یوں لگا جیسے بدن چھوٹا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کچھ تبدیلیاں بھی رونما ہونے لگی ہوں۔اور پھر نعمت علی نے دنیا کے سب سے حیرت انگیز منظر دیکھا۔

پورن ولی ایک فاختہ کی شکل اختیار کرگئی تھی۔خوبصورت فاختہ جو اپنے قدوقامت کے مطابق تھی۔

اچانک ہی اس نے پر پھیلائے اور زمین پر پاؤں ٹکا کر ایک دم فضا میں اڑ گئی۔اس کے بعد نعمت علی نے اسے فاختہ کی شکل میں اڑتے ہوئے دیکھا۔نعمت علی کا سر چکرانے لگا تھا۔اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ لیا۔

فاختہ تھوڑی دور تک فضاء میں بلند ہوئی۔اور اس کے بعد آہستہ آہستہ بلند ہوتی چلی گئی۔پھر وہ غائب ہوگئی۔نعمت علی حیرت کے مارے منجمد کھڑا رہا۔دفعتاً ہی اس کے دل میں ایک خیال آیا۔جاکر دیکھے تو سہی کہ پورن ولی فاختہ بن کر کہاں گئی۔کیا وہ اپنے کمرے میں ہے؟ کیا یہ صرف اس کا وہم تھا۔یا پھر جو کچھ ہوا ہے وہ حقیقت ہے۔لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔جب کمرے کے دروازے پر جاکر اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔نعمت علی ایک ٹھنڈی سانس لے کر مسہری پر آبیٹھا۔یہ انتہائی حیرت ناک منظر اس کے ذہن سے نہ مٹنے والا تھا۔

دوسرے دن پورن ولی غالباً حویلی میں موجود نہیں تھی۔شانتی نے یہی بتایا کہ”دیوی جی! حویلی سے باہر گئی ہوئی ہیں۔“

دوسرا، تیسرا، چوتھا۔اور پھر کئی دن گزر گئے۔اور یہاں تک کہ اماوس کی رات قریب آنے لگی۔اس میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔اس دن پورن ولی نے اسے خاص طور سے اپنے پاس بلایا۔اور بڑے مسکراتے ہوئے اسکا خیر مقدم کیا۔

”تمہاری صحت پہلے سے بہت اچھی ہوگئی ہے شنکر جی مہاراج! لیکن میرا خیال ہے کہ اب میں تمہیں شنکر جی! کہنے کے بجائے وکرم راج کہا کروں گی۔“

”وکرم راج......؟“نعمت علی نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں۔“یہ تمہارا نیا نام ہے۔“

”مگر کیوں؟ میرا اصل نام تو تمہیں معلوم ہے۔“

”تمہارا دوسرا نام شنکر تھا۔تھا ناں۔؟“

”ہاں۔“

”لیکن اب تم وکرم راج ہو۔اور تمہارا تعلق ریاست کرما گڑھی سے ہے۔جسے تم بہت عرصے پہلے چھوڑ چکے ہو۔“سمجھ رہے ہو ناں تم۔اب سے آگیا ہے وکرم راج کہ تم راجہ پرمیت سنگھ کے پاس چلے جاؤ۔تمہیں الور جانا ہوگا۔ایک آوارہ گرد سیاح کی حیثیت سے۔میں تمہیں اور بہت ساری تفصیلات بتاؤں گی۔راجہ پرمیت سنگھ گھوڑوں کا رسیا ہے۔اس کے اصطبل میں ایک سو دو گھوڑے ہیں۔بے شمار گھوڑوں کا تعلق مشرق وسطیٰ سے ہے۔اس نے بھاری بھاری قیمتوں پر یہ گھوڑے خریدے ہیں۔ان گھوڑوں کی دیکھ بھال کیلئے چوبیس بندے ہیں۔جو سب کے سب ماہرین فن ہیں اس کی بہن کرتا ولی بھی گھوڑوں کی رسیا ہے۔اور اپنے آپ کو بہت بڑا گھڑ سوار سمجھتی ہے۔دونوں بہن بھائی گھوڑوں کے دیوانے ہیں۔اکثر دہلی، اور بمبئی میں ان کے گھوڑے ریس میں شریک ہوتے ہیں۔اور اس طرح وہ پورے ہندوستان میں مشہور ہے۔میں تمہیں خاص طور سے یہ بتانا چاہتی ہوں۔کہ تمہیں ان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ایک ماہر گھوڑ سوار کا کردار ادا کرنا ہوگا۔اس سے تمہیں یہ آسانی ہو جائے گی کہ وہ خود تمہیں اپنے قریب رہنے کی دعوت دیں گے۔“نعمت علی نے

تعجب سے پورن وتی کو دیکھا اور بولا۔

"لیکن مجھے تو گھوڑ سواری نہیں آتی۔"

"مجھے تو آتی ہے۔" پورن وتی مسکرا کر بولی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں گھوڑ سواری سکھا دوں گی"

"اتنے مختصر سے وقت میں۔"

"چند لمحوں کے اندر اندر اس بات کی تم بالکل چنتا مت کرو۔ یہ تمہارا نہیں میرا کام ہے۔"

"ٹھیک ہے" نعمت علی نے اس بات کو دل سے تسلیم کیا کہ جو عورت فاختہ بن کر اڑ سکتی ہے۔ جو آسانی سے ذہنوں کو پڑھ کر دلوں کا حال جان لیتی ہے اس کے لئے یہ کام مشکل نہیں ہوگا۔ پھر پورن وتی اسے بہت کچھ بتانے لگی۔ سارا کام چوکس کر دیا تھا اس نے۔ اور اس کے بعد اماوس کی رات کا انتظار کیا جانے لگا۔ جس کے دوسرے دن نعمت علی کو ریاست الور روانہ ہو جانا تھا۔ یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں اور نعمت علی اس چکر میں تھا کہ کسی بھی طرح یہ بات معلوم کرے کہ خیر الدین خیری کی روح کو کس طرح پردھان سنگھ کے قبضے سے آزاد کرائے ۔لیکن ایسے کام جلد بازی میں نہیں ہوتے ۔ ان کیلئے وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور نعمت علی بھی صبر و سکون کے ساتھ اس وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اسے اپنے مطلب کی کوئی ایسی شخصیت ملے جو خیر الدین خیری کی رہائی میں اس کی مددگار ثابت ہو سکے۔

اماوس کی رات کو پورن وتی کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ وہ بالکل دیویوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں ترشول تھا۔ اور اسی درخت کے پاس اس نے نعمت علی کو بلایا تھا۔

رات گہری تاریک تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور اس وقت ساری چیزیں ایک ہیولے کی شکل میں نظر آ رہی تھیں۔ لیکن پورن وتی کی آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ان آنکھوں سے نیلی شعاعیں خارج ہو رہی تھیں۔ اور پورن وتی کا حسین چہرہ اس وقت انتہائی بھیانک نظر آ رہا تھا۔ اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور اس کے بعد نعمت علی پر پھونک ماری اور نعمت علی کو یوں لگا جیسے گہرے زرد رنگ کا ایک غبار اس کے بدن سے آ کر لپٹ گیا ہو اور وہ غبار آہستہ آہستہ اس کے بدن میں پیوست ہوتا جا رہا تھا۔

یہاں تک کہ وہ غبار نعمت علی کے بدن میں گم ہو گیا۔ اور نعمت علی اپنے آپ کو تھوڑا سا بھاری بھاری محسوس کرنے لگا۔ تب پورن وتی نے کہا۔

"اور تجھے اب وہ شکتی مل گئی ہے۔ وکرم راج، جو تجھے راجہ پرمیت سنگھ کے پاس لے جائے گی۔ اور پرمیت سنگھ تیری اصلیت نہیں جان پائے گا۔ لیکن خیال رکھنا اس کے ساتھ کوئی ایسی ہستی منسلک ہے۔ جو نامعلوم ہے۔ تجھے اس نامعلوم ہستی سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ پورن وتی اسے آہستہ آہستہ کچھ بتانے لگی۔ اور نعمت علی نے اسے ذہن نشین کر لیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ پھر اس نے پورن وتی سے کہا۔

"ایک بات کہوں۔ تم سے پورن۔؟"

"ہاں......" تیرے اس تخاطب نے ہی مجھے سرشار کر دیا ہے۔ بول؟ کیا کہتا ہے؟"

"میری ایک مشکل ہے جسے تم جانتی ہوگی۔"

"ہاں۔ لیکن تو نے مجھے اس کے بارے میں کبھی نہیں بتایا۔ اور میں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں۔ کہ میں تیرے من کے اندر جھانک کر بھی اس مشکل کو تلاش نہیں کر سکتی۔"

"اگر میں اس کام میں کامیاب ہو جاؤں تو کیا تم اس مشکل میں میری مدد کرو گی۔"

"بھگوان کی سوگندھ کروں گی۔ اگر تو ذرا بھی مجھے بتا دیتا تو میں دل و جان سے کوشش کرتی۔"

"پہلے میں تمہارا کام کر دوں۔ اسکے بعد تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔"

"میرا وعدہ ہے تجھ سے۔" پورن وتی نے کہا۔

کافی دیر تک وہ مختلف قسم کے عمل کرتی رہی۔ اور بار بار نعمت علی کو انوکھے معاملات سے دوچار ہونا پڑا۔

اس کے بعد وہ اپنے اندر ایک عجیب سا ہلکا پن محسوس کرنے لگا تھا۔

اور اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ انتہائی پھرتیلا اور طاقتور ہو۔ اسے اپنے بدن کی توانائی میں ہزار گنا زیادہ اضافہ محسوس ہوا تھا۔ اور یہ باتیں اس کے لئے کافی خوش آئند تھیں۔ یہاں تک کہ صبح کا ستارہ نمودار ہوا تو پورن وتی نے کہا۔

"جا اب جا کر سو جا۔ دوپہر تک سوتا رہ۔ تجھے ٹرین سے سفر کرنا ہے۔ میں اس کا انتظام کر دوں گی۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ تھوڑا سا ناشتا کرنے کے بعد نعمت علی گہری نیند سو گیا تھا۔ پھر بارہ بجے کے قریب شانتی نے ہی اسے جگایا تھا۔ شانتی اداس نظر آ رہی تھی۔

"آپ کی سب چیزیں تیار ہیں مہاراج۔ آپ کو تھوڑی دیر کے بعد چلے جانا ہے۔ باہر گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔ ڈرائیور آپ کو اسٹیشن تک لے جائے گا۔"

شانتی کے لہجے کی اداسی نعمت علی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ لیکن ساری باتیں فضول تھیں۔ جو اس کے دل میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کا تو کوئی پتہ ہی نہیں تھا۔ اور نعمت علی کو امید بھی نہیں تھی کہ وہ دوبارہ کبھی اس کے پاس آ سکے گی۔ یہ ایک احمقانہ قسم کا پیار تھا۔ جو اس کے دل میں جاگ اٹھا تھا۔

بہر حال پورن وتی اس کے بعد اس کے پاس نہیں آئی۔ یہاں تک کہ شانتی نے آ کر کہا۔ "تمام کام تیار ہو چکے ہیں۔ گاڑی کا وقت بھی ہونے والا ہے۔ ڈرائیور آنے والا ہے۔" نعمت علی اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ جو ایک بے پناہ خوبصورت اور جدید کٹ بیگ میں تھا۔ باہر نکل آیا۔ اور اس کے بعد وہ اس گاڑی تک پہنچ گیا۔ جو بہت قیمتی اور شاندار گاڑی تھی۔

اس ڈرائیور کو بھی وہ پہلے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ ڈرائیور نے اس کیلئے دروازہ کھول دیا۔ اور نعمت علی اندر بیٹھ گیا۔ تمام انتظامات کر دیئے گئے تھے۔ اسٹیشن پہنچنے کے بعد ڈرائیور نے نعمت علی کے ٹکٹ اس کے حوالے کر دیے۔ اور اسے مختصر سی باتیں بتائیں۔ ایک قلی نے اسے ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں پہنچا دیا۔ اور نعمت علی کی زندگی کے نئے سفر کا آغاز ہو گیا۔

اب اس کے پاس بے پناہ سوچوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کتنے کردار آئے تھے اس کی زندگی میں۔ کتنے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ ہندوستان آتے ہوئے بہت سے احساسات دل میں تھے۔ ہندوستان کی زندگی بے پناہ خوبصورت ہوتی اگر خیر الدین خیری کے ساتھ وہ حادثہ نہ پیش آ جاتا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ آواز دی۔

"استاد محترم......استاد محترم۔! آپ نے تو کہا تھا کہ جب بھی میں آپ کو استاد محترم کہہ کر آواز دوں گا۔ آپ پاتال میں بھی ہوں گے تو میرے پاس آ جائیں گے۔ کہاں ہیں استاد محترم۔ کہاں ہیں؟"

لیکن خیر الدین خیری کی آواز نہیں سنائی دی۔

وقت گزرتا رہا۔ نعمت علی کا سفر جاری رہا۔ پھر اس نے ٹرین کے شیشے سے باہر دیکھا۔ رات برق رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ سفر کرتے ہوئے سارا دن ہی گزر گیا تھا۔ ٹرین کے باہر کا ماحول بہت عجیب تھا۔ ہندوستان کی سرسبز و شاداب سرزمین نگاہوں کے سامنے تھی۔ لیکن اس وقت پھر اس کے دل میں وشالی کا خیال آ گیا تھا۔ اس کی آرزو ہوئی کہ وشالی اسے ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہوئی نظر آئے۔ وہ آنکھیں پھاڑتا رہا۔ لیکن اب وشالی کا وجود اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"سب ہی ساتھ چھوڑ گئے۔" اس دوران اس کے ذہن میں اور بھی بہت سے خیالات آتے رہے تھے۔ ریاست "الور" کے بارے میں اسے بتا دیا گیا تھا۔ کہ وہاں تک کا سفر کوئی بارہ گھنٹے کا ہے اسے آرام سے وقت طے کرنا ہوگا۔ بہر حال یہ بارہ گھنٹے رات کو کوئی ساڑھے تین بجے پورے ہوئے تھے۔ ساڑھے تین بجے ٹرین الور کے اسٹیشن پر رکی۔

سرخ پتھروں کے پہاڑ چاروں طرف کھڑے تھے۔ ماحول بہت خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ ان علاقوں

میں گرمی کی شدت ہوتی ہوگی۔ لیکن یہ موسم بہت خوشگوار موسم تھا۔ پہاڑیاں ٹھنڈی ہورہی تھیں۔ ”الور“ کا اسٹیشن بھی جدید ترین بنا ہوا تھا۔

ٹرین کو یہاں آدھے گھنٹے رکنا تھا۔ وہ اطمینان سے نیچے اتر گیا۔ ہاتھ میں خوبصورت سا سوٹ کیس تھا۔ جس میں اس کے لباس وغیرہ موجود تھے۔ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا وہ اسٹیشن سے باہر آگیا۔ ریاست ”الور“ کا نام اس نے بہت پہلے سنا تھا۔ راجپوتانہ کے علاقے میں یہ ریاست تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ ریاست اس قدر جدید ہوگی۔ ویسے تو ہندوستان کے تمام ہی شہر موجودہ وقت کے لحاظ سے بے مثال ہو چکے تھے۔

یہ ریاست بھی کافی خوبصورت نظر آرہی تھی۔ باہر نکلا تو ٹیکسی ڈرائیوروں نے اسے گھیر لیا۔

”سر جی! کہاں۔؟“ ”سر کہاں جانا ہے؟ سر کہاں جانا ہے؟“ آخرکار ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات چیت ہوگئی اور اس ڈرائیور نے اسے ہوٹل دیوداس پہنچا دیا۔ بس یہاں تک ہی کی بات تھی۔ دیوداس کافی اچھا ہوٹل تھا۔ اسے وکرم راج کے نام سے ایک کمرہ کرانے پر حاصل ہوگیا۔ اور وہ اپنے سازوسامان کے ساتھ اس میں مقیم ہوگیا۔ اب ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا جس طرح ایک خاص مقصد کے تحت رانی پورن وتی نے اسے یہاں بھیجا تھا۔ اس طرح وہ اپنے کردار کو یہاں پوری طرح نبھالے۔ اب اس نے دوسری بہت سی باتیں سوچنا چھوڑ دی تھیں۔ شام تک ہوٹل دیوداس کے اس بڑے کمرے میں رہا۔ جہاں اسے زندگی کی تمام آسائشیں حاصل تھیں۔ جبکہ یہاں ہر طرح کے گوشت کا استعمال باقاعدگی سے ہوتا تھا۔ ہندو ہوٹل تھا۔ زیادہ تر ہندو ہی نظر آرہے تھے۔ لیکن ڈائننگ ٹیبلوں پر ہر طرح کے کھانے موجود تھے۔

خاص روایت شکنی تھی یہاں۔ واقعی اسے پہلی بار کسی ہوٹل کا سابقہ پڑا تھا۔ سبزی، ترکاری البتہ یہاں کی کافی عمدہ تھی۔ شام کو وہ باہر نکلا ریاست کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے اس نے ایک ویٹر کا سہارا لیا۔ جس کا نام دین دیال تھا۔ دین دیال نے اسے الور کے بارے میں ساری تفصیلات بتائیں۔ اور انہی تفصیلات میں راجہ پرمیت سنگھ کے ہارس شو کا بھی تذکرہ تھا۔ یہ ہارس شو پانچ دن کے بعد ایک خاص علاقے میں ہونا تھا۔

یہ دن تو اس نے یہاں پرسکون گزارہ۔

لیکن دوسرے دن دین دیال جس سے اس نے اچھی خاصی دوستی کرلی تھی۔ کے ذریعے ایک ٹیکسی منگوائی اور اس ٹیکسی میں اس نے چھوٹے سے لیکن بہت خوبصورت شہر کی قابل دید جگہوں کا نظارہ کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو بھی اس نے پورے دن کیلئے مخصوص کرلیا تھا۔ پر ٹیکسی ڈرائیور نے اسے وہ جگہ بھی دکھائی۔ جہاں راجہ پرمیت سنگھ کا ہارس شو ہوا کرتا تھا۔

”راجہ صاحب بڑے دھرماتما ہیں۔ صاحب جی! بس یوں سمجھ لیجئے ایک انوکھے سادھو ہیں وہ...... سادھوؤں کو عام طور سے پوجا پاٹ سے فرصت نہیں ہوتی۔ وہ پوجا پاٹ بھی کرتے ہیں۔ لیکن گھوڑے ان کا جیون ہیں۔“

”وہ رہتے کہاں ہیں۔؟“

”صاحب جی! آپ پہلے کبھی الور نہیں آئے۔؟“

”نہیں...... پہلی بار آیا ہوں۔“

”میں آپ کو ان کا محل دکھاتا ہوں۔“

سچ مچ محل ہی تھا۔ ویسے پورن وتی نے اسے بتایا تھا کہ ”راجہ پرمیت سنگھ کے پرکھے سچ مچ راجہ تھے۔“ یہ محل بھی اسی دور کا تھا۔ لیکن راجہ پرمیت سنگھ نے اس پر رنگ وروغن کرا کر اسے نئے وقت کا بنا دیا تھا۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ کوئی قدیم عمارت ہے۔ بہت ہی وسیع وعریض عمارت تھی۔ راجہ اگر چاہتا تو پارس شو یہیں پر کرا سکتا تھا۔ لیکن بہرحال تمام تر معلومات کرنے کے بعد نعمت علی اس ہارس شو کا انتظار کرنے لگا۔

چار دن اس نے الور کی سیر کرتے ہوئے

گزارے تھے۔ اس دوران کوئی ایسا عمل نہیں ہوا تھا۔ جو قابل ذکر ہوتا۔ پورن وتی یا اس کی پراسرار قوتوں نے اس سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ البتہ اپنے اندر جو کیفیتیں وہ محسوس کررہا تھا۔ وہ ناقابل یقین تھیں۔

اسے بہت زیادہ اعتماد تھا کہ جب وہ ہارس شو، میں اپنے کردار کی ادائیگی کیلئے اترے گا۔ تو اس میں اسے کامیابی حاصل ہوگی۔ اور یہ اعتماد اسے پورن وتی نے ہی بخشا تھا۔ یہاں تک کہ وہ دن آگیا۔ جب اسے راجہ پرمیت سنگھ کے ہارس شو میں شرکت کرنی تھی۔ ریاست کے لوگ اس میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ جس کا اظہار اب ہورہا تھا۔ جو میدان ہارس شو کیلئے مخصوص کیا گیا تھا۔ وہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بس وسیع وعریض جگہ خالی تھی۔ جہاں گھوڑوں کے کمالات دکھائے جاتے تھے۔

کوشش کرکے نعمت علی سب سے آگے کی جگہ بیٹھ گیا۔ اس نے لوگوں سے جگہ مانگ لی تھی۔ جو اسے آسانی سے دے دی گئی تھی۔ ورنہ اس رش میں اتنی جگہ مل جانا ایک مشکل کام تھا۔ لوگ باقاعدہ میلے کی سی حیثیت سے یہاں آرہے تھے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں بڑی ماڈرن قسم کی عورتیں بھی تھیں۔ جو بے شک رنگ برنگے لباس پہنے ہوئے تھیں۔ لیکن اچھی خاصی تعلیم یافتہ نظر آرہی تھیں۔ ان کیلئے ایک الگ جگہ بنائی گئی تھی۔

پھر اناؤنسر نے لاؤڈ سپیکروں پر راجہ پرمیت سنگھ کی آمد کا اعلان کیا۔ راجہ صاحب کیلئے ایک باقاعدہ انکلوژر بنایا گیا تھا۔ نعمت علی نے دور سے راجہ صاحب کو دیکھا۔ اور ان کے ساتھ چار پانچ خواتین بھی تھیں۔ اور شاید وہ لڑکی بھی جس کا نام کرناوتی بتایا گیا تھا۔

وہ گھوڑسواری کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ راجہ کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔ اور اس کے بارے میں پتہ چل چکا تھا۔ کہ یہ راجہ پرمیت سنگھ کی بہن ہے۔ کافی خوبصورت لڑکی تھی۔ گہرے گہرے سیاہ بال سبک نقوش چہرے پر جو تمکنت چھائی ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا۔ کہ کوئی شہزادی ہی ہے۔ اسے دیکھ کر نعمت علی کو اپنی شہزادی یاد آگئی۔ جو بیچاری صرف ایک روح تھی۔ اور جس کا حصول ناممکنات میں سے تھا۔ پھر مزید اعلانات ہوتے رہے۔ بڑی باقاعدگی تھی۔ اس کے بعد دو بندے بہت ہی خوبصورت گھوڑوں کو پکڑے ہوئے داخل ہوئے اور اس گھوڑے کا تعارف کرایا جانے لگا۔

گھوڑے کی ہسٹری بتائی جارہی تھی۔ جس نے بمبئی میں دو ڈربی ریس جیتی تھیں۔ ان کے بارے میں یہ بتایا جارہا تھا کہ یہ گھوڑے ڈربی کیا بلکہ دنیا بھر کی کسی بھی ریس میں دوڑنے کیلئے تیار ہیں۔ ایک ایک کرکے گھوڑے لائے جاتے رہے۔ پھر گہرے براؤن رنگ کا ایک انتہائی خوبصورت گھوڑا۔ جسے چار بندے پکڑے ہوئے تھے۔ اور جس کے تیور خراب تھے۔ لایا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی کرناوتی، اپنی جگہ سے اٹھ کر سیڑھیاں طے کرکے نیچے آنے لگی۔

غالباً یہ ہی وہ گھوڑا تھا۔ جسے رام کرنے کے لئے پورن وتی نے نعمت علی کو تیار کیا تھا۔ گھوڑے کی شان واقعی دیکھنے کے قابل تھی۔ چار آدمی اسے پکڑے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے کافی لمبی لمبی رسیاں باندھی ہوئی تھیں تاکہ انہیں گھوڑے کے قریب نہ آنا پڑے۔ گھوڑا کسی بھی طرح ان کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ اناؤنسر نے لاؤڈ اسپیکر پر گھوڑے کا نام شیر دل بتایا۔ اس نے کہا۔ ”شیر دل شہزادی کرناوتی کا گھوڑا ہے۔ اور اس نے آج تک اپنی پیٹھ پر کسی کو سواری نہیں کرنے دی۔ کوئی ماں کا لال کرناوتی کے علاوہ ایسا نہیں ہے۔ پورے راجپوتانہ میں جو شیر دل کی پیٹھ پر سواری کرسکے۔ شیر دل نے اب تک بارہ ریسیں جیتی ہیں۔ اور وہ دنیا کے کئی ملکوں میں دوڑنے کے لئے جاچکا ہے۔“ عقب سے ایک خوب صورت ٹرالی لائی گئی جس پر ایوارڈ سجے ہوئے تھے۔ اناؤنسر نے بتایا کہ ”یہ وہ ایوارڈ ہیں۔ جو شیر دل کو حاصل ہوئے ہیں۔“ بے شمار تعریفیں کرنے کے بعد کرناوتی قریب آگئی۔ اس نے خداموں سے کہا۔ ”شیر دل کی یہ رسیں، کھول دی جائیں۔“ شیر دل کے قریب آکر اس نے اس کے گلے میں بندھی ہوئی رسی پر

ہاتھ ڈالا اور خاص ذریعے سے پھنسائی ہوئی راسیں، کھل گئیں۔ خادموں نے رسیاں کھینچ دیں۔ شیر دل جو اچھل کود کر رہا تھا۔ وہ ایکدم ختم ہوگئی۔

یہ کرناوتی کی جسمانی قوت سے ممکن نہیں تھا۔ یقینی طور پر کوئی ایسا عمل کیا گیا تھا۔ جس سے شیر دل کرناوتی کے قابو میں آ گیا تھا۔ ورنہ کرناوتی معصوم سی نرم و نازک سی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ البتہ اس کے انداز میں بہت ہی فخر و غرور تھا۔ ظاہر ہے جس حیثیت کی مالک تھی اس میں اپنے آپ کو اس غرور سے بچانا بہت مشکل کام تھا۔ اس نے گھوڑے کی گردن میں بندھی ہوئی رسی پکڑ لی تھی۔ اور پھر وہ گھوڑے کو پورے پنڈال میں گشت کرانے لگی۔ ہر طرف سے تالیاں ابھر رہی تھیں۔ اور کرناوتی کو داد و تحسین دی جا رہی تھی۔ ایسے سرکش گھوڑے کو جسے چار آدمی بھی نہ سنبھال پا رہے تھے۔ اور وحشت سے ان کا برا حال تھا۔ کرناوتی اسے لے کر گھماتی پھر رہی تھی۔ اناؤنسر باقاعدہ اعلان کر رہا تھا۔

''اور یہ اعلان ہر ماہ کیا جاتا ہے۔ کہ اگر کوئی شیر دل کی پیٹھ پر سواری کر سکے تو اسے بیس لاکھ روپے اور بہت بڑا اعزاز دیا جائے گا۔ راجہ صاحب خود اسے اپنے ہاتھ سے انعام دیں گے۔ یہ بہت بڑا اعزاز جیتنے کیلئے جو بھی چاہے اس کھیل میں شرکت کر سکتا ہے۔'' اعلان بار بار دہرایا جاتا رہا۔

اور اب نعمت علی کی کارکردگی کا وقت آ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔ لوگوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ چاروں طرف سے آوازیں ابھرنے لگیں۔ لوگ شاید نعمت علی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ نعمت علی نے ایک مائیک بردار سے مائیک لے کر اس سے کہا۔

''میں اس گھوڑے کو آسانی سے قابو میں کر سکتا ہوں۔'' کرناوتی رک گئی۔ اس نے کینہ توز نگاہوں سے نعمت علی کو دیکھا۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اس کی آنکھوں کا جلال بھی قابل دید تھا۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نعمت علی کے پاس آ گئی۔ اور پھر نعمت علی سے اپنی خوبصورت آواز میں بولی۔

''تم کون ہو نوجوان کیا نام ہے تمہارا؟''

''میرا نام وکرم راج ہے۔''

''کہاں سے آئے ہو؟'' کرناوتی نے پوچھا۔

''آوارہ گرد ہوں۔ کوئی شہر نہیں ہے اب میرا۔ گھومتا پھرتا ہوں۔ پچھلے دنوں دلی سے آیا ہوں یہاں۔''

''کسی کام سے...... کسی کے مہمان ہو؟''

''ہاں...... ریاست الور کا مہمان ہوں۔ اور کسی کا مہمان نہیں ہوں۔''

''ہم مہمانوں کو نقصان نہیں پہنچنے دیتے۔ اگر تم اسی ریاست کے مہمان ہو۔ تو سمجھ لو ہمارے مہمان ہو۔ تمہیں ایسا کام کرنے سے روکا نہیں جا رہا۔ صرف چیتاونی دی جا رہی ہے۔ بہتر ہے شیر دل سے نہ کھیلو۔ یہ کسی کو معاف نہیں کرتا۔ بات صرف اتنی نہیں ہے کہ تمہیں اپنی پیٹھ سے گرا دے۔ بلکہ تمہیں اپنے سموں سے کچل دے گا۔ جب تک تم زندہ رہو گے یہ تمہیں کچلتا رہے گا۔ یہ اس کی فطرت ہے۔''

''اگر آپ ڈر رہی ہیں کہ میں آپ کے شیر دل کو کیدڑ بنا دوں گا تو یہ دوسری بات ہے۔ ورنہ اس طرح کے گھوڑے میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔'' نعمت علی نے کہا۔ اور کرناوتی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے اس کی راسیں اب تمہارے ہاتھ میں۔'' کرناوتی نے کہا۔ نعمت علی کو سچ مچ اس وقت ڈر لگ رہا تھا۔ خیر الدین خیری ہوتا تو وہ اس طرح کے دس گھوڑوں کی پرواہ نہ کرتا۔ لیکن پورن وتی پر پورا بھروسہ تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کبھی زندگی میں اس کا واسطہ گھوڑے سواری سے نہیں پڑا تھا۔ اور آج وہ امتحان میں پڑ گیا تھا۔

کرناوتی جیسے ہی چند قدم پیچھے ہٹی۔ گھوڑے نے دولتیاں چلائیں۔ اور رخ بدل کر نعمت علی کو لاتیں مارنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت نعمت علی کو بھرپور طریقے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اس میں اس کی اپنی سوچ اور عقل کا دخل نہیں ہے کوئی پراسرار قوت اسے اس مہارت سے گھوڑے سے بچانے کی طاقت بخش رہی تھی۔

وہ گھوڑے کی پشت سے پیچھے ہٹ گیا۔

اور پلٹ کر سامنے آیا۔ گھوڑا بہت زیادہ اودھم مچا رہا تھا۔ کبھی وہ سیدھا کھڑا ہو جاتا۔ کبھی پاؤں کے بل پر۔ جھک کر دولتیاں مارتا۔ لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔ نعمت علی اس کی راس مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے اپنا فاصلہ کم کرتا جا رہا تھا۔ وہ اب اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھ گھوڑے کے قریب پہنچ گئے۔ گھوڑے نے منہ کھول کر اسے کاٹنے کی کوشش کی لیکن اچانک ہی نعمت علی کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ اس نے گھوڑے کی راس کو چہرے کے قریب سے موڑا اور گھوڑے کی گردن مڑتی چلی گئی۔

لوگ ایک دم خاموش ہوگئے تھے۔ گھوڑے کا منہ اوپر کی جانب اٹھ گیا۔ نعمت علی نے اسے ایڑ پر موڑا اور گھوڑا بری طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کی گردن ٹیڑھی ہوگئی تھی۔ پھر اچانک ہی وہ زمین پر گر پڑا۔ لوگ اپنی جگہ سے اٹھ اٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ دور بیٹھا ہوا راجہ پرمیت سنگھ حیرت سے آنکھیں پھاڑے نعمت علی اور گھوڑے کی کشاکش دیکھ رہا تھا۔

گھوڑا جیسے ہی نیچے گرا نعمت علی اچھل کر۔ اس کے بائیں سمت آ گیا۔ اس کے بعد اس نے راس ڈھیلی کی تو گھوڑا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن نعمت علی اب اس پوزیشن میں تھا۔ کہ گھوڑا اٹھا تو وہ اس کی پشت پر ہو۔ اس نے اسی طرح گھوڑے کی کمر پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ اور وہی ہوا۔ راس ڈھیلی ہوئی تو گھوڑا اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ لیکن نعمت علی اس کی پشت پر تھا۔ ایک شور برپا ہوگیا تھا۔ گھوڑا اب بھی اچھل کود کر رہا تھا لیکن یوں لگتا تھا۔ جیسے نعمت علی اس کی پشت کا ایک حصہ ہو۔ اس نے گھوڑے کی راس مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی۔

اس کے ہوش اڑے جا رہے تھے۔ لگ یوں رہا تھا۔ جیسے ابھی گھوڑے کی گردن پر سے ہوتا ہوا اس کے سامنے آ گرے گا۔ اور گھوڑا اسے کچل ڈالے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ گھوڑا پورے پنڈال کا چکر لگانے لگا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کر لی۔ لیکن نعمت علی کو اپنی جگہ سے اکھاڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور یہ جانور کی خاصیت ہوتی ہے۔ کہ جب وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ تو ہار مان کر اپنے سوار کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔

کئی چکر لگانے کے بعد گھوڑا آخر کار رک گیا۔

تماشائیوں نے تالیاں بجا بجا کر پنڈال سر پہ اٹھا لیا تھا۔ لیکن کرناوتی ایک طرف کھڑی ہوئی عجیب سی نگاہوں سے گھوڑے کو دیکھ رہی تھی۔ گھوڑا اب بالکل سیدھا ہوگیا تھا۔ اور نعمت علی آرام سے اس کی پشت پر بیٹھا ہوا تھا۔ صحیح معنوں میں اس کے ہوش و حواس رخصت تھے۔ اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ جیسے ہی وہ گھوڑے کی پشت سے اترے گا۔ گھوڑا پھر اسے اپنی لاتوں پر رکھ لے گا۔

لیکن بہرحال اترنا تھا۔ تماشائی مسلسل تالیاں بجا رہے تھے۔ اناؤنسر نے اعلان کیا۔

''جے ہنومان، جے بھگوتی، جے درگا دیوی! یہ پہلا جوان ہے۔ جس نے شیر دل کو قابو میں کر لیا ہے اور اب شیر دل کے اندر کوئی ایسی بات نہیں رہی جس پر راجکماری کرناوتی۔ اپنی اجارہ داری دکھا سکیں۔'' نعمت علی گھوڑے سے نیچے اتر گیا۔ راس اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن وہ کرناوتی کا عمل نہیں دیکھ سکا تھا۔

کرناوتی کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ گھوڑے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اور پھر اس نے نعمت علی سے کہا۔ ''وہ گھوڑے کی راس اس کے ہاتھ میں دے دے۔'' نعمت علی گردن خم کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

اور اب وہ واپس پبلک کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن اچانک ہی دھائیں، دھائیں دھائیں دھائیں کی چار آوازیں مسلسل ابھریں۔

اور گھوڑے کے جسم کے مختلف حصوں سے خون کی دھاریں پھوٹنے لگیں۔ وہ بری طرح اچھل کر ادھر ادھر بھاگا۔ اور پبلک میں بھگدڑ مچ گئی۔ لیکن وہ پبلک تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد اس نے قلا بازی کھائی۔ اور نیچے گر پڑا۔ جبکہ کرناوتی۔ اپنی پستول کی نال کو پھونک مار رہی تھی۔

پھر اس نے آگے بڑھ کر مزید تین فائر گھوڑے پر کیئے۔ اور گھوڑے کا جسم پھڑپھڑا کر سرد ہو گیا۔ مجمع میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ راجہ پرمیت سنگھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے باڈی گارڈز کو کرناوتی کی طرف بھیجا اور وہ ڈرتے ڈرتے کرناوتی کے پاس پہنچ گئے۔

"راجکماری جی۔ آپکو راجہ صاحب بلا رہے ہیں۔"

"ہاں...... آرہی ہوں۔" کرناوتی نے یہ کہہ کر پستول کی طرف دیکھا اور پھر اسے گھوڑے پر دے مارا۔ اور اس کے بعد آہستہ آہستہ چلتی ہوئی راجہ پرمیت سنگھ کی جانب چل پڑی نعمت علی پبلک کے پاس پہنچ چکا تھا۔

لیکن راجہ پرمیت سنگھ نے شاید کچھ اور لوگوں کو اشارہ کیا تھا۔ چار افراد نعمت علی کے پاس پہنچ گئے۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں مہاراج؟"

"کیوں۔؟" کیا مجھے گرفتار کر لیا جائے گا۔ یا مجھے بھی گولی مارنے کا ارادہ ہے۔"

"راجہ پرمیت سنگھ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آیئے۔" ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں کہا۔ اور نعمت علی ان کے ساتھ چل پڑا۔ سب کچھ اسی انداز میں ہو رہا تھا۔ جس کی پیش گوئی پورن وتی نے کی تھی۔ مجمع منتشر ہو چکا تھا۔ ہارس شو مکمل ہو گیا تھا۔ اور آج شاید برسوں کے بعد اس میں ایک المناک حادثہ ہوا تھا۔ کرناوتی کا پسندیدہ گھوڑا مارا گیا تھا۔ کرناوتی کی طبیعت کا اندازہ اس بات سے ہوتا تھا۔ کہ اس نے گھوڑے کو ایک منٹ کی زندگی نہیں دی تھی۔ گھوڑے کی لاش اب بھی گراؤنڈ میں پڑی ہوئی تھی۔ کرناوتی کہاں گئی تھی۔

اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ نعمت علی کا خیال تھا کہ یہ لوگ جو اسے لینے کے لئے آئے ہیں۔ اسے لے کر راجہ پرمیت سنگھ کے پاس پہنچیں گے۔ لیکن وہ چاروں آدمی اسے لئے ہوئے ایک گاڑی کے پاس پہنچ گئے گاڑی کا دروازہ کھولا گیا اور اسے اندر بیٹھنے کیلئے کہا گیا۔

"لیکن...... میں......" نعمت علی نے کہنا چاہا تو ایک بڑی بڑی مونچھوں والے شخص نے خونخوار نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکر کرو۔ وہ گولیاں گھوڑے کے بدن میں اتر گئیں ورنہ انہیں تمہارے بدن میں اترنا چاہئے تھا۔ تم نے جو جرأت کی ہے۔ اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔"

"ٹھیک اس کا مطلب ہے کہ پنڈال میں تمہارے آدمی جو بکواس کر رہے تھے۔ وہ صرف ایک جھوٹ اور فریب تھا۔" نعمت علی نے ترکی بہ ترکی کہا۔ اور مونچھوں والے شخص کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم۔"

"تم نے کہا تھا کہ جو اس گھوڑے کو رام کرے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ یہی انعام دیا جانا تھا۔ راجہ پرمیت سنگھ کے وعدے یہ۔"

"اگر تم نے زیادہ بکواس کی تو میں اسی وقت تمہیں زندہ دفن کر دوں گا۔"

"تم...... یا تمہارے یہ سارے ساتھی۔" نعمت علی کو بھی غصہ آ گیا۔

"کیا مطلب؟"

"تم نے دیکھا کہ تمہارے گھوڑے کا کیا حال کیا اس سے برا حال میں تمہارا کر سکتا ہوں۔ تمہاری مونچھیں پکڑ کر...... اور اگر کوئی غلط فہمی ہے تمہیں تو پھر آؤ...... گاڑی سے نیچے اترو۔"

"مجھے تو تم پاگل ہی لگتے ہو۔ خاموش ہو کر بیٹھو۔" مونچھوں والے نے کسی قدر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس دوران گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔

(جاری ہے)

شہر وحشت

ایم اے راحت

قسط نمبر: 15

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرہول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دھشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکرائو، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

نعمت علی کھن چکر بن گیا تھا۔ ایک کے بعد ایک مشکل پیش آرہی تھی۔ لیکن صبر واستقامت سے کام لے رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ کہ پاکستان واپس جائے گا تو خیر الدین خیری کو آزادی دلوا کر ورنہ سرزمین ہندوستان میں ہی اپنی جان دے دے گا۔

راجہ پرمیت سنگھ کے آدمی اسے راجہ کے محل میں لے آئے۔ محل، محل ہی تھا۔ اسے عزت واحترام کے ساتھ مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ رات کو راجہ صاحب نے اسے دیوان خاص میں طلب کیا۔ پھر پر اخلاق لہجے میں بولے۔

''کیا نام ہے تمہارا نوجوان۔؟''

''وکرم راج''

''الور کے رہنے والے ہو۔''

''نہیں دہلی سے آیا ہوں۔''

''گھوڑوں کے رسیا ہو''

''جی۔''

''اندازہ ہوگیا۔ ہمارے پاس مہمان رہو۔ ہم تین دن کے لئے، جوالا پور جارہے ہیں، واپس آکر تمہیں انعام دیں گے۔ تم نے سب سے سرکش گھوڑے کو قابو میں کیا ہے بڑی بات ہے۔ آرام سے رہو۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ نعمت علی کو واپس کردیا گیا۔

اس کی خدمت کیلئے جس شخص کو متعین کیا گیا تھا وہ ایک دبلا پتلا عجیب سا آدمی تھا۔

رات کا کھانا لے کر آیا تو اس میں گوشت تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میں ہندو ہوں۔ گوشت نہیں کھاتا۔'' نعمت علی نے کہا۔ تو وہ مسکرا دیا۔

''آپ مسلمان ہیں جناب۔ ان لوگوں کو پتہ ہو نہ ہو۔ میں جانتا ہوں۔'' اس نے پراسرار انداز میں کہا۔

''تم کیسے جانتے ہو۔؟''

''اس لئے کہ میں بھی مسلمان ہوں۔'' وہ بولا اور نعمت علی اسے گھورنے لگا۔ ''آپ کھانا کھائیں یہ حلال گوشت ہے۔ میں نے کلمہ پڑھ کر ذبح کیا ہے۔''

''کلمہ پڑھو۔'' نعمت علی نے کہا اور اس نے بسم اللہ پڑھ کر کلمہ طیبہ پڑھ لیا۔ پھر بولا۔

''رات کو میں آپ کو اپنے بارے میں بتاؤں گا۔ ابھی چلتا ہوں۔'' نعمت علی سخت تجسس میں ڈوب گیا۔ رات کو اس نے اپنی کہانی سنائی۔

''میرا نام علی خان ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر قلی کا کام کرتا تھا۔ اچھے خاصے بدن کا مالک تھا۔ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں۔ لیکن میرے دل میں ایک خواہش تھی۔

نہیں سے دولت کماؤ مسافر گاڑیوں سے اترتے تھے۔ تو میں ان کا سامان لے کر باہر جاتا تھا۔ اس وقت بھی میرے دل میں برائی ہی رہتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ مجھے کوئی ایسا بوڑھا مسافر ملے جس کے پاس نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ ہو۔ وہ بیمار ہو۔ بیگ مجھے دے اور کہے کہ فلاں جگہ پہنچا دو۔ اور پھر راستے میں مرجائے۔

کبھی میں سوچتا کہ ریل کے کسی ڈبے میں سیٹ کے نیچے زیورات سے بھرا ہوا صندوق مل جائے۔ بس یہی میرے دل میں خواہش رہا کرتی تھی ایک دن صبح کا وقت تھا۔ ٹرین آ کر رکی تھی۔ ایک بیگم صاحبہ مجھے ملیں۔ ان کے پاس ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس اور معمولی سا سامان تھا۔ مجھے لے کر باہر آئیں اور پھر انہوں نے کہا۔

''قلی! میرے ساتھ چلے گا۔؟''

''جی، بیگم صاحبہ! میں سمجھا نہیں۔''

''یہ سامان لے کر میرے ساتھ چلے گا۔؟''

''کہاں؟''

''جہاں میں لے جاؤں گی۔''

''مگر ہماری تو یہاں ڈیوٹی ہے۔ جی۔''

''یہ ڈیوٹی تو کیوں کر رہا ہے۔؟''

''ڈیوٹی، تو ڈیوٹی ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ جی!''

''وہ تو ہوتی ہے۔ مگر پیسوں کے لئے کام کرتا ہے نا تو؟ پیٹ کے لئے کرتا ہے نا یہ کام۔؟''

''ہاں جی۔؟''

''اگر میں تجھے نوٹوں کے اتنے ڈھیر دے دوں کہ تجھے ساری زندگی کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ تو کیا تجھے یہ بات پسند نہیں آئے گی؟''

''کیوں پسند نہیں آئے گی۔ بیگم صاحبہ! بھلا کس انسان کی خواہش نہیں ہوتی کہ اسے بڑی سے بڑی رقم مل جائے۔''

''تو پھر چل میرے ساتھ۔''

''میں نے ایک لمحہ کیلئے سوچا کہ بیگم صاحبہ کوئی سرپھری معلوم ہوتی ہیں، دے رہی ہیں تو کیوں نہ لے لیا جائے۔'' چنانچہ میں نے ان سے وعدہ کرلیا۔ ہم باہر نکل آئے۔ باہر آ کر ایک کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ بس میں کیا بتاؤں۔ کیا لگ رہا تھا مجھے کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ یہ کار بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ بیٹھ کر ہی انسان کو مزہ آتا ہے۔ ہم سفر کرتے رہے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ فاصلہ کتنا طے ہوگیا ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ ''اگر بیگم صاحبہ! نے واقعی ایک بڑی رقم دے دی تو میری آئندہ زندگی کیسی گزرے گی۔'' جب میں ہوش میں آیا تو میں نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔

کار جن کھنڈرات میں داخل ہو رہی تھی وہ تو بہت ہی پرانے تھے۔ اور میں اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ اندازہ مجھے اچھی طرح ہوگیا تھا کہ بستی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اور یہ کھنڈرات بستی سے بہت دور ہیں لیکن بہرحال بڑے لوگوں کی باتیں بڑی ہی ہوتی ہیں۔ جہاں ان کا دل چاہے رہیں کون انہیں روک سکتا ہے۔ کار کھنڈرات میں داخل ہوگئی اور یہاں پہنچنے کے بعد میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ سامنے کے حصے بے شک ٹوٹے ہوئے تھے۔ لیکن اندر جو کالی کالی عمارت نظر آ رہی تھیں۔ وہ تو بالکل مضبوط تھی۔ میں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن حیرانی سے اس راستے کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ کار ایک ایسے دروازے کے سامنے آ کر رک گئی۔ جہاں لکڑی کا ایک بہت بڑا پھاٹک لگا ہوا تھا۔ اور اس میں پیتل کی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ پھاٹک کے نیچے ایک کھڑکی سی تھی۔ اور جب بیگم صاحبہ نے مجھے نیچے اترنے کے لئے کہا۔ تو میں حیران حیران سا نیچے اتر آیا اور سامان اٹھا کر اندر چل پڑا۔ وہاں بڑی ٹھنڈک تھی۔ زمین صاف شفاف راستہ ایسا کہ دیکھیں تو دل خوش ہو جائے لیکن مجھے بہت عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اندر کا ماحول واقعی بڑا صاف ستھرا تھا۔ لیکن مجھے یہ حیرت ہو رہی تھی کہ یہ اتنی اچھی بیگم صاحبہ یہاں کیسے رہتی ہیں۔ یہاں تو کوئی اور نظر بھی نہیں آ رہا۔ بالکل خاموشی اور سنسان سی کیفیت یہاں پھیلی ہوئی تھی۔

آخر کار بیگم صاحبہ! ایک دروازے کے پاس رکیں اور انہوں نے مجھ سے کہا۔

''آؤ......! سامان لے کر اندر آ جاؤ۔'' یہ کہہ کر انہوں نے دروازہ کھولا اور آگے بڑھ گئیں۔ اس کے بعد جو راستہ طے کرنا پڑا۔ وہ ایسی جگہ سے گزرتا تھا جو نیچے ڈھلان میں تھا۔ میں نے حیرت سے بیگم صاحبہ کو دیکھا۔ اور بولا۔

''کتنی دور اور جانا ہوگا۔ جی۔؟''

''کیا سامان بہت وزنی ہے۔ چلا آ میرے ساتھ۔'' بیگم صاحبہ نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ اور میں خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ ڈھلان تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ لیکن نجانے کیوں اب میرے حواس خراب ہوتے جا رہے تھے۔ یہ کیسا گھر ہے؟ کیا بڑے لوگ ایسے گھروں میں رہتے ہیں۔ یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کسی ایسے کمرے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہاں عجیب وغریب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن ایک دیوار کے ساتھ کچھ نظر آیا۔ اسے دیکھ کر میری روح فنا ہوگئی۔ یہ انسانی ڈھانچے تھے۔ چمکدار انسانی ڈھانچے جو دیوار کے ساتھ اس طرح لگے ہوئے کھڑے تھے۔ جیسے انسان ہوں۔ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ کیسی جگہ ہے بیگم صاحبہ؟''

''بکواس مت کر! ادھر آ......'' اب بیگم صاحبہ کا لہجہ بدل گیا تھا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے جی۔''

''تو پھر مر جا۔''

''وہ جی مگر...... یہ جگہ ہی عجیب سی ہے۔''

''سن! تجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔ دولت چاہئے یا نہیں۔؟''

''نہیں جی! ایسی دولت نہیں چاہئے۔ جو دینا ہو۔ دے دو مجھے، آگے نہیں جاؤں گا۔''

''بکواس کر رہا ہے۔''

''یہ...... یہ کیا ہے جی! یہ تو انسانی ڈھانچے ہیں۔''

''ہاں ہیں تو پھر......؟''

''مم۔ مگر یہ......''

''دیکھ میری بات سن! میں تجھے کچھ دینا چاہتی ہوں۔ چل ادھر آ! اس پتھر پر بیٹھ جا تجھے جو کچھ دینا ہے۔ نکال کر دے رہی ہوں۔''

''بیٹھوں گا جی! کھڑا ہوا ہوں۔ جو کچھ دینا ہے۔ دے دو۔'' میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''بیگم صاحبہ مجھے گھورنے لگیں۔ پھر انہوں نے کہا۔ نام کیا ہے۔ تیرا؟''

''علی خان۔''

''میری بات سن۔ اگر تو نے میری باتیں مان لیں۔ تو یوں سمجھ لے کہ تجھے زندگی کی ایسی شاندار چیزیں ملیں گی کہ تو حیران رہ جائے گا۔''

''دیکھو۔ بیگم صاحبہ! میں نجانے کیوں آپ کے دھوکے میں آ گیا۔ ہمیں تو بس اتنا چاہئے کہ ہماری زندگی آرام سے گزر سکے۔''

''جھوٹ بولتا ہے تو۔ ساری زندگی تو دوسروں کے مال پر نگاہیں جمائے رہا ہے۔ تو نے دل میں سوچا کہ کوئی نوٹوں سے بھرا ہوا صندوق بھول کر چلا جائے۔ تو نے دل میں سوچا ہے کہ مجھے ریل کی سیٹوں کے نیچے سے زیورات سے بھرا ہوا کوئی صندوق مل جائے۔ تو ہمیشہ امیر بننے کے خواب دیکھتا رہا ہے۔ اور اب میرے سامنے جھوٹ بول رہا ہے۔''

''میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔'' میں نے پھٹی آواز میں بولا۔ ''بیگم صاحبہ! آپ کو یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہیں۔؟''

''مجھے جو کچھ معلوم ہے۔ تیرے بارے میں وہ غلط نہیں ہے۔ اور تو ایک بات سن! بس میں تجھے کچھ دینا چاہتی ہوں۔ کیا تو یہ نہیں جانتا کہ کچھ حاصل کرنے کے لئے محنت کرنا پڑتی ہے۔؟''

''یہ تو ساری باتیں ٹھیک ہیں بیگم صاحبہ! مگر آپ کون ہو؟ یہ جگہ بڑی عجیب ہے ہمیں بس اس سے ڈر لگ رہا ہے۔''

"اس پتھر پر بیٹھ جا! میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتی ہوں۔" انہوں نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئیں۔ میں تو حیرت سے پریشان کھڑا ہوا تھا۔ اور یہ سوچ رہا تھا کہ میرے دل کی بات بیگم صاحبہ کو کیسے معلوم ہوئی؟ بہت بڑا دماغ نہیں تھا۔

بہر حال، وہ تو واپس چلی گئیں اور میں پریشانی کے عالم میں اس پتھر پر جا بیٹھا۔ میرے دل میں بہت برے برے خیالات آرہے تھے۔ لگ رہا تھا۔ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ بہر حال ایک بار پھر میری نظر ڈھانچوں پر پڑی۔ تو خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ساری باتیں عجیب و غریب تھیں۔ آخر یہ ڈھانچے یہاں کیوں رکھے ہوئے ہیں؟ پتہ نہیں۔ بیگم صاحبہ کوئی جادوگرنی ہیں۔"

"پانچ منٹ، دس منٹ۔ اور پھر ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اب میری حالت بہت بری ہورہی تھی۔ چنانچہ میں اپنی جگہ سے اٹھا...... اور دروازے کی طرف بھاگا۔ اب کچھ ملے یا نہ ملے یہاں سے نکل بھاگنا بہت ضروری ہے۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ کوئی مصیبت میرے سر پر آن پڑی ہے۔ میں آگے بڑھ کر اس جگہ پہنچا جہاں سے گزر کر یہاں تک آیا تھا۔ لیکن شاید غلط جگہ آ گیا تھا۔

یہاں تو صرف ایک دیوار تھی۔ اور دیوار میں کوئی دروازہ نہیں تھا مگر بیگم صاحبہ تو ادھر سے ہی گئی ہیں۔ مجھے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔؟ میں نے سوچا اور دیوار ٹٹول، ٹٹول کر دروازہ تلاش کرنے لگا۔ اب تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ حلق پھاڑ کر چیخنے لگوں۔

کوئی دروازہ یہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "بیگم صاحبہ! مجھے نکالو۔ میں مر جاؤں گا۔ بیگم صاحبہ! مجھے نکالو۔ یہاں سے۔ تمہیں اللہ کا واسطہ۔"

اچانک ہی مجھے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز پیچھے سے آئی تھی۔ میں چونک کر پلٹا۔ میں نے سوچا شاید کوئی دروازہ ادھر ہے۔ لیکن پھر یہ دیکھ کر مجھ پر غشی طاری ہونے لگی کہ ہنسنے والا ان ڈھانچوں میں سے ایک تھا۔ وہ منہ کھول کھول کر ہنس رہا تھا۔ کسی ڈھانچے کو میں نے پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اور میں خوف سے دیوار سے لگ گیا۔ ڈھانچہ ہنس رہا تھا۔

پھر دوسرے ڈھانچے نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ اور اس کے بعد سارے ڈھانچے ہنسنے لگے۔ ان کے ہنسنے کی آوازیں بڑے ہال نما کمرے سے ٹکرا ٹکرا کر ابھر رہی تھیں۔ اور خوف سے میرا خون خشک ہورہا تھا۔ میں نے حلق پھاڑتے ہوئے کہا۔

"جانے دو مجھے۔"

ڈھانچے اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ پھر اچانک ہی خاموش ہوگئے۔ میں اپنی جگہ سمٹ کر کھڑا رہا۔ اچانک ہی مجھے محسوس ہوا جیسے کمرے میں دھند سی ہورہی ہے۔ سفید سفید...... دھند...... آہستہ آہستہ دھند پورے کمرے میں پھیل گئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میرا دم گھٹ رہا ہو۔ میں نے اپنے ہاتھ گردن پر رکھ لئے۔ میری آنکھیں حلقوں سے باہر نکلنے لگیں۔ پتہ نہیں کیا ہورہا تھا۔ آہستہ آہستہ میرے پیروں کی جان نکلنے لگی۔ اور اس کے بعد میں زمین پر بیٹھنے لگا۔ اور پھر مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔

"پھر نجانے کب مجھے ہوش آیا تھا۔ میرا پورا بدن اس طرح اینٹھ رہا تھا۔ جیسے شدید سردی میں پڑا رہا ہو۔ کافی دیر تک میں اسی عالم میں پڑا رہا۔ پھر میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر بدن ایک طرف کو لڑھک گیا۔ میرا سارا بدن اکڑ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے شروع کر دیئے۔ اور تھوڑی دیر بعد میری کیفیت بحال ہوگئی۔ پھر میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اب میں اس جگہ نہیں تھا۔ جہاں وہ خوفناک ڈھانچے موجود تھے۔ بلکہ یہ کوئی دوسری ہی جگہ تھی۔ بڑا اچھا کمرہ تھا۔ چھت اونچی تھی۔ کمرے کی دیواروں میں لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ سامنے کی سمت ایک دروازہ بھی نظر آرہا تھا۔

میرے ذہن میں گزرے ہوئے واقعات گھومنے لگے۔ میں دل ہی دل میں اپنے آپ پر لعنت

بھیجنے لگا۔ سچی بات یہ ہے کہ دولت کا لالچ انسان کو پاگل بنا دیتا ہے۔ کاش میں صرف ایک قلی رہتا۔ عزت سے جو روٹی ملتی۔ اسی پر گزارہ کرتا۔ وہ روٹی جو عزت اور محنت سے کمائی جائے۔ سب سے اچھی روٹی ہوتی ہے۔ کم از کم انسان اس کے حصول کے لئے کسی مصیبت کا شکار نہیں ہوتا۔ جبکہ دولت کا لالچ انسان کو ہمیشہ ذلیل و خوار کرتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی زندگی میں مشکل بھی آن پڑتی ہے۔ بہت دیر تک میں انہی خیالات میں ڈوبا رہا۔ اپنے ساتھی قلی یاد آئے۔ نجانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ وہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ ہمارا ٹھیکیدار جو ہمیں تنخواہ دیا کرتا تھا۔ اس کے پاس ہمیں حاضری لگانا پڑتی تھی۔ بڑا ہی سخت مزاج تھا۔ کوئی بغیر کہے سنے غائب ہو جاتا تو بس ٹھیکیدار مصیبت میں ڈال دیتا تھا۔ اتنی بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کرتا کہ بندے کا دم نکل کر رہ جائے۔ اب میں کیا کروں۔؟"

میں نے دل میں سوچا...... بہر حال اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور اس دروازے کی طرف چلا جو مجھے نظر آرہا تھا، یہ کسی اچھے درخت کی لکڑی کا دروازہ تھا۔ جس پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ میں نے اسے خوب ہلایا جلایا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ دروازہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہورہا تھا۔ اس دروازے کے علاوہ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں سے باہر نکلا جاسکے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس بات کا احساس ہوگیا کہ میں یہاں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا ہوں۔ بہر حال یہ سارا معاملہ بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔

اچانک ہی میری نگاہیں دیواروں پر پڑیں۔ دیواروں پر کچھ تصویریں آویزاں نظر آئیں۔ یہ سب عجیب و غریب تصویریں تھیں۔ اور مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ زندہ ہوں۔ بھیانک تصویریں جو دیوار پر لگی ہوئی تھیں۔ کسی ایسے رنگ سے بنائی گئی تھیں۔ جو چمکتا تھا۔ لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ جو تصویر میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اور چند لمحوں کے بعد جب میں نے اس پر غور کیا تو مجھے وہ آنکھیں بند محسوس ہوئیں۔ میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تصویروں کو دیکھا۔ اور دوسرے لمحے میرے سارے جسم میں دہشت کی شدید لہر دوڑ گئی۔ میں نے صاف دیکھا تھا کہ وہ تصویریں ایک دوسرے کو اشارے کررہی تھیں۔ اور مسکرا رہی تھیں۔ ان کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے زندہ افراد ہوں۔ اور ایک دوسرے سے باقاعدگی سے متوجہ ہورہی ہو۔ دیواروں پر سرسراہٹیں بھی محسوس ہورہی تھیں۔

"اوہ...... میرے خدا۔" میرا دل خوف و دہشت سے بند ہوتا جارہا تھا۔

زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک ہی دروازے پر آہٹ سی ہوئی اس کے بعد دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ چار افراد اپنے کندھے پر ایک تابوت اٹھائے اندر آئے۔ میں خوف و دہشت سے ایک طرف کھڑا آنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کے لمبے لبادے اوڑھے ہوئے تھے۔ اور ان کے چہرے ان لبادوں میں ڈھکے ہوئے تھے۔ سارے کا سارا ماحول سنسنی خیز تھا۔ میرے دل میں صرف ایک ہی احساس ابھر رہا تھا۔ اور یہ تھا کہ کاش میں بھی دوسرے قلیوں کی مانند زندگی گزارتا اور کوشش کرتا کہ جو کچھ مجھے محنت سے مل جائے۔ وہی میری زندگی کا مقصد بن جائے۔ لیکن دولت کے حصول کی کوشش نے آخر کار مجھے زندہ درگور کر دیا تھا۔

تابوت کا ڈھکن کھول دیا گیا۔ میری نگاہیں بے اختیار اس تابوت پر پڑیں۔ اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ میری آنکھوں کی خرابی ہے۔ یا میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں۔ وہی حقیقت ہے۔ "اوہ۔ میرے خدا!" کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ تابوت میں تو میں لیٹا ہوا تھا۔ ہاں...... یہ میں ہی تھا۔ وہ میرا ہی جسم تھا۔ میں نے دہشت زدہ انداز میں اپنے بدن کو ٹٹول کر دیکھا۔ اگر میں اس تابوت میں لیٹا ہوا ہوں۔ تو یہ کیا ہے؟ جو میرے وجود میں موجود تھا۔ لیکن میرا اپنا جسم میرا تھا۔ لازمی بات تھی کہ تابوت میں جو انسانی جسم لیٹا ہوا ہے۔

وہ کسی اور کا ہی ہے۔ البتہ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے۔ یا مردہ۔ وہ چاروں جو اس تابوت کو لے کر آئے تھے خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ نجانے ان کے ذہنوں میں کیا سوچ تھی۔؟

پھر اچانک ہی اس کمرے کی اندرونی دیوار میں ایک خلا پیدا ہوا۔ اس کی آواز اتنی زوردار تھی کہ اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا! پھر میں انہی بیگم صاحبہ کو دیکھا۔ جو مجھے یہاں لے کر آئی تھیں۔ وہ اس خلاء سے اندر آ رہی تھیں۔ لیکن ان کا چہرہ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ اس چہرے پر کوئی بہت ہی خاص بات ہے۔ ہاں...... خاص بات تو تھی۔ چہرہ بالکل وہی تھا۔ لیکن ان کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں غائب تھیں۔ اور وہ جس طرح چل رہی تھیں۔ وہ بھی حیرت انگیز بات تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ان کے قدم نہ اٹھ رہے ہوں۔ بلکہ وہ کسی مشینی انداز میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ ”خدا کیا ہے یہ سب کچھ؟ میں کس جال میں پھنس گیا ہوں؟“ میں نے سوچا۔

بہر حال! وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھیں اور تھوڑی دیر کے بعد اس تابوت کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔ چاروں لبادہ پوش بھی اسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ بیگم صاحبہ نے ایک لبادہ پوش کی جانب دیکھا۔ اور پھر اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ اس شخص نے اپنے لمبے سے لباس میں سے ایک لمبی سی نوکیلی چھری نکال کر بیگم صاحبہ کو دے دی۔ یہ چھری خنجر نما تھی۔ یعنی عجیب وغریب انداز کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر لگا ہوا دستہ بے حد چمکدار تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے اس میں ہیرے جڑے ہوں۔ بیگم صاحبہ نے دونوں ہاتھوں سے وہ چھری یا خنجر پکڑا اور تابوت کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔

نجانے کیوں مجھے یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ کہیں مجھے قتل نہ کر دیا جائے۔ لیکن میں تابوت میں تھا ہی کہاں۔ میں تو اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا۔ تابوت میں تو ایک میرے جیسا بدن لیٹا ہوا تھا۔

خدا کی پناہ! کوئی بہت ہی بڑا طلسمی چکر تھا۔ جس میں، میں پھنسا ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ سیدھی کھڑی ہوگئیں وہ بڑے اچھے نقوش کی مالک تھیں۔ پھر اچانک ہی انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے۔ اور پھر پوری قوت صرف کر کے انہوں نے وہ لمبا خنجر تابوت میں لیٹے ہوئے میرے بدن کی گردن میں داخل کر دیا۔

مجھے اپنی گردن میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ میرے حلق سے دہشت بھری آواز نکل گئی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن پکڑ لی۔ لیکن نہ تو ان میں سے کوئی میری دہشت بھری آواز پر متوجہ ہوا۔ اور نہ ہی کسی نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔ میری گردن میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اور مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا۔ کہ جیسے وہ نوکیلا خنجر میری ہی گردن میں پیوست ہوا ہو۔

بیگم صاحبہ نے دوسرے آدمی کی طرف رخ کر کے اسے دیکھا۔ اور اس شخص نے دوسرا خنجر ان کے حوالے کر دیا۔ بیگم صاحبہ نے دوسرا خنجر عین سینے میں ترازو کر دیا تھا۔ اور پھر اچانک ہی میرا سر چکرانے لگا۔ میری آنکھیں خوف سے بند ہوتی جا رہی تھیں مجھے اپنے سینے میں بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ بہت دیر تک میں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ پھر اچانک ہی میرے شانوں، پیشانی، دونوں ہاتھوں کی ہتھیلی اور پیروں میں سخت تکلیف ہونے لگی۔ اور میں درد و کرب سے کراہنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں زمین پر لیٹ گیا۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میرے پورے بدن کا خون زمین پر بہہ رہا ہو۔ حالانکہ تابوت میں لیٹے ہوئے جسم سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ البتہ میری آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ اسی جگہ خلاء دوبارہ نمودار ہوا۔ اور وہ بیگم صاحبہ اس خلاء میں داخل ہوگئیں۔ کچھ دیر کے بعد وہاں کچھ بھی نہیں تھا دیوار بالکل اپنی پہلے جیسی کیفیت میں واپس آ گئی تھی۔ ان چاروں افراد نے وہ تابوت اٹھایا اور کندھے پر رکھ کر باہر نکل گئے دروازہ باہر سے بند ہوگیا۔ جیسے ہی وہ دروازے سے باہر گئے میرے جسم کی تمام تکالیف ختم ہوگئی تھیں۔

پے در پے خوفناک واقعات نے مجھ سے میری

دماغی صلاحیتیں چھین لی تھیں میں خوف و ہراس کے عالم میں اپنی جگہ کافی دیر تک اسی طرح لیٹا رہا تھا۔ دل و دماغ کی کیفیت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ کیا سے کیا ہوگیا تھا۔ نجانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں ریلوے اسٹیشن پر اس جادوگرنی عورت کے جال میں پھنسا تھا؟ کاش! میں اس کا سامان باہر رکھ کر اس سے اپنی مزدوری مانگتا اگر وہ کچھ اور کہتی تو میں لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا اور کہتا دیکھو! یہ جادوگرنی عورت مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جا رہی ہے۔

صورتحال حال سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی مجھے احساس نے جیسے میرے دل و دماغ پر عجیب سی نقاہت پیدا کر دی۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اور میں بے ہوشی کی سی کیفیت کا شکار ہوگیا۔

اچانک ہی کسی نے میرا شانہ جھنجھوڑا۔ ”علی خان...... علی خان اٹھے گا نہیں کیا۔ دیکھ رہا ہے کہ کیا ٹائم ہوگیا ہے۔ اور تو ابھی تک سو رہا ہے دو گاڑیاں نکل چکی ہیں۔ بلال چاچا کہہ رہے تھے کہ شاید تیری طبیعت خراب ہے۔“

یہ الفاظ میرے ساتھی۔ قلی فیض اللہ کے تھے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں فیض اللہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کے جسم پر سرخ وردی تھی۔ اور اس پر 62 نمبر کا بیج لگا ہوا تھا۔ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ فیض اللہ خان بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن پھر بڑی زور کا چکر آیا۔ میں نے اس سے کچھ نہ کہا۔ اور اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”اوہ...... میرے خدا! کتنی خوشی کی بات ہے کہ میں ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آ گیا ہوں۔ اس کا مطلب ہے وہ سب کچھ ایک خواب تھا۔ لیکن خواب...... کیسا خواب......؟ اور یہ سب کچھ......؟“

البتہ ان تمام باتوں کو سوچنے سے دماغ دکھنے لگا تھا۔

میں نے سوچا کہ پہلے کچھ کھانے پینے کی بات کروں تھوڑے ہی فاصلے پر چائے کا اسٹال کھلا ہوا تھا۔ فیض اللہ مجھے جگا کر چلا گیا تھا۔ میں نے اپنی جیب میں دیکھا۔ کچھ نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ یہ نوٹ پہلے ہی میری جیب میں موجود تھے۔ میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں جمن سارے واقعات سے گزر رہا تھا۔ پھر اس کے بعد اچانک ہی میری جان اس جادوگرنی سے کیسے چھوٹ گئی۔؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال! کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا اسٹال تک پہنچا اور اسٹال والے سے کہا۔

”لاؤ بھائی! جلدی سے چائے دے دو۔ اور تھوڑے سے بسکٹ نکال دو۔“

چونکہ اس وقت کوئی ٹرین نہیں آئی تھی۔ اور پلیٹ فارم کا ماحول سنسان تھا۔ چائے والے نے جس کا نام جمن استاد تھا۔ چائے کی پیالی میں چائے انڈیلی۔ اور تین چار بسکٹ نکال کر پلیٹ میں رکھ کر میرے سامنے کر دیئے۔ میں نے چائے کی پیالی اٹھا کر چہرے کے قریب کی اس سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ لیکن اس کا رنگ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ بالکل خون کا رنگ تھا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس خونی رنگ کی چائے کو دیکھا۔ اور حیرانی سے جمن استاد کی طرف دیکھا۔ پھر میں نے اس سے کہا۔

”جمن استاد۔!“

”ہاں! کیوں کیا بات ہے۔ علی خان؟“

”یہ چائے ہے۔؟“

”ہاں......“

”یہ پیالی میں۔؟“

”ہاں بھئی چائے ہے۔“

”ذرا دیکھو تو اسے۔“ میں نے کہا۔ اور چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے چائے کی پیالی کو دیکھ کر بولا۔

”کیوں کیا بات ہے۔؟“

”یہ سرخ رنگ۔“

”سرخ رنگ؟“

”تو اور کیا؟“

”نہیں بھیا سرخ رنگ کہاں ہے۔ اس میں؟“ جمن استاد نے کہا۔

”کیا کہہ رہا ہے تو۔ ذرا اسے سونگھ کر تو دیکھ

۔!'' میں نے اسے کہا۔

''کیا ہوگیا ہے تجھے؟'' جمن خان حیرانی سے بولا۔

''یار کمال کرتا ہے۔ یا تو تیری آنکھیں خراب ہوگئی ہیں ۔ یا میری ۔ یہ تو بالکل خون کے رنگ جیسی چائے ہے ۔ اور...... اور اس میں سے اٹھنے والی بدبو......'' میں نے چائے میں سے اٹھنے والی بھاپ کو سونگھتے ہوئے کہا۔

''یار تیری کھوپڑی کچھ الٹ گئی ہے۔'' جمن استاد نے چائے۔ کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا ۔''تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ذرا اسے چکھ کر دیکھ۔'' میں نے کہا۔

جمن استاد نے چائے کی پیالی اٹھالی ۔ اور چائے کا ایک گھونٹ لیا اور پھر بولا ۔'' لے اب تو بھی چکھ لے۔''

''میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس خون والی چائے کو دیکھا ۔ جمن استاد اسے دیکھ کر بالکل حیران نہیں تھا۔ میں نے اسے چہرے کے قریب کیا۔ بدبو اٹھ رہی تھی ۔لیکن اس کے باوجود میں نے اس بدبو کو برداشت کرتے ہوئے اس کا ایک گھونٹ لیا۔ نمکین اور بدبودار خون...... خون اور صرف خون مجھے ایک دم الٹی سی آنے لگی ۔ میں نے چائے کی پیالی رکھ دی ۔ اور الٹی کرنے کے لئے وہاں سے دوڑ گیا ۔جمن استاد حیرانی سے میری صورت دیکھ رہا تھا۔ مجھے بڑی سی الٹی آئی اور اس نے مجھے بری طرح نڈھال کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد پلیٹ فارم کے تمام قلیوں کو اس بات کا علم ہوگیا۔ کہ میں بیمار ہوں ۔لیکن میں بیمار نہیں تھا ۔اچانک ہی میری نگاہ سامنے پھل والے پر پڑی ۔ میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک ساتھی قلی سے کہا۔

''بھیا یہ پیسے لو۔ اور میرے لئے چھ کیلے لے آؤ ۔ میں سخت بھوکا ہوں ۔ کیا بتاؤں تمہیں میرے اوپر اس وقت کیا گزر رہی ہے۔''

''کوئی بات نہیں میں لے کر آتا ہوں ۔'' اس نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ کیلے لے آیا۔

بمشکل تمام میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کیلے کو چھیلا اور پھر اسے منہ کے قریب کرنے ہی والا تھا کہ اچانک کیلے کے سامنے کا حصہ سانپ کے پھن کی طرح لہرانے لگا ۔ اس کی ننھی ننھی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں ۔ اور زبان بار بار باہر نکل رہی تھی ۔ میں نے وحشت زدہ چیخ مار کر کیلا دور پھینک دیا اور میرے ساتھ بیٹھا ہوا قلی چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''سانپ...... سانپ ہے یہ ...... کہاں سے اٹھا لایا تو۔؟''

''علی خان ! جمن استاد کہہ رہا تھا ۔ کہ تیری طبیعت کچھ خراب ہے کہاں ہے۔ سانپ میرے بھائی؟''

''یہ...... یہ یہ...... سب کیا ہے ۔'' میں نے کیلوں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

''اگر یہ سانپ ہے ۔ تو ہم اسے کھائے جاتے ہیں۔'' اس نے ایک کیلا اٹھایا اور اسے چھیل کر کھا گیا۔ میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ پھر میں نے دوسرا کیلا اٹھایا اسے چھیلا تو اس کی بھی زبان لہراتی ہوئی نظر آئی تھی ۔ میں چیختا ہوا وہاں سے دوڑ گیا۔ بہت سے قلی افسوس بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے ۔ اور میں ریل کی پٹری پر دوڑا چلا جا رہا تھا۔

''میرے خدا!...... میں کیا کروں۔''

نجانے کتنی دیر تک میں دوڑتا رہا ۔ اور اس کے بعد ٹھوکر کھا کر گر پڑا پہلے تو شاید کچھ قلی میری طرف دوڑے ۔لیکن جب میں بہت دور نکل آیا تو انہوں نے بھی میرا پیچھا چھوڑ دیا۔ میں گرا تو ریل کی پٹری میرے ماتھے پر لگی ۔ اور پھر شاید میں بے ہوش ہوگیا۔

اور جب ہوش آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی ۔ وہ واقعات جو میرے ذہن میں تھے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں ۔ بھوک سے میرا دم نکلا جا رہا تھا ۔ اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے بدن کے کسی حصے کو جنبش بھی نہیں دے سکتا۔

''اوہ...... میں کیا کروں، میں اپنی اس حالت کا۔؟'' میرے ہونٹوں سے ایک بڑبڑاہٹ سی نکلی اور میں نے آنکھیں کھول کر افسردہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ ہاتھوں سے ٹٹول کر ریل کی پٹری تلاش کی ۔مگر یہ کیا میرے ہاتھ کسی نرم گدے سے ٹکرائے تھے۔ اور ماحول بھی ریلوے اسٹیشن کا نہیں تھا۔ دور دور تک نہ تو ریل کی پٹری کا پتہ تھا۔ اور نہ ہی کچھ اور۔''

''میرے خدا یہ سب کیا ہے۔؟'' میں نے دیوانہ وار چاروں طرف دیکھا۔ بڑا خوب صورت ماحول تھا۔ بڑی ہی حسین سی کیفیت تھی اس ماحول کی ۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ بھوک اب بھی شدت کے ساتھ لگ رہی تھی۔

دفعتاً سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کے بعد ہی بیگم صاحبہ اندر داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے دو لڑکیاں تھیں ۔ جو ہاتھوں میں کھانے پینے کی اشیاء اٹھائے ہوئے تھیں ۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اور للچائی ہوئی آنکھوں سے ان چیزوں کو دیکھنے لگا ۔ بیگم صاحبہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ۔ انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔

''میرا نام ۔ میرا نام جے پالی ہے۔''

''بیگم صاحبہ جی ! یہ سب کیا ہے ۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ میں بھوک سے مر جاؤں گا۔''

''نہیں ایسے نہیں...... تم مسلمان ہو ناں ۔؟''

''ہاں جی ! میرا نام علی خان ہے۔''

''علی خان چلو......! میں تمہارے ساتھ بڑا رحم کا سلوک کر رہی ہوں ۔ اس وقت تم اس قدر بھوکے ہو کہ اگر میں چاہوں تو تمہیں کھانے کی شکل میں زہر بھی دے سکتی ہوں ۔تم اسے آسانی سے کھا لوگے ۔لیکن میں وہ نہیں کر رہی جو کرنا چاہتی ہوں ۔ ایک بات تو کہو تم؟''

''جی بیگم صاحبہ!''

''بیگم صاحبہ نہیں ۔ جے پالی کہو مجھے۔''

''جی...... جے پالی!'' میں نے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے پہلے اپنا پیٹ بھر لو۔'' اس نے اپنے پیچھے آنے والی داسیوں کو کہا ۔ اور داسیوں نے کھانے پینے کی چیزیں سامنے رکھ دیں۔

اس کے بعد تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ مجھ جیسا بھوکا ان چیزوں پر کیسے ٹوٹ سکتا ہے۔

بہر حال میں خوب کھا پی کر شکم سیر ہوگیا ۔ جے پالی نے ہاتھ سے اشارہ کرکے ان دونوں داسیوں کو جانے کے لئے کہا ۔ وہ برتن اٹھا کر چلی گئیں ۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا کی ہر نعمت میرے لئے بے مقصد ہو۔ اس سے اچھی زندگی بھلا اور کون سی ہو سکتی تھی۔

وہ میری صورت دیکھتی رہی ۔ پھر اس نے کہا ۔''میں تم سے ایک بہت بڑا کام لینا چاہتی ہوں ۔ علی خان ! لیکن اس کے لئے تمہیں بہت کچھ کھونا پڑے گا۔ تم ریلوے اسٹیشن پر قلی کا کام کرتے ہو۔ جو کچھ تمہیں حاصل ہوتا ہے ۔تم جانتے ہو پولیس کی ٹھوکریں، جوتے گالیاں اور اس کے بعد زندگی کا خاتمہ ۔لیکن میں تمہیں مہاراجہ بنا دوں تو کیسا رہے گا۔؟''

''میرے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔'' جے پالی بات تو بڑی خوبصورت ہے ۔ لیکن اس دور میں مہاراجہ کہاں ہوتے ہیں۔؟''

''ہوتے ہیں ۔ تمہاری چھوٹی آنکھیں انہیں نہیں دیکھ سکتیں ۔ راج کرتے ہیں وہ حکومتیں ان کے نام سے چلتی ہیں ۔ اصل حکومت ان کی ہوتی ہے ۔ شاندار کاریں عزت ہر شخص ان کے سامنے جھکتا ہے ۔ کیا تمہیں ایسے لوگ یاد نہیں؟؟''

''ہاں ! وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

''دیکھو۔ تمہیں دین ۔ دھرم کے چکر سے نکلنا ہوگا ۔ نہ ہندو کچھ ہوتا ہے نہ مسلمان ۔ سنسار میں شکتی جس کے پاس ہو ۔ وہی مہان ہوتا ہے ۔ اگر تم مہان بننا چاہتے ہو۔ تو دین دھرم کے چکر سے نکلنا ہوگا۔''

''بات اصل میں یہ ہے ۔ جے پالی جی ! کہ میں جانتا ہوں کہ ہم مسلمان چاہے دین دھرم سے دور ہی کیوں نہ ہو جائیں ۔ اپنا دین کبھی نہیں بیچتے ۔ وہ بہت بدنصیب ہوتے ہیں ۔ اور خدا جانے کیا ہوتا ہے ۔ ان کے اندر کہ وہ اپنے مذہب بیچ دیتے ہیں ۔ ہم ماں ۔ بہن، باپ بیٹی سب کیلئے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔

لیکن اگر دین دھرم کا معاملہ ہو تو سینہ تان کر نہیں ہم اپنی گردن ہتھیلی پر رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور زندگی ہمارے لئے بے حقیقت ہوتی ہے۔''

بہرحال جے پالی کہنے لگی۔ ''اگر تم ان جھگڑوں سے نکل کر میرے کہنے پر عمل کرو تو میں تمہیں اتنی ہی طاقت بخش سکتی ہوں۔''

''مگر کیسے؟''

''جو کچھ میں کہوں گی۔ تمہیں وہ کرنا ہوگا؟''

''مثلاً......'' میں نے سوال کیا۔

اس نے اپنے لباس میں سے ایک چیز نکالی۔ یہ خوبصورت سی چھوٹی سی مورتی تھی۔ جو شاید سونے کی بنی ہوئی تھی۔ اس مورتی کی لمبائی، چوڑائی تین انچ سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن مورتی بہت خوبصورت تھی۔ اس نے کہا۔ ''یہ مورتی تمہیں اپنے قبضے میں کرنے کے لئے ایک جاپ کرنا ہوگا۔ کیا سمجھے؟ اور جب تم یہ جاپ پورا کرلوگے تو اس مورتی میں زندگی دوڑ جائے گی۔ اور اس کے بعد اسے سامنے رکھ کر جو کچھ تم چاہو گے کرسکو گے۔ یہ مورتی تمہیں راجہ بنا دے گی۔''

میں نے حامی بھرلی۔ اس بدبخت عورت نے مجھے وہ جاپ بتایا جسے پورا کرکے میں اس مورتی کا مالک بن سکتا تھا۔ اس نے مجھے اس جاپ کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ وہ ایک منتر تھا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔ کہ جادو منتر پڑھنے سے دین دھرم پر کیا اثر پڑتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں نے تو دولت حاصل کرنے کے لئے وہ جاپ کرنا قبول کرلیا تھا۔ اس عورت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق میں نے ہر کام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس نے کہا۔

''یہ جاپ کرتے ہوئے تمہیں بہت مشکل ہوگی۔''

''کیوں؟''

''جاپ کے بیر تمہیں ڈرائیں گے۔ لیکن اس عمارت کے ایک بڑے درخت کے سائے میں بیٹھ کر تم یہ جاپ کرنا، تمہیں آسانی رہے گی۔''

میں نے اس سے وعدہ کرلیا اور پھر وہاں جانے کے بعد میں نے اس مورتی کو سامنے رکھ کر ایک جگہ کو اچھی طرح صاف کیا۔ اور پھر وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد آنکھیں بند کرکے میں نے منتر پڑھنا شروع کردیا۔ تمام احساسات سے بے نیاز ہوکر نجانے کب تک منتر پڑھتا رہا۔ پھر اچانک ہی میں نے آنکھیں کھول دیں اور گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ منتر کے الفاظ اب بھی میرے لبوں پر تھے۔ مگر اپنے اس غیر دانستہ عمل پر مجھے خود تعجب ہوا تھا۔ پھر مجھے ایک جگہ کھانا رکھا ہوا نظر آگیا۔

''یہ کھانا یہاں کون لایا۔؟'' مجھے جے پالی کے الفاظ یاد آئے۔

''زندگی گزارنے کے لئے ضرورت کی چیزیں خود بخود مل جائیں گی۔''

جو کچھ ہوتا کم تھا۔ بہرحال! کھانے کو دیکھ کر بھوک چمک اٹھی تھی جاپ کے پھیر کے آخری الفاظ، میرے لبوں پر تھے پھر وہ بھی ختم ہوگئے۔ اور میں اطمینان سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ کھانا انتہائی مزیدار تھا۔ پانی بھی موجود تھا چنانچہ سیر ہوکر کھانا کھایا۔ دو تین گلاس پانی پیا اور پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔ میں نے دوبارہ جاپ شروع کردیا ......اس بار آنکھیں کھلی ہی رکھی تھیں۔ جاپ کرتے کرتے اچانک ہی میں نے گردن اٹھا کر اس جانب دیکھا۔ جہاں کھانے کے برتن رکھے تھے۔ اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ برتن اب وہاں موجود نہیں تھے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ پھر یہ برتن یہاں سے کون لے گیا۔ اس حیرانی کے باوجود میرے منہ سے مسلسل جاپ کے الفاظ نکلتے رہے کیونکہ اس تسلسل کو قائم رکھنا ضروری تھا۔ ورنہ سب کچھ ختم ہو جاتا۔

''وقت گزرتا رہا۔ شام ہوئی پھر رات ہوگئی اس مخصوص جگہ پر رات کا کھانا مجھے مل گیا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس طرح کھانا مل جانا۔ دور دور تک کسی آدم زاد کا نام و نشان نہ ہو۔ بہرحال کھانا کھایا پانی پیا اور اپنی مخصوص جگہ آکر بیٹھ گیا۔ جاپ کا تسلسل برقرار تھا۔ ہاں کبھی

کبھی غنودگی آجاتی تھی۔ لیکن نیند نہیں آئی تھی۔ ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی تھی۔ وہ یہ تھی کہ ساری رات ایک مخصوص روشنی پورے ماحول پر چھائی رہی تھی۔ اور اتنی تھی کہ میں اپنے آپ کو اور آس پاس کی چیزوں کو دیکھ سکتا تھا۔

پھر صبح ہوگئی۔ میں نے جاپ جاری رکھا تھا۔ میرے غیر مرئی دوستوں نے صبح کے ناشتے کا انتظام کردیا تھا۔ اس کو اور میں کیا کہتا؟ یا تو کوئی ایسا وجود جو نظر نہ آتا ہو......یا پھر......

بہرحال! وقت گزرتا رہا۔ دوسرا دن......تیسرا دن......اور پھر چوتھا۔ دن بھی سکون سے گزر گیا۔ ہاں البتہ چوتھے دن کے بعد کی رات میرے لئے انتہائی سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ رات کے کھانے وغیرہ سے فراغت کے بعد مجھے ایک بلی کی آواز سنائی دی۔ میں چونک گیا۔

پھر میں نے دیکھا کہ ایک بلی میری جانب بڑھ رہی ہے۔ بڑی ہی عجیب و غریب بلی تھی۔ اس کا جسم بھی عام بلیوں سے بڑا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آکر رک گئی تھی۔ اس کے بعد ایک دوسری بلی بھی نمودار ہوئی۔ اس کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ پھر وہ بلی بھی اس سے پہلے والی بلی کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ پھر دو اور بلیاں نمودار ہوئیں۔ اور وہ بھی عین اسی جگہ آکر بیٹھ گئیں......اور پھر......اور پھر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ اور ان کے منہ سے آوازیں خارج ہونے لگیں۔ خدا کی پناہ......وہ ہنسی کی آوازیں تھیں۔ انسانی ہنسی کی آوازیں۔ ان کی کھلی باچھوں سے دانت باہر آرہے تھے۔

پھر ان میں سے ایک بلی نے میری جانب چھلانگ لگادی۔ ایک لمحے کے لئے میرے ہاتھ پاؤں لرز گئے تھے۔ اور میں بری طرح خوفزدہ ہوگیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا۔ اس منتر کے لفظ مسلسل میرے لبوں پر تھے۔ بلی اچھلتی ہوئی میرے قریب آئی اور میرے سر پر سے ہوتی ہوئی پیچھے چلی گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور پھر ایک عجیب کھیل شروع ہوگیا۔

وہ بلیاں میرے دائیں بائیں......آگے پیچھے چکرانے لگیں۔ میرے سر کے اوپر مخصوص اونچائی تک چھلانگیں لگاتی رہیں۔ لیکن ایک دفعہ بھی ان کا جسم مجھ سے نہیں ٹکرایا۔ اب میں یہ سمجھ چکا تھا۔ کہ وہ بلیاں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اور اگر میں یہ عمل مسلسل جاری رکھوں گا۔ تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ سب اس عمل کا اثر تھا۔ مجھے روکا جارہا تھا۔ خوفزدہ کیا جارہا تھا۔ لیکن اگر میں ہمت سے کام لوں اور بجائے ڈرنے کے چالیس دن مسلسل یہ عمل کروں تو کامیاب ہو جاؤں گا۔ ایسا ہی تھا۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔

چنانچہ میں نے اسے جاری رکھا۔ بلیاں تھک ہار کر اپنی جگہ جا بیٹھی تھیں۔ میں اطمینان سے منتر پڑھتا رہا۔ پھر ان میں سے ایک نے دوبارہ یہی حرکت کی اور میرے سر پر سے گزرتی ہوئی۔ دوسری جانب چلی گئی۔ میرا دھیان ہٹانے کی بھرپور کوشش ایک بار پھر کی گئی تھی۔ اور پھر یہ بلیاں ایک بار پھر تھک ہار کر بیٹھ گئیں۔ پھر وہ چاروں جھٹکے سے اٹھیں اور ایک سمت بھاگ گئیں۔ اور میری نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ میں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔

پھر وہی معمول شروع ہوگیا۔ یعنی صبح کا ناشتہ مقررہ جگہ پر مجھے مل گیا اس کے بعد تین چار دن پرسکون گزرنے تھے۔ اب تو میں اس ماحول کا عادی ہوتا جارہا تھا۔ وقت پر کھانا مل جاتا تھا۔ کھانے وغیرہ سے فراغت ہوتی تو پھر اپنے عمل میں لگ جاتا......لیکن ابھی تو شاید مشکلوں کا آغاز ہوا تھا۔ یہ غالباً آٹھویں رات تھی۔ آدھی رات سے زیادہ بیت چکی تھی کہ چیخوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ کسی مرد کے چیخنے کی آوازیں تھیں۔ جو مدد کیلئے پکار رہا تھا۔ پھر میں نے ایک آدمی کو دیکھا۔ جو شدید زخمی تھا۔ اور خوفزدہ انداز میں بھاگ رہا تھا۔

''بچاؤ......بچاؤ......بھگوان کیلئے مجھے بچاؤ......'' اس کے منہ سے مسلسل آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور اس کے پیچھے ایک عورت تھی۔ شاید وہ بہت زیادہ ڈر گیا تھا۔ لیکن خود کو سنبھالے رکھنا ضروری تھا۔ پھر وہ آدمی چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے پہلے مجھے

دیکھا ہو۔ وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ اس کا چہرہ انتہائی مکروہ اور بھیانک تھا۔ گھنگریالے بال جو گردن میں اٹے ہوئے تھے۔ اس کے شانوں تک جھول رہے تھے۔ چہرے پر زخم کے نشان تھے۔ اوپری ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ جس میں سے دانت باہر جھانک رہے تھے۔

''بچالے...... بچالے ......مار ڈالے گی ......مار ڈالے گی یہ......'' اوپری ہونٹ کٹا ہونے کی وجہ سے اس کے منہ سے الفاظ صحیح طرح نہیں نکل پا رہے تھے۔

میں مصروف عمل رہا۔ ''اے لڑکی! سنا نہیں تو نے میں کیا کہہ رہا ہوں...... وہ مجھے کھانے پر تلی ہے۔ اور تو...... تو ......اپنے ہی کام پر لگا ہے۔ بچائے گا نہیں مجھے۔؟''

وہ عورت بھی اب میرے قریب آ گئی تھی۔ کالی بھجنگ صورت۔ بال بکھرے ہوئے۔ آنکھیں پھٹی ہوئیں۔ ہندوانہ طرز کی ساڑھی باندھے ہوئے۔ اس کے دانت بھی عجیب انداز میں باہر نکلے ہوئے تھے۔ لیکن...... لیکن ایک عجیب سی چیز جس نے میرے بدن میں لرزشیں پیدا کر دی تھیں۔ اس کے دانتوں پر لگا ہوا خون تھا۔ پھر اس کے منہ سے کراری سی آواز نکلی۔

''ہی...... ہی...... ہی...... مل گیا...... کہاں تک بھاگے گا۔ ارے کہاں جائے گا بچ کے ......چل...... آ جا...... آ جا......''

''خبردار جو آگے بڑھی۔ کتیا۔! کیا مجھے کچا چبا جائے گی۔؟'' وہ آدمی بولا۔

''تو اور کیا۔ تجھے ہی تو کھاؤں گی۔ اور کون ہے یہاں۔''

''یہ بھی تو ہے۔ اسے کھا جا۔'' اس شخص نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ اور میں بری طرح سہم گیا۔ اس عورت نے میری طرف دیکھا۔ وہ بالکل اس طرح مجھے گھور رہی تھی۔ جیسے کوئی بھوکا شیر اپنے شکار کو دیکھتا ہو۔ بولی۔

''کیوں؟'' اسے کیوں کھاؤں؟ میں تجھے کھاؤں گی۔ آج تو ہی میرا شکار ہے۔ آج میں تجھے کھاؤں گی۔ آج تیری باری ہے۔''

''اری بدبخت! کیا ہو گیا ہے۔ تجھے؟ اپنے مرد کو کھائے گی؟''

''میں بھوکی ہوں۔''

''اری بھوکی ہے تو کسی اور کو کھا۔ مجھے کیوں کھاتی ہے۔ پتہ نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی جب تجھے لایا تھا۔''

''میں کیا کروں؟ مجبور ہوں۔ منش کا گوشت میری کمزوری ہے۔ میری مجبوری ہے۔ میری بھوک اتنی شدید ہو رہی ہے کہ کیا کہوں تجھ سے چل آ...... آ جا......''

''ارے بابو...... مجھے بچالو رے۔''

''یہ کیا بچائے گا۔؟ یہ تو خود اپنے پھیر میں الجھا ہے۔ تجھے کیا بچائے گا۔''

''مجھے بچالے...... چھوڑ دے اپنا پھیر...... میرا جیون بچالے۔ کھا جائے گی یہ ڈائن...... یہ ڈائن مجھے کھا جائے گی...... جیون نشٹ کر دیا میرا۔ اب مار ڈالے گی۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔''

''کیا کرے گا جیون کا۔؟ پھر پاپ کرے گا۔ پھر لوگوں کو تنگ کرے گا۔ ارے تجھے تو خوش ہونا چاہئے۔ کہ مکتی مل رہی ہے تجھے پاپوں سے مکتی مل رہی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ عورت تیزی سے آگے بڑھی۔ اور پھر اس نے جو عمل کیا۔ وہ میرا خون خشک کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس نے اس آدمی کا دایاں ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور اپنے دانت اس کے شانے میں پیوست کر دیئے۔ وہ آدمی تکلیف سے تڑپنے لگا۔ اور نیچے گر پڑا۔

لیکن اس عورت نے اپنے دانت وہاں سے نہیں ہٹائے تھے۔ پھر وہ بری طرح سے شانے کو جھنجھوڑنے لگی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس نے ہاتھ مروڑنا شروع کر دیا۔ وہ پوری قوت سے ہاتھ کو جھٹکے دے رہی تھی۔ اور دانتوں سے مسلسل گوشت کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس نے اس کا بازو الگ کر دیا۔ ......اب اس آدمی کا بازو۔ اس عورت کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ مزے لے لے کر اسے کھا رہی تھی۔ وہ آدمی شدت کرب سے زمین پر تڑپ رہا تھا۔ میرا یہ حال تھا

کہ کاٹو تو بدن سے لہو نہ نکلے۔ اتنا خوفناک منظر...... اتنی وحشت خیزی...... وہ عورت اتنی تیزی سے بازو کا گوشت صاف کر گئی تھی۔ کہ جیسے مشین ہو۔ اس نے انگلیوں تک کی کھال نوچ لی تھی۔ اور اب ہاتھ کی ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس عورت نے اطمینان سے اس شخص کا بایاں ہاتھ بھی شانے کے پاس سے جدا کر لیا۔

لیکن اس بار سید بھی میری جانب آ گئی تھی۔ اور پھر اس نے وہ ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ لے مانو! کھالے تجھے بھوک لگی ہو گی تو بھی کھالے بڑا سواد شٹ ہے یہ، بڑا مزہ آ رہا ہے۔ اسے کھانے میں۔ اس سے پہلے کسی منش کو کھانے سے اتنا مزہ نہیں آیا۔ ارے ڈر کیوں رہا ہے۔ کیوں گھورے جا رہا ہے مجھے، نہیں کھانا تو نہ کھا۔ میں کوئی زبردستی نہیں کر رہی تیرے ساتھ۔'' پھر وہ ایک جگہ بیٹھ گئی۔ اور پھر اس طرح دوسرا ہاتھ بھی صاف کر گئی۔

ادھر اس شخص کا یہ عالم تھا کہ وہ زمین سے تین تین فٹ اونچا اچھل رہا تھا۔ اس کے حلق سے مسلسل بھیانک چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

''مر گیا...... مر گیا...... ارے مر گیا...... کھا گئی...... کھا گئی...... کمبخت کھا گئی۔ اے مانو! اٹھ...... اٹھ جا! میں کہتا ہوں۔ بھگوان تجھے بھی کبھی معاف نہیں کرے گا۔ تو نے...... تو نے میرا جیون نہ بچایا تو کبھی اپنے عمل میں کامیاب نہیں ہو گا۔ یہ میرا شراپ ہے تجھے مانو! یاد رکھنا...... یاد رکھنا...... آہ......''

میرا رواں...... رواں کانپ رہا تھا۔ یہ منظر...... یہ منظر کسی انسان کے ہوش اڑا دینے کیلئے کافی تھا۔ لیکن میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھا تھا۔ پھر اس عورت نے اس آدمی کی ٹانگ نوچنا شروع کر دی۔ وہ بڑی مہارت سے ٹانگ کا گوشت صاف کر گئی تھی۔

اس بار اس نے ٹانگ الگ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پھر وہ دوسری ٹانگ بھی چٹ کر گئی۔ مجھے صبر آتا جا رہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا۔ کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ لیکن میں اس آدمی کو بچا بھی نہیں سکتا میرا جاپ ٹوٹ جائے گا۔ اور پھر...... اور پھر...... سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ میں یہی سب کچھ سوچتا رہا لیکن میرے جاپ کرنے کی رفتار وہی تھی۔ تسلسل وہی تھا۔ جس پر مجھے حیرانی ہوئی تھی۔ واقعی...... اگر میں دھیان کے ساتھ عمل کرتا رہوں تو ضرور کامیاب ہو جاؤں گا اور...... اور یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔

پھر اس عورت نے بقیہ جسم کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ وہ آدمی آخری حد تک شدت سے چیخ رہا تھا۔ اس کی چیخیں گونج رہی تھیں۔

پھر آہستہ آہستہ اس کی چیخیں مدھم پڑنے لگیں۔ اور پھر اس کی آواز بند ہو گئی۔ وہ عورت چپ چپ کر کے کھاتی رہی۔ اس نے آدمی کا بدن خالی کر دیا۔ پھر اس کی گردن کی طرف بڑھی اس نے آدمی کے گلے میں دانت پیوست کر دیئے اور خون بہنے لگا۔

پھر اس عورت نے سر اٹھایا۔ اس کے ناک اور منہ پر جا بجا خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ دانتوں سے بری طرح خون ٹپک رہا تھا۔ اس نے خون خوار نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور میری طرف بڑھنے لگی۔ اس کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

''ارے بیرا...... میں بھوکی ہوں۔ ارے او بیرا...... میری بھوک ویسی ہی ہے۔ اس کمبخت کی ایک ایک بوٹی نوچ لی میں نے لیکن لیکن میری بھوک ہی ختم نہ ہوئی۔ لگتا ہے۔ کچھ کھایا ہی نہیں۔ ارے بیرا...... اب میں تجھے کھاؤں گی۔''

یہ کہہ کر وہ میری طرف بڑھی اس کے نوکیلے دانتوں اور ناخنوں کو دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ بہرحال اب وہ میری طرف ہی آ رہی تھی۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ بالکل میرے قریب آ گئی۔ مارے خوف کے میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور مرنے کیلئے تیار ہو گیا تھا۔ پھر نجانے کیا ہوا۔ اس نے مجھے ابھی تک چھوا کیوں نہیں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے دیکھ کر آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ میری آنکھوں کو کوئی دھوکہ ہوا ہے۔ وہ ہڈیوں کا پنجر اپنی جگہ نہیں تھا۔ نہ ہی فرش پر خون تھا۔ جبکہ کچھ دیر پہلے خون

کے بے پناہ دھبے اس جگہ پر موجود تھے۔ بات اب میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ سب عمل کو توڑنے کی کوشش تھی۔ یہ لوگ یہ ہی چاہتے تھے کہ میرا جاپ کسی طرح ٹوٹ جائے۔ میں اس خوفناک منظر سے ڈر جاؤں۔ اپنی جگہ سے کھڑا ہو جاؤں۔ بھاگ جاؤں لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ عورت بھی غائب تھی۔

تھوڑی صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ رات بھر کے واقعات دل و دماغ سے چپک کر رہ گئے تھے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ان منظروں میں مجھے ڈرانا مقصود تھا۔ یہ مجھے کوئی جانی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ پھر میں اپنی جگہ لیٹ گیا۔ میرے ذہن پر غنودگی سی چھانے لگی۔ نیند کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اس نیم غنودہ کیفیت میں کافی دیر لیٹا رہا۔ پھر جب ذرا دل کی کیفیت بحال ہوئی تو اٹھ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر خود کو مضبوط کیا اور پوری تندہی کے ساتھ اس عمل میں مصروف ہو گیا۔ اس ماحول کی عادت پڑتی جا رہی تھی۔ شکر تھا۔ کہ ان واقعات کے بعد اور کوئی واقعہ دوبارہ پیش نہیں آیا تھا۔ اب تو بس ایک ہی لگن تھی۔ کہ کب چالیس دن پورے ہوں۔ اور کب میرا عمل ختم ہو۔ اس انتظار میں پوری لگن کے ساتھ جاپ کرتا رہا۔ اور دن گزرتے رہے۔ لیکن شاید میرے کئی امتحان باقی تھے۔

ٹھیک چوبیسویں دن سورج ڈھلنے کے بعد ہی عجیب و غریب واقعات کا آغاز ہو گیا تھا۔ میں اپنے جاپ میں مصروف تھا۔ اور بڑے اطمینان سے عمل پڑھ رہا تھا کہ کہیں سے ایک چیز اڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے کچھ فاصلے پر زمین پر گر پڑی۔ میں نے نظر اٹھا کر اس چیز کو دکھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے یہ بکرے کا کٹا ہوا سر تھا۔ خون میں لت پت۔ خون کی چھینٹیں فرش پر بکھر گئیں۔

ابھی میں اس کا جائزہ لے ہی رہا تھا۔ کہ ایک اور سر اڑتا ہوا آیا۔ اور پھر وقفے وقفے سے بکروں کے سر مجھ سے کچھ فاصلوں پر گرتے رہے۔ میں نے دھیان لگانے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ ان سروں سے اڑنے والی چھینٹیں میرے کپڑوں پر پڑ رہی تھیں۔

لیکن میں صبر سے بیٹھا رہا۔ کافی دیر تک دھم دھم کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد وہ سر خود بخود غائب ہو گئے۔

بہت دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر نجانے کہاں سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ پھر یہ رونے کی آواز کان پھاڑ دینے کی حد تک تیز ہو گئی۔ پھر ایک اور آواز آئی۔

''مارو...... مارو...... مار دو اسے...... ارے جلدی کرو...... یہ مروائے گا ہمیں۔''

''نادان ہے...... مالک۔''

''ارے کاہے کا نادان! ہماری آزادی ختم کرنے کیلئے جا رہا تھا نہیں چھوڑیں گے۔ نہیں چھوڑیں گے۔''

میں اب پرسکون ہو گیا تھا۔ دل میں سوچا کہ اب ان تمام باتوں سے ڈرنا بیکار ہے۔ صبح تک یہ مشغلہ جاری رہا۔ اس کے بعد ماحول پرسکون ہو گیا۔ میرے خیر خواہوں نے میری دلچسپی کیلئے بہت سے سامان کر رکھے تھے۔

چنانچہ تیسویں رات میں جاپ میں مصروف تھا۔ کہ اچانک ہی زمین پھٹنی شروع ہو گئی۔ ایک بہت بڑا سوراخ ہو گیا تھا۔ پھر اس سوراخ میں سے ایک چیز نے سر ابھارا۔ انتہائی خوفناک شکل تھی اس کی...... اوپر کو اٹھے ہوئے کان بھیڑیئے جیسے جبڑے جن سے دانت باہر آ رہے تھے۔ انگاروں جیسی دہکتی ہوئی آنکھیں اس نے دونوں ہاتھ اوپر رکھے تھے۔ اور ہاتھوں پر وزن ڈال کر اوپر آ گیا۔

اس کے ہاتھ پیر بالکل انسانوں جیسے تھے۔ لیکن اس کا قد صرف ایک فٹ تھا۔ اتنا ہیبت ناک بونا میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ پھر اس کے پیچھے پیچھے ایک اور بونا نکلا۔ اس کا بدن بھی ویسا ہی تھا۔ البتہ چہرہ شیر کی مانند تھا۔ یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ دو اور بونے ان دونوں کے پیچھے باہر نکلے اور ان کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ پھر سب سے آخر میں ایک اور بونا نکلا۔

اس کا بدن بھی ویسا ہی تھا۔ اس کا چہرہ انتہائی

خوفناک تھا۔ اس کا قد بھی ان تینوں سے تھوڑا بڑا تھا۔ اس کے چہرے پر جا بجا بال اگے ہوئے تھے۔ جبڑوں سے نوکیلے دانت باہر جھانک رہے تھے۔ پھر وہ پانچوں ایک ساتھ چلتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ لمبا بونا سب سے آگے تھا۔ پھر اس کے منہ سے منمناتی ہوئی آواز نکلی۔

''وشنو۔''

''جی مالک۔'' ایک دوسرے بونے نے کہا۔

''ارے یہ کون ہے رے۔؟''

''یہ بیرا بڑا کٹھور ہے۔''

''ارے میں نے پوچھا یہ کون ہے۔؟''

''یوں تو ہے۔ مسلا...... لیکن کٹھن تیرہ کے لئے جاپ کر رہا ہے۔''

''ہونہہ یہ پدی۔ اور پدی کا شوربہ یہ کرے گا جاپ۔؟''

''کرے گا مالک...... کر رہا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں ناں کیسے پڑھ رہا ہے۔''

''پڑھنے دے...... پڑھنے دے۔ لیکن سوچ لے نہ صرف تو بلکہ ہم سب اس کے نیچے آ جائیں گے۔ دیکھ وشنو، ایک تو یہ ٹھہرا ملنش، پھر مسلا...... نہ بھئی نہ۔ میں تو نہ آؤں گا اس کے پھیر میں۔''

''پھر کیا کریں مالک۔''

''تم میں سے ایک اسے مارے گا۔''

''ہم میں سے۔؟''

''ہاں...... تم لوگوں میں سے۔''

''پر...... پر مالک......''

یہ کیا...... پر...... پر لگا رکھی ہے۔ طے کر لو۔ کون مارے گا اسے۔''

''میں ماروں گا اسے'' وہ بونا جسے وشنو کہا گیا تھا بولا۔

''نہیں اسے میں ماروں گا۔'' ایک دوسرے بونے نے کہا۔

''نہیں۔ تم دونوں میں سے کوئی اسے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اس کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔''

تیسرے بونے نے کہا۔ اور پھر عجیب ہی کھیل شروع ہو گیا۔ وہ سب آپس میں لڑنے لگے تھے۔ ہر کوئی یہ ہی چاہتا تھا کہ میری موت اس کے ہاتھوں ہو۔ پھر میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنے اپنے لباسوں میں سے چھوٹی چھوٹی تلواریں نکال لیں۔ وہ تلواریں لہرانے لگے۔ ان کے انداز اگر عام حالات میں کوئی شخص دیکھتا تو مارے ہنسی کے اس کا برا حال ہو جاتا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ بونے بھی مجھے اس عمل سے روکنے کیلئے بھیجے گئے تھے چنانچہ میں خاموش رہا۔

پھر ان بونوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ وہ چاروں آپس میں انتہائی ماہرانہ انداز میں لڑ رہے تھے۔ پھر ان میں سے دو بونے زخمی ہو گئے۔ اور زمین پر گر کر کراہنے لگے۔ پھر اچانک ہی وہ دونوں غائب ہو گئے۔ اس کے بعد باقی دونوں بونوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ اس دوران وہ پانچواں بونا اچھل اچھل کر دونوں کو جوش دلا رہا تھا۔

''شاباش وشنو شاباش۔'' اس بڑے بونے نے کہا اور وشنو نے ادب سے گردن جھکا دی۔ اس بڑے بونے نے پھرتی سے اپنے لباس سے تلوار نکالی اور وشنو کی گردن اڑا دی۔ اور پھر میں نے جو منظر دیکھا۔ وہ ناقابل یقین حد تک ہیبت ناک تھا۔ بونا آرام سے اس طرف مڑا۔ جہاں اس کی گردن جا پڑی تھی۔ اس نے اطمینان سے اپنی تلوار زمین پر رکھی جھک کر اپنی گردن اٹھائی اور دوبارہ اپنے شانوں پر رکھ لی۔ پھر دوبارہ تلوار زمین سے اٹھائی۔ اور جھٹکے سے اس بڑے بونے کی طرف مڑا۔

''مالک...... یہ کیا...... یہ کیا حرکت کی تھی؟''

''وشنو...... میں ماروں گا۔ اسے تو ہٹ جا۔ میرا ارادہ بدل گیا ہے۔ اب میں خود ہی اسے ماروں گا۔''

''تو مالک آپ مجھے ایسے ہی منع کر دیتے۔''

''بس! میری مرضی......! یہ بھی تو منع کرنا ہی ہوا ناں۔''

''اچھا۔ پھر ٹھیک ہے دیکھتے ہیں۔ کون اسے مارتا ہے۔'' یہ کہہ کر بونا اس بڑے بونے کی طرف لپکا اور ان دونوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ پھر لڑتے لڑتے

وہ دونوں بھی شدید زخمی ہوگئے تھے۔

اس کے بعد پھر ایک اور عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو بیچ میں سے آدھا آدھا کاٹ دیا تھا۔ اور پھر وہ دونوں بھی غائب ہوگئے۔

ابھی میں اس منظر کے سحر میں کھویا ہوا تھا کہ عجیب تماشے سامنے آئے۔ میرے میزبانوں نے انتہے ہیبت ناک منظر...... یہ خوفناک چہرے ان کا انداز لیکن میں نے محسوس کرلیا تھا۔ کہ ان سب کے پیچھے مقصد وہی تھا۔ یعنی کسی بھی طرح میرا جاپ ٹوٹ جائے۔ اور اس کے بعد میں بھول جاؤں۔ لیکن اب شاید یہ ممکن نہ تھا۔

پھر مندر کی زمین لرزنے لگی۔ اور میں چونک پڑا۔ اب کیا ہوا؟ شاید زلزلہ آرہا ہے۔ میرے حریف شاید ان تمام حربوں سے ناکام ہوکر مجھے زمین میں دفن کرنے پر تل گئے تھے۔ اور اس لئے زلزلے کی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں زمین کے لرزنے کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ آٹھ دس جنگلی بھینسے میری جانب دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ اس بار میں بالکل خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول رکھی تھیں کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ...... یہ بھینسے مجھے اپنے طاقتور کھروں سے کچل دیں گے۔ مجھے اپنے سینگوں پر اچھالیں گے میں مرہی جاؤں گا۔ لیکن اب میں مرتے دم تک جاپ کے الفاظ دہرانا چاہتا تھا۔ کہ میرے دل کی حرکت بند بھی ہوجائے تو اپنے مقصد کی تکمیل کرتے ہوئے۔

بہرحال وہ جنگلی بھینسے میری جانب بڑھے۔ اور پھر بڑی عجیب بات ہوئی ان جنگلی بھینسوں کا فاصلہ مجھ سے کوئی ایک گز رہ گیا۔ تو اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرائے۔ وہ کیا چیز تھی؟ کیونکہ میری نظروں کے سامنے کوئی شفاف منظر نہیں آرہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ بھینسے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ کسی کے سر سے خون بہنے لگا۔ کسی کے سینگ ٹوٹ گئے۔ بہرحال وہ تماشہ کافی دیر تک جاری رہا۔ وہ بھینسے ٹوٹی پھوٹی حالت میں میری طرف بڑھنے لگے۔ اور پھر کسی چیز سے ٹکرا کر پلٹ جاتے۔ پھر تھک ہار کر وہ بھی غائب ہوگئے۔ بڑی اذیت ناک رات تھی وہ۔ اس کے بعد کوئی خوفناک واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اب تو صرف ایک ہی لگن تھی کہ بقیہ دن بھی پورے ہوں۔ اور میں اس مورتی کا مالک بن جاؤں۔

پھر چالیسواں دن بھی آگیا۔ شکر تھا۔ اس کے بعد کوئی مجھے تنگ کرنے نہیں آیا۔ دل میں ایک خوف کا احساس بھی تھا کہ دیکھو آگے کیا ہوتا ہے لیکن یہ خوشی بھی تھی کہ چلو یہ جاپ تو ختم ہوگیا۔

چالیسواں دن بھی آہستہ آہستہ اپنا وقت پورا کررہا تھا۔ میں بھی انتہائی توجہ کے ساتھ جاپ میں مصروف تھا۔ اور ساتھ ساتھ ایسے واقعات پیش آنے والے واقعات کا منتظر تھا۔ اس دوران مجھے بہت سے اندازے ہوئے تھے جاپ کے ان دنوں میں مجھے ڈرانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ لیکن میری تقدیر نے میرا ساتھ دیا تھا۔ دن اور رات کی تمیز کیے بغیر میں نے اس کا پھیر کیا تھا۔ نجانے کتنی بار یہ عمل دہرایا تھا۔ اب تو مجھے یہ الفاظ ایسے ازبر ہوگئے تھے۔ کہ شاید انہیں زندگی بھرنہ بھول پاتا۔ ویسے ایک بہت اچھا تجربہ ہوا تھا۔

عام دنیا کے لوگ کہتے ہیں کہ جو لوگ نئے نئے لوگوں سے ملتے ہیں۔ ان سے خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ ان کے کام آتے ہیں۔ اور ان سے کام بھی لیتے ہیں۔ وہ دنیا میں کامیاب کہلاتے ہیں۔ لیکن میرا تو کسی انسان سے پالا ہی نہیں پڑا تھا۔ ہر لمحہ، ہر دن، زبردست تحفے میرے منتظر رہتے جو میرے خیر خواہوں نے مجھے ڈرانے کے لئے۔ میرا جاپ توڑنے کیلئے بھیجے تھے۔ اپنے ان محسنوں کے تحفوں کو بھی نہیں بھول سکتا تھا۔

وہ مکروہ شکل کی بلیاں جن کی غراہٹ آدمی کے بدن کو لرزا دے۔ وہ انسانی آوازوں میں بلتی تھیں۔ انہوں نے میرا مذاق اڑایا تھا۔ مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد وہ مرد اور عورت...... آہ...... وہ منظر...... وہ منظر تو جیسے میرے دماغ پر نقش ہوگیا تھا۔ وہ عورت جس طرح سے اس آدمی کو کھا رہی تھی۔ اس کا انداز جانوروں سے بھی بدتر تھا۔ کس طرح اس نے اس

شخص کی آنکھیں نوچی تھیں۔ کان چبائے تھے۔ وہ شخص اس کی زبان بالکل صحیح کام کررہی تھیں حالانکہ شروع میں مجھے اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ تو میں یہ ہی سمجھا کہ ہونٹ کٹا ہونے کی وجہ سے شاید ایسا ہے۔ لیکن آخری وقت میں اس آخری وقت میں وہ بالکل صحیح الفاظ ادا کررہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں بھی بدروح ہیں۔ پھر وہ بکرے کے کٹے ہوئے سر جو میری توجہ ہٹانے کے لئے پھینکے گئے تھے۔ پھر بچوں کے رونے کی آوازیں۔ اس کے بعد وہ ہیبت ناک بونے۔ جو مجھے مارنے کے لئے بے چین تھے۔ اور اس کے بعد وہ بھینسے جن کی آنکھوں میں خون کی جھلک تھی۔ اس طرح نمودار ہوئے تھے۔ جیسے مجھے ختم ہی کردیں گے۔ لیکن میں خوفزدہ ہوئے بغیر ان تحفوں کو قبول کرتا رہا۔ انہیں برداشت کرتا رہا تھا۔ اور اب...... اب اس جاپ کے اختتام کا وقت آن پہنچا تھا۔

پھر سورج ڈھل گیا۔ اور یہ ہی وقت تھا۔ جب میرا جاپ مکمل ہوگیا۔ ہاں...... چالیسویں دن سورج ڈھلنے کا وقت بتایا گیا تھا۔ مجھے پھر اچانک میں نے کسی کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا اور میں اپنی جگہ سہم گیا لیکن پھر میں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے۔ کہ یہ بھی میرے محسنوں کا کوئی تحفہ ہو۔ چنانچہ میں اس تحفے کے استقبال کیلئے تیار ہوگیا۔

غالباً وہ کوئی عورت ہی تھی۔ اس کے پیروں میں گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ اور اس کی قدموں کی دھمک کے ساتھ ساتھ آوازیں پیدا کررہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ میرے قریب آگئی۔ اور میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ میرے بالکل قریب آگئی۔ اور میں اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ گیا۔

آنے والی جے پالی تھی۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ کا انداز لئے آنکھوں میں وہی روشنی تھی۔ لیکن...... لیکن مجھے محتاط رہنا چاہئے۔ ہوسکتا ہے یہ بھی فریب ہو۔ اور اگر میں اپنی جگہ چھوڑ دوں تو سب ختم ہوجائے گا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"علی خان۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"علی خان میں ہوں۔ جے پالی۔ تمہاری ساتھی...... تمہاری دوست۔"

جواب میں میں نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

"علی خان تمہارا جاپ ختم ہوگیا ہے۔ اب تم آزاد ہو تم بول سکتے ہو۔ تم اپنی جگہ اٹھ کر باہر جاسکتے ہو۔ باہر کی فضاؤں میں سانس لے سکتے ہو۔ کچھ تو بولو۔"

"مجھے یہ احساس ہوا تھا۔ کہ واقعی میرا جاپ تو اب ختم ہوچکا تھا۔ اور اب میں کم از کم کسی کو مخاطب کرسکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"میں کیسے مان لوں کہ تم جے پالی ہو۔؟"

جواب میں جے پالی کا قہقہہ بلند ہوگیا۔ "اب میرے پاس کوئی نشانی تو ہے نہیں جو میں تمہیں دکھاؤں اور یقین دلاؤں۔"

"پھر بھی یہ میری نظر کا دھوکہ بھی ہوسکتا ہے۔"

"اور میری آواز۔؟"

"ان چالیس دنوں میں میں نے جو کچھ یہاں دیکھا ہے اس کے سامنے تمہاری آواز کا جے پالی جیسی ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔"

"نہیں...... علی خان میرا یقین کرو۔ میں جے پالی ہوں۔ اچھا...... یہ دیکھو۔" وہ یہ کہہ کر میری جانب بڑھی اور اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔ میں اس سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کی گرفت اور مضبوط ہورہی تھی۔ مجھے مجبوراً کھڑا ہونا پڑا۔ اس نے پھر کہا۔

"دیکھو علی خان! مجھ سے پہلے تم نے جو کچھ یہاں دیکھا یا جن چیزوں سے تمہارا واسطہ پڑا انہوں نے تمہیں چھوا تک نہیں اور چھو بھی کیسے سکتے تھے۔ جاپ کے دوران تمہارے اردگرد ایک دیوار تھی۔ ایک ایسی دیوار جو نہ تمہیں نظر آسکتی تھی۔ اور نہ کسی اور کو۔ اور تم تک پہنچنے والی ہر چیز اس دیوار سے رک جاتی تھی۔ اور جہاں تک اس بکرے کے خون کی چھینٹوں کا تعلق ہے۔ تو اسکے لئے دیوار کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایک ضروری

چیز تھی۔ لیکن تم دیکھ لو۔ ایک بھی سر تم سے ٹکرا نہ سکا۔ میں تمہیں ہاتھ لگا سکتی ہوں۔ میں نے تمہیں ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں صرف اور جے پالی ہوں۔ تمہاری میڈم...... تمہاری دوست...... اور اب تم آزاد ہو۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی یہ سب کچھ درست ہی لگ رہا تھا۔ اگر یہ جے پالی نہ ہوتی۔ تو مجھے چھو نہ سکتی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے جتنے بھی لوگ یا بدہیت چیزیں میرے پاس مجھے ڈرانے کے لئے آئی تھیں۔ ان سب نے مجھے چھوا نہیں تھا۔

جے پالی نے پھر کہا۔

"اب جبکہ تم آزاد ہو تو تم اپنے انعام کے حق دار بھی ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔" جے پالی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے لئے ہوئے گن تیرہ کے مجسمے کے قریب پہنچ گئی پھر اس نے گن تیرہ کے پیروں کو چھوا اور میں نے دیکھا۔ کہ اس کے پیروں کے پاس سے زمین سرکنی شروع ہو گئی۔

غالباً اس کے پیروں میں کوئی کل تھا۔ جس کے دبانے سے زمین میں خلاء نمودار ہو گیا تھا۔ پھر وہاں اتنی جگہ بن گئی کہ ایک آدمی وہاں سے بآسانی اندر جا سکتا تھا۔ جے پالی نے میرا ہاتھ پکڑا اور پھر نیچے قدم رکھ دیئے۔ نیچے کئی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ جو غالباً کسی تہہ خانے میں جا کر ختم ہوتی تھیں۔ ہم نے ان سیڑھیوں سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ ابھی ہم آٹھ دس سیڑھیاں طے کی ہوں گی کہ ایک جانب سے آواز آئی۔

"بچالو...... ہمیں بچالو......"

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہ ایک سر کٹا شخص تھا...... میں نے پورے ہوش و حواس کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔ وہ سر کٹا ہی تھا۔ لیکن یہ سر کٹا بول رہا تھا۔ میں خوف سے کانپنے لگا۔

"نہیں علی خان! ڈرو نہیں...... یہ ہمیں کچھ نہیں کہے گا۔" جے پالی نے کہا۔

ہم کچھ اور نیچے اترے تو ایک اور شخص کو دیکھا۔ اس کے پورے بدن پر کانٹے تھے۔ اور دونوں آنکھیں غائب تھیں۔

"ارے لڑکے! بچالے...... بڑا انیائے ہوا ہے۔ ہمارے ساتھ بلکہ ظلم کیا ہے۔ ہم نے اپنے جیون کے ساتھ، بھگوان کے لئے بچالے ہمارا جیون۔"

میں بہر حال انسان تھا۔ ڈر تو لگ رہا تھا۔ لیکن اتنا یقین تھا۔ مجھے کہ جے پالی کے ہوتے ہوئے اب مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ نیچے اترتے کے دوران اسی طرح کے لوگ مجھ سے ٹکراتے رہے۔ کسی کا سر نہیں تو کسی کے جسم پر کانٹے تھے۔ کوئی کوڑھ کا مریض تھا۔ تو کوئی ہاتھ سے محروم تھا۔ لیکن سب کی زبان پر ایک ہی پکار رہی تھی۔ کہ انہیں بچالیا جائے۔

پھر ہم نیچے تہہ خانے میں پہنچ گئے۔ یہاں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی۔ جے پالی بولی۔

"جانتے ہو یہ لوگ کون تھے۔؟"

جواب میں، میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ اس مورتی کے حصول کے خواہش مند تھے۔"

"کیا؟"

ہاں...... تم سے پہلے ان لوگوں نے مجھ سے مورتی کے حصول کی خواہش ظاہر کی اور میں انہیں یہاں لے آئی۔ لیکن یہ سب کمزور دل کے مالک تھے۔ ان کا دل تمہاری طرح مضبوط نہیں تھا۔ ان کے اندر اعتماد کی کمی تھی۔ یہ سب ان چیزوں سے ڈر گئے تھے، جو صرف نظر کا دھوکہ تھیں۔ انہیں ڈرانے کے لئے تھیں۔ جاپ سے روکنے کیلئے تھیں۔ اس جاپ کا اصول ہے کہ جب جاپ الٹا ہوتا ہے۔ تو اس کے لئے شیلا کا سزا تجویز کرتا ہے۔ گن تیرہ کا دلارا۔ شیلا کا اپنے من پسند شراپ میں اس بھگت کو ڈال دیتا ہے اور پھر وہ بھگت ساری زندگی یہیں گزارتا ہے۔ آؤ! میں تمہیں شیلا کا سے ملواؤں۔" وہ مجھے پھر ایک جانب لے چلی...... سامنے دیوار تھی۔ اور میں حیران تھا کہ یہ مجھے کہاں لے جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن جلد ہی بات سمجھ میں آ گئی۔ اس سامنے والی دیوار میں ایک خلاء نمودار ہو گیا۔ جے پالی نے مڑ کر مجھے

دیکھا۔ پھر بولی۔

"آؤ...... علی خان! میرے پیچھے آؤ۔"

میں اس کے پیچھے پیچھے اس خلاء میں داخل ہو گیا۔ یہاں نسبتاً زیادہ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں۔ میں نے سامنے ایک بہت بڑا مجسمہ دیکھا جو زمین سے تقریباً پانچ فٹ اونچا تھا۔ اس کا پھیلاؤ کوئی آٹھ فٹ تھا۔ عجیب سے بے ڈھنگ ہاتھ پاؤں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ چہرہ انتہائی بھیانک بدن پر لبادہ تراشا گیا تھا۔ جس میں سے ہاتھ پاؤں باہر نکل کر پھیلتے چلے گئے تھے۔

جے پالی نے کہا۔ "یہ شیلا کا ہے۔ گن تیرہ کا چہیتا۔ میرے من کا میت۔ واقعی میرے من کا میت۔"

میں نے دیکھا۔ کہ جے پالی کی آنکھوں میں خمار بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ پھر جے پالی نے تھرکنا شروع کر دیا۔ کہیں سے طبلے کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن اس طبلے کا اس کمرے میں نام و نشان نہیں تھا۔ بس آواز ہی آ رہی تھی۔ وہ کسی ماہر رقاصہ کی طرح رقص کر رہی تھی۔ اور میں حیرانی سے اس کی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ بڑا ہیجان خیز رقص تھا۔

میں نے اس سے پہلے جے پالی کو اتنے جوش میں نہیں دیکھا تھا۔ جے پالی ایک اچھے خاصے بدن کی مالک عورت تھی۔ لیکن اس وجود کے باوجود اس کی یہ مہارت دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ کافی دیر تک وہ رقص کرتی رہی۔ طبلے کی آواز کے ساتھ گھنگروں کی جھنکار ایک عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ جے پالی کا چہرہ شدت جوش سے سرخ ہو گیا تھا۔ لیکن...... لیکن یہ کیا ......اس کے چہرے کی کھال پھٹنی شروع ہو گئی تھی۔ پھر اس کے ہاتھوں پیروں کی کھال بھی پھٹنے لگی۔ اس کا بدن نیلا پڑتا جا رہا تھا۔ پھر اس کی زبان اس کے سینے پر لٹک آئی۔ آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔ جبڑے کھنچ گئے۔

میں خوفزدہ بھی تھا۔ اور حیران بھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ پھر اس نے رقص کرنے کی رفتار کم کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ طبلے کی آواز بھی مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ پھر وہ بھی ختم ہو گئی اور جے پالی بھی رک گئی تھی۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ اوہ...... وہ آنکھیں...... ان آنکھوں میں انگارے روشن تھے۔ پھر طبلے کی تھاپ دوبارہ شروع ہوئی۔ اور وہ اس کے ساتھ دوبارہ رقص کرنے لگی۔ اس بار میں نے عجیب و غریب منظر دیکھا۔ اس کے بدن میں ہاتھوں کی جگہ سے مزید دو ہاتھ نکلنا شروع ہو گئے۔ پھر اس کی لمبائی اصلی ہاتھوں جتنی ہو گئی۔ پھر اس کے بدن سے اس کی ٹانگیں بھی دو سے چار ہوئیں۔ پھر مزید نکلنے لگیں۔ اب وہ اپنی اصلی ٹانگوں کے علاوہ اپنی اضافی ٹانگوں پر ناچ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا باقی جسم کبھی دائیں طرف جھک جاتا۔ اور کبھی بائیں طرف۔ بڑا پر اسرار اور ہولناک منظر تھا۔ جے پالی خود کسی چڑیل سے کم نہ لگ رہی تھی۔ بکھرے بال، لٹکی ہوئی زبان اس کے سارے ہاتھ پاؤں پھٹا ہوا گوشت پھر رقص کرتے کرتے اچانک وہ رک گئی۔ اور تیزی سے میری طرف مڑی۔

"علی خان۔!" بڑی عجیب سی آواز تھی اس کی۔

"جی...... جی۔"

"علی خان تجھے مورتی چاہئے ناں۔؟"

"جی......" میں شدید خوفزدہ تھا۔

"آ...... میرے پاس آ۔"

"کیا......؟"

"میرے پاس آ...... علی خان۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔ لیکن میں اس کے حلیے سے شدید خوفزدہ تھا۔

"میں آج خوش ہوں۔ علی خان! بہت خوش ہوں۔ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے۔ تو نے وہ حاصل کر لیا ہے جس کیلئے کئی لوگ اپنا جیون گنوا بیٹھے۔ کیا تو خوش ہے؟"

"جی۔"

"بہت خوش؟"

"جی بالکل۔"

"اچھا تو پہلے یہ مورتی لے لے۔"

اس نے اپنے لباس سے ایک مورتی نکالی۔ یہ وہی مورتی تھی جو اس نے پہلے مجھے دی تھی۔ میں ڈرتے

ڈرتے آگے بڑھا۔ اور پھر میں نے وہ مورتی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اس نے پھر کہا۔

''علی خان تو نے یہ مورتی بے شک حاصل کرلی ہے۔ اور تو اس کا حق دار ہے۔ لیکن یہ کام تو نے صرف اپنے لئے کیا ہے ناں۔؟''

''جی۔!''

''اور اس کام کے بدلے مورتی کسے ملی۔؟ تجھے ہی ملی ناں؟''

''جی بالکل۔''

''تو اس میں تو سارا فائدہ تیرا ہی ہوا۔ اس میں مجھے کیا ملا۔؟''

''آپ میری جان لے سکتی ہیں۔''

''ارے نہیں۔ ایک اتنی ہمت والا لڑکا جس نے بڑے بڑوں سے ادھورہ رہ جانے والا عمل کردکھایا۔ اس کی زندگی تو میرے لئے انتہائی قیمتی ہے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ تو میرا دوست ہے۔ اور اس دوستی کے صلے میں۔ میں تجھ سے ایک کام لینا چاہتی ہوں۔''

''مجھے بتایئے کیا کام لینا چاہتی ہیں آپ مجھ سے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ آپ کا ہر کام کروں گا۔'' میں نے سہمے سہمے انداز میں کہا۔ میری اب بھی وہی کیفیت تھی۔

''نہیں..... علی خان! ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اب گن تیرہ کا مجسمہ تیرے پاس ہے، اب تو خود ڈرانے والی چیز ہے۔ ایک طاقت کا مالک ہے۔ اب تو اس طاقت کو استعمال کرتے ہوئے۔ میرا وہ کام کرے گا۔''

''جی.....'' میں نے پھر اسی انداز میں کہا۔

''اس دنیا میں ہر شخص کے کچھ دوست ہوتے ہیں۔ جیسے تو میرا دوست ہے۔ لیکن زندگی کے ہر موڑ پر اس کے دشمن بھی اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ اور ان کا ایک ہی کام ہوتا ہے۔ اپنے حریف کا نقصان یا پھر اس کی موت۔ اس جیون پھیر میں میرے بھی پانچ دشمن ہیں۔ جو میری جان لینے کے خواہش مند ہیں۔ میں چاہتی ہوں کے میں ہی انہیں ان کے جیون سے آزاد کردوں۔ انہیں اس تکلیف سے ہمیشہ کیلئے مکتی مل جائے کہ میں ابھی تک زندہ کیوں ہوں۔ تو سمجھ رہا ہے ناں میری بات۔؟''

''جی میڈم!''

''اور اس کام میں تو میرا ساتھ دے گا۔ بلکہ ان پانچوں دشمنوں کو تلاش کرکے تو ہی ان کا خاتمہ کرے گا۔

''جی میں۔؟'' میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں...... تجھے میرا یہ کام کرنا ہوگا۔ مجھے اپنے پانچوں دشمنوں کا خون چاہئے۔''

''لیکن میں کس طرح۔؟'' میں مسلسل گھبرایا ہوا تھا۔

''گن تیرہ کی مورتی ہے۔ تیرے پاس یہ بہت بڑی شکتی ہے۔ اور اس شکتی کا مظاہرہ تو دیکھ چکا ترتیب وار ان دشمنوں کا خیال کرنا۔ یہ مورتی ان تک پہنچنے میں تیری معاون و مددگار ہوگی۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے۔ تجھے خود ہی سوچنا ہوگا۔ مجھے بس ان کا خون چاہئے اور جب تو ان پانچوں کا خون میرے پاس لے آئے گا تو پتہ ہے کیا ہوگا۔

''کیا......؟''

''یہ گن تیرہ کی شکتی کچھ معاملات میں محدود ہے لیکن ان پانچوں کا خون لانے کے بعد تو امر شکتی کا مالک بن جائے گا۔ میں تجھے وہ شکتی دوں گی کہ پھر شاید تجھ سے بڑا شکتی مان کوئی نہ ہو۔''

پھر اس نے شیلا کا کے مجسمے کے نیچے رکھا ہوا ایک پیالہ اٹھایا۔ اس پیالے میں ایک عجیب سا سیال تھا۔ اس کا رنگ بالکل سفید تھا۔ وہ بالکل پانی کی طرح تھا۔ لیکن پانی سے گاڑھا تھا۔ اس نے وہ سیال میرے منہ پر ڈال دیا۔

''جا بالک...... وجے ہو تیری۔ تیری وجے ہو۔ گن تیرہ کی شکتی تیرے ساتھ ہے۔ جے پالی کا آشیر باد تیرے ساتھ ہے۔ وجے تیرا مقدر ہے۔ تیری وجے اوش ہے۔ تیری وجے ہوگی۔''

جے پالی بلند آواز میں کہتی رہی لیکن میں خاموش کھڑا رہا تھا۔

(جاری ہے)

ایم اے راحت

قسط نمبر: 16

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرہول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دہشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراؤ، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

آنکھوں میں ہونے والی شدید جلن نے مجھے بے چین کردیا تھا۔ میں اپنی بے چینی کا اظہار جے پالی سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر یہ جلن شدید ترین ہوتی چلی گئی۔ اور میں نے دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ لیں۔ مورتی میرے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک میں اپنی آنکھیں ملتا رہا۔ یہ شاید اسی پانی کا اثر تھا۔ جو جے پالی نے میرے چہرے پر ڈالا تھا۔ اس پانی میں مرچیں یا ایسی کوئی چیز شامل تھی کہ کچھ دیر کے لئے میری آنکھیں بالکل بند سی ہوگئی تھیں، پھر یہ جلن ختم ہوگئی لیکن میں اب بھی آنکھیں مل رہا تھا، اور پھر آہستہ آہستہ یہ جلن ختم ہوگئی۔ میں نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹالیا۔

لیکن...... لیکن...... یہ کون سی جگہ تھی۔ سارا منظر ہی تبدیل ہوگیا تھا۔ اب نہ وہ مندر تھا، نہ شیلا کا مجسمہ اور نہ جے پالی میرے سامنے تھی بلکہ میں ایک میدانی ڈھلان پر کھڑا تھا۔ ایک ایسا میدانی ڈھلان جس پر مختلف قسم کے خودرو پودے اگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں لمبی گھاس ان پودوں کے درمیان جھانک رہی تھی۔ دور دور تک کھلا میدان نظر آتا تھا۔ کافی دور ایک سڑک نظر آرہی تھی۔ میں اس سڑک کی طرف چل پڑا۔

دل میں یہی خیال تھا کہ کسی طرح اس سڑک تک پہنچ جاؤں اور کسی ایسے شخص کو تلاش کروں جو آباد علاقے کا راستہ بتائے یا مجھے وہاں لے جائے چنانچہ میں چلتا رہا اور پھر سڑک تک پہنچ گیا۔ یہ ایک شفاف سڑک تھی۔ دور دور تک کسی آدم زاد کا نام ونشان نہ تھا۔ سڑک کے دوسری طرف بھی ایسے ہی ڈھلان تھے۔ کافی دیر تک میں اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر ایک جانب دھول اڑتی ہوئی نظر آئی غالباً کوئی گاڑی اس طرف آرہی تھی۔ میرا اندازہ درست نکلا کیونکہ اس دھول سے ایک گاڑی برآمد ہوئی۔ دراصل یہ وہ مٹی اور دھول تھی جو اس سڑک کے کناروں پر موجود تھی اور تیزی سے گزرنے والی گاڑیاں اس دھول کو اڑاتی ہوئی گزرتی ہوں گی۔

بہر حال میں اس بات کے لئے تیار ہوگیا کہ اس گاڑی کو ضرور روکوں گا۔ چنانچہ میں سڑک کے درمیان آ گیا۔ البتہ اتنی جگہ میں نے ضرور چھوڑ دی تھی کہ اگر گاڑی والا مجھے نہ دیکھ پائے تو میں ایک طرف ہو جاؤں تاکہ محفوظ رہوں۔ پھر میں نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے اور زور، زور سے اس انداز میں ہلانے شروع کردیئے۔ جیسے میں مدد چاہتا ہوں۔ پھر اس گاڑی والے نے شاید مجھے دیکھ لیا تھا کیونکہ اس کی گاڑی کی رفتار کم ہونا شروع ہوگئی۔ گاڑی میرے قریب آکر رک گئی۔ یہ بالکل نئی چمکتی ہوئی
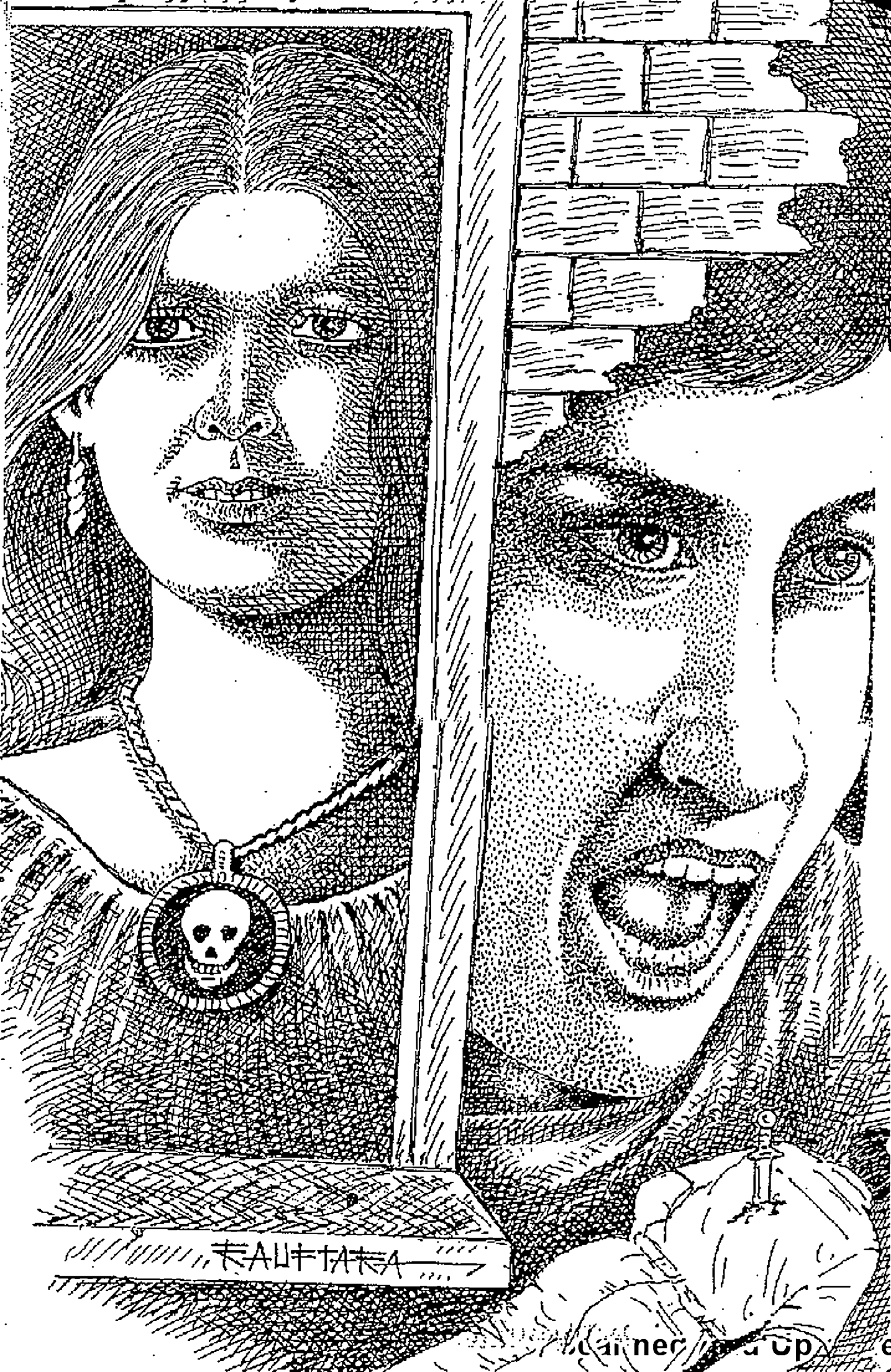
گاڑی تھی۔“ پھر اس میں سے ایک آدمی باہر نکلا۔ اچھا خوش شکل آدمی تھا۔ رنگ گورا، خوبصورت لمبے بال، جو شانوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سنہری فریم کی عینک ہاتھوں میں انگوٹھیاں، گلے میں چین پڑی تھی۔ جدید تراش خراش کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔

”آپ یہاں تنہا اس ویرانے میں کیا کر رہے ہیں۔؟“

”کچھ نہیں...... ایک مسافر ہوں۔“

”راستہ بھول گئے ہیں کیا۔؟“

”جی۔“

”لیکن آپ کے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔“

”نہیں جی! میں شہر جانے والی بس میں سوار ہوا تھا۔ پھر بس ایک جگہ رکی سب نیچے اتر کر ادھر ادھر گھومنے لگے۔ میں بھی ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اور میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو بس جا چکی تھی۔“

”اوہو...... یہ تو بہت برا ہوا۔“

”جی! شہر جانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟“

”ہاں...... کیوں نہیں؟ میں شہر کی طرف جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلیں، شہر میں آپ جہاں کہیں بھی کہیں گے میں آپ کو اتار دوں گا۔“ اس نے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والا دروازہ کھول دیا۔ میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پھر اچانک اس نے کہا۔

”آپ کا سامان وغیرہ؟“

”وہ بس میں ہی تھا۔“ سامان کے ذکر سے مجھے مورتی یاد آ گئی جو میں نے اندرونی لباس میں چھپالی تھی۔

”اوہ......! یہ تو بہت برا ہوا۔ آپ کا پرس وغیرہ تو ہے۔ آپ کے پاس؟“

”جی نہیں۔“

”تو کیا وہ اس سامان کے ساتھ......“

”جی ہاں! بالکل۔“

”پھر تو اس کو تلاش کرنا ہوگا۔ اگر سامان نہ ملا تو اس کی رپورٹ کرنا ہوگی۔“

”چھوڑیں صاحب! اب جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔“

”لیکن پھر بھی اہم کاغذ، کوئی ایسی دستاویز، جو اہم ہو، اور جس کے لئے رپورٹ کرنی پڑے۔“

”نہیں صاحب! اس سامان میں صرف میرے کپڑے اور کچھ پیسے تھے۔“

”چلو! یہ بھی غنیمت ہے۔ بہر حال بہت برا ہوا۔ تم کہو تو اس سامان کے حصول کے لئے میں کوشش کروں؟“

”نہیں صاحب! آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔؟“ جانے والی چیز تھی چلی گئی۔ اب اس کا غم کیا کرنا۔“

”تمہارا نام نہیں پوچھا میں نے ابھی تک تمہارا نام کیا ہے۔؟“

”علی خان ہے جی میرا نام۔“

”مجھے شیر گل کہتے ہیں۔“

”علی خان! تم رہتے کہاں ہو؟ کیا اسی شہر میں......؟“

”نہیں جی! اس شہر میں تو میں ایک اجنبی کی حیثیت سے جا رہا ہوں۔ میں تو کرشن پور کے ایک علاقے، مجیبی بستی میں رہتا ہوں۔“

”اچھا آپ کے والد کیا کرتے ہیں۔؟“

”والد نہیں ہیں۔“

”اور والدہ۔؟“

”وہ بھی نہیں ہیں۔“

”بڑا افسوس ہوا سن کر...... آئی ایم سوری۔“ جواب میں، میں خاموش رہا۔

”آپ پڑھتے ہیں؟“

”نہیں جی!“

”پھر کوئی کام وغیرہ کرتے ہیں؟“

”جی ہاں۔ ایک دکان پر ملازم ہوں۔“

”اچھا اچھا۔“ پھر وہ خاموش ہوگیا۔ کافی دیر تک اسی طرح خاموشی چھائی رہی پھر اس نے کہا۔ ”شہر جنگ آباد میں کہاں قیام کریں گے؟“

اس کے پوچھنے پر پہلی بار مجھے اس شہر کا نام پتہ چلا جہاں ہم جا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”وہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔“

”اور آپ کے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔“

”جی۔“ میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ میرے ہاں قیام کریں۔؟ بلکہ یہی مناسب رہے گا۔“

”جی آپ کا یہ احسان ہی بہت ہے کہ آپ مجھے شہر تک لے جا رہے ہیں ورنہ میں تو ان بیابانوں میں سر ٹکراتا پھرتا۔“

”اس میں احسان کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بحیثیت انسان یہ میرا فرض ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ سب نہیں کرتا تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ انسانیت سے خارج ہے۔ چنانچہ آپ کیلئے بہتر ہے کہ آپ کچھ روز میرے ہاں قیام کریں۔ جس مقصد کے لئے آپ یہاں آئے ہیں اسے پورا کیجئے۔ اور پھر اپنے شہر روانہ ہو جایئے۔“

”جی...... میرے خیال میں۔“

”خیال وغیرہ آپ چھوڑیں، آپ کو اب میرے گھر رہنا پڑے گا، اللہ کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اور ہاں رقم وغیرہ کی پرواہ بھی بالکل نہ کیجئے گا۔“

میں اس کا کیا جواب دیتا؟ خاموش رہا۔ پھر کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی شہر میں داخل ہوگئی۔ گاڑی کچھ دیر تک مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی راستے میں مجھے اندازہ ہوا کہ یہ چھوٹا سا شہر ہے۔ لیکن صاف ستھرا ماحول ہے۔ سڑکیں خوبصورت ہیں۔ چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی چھائی ہوئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بازار ہیں۔ بڑا ہی پرسکون ماحول ہے۔

میں اب تک پریشان رہا تھا۔ لیکن اب کچھ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اب مجھے ایک مقصد مل گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ طاقت بھی دی گئی تھی۔ ایک ایسی طاقت جو بہر حال ایک حیثیت رکھتی تھی اور یہ شخص...... یہ شخص تو میرے لئے فرشتہ ہی ثابت ہوا تھا۔

پھر گاڑی مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی ایک کوٹھی کے سامنے رک گئی پھر اس آدمی نے ہارن بجایا۔ ایک ملازم نے دروازہ اندر سے کھول دیا اور شیر گل گاڑی اندر لیتا چلا گیا۔ اس نے گاڑی ایک جگہ روک دی۔

”آؤ......“ اس نے کہا۔ اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

میں بھی نیچے اتر آیا تھا۔ میں نے شیر گل، کو دیکھا۔ اچھا خاصا لمبا چوڑا تھا۔ انتہائی شاندار شخصیت تھی اس کی، پھر میں نے کوٹھی پر نظر دوڑائی۔ انتہائی خوبصورت کوٹھی تھی۔ ایک طرف وسیع لان تھا، جس میں مختلف قسم کے پھول لگے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ ناریل کے درخت بھی تھے۔ کوٹھی کی شان و شوکت سے مجھے شیر گل کی حیثیت کا اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ شخص انتہائی دولت مند ہے۔ بڑی آن بان ہے اس کی“

شیر گل مجھے لئے ہوئے آگے بڑھا، اور سامنے کی سمت جانے کی بجائے دائیں سمت چلنے لگا۔ آگے جا کر میں نے دیکھا کہ دیوار کے ساتھ ساتھ چار پانچ کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں پودے لگے ہوئے تھے۔ پھر شیر خان ان کمروں میں سے ایک کے دروازے کے پاس آیا۔ اور زور سے کسی کو آواز دی۔ ”پیر شیر،...... او...... پیر شیر۔“

جواب میں اندر سے آواز سنائی دی۔ ”...... آتا ہے گل جاناں ابی آتا اے......“ دو منٹ کے بعد دروازہ کھلا۔ اور اندر سے ایک آدمی برآمد ہوا۔ مضبوط ہاتھوں، پیروں والا پٹھان تھا۔ معمولی لباس پہنے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

”سلام...... صاب، تم آ گیا صاحب۔“

”تو کیا نہ آتا۔؟“

”نہیں صاب! کیا بات کرتا اے، ام تو انتظار کرتا تھا آپ کا۔“

”چلو انتظار ختم ہوگیا اب تمہارا۔ اب خوش ہو ناں۔؟“

”جی ہاں۔ بہت خوش ہوں۔“

”اچھا۔ سنو یہ ہمارے مہمان ہیں یہ کچھ دن یہاں

قیام کریں گے۔"

"جی اچھا صاب!" "انہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگا۔ آپ فکر مت کرو۔"

"دیکھو علی خان! تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، تم یہاں رہو۔ اپنا کام کرو، اور یہ کچھ پیسے ہیں، انہیں رکھو۔" اس نے جیب سے سو سو کے چند نوٹ نکال کر میری جانب بڑھا دیئے۔

میں جھجکتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

"ارے اس میں جھجکنے کی کیا بات ہے۔ مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو، اور کھانے پینے یا دوسری چیزوں میں بھی تکلف نہ کرنا۔ جو چاہیے ہو، بلا جھجک کہنا۔ ٹھیک ہے ناں؟"

"جی۔"

"اور یہ......" اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیسوں کی جانب اشارہ کرکے کہا۔ "یہ آپ رکھیں۔"

"نہیں! اگر مجھے ضرورت ہوئی تو آپ سے مانگ لوں گا۔"

"ارے نہیں!" "یہ......رکھ لو......" اس نے زبردستی نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیئے تھے۔

پیر شیر نے مجھ سے کہا۔ "آؤ صاب!" اور میں اس کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ کمرہ اچھا خاصا تھا۔ صاف ستھرا، ایک جانب درمیان میں ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی سامان نہیں تھا۔ بہرحال سر چھپانے کا بہتر ٹھکانہ مل گیا تھا۔ میں نے سوچا کچھ دن یہاں رہوں گا۔ اس کے بعد یہاں سے نکل کر کوئی دوسری جگہ تلاش کرلوں گا۔ ابھی تو بے پالی کا کام بھی کرنا تھا۔

"صاب! یہ آپ کے رہنے کا کمرہ ہے۔ اگر کوئی چیز چاہیے ہو، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، تو آپ بلا جھجک کہو ہم آپ کا خدمت کیلئے تیار ہے۔"

"جی اچھا۔"

"صاب آپ اب حکم کرو۔"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"صاب ہم ابھی آپ کیلئے کھانا بھجواتا ہے۔ آپ منہ ہاتھ دھولو۔ وہ دیکھو......وہ باتھ روم ہے۔" اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔ کمرے کے ساتھ ہی باتھ روم بنا ہوا ہے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ اور باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ اچھی طرح منہ دھویا مجھے مورتی کا خیال آیا۔ اور میں نے اپنے لباس سے مورتی نکال لی۔ مورتی بالکل صحیح سلامت تھی۔ میں نے اس کو واپس اپنے لباس میں رکھ لیا۔ پھر میں باہر آگیا کچھ دیر کے لئے مسہری پر لیٹ گیا۔ آرام دہ مسہری تھی۔ اور لیٹنے میں لطف آرہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کون۔؟"

"میں ہوں۔ ملازمہ......آپ کے لئے کھانا لائی ہوں۔"

میں نے دروازہ کھول دیا۔ پندرہ سولہ، سال کی ایک پیاری سی لڑکی کھانے کی ٹرے ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ میں ٹرے اس کے ہاتھ سے لینے لگا تو وہ بولی۔ "ارے آپ کیوں تکلیف کررہے ہیں۔ میں کھانا میز پر لگا دیتی ہوں۔" اس نے کہا تو میں نے اسے اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔ پھر اس نے کھانا میز پر لگا دیا۔ ساتھ پانی کا جگ بھی تھا۔ کہنے لگی۔

"کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے۔ میں ابھی دوبارہ چکر لگاؤں گی۔"

"نہیں تم جاؤ، بس اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے کہا ۔اور وہ چلی گئی میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے اندر عجیب سی بے چینی ہے۔ جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ لیکن کہہ نہ پا رہی ہو۔ بہرحال وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ میں نے میز مسہری کے قریب ہی کھسکا لی، اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ انتہائی مزیدار کھانا تھا۔ میں نے خوب سیر ہوکر کھانا کھایا۔ برتن میز پر ہی رہنے دیا۔ اس کے بعد میں مسہری پر لیٹ گیا۔

کچھ دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ "آجاؤ، دروازہ کھلا ہے۔" میں نے کہا۔ وہی لڑکی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے خاموشی سے برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھے پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

"نہیں......شکریہ۔!" میں نے کہا، اور وہ واپسی کیلئے مڑ گئی۔ میں اسے دروازے سے باہر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

پھر میں آرام کرتا رہا۔ میں نے اپنے خیالات کو اب ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اور کافی حد تک پرسکون بھی ہوگیا تھا۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

"کون؟ اندر آجاؤ۔" میں نے کہا۔ اور پیر شیر اندر داخل ہوگیا۔ میں ایک بار پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"او......لیٹے رہو......صاب! ہم تو یہ پوچھنے کو آیا کہ تم نے کھانا کھالیا۔؟"

"ہاں......پیر شیر" میں نے جواب دیا۔

"اور چائے۔؟"

"نہیں چائے نہیں پی۔"

"اوہ......صاب! تم بہت شرماتا ہے اس بی بی سے چائے کا بول دیتا ۔ دو منٹ میں آجاتا ......اچھا......ہم خود چائے لے کر آتا ہے۔" پیر شیر نے کہا اور باہر چلا گیا۔ بہت اچھا، رویہ تھا ان لوگوں کا میرے ساتھ۔ ایک تو کھانا ہی اتنا شاندار تھا۔ اس کے بعد چائے اور دوسری چیزیں، میں بہرحال ان لوگوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد پیر شیر، چائے لے کر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ جس میں چائے کی کیتلی رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی دو پیالیاں بھی تھیں۔ یہ برتن بھی انتہائی خوبصورت تھے۔ پیر شیر بولا۔ "صاب! تم کو برا نہ لگے تو ہم بھی آپ کے ساتھ؟"

"ہاں......پیر شیر، اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ اور پیر شیر، نے دونوں پیالیوں میں چائے انڈیلی۔ پھر ایک کپ میری جانب بڑھا دیا۔ اور دوسرا کپ لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ پیر شیر کے چہرے پر کچھ ہچکچاہٹ کے آثار ہیں۔ میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"کچھ کہنا چاہتے ہو۔ پیر شیر۔؟"

"ہاں......صاب! ہم جانتے ہیں۔ جو کچھ ہم کہیں گے۔ اس سے ہماری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لیکن ہمارا دل چاہتا ہے کہ......"

"کہو......پیر شیر!" میں نے کہا۔ لیکن اس وقت ایک عجیب سی آہٹ ہوئی اور پیر شیر کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

پیر شیر خوفزدہ نگاہوں سے دروازے کی جانب دیکھتا رہا۔ جیسے کسی کی آمد کا منتظر ہو۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد آہٹیں ختم ہوگئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی دروازے کے پاس سے گذر رہا تھا اور اب وہاں سے چلا گیا تھا۔ پھر بھی احتیاطاً پیر شیر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے دروازہ کھولا ۔اور باہر جھانکنے لگا۔

میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ پیر شیر کس سے خوفزدہ ہو رہا ہے۔ یا جو کچھ بھی وہ مجھ سے کہنا چاہتا ہے۔ وہ کیا ہے۔ صورتحال جو کچھ بھی تھی۔ میرے علم میں تھی۔ لیکن شیر گل کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ پیر شیر پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد واپس پلٹا، اور میرے پاس آگیا۔ اس نے بھاری آواز میں کہا۔

"صاب! بات کو جلدی ختم کرتا ہوں۔ اصل میں آپ کی شکل میرے چھوٹے بھائی سے بڑی ملتی جلتی ہے ۔ میرا چھوٹا بھائی میری بستی میں دشمنی میں مارا گیا۔ ہمارے خاندانوں میں دشمنی چلتی رہتی ہے صاب! بس آپ یہ سمجھ لو آج تک مجھے اپنا بھائی نہیں بھولا۔ میں اپنے بھائی کے قاتلوں میں سے چار کو ختم کرچکا ہوں۔ مگر ابھی میرے سینے میں انتقام کی آگ روشن ہے۔ خیر! چھوڑو صاب! میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ آپ میرے بھائی کے ہم شکل ہو۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ آپ ان لوگوں کے جال میں پھنسو، جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا۔ تو اس وقت میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر مجھ سے ممکن

ہو سکا تو میں آپ کی جان بچاؤں گا۔

صاب! ادھر سے نکل جاؤ، یہ خطرناک لوگ ہیں۔ یہ ان کا اڈہ ہے۔ ہم لوگ ادھر ہیروئن بیچتے ہیں۔ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ اسمگلنگ کرتے ہیں۔ سارے کام ادھر ہوتے ہیں۔ صاب! کسی بھی وقت ہماری زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ آپ کو یہ لوگ ادھر لائے ہیں۔ ابھی آپ لوگوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کریں گے۔ پھر آپ کے ہاتھوں قتل کرا دیں گے اور اس کے بعد آپ کو اپنے جال میں پھانس لیں گے۔ بس یوں سمجھ لو صاب! آپ زندگی بھر ان لوگوں کے جال سے نہیں نکل سکتے۔ پھر آپ یہ سب کام کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ابھی آپ آزاد ہو۔ ادھر سے نکل جاؤ۔"

"پیر شیر کے منہ سے ابھی اتنی ہی آواز نکلی تھی کہ اچانک باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرے ساتھ پیر شیر بھی چونک پڑا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"پناہ خدایا" اس کے بعد دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ گولیاں بڑے زور و شور سے چل رہی تھیں۔

اس کے بعد ایک آواز سنائی دی۔ وہ غالباً لاؤڈ اسپیکر پر سنائی دے رہی تھی۔ آواز نے کہا۔

"خبردار! پولیس نے تم لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اگر ایک بھی گولی اندر سے چلائی گئی۔ تو ساری عمارتوں کو بم سے اڑا دیا جائے گا۔ پولیس کی بہت بڑی تعداد نے تم لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ سامنے کے دروازے سے ایک ایک کرکے ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ۔ تو تمہاری زندگی بچ جائے گی۔ خیال رکھنا اگر پتھر بھی پھینکا گیا تو اس کا جواب گولی سے ملے گا۔"

پولیس بار بار یہ اعلان کر رہی تھی۔ اور میں بدحواسی اور پریشانی کے عالم میں سوچ رہا کہ پولیس نے بھی چھاپہ مارنے کیلئے یہی وقت مقرر کیا تھا۔ پیر شیر کی تفصیل بتانے کے بعد ممکن تھا کہ میں فوری طور پر یہاں سے نکل جاتا۔ پیر شیر ضرور میری مدد کرتا۔ لیکن تقدیر نے اس کا موقع نہیں دیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں کیا کروں؟ پریشانی کی لہر میرے پورے وجود میں دوڑ رہی تھی۔ اور میرا ذہن کوئی فیصلہ کرنے سے معذور تھا۔ آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا رہوں۔ باقی لوگ کیا کریں گے۔ یہ ان کا معاملہ ہے۔ اگر میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا تو اس پر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

باہر ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔ لیکن فائرنگ نہیں ہوئی تھی۔ یا تو ان لوگوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ پولیس نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اور ایسا کر ڈالا جائے گا۔ چنانچہ جان بچانا ضروری تھی۔ اور میرا بھی خیال درست ثابت ہوا۔ بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بھاگ دوڑ ہو رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد میرے کمرے کے دروازے پر لات ماری گئی۔

اس کے بعد چند طاقتور پولیس والے اندر گھس آئے۔ وہ اس طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے۔ جیسے جانور پکڑ رہے ہوں۔ ایک لمحے کے اندر اندر میری کلائیوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ میرے منہ سے ایک مدھم سی آواز نکلی تھی۔

"سنو.....تو.....میری بات سنو....."

لیکن میری بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے عمارت سے باہر لے آئے اور پھر ایک ٹرک میں اٹھا کر پھینک دیا۔ ٹرک میں اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ ان میں پیر شیر بھی تھا۔ جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ عمارت کی صفائی کی جا رہی تھی۔ تیرہ افراد پکڑے گئے تھے۔ شیر گل ان میں نہیں تھا۔ ابھی اندر تلاشی ہو رہی تھی۔ لڑکیاں بھی تھیں۔ ان میں وہ لڑکی بھی تھیں۔ جس نے مجھے کھانا دیا تھا۔ سب سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

بہت دیر تک یہ ہنگامہ آرائی ہوتی رہی اور اس کے بعد پولیس کا ٹرک اسٹارٹ ہو کر چل پڑا۔ اس کی منزل پولیس ہیڈ کوارٹر تھی۔ جس کا بورڈ مجھے نظر آ گیا تھا۔ پولیس کی ایک جیپ بھی ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ اور میں دل میں سوچ رہا تھا کہ منشیات کے اڈے سے پکڑا گیا ہوں۔ دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہمیں بہت بڑے ہال میں پہنچا دیا گیا۔ ہال خوب روشن تھا۔ ہتھکڑیاں پڑے ہوئے لوگ زمین پر بیٹھ گئے۔ پولیس والے ان میں سے بعض کو ٹھوکریں بھی مار رہے تھے۔ لیکن شکر تھا کہ میری طرف کوئی متوجہ نہیں ہوا تھا۔ رات آدھی کے قریب گزر گئی۔ اندر کے ماحول سے اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ اتنی رات ہو گئی ہے۔"

پھر ایک ایس پی تین انسپکٹروں اور کچھ سب انسپکٹروں کے ساتھ اندر آیا۔ وہ ایک ایک کرکے ان لوگوں کا جائزہ لیتا رہا۔ ان میں سے کچھ کو اس نے نام لے کر آواز دی تھی۔ اور بڑے طنزیہ الفاظ کہے۔ پھر وہ میرے پاس پہنچا اور اچانک ہی اس کی آنکھیں شدت حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے ایڑیاں بجا کر مجھے سیلوٹ کیا اور بدحواسی سے بولا۔

"ارے سر.....آپ.....آپ کو..... سوری سر..... بیوقوفو! جلدی کرو۔ چابی منگوا کر ہتھکڑی کھولو، تمہیں، تمہیں معلوم نہیں۔ یہ کون ہیں؟"

ایس پی کے چہرے پر ایسے بدحواسی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ جیسے اس نے بہت ہی بڑے اور معتزز شخصیت کو دیکھ لیا ہو۔

انسپکٹر بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ ایس پی نہایت معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ "سر آپ یقین کریں ان گدھوں سے غلطی ہوئی ہے۔.....سر اصل میں اس آپریشن کا انچارج میں ہی ہوں۔ سر.....پلیز.....پلیز سر.....آپ مجھے معاف کر دیں۔ کانسٹیبل احمق ہوتے ہیں۔ اور پھر سر آپ۔"

میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ پولیس آفیسر کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہے لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی۔ اور میری آرزو بھی تھی۔ کہ یہ غلط فہمی کسی حد تک ایسے ہی رہے۔ تاکہ میری جان بچ جائے۔ ویسے بھی اس پورے کھیل میں، میں کوئی کردار نہیں رکھتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہتھکڑیوں کی چابی آ گئی میری ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ اور اس کے بعد ایس پی نے گرج کر ایک انسپکٹر سے کہا۔ "صاحب کو اپنے ساتھ لے جا کر میرے گھر پہنچا دو۔ میں گھر ٹیلی فون کئے دیتا ہوں۔.....سر! پلیز، آپ اس وقت مجھ سے کچھ مت پوچھیں، بس آپ چلیں۔ سر پلیز!.....جس طرح سے بھی آپ کہیں، میں آپ سے معذرت کیلئے تیار ہوں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ بھائی تیری غلط فہمی قائم رہے۔ اور میری زندگی بچ جائے۔ ورنہ نجانے کیا سلوک ہو میرے ساتھ۔"

بہر حال میں وہاں سے چل پڑا۔ انسپکٹر بڑے پر احترام انداز میں میرے ساتھ باہر آیا۔ باہر پولیس کی جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے جیپ میں بیٹھنے کی پیشکش کی اور جب میں بیٹھ گیا تو وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ راستے بھر اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایس پی کے گھر والے نجانے میرے ساتھ کس طرح پیش آئیں۔

بہر حال! ابھی تک وہ عالم بدحواسی میں تھا۔ یقینی طور پر ایس پی نے اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں ہدایت کر دی ہوگی۔ ورنہ اتنی رات گئے کوئی خوبصورت کوٹھی اس طرح روشن ہو سکتی تھی۔ جتنی ایس پی کی کوٹھی روشن تھی۔

برآمدے ہی میں ایک عورت ساڑھی باندھے ہوئے کھڑی تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی موجود تھا۔ ان کے پاس دو ملازم بھی تھے۔ عورت نے آگے بڑھ کر میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"سر! میرا نام ہے راج کماری۔ میں ایس پی گوپال سکسینہ کی بیوی ہوں۔ یہ ہمارے بچے ہیں۔ بیٹی کا نام کرینہ، اور بیٹے کا نام وشال ہے۔ سر! گوپال سکسینہ نے ہمیں آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ آئیے پلیز! یہ گھر آپ کے قابل تو نہیں ہے لیکن یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں آئے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ یہی میری خوش قسمتی ہے کہ میں تھانے کے لاک اپ کے بجائے یا پھر کانسٹیبلوں

کے ہاتھوں مار کھانے کی بجائے یہاں تک آیا دیکھنا یہ ہے کہ یہ خوش قسمتی کب تک قائم رہتی ہے۔ بہرحال! وہ لوگ مجھے اندر لے گئے۔ راجکماری نے کہا۔

"سر! آپ لباس تبدیل کرلیجئے۔ ہوسکتا ہے۔ وہ آپ کے جسم پر فٹ آجائے، گوپال سکسینہ کا جسم آپ کے جسم سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے۔ سر..... کوئی ایسی، ویسی بات ہو تو معاف کردیجئے گا۔ ہم لوگ اصل میں تنید سے جاگے ہیں گوپال تو اپنی ڈیوٹی پر چوبیس گھنٹے مصروف رہتے ہیں، ہم ان کا انتظار نہیں کرتے، سو جاتے ہیں، آیئے پلیز۔!"

میں نے بھی دل میں یہ ہی سوچا تھا۔ کہ جتنی آسانیاں مجھے یہاں حاصل ہورہی ہیں انہیں حاصل کرنے سے گریز نہ کروں۔ کیونکہ اس کے بعد جو ہونا ہے اس کا مجھے اچھی طرح پتہ تھا۔ بہرحال! غسل خانے میں گیا۔ جو لباس مجھے دیا گیا تھا۔ وہ پہنا..... گوپال سکسینہ پر تو میں نے غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کا لباس میرے بدن پر پوری طرح فٹ تھا۔ میں اسے پہن کر باہر آیا تو نوجوان لڑکی میرا انتظار کررہی تھی۔ "آیئے سر! اب ایک کپ کافی تو ہمارے ساتھ ہی ہوجائے۔ نیند تو آپ کی خراب ہو ہی گئی ہے۔"

کافی کا نام سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ چنانچہ میں کرینہ کے ساتھ اس بڑے سے ہال میں پہنچ گیا جہاں ایک ڈائننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ یہاں وشال بھی تھا۔ راجکماری بھی تھی۔ کرینہ مجھے لئے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پہنچی۔ ایک کرسی پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب میں بیٹھ گیا تو وہ ایک کرسی پر میرے سامنے مسکراتی ہوئی بیٹھ گئی۔ میز پر بہت سی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ یہ وقت کا کھیل تھا۔ لیکن بات وہی تھی میں اس کھیل کو عارضی سمجھ رہا تھا۔ ظاہر ہے۔ اس کے بعد جو میری حجامت ہوگی، وہ دیکھنے کے قابل ہوگی۔

میں کھانے پینے سے فراغت حاصل کرچکا تو راجکماری نے کہا۔ "سر! اب آپ کچھ دیر آرام کرنا پسند کریں گے، آیئے میں آپ کو بیڈ روم تک پہنچادوں۔"

"ہاں۔ ضرور۔" میں نے کہا۔ اور راجکماری مجھے ایک خوبصورت بیڈ روم تک لے آئی۔ سنگل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ بہت ہی کشادہ کمرہ تھا۔ ایئر کنڈیشن چل رہا تھا۔ کمرے کا ماحول بڑا رومانی تھا۔ میں نے راجکماری کا شکریہ ادا کیا اور وہ مجھے گڈ نائٹ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ میں نے ہنستے ہوئے دل میں سوچا کہ "بی بی تھوڑی دیر تک تو گڈ نائٹ ہے اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کا مجھے علم نہیں۔"

میں مستانہ چال چلتا ہوا بیڈ پر جا بیٹھا گنیتو کی مورتی میں نے اپنے لباس سے نکال کر سرہانے رکھ لی۔ بہرحال ابھی تک اس کے نفع و نقصان کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں تو جن حالات سے گزر رہا تھا۔ وہ میرے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث تھے۔ میں بیڈ پر لیٹ گیا، نیلا مدھم بلب جل رہا تھا۔

لیٹنے کے بعد میں نے اس کمرے کے خوشگوار ماحول پر نظر ڈالی اور اچانک ہی اچھل کر بیٹھ گیا۔ دیوار پر ایک خوبصورت فریم آویزاں تھا۔ اور اس میں ایک عورت کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ لیکن یہ عورت۔ میرے خدا۔ اس عورت کو تو میں لاکھوں میں کیا کروڑوں میں پہچان سکتا ہوں۔ یہ جے پالی تھی۔ جو گہری آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے جے پالی کا جائزہ لیتا رہا۔ ایس پی گوپال سکسینہ کی غلط فہمی کا راز مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ مجھے سر، سر، کیوں کہہ رہا تھا۔ لیکن ایک بار بھی اس نے نام لیکر نہیں پکارا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو کم از کم مجھے یہ تو پتہ چل جاتا کہ اس کی غلط فہمی کی وجہ کیا ہے۔ لیکن ایس پی کا تعلق کسی طور جے پالی سے ہوگا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔

"اوہ..... میرے خدا! یہ بڑی خوفناک بات ہے۔ ایس پی بھی میرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ مگر جے پالی..... کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اب تو میں بہت زیادہ پریشان ہوگیا تھا۔

اسی وقت آوازیں سنائی دیں اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا باہر پولیس کی گاڑی آکر رکی تھی۔ میں نے ایک کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اور میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ ایس پی غالباً اپنی ڈیوٹی سے واپس آگیا تھا۔ ملازم اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے، پھر وہ اندر چلا گیا۔ میرے لئے اس کے پاس جانے یا اس سے ملنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں وہاں سے ہٹا، اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا۔ جے پالی کی تصویر کے پاس آگیا۔ اسی وقت مجھے جے پالی کی آواز سنائی دی۔

"کہو، لطف آرہا ہے نا زندگی کا؟"

میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی موجود نہیں تھا۔ ایک بار پھر میری نگاہیں اس نیم تاریک ماحول میں تصویر کا جائزہ لینے لگیں۔ تو میں نے جے پالی کی تصویر کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ تو کیا یہ تصویر بولی ہے؟"

"بتایا نہیں تم نے....." اس بار جے پالی کی تصویر کے ہونٹ ہلے اور میں نے گہری سانس لی۔

"جے پالی! تم.....؟"

"تم نے مجھے بہت پیار سے مخاطب کیا ہے۔ میں خوش ہوں۔ ہاں..... یہ میں ہی ہوں۔ گن تیرہ کے کمالات نہیں دیکھ رہے تم؟"

"گن تیرہ۔"

"تو اور کیا، پیر شیر یا اس سے بھی پہلے چلے جاؤ تمہیں جس محبت سے وہ لوگ شہر تک لے کر آئے۔ اس کے بارے میں تم کیا سمجھتے ہو؟ پھر پیر شیر نے تمہیں اپنے بھائی کا ہم شکل پایا۔ یہ بھی گن تیرہ کا کمال تھا۔ اس کے بعد اتفاقیہ طور پر پولیس نے اسی وقت ریڈ کردیا تھا۔ تم پکڑے گئے لیکن ایس پی گوپال سکسینہ نے تمہیں دیکھا۔ کوئی بڑا آفیسر سمجھ لیا۔ یقینی طور پر وہ یہ سوچ رہا ہے کہ اس گروہ کا سراغ لگانے کے لئے اس میں داخل ہوئے تھے۔ ان ساری باتوں کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

"میں نہیں جانتا جے پالی۔"

"سب میری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ گن تیرہ کے حصول کے بعد تم جتنے بڑے انسان بن گئے ہو۔ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے۔ لیکن جو وعدہ تم نے مجھ سے کیا ہے۔ اس کی تکمیل کے بعد ہی تم مکمل ہوسکو گے۔"

"وعدہ.....؟"

"ہاں..... پانچ شکار..... میرے پانچ شکار..... یاد نہیں ہے۔ وہ وعدہ تمہیں؟"

"یاد ہے۔"

"اور جانتے ہو کہ پہلا شکار کون ہے۔؟"

"کون؟" میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"ایس پی، گوپال سکسینہ" وہ بولی اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے تصویر کو تکتا رہ گیا۔ میرے دل میں اچانک ایک بغاوت کا احساس ابھرا تھا۔ ایس پی گوپال سکسینہ نے غلط فہمی ہی کی بنیاد پر سہی، لیکن اب تک جو میرے ساتھ سلوک کیا تھا۔ میرا رواں رواں اس کا احسان مند ہوگیا تھا۔ اور یہ عورت کہہ رہی ہے کہ ایس پی گوپال سکسینہ اس کا شکار ہے مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ اس نے یہ بات کہی تھی۔ مجھ سے کہ اسے پانچ آدمیوں کا خون درکار ہے۔ اگر ان پانچوں میں گوپال سکسینہ بھی شامل ہے تو کیا مجھ سا کوئی کمینہ انسان روئے زمین پر دوسرا بھی ہوگا۔؟ وہ میرا محسن ہے۔ اور میں اسے نقصان پہنچاؤں؟

اچانک ہی جے پالی کی آواز ابھری۔ "کس سوچ میں پڑ گئے۔؟ خاموش کیوں ہوگئے۔؟"

"جے پالی! میں ایس پی، گوپال سکسینہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"میرا دشمن ہے۔ یہ۔ اس دشمنی کی وجہ تمہیں نہیں بتاؤں گی۔ لیکن مجھے اس کا خون درکار ہے۔ جانتے ہو یہ وہ پائل ہے۔"

"پائل؟"

"ہاں۔"

"پائل کیا ہوتا ہے۔؟"

"جو ماں کے پیٹ سے پیروں کے بل دنیا میں آیا ہو۔ وہ پائل کہلاتا ہے۔ اور اس میں ایسی خصوصیت ہوتی ہے۔ کہ ہم کالے جادو والے ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایسے پانچ افراد کا خون جب میں اپنے بدن پر ڈال کر پورن ماشی کی رات کو اس سے نہاؤں تو مجھے

امرشکتی حاصل ہوجائے گی۔ میں اپنے جیون کو ہزاروں سال لمبا کرسکتی ہوں۔سن رہے ہو؟"

"ہاں۔!"

"یہ تمہاری مسہری ہے ناں۔؟"

"جی۔"

"اس کے پیچھے ایک خنجر اور ایک برتن رکھا ہوا ہے۔ ایس پی تھکا ہوا آیا ہے۔تھوڑی دیر کے بعد سوجائے گا۔ تم جاؤ گے۔ اس کی شہ رگ کاٹو گے۔اور خون پیالے میں بھر کرلے آؤ گے۔ میں تمہیں اس کے بعد بتاؤں گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔اس عمارت سے سیدھے باہر نکل جانا کوئی تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔یہ میرا پہلا کام ہے۔اور مجھے امید ہے کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو گے۔ گن تیرہ تمہیں دے کر میں نے تمہیں امرشکتی دے دی ہے۔ گن تیرہ تمہارے لئے وہ کچھ کرے گی کہ آگے آگے دیکھنا تم کیا سے کیا بن جاتے ہو۔ لیکن پانچ آدمیوں کا خون مجھے دینے کے بعد۔"

میرے ہاتھوں میں لرزش شروع ہوگئی تھی۔ساری زندگی امن وامان سے گزاری تھی۔ کسی کا خون کبھی نہیں کیا تھا۔ میں تو کسی جانور کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔میرے ہوش وحواس رخصت ہوتے جارہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر تصویر کی طرف دیکھا۔ جے پالی کی تصویر نے آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے پھر کہا۔"اب میں خاموش ہورہی ہوں۔جاؤ!اپنا کام کرو۔"

میں آہستہ آہستہ مسہری کی جانب بڑھ گیا۔ میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔مسہری کے سرہانے گن تیرہ کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔کیا اسے اٹھا کر باہر پھینک دوں۔اور ان ساری مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کروں یا پھر......یا پھر......"

اچانک ہی مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میرے ہاتھ پیروں میں کھنچاوٹ سی ہورہی ہے۔ میں مسہری کے عقبی حصے میں جھکا۔یہاں مجھے ایک چمکدار خنجر رکھا ہوا نظر آگیا اور اس کے ساتھ ہی ایک پیالہ بھی جو پلاسٹک کا بنا ہوا تھا۔آہ......مجھے وہی کرنا ہے۔جو اس نے کہا ہے۔ میں جادو کے جال میں پھنسا ہوا ہوں۔اس جادو سے نکلنا میرے لئے کسی طور ممکن نہیں ہے۔

جو کچھ بھی کرنا ہے۔ مجھے اس کے احکامات کے تحت کرنا ہے۔میرے لرزتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھے۔ میں نے خنجر اپنی مٹھی میں دبایا اور اس کے بعد پلاسٹک کا پیالہ بھی اٹھایا اب میں اپنی جگہ کھڑا ہوا کانپ رہا تھا۔اور یہ سوچ رہا تھا کہ"مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

پھر آہستہ آہستہ حواس قابو میں آنے لگے۔ایک بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر میں نے جے پالی کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔تو پھر ایسے طلسمی جال میں پھنس جاؤں گا۔جس سے نکلنا میرے لئے ممکن نہیں ہوگا۔یہ بات تو طے تھی کہ وہ شیطان زادی میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہوتی ہے۔اور......اور کچھ حاصل کرنے کے لئے مجھے اس کے احکامات پر عمل کرنا ہی تھا۔

☆......☆......☆

علی خان کی کہانی جاری تھی کہ اندر سے بلاوہ آگیا۔ اور وہ ادھوری کہانی چھوڑ کر چلا گیا۔لیکن نعمت علی اس کہانی میں کھویا ہوا تھا۔"پھر کیا ہوا۔علی خان، راجہ پرمیت سنگھ کے پاس کیسے پہنچ گیا نعمت علی کے ذہن میں ایک تجسس تھا۔ کیا راجہ کو اس کے بارے میں معلوم ہے۔ مسلمان ہے۔"غرض یہ خیالات اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے اسی رات چوبداروں نے اسے راجہ پرمیت سنگھ کا پیغام دیا۔

"راجہ صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔چوبدار نعمت علی کو لے کر چل پڑا خوبصورت محل کی کئی غلام گردشیں طے کی گئیں اور پھر چوبدار ایک دروازے پر جاکر رک گئے۔

"جاؤ۔اندر جاؤ۔"اسی نے کہا۔اور نعمت علی بڑا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔لیکن یہ کیا۔یہ تو دنیا ہی نئی تھی۔ اس طلسم گاہ کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔سرزمین ہندوستان، قدیم دیوی، دیوتاؤں کا ملک، جہاں پراسرار عقائد کے ساتھ انوکھے طلسم کدے بکھرے ہوئے تھے۔ اور اس وقت بھی ایک انوکھی دنیا نعمت علی کے سامنے آگئی تھی۔ وہ ایک انوکھی داستان کا دیدہ ور بن گیا تھا۔یہ

داستان ایک ناگ قبیلے اور آدمخوروں کی تھی۔اس قبیلے کا سردار غورال تھا۔

غورال جڑی بوٹیوں سے علاج کرتا تھا۔چھوٹی موٹی جادوگری کی باتیں بھی اسے آتی تھیں۔لیکن علاقہ ایسا تھا کہ قدم قدم پر ایک سے ایک جادوگر پایا جاتا تھا۔ قبیلوں میں جب ہنگامہ آرائی ہوتی تھی۔تو اس کے دو حصے ہوا کرتے تھے۔ایک جادوٹونوں والا دوسرا جنگ و جدل والا۔ جب جادوٹونوں کی جنگ ہوتی تو ماحول بہت عجیب ہوجایا کرتا تھا۔اور اس میں بڑی خونریزی ہوا کرتی تھی۔لیکن ذرا مختلف طریقے سے اور جب تلوار کلہاڑوں اور نیزوں کی جنگ ہوا کرتی تھی۔تو فیصلے لمحوں میں ہوجایا کرتے تھے۔

ان کا قبیلہ تباہ ہوا تو غورال نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے اپنے اہل خاندان کے ہمراہ دریائی راستے اختیار کرکے ایک طویل سفر منتخب کرلیا۔اور آخر تقدیر نے اسے یہاں تک پہنچادیا۔مقصد وہی تھا۔کوئی ٹھکانہ بچوں کی زندگی۔اور یہی سب کچھ انسان ہمیشہ سے سوچتا آیا ہے۔

اس کے بچے جوان ہوچکے تھے۔وہ جانتا تھا کہ جو کچھ وہ انہیں دے سکتا ہے اس کے بعد باقی زندگی انہیں اپنے طور پر ہی گزارنی ہے۔چنانچہ اس پر اس نے اپنا کوئی تسلط قائم کرنے کی بجائے ان سب کو آزادی دے دی تھی۔وہ سب اپنی اپنی راہوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

نگانہ کچھ زیادہ ہی خوش قسمت تھی۔اسے بالکل انسانوں کے انداز میں زندگی گزارنا پسند آگیا تھا۔اور اب اس کے جینے کا انداز بدل گیا تھا۔ادھر دوسری لڑکیاں بھی اپنے اپنے مستقبل تلاش کررہی تھیں۔غورال نے ان کے فیصلے انہی پر چھوڑ دیئے تھے۔اور وہ اپنی راہوں کے انتخاب میں تھیں۔

ادھر لڑکوں میں ہیموش نے سب سے پہلے اپنی منزل تلاش کرلی تھی۔اصل مسئلہ انسانوں کے درمیان رہ کر انسانوں کی فطرت سے مکمل واقفیت کا تھا۔جو بہرحال تھوڑے عرصے میں نہیں ہوجاتی۔دنیا میں کوئی ایسا علم نہیں ہے۔جو وقت سے پہلے تجربات دے، تجربے صرف عمر ہی کی دین ہوتے ہیں۔ماحول سے واقفیت ماحول میں رہ کر ہی ہوتی ہے غورال نے اپنے بچوں کو فطری طور پر ناگ بنا دیا تھا۔تمام تر خصوصیات کے ساتھ۔اور اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔باقی کام انہیں خود کرنے تھے۔

ہیموش نے اس سلسلے میں سب سے پہلے تیر مارا تھا کہ اس نے لوگا کو اپنے وجود میں اتار لیا تھا۔اور لوگا بہرحال ایک پراسرار بیر تھا۔ہیموش کو اس سے خاصا فائدہ ہورہا تھا۔ایک دن اس نے لوگا سے پوچھا۔

"لوگا!یہ بتا۔اس دنیا میں رہنے والے انسان بہتر اور خوبصورت زندگی کیسے گزارتے ہیں۔؟"

لوگا نے خود اسے اس کی زبان میں جواب دیا۔"شاطر، یہ لوگ گھر بنا کر رہتے ہیں۔یہ جو پتھر، سیمنٹ، اور مٹی کے گھر دیکھ رہا ہے۔ان میں سے ہر گھر کی ایک کہانی ہے۔بچپن سے یہ لوگ ماں باپ کے زیرسایہ پروان چڑھتے ہیں۔جوان ہوتے ہیں تو اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔بوڑھے ہوتے ہیں تو اپنی بیوی بچوں کے سہارے بقیہ وقت گزار کر آخرکار ختم ہوجاتے ہیں۔ ضرورتوں میں دولت بنیادی چیز ہے۔اور دولت کے حصول کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔"

"فرض کرو۔میں دولت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"میں تجھے سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ہیموش!"

پھر لوگا۔ اسے ریس کورس لے گیا۔ دوڑتے ہوئے گھوڑے ہیموش کو بڑے دلچسپ لگے تھے۔لوگا نے اس کے اندر سے کہا۔

"یہ تھوڑی سی رقم جو تیری جیب میں آچکی ہے لے اور گھوڑوں پر جوا کھیل۔"

"وہ کیسے کھیلا جاتا ہے۔؟ کیا ان کی پیٹھ پر بیٹھ کر جس طرح یہ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔جو گھوڑوں کو دوڑاتے ہیں۔"

"نہیں ادھر جاکر۔گھوڑوں پر نمبر لگا کر۔ میں تجھے بتائے دیتا ہوں۔"

اور پھر ریس میں ہیموش جیتا تھا۔ اور اسے نوٹوں کا پورا تھیلا لے کر ریس کورس آفس سے آنا پڑا تھا۔ ایک ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ اس نے اور اس کے بعد لوگا اسے مختلف طریقوں سے دولت حاصل کرنے کے گر بتاتا رہا۔

چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہیموش ایک دولت مند آدمی بن گیا۔ اس نے ایک بہت خوبصورت مکان خریدا۔ لوگا اسے ہر طرف سے گائیڈ کررہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہیموش ایک امیر آدمی کی حیثیت سے اس مکان میں مقیم ہوگیا۔ اس نے لوگا سے کہا۔

"اب مجھے کیا کرنا ہے۔؟"

"بہتر یہ ہے کہ اب تو اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دے۔ ایک عزت دار آدمی کی حیثیت سے تو یہاں پہنچ گیا ہے۔ آگے اپنے آپ پر بھروسہ کر، اور میری بات سن، میں تجھے یہاں تک تو لے آیا ہوں۔ لیکن تیرا دوست بن کر۔ اس وقت تیرا صحیح ساتھی بنوں گا۔ جب تو مجھے آزاد کردے۔"

"تجھے آزاد کرنے کا کیا طریقہ ہوگا۔؟"

"وہ میں تجھے بتادوں گا۔ لیکن ایک شرط پر۔"

"ہاں...... بول۔"

"سوچ سمجھ کر مجھ سے یہ طریقہ پوچھنا۔ اور اگر خلوص دل سے مجھے آزاد کرنے پر آمادہ ہو۔ تو میری بات پر عمل کرنا۔ اگر تو نے میری بات سننے کے بعد مجھے آزاد کرنے سے انکار کیا تو میں تیرے پیٹ میں رہ کر تیرے سارے وجود میں زہر پھیلا دوں گا اور تو مرجائے گا۔"

ہیموش دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ اس نے لوگا کو یہ نہیں بتایا تھا کہ درحقیقت میں وہ تو ایک ناگ ہے۔ زہر چاہے کسی بھی طرح کا ہو۔ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ بہرحال اس نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔

ادھر دوسرا کردار نیرون تھا۔ نیرون دوسرا ذہین نوجوان تھا۔ جو ابھی اپنی زندگی کے لئے بہتر راستے تلاش کررہا تھا۔ شلوگ جوغورال کا منجھلا بیٹا تھا۔ ابھی دنیا کے تجربے ہی کررہا تھا۔ لیکن نیرون کی زندگی میں خود بخود ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس نے اسے طویل کہانی سے منسلک کردیا۔ ابھی تک اس نے اپنے لئے کوئی ایسی جگہ منتخب نہیں کی تھی۔ جو مستقل ہوتی۔ ویسے بھی ان میں سے ہر شخص ابھی تک اس دنیا کو سمجھ رہا تھا۔

نیرون اس دن شہر کے ہنگامی ماحول سے کسی قدر تنگ آکر ویرانوں کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔ اور لمبا سفر طے کرکے شہری آبادی سے دور نکل آیا تھا۔ ذہنی طور پر سکون کا سمندر موجزن تھا۔ نہ آدم، نہ آدم زاد۔

قرب وجوار میں پہاڑی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہ ایک ٹیلے کی بلندی پر پہنچ کر بیٹھ گیا۔ باپ نے انہیں سانپوں کی فطرت بخش دی تھی۔ اور وہ سب اندرونی طور پر ناگ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مدھم سی بین کی آواز نیرون کے ذہن پر زور کی لہریں طاری کردیں۔ بین کی مدھم آواز دور سے آرہی تھی۔ لیکن ہوا کی لہریں اسے اپنے کندھوں پر سوار کرکے سفر کرارہی تھیں۔ اور نیرون اس آواز کو سن کر مست ہوتا جارہا تھا۔

بہت دیر تک بین بجتی رہی اور وہ مستی میں ڈوبا رہا۔ پھر جیسے ہی بین کی آواز بند ہوئی اس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا اور وہ چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اب اس نے انسان کی حیثیت سے سوچا کہ بین کی آواز آخر کہاں سے آرہی ہے۔؟"

اس خیال کے تحت اس کی آنکھیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ اور پھر اسے وہ روشنی نظر آگئی جو کافی فاصلے پر تھی۔ غالباً آگ کا الاؤ روشن کیا گیا تھا۔ اس کے شعلے فضاء میں بلند ہورہے تھے۔ اور ان شعلوں کے سائے میں کچھ انسانی بدن چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ نیرون بھلا خوفزدہ کیسے ہوسکتا تھا۔ وہ تو خود ایک آوارہ روح تھا۔ ایک ناگ جو انسانی شکل میں تھا۔ لیکن ضرورت کے وقت ناگ بن سکتا تھا۔ ایک خوفناک آدم خور قبیلے سے اس کا تعلق تھا۔ بہرحال یہ سوچنے لگا کہ ذرا پتہ چلائے کہ آخر یہ کیا ہے؟ چنانچہ اس کے قدم اس جانب اٹھ گئے۔ ایک انسان ہی کی حیثیت سے وہ آگے بڑھتا رہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس جگہ پہنچ گیا جہاں چھوٹے چھوٹے کٹے پھٹے خیمے لگے

ہوئے تھے۔ غالباً کوئی خانہ بدوش گھر وہاں قیام پذیر تھا۔ اور وہ اپنی کاروائیوں میں مصروف تھا۔

وہ انہیں دیکھتا رہا۔

زندگی رواں دواں تھی۔ ان کے درمیان، خانہ بدوش عورتیں کافی خوبصورت تھیں۔ لیکن ان میں ایک وحشت سی پائی جاتی تھی۔ اور وہ وحشت کافی دلکش لگ رہی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے سب تھے۔ پھر نیرون نے ان خانہ بدوشوں میں ایک اور عورت دیکھی نوجوان لڑکی تھی۔ حسن و جمال کا ایک دلکش شاہکار کہ آنکھیں اس پر جم کر رہ جائیں۔ اسے دیکھ کر ذہن پر ایک انوکھا سا تصور ابھرتا تھا۔ نیرون کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کی چال میں ایک انوکھا سا بانکپن ہے۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ روشنی کا ایک ستون ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ پھر اچانک اس نے ایک ایسے خوبصورت نوجوان کو دیکھا۔ جوان کے قریب آ کر رک گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نجانے کیوں نیرون کے سینے میں ایک رقابت کا سا انداز پیدا ہوگیا۔ یہ نوجوان اگر اس لڑکی کا شوہر یا منگیتر ہے تو اسے اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیوں کہ میں اسے پسند کرنے لگا ہوں۔

بہر حال نوجوان اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر وہ دونوں وہاں سے آگے چل پڑے اور ایک ٹیلے کی آڑ میں پہنچ کر رک گئے۔ نوجوان لڑکی نے کہا۔

”کیا بات ہے۔ کیلاش کچھ ناراض ناراض سی لگ رہی ہو۔ مجھ سے۔؟“

”تم کوئی اچھے آدمی نہیں ہو۔ زولا۔“

”کیا مطلب۔؟“

”یہ آنے والا وقت ہے۔؟ اتنی دیر میں آئے ہو۔“

”اوہ۔ تم نہیں جانتی کیلاش کہ مجھے کیسی کیسی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چھوڑو۔ ان باتوں کو دیکھو موسم کتنا خوبصورت ہے۔ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ چاند نکلتا ہے اور چھپ جاتا ہے۔ تو یوں لگتا ہے جیسے ہم چاند سے کھیل رہے ہوں۔ آؤ...... ہم ایک دوسرے سے کھیلیں۔“ نوجوان نے لڑکی کو مخاطب کیا اور وہ بے اختیار مسکرادی۔

پھر دونوں ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرتے رہے۔ نیرون گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ ذرا سا اندازہ لگایا جائے کہ ان لوگوں کا طرز زندگی کیا ہے۔؟ کسی خاص قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر ایسے ہی جنگلوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔؟

بہر حال اس کے بعد اس نے بقیہ وقت وہیں گزارہ یہاں تک کہ رات گزر گئی۔ اور دوسری صبح آ گئی۔ وہ ان لوگوں کا طرز زندگی دیکھتا رہا۔ اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں سے کچھ سوکھی لکڑیاں چن کر لائے تھے۔ تاکہ ان پر کھانا پکایا جاسکے۔ ان کے ساتھ جانور بھی تھے۔ جن کا دودھ وغیرہ نکال کر وہ اپنے لئے استعمال کر رہے تھے۔ نیرون ان کی زندگی کا مکمل طور پر تجزیہ کر رہا تھا۔ جنگل کے بیل بوٹے، چھوٹے موٹے جانور، ان کی خوراک بنتے تھے۔ نیرون دلچسپی سے ان لوگوں کا جائزہ لیتا رہا۔ یہاں تک کہ دوسری رات آ گئی۔ چاند نکل آیا تھا۔ اور آج آسمان روشن تھا۔ ستارے آسمان سے جڑے ہوئے تھے۔ اور ان کے بیچ و بیچ، چاند بے حد حسین لگ رہا تھا۔

نیرون ماحول کی رنگینیوں سے دلچسپی لیتا رہا۔ لیکن اچانک ہی وہ چونک پڑا۔ اسے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ پھر اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ جہاں ایک سرسراہٹ کا احساس ہوا تھا۔ اس نے دیکھا ایک انتہائی چوڑے پھن کا ناگ کنڈلی مارے کھڑا ہوا ہے۔ اس کا پھن پھیلا ہوا تھا۔ اور اس کا چمکدار خوبصورت بدن ہلکی ہلکی لہریں لے رہا تھا۔ اس کی ننھی منی خوبصورت آنکھیں نیرون پر گڑی ہوئی تھیں۔ نیرون حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ ان میں سے نہیں تھا۔ یعنی غورال کے بیٹوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ نیرون اچھی طرح اپنے سارے بہن بھائیوں کو پہچانتا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ناگ اس کے سامنے کیوں آ کر کھڑا ہوگیا ہے۔؟

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اور اس کا پھن

اس انداز میں پھیلا ہوا تھا۔ جیسے وہ اس پر پوری پوری نگاہ رکھنا چاہتا ہو۔ بڑی دیر ہوگئی۔ نیرون کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد سانپ نے اپنا پھن سکوڑا۔ اور پھر تیزی سے ایک جانب چل پڑا۔

لیکن نیرون کو اس سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ خود ناگوں میں سے ایک تھا۔ اور ناگ ہی بنا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ تیز رفتاری سے وہاں سے آگے بڑھا۔ اور سانپ کے پیچھے چلتا ہوا۔ ایک ٹیلے کی اوٹ میں چلا گیا۔ جیسے ہی نیرون ٹیلے کے دوسری جانب مڑا تو وہ حیران رہ گیا۔

دوسری جانب کیلاش تھی۔ جو حیران سی کھڑی ہوئی تھی۔ نیرون اسے دیکھ کر ایک لمحے کیلئے ٹھٹھک گیا۔ کیلاش کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ کچھ قدم آگے بڑھی۔ اور اس کی مترنم آواز ابھری۔

”کون ہو تم؟ ہمارے قبیلے کے تو نہیں ہو۔ اجنبی ہو؟ کہاں سے چلے آرہے ہو۔؟“ بہت سے سوالات اس نے ایک ساتھ کر دیئے۔ نیرون اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اور نجانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے لڑکی کی آنکھوں میں اسکے لئے دلچسپی سی ہے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور بولا۔

”یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں تم آسمان سے اتری ہو یا زمین سے نکلی ہو۔ اتنی حسین ہو کہ انسان کو اپنے اوپر قابو پانا مشکل ہوجائے۔“

نیرون بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”کیلاش ہے۔ میرا نام۔ اور تم کون ہو۔؟“ لڑکی کی آواز ابھری۔

”نیرون“

”انسان ہو۔؟“

”ہاں...... انسان ہی کہہ لو۔“

”کوئی سادھو، سفت ہو؟“

”وہ کیا ہوتا ہے...... میں نہیں جانتا۔“

”ارے تم سادھو...... سفت نہیں جانتے۔؟“

”نہیں۔“

”حیرت ہے۔ خیر تم جو کچھ بھی ہو مجھے یونان کے دیوتا معلوم ہوتے ہو۔“

”تم مجھے بیوقوف بنا رہی ہو۔ اتنی خوبصورت لڑکی اگر مجھے یونان کا دیوتا کہہ رہی ہے۔ تو میرے لئے یہ حیرانی کی بات ہی ہوسکتی ہے۔“ تم مجھے بیوقوف بنا رہی ہو۔“

”نہیں دیوتاؤں کو بیوقوف نہیں بنایا جاسکتا۔ اور خاص طور پر مجھ جیسی معمولی عورت۔“

”تم اور معمولی۔“

”تو پھر؟“ وہ ایک ادا سے مسکرائی۔

”تم...... میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں۔ جو تمہارے حسن کی تعریف کرسکیں۔“

”واہ اتنی خوبصورت باتیں کرتے ہو تم کہ دل عجیب عجیب سا ہو رہا ہے۔“

”کیلاش...... تمہیں دیکھ کر میں اپنا سب کچھ بھول گیا ہوں۔“

”چلو مان، لیتی ہوں۔ تمہاری بات۔ اچھا بتاؤ کہاں رہتے ہو تم۔؟ یہاں کوئی جگہ ہے۔ تمہارے رہنے کے لئے۔ یا کہیں سے چل کر آرہے ہو۔؟“

”نہ سادھو، ہوں۔ نہ سفت ہوں۔ نہ جوگی ہوں۔ لیکن یہ سمجھو میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ بس بھٹکتا رہتا ہوں۔“

”آؤ...... میرے ساتھ...... بڑی خوبصورت جگہ لے کر چل رہی ہوں تمہیں۔“

نیرون اس کے ساتھ چل پڑا۔ آگے ایک چھوٹا سا آبشار نظر آرہا تھا۔ وہ اسے لے کر اس آبشار کے پاس پہنچ گئی جہاں درخت اگے ہوئے تھے۔ یہ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ آسمان سے اتری چاندنی میں نیرون کیلاش کے ساتھ گھاس پر بیٹھ گیا۔ کیلاش نے کہا۔

”تمہیں دیکھ کر تو اپنے آپ کو بھول جانے کو دل چاہتا ہے۔ تم اس بات کو تسلیم نہیں کر رہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم ضرور کوئی دیوتا ہو۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم، اور میں خود تمہیں کوئی دیوی سمجھ رہا ہوں۔“

”دیوی اور میں۔؟ چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری دیوی اور تم میرے دیوتا۔“ وہ آگے بڑھی اور اپنا چہرہ نیرون کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ حیران بھی تھا۔ اور خوش بھی اس کی پسند کی حسینہ خود بخود اس کی جانب مائل ہوگئی تھی۔ لیکن وہ جسے اس نے پچھلی رات اس حسینہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کا کیا ہوگا۔ اچانک ہی نیرون کو دور کہیں سے ایک آواز سنائی دی، وہ زولا کی آواز تھی۔

”یہ کون ہے۔؟“

”ایک پاگل سر پھرا۔ جو میرے پیچھے پڑا ہے۔ لیکن جو تم سے دل لگا لے اس کی نگاہوں میں بھلا اور کوئی کیسے رہ سکتا ہے۔؟“ کیلاش نے کہا۔

نیرون خاصا متاثر ہوگیا تھا۔ لیکن رقیب روسیا کا تصور اس کے لئے بھی بڑا عجیب تھا۔ وہ دور سے زولا کے سائے کو دیکھتا رہا۔ زولا، دیوانوں کی طرح کیلاش کو آوازیں دیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن کیلاش نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ اور منہ سے کچھ بھی نہیں بولا تھا۔

بہر حال زولا۔ وہاں سے تھوڑی دوری پر جاتے ہوئے آگے نکل گیا۔ کیلاش خاموشی سے اسے جاتا دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”اب تم یہ بتاؤ۔ تمہارا ٹھکانہ کہاں ہے؟ میں تم سے کہاں مل سکتی ہوں۔“

”اسی جگہ ہر رات۔“ نیرون نے جواب دیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اسی وقت آجایا کروں گی۔“

چنانچہ نیرون اس سے رخصت ہوگیا۔ بڑی دلچسپ بات یہ تھی کہ کیلاش کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو نیرون کو بے حد متاثر کر رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیلاش سے اسے اپنائیت کیوں محسوس ہو رہی ہے۔

لیکن اس دن اسے ایک بوڑھا سپیرا ملا۔ اس کے ہاتھوں میں بین تھی۔ اور وہ ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ نیرون کو دیکھ کر وہ اس کے قریب آگیا۔ اور اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

”نوجوان۔ کیا تم سپیرے ہو؟ سپیروں کی اس وادی سے تمہارا کیا تعلق؟“

”نہیں بابا۔ لیکن تم کون ہو؟“

”میں سپیرا ہوں۔ ایک ناگن کو تلاش کر رہا ہوں۔ وہ ناگن جو اچھا دھاری ہے۔ یعنی اپنی جون بدل سکتی ہے۔ اتنی خوبصورت بن جاتی ہے کہ تم اسے دیکھ کے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ وہ ناگ رانی ہے۔ اور اس ناگ رانی کو قابو میں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان سپیروں میں سب سے بڑا سپیرا بن جائے۔ اگر میں نے اس ناگ رانی کو پکڑ لیا تو میرے قبیلے والے مجھے سردار بنا لیں گے۔“ نیرون نے گہری نگاہوں سے اس بوڑھے سپیرے کو دیکھا۔ اسے نجانے کیوں یہ شبہ ہوا تھا۔ کہ وہ یہ الفاظ کیلاش کے بارے میں کہہ رہا ہے۔ لیکن ابھی وہ اس وقت تک بوڑھے سپیرے سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جب تک وہ کیلاش پر حملہ آور نہ ہوجائے۔

☆......☆......☆

شلوگ ان دونوں بھائیوں میں ذرا مختلف طبیعت کا مالک تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی وحشیانہ فطرت کے مطابق وہ بھی آدم خور تھا۔ اور اس کے مشاغل بھی مختلف نہیں تھے۔ وحشت اور دیوانگی میں وہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود اس کے اندر شدید تجسس تھا۔ وہ اس نئی دنیا میں آکر بہت خوش تھا۔ اور اپنی فطرت و تجسس کے مطابق کچھ کرنا چاہتا تھا۔ ہیموش اور نیرون تو دو مختلف راستوں پر نکل ہی کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن شلوگ اپنی چیزوں کی کھوج میں تھا۔ جو اسے اس نئی دنیا کے ماحول سے روشناس کرا سکیں۔

سر پر چمکتا ہوا نیلا آسمان، زمین کی گہرائیاں، اس نئی دنیا میں موجود وہ تمام چیزیں جو سمجھ میں نہ آئیں۔ وہ ان کے لئے بڑی دلکشی رکھتی تھیں۔ وہ مستقل اسی کھوج میں رہتا کہ کوئی نئی بات اسے معلوم ہو۔ وہ انوکھی عمارتیں اس کے لئے نہایت حیران کن تھیں۔ جہاں وہ پہنچا تھا۔ جو درحقیقت سائنسی تجربہ گاہیں تھیں۔ وہاں اندر داخل ہونے کے لئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن شلوگ اس میں داخل ہوکر صورتحال کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

یہاں تک کہ ایک دن وہ سانپ بن کر ایک گٹر کے راستے اس عمارت میں داخل ہوگیا۔

عمارت اندر سے خاموش اور سنسان تھی۔ یہ خلائی تحقیقاتی ادارہ تھا۔ اور یہاں ہر طرف خلائی تحقیقات پر کام ہوا کرتے تھے۔ اس وقت یہاں کام کرنے والے تمام افراد چھٹی کر کے جا چکے تھے۔ شلوگ کو یہی غنیمت محسوس ہوا کہ وہ سانپ بن کر مختلف جگہوں کی سیر کرتا رہے۔ چنانچہ وہ کونے کھدروں سے گزرتا ہوا اس عظیم الشان لیبارٹری میں داخل ہوگیا۔ جہاں ہزاروں سائنسی آلات بکھرے ہوئے تھے۔ عجیب و غریب آوازیں فضا میں گردش کر رہی تھیں۔

شلوگ کو یہ سب کچھ بہت دلکش محسوس ہوا۔ یہاں سائنس کی فضائی تاریخ موجود تھی۔ وہ سانپ کی حیثیت سے ان تمام مشینوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ دفعتاً ہی اسے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ یہ باتیں کرنے کی اور انسانی قدموں کی آوازیں تھیں۔ کچھ لوگ اندر داخل ہو رہے تھے۔ شلوگ کے پاس چھپنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ تیزی سے ایک سمت بڑھا۔ اور جونہی اسے ایک سوراخ نظر آیا۔ وہ اس میں داخل ہوگیا۔ حالانکہ وہ بڑی خوبصورت جگہ بنی ہوئی تھی۔ سانپ کی حیثیت سے شلوگ کو سوراخ میں چھپ کر بیٹھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ لیکن یہ عجیب و غریب خلائی مشین تھی۔ جو اشیاء کو خلاء میں منتشر کر دیتی تھی۔ اور وہاں مختلف سیاروں پر پہنچا دیتی تھی۔

شلوگ کے فرشتوں کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی۔ کہ کیا ہونے والا ہے۔ چند ہی لمحوں کے بعد اچانک ہی اسے اپنے بدن میں تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ اور پھر ایک عجیب و غریب دھواں اس مشین کے اندر بھر گیا۔ شلوگ کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کا جسم ذرات میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اسے یوں لگا۔ جیسے اس کے جسم کے یہ ذرات مشین سے نکل کر فضا میں منتشر ہوگئے ہوں۔

کچھ لمحوں کے لئے۔ اس کے ہوش و حواس رخصت ہوگئے تھے۔ اور نجانے کتنی دیر گزری تھی کہ اس نے اپنے آپ کو انسانی جسم میں محسوس کیا۔ اس نے اپنے اطراف میں چاروں طرف دیکھا۔ اس کے اطراف میں ریت بکھری ہوئی تھی۔ اور وہ اسی ریت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ لیکن اس کے اندر ایک عجیب و غریب سوچ ابھری رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ ایک نئی نسل کا نمائندہ ہو۔

ایک انوکھا ذہن اس کے ذہن میں داخل ہوگیا تھا۔ غالباً یہ سب کچھ اسی مشینی عمل کا نتیجہ تھا۔ جو غیر متوقع طور پر سرزد ہوگیا تھا۔ وہاں موجود سائنس دان کوئی بہت ہی پراسرار تجربہ کر رہے تھے۔ اور یہ تجربہ شلوگ پر منتقل ہوگیا تھا۔

اس نے ایک بار پھر چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اس کے اردگرد چند نیلی جھاڑیاں تھیں۔ قریب سے ایک چھپکلی دوڑتی ہوئی نکلی۔ اس کا رنگ بھی نیلا تھا۔ اور کئی پاؤں تھے۔ شلوگ نے اوپر فضاء میں دیکھا۔ اس سر زمین پر ایک گنبد نما چھت سی تھی۔ جو چاروں طرف سے ریت کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ اور اس گنبد کی آخری سرحد اس سے صرف ایک سو گز پرے تھی۔ فضاء کا قطر صرف ڈھائی سو گز تھا۔ یہاں سب کچھ نیلا تھا۔ سوائے ایک سرخ چیز کے جو دور سے ایک گز قطر کے دائرے میں چمک رہی تھی۔ اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔

”کیا یہ سب ایک خواب ہے؟ یہ گرمی! یہ ریت، سرخ چیز، کی طرف دیکھنے پر عجیب خوف کا احساس ہوا تھا۔ نہیں، نہیں...... یہ خواب نہ تھا۔ کیونکہ خلائی جنگ کے دوران وہ سو نہیں سکتا تھا۔ پھر کیا یہ موت ہے؟ نہیں، یہ موت بھی نہیں۔ موت اس طرح نہیں ہوسکتی۔ نیلی گرمی، نیلی ریت، اور سرخ خوفناک چیز......اف۔“

وہ انہی باتوں کو سوچ رہا تھا۔ کہ اس نے ایک آواز سنی۔ اور یہ آواز اس نے اپنے کانوں کے بجائے اپنے سر کے اندر سے سنی۔ ان فضاؤں۔ اور اطراف و جوانب میں الفاظ اس کے دماغ میں سمانے لگے۔

اور اس جگہ وہ اسی وقت میں دو نسلوں کو موجود پاتا ہوں جو ایک زبردست جنگ میں کودنے والی ہیں۔ ایک

ایسی جنگ جو کسی ایک نسل کو بالکل ختم کردے گی۔ اور دوسری کو اس قدر کمزور بنادے گی۔ کہ اس کا وجود نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا۔ اور وہ رفتہ رفتہ خاک میں مل جائے گی۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔"

"کیوں...... تم کون ہو۔ جو یہ الفاظ کہے جارہے ہو۔؟" شلوگ کے دماغ سے یہ سوال اٹھا۔

"تم اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔" اور یہ الفاظ شلوگ کے دماغ میں رک گئے۔ "میں ہوں۔ ایک قدیم نسل کی ارتقائی منازل کی ایک انتہا اتنی قدیم کہ جس کی ابتداء کو ان الفاظ میں بتایا ہی نہیں جاسکتا جو تمہارے دماغ میں موجود ہیں۔ ایک ایسی نسل جو ایک واحد ذات پر مرتکز ہوگئی ہے۔ اور ابدی ہے۔ پس میں آنے والی جنگ میں مداخلت کرتا ہوں۔ وہ جنگ جو بالکل ایک جیسی طاقت رکھنے والے جنگلی لٹیروں میں ہوگی۔ اور جس کا انجام تمہاری اور بیرونی حملہ آوروں دونوں کی نسل کو ختم کردے گا۔ لیکن ایک کو لازماً زندہ رہنا چاہئے۔ ایک کو لازماً ترقی پانا اور باقی رہنا ہے۔"

"ایک کو......؟" شلوگ نے سوچا۔ "میری نسل یا دوسرے کی نسل۔؟"

"یہ میرے اختیار میں ہے۔ کہ جنگ کو ختم کردوں۔ بیرونی حملہ آوروں کو ان کی کہکشاؤں میں واپس بھیج دوں۔ لیکن وہ پھر حملہ کرنے آجائیں گے۔ یا تمہاری نسل کے لوگ جلد یا بدیر ان کو وہاں جالیں گے۔ اگر دونوں ہی اس فضاء میں موجود ہوں گے۔ تو میں ایک دوسرے کو تباہ ہونے سے نہ روک سکوں گا۔ اور پھر میں بھی باقی نہ رہ سکوں گا۔" الفاظ اس کے دماغ میں ریکارڈ ہونے لگے۔ واپس مجھے لازماً دخل دینا ہے۔ میں ایک بیڑے کو تباہ کردوں گا۔ دوسرے کی تباہی کے بغیر، اس طرح ایک تہذیب کو لازماً باقی رہنا ہے۔"

شلوگ نے سوچا۔ "خواب!"...... لیکن یہ خواب نہیں ہوسکتا ہے۔ پھر اس نے سوچا۔ "کون سی تہذیب اور نسل باقی رہ جائے گی؟"

"خاموش!" آواز نے کہا۔ "زیادہ طاقت والا لازماً رہے گا۔ میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ میں صرف اس لئے دخل دے رہا ہوں۔ کہ مکمل فتح حاصل ہو۔ میں نے اس فیصلے کے لئے میدان جنگ سے دو انسان چن لئے ہیں۔ ایک تم اور دوسرا وہی اجنبی۔ میں تمہارے ذہن سے معلوم کرچکا ہوں کہ تمہارے ابتدائی دور میں دو قوموں کی جنگ کا فیصلہ کرنے کے لئے طرفین کے دو پہلوانوں کی لڑائی غیر معروف نہ تھی۔ تم اور تمہاری مخالف یہاں میدان میں موجود ہو۔ اور بغیر کسی ہتھیار کے۔ اور دونوں ہی ان حالات میں ایک دوسرے سے تم دونوں قطعاً ناواقف ہو۔ اس جنگ کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں بچ جانے والا اپنی نسل کا ہیرو ہوگا۔ اور اسی کی نسل بقاء حاصل کرے گی۔"

"لیکن شلوگ کچھ کہنے ہی والا تھا۔ کہ اس کے سوال کا جواب آگیا۔ "یہ بالکل صحیح طریقہ ہے۔ دونوں کے حالات ایسے ہیں کہ جسمانی قوت حتمی طور پر مسئلہ کا فیصلہ کرسکتی ہے۔ یہاں ایک دیوار ہے۔ ذہنی طاقت اور ہمت حوصلہ زیادہ اہم ہوگا۔ قوت کے مقابلہ میں سب سے اہم حوصلہ بہادری اور جرأت ہے۔ جو بچنے والے کے اندر ہوگی۔"

"لیکن جب ہم لڑ رہے ہوں گے تو دونوں کے خلائی بیڑے۔؟" شلوگ نے سوچا۔

"نہیں۔ تم ایک دوسری فضا میں ہو۔ میں ایک، دوسرے وقت میں اس لئے کہ جب تک یہاں ہو فضا میں وقت خاموش رہے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم تعجب کررہے ہو کہ یہ جگہ حقیقی ہے۔ ہاں۔ یہ حقیقی ہے۔ اور حقیقی بھی نہیں جیسا کہ میں تمہاری محدود ذہانت کے لحاظ سے ہوں بھی، نہیں بھی۔ میرا وجود ذہنی ہے۔ جسمانی نہیں۔ تم نے مجھے ایک سیارے کی شکل میں دیکھا ہے۔ یہ ایک ذرہ ہوسکتا ہے۔ یا ایک سورج۔ لیکن تمہارے لئے اب یہ جگہ حقیقی ہے۔ یہاں جو کچھ تم کروگے وہ اصل ہوگا اور تمہارا وہی عمل آخری ہوگا۔ اور اگر یہاں تم مرگئے۔ تو وہ حقیقی موت ہوگی۔ یہاں تمہاری ناکامی تمہاری نسل کا خاتمہ ہوگی۔ تمہارے جاننے کے لئے

اتنا ہی کافی ہے۔" اور تب آواز بند ہوگئی۔

اب وہ پھر اکیلا تھا۔ لیکن بالکل اکیلا نہیں۔ اس لئے جب شلوگ نے اوپر دیکھا تو معلوم ہوا کہ سرخ شے وہ خوفناک سرخ حلقہ ہی اجنبی تھا۔ اور اس کی طرف لڑھکتا ہوا آرہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نہ تو ٹانگیں ہیں نا بازو اور نہ کوئی جسمانی ساخت، وہ پتلی ریت پر لڑھکتا ہوا آیا۔ پارے کی سی تیزی کے ساتھ، وہ اسی وقت شلوگ کے دماغ میں اس کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

دشمن دور سے لڑھکتا ہوا آرہا تھا۔ شلوگ نے قریب سے ایک پتھر اٹھایا تاکہ مقابلہ کرسکے۔ لیکن دشمن اتنی تیزی سے سر پر آگیا۔ کہ اسے جان بچانے کے لئے بھاگنا پڑا۔ اس کے پاس اتنا بھی وقت نہ تھا۔ کہ دشمن سے لڑائی کے متعلق سوچ سکے۔ اسکیم بنا سکے۔ ایک ایسی مخلوق سے جنگ کی اسکیم جس کی طاقت، جس کے عادات و اطوار، اور جس کے طریق جنگ کے متعلق اسے کچھ بھی علم نہ تھا۔

پانچ گز کے فاصلے پر دشمن رک گیا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اسے زبردستی روک دیا ہو۔ سامنے ایک نہ دکھائی دینے والی دیوار تھی۔ جس سے آگے دشمن نہ آسکتا تھا۔ تب شلوگ کو یاد آیا کہ یہ جنگ جسمانی طاقت سے نہیں جیتی جاسکتی۔ بلکہ اس کے لئے ذہنی قوت سے کام لینا ہوگا۔ گیند نما دشمن بار بار دیوار سے ٹکراتا تھا۔ اور پیچھے گر پڑتا تھا۔ شلوگ بارہ قدم آگے آیا۔ تو اس کے ہاتھوں نے بھی دیوار کو محسوس کرلیا۔ یہ شیشے کی بجائے ربڑ کی چادر کی طرح نرم تھی۔ اور چھونے سے گرم محسوس ہوتی تھی۔ اس نے دیوار کو اوپر سے اور دائیں بائیں اطراف سے دیکھا۔ لیکن دوسری طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اسے خیال آیا کہ دیوار کے نیچے سے کھود کر دوسری طرف جانے کا راستہ بنائے۔ اور دشمن پر حملہ کرے۔ نادیدہ ربڑ کی دیوار چھونے سے گرم محسوس ہوتی تھی۔ لیکن یہ انتہائی عجیب تھی۔ کہ بالکل قریب سے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود بھی ربڑ کی دیوار نظر آتی تھی۔ شلوگ نے کچھ سوچ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر ایک طرف ڈال دیا۔ اور دونوں ہاتھ نادیدہ دیوار پر رکھ کر اسے دھکیلا۔ اس میں بلاشبہ لچک موجود تھی۔ لیکن زیادہ نہیں۔ پوری قوت صرف کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور نہ نکلا کہ دیوار چند انچ پرے ہوکر پھر اصل جگہ پر واپس آگئی۔

پھر شلوگ اپنے پنجوں کے بل کھڑا ہوکر دیوار کی بلندی معلوم کرنے لگا۔ جہاں تک اس کی انگلیاں پہنچ سکیں۔ وہاں تک دیوار موجود تھی۔ شلوگ نے دیکھا کہ گیند نما سرخ دشمن لڑھکتا ہوا۔ پھر اس کی جانب آرہا ہے۔ اسے دوبارہ ابکائی سی محسوس ہوئی۔ اور وہ دیوار سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ لیکن دشمن نہیں رکا۔ وہ اپنی طرف دیوار کے ساتھ ساتھ ایک جانب چلا آیا تھا۔ شلوگ کے دل میں خیال آیا شاید یہ نادیدہ دیوار محض زمین کی سطح تک ہی قائم ہو۔ اور زمین کھود کر دوسری جانب نکلنے کا راستہ مل سکے۔ یہ سوچ کر وہ جھکا اور ریت ہٹانے لگا۔ ریت بہت نرم اور ہلکی تھی۔ اور اسے آسانی سے کھودا جاسکتا تھا۔ چند منٹ میں اس نے دو فٹ گہرائی تک ریت نکال ڈالی اور پھر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا تو وہاں بھی نادیدہ دیوار کی رکاوٹ محسوس ہوگئی۔

سرخ دشمن واپس پلٹ رہا تھا۔ ظاہر ہے۔ اسے بھی اپنی حدود سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملا۔ شلوگ نے سوچا ضرور بالضرور اس دیوار سے گزرنے کا کوئی راستہ ہونا چاہئے۔ کوئی ایسا طریقہ جس کے باعث ہم دو دشمن ایک دوسرے کے آمنے سامنے آسکیں۔ ورنہ یہ لڑائی قطعی فضول ہے۔ لیکن یہ پراسرار راستہ تلاش کرنے کے لئے ابھی جلدی کی ضرورت نہیں۔ اس سے پہلے ایک کوشش اور کرنی چاہئے۔

گیند نما دشمن اب نادیدہ دیوار کے بالکل پاس موجود تھا۔ اندازاً چھ فٹ کے فاصلے پر۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ شلوگ کی شخصیت کا بغور جائزہ لے رہا ہے۔ شلوگ نے بھی اس پر نگاہیں جمادیں۔ خدا کی پناہ، کتنی عجیب و غریب شے ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر اس کو دنیا کی کسی چیز یا شکل سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔؟ اس کے ذہن میں اس عجیب دشمن کی شخصیت محسوس

کرنے کے لئے کوئی خارجی شہادت موجود نہ تھی۔

اس کے کان، آنکھیں، منہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ محض گولائی، البتہ شلوگ نے یہ ضرور دیکھا تھا کہ اس کے جسم میں بہت سے سوراخ ہیں۔

اور پھر دفعتاً ان سوراخوں میں سے دو لمبے لمبے پنجے برآمد ہوئے اور ریت میں دھنس گئے۔ جیسے وہ ریت کا معائنہ کررہے ہو۔ ان حیرت انگیز پنجوں کا قطر ایک انچ کے قریب اور لمبائی شاید ڈیڑھ فٹ تک تھی۔ لیکن یہ پنجے سوراخوں میں پوشیدہ رہتے تھے۔ اور ضرورت کے وقت ہی باہر نکلتے تھے۔ اور جب سرخ دشمن کا جواب دے سکے۔ اور بلاشبہ اس کا جواب موصول ہوا اور شلوگ دہشت سے لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ جنگ کا خواہشمند تھا۔ اس کا پیغام اتنا صاف نہیں تھا۔ جتنا ذات ابدی نے شلوگ کے دماغ میں داخل کیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اس کا مطلب سمجھ گیا اس نے اپنے ذہن سے دشمن کے خوف کا احساس خارج کیا۔ اب وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ اور اپنے آپ کو نحیف محسوس کررہا تھا۔ لیکن ابھی سوچنے سمجھنے کی قوت بحال تھی۔ اور وہ وہیں کھڑا ہو کر اس عجیب و غریب دشمن کو بندر دیکھتا رہا۔ اور ذہنی جنگ کے دوران اس کا دشمن بھی بے حس و حرکت اپنی جگہ پر موجود رہا۔ اور یہ جنگ وہ تقریباً جیت چکا تھا۔

پھر وہ چند منٹ تک لڑھک کر اس جگہ ٹھہر گیا جہاں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ پھر اس کے جسم کے سوراخوں میں سے تین پنجے برآمد ہوئے۔ اور انہوں نے جھاڑیوں کا معائنہ شروع کردیا۔

''اچھا، دوست، پھر جنگ ہی سہی۔'' شلوگ نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا۔ ''اگر میں نے تمہارا پیغام صحیح طور پر وصول کرلیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم امن پسند نہیں ہو۔ اب موت ہی ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔''

لیکن اس فقرے کا مطلب کیا تھا۔ ایک نسل کا بالکل خاتمہ، قطعی تباہی خواہ وہ نسل شلوگ کی دنیا میں بسنے والی ہو، یا خلاؤں میں بسنے والی سرخ دشمن کی نسل ہو۔ ان دونوں میں سے ایک کا اختتام لازمی تھا۔ اور یہ خیال آتے ہی دفعتاً اس کا دل انسانی ہمدردیوں اور محبت سے لبریز ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ انسانی نسل ختم ہو جائے گی جتنا زیادہ وہ اس پر غور کرتا اسے یہ وہم حقیقت بنتا محسوس ہوتا تھا۔

شلوگ کو ایک ایسی طاقت نے جو عقل انسانی کے دائرے سے خارج ہے۔ اپنے مدعا اور طاقتوں کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ سب سچ تھا۔ اور اب نسل انسانی کی قسمت کا دارومدار محض ایک ذات واحد شلوگ پر رہ گیا تھا۔ خدا رحم کرے، اسے محسوس کرنا ہی کتنی اذیت ناک بات تھی۔ لیکن پھر اس نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دیا۔ وہ موجودہ صورتحال پر غور کرنا چاہتا تھا۔ بار بار اس کے دل میں یہ خیال آتا کہ اس نادیدہ دیوار کو عبور کرکے دشمن کو ہلاک کرنے کا کوئی راستہ ضرور ہے۔ ضرور ہونا چاہئے۔ کیا دماغ راستہ ہوگا؟'' اگر ایسا ہے تو پھر اس کا دشمن ذہنی طور پر اس سے زیادہ طاقتور ہے۔ چونکہ وہ اس کی ذہنی پیغام رسائی کی طاقت کا تجربہ کرچکا تھا۔

شلوگ اپنے ذہن میں دشمن کے متعلق تمام تصورات و احساسات کو خارج کردینے کے قابل تھا۔ لیکن اس کا دشمن بھی اس بات پر قادر ہے۔ شلوگ اسے ٹکٹکی باندھ کر تکنے لگا۔ اور اپنے ذہن کی تمام قوت کو اس پر مرکوز کرکے دل میں کہنے لگا۔

''مرنا ...... ہے تمہیں ...... تمہیں مرنا ہے۔ تم مر رہے ہو۔ تم مر......'' شلوگ کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ اور اس دماغی جدوجہد اور دباؤ کے باعث اس کا جسم کانپنے لگا۔ لیکن اس عجیب وغریب مخلوق پر اس کا کوئی اثر محسوس نہ ہوتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان اور سکون سے جھاڑیوں کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس جدوجہد اور ذہنی طاقت صرف کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شلوگ اپنے آپ کو نحیف محسوس کرنے لگا۔ بے پناہ گرمی کی بدولت اس کا دم نکلا جارہا تھا۔ اور اس پر غنودگی کی حالت طاری ہوگئی تھی۔

وہ آرام کے لئے ریت پر لیٹ گیا۔ اور پوری توجہ سے اس عجیب چیز کی حرکات کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس نے سوچا۔ ممکن ہے۔ اس قریبی مطالعے سے اسے اپنے دشمن کی قوت اور کمزوریوں کا سراغ مل جائے۔ سرخ دشمن جھاڑیوں کی شاخیں اکھاڑ رہا تھا۔ شلوگ ہوشیاری سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ جھاڑیوں سے شاخیں اکھاڑنے کا کام کتنا سخت ہوسکتا ہے۔

اور پھر اسے خیال آیا کہ وہ اپنے حصے میں بھی ایسی ہی جھاڑیوں سے شاخیں جھاڑیوں سے شاخیں اکھاڑنے کی کوشش کرے۔ تاکہ اپنے بازوؤں اور جسمانی قوت سے مقابلہ کرسکے۔ اس نے دیکھا کہ سرخ مخلوق کو شاخیں اکھاڑنے میں سخت محنت کرنی پڑرہی ہے۔ اور اس کام میں اس کا ہر پنجہ مصروف تھا۔

شلوگ نے دیکھا کہ ڈیڑھ فٹ لمبے پنجے میں دو انگلیاں اور ان انگلیوں میں بڑے بڑے ناخن ہیں۔ لیکن یہ ناخن زیادہ خطرناک معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اگر انسانی ناخنوں کو بڑھنے دیا جائے۔ تو شاید وہ بھی ایسے ہی ہو جائیں۔ شلوگ نے اپنے حصے میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور بلاشبہ دائیں طرف وہی نیلی جھاڑی موجود تھی۔ وہ اس کے قریب گیا۔ اور ایک شاخ اکھاڑلی یہ شاخ نازک سی تھی۔ اور آسانی سے توڑی جاسکتی تھی۔ دوسری جانب شلوگ یہ سوچ رہا تھا کہ دشمن کو کیسے ہلاک کیا جاسکتا ہے۔؟ اگر اسے موقع مل گیا تو دشمن کو کس طریقے سے مجروح کرسکے گا؟ پھر وہ واپس آگیا۔ اور سرخ مخلوق کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے جسم کا اوپری حصہ کافی سخت نظر آتا تھا۔ اور اس پر ضرب پہنچانے کے لئے کسی تیز ہتھیار کی ضرورت تھی۔

شلوگ نے وہی لمبا سا پتھر پھر اٹھالیا۔ یہ بارہ انچ لمبا نوکیلا پتھر تھا۔ اور نوک کی جانب سے کافی تیز تھا۔ دوسری طرف سرخ مخلوق مسلسل نیلی جھاڑیوں کا معائنہ کرنے اور شاخیں اکھاڑنے میں مصروف تھی۔ ایک جھاڑی کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی نیلی چھپکلی نکل کر بھاگ نکلی۔

وہی چھپکلی جو شلوگ اس سے پیشتر دیکھ چکا تھا۔ لیکن سرخ مخلوق کا ایک پنجہ تیزی سے اس پر جھپٹا اور چھپکلی کی ٹانگیں اکھاڑنے لگا۔ بالکل اسی طرح سکون و اطمینان سے جیسے وہ جھاڑیاں اکھاڑ رہا تھا۔ چھپکلی اس کے پنجے میں دبی ہوئی تھی۔ اور اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کررہی تھی۔ اور اس دوران میں چھپکلی نے ایک ہلکی سی چیخ ماری۔ اور یہ پہلی آواز تھی جو اس خاموش فضاء میں شلوگ کے کانوں نے سنی۔

یہ منظر دیکھ کر شلوگ ایک بار پھر کانپ اٹھا۔ وہ اس جگہ سے اپنی نظریں ہٹالینا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے طبیعت پر قابو پاکر یہ تماشا دیکھنا جاری رکھا۔ کیونکہ اپنے اور مد مقابل کی ہر حرکت کا مضبوط مطالعہ کرنا ہی اس کے لئے کارآمد ثابت ہوسکتا تھا۔ اور پھر چند ہی منٹ بعد ہی چھپکلی بے جان ہو کر سرخ مخلوق کے پنجوں میں دبی ہوئی تھی۔

ابھی اس کی ٹانگیں باقی تھیں۔ لیکن سرخ مخلوق نے انہیں اکھاڑنے کی ضرورت نہ سمجھی اور دفعتاً وہ مری ہوئی چھپکلی شلوگ کی جانب اچھال کر پھینک دی۔ مری ہوئی چھپکلی فضا میں اڑتی ہوئی آئی اور شلوگ کے پیروں کے قریب گر پڑی۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ مری ہوئی چھپکلی نادیدہ دیوار کو عبور کرکے آئی تھی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نادیدہ دیوار اب غائب ہوچکی ہے۔؟

پتھر کا چاقو ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کر شلوگ بجلی کی مانند اپنے دشمن کی جانب لپکا سنہری موقع تھا۔ اسے ہلاک کرنے کا وہ نادیدہ دیوار اگر موجود نہ ہو تو۔ لیکن افسوس دیوار غائب نہیں تھی۔ وہ ویسے ہی قائم تھی۔ شلوگ کا سر شدت سے دیوار سے ٹکرایا۔ اور وہ پیچھے کی جانب جا پڑا۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے اچانک اس نے دیکھا کہ کوئی شے فضاء میں بلند ہوتی ہوئی اس کی جانب آرہی ہے۔ اس سے بچنے کیلئے وہ ریت پر لیٹ گیا۔

لیکن وہ پھر بھی محفوظ نہ رہا۔ ایک پتھر بڑے زور سے اس کی بائیں ٹانگ کی پنڈلی پر پڑا اور درد کی ایک زبردست ٹیس سارے جسم میں دوڑ گئی۔

لیکن وہ اس تکلیف کو نظر انداز کرکے جلدی سے پیچھے لڑھک گیا۔ کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ سرخ دشمن

ایک اور پتھر پھینکنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس نے اپنے دو پنجوں میں پتھر پکڑ رکھا تھا۔ اور پھر پتھر سنسناتا ہوا۔

شلوگ پتھر کی زد سے دور پہنچ چکا تھا۔ سرخ دشمن کا پتھر زیادہ دور تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پہلے پتھر کی ضرب سے شلوگ بے خبری میں زخمی ہو گیا ورنہ وہ ضرور محفوظ ہو جاتا۔

پھر شلوگ نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اور پوری قوت سے ایک پتھر سرخ دشمن کی جانب پھینک دیا۔ اور پتھر نادیدہ دیوار پار کر کے دشمن کی سرحد میں جا پڑا۔ اب سرخ مخلوق کے بھاگنے کی باری تھی۔ بڑی تیزی سے گردش کرتا ہوا وہ اپنے میدان کے آخری کنارے تک پہنچ گیا۔ شلوگ اپنی فتح پر ہنس پڑا۔

لیکن جونہی اس کی نظر اپنی پنڈلی کے زخم پر پڑی۔ اس کی ہنسی یکلخت رک گئی دشمن کے پتھر نے اس کی ٹانگ کو بڑا گہرا زخم پہنچایا تھا۔ کئی انچ لمبا زخم تھا۔ اور اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ شلوگ نے سوچا اگر خون خود رک جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ ورنہ سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن اس زخم کے بدلے میں اب وہ ایک نئی حقیقت دریافت کر چکا تھا۔ یعنی نادیدہ دیوار کی ایک خصوصیت۔ وہ دوبارہ اس دیوار کی جانب گیا۔ اور اپنے ہاتھوں سے اسے چھوا۔

پھر ایک دیوار پر ہاتھ رکھ کر اس نے دوسرے ہاتھ سے مٹھی بھر ریت پھینکی۔ وہ دیوار سے پار ہو گئی۔ لیکن اس کا ہاتھ باہر نہ جا سکا۔ عجیب بات تھی۔ مادی اشیاء اور غیر مادی اشیاء میں یہ دیوار فرق محسوس کر لیتی تھی۔ لیکن نہیں، مری ہوئی چھپکلی نے بھی تو یہ دیوار عبور کر لی تھی۔ اور ایک چھپکلی خواہ زندہ ہو یا مری ہوئی یقیناً ایک مادی شے نہیں ہو سکتی۔ شلوگ نے ایک شاخ توڑی اور اسکو دیوار سے گزارنا چاہا۔ شاخ دیوار سے گزر گئی جب انگلیاں دیوار کے قریب آئیں تو وہ باہر نہ نکل سکیں۔ آہ، نہ تو وہ خود اس حد سے نکل سکتا تھا۔ اور نہ دشمن اس کی حد میں آ سکتا تھا۔ لیکن پتھر، ریت، شاخیں اور ایک مردہ چھپکلی؟ کیا زندہ چھپکلی بھی اس نادیدہ دیوار سے باہر نکل سکتی ہے۔؟

جھاڑیوں کے اندر سے اس نے ایک چھپکلی پکڑی اور اسے آہستہ سے نادیدہ دیوار کی طرف پھینکا۔ لیکن چھپکلی دیوار کے پار نہ جا سکی۔ اور اس سے ٹکرا کر گر گئی۔ اور تیزی سے ایک جھاڑی میں چھپ گئی۔ لیکن شلوگ کو اس معمے کا حل مل چکا تھا۔ زندہ اشیاء اس دیوار کو پار نہ کر سکتی تھیں۔ البتہ مرا ہوا جسم یا مادی اشیاء کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ پھر اس کا دھیان اپنی زخمی پنڈلی کی طرف گیا۔ خون بہنا کم ہو گیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اسے اس کے لئے اب زیادہ فکر مند نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن کم از کم پانی تو ضرور ملنا چاہئے۔ بشرطیکہ یہاں پانی دستیاب ہو سکے۔ اور زخم دھویا جا سکے۔

پانی کا خیال آتے ہی۔ شلوگ کو محسوس ہوا کہ پیاس سے اس کا حلق سوکھ گیا ہے۔ اسے ہر قیمت پر پانی تلاش کرنا چاہئے۔ ورنہ یہ جنگ اس کے لئے مہلک بن جائے گی پس وہ لنگڑاتا ہوا اپنے حصے کے میدان میں چکر لگانے لگا۔ دائیں طرف کی آخری حد تک پہنچ کر اس نے اس پر اسرار نادیدہ دیوار کو دیکھ لیا۔ یہاں وہ صاف نظر آ رہی تھی۔ نیلی مائل بھورے رنگ کی دیوار اور اس کی سطح ویسی ہی تھی۔ جیسی درمیانی حصے کو محسوس ہوتی تھی۔ گرم اور ربڑ کی مانند لچکدار۔ یہاں بھی اس نے دیوار پر ریت پھینک کر تجربہ کیا اور واقعی ریت پار ہو گئی۔

کئی بار وہ ادھر سے ادھر اس طویل قید خانے میں آیا گیا۔ لیکن پانی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ پیاس کا احساس اس پر شدت سے طاری ہو رہا تھا۔ بے پناہ حرارت تھی۔ اندازے کے مطابق ایک سو تیس فارن ہائیٹ اور فضاء میں ہوا کی ہلکی سی تحریک نہ تھی۔ بار بار چلنے سے اسکی پنڈلی کا زخم اور خراب ہو گیا تھا۔ اور اب وہ بمشکل چل سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی اندازہ کیا کہ سرخ دشمن کی حالت بھی غالباً صحیح نہیں رہی۔ کیونکہ ذات ابدی نے بتایا تھا کہ اس مقام کی فضاء دونوں کے لئے اجنبی اور غیر تسکین دہ ہے۔ ممکن ہے دشمن کسی ایسے سیارے سے آیا ہو جہاں دو سو درجۂ حرارت بھی نارمل کہلاتا ہو اور ممکن ہے اسے یہاں سردی محسوس ہو رہی ہو۔

(جاری ہے)

شہر وحشت

ایم اے راحت

قسط نمبر:17

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرھول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دھشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراٹو، کالی طاقتوں کی خوتی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذھن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

اسے پھر پانی کی یاد ستانے لگی۔ اگر پانی نہ ملا تو ہر صورت میں موت ہے۔ اور موت سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ نادیدہ دیوار کو عبور کرکے دشمن کو ہلاک کردیا جائے۔ اسے اب پھرتی سے کام لینا پڑے گا۔ لیکن وہ ایک لمحہ آرام کیلئے ریت پر بیٹھ گیا۔ تاکہ پھر سوچے وہ کرہی کیا سکتا تھا؟ کچھ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اسے کچھ نہ کچھ تو ضرور کرنا چاہئے تھا۔ بلاشبہ کئی قسم کی نیلی جھاڑیاں تھیں لیکن وہ ان سے کیا کام لے گا؟ لیکن بغور معائنہ کرنے سے ممکن ہے۔ وہ ان سے کوئی فائدہ اٹھانے کی تدبیر اخذ کرے۔ اور پھر اس کی زخمی ٹانگ، اس بارے میں بھی لازماً کچھ کرنا پڑے گا۔ اور کم از کم پانی کے بغیر زخم تو صاف ہونا چاہئے۔

اس کی ٹانگ میں تکلیف اب پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔ پس اس نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے ٹانگ کا علاج ضروری ہے۔ نیلی جھاڑیوں میں سے ایک قسم کی جھاڑیوں میں پتے بھی اگے ہوئے تھے۔ یا پتوں سے ملتی جلتی کوئی شے تھی۔ اس نے مٹھی بھر پتے اکھاڑ لئے اور ان کا معائنہ کرنے کے لئے اس نے پتوں سے زخم کو صاف کیا۔ اور پھر تازہ پتے زخم پر رکھ کر اوپر سے اسی جھاڑی کی بیلیں اتار کر ٹانگ پر باندھ لیں۔ یہ بیلیں نہایت مضبوط تھیں۔ اس نے اپنے پتھر کے ہتھیار کی مدد سے بہت سی بیلیں کاٹ ڈالیں۔

اور ان میں بعض بیلیں ایک فٹ سے زیادہ لمبی تھیں۔ اور ان بیلوں کو بٹ کر اچھا خاصا موٹا رسہ بنایا جاسکتا تھا۔ سو اس نے سوچا۔ ممکن ہے ایسا رسہ کام ہی آجائے۔ پھر اس نے اپنے پتھری چاقو کی نوک کو دوسرے پتھروں سے رگڑ کر اسکی دھار تیز کی اور پھر بیلوں کو بٹ کر ایک پٹی سی بنائی اور اس میں اپنا ہتھیار باندھ لیا۔ اور پھر نیلی جھاڑیوں کا معائنہ کرنے لگا۔ تین علیحدہ علیحدہ قسموں کی جھاڑیاں تھیں۔ ان میں سے ایک قسم کی جھاڑیاں تو پتوں سے آزاد تھیں۔ دوسری قسم کے پتے اور شاخیں آگ میں جلنے کیلئے بہترین ثابت ہوسکتے تھے۔ اور تیسری قسم کی جھاڑی میں موٹی موٹی اعلیٰ لکڑی کی شاخیں تھیں۔ شلوگ پھر لنگڑاتا ہوا نادیدہ دیوار کی جانب گیا، بلاشبہ دیوار موجود تھی۔

دشمن اپنے حصے میں ایک ایسی جگہ محفوظ تھا۔ جہاں شلوگ کا پھینکا ہوا پتھر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اور کچھ نہ کچھ کارروائی کرنے میں ضرور مصروف تھا۔ لیکن کیسی کاروائی؟ شلوگ کو اندازہ نہیں ہوسکا۔ ایک بار وہ حرکت کرتے کرتے رکا اور دیوار کے نزدیک آیا۔ اور شلوگ کو
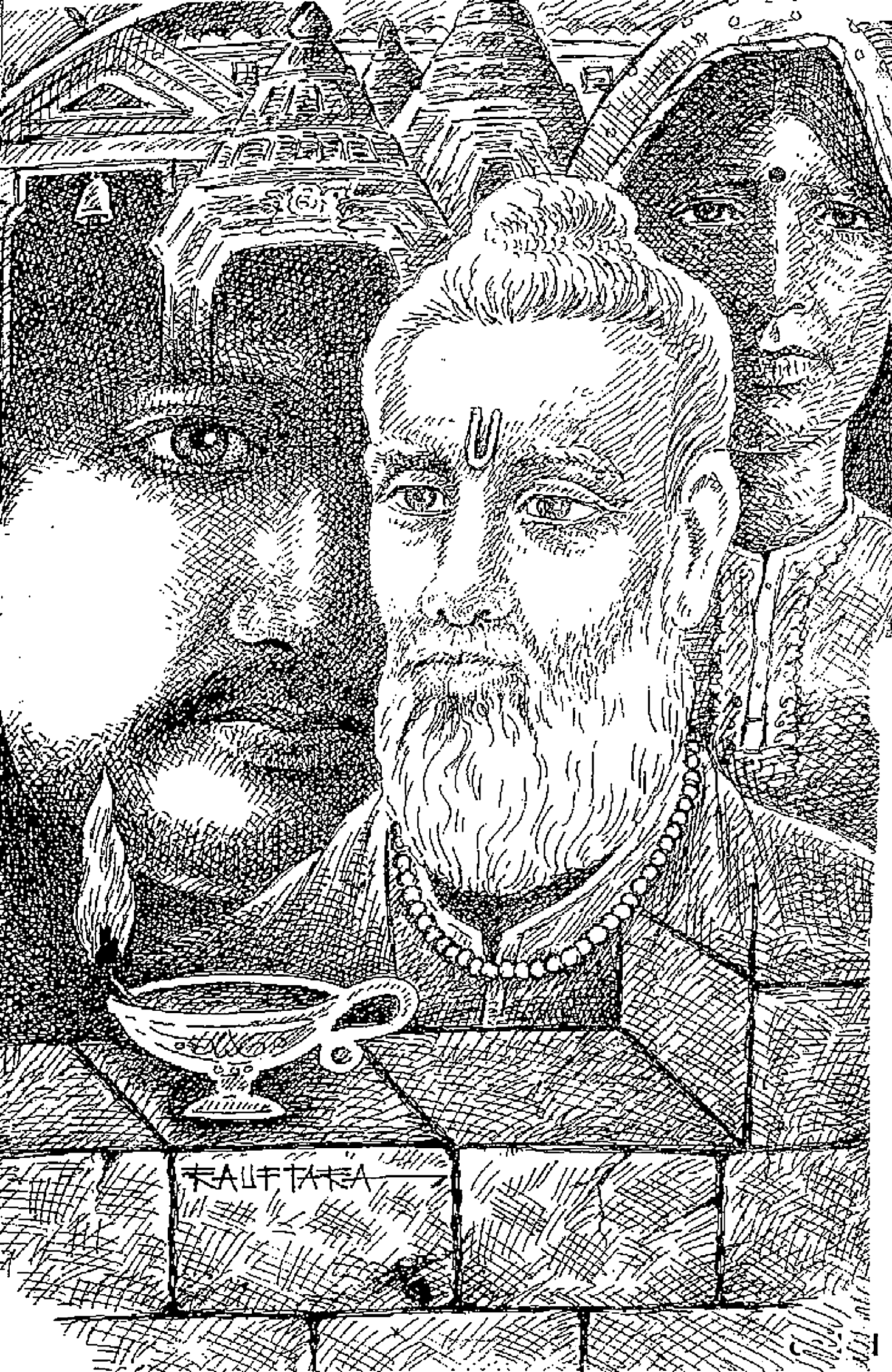
یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ اپنی توجہ سامنے مرتکز کئے ہوئے ہے۔ اس مرتبہ بھی شلوگ کو ابکائی سی آنے لگی اس نے جھلا کر ایک پتھر دشمن پر پھینکا۔ اور دشمن واپس مڑ گیا۔ اور اسی کام میں مصروف ہو گیا جو اس سے پیشتر وہ کر رہا تھا۔

شلوگ کو کم از کم اطمینان ضرور تھا کہ وہ اپنے دشمن کو قریب نہیں آنے دے گا۔ اور یہ سوچ کر وہ متواتر دو گھنٹے تک پتھر لا لا کر جمع کرتا رہا۔ اس نے اپنی سرحد میں پتھروں کی کئی ڈھیریاں جمع کر دیں۔ اب اس کا حلق پیاس کے مارے جل رہا تھا۔ اور سوائے پانی کے اس کے ذہن کو اب کوئی نئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ لیکن اسے اپنے بچاؤ کیلئے کچھ نہ کچھ تو ضرور سوچنا ہوگا۔ نادیدہ دیوار کو کیسے عبور کرے؟ دشمن کو کس طرح ہلاک کیا جائے؟ اور اس سے پہلے کہ شلوگ پیاس اور گرمی کی شدت سے مر جائے، یہ دونوں کام سرانجام پا جانے چاہئیں۔

نادیدہ دیوار خدا جانے کس قدر اونچائی تک چلی گئی تھی۔ اور ریت کے اندر کی گہرائی۔ کہاں تک تھی؟ یہ تمام سوالات اسے حل کرنے تھے۔ ابھی وہ انہی خیالات میں گم تھا کہ دفعتاً اس کی نظر اپنے حصے میں حرکت کرتی ہوئی ایک چھپکلی پر پڑی جو ایک جھاڑی سے نکل کر دوسری جھاڑی کی جانب رینگ گئی تھی۔ دوسری جھاڑی کے قریب پہنچ کر چھپکلی نے شلوگ کی طرف مڑ کر دیکھا اور شلوگ اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ اور اس سے کہنے لگا۔

”ہیلو“

چھپکلی۔ شلوگ کی جانب چند قدم آگے آئی اور بولی۔ ”ہیلو“ ایک لمحے کیلئے شلوگ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔

اور تب پھر وہ ایک زبردست قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور ایسا کرنے سے اس کے حلق کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ وہ چھپکلی سے مخاطب ہوا۔ ”آؤ، میرے قریب آجاؤ“، لیکن چھپکلی واپس مڑ کر جھاڑیوں میں بھاگ گئی۔

اب وہ پھر شدت سے پیاس محسوس کر رہا تھا۔

اس نے سوچا اگر اس طرح یہاں بیٹھا رہا تو اپنے دشمن سے جنگ کبھی نہیں جیت سکے گا۔ اسے کچھ نہ کچھ تدبیر اختیار کرنی ہی چاہئے۔ لیکن کیا تدبیر؟

یہی ایک بات سمجھ میں آتی تھی کہ نادیدہ دیوار کو عبور کیا جائے۔ وہ اسے عبور کر سکتا ہے۔ یا اس پر سے پھلانگ سکے گا۔؟ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ ریت کے نیچے سے کوئی راستہ مل جائے۔

یہ سوچ کر وہ لنگڑاتا ہوا نادیدہ دیوار کی جانب گیا، اور اپنے چاقو کی مدد سے اس کے ساتھ ملی ہوئی زمین کو کھودنے لگا۔ کھودتا رہا۔ کھودتا رہا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس سخت دشوار کام میں اس کا کتنا وقت صرف ہوا۔ لیکن اس نے چار فٹ گہرا گڑھا کھود لیا لیکن خشک ریت ہی نکلتی چلی آتی تھی۔ پانی کا نام ونشان نہ تھا۔ اور گڑھے کے ساتھ نادیدہ دیوار کی رکاوٹ صاف محسوس ہوتی تھی۔

شلوگ تھک کر وہیں لیٹ گیا۔ اور پھر اس نے اپنے دشمن کو دیکھنے کیلئے سر اٹھایا۔ وہ بھی اپنے حصے میں کوئی عجیب سی کارروائی کرنے میں مشغول تھا۔ شلوگ نے دیکھا کہ وہ جھاڑیوں کی لکڑی کے دو ٹکڑوں کو بیلوں کی مدد سے باندھ کر کوئی شے تیار کر رہا تھا۔ ایک چار فٹ اونچی مربع سی شے کو تکنے لگا جو دشمن بڑی سرگرمی سے بنا رہا تھا۔ پھر دشمن نے ایک بڑا پتھر اس مشین میں رکھا اور اسے گھما کر شلوگ کی جانب کر لیا۔ اور پھر وہ پتھر سنسناتا ہوا شلوگ کے سر پر سے گزر گیا۔ جس فاصلے سے یہ پتھر آرہا تھا۔ اس فاصلے تک شلوگ ایک چھوٹا سا پتھر بھی نہیں پھینک سکتا تھا۔ اب تو شلوگ بہت پریشان ہوا۔ خواہ، وہ اپنی سرحد کے آخری نقطے تک چلا جاتا تب بھی اس مشین کے پتھر سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی اثناء میں ایک اور پتھر اس کی جانب آیا۔ اور شلوگ اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ معاملہ خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

پھر وہ تیزی سے ادھر ادھر حرکت کرنے لگا۔ تاکہ دشمن کا نشانہ ٹھیک نہ بیٹھے۔ اب ایک ہی صورت

باقی تھی کہ کسی طرح پتھر پھینکنے والی مشین کو تباہ کر دیا جائے۔ لیکن کیسے؟ زمین کھودنے کی وجہ سے اس کے بازو اب سخت درد کر رہے تھے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چل کر اپنے میدان کے آخری کنارے تک چلا گیا۔ لیکن دشمن کے پتھر وہاں باآسانی پہنچ رہے تھے۔ وہاں سے وہ پھر نادیدہ دیوار کی جانب آنے لگا۔ راستے میں وہ کئی بار گرا۔ وہ بمشکل اٹھ کر قدم اٹھاتا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ کہ اس کا خاتمہ اب قریب ہے۔ تاہم اپنی جان بچانے کی خاطر وہ باقاعدہ دوڑ دھوپ میں مشغول تھا۔

دفعتاً دشمن کی غلیل نما مشین سے نکلا ہوا پتھر شلوگ کے جمع کیے ہوئے پتھروں کے ڈھیر پر آن گرا۔ اور پتھروں کے ٹکرانے سے آگ کی چنگاریاں نمودار ہوئیں۔ چنگاریاں آگ، شلوگ کو یاد آیا کہ قدیم نسل کا آدمی چقماق پتھروں کو رگڑ رگڑ کر آگ جلاتا تھا۔ اور اگر جھاڑیوں کے خشک پتے آگ پکڑ لیں تو خوش قسمتی سے ایسے پتوں کی ایک جھاڑی اس کے قریب ہی موجود تھی۔ اس نے جھاڑیوں کو اکھاڑ ڈالا۔ پھر اسے پتھروں کے ڈھیر پر لے گیا۔

اور پھر ایک بڑا پتھر اٹھا کر دوسرے پتھر پر زور سے مارا تو آگ کی چنگاریاں نکلیں شلوگ نے کئی بار یہ عمل انجام دیا۔ حتیٰ کہ جھاڑیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ لیکن اب اسے ایک ترکیب سوجھ گئی تھی۔ شلوگ نے آٹھ فٹ گہرے گڑھے میں آگ جلا لی۔ اور اس جھاڑی کی شاخوں کو اس میں ڈال دیا۔ جو آہستہ آہستہ جلتی رہتی تھیں۔ لوہے کے تاروں کی مانند مضبوط بیلیں آسانی سے آگ نہیں پکڑتی تھیں۔ لیکن جل اٹھنے پر بہت دیر تک جلتی ہی رہتی تھیں۔ اور پھر شلوگ نے ان بیلوں کو لپیٹ کر ایک درجن بم کے گولے تیار کر لئے۔

بڑے بڑے پتھروں کے گرد اس نے بیلیں لپیٹیں۔ اور ان میں آگ لگا کر دشمن کی جگہ پر گولے پھینکنے شروع کر دیئے۔ دشمن خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنی غلیل پیچھے ہٹانے لگا۔ لیکن شلوگ نے تاخیر کیے بغیر تیزی سے بقیہ بم کے گولے مارنے شروع کر دیئے۔

چوتھا بم دشمن کی بنائی ہوئی لکڑی کی مشین پر جا پڑا اور اس میں فوراً آگ لگ گئی۔ دشمن نے اس پر ریت پھینک کر آگ بجھانی چاہی لیکن مشین کو بچانے کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور چند لمحے کے اندر اندر مشین جل کر راکھ ہو گئی، زخم کی تکلیف، پیاس، اور گرمی کی شدت اور تھکاوٹ کے ہاتھوں کمزور ہو کر شلوگ کے لئے کھڑا رہنا دشوار ہو گیا وہ ریت پر بیٹھ گیا۔

اب کیا کیا جائے۔؟ کیا دشمن کی طرح وہ بھی پتھر پھینکنے والی ایک مشین تیار کرے؟ تیر کمان؟ لیکن اسے شک تھا۔ کہ بیلوں یا لکڑی کے تیر صحیح نشانے پر نہیں جا سکیں گے۔ نیزہ؟ ہاں یہ ہتھیار کامیاب ثابت ہو سکتا ہے۔ دور پھینکنے کیلئے تو نیزہ بھی بیکار ثابت ہوتا لیکن قریب سے حملہ کرنے کیلئے نیزہ بہترین ہتھیار ہے لیکن نیزہ ہارپون کی مانند بنا چاہئے جس کے سرے پر ایک لمبا نوکیلا چاقو ہو۔ اور اس نیزے کے سرے پر ایک لمبا رسہ باندھ دیا جائے۔ تاکہ نیزہ پھینکنے کے بعد اسے واپس گھسیٹا جا سکے۔ یہ تدبیر ذہن میں آتے ہی وہ اٹھا اور نیلی جھاڑیوں سے بیلیں اکھاڑ اکھاڑ کر بٹنے لگا۔

بیس منٹ رسہ بٹنے کے بعد اس نے موٹی موٹی شاخوں کو باندھ کر ایک چار منٹ لمبا نیزہ تیار کر لیا۔ پھر ایک لمبے سے پتھر کو گھس گھس کر اس کی نوک بنائی اور یہ پتھر اس نے نیزے کے سرے پر مضبوطی سے باندھ دیا تاکہ ہارپون ضائع نہ ہو سکے قریب ہی ریت کی کوئی شے زوردار آواز کے ساتھ گری۔ اور شلوگ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ خدا جانے وہ کتنے عرصے تک سویا رہا تھا۔

پھر ایک اور پتھر اس کے قریب ہی آگرا۔ شلوگ نے ہاتھوں کے بل ذرا سا اٹھ کر دشمن کو دیکھ لیا۔ وہ نادیدہ دیوار سے کچھ گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ شلوگ کو حرکت میں دیکھ کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ شلوگ کی حالت اب انتہائی ابتر ہو چکی تھی۔ پیاس کے مارے اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ اس کا

اختتام قریب ہے۔

اس کے ساتھ ہی انسانی نسل کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

دفعتاً شلوگ کے مردہ ذہن میں زندگی کی ایک کرن نمودار ہوئی۔ وہ کھسکتا کھسکتا انتہائی جاں کنی کے عالم میں نادیدہ دیوار تک پہنچا یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اسے وہاں تک پہنچنے میں صدیاں صرف کرنا پڑیں گی۔ نادیدہ دیوار حسبِ معمول وہاں موجود تھی۔ تب شلوگ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ وہیں ایک مشین بنانے کی تیاری میں مشغول تھا۔ مشین نصف سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی۔ شلوگ کے ذہن میں جو تدبیر آئی تھی۔ وہ یہ تھی کہ نادیدہ دیوار کے قریب ہی لیٹ جائے۔ دشمن اسے غافل سمجھ کر حملہ کرنے کیلئے قریب آئے گا۔ اور پھر وہ اپنا ہارپون اس کے جسم پر پھینکنے کی کوشش کرے گا۔ دوسری طرف شلوگ کو اپنی ابتر حالت پر یقین ہو چکا تھا۔ کہ دشمن کو مشین استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ کیونکہ اس کی موت قریب ہے۔ اور جب مشین تیار ہوگی تو وہ مر چکا ہوگا۔ اور پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

''اچانک ہی شلوگ نے اپنے قریب ایک آواز سنی۔ ''ہیلو۔'' یہ ایک ننھی سی باریک آواز تھی۔ شلوگ نے آنکھیں کھول دیں سر کو گھما کر دیکھا یہ ایک چھپکلی تھی۔

''جاؤ۔ یہاں سے جاؤ۔'' شلوگ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے حلق سے آواز ہی نہ نکلی اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

''زخمی'' آواز نے کہا۔ ''ہلاک کردو زخمی، ہلاک کردو۔'' شلوگ نے دوبارہ آنکھیں کھولیں نیلی چھپکلی وہیں موجود تھی۔ پھر وہ نادیدہ دیوار کی طرف گئی۔ اور واپس آگئی۔

''زخمی!،، وہ بولی۔ ''ہلاک کردو، آؤ۔'' اور یہ کہتے ہوئے وہ پھر دیوار کی جانب غائب ہوگئی۔ شلوگ سمجھ گیا کہ وہ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر رہی ہے۔ بار بار وہ بے معنی الفاظ کہتی تھی اور شلوگ اپنی آنکھیں کھولتا۔

چھپکلی بھاگتی ہوئی۔ نادیدہ دیوار کی جانب جاتی اور پھر شلوگ کے پاس واپس آجاتی۔ ''زخمی ہلاک کردو۔ آؤ۔''

مجبور ہو کر شلوگ اس کے پیچھے رینگتا ہوا چلا اور پھر اس کے کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی۔ ریت پر کوئی نیلی سی شے پڑی تھی۔ اور بے چینی سے تڑپ رہی تھی۔ تب شلوگ نے اسے پہچان لیا یہ تو وہی چھپکلی تھی جسے دشمن نے اس کی ٹانگیں اکھاڑ کر شلوگ کی طرف پھینکا تھا۔ اور وہ اسے مردہ سمجھ رہا تھا۔ لیکن، لیکن وہ تو زندہ تھی۔

''زخمی!'' دوسری چھپکلی نے کہا۔ ''زخمی ہلاک کردو۔ ہلاک کردو۔''

شلوگ سمجھ گیا۔ اس نے اپنا چاقو پیٹی سے نکالا اور زخمی چھپکلی کو ہلاک کردیا زندہ چھپکلی جلدی سے ایک جھاڑی کی طرف بھاگ گئی۔ شلوگ دوبارہ رینگتا ہوا نادیدہ دیوار کی جانب چلا گیا۔ دشمن سرگرمی سے مشین کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ اچانک شلوگ کے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ زخمی چھپکلی تو نادیدہ دیوار عبور کر کے آئی تھی۔ وہ دشمن کی طرف سے آئی تھی اس نے چھپکلی کی ٹانگیں اکھاڑ کر اسے شلوگ کی جانب پھینک دیا تھا۔ اور اس نے سوچا کہ چھپکلی مردہ ہے۔ لیکن وہ مردہ نہیں تھی۔ وہ صرف بیہوش تھی۔

آہ۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ ایک زندہ اور باہوش چھپکلی نادیدہ دیوار عبور نہیں کرسکتی۔ مگر ایک بیہوش چھپکلی اسے عبور کرسکتی ہے اور اس خیال کے آتے ہی شلوگ اپنی زندگی داؤ پر لگانے کیلئے تیار ہوگیا۔ اس نے ایک پتھر ہاتھ میں پکڑا اور نادیدہ دیوار کے قریب کھدی ہوئی ریت کے ڈھیر پر لیٹ گیا۔ یہ ڈھیر آدھا دشمن کی سرحد میں تھا۔ اور آدھا شلوگ کی سرحد میں وہ اس ڈھیر پر اس انداز سے لیٹ گیا کہ اگر بیہوش ہوجائے تو اس طرح گرے کہ دشمن کی سرحد میں داخل ہوجائے۔

اس نے اپنے ہتھیاروں کو اچھی طرح اپنے

ساتھ رکھ لیا تھا۔ پھر اس نے دائیں ہاتھ سے پتھر بلند کیا۔ جسے وہ اپنے سر پر مار کر بے ہوش ہونا چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس ضرب سے وہ ہلاک ہوجاتا۔ اسے شبہ ہوا کہ دشمن یہ تمام حرکتیں دیکھ رہا ہے۔ اور پھر وہ شلوگ کو بیہوش ہو کر اپنی سرحد میں گرتے دیکھ کر ضرور تفتیش کیلئے آئے گا۔ اور وہ سمجھے گا کہ شلوگ مر گیا ہے۔ اور پھر اس نے پتھر اپنے سر پر مارا۔ دفعتاً اس کی کمر میں زور سے درد اٹھا۔ اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

لیکن اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔ دشمن آہستہ آہستہ اس کی جانب آرہا تھا۔ اور وہ اس سے بیس فٹ کے فاصلے پر آگیا اور اس نے ایک پتھر شلوگ پر پھینکا تھا یہ معلوم کرنے کیلئے کہ آیا۔ وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے۔''

دشمن قریب آگیا۔ شلوگ دم سادھے پڑا رہا پھر دشمن نے پنجے کھول کر شلوگ کی جانب بڑھا۔ پوری طاقت جمع کر کے شلوگ نے اپنا ہارپون دشمن کے دے مارا۔ اور ہارپون دشمن کے جسم میں کھب گیا۔ اور دشمن واپس اسی حالت میں بھاگا کہ ہارپون اس کے جسم میں گڑا ہوا تھا۔ شلوگ نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی لیکن گر پڑا۔

خواب کچھ بھی دیکھ لو ادھورے رہ جاتے ہیں۔

نعمت علی کی زندگی سے پراسرار واقعات چمٹ گئے تھے۔ جب بھی کبھی اپنے آپ پر غور کرتا۔ عجیب سی کیفیت کا شکار ہوجاتا۔ مدد علی نے بڑی سادگی سے زندگی گزاری تھی وہ خود بھی کھا پی رہا تھا۔ اور عیش کر رہا تھا۔ کہ مدد علی کو اسے عالم اور درویش بنانے کی سوجھی۔ قبرستان بھیج دیا اور قبرستان میں جو کچھ ہوا وہی اب مدد علی کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ جب بھی کبھی غور کرتا۔ کچھ اچھائیاں اور کچھ برائیاں محسوس ہونے لگتیں۔

مثلاً یہ کہ کم از کم مدد علی کو زندگی کا یہ دور گزارنے میں ان دشواریوں کا سامنا کرنا نہیں پڑ رہا۔ جو انہوں نے زندگی بھر اٹھائی تھیں۔ اور صرف پیٹ بھر روٹی کھائی تھی۔ اور کچھ بھی نہیں لیکن اب وہ عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بیٹوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اگر خیرالدین خیری اس طرح نہ مل جاتا۔ تو بھلا نکما سا نعمت علی ماں باپ کیلئے کیا کرسکتا تھا۔ لیکن اور کچھ نہیں تو کم از کم اب اس کے دل کو کو یہ سکون ضرور تھا۔ کہ مدد علی اور آسیہ بیگم آرام و سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انہیں کوئی پریشانی یا تکلیف نہیں ہے۔ ایک بیٹے کا فرض پورا ہو چکا تھا۔

لیکن اب جو الجھنیں پیش آگئیں تھیں ان کا کیا کرتا۔ ہاں۔ اپنی جگہ ایک بات پر وہ اٹل تھا کہ ہندوستان سے اگر پاکستان واپس جائے گا تو خیرالدین خیری کو ساتھ لیکر جا ہے وہ ایک ہوا ہی سہی۔ ایک روح ہی صحیح۔ لیکن کچھ اس طرح کا رشتہ ہوگیا تھا۔ خیرالدین خیری سے کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ چاہے اس کوشش میں زندگی ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑ جائے۔

راجہ پرمیت سنگھ کے ہاں جو واقعات اسے پے در پے پیش آرہے تھے۔ ان سے بعض اوقات اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ لیکن رانی پورن وتی نے اسے بتایا تھا۔ کہ راجہ پرمیت سنگھ کے پس پشت پردھان سنگھ ہے۔ اور پردھان سنگھ ہی وہ تھا۔ جس کے لئے نعمت علی یہاں رکا ہوا تھا۔ پردھان سنگھ کے قبضے سے خیرالدین خیری کی روح کو آزاد کرانا اب نعمت علی کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اور وہ اٹل تھا اس بات پر کہ اگر اس کوشش میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے تو دیکھا جائے گا۔

کم از کم موت کے بعد روحیں تو مل جائیں گی۔ اور کچھ ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ وہ یہاں معروف تھا۔ اور اس کے سامنے ہر طرح کی کہانیاں آرہی تھیں۔ شلوگ کی کہانی اس وقت زیرِ عمل تھی۔ مگر راجہ پرمیت سنگھ کے پیغام نے اس کہانی سے رابطہ توڑ دیا۔

راجہ پرمیت سنگھ نے اسے بلایا تھا۔ تیاریاں کرنے کے بعد وہ راجہ پرمیت سنگھ کے پاس پہنچ گیا راجہ پرمیت سنگھ نے بہت ہی اچھے انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔

''ہم جو کچھ بھی ہیں تمہارے علم میں آچکا ہوگا۔

لوگ ہماری پوجا کرتے ہیں۔ دیوتا، اور اوتار کا درجہ دیتے ہیں ہمیں۔ لیکن ہم تمہیں سچ بتائیں ہم ابھی کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہمارے من میں ایک بہت بڑی بات ہے۔ اگر ہماری وہ بات پوری ہوجائے۔ تو پھر ہم کیا ہوں گے۔ یہ ابھی سنسار والے نہیں جانتے۔ ہم پر اس شخص کی قدر کرتے ہیں۔ جس کے اندر کوئی خاص بات ہو اور تم قلیل وقت میں ہمارے پسندیدہ انسان بن گئے ہو۔ شیر دل بچپن ہی سے کرناوتی کے ساتھ رہا ہے۔

وہ صرف کرناوتی کے بس کی بات تھی۔ شاید تمہیں اس بات کا علم نہ ہو کہ کئی ایسے کئی سائس موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ جنہوں نے شیر دل کی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن تم نے شیر دل کو گیدڑ بنا دیا۔ اور اس پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ ہم اس بات کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اور اب ہم یہ سمجھتے ہیں وکرم راج، یہ ہی نام ہے ناں تمہارا؟"

"جی مہاراج۔"

"وکرم راج ہم تمہیں اپنے ایک اہم مقصد میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ بس یوں سمجھو! کہ تم ہمارے من کو بھا گئے ہو۔"

"محبت ہے۔ مہاراج کی۔"

"تم ہمیں بتاؤ۔ تم کہیں جانا تو نہیں چاہتے۔ کیا تم ایک طویل عرصے کیلئے ہمارا ساتھ دے سکو گے۔"

"جی مہاراج۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ میں یہاں آکر بہت خوش ہوں۔ آپ نے جو عزت مجھے دی ہے۔ میں اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔"

"شکریہ ہم ایک سفر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور اس کے لئے طویل عرصے سے منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اس سفر میں تم ہمارے ساتھ ہوگے۔ اب من کی بات بتانی ہے تمہیں۔ تو بتائے دیتے ہیں۔ ہمیں پاتال سنگھاسن کی تلاش ہے۔ سمجھے؟" پاتال سنگھاسن کی" نعمت علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور سوالیہ نگاہوں سے راجہ پرمیت سنگھ کو دیکھتا رہا۔

"پوچھو ہم سے کہ پاتال سنگھاسن کیا ہے۔"

"ہمت نہیں کر پا رہا مہاراج۔ آپ کا حکم ہے تو بتا دیجئے۔"

"پاتال سنگھاسن، پاتال نگری میں ہے۔ کیا سمجھے؟ ہمارے گرو ہمیں۔ بہت مہان بہت ہی مہان۔ نام ہے۔ ان کا پردھان سنگھ تم سمجھ لو، اس سنسار کے بہت بڑے اوتار ہیں۔ ہمارے گرو ہیں وہ، انہی کے اشارے پر ہم پاتال سنگھاسن کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ پاتال سنگھاسن ہمیں مل جائے۔ تو یوں سمجھ لو، کہ سارا سنسار ہمارے چرنوں میں ہوگا۔ سمجھ رہے ہو ناں تم۔ پورا سنسار ہماری پوجا کرے گا۔ اور یہ سمان ہمیں ویر پردھان سنگھ دینا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے۔ کہ اب وہ اس سنسار سے جانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ جو کچھ ان کے قبضے میں ہے۔ وہ اسے ہمارے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔

ہم نے طے کیا ہے کہ ہماری بہن کرناوتی تم اور ویر پردھان سنگھ ہمارے ساتھ پاتال نگری چلیں گے۔

جہاں پاتال سنگھاسن پوشیدہ ہے۔ نعمت علی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ جو کہانی اس کے سامنے آئی تھی۔ وہ تو خیر جو کچھ تھی سو تھی ہی۔ لیکن یہ جان کر کہ کسی سفر میں پردھان سنگھ اس کے ساتھ ہوگا۔ یہ بھی بڑے غور کرنے کی بات تھی اس نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"مہاراج مجھے جو حکم دیں گے میں اس کیلئے حاضر ہوں۔"

"تمہاری جگہ بدل دی گئی ہے۔ اب تم محل میں اندر کے حصے میں رہو گے۔ وہاں جہاں، ہماری اپنی ہر چیز رہتی ہے۔"

"جو حکم مہاراج، غرض یہ کہ راجہ پرمیت سنگھ اسے پاتال سنگھاسن کے بارے میں بتاتا رہا۔ جو ایک تخت تھا اور جس پر بیٹھ کر دنیا بھر کے سارے راز نمایاں ہوجاتے تھے۔ اور پرمیت سنگھ ہر چیز پر قادر ہوسکتا تھا۔ خیر، نعمت علی کو اس بات پر یقین تو نہیں تھا۔ وہ مسلمان تھا۔ اور اس کا ایمان تھا کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو

ہوتا ہے۔ انسان چاہے کتنی بھی کوششیں کر لے۔ کتے کی موت مارا جاتا ہے۔

تاریخ گواہ تھی فرعون، شداد، نمرود، حسن بن صباح، اور نجانے کون کون، نجانے کیا کیا حسرتیں لے کر دنیا میں آئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے طور پر ہر کوشش کر لی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک لمحہ ان کی تباہی کا باعث بن گیا۔ اور اب دنیا میں بس ان کا نام رہ گیا تھا۔ اور وہ بھی بڑی حیثیت سے، تو بیچارہ پرمیت سنگھ کیا تھا۔ کھیل کھیل رہا تھا۔ اور پھر ہندو دھرم میں تو اس قسم کے قصے کہانیاں عام ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا مسئلہ صرف یہ تھا کہ خیرالدین خیری کی روح کو آزادی دلائے۔ اور یہ ہی سب کچھ اس کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ نئی جگہ راج محل کا ایک بہت ہی خوبصورت حصہ تھا۔ اس کے برابر ایک زنان خانہ بھی موجود تھا۔

سامنے ہی پائیں باغ بھی تھا۔ جس میں حسین و جمیل پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور اس رات وہ ان پھولوں کے درمیان بیٹھا اپنے ماضی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ماں باپ کی طرف سے بالکل بے فکر تھا۔ کہ اچانک ہی اس نے آہٹیں سنیں۔ اور اس کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو کرناوتی اپنی دو تین سہیلیوں کے ساتھ ادھر آرہی تھی۔ نعمت علی ایک لمحے کیلئے گڑبڑا سا گیا۔ یہ زنانہ باغ تو نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے یہ احساس ہوا کہ کرناوتی راجہ پرمیت سنگھ کی بہن ہے۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ کرناوتی اسی کی طرف آرہی تھی۔

"ارے تو یہاں کیا کر رہا ہے سائس! کیا کر رہا ہے تو یہاں۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا۔ راجکماری جی! کہ آپ یہاں آئیں گی۔؟"

"مگر...... اوہو...... اوہو ہمیں پتہ چل گیا۔ تو۔ تو یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ بڑی بات ہے۔ کبھی کبھی بھائی جی مہاراج بھی بیوقوفیوں کی حرکتیں کرتے ہیں۔ راجہ ہوکر انہوں نے ایک سائس کو اتنی عزت دے دی ہے۔" کرناوتی طنزیہ لہجے میں بول رہی تھی۔

نعمت علی کو غصہ تو آرہا تھا۔ لیکن صورتحال کے تحت اس نے سب کچھ برداشت کرلیا تھا۔ کرناوتی نے کہا۔

"اب کھڑا کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ سنا ہے تو ہمارے ساتھ سفر پر جا رہا ہے۔؟"

"جی ہاں۔ راجہ صاحب نے یہ ہی کہا ہے۔ مجھ سے۔"

"چل ٹھیک ہے۔ بھائی جی! مہاراج کے جو فیصلے ہوں گے۔ ان پر عمل کرلیا جائے گا۔ آؤ...... لڑکیو! یہاں سے چلتے ہیں۔ اس جگہ بھی ایسے ایسے لوگوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔"

"سنیں کرناوتی جی! میری بات سنیں۔" نعمت علی کا صبر آخرکار انتہا کو پہنچ گیا۔ اور کرناوتی رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کو صرف اس بات کا دکھ ہے ناں۔ کہ میں نے آپ کا چیلنج قبول کرلیا۔ اور آپ کے اس ٹٹو کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ کرناوتی جی! میرے لئے وہ ٹٹو ہی تھا۔ اگر آپ کا سچ مچ کوئی گھوڑا ہو۔ تو اسے لائیے میں اسے بتاتا ہوں کہ گھڑسواری کیا ہوتی ہے۔ آپ کو صرف اسی بات کا دکھ ہے ناں اور اس کی وجہ سے آپ میری توہین کر رہی ہیں۔ چلیں ٹھیک ہے۔ آپ عورت ذات ہیں آپکو چیلنج کرنا بھی میرے لئے حقارت کی بات ہے۔ لیکن اگر واقعی کبھی گھوڑے سواری کا موقع آیا تو پھر آپکو بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔" کرناوتی نے خونی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر بولی۔

"مجھے تمہارا چیلنج قبول ہے۔ تمہاری موت اگر میرے ہاتھوں لکھی ہے تو مجبوری ہے۔ میں کیا کرسکتی ہوں۔" "آؤ۔" اس نے ساتھی لڑکیوں سے کہا۔ اور اسے گھورتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ نعمت علی کو واقعی غصہ آرہا تھا۔ ایک لمحے کیلئے اس کا دل چاہا کہ ساری چیزوں پر لعنت بھیج کر وہاں سے چلا جائے۔

لیکن ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ہی ایک درخت سے ایک خوبصورت طوطا اڑا اور اس کے

کندھے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس طوطے کا یہاں آنا جو بڑے سائز کا تھا۔ اور بڑا عجیب تھا۔ نعمت علی کو بہت حیران کن محسوس ہوا۔ لیکن اچانک ہی طوطے نے انسانی آواز میں کہا۔

''نہیں۔ میری جان نہیں۔ نہیں وکرم راج! نہیں، تمہیں غصہ نہیں آنا چاہئے۔ نعمت علی ایک دم دنگ رہ گیا۔ اور پھر اچانک ہی اسے پورن وتی کا خیال آیا۔ جو طرح طرح کے روپ دھار سکتی تھی اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ تو اچانک ہی طوطا اپنی جگہ سے اڑا۔ زمین پر بیٹھا اور اس کے بعد اسے پورن وتی نظر آئی۔ جو انسانی شکل میں آچکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی۔ وہ آگے بڑھی اور بڑے پیار سے نعمت علی کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

''میرے دوست! میرے ساتھی! تم ایک بہت بڑا مقصد پورا کررہے ہو میرا۔ تم میری زندگی کا بہت بڑا حصہ بن چکے ہو۔ اگر تم سویکار کرو تو میں تمہارے چرنوں کی داسی بننے کیلئے تیار ہوں۔'' وکرم راج میں تم سے پریم کرنے لگی ہوں۔ میری بات سنو۔'' جس پاتال سنگھاسن کے بارے میں راجہ پرمیت سنگھ نے تم سے کہا ہے۔ وہی تو میری سب سے بڑی طلب ہے۔ میرا استمان ہے۔ اور تم اس کا ذریعہ بن رہے ہو۔ تم نے اپنی محنت اور اپنی کوشش سے وہ مقام حاصل کرلیا ہے کہ راجہ پرمیت سنگھ اب تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کیلئے تیار ہوگیا ہے۔ ورنہ یہ بہت بڑا کام تھا۔ تمہیں جانا ہے۔ اس لڑکی کی پرواہ مت کرو۔ یہ ایسی ہی طبیعت کی مالک ہے۔ تم اسے جوتے کی نوک پر رکھو۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ میں اس بات کا دعویٰ کررہی ہوں۔ تم دیکھ لینا۔ یہ تمہارے پاؤں چومے گی یہ پورن وتی کا قول ہے۔ تم اس کی بالکل چنتا نہ کرو۔ اپنے آپ کو ثابت کردو کہ تم راجہ پرمیت سنگھ کے ساتھ جانے کے قابل ہو۔ بس سمجھ لینا۔ کہ تمہیں میرا یہ کام کرنا ہے۔'' نعمت علی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور اسے آہستہ سے پیچھے کردیا۔

اسے ایک دم وشالی یاد آگئی تھی۔ اس کی محبوبہ وہ جس نے نعمت علی کو ایک انوکھے احساس سے روشناس کرایا تھا۔ حالانکہ وہ ایک روح تھی۔ کبھی کبھی تو نعمت علی کو اس بات پر ہنسی آنے لگتی تھی۔ کہ روحوں نے اس کے گرد کیسا گھیرا ڈال رکھا ہے۔ اس نے پورن وتی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ پورن وتی جی۔ آپ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے۔ میں اسے سرانجام دینے کیلئے تیار ہوں۔''

''بہت...... بہت۔ دھنے واد، بہت بہت دھن واد، بد دل مت ہونا۔'' پورن وتی نے کہا۔ اور پھر اچانک اس نے ہاتھ فضاء میں پھیلائے۔ اور نعمت علی نے ایک انوکھا منظر دیکھا۔ ایسا منظر جو فلموں اور کہانیوں میں ہی نظر آسکتا ہے۔ انسانی زندگی کا اس سے بھلا کیا تعلق۔ پورن وتی فضاء میں پرواز کرگئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اتنی اونچی ہوئی کہ کسی چھوٹے سے پرندے کی شکل میں نظر آنے لگی۔

نعمت علی ایک گہری سانس لے کر محل میں واپس چل پڑا تھا۔

راجہ پرمیت سنگھ نے اس کے بعد تین چار دن تک کوئی ملاقات نہیں کی محل میں اسے ایک بڑی حیثیت حاصل تھی۔ کرناوتی اس دوران ایک بار بھی نظر نہیں آئی تھی۔ ان لوگوں سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جن کا ساتھ باہر کی دنیا میں رہا تھا۔ البتہ اور کچھ افراد تھے جن سے نعمت علی کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ انہی میں ایک دیپ چند بھی تھا۔ لمبا چوڑا اچھی شخصیت کا مالک، نعمت علی سے بڑی محبت سے پیش آتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ بھی پاتال سنگھاسن کی تلاش میں جانے والوں میں شامل ہے۔''

''ہمیں جانا کہاں ہوگا؟'' نعمت علی نے دیپ چند سے سوال کیا۔

''میرے سپرد اس سارے سفر کی ذمہ داریاں ہیں اور مجھے بتادیا گیا ہے وکرم راج مہاراج کہ آپ ہمارے ساتھی ہیں غالباً آپکو خاص طور سے اس ٹیم میں

شامل کیا گیا ہے۔ ہم لوگ تبت کی ترائیوں میں ایسے علاقوں میں جائیں گے جن میں سے بعض علاقوں میں ابھی انسان کی پہنچ نہیں ہوئی ہے۔ ہمالیہ پہاڑ کے عقبی حصے میں۔ اس طرح کے قبیلے آباد ہیں۔ جن تک انسانی پہنچ نہیں ہوئی ہے۔ وہ علاقے ہمارے چرنوں کے نیچے ہوں گے۔''

پاتال سنگھاسن انہی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ نجانے کیوں نعمت علی کو اس بات سے دلچسپی کا احساس ہوا تھا۔ اب تک وہ ایسے علاقوں کی سیر کرچکا تھا۔ جہاں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہندوستان ویسے تو بڑی وسیع جگہ تھی۔ اور یہاں کی کچھ روایات کے بارے میں نعمت علی سن چکا تھا لیکن تبت وغیرہ کا علاقہ اس کے علم سے باہر تھا۔ اس انوکھی دنیا کے بارے میں بھی اسے تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

وہاں بدھ بھکشوؤں اور دلائی لاماؤں، کی حکمرانی تھی۔ اور وہاں کی پراسرار روایات بڑی دلچسپ ودلکش تھیں۔ نعمت علی کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اگر ان علاقوں کا سفر کیا جائے۔ تو لطف آئے گا۔ ویسے بھی اس کی زندگی کا کوئی خاص مقصد تو تھا نہیں۔ ماں باپ اچھے خاصے آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔ پھر بھی اس نے خیرالدین خیری سے سوال کیا۔

''استادِ محترم! آپ نے کہا تھا کہ جب بھی میں آپ کو آواز دوں گا۔ آپ میری آواز کا جواب دیں گے۔ کم ازکم اور کچھ نہیں تو آپ مجھے اتنا تو ضرور بتادیں کہ کیا میرے لئے یہ سفر مناسب رہے گا۔'' اور نجانے کیوں نعمت علی کو یہ احساس ہوا۔ کہ ایک مدھم سا راگ اس کے کانوں میں گونج رہا ہے۔ لفظ تو نہیں تھے۔ لیکن احساس بول رہا تھا۔ اور اسے یہ بتایا جارہا تھا کہ یہ سفر کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔

دل کو ایک ڈھارس سی ہوگئی تھی۔ پھر غالباً چھٹا دن تھا۔ اس گفتگو کے ہونے میں کہ اسے دیپ چند بتلانے کیلئے آگیا۔''

''آج سب لوگ مکمل ہوگئے ہیں۔ اور شاید ایک آدھ دن کے اندر اندر ہمیں سفر کرنا پڑ جائے۔''

''بہت خوب، ہمیں یہ سفر کیسے کرنا ہوگا۔؟''

''وہ بعد میں معلوم ہوگا لیکن آج رات کو پرمیت سنگھ مہاراج نے سب کو طلب کیا ہے۔ اور انہیں ان کے بارے میں بتادیا جائے گا۔''

''ٹھیک۔''

پھر اسی رات دیپ چند کے ساتھ ہی وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں تمام لوگ موجود تھے۔ ایک لمبے لمبے بالوں والا سادھو بھی وہاں موجود تھا۔ جسے دیکھتے ہی نعمت علی نے پہچان لیا۔ یہ پردھان سنگھ تھا۔ نعمت علی کے دل کو ایک خوف کا سا احساس ہوا۔ راجہ پرمیت سنگھ نے سب کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ یہاں تک کہ کرناوتی بھی موجود تھی۔ اس نے کہا۔

''ہمارا یہ مشن ایک آدھ دن میں روانگی کیلئے تیار ہوجائے گا۔ اور ہمیں اپنے طور پر سفر کرنا پڑے گا۔ وہ بہت کچھ بتاتا رہا۔ لیکن، نعمت علی نے محسوس کیا کہ پردھان سنگھ اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ نعمت علی کے دل کو ایک خوف کا احساس ہوا۔ تو اس کے کان میں پورن وتی کی سرگوشی ابھری۔

''نہیں۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے تم پر شک ضرور ہوا ہے۔ لیکن وہ تمہیں پہچان نہیں سکے گا۔ ایکدم سے نعمت علی کا دل بڑا ہوگیا۔ اس کا مطلب ہے۔ کہ پورن وتی تمام حالات سے واقف ہے اور اس کی پیٹھ پر ہے۔ نعمت علی کو ایک ڈھارس سی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ جب ساری باتیں ختم ہوگئیں۔ تو پردھان سنگھ اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

''پتہ نہیں کیوں۔ تو من کو اپنا اپنا سا لگتا ہے۔ کیا نام ہے تیرا وکرم راج! کون ہے تو؟''

''داس ہوں مہاراج آپ کا۔ وکرم راج ہے۔ میرا نام۔''

''ہاں...... سو تو ہے۔''

''چل ٹھیک ہے، اچھا لگا تو ہمیں جان چھوٹ گئی تھی۔ ورنہ نعمت علی کا دل تو دھاڑ دھاڑ کررہا تھا۔ کہ

دیکھو! اب بھانڈا پھوٹتا ہے۔ بہرحال اس کے بعد تمام تر تیاریاں مکمل ہوتی چلی گئی تھیں۔

نعمت علی کو ان علاقوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ لیکن راجہ پرمیت سنگھ اور اس کے ساتھی تمام کاموں میں مصروف رہے تھے۔ ساری تیاریاں مکمل ہوئیں اور اس کے بعد ان لوگوں کے سفر کا آغاز ہو گیا۔ وہ سری لنکا چل پڑے تھے۔

سری لنکا تک کا سفر خاصی دلچسپیوں کا باعث تھا۔ اور سفر میں بہت لطف آیا تھا۔ کرنا وتی کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ جو اس کی مصاحب تھیں۔ کرنا وتی کی نفرت کا وہی عالم تھا۔ بہرحال سری لنکا کے ایک قصبے میں ان لوگوں نے قیام کیا ہر ایک کو اپنے اپنے طور پر سیر و سیاحت کی آزادی تھی یہاں گیانڈی نامی اس قصبے میں نعمت علی کی ملاقات ایک بدھ لڑکے سے ہوئی۔ اس کا نام جے ورتنا تھا۔ وہ نعمت علی کا دوست بن گیا۔ اور دونوں بہت جلد بے تکلف ہو گئے۔

ورتنا کا باپ گیانڈی کے یاقوت کی ایک کان میں انجینئر تھا۔ ورتنا، نعمت علی کو اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ اسے ایک لڑکی سے عشق تھا۔ اور وہ خوب سیر و سیاحت کیا کرتے تھے۔ ورتنا نے نعمت علی کو وہاں کے قابل دید مناظر دکھائے۔ یہ علاقہ کتنا حسین تھا۔ اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ پہاڑی سلسلے میں آخری چوٹی بھی دیکھی گئی۔ جس کے بارے میں یہ ہی روایت تھی کہ حضرت آدم کو اسی چوٹی پر پھینکا گیا تھا۔ وہاں باقاعدہ ایک احاطہ بنا ہوا تھا۔ سری لنکا کے مسلمان عقیدت مند زندگی کی بازی لگا کر اس چوٹی تک آتے تھے۔ اور یہاں بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ ورتنا نعمت علی کو بہت سی چیزیں دکھاتا رہا۔ انہوں نے یہاں بدھوں کی نہایت مشہور عبادت گاہ مہاسان دیول بھی دیکھی۔ اور کچھ عجیب سی پراسرار قوتیں، نعمت علی کو اپنے اردگرد رقصاں محسوس ہوئیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے عالم خواب میں ہو۔ اور اس کے ذہن پر ایک دھند سی چھائی ہوئی ہو۔

اس دن جب مہاسان دیول سے واپسی ہو رہی تھی تو انہوں نے ایک ایسی جگہ قیام کیا جہاں پتھر کی چٹان شیر کے منہ کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔ پورا شیر کا دہانہ تھا۔ لمبے لمبے دانت کھلے ہوئے تھے۔ جے ورتنا نے اسے بتایا کہ لوگ یہاں آتے ہیں تو اس میں بیٹھ کر تصویریں کھنچواتے ہیں۔ اور یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ شیر کے حلق میں بیٹھے ہوں۔

نعمت علی جے ورتنا کے ساتھ وہاں جا بیٹھا۔ اور اس کے ذہن پر ایک دھند سی چھانے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے ایک اندھیری سی فضاء ہو اور اس کا تسلسل نہ ٹوٹ پا رہا ہو۔ غرض یہ کہ اس طرح سے وقت گزرتا رہا۔ ورتنا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ دیر وہ نعمت علی کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا۔ اور اس کے بعد اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟'' دکرم راج مہاراج۔؟'' نعمت علی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔ ''ہمارا تعلق سری لنکا کے ایک ایسے قبیلے سے ہے۔ جس کا اپنا ایک وقار ایک مقام ہے۔ ہم جسے دوست کہہ دیتے ہیں اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی تمہارے علم میں ہے کہ میں مذہباً بدھ ہوں اور میں نے اپنے قبیلے کی روایات کے مطابق بہت سی مذہبی تعلیمات کا جائزہ لیا ہے۔

''بہرحال میں تمہیں بہت سی ایسی باتیں بتاؤں گا۔ جنہیں سن کر تمہیں حیرت ہوگی۔'' نعمت علی حیران نگاہوں سے ورتنا کا جائزہ لے رہا تھا۔ بڑی سادہ سی زندگی گزاری تھی اس نے، اب تک بہت پراسرار واقعات پیش آئے تھے اس کی زندگی میں، لیکن اس طرح کی معلومات اسے کبھی حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ پراسرار واقعات سے گزرنا ایک الگ بات ہے۔ اور ان کے بارے میں معلومات ایک مشکل کام اب تک جن لوگوں سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بیشک بعض معاملات میں ناقابل یقین تھے۔ لیکن اب صورت حال بہت ہی مختلف محسوس ہو رہی تھی۔ ورتنا کہنے لگا۔

''تم نہیں جانتے کہ وردھان سادھانی کسی ایک انسان کا نام نہیں۔ بلکہ یہ زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ایک چمکدار دھند ہے۔ جو اس کے گرد لپٹ جاتی ہے۔ جو وردھان سادھانی کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اور میں تمہیں دل سے بتا رہا ہوں کہ وہم کا کوئی وجود نہیں ہے۔ میں تمہیں ایک ایسی جگہ لے چلوں گا۔ اگر تمہیں اس کی اجازت ملی۔ جسے دیکھ کر تم دنگ رہ جاؤ گے۔'' نعمت علی کے دل میں ایک بالکل ہی نئی امنگ پیدا ہو چکی تھی۔

راجہ پرمیت سنگھ کی طرف سے اسے اجازت تھی کہ جب تک راجہ پرمیت سنگھ یہاں سے آگے بڑھنے کا انتظام نہیں کر لیتا۔ وہ آزادی سے جہاں چاہے گھوم سکتا ہے۔ اور ورتنا درحقیقت ایک بہترین دوست اور بہترین ساتھی ثابت ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''وردھان سادھانی کے نام سے ایک جگہ منسوب ہے۔ ہم اسے رانگا پلی کہتے ہیں جو یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ یہاں سے تھوڑی سی دوری پر ایک بستی ہے۔ جہاں دشوار گزار پہاڑوں کا ایک راستہ جاتا ہے۔ اس بستی کا نام مودپے ہے۔ کسی زمانے میں اس راستے پر آمد و رفت رہتی تھی۔ اور محکمہ جنگلات کے لوگ جنگلی ہاتھی پکڑنے والے ادھر جا نکلتے تھے۔ مگر اس کے بعد وہاں پے درپے واقعات ہونے لگے۔ اور لوگوں نے ادھر جانا چھوڑ دیا۔ اسی راستے پر کافی دور جا کر وردھان سادھانی اور اس کے بدعقیدہ بھکشوؤں کا دھار ہے۔ بہت کم لوگوں نے وہ جگہ دیکھی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سال کے آٹھ مہینے ان پہاڑوں پر برف جمی رہتی ہے۔ میرے پتا نے بھی دور سے ہی اس دھار کی عمارت دیکھی ہے۔ پر قریب جانے کی ہمت نہیں کی اس کی وجہ وہاں کی روایات ہیں۔''

''کیسی روایات؟'' نعمت علی کے منہ سے بے ساختہ نکلا اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اب اس کے ذہن میں کچھ نئی امنگوں نے جنم لیا ہے۔ وہ کہنے لگا۔

''ابھی تم نے کہا تھا۔ ورتنا کہ وردھان سادھانی بدعقیدہ اور بدمست ہے۔''

''ہاں۔ ان لوگوں کے عقیدے ہمارے عقائد سے میل نہیں کھاتے۔ بلکہ ہم اپنے الفاظ میں انہیں کافر کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بدھ مذہب سے بہت دور کی باتیں کرتے ہیں۔''

''اور وہ جگہ کیسی ہے؟''

''وہاں برف جمی رہتی ہے۔ اور وہاں لوگوں کے نہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں جو ایک دفعہ چلا گیا۔ وہ یا تو دنیا کو ترک کر کے انہی گمراہ بھکشوؤں میں شامل ہو جاتا ہے۔ یا پھر پاگل ہو جاتا ہے۔''

''اوہ......'' نعمت علی نے مدہم لہجے میں کہا۔ بہرحال اس کے بعد وہ واپس آ گیا۔ ورتنا نے اسے ایک عجیب ہی دنیا کی سیر کرا دی تھی۔ لیکن جس جگہ قیام کیا گیا تھا۔ وہ بھی خاص قسم کی طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔ نعمت علی کو بھی ایک ایسی جگہ دے دی گئی تھی۔ جو مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کا راستہ باہر ہی تھا۔

رات کے کھانے پر سب لوگ ساتھ تھے۔ نعمت علی کو باقاعدہ نوکروں کی جگہ نہیں دی گئی تھی۔ اور پھر خاص طور سے کیونکہ اسے ہندو سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے رات کا کھانا ان لوگوں نے ساتھ ہی کھایا تھا۔ سبزیاں دودھ اور کچھ خاص قسم کی چیزیں جو بہر طور بڑی لذیذ تھیں۔ اور تبدیلی بھی۔ نجانے کب تک نعمت علی جاگتا رہا۔ پھر اس نے لائٹ بجھائی اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اور بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔

نجانے کب اسے نیند آ گئی۔ اور نجانے کتنی دیر سویا تھا کہ نیند ہی کے عالم میں اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی اسے پکار رہا ہو۔ جو اسے پکار رہا تھا۔ اس کی آواز جانی پہچانی سی لگتی تھی۔ اور نعمت علی ایک دم جاگ گیا۔ گھڑی اس وقت رات کا ایک بجا رہی تھی۔ ایک بار پھر آواز سنائی دی تو وہ تڑپ کر اٹھ گیا۔

وشالی کی آواز اس نے صاف پہچان لی تھی۔

پتہ نہیں کون جاگ رہا تھا۔ کون سو رہا تھا۔ یہاں اس جگہ نعمت علی تنہا نہیں تھا۔ بلکہ بہت سے لوگ اس کے

آس پاس موجود تھے۔ لیکن وہ ان سب سے بے نیاز باہر نکل آیا۔

باہر اس نے ایک سفید سایہ دیکھا۔ جو سلکی لباس میں ملبوس تھا۔ سایہ سر سے پاؤں تک ایک لبادہ نما لباس میں موجود تھا۔ لیکن سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اور پھر دھند میں چھائی ہوئی مدھم روشنی میں اس نے گردن گھما کر دیکھا تو نعمت علی ایکدم بے اختیار ہو گیا۔ وہ وشالی ہی تھی۔

"و......و......شالی......وشالی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر آواز دی لیکن وشالی آگے بڑھ گئی۔ اس کا لباس اڑ رہا تھا۔ نعمت علی دیوانہ وار اس کے پیچھے چل پڑا۔

اس سے پہلے بھی اس پر یہ لمحہ طاری نہیں ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھتا رہا اونچی نیچی ٹیکریوں، وادیوں اور میدانوں سے گزرتے ہوئے۔ وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وشالی اس سے اتنے ہی فاصلے پر تھی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ فضاء میں تیر رہی ہے۔

نعمت علی کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دور نکل آیا۔ لیکن یہ انوکھا سفر اس کے لئے ہوش و حواس سے عاری تھا۔ بستی پیچھے رہ گئی تھی۔ اور وہ پہاڑی راستوں پر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ رات کا پچھلا پہر گھنے جنگلوں کا گزر اور پھر بلندیاں اور پستیاں جن پر چڑھتے اترتے یوں لگ رہا تھا۔ کہ جیسے یہ فضائی سناٹا اس کے لئے کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو۔

سردی کافی تھی۔ دھند بھی تھی۔ لیکن نعمت علی کے اندر ایک عجیب سی توانائی اور سرشاری تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی بلندی پر پہنچ گیا ہے۔ رات کتنی گزر گئی۔ آخر کار کچھ دیر کے بعد اس نے دیو قامت درختوں پر اکا دکا پرندوں کی چہچہاہٹ سنی۔ اس کے ساتھ ہی مدھم مدھم روشنی بھی نمودار ہوتی جا رہی تھی۔

گویا صبح ہونے والی تھی۔ پھر ذرا سا اجالا ہوا تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس وقت وہ جس پہاڑ کی دشوار گزار پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ اس کے خاتمے پر اسے ایک عمارت دھبے کی صورت میں نظر آئی۔ اس نے دیکھا کہ اس عمارت کے عقب میں پہاڑ ایک دیوار کی طرح سیدھا اٹھتا چلا گیا ہے۔ اور اتنا بلند ہے کہ اس کی چوٹی بادلوں میں چھپ گئی ہے وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسے خیر الدین تیرو کا ساتھ حاصل تھا۔ ایک ناقابل یقین کی سی کیفیت تھی۔

لیکن اب تک اس نے ایسا کوئی منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور وشالی بھی اسے کہیں آس پاس نظر نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال وہ آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر ایک عجیب عمارت نظر آئی۔ بلکہ اسے عمارت کہنا مناسب نہیں تھا۔ پہاڑ کی ایک ٹھوس چٹان کو تراش کر قدرتی غار کی کیفیت دے دی گئی تھی۔

جس کی ایک محراب سی بنی ہوئی تھی۔ محراب سے گزر کر ایک طویل غلام گردش نظر آ رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا گنبد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس آدھے گنبد کا حصہ پہاڑ نے نگل لیا ہو۔ اندرونی حصہ سرنگوں اور گپھاؤں پر مشتمل تھا۔ چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر چھوٹے بڑے حجرے بنائے گئے تھے۔ یقیناً، ان حجروں میں بھکشو، یا پجاری رہتے ہوں گے غرض یہ کہ وہ آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر اچانک ہی، اس نے پانی گرنے کا شور سنا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر دو راستے پھوٹتے تھے۔ اور ان دونوں راستوں میں سے ایک طرف وشالی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ تو اس نے چٹان میں چار پانچ سیڑھیاں تراش کر اوپر جانے کا راستہ دیکھا۔ اور پھر جب وہ اوپر پہنچا تو اسے ایک چوڑا سا پلیٹ فارم نظر آیا۔ یہاں وشالی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔ نعمت علی اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اس نے کہا۔

"وشالی۔" لیکن ابھی اس کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے کہ اچانک وشالی کا پورا بدن دھوئیں میں ڈوب گیا۔ سفید لطیف دھواں جس سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ چند لمحات تک یہ دھواں فضاء میں بلند ہوتا رہا۔ اور اس کے بعد جب دھواں ہٹا تو نعمت علی نے دیکھا کہ وہاں کسی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ نعمت علی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا تھا۔ اسے ایک عجیب سے

دکھ کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے حلق سے ایک مدھم سی آواز نکلی۔

"وشالی!...... وشالی! کہاں چلی گئیں تم۔ وشالی تم کہاں چلی گئیں۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اسے کسی نے اپنے دونوں بازوؤں میں سنبھال لیا ہو۔ اور ایک عجیب و غریب خوشبو اس کے سارے وجود میں تیرنے لگی ہو۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی کے گھنیرے بال اس کے چہرے کو چھو رہے ہوں۔

ایک لمحے کیلئے اس کی آنکھیں بند ہوئیں۔ پھر فوراً ہی کھل گئیں۔ بڑی عجیب سی کیفیت کا احساس تھا۔ جب ذہنی کیفیت واپس آئی۔ تو اس نے پورن وتی کو دیکھا۔ جس کا چہرہ دھند جیسی کیفیت میں چمک رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔

"مہا...... مہا...... متی۔ آپ؟"

"ہاں۔ وکرم راج۔ یہ میں ہوں۔ تم زندہ طلسمات میں گھر گئے ہو۔ تم بہت سی نگاہوں کا مرکز بن گئے ہو۔ اور میں جانتی ہوں۔ ایسا کیوں ہے تمہارے تصور میں بھی یہ بات نہیں ہوگی وکرم راج کہ دیوی اور دیوتاؤں نے تمہیں اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ نجانے وہ تم سے کیا کام لینا چاہتے ہیں جو ہوگا۔ اس پر پریشان مت ہونا۔ کیا سمجھے؟ جو گزر رہی ہے اسے گزرنے دو۔ وقت آنے پر بہت سی حقیقتیں خود تمہارے سامنے آجائیں گی۔"

"لیکن...... میں...... میں...... وہ نہیں ہوں۔ جو تم لوگ سمجھ رہے ہو مجھے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"وشالی کہاں گئی؟" نعمت علی کے منہ سے بے اختیار نکلا اور پورن وتی کا چہرہ خشک ہوگیا۔

"ایک وشالی پر انحصار مت کرو۔ وکرم راج! بہت سی وشالی تمہارے راستے میں آئیں گی۔ بہت کچھ تمہارے راستے میں آئے گا۔ سمجھ رہے ہونا؟" بس صبح ہوگئی باقی باتوں پر غور مت کرو۔ بعد میں سوچنا۔" پورن وتی نے نعمت علی کی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ نرم سا احساس اور اس کے بعد ایک آواز۔

"اٹھ جایئے مہاراج! اٹھ جایئے پربھو ناشتے کا سمے ہوگیا ہے۔ آپ بہت دیر سے سو رہے ہیں۔ سب جاگ گئے ہیں۔" ایکدم سے نعمت علی کے بدن میں تھرتھراہٹ سی ہوئی۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ کیا ہوگیا۔ یہ طلسم تو بہت ہی ہولناک تھا۔ بہر حال اپنی جگہ سے اٹھا۔ پورا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ جو سفر اس نے رات کو طے کیا تھا۔ وہ اس کے جسم پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ باقی لوگ نارمل تھے۔ آگے بڑھنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ آگے کے سفر کا آغاز کردیا گیا۔ ان لوگوں نے ذریعہ سفر شاندار قسم کی جیپیں اور گھوڑے کا اختیار کیا تھا۔ تین جیپیں تھیں۔ پانچ گھوڑے تھے اور ان گھوڑوں کو وہیں سے حاصل کیا گیا تھا۔

راجہ پرمیت سنگھ کے لئے یہ سارے کام کرنا مشکل نہیں تھا۔ ہر جگہ اس کی پذیرائی ہو رہی تھی۔ اور اسکا نعمت علی کو بھرپور طریقے سے اندازہ تھا۔ پردھان سنگھ البتہ جب بھی سامنے آتا تو اسے غور سے دیکھنے لگتا تھا۔ یہ ہی خوش نصیبی تھی کہ اس کے ذہن میں نعمت علی کی بات نہیں آئی تھی۔ اس دوران نعمت علی نے کئی بار یہ کوشش کی تھی۔ کہ پردھان سنگھ کہ معمولات تلاش کرے اور یہ پتہ چلائے کہ اگر خیر الدین خیری کی روح اس کے قبضے میں ہے تو وہ کس طرح ان روحوں کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔

یا پھر خیر الدین خیری کے علاوہ کوئی اور روح بھی اس کے قبضے میں ہے یا نہیں لیکن ظاہر ہے۔ نعمت علی کو یہ سب کچھ نہیں آتا تھا۔ چنانچہ وہ کچھ معلوم نہیں کرسکا تھا۔

سفر کا آغاز ہوگیا۔ ماحول انتہائی خوبصورت تھا۔ نجانے کیسے کیسے معاملات نظر آرہے تھے۔ وہ لوگ خوبصورتی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اور دیکھ رہے تھے کہ یہاں نجانے کیا کیا ہے۔ تبت کے علاقے میں ہر منظر بے پناہ خوبصورت تھا۔ اور جو کچھ

نگاہوں کے سامنے آرہا تھا۔ وہ اتنا حسین تھا کہ لطف آجاتا تھا۔ بہر طور تقریباً دو دن کا سفر کیا گیا اور اب اس کے بعد وہ روایتی پہاڑی سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ جس کے بارے میں پہلے بھی کئی بار سنا جاچکا تھا۔

اس دوران قیام بھی ہوتا تھا۔ کھانا وغیرہ بھی پکایا جاتا تھا۔ اور یہ ساری چیزیں نگاہوں کے سامنے آجاتی تھیں۔

نعمت علی بہت ہی عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ اس دوران نہ تو وشالی اسے نظر آئی تھی۔ اور نہ ہی پورن وتی بس وقت گزر رہا تھا۔ اور احساسات میں تبدیلیاں ہوتی جارہی تھیں۔

پھر ایک بہت ہی خوبصورت جگہ قیام کیا گیا۔ یہ ہمالیہ کی ترائی کا علاقہ تھا۔ اور یہاں کے مناظر کافی حد تک خوبصورت تھے۔ اور دل یہ چاہتا تھا۔ کہ یہیں زندگی کی شام ہوجائے۔ کرناوتی کی نفرت کا وہی عالم تھا۔ یہاں غالباً کچھ وقت زیادہ قیام کرنا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ تو معلوم نہیں ہوسکی تھی۔ لیکن یوں لگتا تھا۔ جیسے راجہ پرمیت سنگھ یہاں زیادہ وقت گزارنا چاہتا ہو۔

دوپہر کے بعد موسم میں خاصی تبدیلیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ آسمان پر بادل جھکے ہوئے تھے۔ کرناوتی ایک خوبصورت سفید رنگ کے گھوڑے پر سوار ہوکر سیر و سیاحت کیلئے نکلی۔ نعمت علی کو بھی کوئی کام نہیں تھا۔

اچانک ہی کرناوتی نے کہا۔

"جی! شہسوار، آؤ چل رہے ہو میرے ساتھ۔"

نعمت علی نے گردن اٹھا کر کرناوتی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بدستور تضحیک کے آثار تھے۔

"کہاں جانا ہے۔ راجکماری جی!"

"ان علاقوں میں گھوڑے کی سیر کا مزہ ہی الگ ہے۔ بشرطیکہ کسی کے اندر ہمت ہو۔" نعمت علی نے گردن خم کرکے کہا۔

"اگر آپ مجھے حکم دیں گی تو بھلا میری مجال ہے کرنے سے انکار کروں۔"

"گھوڑا لاؤ۔" کرناوتی نے ایک سائیس سے کہا۔ اور وہ ایک مشکی گھوڑا لے کر آگیا۔ گھوڑا نہایت تندرست و توانا تھا۔

"کیا خیال ہے؟"

"جی۔"

"تو پھر آؤ۔" کرناوتی بولی اور نعمت علی گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

کرناوتی آہستہ آہستہ سفر کررہی تھی۔ اس کے ساتھ تین گھوڑے اور تھے چوتھے گھوڑے پر نعمت علی سوار تھا۔ کرناوتی کی آنکھوں میں کوئی عجیب سی کیفیت نظر آرہی تھی۔ جس کو نعمت علی نے محسوس نہیں کیا۔

بہر حال گھوڑے سست روی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں دوڑانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ یہ علاقہ گھوڑے دوڑانے کے قابل تھا ہی نہیں۔

کرناوتی ایک خوفناک ڈھلان تک پہنچی، یہ ڈھلان بس ناقابل یقین تھا۔ اتنی خوفناک چٹانیں اس میں بکھری ہوئی تھیں کہ اگر ذرا سی لغزش ہوجائے۔ اور انسان اس کے درمیان چلا جائے۔ تو قیمہ ہی بن جائے۔ یہاں آکر کرناوتی نے اپنا گھوڑا روکا۔ لیکن اس انداز میں کہ گھوڑا ڈھلان کے بالکل کنارے پر کھڑا تھا۔ اچانک ہی کرناوتی نے ایک عمل کر ڈالا جس کی کوئی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس نے ایک سرنج نکالی جس میں ایک سیال بھرا ہوا تھا۔

اور اچانک ہی اس نے سرنج گھوڑے کی ران کے اوپر لگادی۔ گھوڑا بری طرح اچھلا تھا۔ اور نعمت علی کو اس طرح اپنے آپکو سنبھالنا مشکل ہوگیا تھا۔ کوئی ایسی چیز گھوڑے کے اندر انجیکٹ کی گئی تھی۔ کہ گھوڑا دیوانہ ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے ڈھلان میں چھلانگ لگادی۔ یہ سب کچھ نعمت علی کیلئے ناقابل یقین تھا۔

باقاعدہ شہسوار تو وہ تھا ہی نہیں۔ وہ تو بس پورن وتی کی مہربانی تھی کہ اس نے اسے کچھ سے کچھ بنادیا تھا۔ لیکن اس وقت اسے گھوڑے کو سنبھالنا انتہائی مشکل ہوگیا۔ گھوڑا چٹانوں کے درمیان چھلانگیں لگا دیا تھا۔ ہر چھلانگ پر نعمت علی گھوڑے کی پشت پر سے اچھل جاتا۔

لیکن بس تقدیر تھی۔ جو اسے جمائے ہوئے تھی۔ گھوڑا ڈھلان پر دوڑتا چلا جارہا تھا۔

نعمت علی کو یہ اندازہ ہوگیا تھا۔ کہ اس کے خلاف کوئی گہری سی سازش ہوئی ہے۔ گھوڑے نے کئی جگہ ٹھوکر کھائی تھی۔ اور نعمت علی کے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ پھر جو کچھ ہوتا تھا۔ وہ ہوگیا۔ نعمت علی گھوڑے کی پشت سے بہت اونچا اچھلا تھا۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا۔ کم از کم اسے اس کا علم نہیں تھا۔ لیکن جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک عجیب وغریب ماحول میں دیکھا کچھ دیر کیلئے اس کے احساسات اس سے بہت دور چلے گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ ہوش و حواس واپس آتے چلے گئے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک پہاڑی غار میں ہے۔ کافی بلندی پر غار کی چھت نظر آرہی تھی۔ جو خاصی ہموار اور ناتراشیدہ تھی۔

یہ غار سو فیصدی قدرتی تھا۔ بدن کے نیچے کوئی نرم سی چیز تھی۔ اس نے اس چیز کو چھو کر دیکھا۔ لیکن اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ البتہ اسے اپنی طبیعت میں ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہورہا تھا۔ رفتہ رفتہ واقعات اس کے ذہن میں نمایاں ہوتے چلے گئے۔ اسے وہ ڈھلان کا ہولناک سفر یاد آیا۔ کرناولی یاد آئی جس نے گھوڑے کو انجکشن دیا تھا۔ اور گھوڑا پاگل ہوگیا تھا۔ یقیناً وہ تیزاب یا ایسی کسی چیز کا انجکشن تھا۔ جس نے گھوڑے کے وجود میں آگ لگادی تھی۔ نعمت علی کو یقین تھا۔ کہ گھوڑا تو مر چکا ہوگا۔

لیکن جو کچھ کرناولی نے کیا تھا۔ وہ ناقابل معافی تھا۔ اور اب یہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کہ وہ راجہ پرمیت سنگھ سے کتنی دور نکل آیا تھا۔ کچھ لمحوں تک وہ ماضی کے بارے میں غور کرتا رہا۔ اور پھر اس کے بعد اس نے گردن گھمائی اس نے دیکھا۔ کہ پتھر کی چٹانوں کو چوکور تراشا گیا ہے۔ اور ان تراشیدہ چٹانوں پر عجیب وغریب چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں خوبصورت رنگ کے پتھر بھی موجود تھے۔

ایک جگہ ہلکا سا دھواں بلند ہورہا تھا۔ بہرحال وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر بہت دور فاصلے پر اسے ایک گول دروازے سے کوئی داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ یہ ایک انسان تھا۔ لیکن لاماؤں کے لباس میں اسکا سر گنجا تھا۔ اور گلے میں مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ نعمت علی کو یاد آگیا کہ وہ لاماؤں کے دیش میں ہے۔

لیکن کس کیفیت میں۔ جس طرح گھوڑا دوڑا تھا۔ اس وقت تو یہ اندازہ ہورہا تھا کہ اس کی ہڈیاں چور چور ہوجائیں گی۔ زندگی بچنے کے کوئی امید نہیں تھی تو کیا میں زندہ ہوں۔؟

اور لاماؤں کی کس آبادی میں ہوں۔ اس کے علاوہ اور کیا سوچا جاسکتا تھا۔ بہرحال وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اور قریب آگیا۔ اس کے بعد اس نے نعمت علی کے جسم کو دیکھا۔ اور گردن ہلائی۔ جیسے وہ اطمینان کا اظہار کررہا ہو۔ اس کے بعد اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔

جملہ تو سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن نعمت علی کو یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ بھوک کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ تب نعمت علی کو بھوک کا احساس ہوا اور اس نے گردن ہلادی۔ اس شخص کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے تھے۔ پھر وہ وہاں سے آگے بڑھا۔ اور لکڑی کے ایک پیالے میں کچھ چیزیں لے کر آیا۔ یہ ایک سیال سا تھا ساتھ ہی ایک لوکی نما پھل۔ جو اس نے سیال کے ساتھ نعمت علی کی طرف بڑھادیا۔

نعمت علی نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس کو دقت نہیں ہوئی۔ ایک لمحے کے لئے اسے حیرانی ہوئی تھی۔ اور اس نے سوچا تھا کہ کمال کی بات ہے زندگی ان حالت میں بھی بچ سکتی ہے۔ لیکن بہرحال اللہ کا وجود کہیں بھی اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔ وہ پیالہ لئے ہوئے نعمت علی کے پاس پہنچا اور اس نے لوکی نما چیز اس کے ہاتھ میں تھمادی۔

نعمت علی کو یہ تو نہیں معلوم تھا۔ کہ یہ ترکاری ہے۔ یا پھل لیکن اس نے اسے ذرا سا چکھ کر دیکھا۔ اور وہ اسے بہت ہی لذیز محسوس ہوا۔ میٹھا تھا۔ اور ہلکی ہلکی سی ترشی بھی تھی۔ اس میں لیکن یہ پھل نعمت علی نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بہرحال نعمت علی نے وہ پھل چبایا۔ اور سیال کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لئے اب اس میں کوئی تکلف تو نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ لوگ نعمت علی کا علاج بھی کررہے تھے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ نعمت علی پھر آرام کرنے کے لئے اسی بستر پر لیٹ گیا۔ اور وہ شخص واپس چلا گیا۔ دن اور رات کا کوئی تعیس نہیں تھا۔ غار میں ایک عجیب سی مدھم مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

پھر اس وقت کوئی یقین ہی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کیا وقت ہوا ہے کہ ایک ضعیف شخص غار کے اس دہانے سے اندر داخل ہوا۔ یہ بھی لاماؤں کے لباس میں تھا۔ اور اس کے پیچھے دو افراد بڑے ادب سے نظریں جھکائے چلے آرہے تھے۔ آنے والوں میں سے ان دو آدمیوں نے لکڑی کا بنا ہوا ایک اسٹول جو بہرصورت بھدا تھا۔ لیکن اسے اسٹول نما ہی بنایا گیا تھا۔ یعنی درخت کے اوپری حصے کو کاٹ کر اس میں چار سوراخ کئے گئے تھے۔ اور ان سوراخوں میں لکڑیاں گھسا کر اسے اسٹول بنادیا گیا تھا۔

انہوں نے وہ اسٹول بستر کے سامنے رکھ دیا۔ اور بوڑھا شخص اس پر بیٹھ گیا۔ اچانک ہی نعمت علی نے محسوس کیا کہ اس کے کندھے پر ایک عجیب سی چیز بیٹھی ہوئی ہے۔ نعمت علی نے غور کیا تو اسے محسوس ہوا۔ کہ یہ ایک پرندہ ہے۔ لیکن یہ کیسا پرندہ تھا۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو پارہا تھا۔

شکل وصورت میں وہ چمگادڑ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اسکا رنگ گہرا نیلا تھا۔ نیلی چمگادڑ نعمت علی کے ذہن میں ایک نام ابھرا۔ اور نجانے کیوں اسے یوں لگا جیسے چمگادڑ ہنس پڑی ہو۔ ادھر بوڑھا گہری نگاہوں سے نعمت علی کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو۔؟“

”میں بہت دور سے آرہا ہوں۔ اور میں نہیں ...... جانتا کہ میں یہاں کیسے پہنچا؟ یہ کون سی جگہ ہے۔“

”پاتال نگری۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ اور نعمت علی کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ یہ ہی نام تو راجہ پرمیت سنگھ نے لیا تھا۔ پاتال نگری۔ وہ کوئی پاتال سنگھاسن تھا۔“ جس کے لئے پرمیت سنگھ نے یہ سفر کیا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

”ہم پاتال نگری کے اوپری حصے میں ہیں۔ زمین کی گہرائیاں یہاں سے تھوڑے فاصلے سے شروع ہوتی ہیں۔ اور کیا تم اس بات پر یقین کروگے کہ تمہیں یہاں ایک مقصد کیلئے بلایا گیا ہے۔“ نعمت علی کو یاد آیا۔ کہ وہ یہاں خود تو نہیں آیا۔ اس کے ساتھ تو کرناولی نے سازش کی تھی۔ زندگی بچ گئی۔ یہ بھی بہت بڑا کام ہے۔

”ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن دیوتاؤں کے فیصلے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ تم خود یہاں نہیں آئے۔ بلکہ جو کچھ تمہارے ساتھ کیا گیا۔ وہ تمہیں یہاں پہنچانے کے لئے تھا۔“ نعمت علی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ بوڑھے نے اس کے دماغ میں اٹھنے والے خیالات کو پڑھ لیا تھا۔ بوڑھا پھر بولا۔

”ہاں ...... میں نے تمہارے خیالات کو پڑھ لیا ہے۔ تمہیں جو اک شکل بخشی گئی ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ ایک نوجوان نے تمہیں تمہارے بارے میں بتایا تھا جس کا نام ورتنا تھا۔

”ورتنا کا تعلق بھی ہم سے ہی تھا۔“ نعمت علی نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی حیرتوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

”حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بعض معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں تم تھوڑا سا آرام کرو۔ ٹھیک ہوجاؤ گے اور تمہیں بہت آسانیاں مل جائیں گی۔ میں تمہاری رہائش کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔“ اس کے بعد نعمت علی کو ایک بہت ہی اچھی جگہ جو ایک جھونپڑے کی شکل میں تھی۔ رہنے کے لئے دی گئی۔ یہاں اسے بڑی آسائشیں فراہم کی گئی تھیں لیکن وہ دنگ تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہورہا ہے۔ قدرت اس سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔ اس کی زندگی کا تو ایک ہی مقصد تھا۔ خیر الدین خیری کی رہائی۔ کرناولی نے دھکیلنے نے ان

لوگوں سے فاصلہ پیدا کر دیا تھا۔

بہر حال وقت کے فیصلوں کا تو انتظار کرنا ہی پڑتا ہے۔ جب انسان کے بس میں کچھ نہ رہے تو پھر وقت اسے آگے کی کہانی سناتا ہے۔ اور وقت نے آگے کی کہانی بڑھائی۔ کہ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ جب اچانک ہی خیر الدین خیری کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔

جس جھونپڑی میں وہ فروکش تھا۔ وہاں ایک روشندان نما جگہ بھی بنی ہوئی تھی۔ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز اسی روشندان سے آئی تھی۔ اور نعمت علی چونک کر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ پھر اس نے اسی نیلی چمگادڑ کو دیکھا۔ جو اس روشن دان سے اندر اتر آئی تھی۔ نعمت علی حیران رہ گیا۔

چمگادڑ زمین پر بیٹھی اور اس کے بعد اچانک ہی اس کا قد بڑھتا چلا گیا۔ اور دوسرے لمحے وہ پورن وتی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ نعمت علی اچھل کر بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جو زمین پر لگا ہوا تھا پورن وتی کے ہونٹوں پر بڑی سبک مسکراہٹ تھی۔

''ہاں۔ میں بھلا تم سے دور کیوں رہ سکتی ہوں۔ مختصر الفاظ میں تمہیں بتا دوں نیلی چمگادڑ بوڑھے آہورہ کا شناختی نشان ہے۔ لیکن میں نے اسے دھوکا دیا نیلی چمگادڑ سے میری جنگ ہوئی اور میں نے اسے ہلاک کر کے اس کا روپ دھار لیا۔ کیونکہ مجھے تمہارے پاس آنا تھا۔''

''اوہ۔'' نعمت علی کے منہ سے عجیب سے انداز میں نکلا۔

''اب میں تمہیں بتا دوں راجہ پرمیت سنگھ۔ کرناوتی، اور ان کا گرو پردھان سنگھ، یہاں آچکے ہیں۔ اور بہت جلد وہ تم سے آکر ملیں گے۔ سنو...... جو کچھ میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ اسے غور سے سنو۔ پہلے مجھے تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اور واقعی میرا جادو تمہاری شخصیت کے سامنے بالکل بے اثر ہو گیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مجھے تمہارے دھرم سے اختلاف تھا۔

لیکن بالکل اچانک کچھ باتیں معلوم کرتے ہوئے مجھے یہ پتا چل گیا۔ کہ تم مسلمان ہو۔ مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں تھا بعد میں مجھے اور بھی بہت سی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ تمہارا ایک مقصد ہے۔ جس کے لئے تم سرگرداں ہو۔ میں تمہاری مدد کرنے کے لئے تمہارے پاس اس وقت یہاں آئی ہوں۔ سنو! اتفاق کی بات ہے کہ تمہاری شکل وصورت ان لوگوں کے ایک مقدس دیوتا۔ سادھو دستو سے ملتی جلتی ہے۔ بوڑھا آہورہ بھی جانتا ہے۔ کہ تم سادھو دستو نہیں ہو لیکن وہ ایک کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بدھوں کے دو عقائد یہاں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ تمہیں درتنا نے بتایا تھا کہ یہاں پاتال نگری میں ایک ایسا قبیلہ آباد ہے۔ جو بدھ دھرم میں تحریف سمجھتا ہے۔ اور اس پر یہ سرگرداں ہے۔ تمہیں اسی لئے یہاں لایا گیا ہے۔ تمہیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ راجہ پرمیت سنگھ پاتال نگری کے پاتال سنگھاسن پر براجمان ہونا چاہتا ہے۔ اور پردھان سنگھ اس کی مدد کر رہا ہے۔ لیکن اصل بات تمہیں نہیں معلوم۔ پردھان سنگھ اصل میں پرمیت سنگھ کو یہاں لا کر اس کے ذریعے پاتال سنگھاسن پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اور جب وہ پاتال سنگھاسن تک پہنچ جائے گا تو سب سے پہلے وہ راجہ پرمیت سنگھ کو ہی قتل کرے گا۔ طاقتوں کے کھیل ایسے ہی چلتے ہیں۔ وہ لوگ یہاں پہنچ چکے ہیں اور بہت جلد تم سے مل لیں گے۔ کیونکہ بوڑھا آہورہ تمہیں ان سے ملنے کی اجازت دے گا۔ سمجھ گئے ہو ناں تم۔؟''

تم پھر ان سب کے راہنما بنو گے۔ یہاں تمہارا ایک مجسمہ دیوتا کی حیثیت سے نصب ہے۔ جس کے بناء پر بوڑھا آہورہ اپنی قوم کو تمہاری جانب راغب کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ تم سے اس کے لئے مدد لے گا۔ اس کی مدد ضرور کرنا باقی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کسی نہ کسی شکل میں تم تک پہنچتی رہوں گی۔ اور تمہیں آگاہ کرتی رہوں گی۔''

نعمت علی دنگ رہ گیا تھا۔ رانی پورن وتی کو اس

کی ساری تفصیل معلوم ہو گئی تھی۔ لازمی بات ہے کہ اس کا نام بھی اسے پتہ چل گیا ہوگا۔ ادھر بوڑھے آہورہ کے بارے میں بھی اس نے ساری تفصیل بتا دی تھی۔ رانی پورن وتی نے کہا۔

''کہیں کسی جگہ بھی بددل نہ ہونا۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی بے فکر رہو۔'' نعمت علی کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔ ''اب میں جا رہی ہوں۔ حوصلے سے کام لینا۔'' چنانچہ وہ اسی روشندان سے پرواز کر گئی۔ اور نعمت علی گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

ادھر نعمت علی یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ اور ادھر راجہ پرمیت سنگھ اس وقت کے بعد سے سخت بددل ہو گیا تھا۔ اس کا گرو پردھان سنگھ بھی نعمت علی کیلئے بہت پریشان تھا۔ کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کرناوتی نے کیا کام دکھایا ہے لیکن وقت کے یہ ہی کھیل چلتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس مندر تک پہنچ گئے۔ جہاں انہیں حیرت انگیز چیزیں نظر آنے لگیں۔ یعنی پاتال نگری کے سفر کا آغاز ہو گیا۔

جتنی مشکلات سے وہ ان ڈھلانوں پر اترے تھے۔ ان کی حالت قابل رحم ہو رہی تھی۔ سب ہی ایک دوسرے کا بوجھ سنبھالے ہوئے تھے۔ لیکن راجہ پرمیت سنگھ اپنے مقصد کو زندگی زیادہ قیمتی سمجھتا تھا۔ اور سر جھکائے وہ ان گہرائیوں میں آگے بڑھ رہے تھے۔ جہاں پر اترتے ہوئے ان کے کئی ساتھی کام آگئے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ یہ سلسلہ کب تک ختم ہوگا۔ اور پاتال کی گہرائیوں کا یہ سفر نجانے کہاں تک پہنچے گا۔ وہ اترتے رہے۔ اور وقت آگے بڑھتا رہا۔ ان خوفناک گہرائیوں میں اترتے ہی دل پر اکتاہٹ طاری ہو رہی تھی۔ لیکن بہر حال وہ سفر کر رہے تھے۔ اور پھر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ ان ڈھلانوں کا اختتام، ایک وسیع اور شاندار پہاڑ کے دامن میں جا کر ختم ہوا تھا۔ جس کی چوٹی پر برف جمی ہوئی تھی۔

پہاڑوں کا یہ سلسلہ نیم دائرے کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ اور انتہائی طویل وعریض تھا۔ تاحد نظر پہاڑ ہی پہاڑ جن میں کہیں کوئی درہ یا شگاف نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے آگے کا میدان بنجر تھا۔ جس میں بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں نظر آرہی تھیں۔ اور ان پتھروں اور چٹانوں کے درمیان مویشیوں کے ریوڑ گھاس کی تلاش میں گھومتے نظر آرہے تھے۔ پہاڑوں کے نسبتاً نیچے ڈھلانوں پر گھنے جنگلات تھے۔ اور ان جنگلات میں چھوٹے چھوٹے میدان بکھرے ہوئے تھے۔ جو دور سے دیکھنے میں واضح نہیں تھے۔ لیکن غور کرنے پر اندازہ ہوتا تھا۔ کہ وہ کھیت ہیں۔

وہ سب وہاں رکے اور سب سے پہلے وہاں انہوں نے اپنی تیز نگاہوں سے اس ماحول کا گہرے طریقے سے جائزہ لیا۔

''آہ...... یہ بھورے رنگ کی چٹانیں۔''

''نہیں یہ چٹانیں نہیں ہیں۔'' پردھان سنگھ نے کہا۔

''تو پھر؟''

''یہ جھونپڑے ہیں۔ جو ایک خاص قسم کی گھاس پھوس سے بنے ہوئے ہیں۔''

''اوہ...... یہ تو بڑی عجیب صورت حال ہے۔ کیا واقعی ہم پاتال نگری پہنچ گئے۔''

''ہاں۔ میں جو کچھ تمہیں بتا رہا ہوں۔ اس پر شک نہ کرو۔''

''نہیں...... نہیں شک کی بات نہیں ہے۔ گرو مہاراج آپ جو کہہ رہے ہیں وہ سچ ہوگا۔'' غرض یہ کہ وہ آگے بڑھنے لگے۔ پھر انہیں ایک دریا نظر آیا۔ اس کے آس پاس قدرتی خندقیں بھی تھیں۔ یہ مکانات نما جھونپڑے بہت خوبصورت بنے ہوئے تھے ایک باقاعدہ آبادی تھی۔ جو نسبتاً بلند مقام پر بنی ہوئی تھی۔ بہر حال وہ آگے بڑھتے رہے۔ اور پھر وہ ایک ایسی چٹان کے پاس پہنچ گئے جو عمارت نما بنی ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں راجہ پرمیت سنگھ نے پردھان سنگھ سے پوچھا۔

''وہ کون سی جگہ ہے۔؟''

''یقیناً کسی معزز شخصیت کی رہائش گاہ۔ بہر طور

وہ یہاں سے بھی آگے بڑھتے رہے۔ اور پھر ایک ایسی جگہ پہنچ گئے۔ جہاں انہیں بہت سے لوگ نظر آئے تھے ۔ یہ گھٹے ہوئے سر اور لمبی چوٹیوں والے لوگ تھے۔ جن کے اوپر جسموں پر گیروے رنگ کا لباس تھا۔ سر صاف شفاف اور عجیب غریب تھے۔ پھر انہوں نے ایک اور شخص کو دیکھا۔ جس کی گردن میں بے شمار چھوٹی چھوٹی جانوروں کی کھوپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

وہ لوگ ان کے چاروں طرف بکھر گئے۔ اور پھر اس طرح انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کرنے لگے۔ جیسے وہ انہیں آگے لے جانا چاہتے ہوں۔ یہاں تک کہ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے اس آبادی کے پاس پہنچ گئے۔ جو جھونپڑیوں کی آبادی تھی۔ یہاں انہیں ایک احاطے میں لایا گیا۔ جو کافی وسیع و عریض تھا۔ یہاں بھی چھت والے جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ انسانوں کی رہائش گاہیں ہوں۔ لیکن عارضی رہائش گاہیں۔ تب انہیں لانے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"یہ جگہ تمہارے قیام کیلئے ہے۔ اور سنو! کوئی ایسا عمل نہ کرنا جو تمہارے لئے مصیبت کا باعث بن جائے۔ تمہیں یہاں امن دیا جاتا ہے۔" راجہ پرمیت سنگھ نے گردن خم کردی تھی۔ اور اس کے بعد وہ اس علاقے میں فروکش ہوگئے۔

بڑی سنسنی خیز کیفیت تھی۔ ان لوگوں نے نجانے کس کس طرح مشکلات اٹھا کر یہاں تک کا سفر کیا تھا۔ لیکن اب منزل پر پہنچنے کے بعد ان کے راستے مسدود ہوگئے تھے۔ راجہ پرمیت سنگھ کو سب سے بڑا سہارا گرو پردھان سنگھ کا تھا۔ وہ ضرور اس سلسلے میں ایسا عمل ضرور کریں گے۔ جس سے ان کی مشکلوں کا حل مل جائے گا۔ اور اس نے اس کے بعد گرو پردھان سنگھ سے کہہ ڈالی۔

"گرو جی! مہاراج اب ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ ہم عجیب سی کیفیت کا شکار ہیں۔ پاتال نگری پہنچ چکے ہیں۔ اور پاتال سنگھاسن ہم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لیکن یوں لگتا ہے۔ گرو مہاراج یہاں آکر ہمارے راستے بند ہوگئے ہوں۔ کیا آپ ہماری راہنمائی نہیں کریں گے۔" پردھان سنگھ جیسے خود بھی چکرایا ہوا تھا۔ اس نے پرخیال انداز میں گردن ہلائی۔ اور آہستہ سے بولا۔

"کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے...... کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ اور اب میں ایک عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہوگیا ہوں۔ بلکہ میں بتا نہیں سکتا پرمیت سنگھ۔ کہ یہ گڑبڑ کیا ہوئی ہے۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے۔ جیسے ہم ایک بہت بڑی سازش کا شکار ہوگئے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی بہت ہی سنگین واقعہ ہونے والا ہے۔ مجھ سے بہت غلطی ہوگئی ہے۔ بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ ہم ایک انوکھی مشکل کا شکار ہوگئے ہیں۔ مجھے بتا راجہ پرمیت سنگھ وہ لڑکا کس طرح تیرے پاس آیا تھا۔" پردھان سنگھ نے کہا۔ اور پرمیت سنگھ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"کون سے لڑکے کی بات کر رہے ہو۔؟"

"وکرم راج! جسے تو اپنے ساتھ لایا تھا اور وہ پراسرار طریقے سے گم ہوگیا۔" وکرم راج کا نام سن کر کرناوتی۔ ایکدم چونک گئی تھی۔ اس نے کوئی اظہار نہیں کیا۔ لیکن اس کے کان پردھان سنگھ کی باتوں پر لگ گئے۔ پردھان سنگھ کہہ رہا تھا۔

"کہا تھا ناں میں نے تجھ سے کہ اس لڑکے کی شکل نجانے کیوں مجھے جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب گرو جی!" راجہ پرمیت سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔

"کوئی بہت ہی بڑی بات ہوئی ہے۔ وہ لڑکا مسلمان تھا۔"

"کیا؟" راجہ پرمیت سنگھ نے سمجھ نہ آنے والے انداز میں پردھان سنگھ کو دیکھا۔

"ہاں...... مجھے بہت کچھ یاد آرہا ہے۔ بہت کچھ یاد آرہا ہے کہ اسے میں پہلے مل چکا ہوں۔ وہ کسی کے ساتھ تھا۔"

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

"بتاؤں گا۔ تجھے بتاؤں گا۔ ابھی تھوڑا سا دم لے لے۔ ذرا سا اندازہ ہوجائے کہ ہم کہاں ہیں۔ اور ہمیں کہاں جانا ہے؟ ان باتوں کا پتہ چل جائے تو میں تجھے آگے کی بات بتاؤں۔"

"جو آگیا گرو مہاراج لیکن پتہ نہیں میرا من کیوں ڈر رہا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ میں خوف اور ڈر سے بہت دور ہوں۔ لیکن اب لگ رہا ہے کہ کوئی ایسی انوکھی بات ضرور ہے۔ جو کسی مشکل کا پتہ دے رہی ہے۔"

"ہاں...... ہے۔ لیکن میرے راستے بند نہیں ہیں۔" پردھان سنگھ اپنے کام میں مصروف ہوگیا لیکن کرناوتی کی کیفیت بہت عجیب ہوگئی تھی۔ یہ ساری باتیں اس نے سن لی تھیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ جب اس نے نعمت علی کو موت کی طرف دوڑایا تھا۔ تو اس وقت تو اسے صرف یہ احساس تھا کہ اس کا پسندیدہ گھوڑا شیر دل اس کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ لیکن اس کے بعد نجانے کیوں اس کے ضمیر نے اسے کچوکے دینا شروع کردیئے۔

کتنا نوجوان اور حسین تھا وہ لمبا چوڑا اونچا، خوبصورت، اور کس طرح اس کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ گھوڑے کی موت تو اس نے دیکھ ہی لی تھی۔ ڈھلانوں سے اترے ہی تھے۔ وہ لوگ۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اس کی نگاہیں نعمت علی کو تلاش کرتی رہی تھیں۔ اور اس وقت سے اس کے دل پر ملال سا تھا۔

اور ضمیر کا بوجھ جب بے تحاشہ بڑھ گیا تو وہ راجہ پرمیت کے پاس پہنچ گئی۔

"بھائی جی مہاراج! آپ کے سامنے اپنی ایک غلطی کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔" راجہ پرمیت سنگھ نے حیران نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔ اور بولا۔

"کیسی غلطی کرناوتی۔؟"

"آپ، اور گرو مہاراج ابھی وکرم راج کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔"

"ہاں...... تو پھر؟ تو جانتی ہے اس کے بارے میں کچھ کر چلا گیا۔ وہ گھوڑا لے کر کیوں فرار ہوگیا؟ کون تھا وہ؟ اور کیا چاہتا تھا۔ کیا وہ بھی ان ہی علاقوں میں آنا چاہتا تھا؟"

"نہیں بھائی جی مہاراج۔ وہ اب اس سنسار میں نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" پرمیت سنگھ نے حیران لہجے میں کہا۔

"میں نے اسے ہلاک کردیا۔ بھائی جی مہاراج۔" کرناوتی شرمساری سے بولی۔ اور پرمیت سنگھ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"کوئی خواب دیکھا ہے تو نے۔ کوئی سپنا دیکھا ہے۔"

"نہیں بھائی جی مہاراج۔ مجھے اس سے نفرت تھی۔ اس وقت سے جب اس نے میرے شیر دل کو مجھ سے جدا کیا تھا۔" کرناوتی نے پوری تفصیل راجہ پرمیت سنگھ کو بتادی۔ اور راجہ پرمیت کے چہرے پر افسردگی کے آثار پھیل گئے۔ "ارے...... یہ تو...... تو نے بہت برا کیا کرناوتی۔ یہ تو تو نے بہت برا کیا۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں بھائی جی! بہت بڑی غلطی ہوگئی مجھ سے۔"

"ہوں۔ افسوس، مگر گرو جی کہتے ہیں کہ مسلمان لڑکا تھا۔ وہ اگر وہ مسلمان تھا۔ تو یہاں کیوں آیا تھا۔ مگر اسکا کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا۔" یہاں پاتال نگری میں آنے کے بعد ان پر کوئی عجیب سی کیفیت بیت رہی تھی۔ وہ بہت حیران تھے۔ پھر انہیں وہاں سے بھی کہیں اور چلنے کیلئے کہا گیا۔ اور جس جگہ یہ لے جائے گئے۔ وہ ایک بڑا سا غار تھا۔ جسے انسانی ہاتھوں کی تلاش سپاٹ اور سیدھی دیواروں کی شکل میں چکنا کیا تھا۔ اور یہ کافی خوبصورت تھا۔

اس میں بہت سی قیمتی چیزیں سجاوٹ کے طور پر لگی ہوئی تھیں۔ اور کہیں سے بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ کہ وہ کوئی اجنبی جگہ ہے۔ یہ لوگ یہاں آنے کے بعد بیٹھے تھے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک ایک طرف سے کچھ سرسراہٹیں سنائی دیں۔ یہ سرسراہٹیں جس طرف

سے آئی تھی اور وہ اجنبی جگہ تھی۔ ان سرسراہٹوں کے نمودار ہونے کے ساتھ سے وہاں ایک دیوار اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ اور اس میں ایک گول دروازہ نمودار ہو گیا۔

حیرانی کی بات تھی۔ کہ اس ویرانے میں جہاں صرف پتھریلی چٹانوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس طرح کا کوئی عمل بھی ہوگا۔ بہر حال انہیں کچھ نہیں پتہ چل سکا تھا۔ جو سوراخ پیدا ہوا تھا۔ وہ تاریک تھا۔ اور اس سے کوئی روشنی نہیں آرہی تھی۔ لیکن چند لمحوں کے بعد ہی اس میں آہستہ آہستہ روشنی ہونے لگی۔ اور پھر انہیں کچھ مشعلیں نظر آئیں۔ جو انسانی ہاتھوں میں تھیں۔ جو لوگ جو مشعلیں اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ ادھر ہی کے باشندے تھے۔ غار میں داخل ہو کر وہ ساکت نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگے۔ پتہ نہیں کس مقصد کے تحت وہ یہاں آئے تھے۔

اور پھر چند ہی لمحات کے بعد وہاں جو بوڑھا شخص اندر آیا۔ انہیں اسے دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کافی بوڑھا تھا وہ اور انسانوں کے شانوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ ایک لمحے میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ بوڑھا انتہائی مکار آدمی ہے۔ غرض یہ کہ بوڑھا ان کے درمیان پہنچ گیا۔ اور وہ دونوں مشکل بردار واپس اس سوراخ سے اندر داخل ہو گئے۔ بوڑھا خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”میرا نام آہورہ ہے۔ کیا سمجھے؟ آہورہ ہے میرا نام اور تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں میں۔“ پرمیت سنگھ نے پردھان سنگھ کی طرف دیکھا۔ اور پردھان سنگھ نے آگے بڑھ کر گردن جھکا دی۔

”میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ مقدس بزرگ! ہم یہاں سیر و سیاحت کیلئے آئے ہوئے تھے۔ ہم مہم جو ہیں۔ اور دنیا کے ایسے پراسرار گوشوں کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں جو انسانی آنکھوں سے دور ہیں۔ محترم بزرگ! ہم اس طرف بھٹکتے ہوئے آنکلے ہیں۔ اور یہ تو بہت ہی بڑی بات ہے کہ ہم ایک ایسی اجنبی جگہ آگئے ہیں۔ جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں۔ مہمانوں کا درجہ دیں اور اس جگہ کا جائزہ لینے کے بعد ہم یہاں سے واپس چلے جائیں۔“

”ہوں۔ اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ وہی سچ ہے۔“

”ہاں۔ مقدس بزرگ! ہم بھلا آپ سے جھوٹ کیوں بولیں گے۔“ بوڑھے کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے ان کی بات پر یقین نہیں کیا ہے۔ اور پھر اس نے جو کچھ کیا۔ وہ بہت مختلف تھا۔ اس نے کہا۔

”اگر تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ ہی سچ ہے۔ تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں پوری عزت اور احترام کے ساتھ اس دنیا سے واپسی کی اجازت دے دیں گے۔ لیکن اگر تم نے جھوٹ بولا۔ تو تم یوں سمجھ لو۔ کہ پھر تمہارے لئے زندہ رہنے کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔“ کرناوتی کانپ کر رہ گئی۔ راجہ پرمیت سنگھ بھی پریشان تھا۔ پردھان سنگھ کے دل میں جو کچھ بھی تھا۔ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ تاہم اس نے کہا۔

”ہمارے جھوٹ، سچ کی پرکھ کیسے ہوگی۔؟“

”ہمارے ہاں..... ایک پتھر نصب ہے۔ یہ سچ، اور جھوٹ کی پرکھ کا پتھر ہے۔ تمہیں اس کے سامنے کھڑے ہو کر یہ بتانا ہوگا کہ تم یہاں کیوں داخل ہوئے ہو۔ اگر تم نے سچ بولا تو یہ پتھر سبز ہو جائے گا۔ اور اگر جھوٹ بولا تو وہ سرخ ہو جائے گا۔ اور سرخ کا مطلب تو تم جانتے ہی ہو۔ یعنی ہم پر جھوٹے انسان کو اپنے سچ کے اس دیوتا پر قربان کر دیتے ہیں۔ کیا سمجھے؟ تمہارا سرخ۔ سرخ خون دیوتاؤں کو بہت پسند ہوگا۔ کل روشنی میں تمہیں وہاں لایا جائے گا۔ اور سچ اور جھوٹ کی پرکھ ہو جائے گی۔“ بوڑھے نے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں کو اشارہ کیا اور اس کے بعد وہ غار سے باہر نکل گیا۔ لیکن اپنے پیچھے وہ شدید سنسنی چھوڑ گیا تھا۔

(جاری ہے)

شہر وحشت

ایم اے راحت

آخری قسط

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرہول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دہشت طاری کرتا وقت، جسم و جان پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراؤ، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے پڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذہن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کہانی۔

دل ودماغ کو مبہوت کرتی خوف وحیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر وشر کی انوکھی کہانی

بوڑھا آہورہ ان کی توقع سے کہیں زیادہ خطرناک اور چالاک شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اپنے مہرے بڑی ہوشیاری سے استعمال کرنا جانتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پاتال نگری کی کہانیاں دنیا کی کہانیوں سے بہت مختلف تھیں۔ راجہ پرمیت سنگھ اپنے گرو پر وحان سنگھ کے ساتھ بڑے اعلیٰ پیمانے پر تیاریاں کرکے پاتال نگری تک پہنچا تھا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد گرو مہاراج اور چیلے کی سٹی گم ہوگئی تھی۔ آہورہ ان کی شخصیت پر بھاری تھا۔

اب تک..... جو کچھ ہوتا رہا تھا۔ وہ ایک خواب کی مانند تھا۔ اور ان سب ہی کے دلوں میں نجانے کیسے کیسے تاثرات تھے۔ اس طرح نعمت علی اپنی زندگی کے اہم ترین وقت سے گزر رہا تھا۔

اور ادھر راجہ پرمیت سنگھ کرناوتی اور دوسرے لوگ زندگی کی مشکلات کا شکار تھے۔ اس وقت راجہ پرمیت سنگھ اپنی بہن سے کافی بددل ہوگیا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ "تم نے بہت برا عمل کیا ہے کرناوتی۔ ! تم نہیں جانتیں کہ وہ شخص ہمارے لئے کتنا قیمتی تھا۔ وہ سارے کام بخوبی کرسکتا تھا۔"

"ہاں یہ حقیقت ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ وحشت ناک جگہ جسے پاتال نگری کا نام دیا گیا ہے۔ کیسی عجیب دنیا ہے کہ مہذب دنیا میں رہنے والوں نے کبھی خواب میں بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا۔ کوئی بھی اگر اس کہانی کے بارے میں سنے گا تو یقین نہیں کرے گا۔ اور یہ ہی کہا جائے گا کہ یہ ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ لیکن وہ لوگ حقیقت جانتے تھے۔ آخرکار ایک شخص ان کے پاس پہنچا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام ہنگارا ہے۔ اور میں یہاں کا سردار ہوں۔ ہمارے مقدس پیشوا آہورہ نے کچھ ذمہ داریاں میرے سپرد کی ہیں۔ جنہیں میں سرانجام دے رہا ہوں۔ آہورہ کی گہری نگاہوں نے یہ جائزہ لے لیا ہے کہ یہ لڑکی جس کا تمہاری دنیا میں نام کرناوتی ہے۔ آہورہ کی تحویل میں آرہی ہے۔ وہ اسے دیوی اڈینا کی حیثیت دینا چاہتا ہے۔ دیوی اڈینا اور ہابون ہماری ایک قدیم رسم کے مطابق پاتال نگری کے قدیم دیوی اور دیوتا ہیں۔ ایک شخص کو تم میں شامل کیا جائے گا۔ جو بڑی حیثیت کا حامل ہے۔

لیکن وہ جو ہمارا پیشوائے اعظم اور آہورہ کا خاص آدمی ہوگا۔ وہ تمہارا ہی آدمی ہے۔ اس کا اصل نام

نعمت علی ہے۔ اور وہ وکرم راج کی حیثیت سے تمہارے ساتھ تھا۔" سارے کے سارے یہ نام سن کر اچھل پڑے تھے۔ راجہ پرمیت سنگھ نے بے صبری سے پوچھا۔

"تمہارا نام ہنگارا ہے ناں؟"

"ہاں۔"

"تو عظیم ہنگارا بتاؤ کہ کیا نعمت علی نام کے شخص کو یا وکرم راج نام کے شخص کو تم جانتے ہو؟"

"ہاں...... وہ ہمارے پاس ہے اور بہت جلد تم میں شامل ہو جائے گا۔ لیکن خبردار کبھی اس سے کوئی بات نہ کرنا۔"

ادھر یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں اور ادھر جہاں نعمت علی موجود تھا۔ وہاں بڑے عجیب و غریب حالات پیش آ رہے تھے۔ نعمت علی اس وقت ایک خوبصورت سی کھلی جگہ میں موجود تھا۔ اور پاتال نگری کے راز اس پر منکشف ہوتے جا رہے تھے کہ اچانک ہی ایک فاختہ اڑتی ہوئی آئی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر اس نے انسانی آواز میں کہا۔

"میں پورن وتی ہوں۔ یہ لوگ اپنا کام کر رہے ہیں اور میں اپنا کام کروں گی۔ وہ لوگ کرناوتی کو اپنی دیوی اڈینا کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔

اور میں کرناوتی کے بدن پر قبضہ جما رہی ہوں۔ اب وکرم راج، میں پھر تمہارا اصل نام کیوں نہ لوں۔ نعمت علی۔ تم لوگوں کو ایک انوکھا کھیل کھیلنا ہوگا۔ ہابون نامی جو شخص تمہارے پاس پہنچے گا وہ تمہارے عقیدت مندوں میں سے ہوگا اور تم یوں محسوس کرو گے جیسے وہ صدیوں سے تمہارا غلام ہے۔

اور تمہاری بات ماننے والا بے شک وہ یہاں کا انسان ہوگا اور پوری طرح میرے قبضے میں ہوگا اور تم سے ذرا بھی اجنبیت کا اظہار نہیں کرے گا۔

یہ ہی کام تمہیں بھی کرنا ہے۔ ابھی آہورہ تمہیں ان کے ساتھ شامل کر دے گا۔ اور کرناوتی میرے قبضے میں ہوگی۔ یعنی یہ ہی سمجھ لو کہ کرناوتی کی حیثیت سے میں خود ہوں گی۔ وہ لوگ تمہیں اور مجھے دیوی اڈینا کی حیثیت سے پیش کریں گے۔

اور ہابون جو یہاں کا ایک قدیم دیوتا تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن جو ایک انسانی شکل میں ہے اور آہورہ کی سازشوں کے ساتھ پرورش پا رہا ہے۔ اب تمہارا ساتھی ہوگا۔" اور یہ ہی ہوا۔

ہابون نامی شخص نعمت علی کے پاس پہنچ گیا۔ بلاشبہ یہ ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ لیکن اس نے نعمت علی کے سامنے سر خم کرتے ہوئے کہا۔

"میں تیرے قدموں میں تیرے غلام کی حیثیت سے ہوں۔ مقدس دیوتا!" نعمت علی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ لیکن اس نے خاموشی اختیار کی۔

ادھر سردار نے نعمت علی کو ساتھ لیا اور ان لوگوں کے درمیان پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے کرناوتی اور نعمت علی کے سامنے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"بڑے دیوتا تم ہو؟ اور ہابون وہ جوان دیوتاؤں کو اپنے قبضے میں رکھے گا۔ بہت ساری کہانیاں تمہیں سنائی ہیں اور بہت ساری تم سنو گے۔ لیکن مقدس اڈینا اور مقدس دیوتا۔ میں تیرا غلام تجھ پر اپنی اطاعت ظاہر کرنے آیا ہوں۔ اور کبھی ایسا نہ ہوگا کہ میرا سر تیرے سامنے اٹھے اور میں ہمیشہ تیرے قدموں میں سر جھکائے رہوں گا۔ اور تو حکم دے گا تو میں اپنے سر پر سرداری کا تاج رکھوں گا۔ ورنہ جب بھی تیرا حکم ہوگا۔ میں اسے اتار کر کسی اور کے حوالے کر دوں گا۔

مقدس دیوی! اور دیوتا میں یہ ہی عرض کرنے کے لئے تیری خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ اگر کوئی کسی وقت کوئی ایسی بات تیرے کانوں تک پہنچائے۔ جو میرے خلاف ہو۔ تو...... تو میری اس اطاعت کو ذہن میں رکھنا۔ اور میرے لئے کوئی ایسا حکم نہ دینا جو میری زندگی کا چراغ گل کر دے۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی کو بہت کم دیکھا ہے۔

بس یہ ہی کہنے کیلئے میں حاضر ہوا تھا۔ اور اس کے بعد وہ چلے گئے۔ لیکن نہ تو نعمت علی اور نہ ہی کرناوتی اس کے الفاظ کو سمجھ سکے تھے۔ بلکہ پورن وتی نے نعمت علی کے کان میں کہا تھا۔

"میں واقعی خود بھی حیران ہوں۔ لیکن کوئی بات نہیں ہم جتنے لوگ یہاں موجود ہیں۔ وہ سب کے سب ان حالات سے ناواقف ہیں۔ بہر حال میرا مقصد پاتال سنگھاسن تک پہنچنا ہے۔ راجہ پرمیت سنگھ بھی یہ ہی چاہتا ہے۔"

نعمت علی نے حیرت سے کہا۔ "کرناوتی۔ تم واقعی اس وقت اپنے بھائی کی بہن نہیں ہو۔"

"نہیں۔"

"پھر...... پھر...... تم......؟"

"میں...... اس وقت صرف اور صرف پورن وتی ہوں۔" کرناوتی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

اور نعمت علی متحیرانہ انداز میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔

اور اس کے بعد پراسرار واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ انتظار کرتے رہے، پھر کچھ اور وقت گزرا، سردار ہنگارا کے الفاظ نے انہیں حیران کر دیا تھا لیکن پھر بات آہستہ آہستہ انکی سمجھ میں آ گئی اور اس وقت انہیں احساس ہوا کہ واقعہ کیا ہے، ہوا یوں کہ جس جگہ وہ فروکش تھے، یہ ایک بڑا سا کمرا تھا کمرا کیا زمانہ قدیم میں کوئی غار تھا جسے انسانی ہاتھوں کی تراش نے سپاٹ اور سیدھی دیواروں کی شکل میں چکنا کیا تھا اور اسے خوبصورت ترین بنا دیا تھا، اور اس میں نہایت قیمتی اشیاء سجاوٹ کیلئے رکھی تھیں اور کہیں سے بھی کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا یعنی وہ جگہ جہاں خاص قسم کے جنگلی پودوں کی بیلوں سے سجانے کی کوشش کی گئی تھی اور جو عجیب و غریب معلوم ہوتی تھی جب یہ لوگ آپس میں بیٹھے مشورے میں مصروف تھے اور سردار ہنگارا جا چکا تھا اور بہت وقت ہو گیا تھا اسے گئے ہوئے تو اچانک، انہوں نے کچھ سرسراہٹیں محسوس کیں اور حیران ہو کر اس دیوار کی جانب دیکھنے لگے جہاں کچھ سرسراہٹیں نمودار ہوئیں تھیں۔ اور ان سرسراہٹوں کے نمودار ہونے کے بعد وہاں ایک دیوار شق ہو گئی اور اس میں ایک گول دروازہ پیدا ہو گیا جیسے کوئی چیز اس کی جگہ سے ہٹا دی گئی ہو غالباً یہ کوئی خاص طریقے سے بنائی گئی دیوار تھی اور جس میں جو چٹان پتھر کی تھی اور جس کے رخنے ان جنگل بیلوں میں چھپے ہوئے تھے اپنی جگہ سے گھوم گئی تھی اور درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی گویا اسے گھمانے کیلئے پتھر میں سوراخ کر کے اس طرح سے اس چٹان کو پھنسایا گیا تھا کہ اگر کوئی دوسری جانب سے بھی اسے گھمائے تو گھوم سکتی ہے ورنہ نئے آنے والے اجنبیوں کو تو پتا بھی نہیں چل سکتا تھا کہ اس کے پیچھے بھی کوئی دیوار ہے اور یہ لوگ حیران ہو کر اس طرف دیکھنے لگے جو سوراخ پیدا ہوا تھا وہ تاریک تھا اور اس سے کوئی روشنی نہیں آ رہی تھی وہ حیران نگاہوں سے ادھر دیکھتے رہے پھر لحہ لحہ سوراخ آہستہ آہستہ روشن ہونے لگا اور تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہوا جیسے ایک روشنی متحرک ہے اور کوئی آ رہا ہے پھر انہوں نے حیرانی سے دو مشعلیں دیکھیں جو انسانی ہاتھوں میں تھیں۔ اور ان مشعلوں کو جو اٹھائے ہوئے تھے وہ یہاں کے مقامی باشندے تھے۔ اور ان کے چہروں پر ایک خوف سا چھایا ہوا تھا اور انکی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ مشعل لئے آ رہے تھے۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور یہ لوگ ساکت نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے کہ یہ ایک حیرت ناک واقعہ تھا اور دیکھنا یہ تھا کہ ان مشعل برداروں کو جو اس جگہ سے نمودار ہوئے تھے ان سے کیا کام ہے یا وہ کس مقصد کے تحت آئے ہیں تب وہ دونوں سمت کے دروازے سے نکل کر اس کے کنارے پر کھڑے ہو گئے اور پھر کوئی اور نظر آیا جو آہستہ آہستہ ادھر آ رہا تھا جگہ اتنی بڑی تھی کہ ایک آدمی بآسانی وہاں سے گزر سکے۔ تو جو شخص وہاں سے گزر کر اندر آیا اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں وہ بڑا پجاری اور دیوتاؤں کا چہیتا آہورہ تھا جو بہت ضعیف اور بوڑھا تھا لیکن اس وقت جب وہ انسانوں کے شانوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ اور اس نے ان کی تصدیق کی تھی نجانے کیوں اس وقت بھی نعمت علی کو محسوس ہوا کہ بوڑھے شخص کی آنکھوں میں شدید مکاری چھپی ہوئی تھی

اور وہ ذرا مختلف قسم کا آدمی نظر آتا تھا لیکن وہ ان کا محسن بھی تھا کہ اس نے ان کے دیوی دیوتا ہونے کی تصدیق کی تھی بات اگر وہیں سے خراب ہوجاتی تو صورت حال مشکل ہوجاتی کیونکہ اس وقت بہت تھوڑے افراد تھے جو ان کے عقیدت مند اس وقت تک نہیں تھے جب تک کہ بوڑھے نے ان کی تصدیق نہیں کردی تھی اور اس وقت بھی بوڑھا آہورہ اپنے قدموں سے چل کر آرہا تھا اور اس قدر لاغر نہیں نظر آیا تھا جتنا اس وقت نظر آرہا تھا، اور جب وہ انکے درمیان پہنچا تو وہ دونوں مشعل بردار کھڑے ہوئے تھے واپس اس سوراخ سے اندر داخل ہوئے اور چٹان ایک بار پھر اپنی جگہ سے گھوم کر ہموار ہوگئی اور تعجب کی بات یہ تھی کہ اس عجیب و غریب جگہ یعنی مہذب انسانوں کی اس بستی میں ایسی کوئی جگہ بھی بنائی گئی تھی جسے بڑی شان کے ساتھ یہ کہا جاسکتا کہ وہ جدید ترین تھا اور ایسی جگہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا آہورہ نیچے اترا اور آہستہ سے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے کرکے اپنی گردن خم کی اور خاصا نیچے تک جھکتا چلا گیا اس کے بعد سیدھا ہوگیا اور اس نے کہا۔

"یہ وہ وقت ہے کہ اب یہاں میرے سوا کوئی نہیں آئے گا اور میں جانتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم لوگ میرے آنے سے حیران ہو لیکن بہتر ہے کہ مجھے بیٹھنے کی پیشکش کرو، میں تمہارے سامنے اونچی جگہ نہیں بیٹھ سکتا بلکہ نیچے زمین پر بیٹھ کر تمہاری تعظیم کرنا چاہتا ہوں۔"

پھر وہ خود ہی ایک جگہ منتخب کرکے بیٹھ گیا ان سب پر سکتہ طاری تھا۔ آہورہ کا اس طرح آجانا ان کے لئے تعجب کی بات تھی لیکن بہرحال وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے تب آہورہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی اور اس نے کہا۔

"تم۔ اس نے انگلی اٹھا کر کرناوتی کی طرف اشارہ کیا تھا سب سے پہلے تم سے مخاطب ہوں اور تم اگر یہ کہتی ہو کہ تم اڈینا ہو تو بتاؤ کہ پاتال نگری میں کیا ہے۔"

نعمت علی کو ایک لمحے کے اندر یہ احساس ہوگیا ہوگیا تھا کہ بوڑھا پجاری آہورہ شیطانی قوتوں کا مالک ہے اور اس کے دل میں ایسی کوئی بات ہے جو بڑی پر اسرار حیثیت رکھتی ہے تو کرناوتی نے خاموش نگاہوں سے آہورہ کو دیکھا اور پھر جو کچھ اس نے کہا وہ نعمت علی کے لئے حیران کن بھی تھا اور تسلی بخش بھی، اس نے کہا۔

"دیوتا کے پجاری آڈن کے قدموں کی خاک، مجھ سے سوال کرنے سے پہلے کیا تو نے مقدس دیوتا یعنی آڈن سے اس بارے میں پوچھا کہ مجھ سے کوئی سوال کرے.....؟"

تو اس کے الفاظ پر آہورہ مسکرایا اور پھر اسکی نگاہیں ہابون کی طرف اٹھ گئیں۔

"اور مقدس دیوتا تو کیا یہی بات تو بتا سکتا ہے.....؟"

"اور میں جو کچھ بتا سکتا ہوں اس کے لئے آسمانوں سے حکم ہے کہ اپنے سینے میں رکھوں اور سوال کا جواب اسی وقت دیا جاتا ہے جب روشن اجالوں سے اس کا حکم ہو۔"

"اور اے شخص تو جو سفید چمڑی والا ہے کیا تو یہ بتا سکتا ہے، اور اے عورت تو اور اے کالی شکل والے تو بتا کہ پاتال نگری میں کیا ہے؟"

"جو بات مقدس دیوتا اپنی زبان سے ادا نہ کرنا چاہے اس کا جواب ہم اس کے خادم اور معمولی لوگ بھلا کیسے دیں گے۔؟"

نعمت علی نے ترش لہجے میں کہا اور وہ محسوس کررہا تھا کہ آہورہ کو دیکھ کر خاص طور سے پردھان سنگھ کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے اور وہ پتھرا سا گیا ہے اور نہ اسکے بدن میں جنبش ہے نہ وہ ہل جل رہا ہے مگر یہ صورت حال خاصی خطرناک تھی اور مقدس پجاری کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اس نے گردن خم کرکے کہا۔

"دیوی اڈینا مقدس آڈن اور اے لوگو، تم جو سب ساتھ آئے ہو میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ تم

عزت والے ہو لیکن ذرا یہ سوچو اس وقت اس جگہ جب تم پہلی بار یہاں داخل ہوئے تھے ہم تمہارے بارے میں یہ یقین نہ رکھتے تھے کہ تم آگئے ہو اور جب مجھے میرے مسکن سے بلایا گیا تو میں حیران ہوا لیکن وہاں پہنچا اور پھر میں نے تمہاری زندگیاں اس سے بچالیں کیوں جانتے ہو کیوں؟"

جو کچھ تو کہنا چاہتا ہے آہورہ صاف اور واضح الفاظ میں کہہ اور تیرا انداز گفتگو کچھ گستاخانہ ہے۔" ہابون نے کہا۔

"نہیں مقدس دیوی اور مقدس دیوتا! ایسی بات نہیں ہے میں تمہارا احترام کرتا ہوں اور ہمیشہ ہی تمہارا احترام کرتا رہوں گا لیکن سنو، جو آسمانوں سے اترتے ہیں اور پاتال نگری میں پہنچتے ہیں وہ اپنے ساتھ معلومات کے بہت سے خزانے لاتے ہیں اور جو خزانے میری عمر نے میرے پاس جمع کردیئے ہیں تم ان سے واقف نہیں اور نہ ہی ان سے واقف ہونا کوئی آسان کام ہے لیکن میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اپنی دنیا سے آئے ہو اور اے شخص، نہ تو آڈن ہے اور عورت، نہ تو اڈینا، آڈن اور اڈینا جو بھی ہیں میں انہیں کسی بھی وقت پاتال نگری والوں کے حوالے کرسکتا ہوں لیکن یہ کہانیاں یہ واقعات تو تاریخ کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہیں اور وقت جانتا ہے کہ دیوی اور دیوتا کون تھے اور کہاں ہیں اور میں وقت کا ساتھی ہوں سنو، میں تمہیں جو کچھ کہہ رہا ہوں غور سے سنو اور خبردار میرے مدمقابل آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ وہ تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی اور اس وقت بھی میں جانتا تھا کہ نہ یہ شخص آڈن ہے اور نہ یہ اڈینا اور نہ یہ سب جو تم دونوں کے ساتھ ہیں وہ ہیں جو پاتال نگری والے سمجھتے ہیں لیکن میں نے تصدیق کی اور دیوی دیوتا بنا ڈالے تمہیں ان لوگوں کے سامنے گویا یہ میرا عمل تھا اگر تم جادو کی قوت رکھتے ہو تو اسی لمحے مجھے فنا کردو کیونکہ تمہارے پاس آسمانوں کی طاقت ہے اور میں جانتا ہوں تم ایسا نہیں کرسکو گے کیونکہ تم وہ ہو ہی نہیں جو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"مطلب.....؟" نعمت علی نے سوال کیا۔

"تمہارے سامنے یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے کہ ہزاروں سال سے میں اور میرے خاندان کے وہ لوگ جو اب اس دنیا سے چلے گئے آڈن اور اڈینا کا کھیل رچائے ہوئے ہیں اور اسی میں ہماری بقاء ہے اور یہی ہماری حکومت کا راز اور جب کوئی ہم سے ٹکرانے کی کوشش کرتا ہے تو ہم اسے خاک کردیتے ہیں اور پھر انتظار کرتے ہیں کہ دیوی دیوتا کا طلسم، اور صدیوں سے وہ کہانیاں سنتے آئے ہیں جن سے وہ کبھی منحرف نہیں ہوں گے لیکن اگر انہیں یہ پتا چل جائے کہ تم لوگوں میں نہ کوئی دیوی ہے نہ دیوتا تو پھر ان کا قہر و غضب دیکھنے کے قابل ہوگا اور تم لوگ اس بات کو تسلیم کرو کہ حقیقت وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ یعنی کہ کچھ بھی نہیں اور وہ کچھ نہ ہوتا بہت کچھ ہوسکتا ہے بشرطیکہ میں چاہوں....."

"گویا تم ہم سے کوئی ایسی بات منوانا چاہتے ہو جو تمہارے خیال میں نہ ماننے کے قابل ہو۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ بات تو یہ ہے کہ جب بھی دیوی اور دیوتا ظہور میں آتے ہیں تو ان کا سب سے بڑا عقیدت مند آہورہ ہوتا ہے۔ لیکن ہوتا یوں ہے کہ وہ بھی آہورہ کی عزت کرتے ہیں اس کی قدر کرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو آہورہ کی خواہش کے مطابق ہو اور اس سے زیادہ تو میں کچھ چاہتا بھی نہیں ہوں اور وہ بھی نہیں جو تمہارے لئے ناقابل عمل ہو۔"

"آہورہ تو جو کچھ کہہ رہا ہے جانتا ہے، اگر ہم پاتال نگری والے کے سامنے وہ دہرا دیں تو تیرے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟" جواب میں آہورہ ہنسنے لگا اور کہنے لگا۔

"لیکن حالات، ماحول اور وقت کے متعلق، میں تم سے بھی سوالات کرسکتا ہوں اور ایسی باتیں پوچھ سکتا ہوں تم سے، جن کا تم جواب نہ دے پاؤ، اسی کو میں بنیاد بنا سکتا ہوں۔"

"تو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ناقابل یقین ہے لیکن

پھر بھی وہ کہہ جو تیری خواہش ہے اور جو کچھ تو اہے۔"

"میری خواہش اور میری چاہت، تو سنو! میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ دیوتا آذن ہے، اور تو دیوی اڈینا۔ لیکن آہورہ کے تعاون کیساتھ، اور یہ تعاون جب بھی ختم ہوا تو یوں سمجھ لے کہ صورت حال خراب ہو جائے گی مجھ سے منحرف نہ ہوتا اور وہ نہ کرتا جو میں نہیں چاہتا میرا خیال ہے اتنا کہنا میرے لئے کافی ہے میں تم سے کسی بات کا انکار یا اقرار نہیں لیتا لیکن ابھی میں تمہارا دوست ہوں اور جو کچھ تمہیں سمجھانے آیا ہوں اسے ہی سمجھنے کی کوشش کرنا تمہارے حق میں بھی بہتر ہوگا اور میرے حق میں بھی۔" پھر وہ اپنی جگہ سے خود بخود اٹھ گیا اور آہستہ سے چلتا ہوا دیوار کے پاس پہنچا۔ اور جیسے ہی وہ دیوار کے قریب پہنچا وہ چٹان پھر اپنی جگہ سے ہٹی اور اس میں دروازہ نمودار ہو گیا تب وہ اس دروازے سے اندر داخل ہو گیا اور چٹان اپنی جگہ برابر ہو گئی اور یہ سب سحر زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتے رہ گئے اور یہ سحر نا جانے کب تک ان پر طاری رہا اور وقت گذرتا چلا گیا، بہت دیر کے بعد پردھان سنگھ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوہ! سارا تصور ہی بدل گیا، سارا خیال ہی بدل گیا اور جو علم ہمیں حاصل ہوا شاید یہاں موجود کسی ایک انسان کو بھی حاصل نہ ہو اور میں خوفزدہ تھا کہ یہ شیطان بوڑھا جسے اب میں شیطان کہنے سے گریز نہیں کرتا، لیکن اب سے کچھ وقت پہلے اگر کوئی میری گردن بھی کاٹ دیتا تو میں یہ لفظ اس کے لئے اپنے منہ سے ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا کیونکہ بچپن سے میں نے اس کے تقدس کی عبادت کی ہے اور اسے بڑا مانا ہے اور اس وقت بھی تم لوگ یقین کرو پرمیت سنگھ اور تم عظیم آقا اور تو آقا زادی، اے کالے شخص، جو اس وقت ہمارا دیوتا بنا ہوا ہے کہ جب یہ شخص تصدیق کرنے آیا تھا اس وقت ہی میرا وجود پتھر بن گیا تھا چونکہ یہ ہی تو وہ تھا جو مجھے دیوتا کے قدموں میں قربان کرنا چاہتا تھا اور میں تو اسے پہچانتا ہوں لیکن اس وقت میں بچی تھی اور اب میں سوچتا ہوں شاید اس عمر میں آنے کے بعد یہ مجھے پہچان نہیں سکے گا اور اس خوف کا اس وقت مجھے احساس تھا کہ کہیں وہ میری شناخت نہ کر لے لیکن اگر وہ قوت والا ہوتا جب ایسا ہوتا اب میرا دل بہت مطمئن ہو گیا ہے کہ جو کچھ میں سوچتی رہی ہوں وہ غلط ہے۔"

"ٹھیک ہے وہ تجھے نہیں پہچان سکا لیکن وہ جو کچھ کہہ گیا ہے اس کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟"

"اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو...... جو کچھ اس نے کہا وہ سچ ہے......" ہابون نے کہا۔

"ہاں۔"

"اور کیا یہ بات ہمارے لئے پریشان کن نہیں ہے کہ یہاں ایک ایسا صاحب اقتدار شخص موجود ہے جو ہمارے بارے میں جانتا ہے۔" کرناوتی نے کہا۔

"لیکن ہم اس بات کا اقرار نہیں کرتے کرناوتی، اور اگر ہم نے اس بات کا اقرار کر لیا تو اس کا مقصد ہے کہ ہم اس کی مٹھی میں چلے جائیں گے۔"

"تو پھر۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ حالات کا تھوڑا سا جائزہ لو یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرو کہ وہ کیا چاہتا ہے وہ جو ہمارے لئے ممکن ہو تو میرے خیال میں ہمیں اس کی بات مان لینی چاہئے۔"

"کیا اس طرح کہ ہم اس کی برتری قبول کر لیں؟" کرناوتی نے سوال کیا۔

"نہیں پہلے عملی کوشش کرتے ہیں وہ جو، اپنی زبان سے ادا کرے وہ پاتال نگری والوں کے سامنے آ جائے اور آہورہ کی طرف سے اختلاف نہ ہو اور اس کے بعد جب ہمیں یہاں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں گے کہ آہورہ ہمارا دشمن ہو سکتا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

"مگر...... ہم اس سے تعاون کر بھی لیں تو کیا حرج ہے؟" ہابون نے کہا "دیکھنا تو یہی ہوگا کہ وہ کیا تعاون چاہتا ہے ہم سے۔" اور پھر اس کے بعد سب

گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے یہ بڑا مشکل مرحلہ آ گیا تھا اور حیرانی کی بات تھی کہ ایسے عقلمند ہر جگہ ہوتے ہیں جو اقتدار کو قبضے میں رکھنے کیلئے نجانے کیا کیا سوانگ رچا لیتے ہیں لیکن بہرحال یہ فکر کے لمحات تھے۔ اور وہ ان پر غور کر رہے تھے۔ ہابون بھی بے وقوف نہیں تھا۔ بیشتر مواقع پر اس نے ناقابل یقین ذہانت کا ثبوت دیا تھا لیکن یہ مرحلہ ایسا آ گیا تھا کہ وہ بھی کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ پھر وہ الجھ کر بولا۔

"مجھے اجازت دو...... میں اسے ختم کر دوں۔ اگر وہ ہماری کامیابی میں رکاوٹ بن رہا ہے تو اس کی زندگی خطرناک ہے۔"

نعمت علی مسکرایا۔ پھر اس نے کہا۔ "نہیں ہابون بے شک تم زندگی کی بازی لگا کر ایسا کر سکتے ہو کیا ہم ایسا نہیں کریں گے۔ وہ جو موت کے ہم آغوش ہو گیا۔ ہمارے لئے اتنا ہی قیمتی تھا جتنا دوسرے۔ میں سب کے ساتھ واپس جاؤں گا۔ یہ میرا عہد ہے۔"

نعمت علی ایک عجیب سی وحشت کا شکار تھا یہ ماحول اس کے سر میں ہتھوڑے کی طرح دھنک رہا تھا وہ باہر نکلا اور قرب و جوار کے ماحول کا جائزہ لینے لگا تھوڑے فاصلے پر اس عبادت گاہ کا بڑا دروازہ تھا دروازے کے دونوں طرف عظیم الشان اور مضبوط دیواریں کوئی پچاس فٹ تک بلند ہوتی چلی گئی تھیں اور ان لوگوں کی زبردست کارکردگی دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کسی بہت بڑے مذہبی رسم یا جشن کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی ہیں لوگوں کے گروہ کے گروہ چاروں طرف مصروف عمل نظر آ رہے تھے اس میں وہ پجاری بھی شامل تھے جو لمبے لمبے چوغوں والے تھے وہ ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے اور انتظامی امور والے لوگ بھی، جن کے ہاتھوں میں جوڑے بھالے اور پیشانی پر سیاہ رنگ کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور یہ انہیں انتظامی امور کے ذمہ دار قرار دیتی تھیں۔ دروازے کے دوسری طرف بھی پہرہ تھا۔ وہ اس وقت سامنے کھڑا دیکھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ پھر دروازے کا پردہ ہٹا اور پجاریوں کا ایک گروہ کمرے میں داخل ہوا یہ تقریباً بارہ یا تیرہ افراد تھے اور ہر پجاری کے ہاتھ میں ایک لمبی سی موم بتی تھی۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ان سب کے پیچھے آہورہ بھی تھا اور اس وقت وہ تندرست و توانا آدمی لگ رہا تھا حالانکہ اس کا بدن بہت دبلا پتلا تھا۔ اور لمبی داڑھی اور بکھرے ہوئے بالوں کی وجہ سے وہ آسیب کی مانند لگ رہا تھا۔ بہرحال وہ لوگ اندر آ گئے اور سجدے میں گر گئے۔ پھر دیر تک وہ اس طرح خاموش پڑے رہے جیسے پتھر کے بت ہوں یہی کیفیت خود آہورہ کی تھی۔ نعمت علی دیکھ رہا تھا کہ آہورہ کتنا بڑا اداکار ہے اور کیا ہی عمدہ اداکاری کرنا جانتا ہے جبکہ نجانے کون کون سے راز اس کے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھے، آخرکار ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیا آپ تیار ہیں عظیم دیوتا، ہم آپ کو بڑی عبادت گاہ میں لے جانے کیلئے تیار ہوئے ہیں۔ اور اس وقت پاتال نگری والے اپنے دیوتاؤں کے درشن کیلئے بے چین ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی پرجلال صورتیں دیکھیں......"

"ٹھیک ہے آہورہ ہم تیار ہیں......" کرناوتی نے جواب دیا۔ "تو پھر یہ لباس پہن لیجئے یہ عارضی لباس ہیں جو آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے چھپا لیں گے کیونکہ آپ کی مقدس صورتیں اس وقت تک کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا۔ جب تک کہ زیارت کا وقت نہ ہو جائے پھر لمبے لمبے چوغے انہیں دے دیئے گئے اور صرف ہابون اور کرناوتی کے لئے یہ چوغے لائے گئے تھے اور بڑے احترام سے ایک شخص اپنے دونوں ہاتھوں میں پتھر کی بنی ہوئی ایک تھالی میں رکھ کر لایا تھا۔ اور آہورہ نے یہ لباس جس میں تسموں کے بجائے سینگ کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے اور لمبے لبادے کو بکری کے بالوں سے بنایا گیا تھا اس میں بڑی بڑی آستینیں لگی ہوئی تھیں جو اتنی بڑی تھیں کہ پہننے والے کے ہاتھ بھی ان میں چھپ جائیں اور اس کے اوپری سرے پر ایک گول نوکدار ٹوپی سی نقاب لٹک رہی تھی جس میں تین

سوراخ تھے دو آنکھوں کیلئے، اور ایک سانس لینے کیلئے۔ کرناوتی اور ہابون نے لباس اپنے جسموں پر پہنا اور وہ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پراسرار بلائیں ہوں پھر انہی پجاریوں نے کرناوتی کے ہاتھ میں نجانے کونسی قسم کے پھول دیئے ان میں ایک سرخ تھا اور دوسرا سفید یہ پھول اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑنے تھے گویا دیوی تیار ہوگئی تھی باہر جانے کیلئے، اس کے بعد پجاری ہابون کے پاس پہنچے اور اسی طرح اسے بھی سجا دیا گیا اور اس کے ہاتھ میں سفید ہاتھی دانت کی ایک چھڑی دی گئی جو سانپ کی شکل کی تھی اور کافی قدیم معلوم ہوتی تھی اس کی آنکھوں کی جگہ ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ہابون نے یہ چھڑی اپنے ہاتھ میں لے لی تو آہورہ نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا......

"دیوی اور دیوتا تیار ہوگئے ہیں اب ہمیں چلنا ہے اور اب آپ کو چلنا ہے۔"

"ہاں لیکن ہمارے خادم بھی ہمارے ساتھ آئیں گے وہ بھی جو اس کمرے میں ہیں اور وہ بھی جنہیں دوسری جگہ رکھا گیا ہے اور یہ عورت یہیں رہے گی کہ جب ہم واپس آئیں تو ہمیں اپنی ضرورت کی چیزیں تیار مل جائیں کرناوتی خود ہی فیصلے کر رہی تھی اور یہ بات اس نے اس لئے کہی تھی کہ خود پردھان سنگھ نے خوف کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ اس کا عبادت گاہ میں جانا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی کو کوئی اعتراض ہوسکتا تھا خصوصاً نعمت علی کو، کیوں کہ نعمت علی نے بھی کرناوتی کی ذہانت سے پورا پورا اتفاق کیا تھا اور واقعی اس وقت پردھان سنگھ کی حالت کافی خراب تھی تو آہورہ نے پرادب لہجے میں کہا۔

"آپ کے سب خادم باہر کھڑے ہیں دیوی، اور ان کیلئے بھی تیاریاں کرلی گئی ہیں لیکن یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے جھریوں پڑے چہرے پر نہایت ہی معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور نا جانے کیوں نعمت علی کو اس کی مسکراہٹ میں ایک شیطان کی سی عیاری اور مکاری محسوس ہوئی پھر اس نے سوچا کہ کیا کہنا چاہئے یہ بوڑھا مکار اس کے الفاظ میں جو خاص بات تھی اس نے نعمت علی کو کسی حد تک مضطرب کر دیا تھا آخر کیا تیاریاں کرلی ہیں، اس نے اس، یہ تمام باتیں سوچنے کا وقت نہیں تھا وہ لوگ برآمدے میں آگئے جہاں مسلح سپاہی ڈولیاں لئے کھڑے ہوئے تھے اور یہیں پر انہوں نے اپنے ساتھ آنے والے سیاہ فاموں کو بھی دیکھا جن کے چہرے پر خوف و ہراس طاری تھا کیونکہ بہت سے افراد انہیں اپنے نرغے میں لیے ہوئے تھے جن کے پاس ہتھیار موجود تھے۔ صرف ہابون اور کرناوتی کو ڈولیوں میں بٹھایا گیا اور ڈولیوں کے پیچھے چھوٹے سے گروہ کی صف تھی اور پرمیت سنگھ سب سے آگے آگے چل رہا تھا انہیں خاص طور پر ہتھیار بھی دیئے گئے تھے۔ یعنی نعمت علی کو اور پرمیت سنگھ کو اور یہ لوگ بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے اور ان کے خصوصی ہتھیار بھی ان کے لباسوں میں چھپے ہوئے تھے کہ اب تک جس چیز کی خاص طور پر حفاظت کی گئی تھی وہ بارود اور دھماکے کرنے والے ہتھیار تھے۔ اور بھی ایک ایسا سنہری کارڈ تھا ان کے ہاتھ میں جس سے وہ بھی کسی لمحے حالات پر قابو پاسکتے تھے کیونکہ اس کے لئے خاص طور سے ہدایت کی گئی تھی البتہ یہ بات انہیں معلوم نہیں تھی کہ بارود کے استعمال اور آتشی ہتھیاروں کے استعمال سے خود اس بوڑھے شیطان کو واقفیت ہے یا نہیں، لیکن جو کچھ انہوں نے اپنے جسموں پر سجایا تھا اس پر اس نے غور نہیں کیا تھا اور انہیں ان کا مخصوص ہتھیار ہی سمجھا تھا لیکن بہرحال ہر چیز کار آمد تھی اور خصوصی طور پر پستول جو چھوٹے ہوتے تھے لیکن موقع پر کام آنے والے چنانچہ یہ سب آگے بڑھ گئے وہ اس بات کا تھوڑا بہت اندازہ لگا چکے تھے کہ اگر یہ لوگ ان ہتھیاروں کی جانب توجہ نہیں دیتے تو وہ انہیں صرف ان کا زیور سمجھتے ہیں پھر یہ گروہ آگے بڑھا اور عجیب سی بے ہنگم آوازیں فضا میں گونجنے لگیں یہ ان کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں چلنے والے پجاری تھے جو کوئی مقدس گیت گا رہے تھے۔

سپاہیوں کی قطاروں کی قطاریں بھالوں کے

پھلوں پر موم بتیاں روشن کئے آگے بڑھ رہی تھیں اور جب وہ عظیم الشان دروازے کے پاس پہنچے تو دروازہ کھول دیا گیا اور اس سے وہ باہر آئے چنانچہ اب وہ اس بلندی پر چڑھ گئے تھے جو اس رہائش گاہ یعنی محل اور اس بڑی اور عظیم الشان عبادت گاہ کے درمیان تھی جو انتہائی ہیبت ناک تھی اور بلندی پر نظر آ رہی تھی اور یہ فاصلے طے کرنے کے بعد وہ عبادت گاہ کے سامنے پہنچ گئے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور یہاں ڈولیاں رکھ دی گئیں۔

کرناوتی اور ہابون سے نیچے اتر آنے کو کہا گیا، جیسے ہی وہ نیچے اترے ساری روشنیاں بجھا دی گئیں موم بتیاں اور مشعلیں دھواں دے رہی تھیں اور قرب و جوار میں مکمل اندھیرا چھا گیا تھا، اندھیرا بڑا خوف ناک اور دل لرزا دینے والا تھا اور پتہ نہیں اس کی کیا وجہ تھی۔ اچانک کسی نے نعمت علی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھسیٹ کر ایک طرف چلا، نعمت علی کچھ ایسی کیفیت میں تھا کہ مدافعت بھی نہیں کرسکا اور اس کے ساتھ گھسٹتا چلا گیا۔ خدا جانے گھسیٹنے والا کون تھا اور اسے کہاں لئے جا رہا تھا اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ وہ معلوم نہ کرسکا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا تھا؟ یہاں تک کہ اسے یہ احساس ہوا کہ جو شخص اسے گھسیٹ رہا ہے وہ کوئی پجاری ہی ہے اسے اس کے لباس کی وجہ سے اندازہ ہوا تھا۔ پھر خاصا فاصلہ طے ہوگیا۔ آوازوں سے اس نے اندازہ لگایا کہ صرف اس کے ساتھ ہی ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس طرح گھسیٹ کر لے جایا جا رہا تھا۔ اس نے ان لوگوں کی آوازیں بھی سنیں جو اس کے اپنے ساتھی تھے وہ خوف سے بڑبڑا رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ وہ کون ہیں اور انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ اچانک ہی ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے ان کے ساتھ سختی کی جا رہی ہو کچھ گھونسوں اور تھپڑوں کی آوازیں تھیں چنانچہ یہ ظاہر ہوا کہ انہیں خاموش ہی رہنا ہے پھر اچانک ہی نعمت علی کو یہ محسوس ہوا جیسے وہ کھلی فضا میں سے نکل کر کسی تنگ جگہ پر آگئے ہوں کیونکہ ہوا بدلی ہوگئی تھی اور پتھریلے فرش ان کے پیروں کی آواز چاپ پیدا کر رہی تھی۔ "ہم شائد کسی سرنگ سے گزر رہے ہیں۔" یہ سرگوشی پرمیت سنگھ کی تھی۔

"خاموش اگر دوسری بار تو نے زبان کھولی تو تیری گردن دبا دی جائے گی، یہ مقدس مقام ہے اور یہاں خاموش رہنا ضروری ہے۔ بولنے والے موت کی نیند سلا دیئے جاتے ہیں......" وہ لوگ خاموش ہوگئے انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ صورت حال ان کے حق میں کافی سنگین ہے اور بہرحال یہ ایک حقیقت تھی کہ اس وقت جو حیثیت ہابون اور کرناوتی کو حاصل تھی وہ کسی اور کو نہیں یہ الگ بات ہے کہ وہ دیوی دیوتا کے ساتھی تھے لیکن اس کا مقصد یہ بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں کے قانون کی خلاف ورزی کریں البتہ نعمت علی نے اپنی پستول کو بہت ٹٹولا تھا اور نجانے کیوں اس کی چھٹی حس اسے یہ احساس دلا رہی تھی، کہ صورت حال غیر محفوظ ہے پتہ نہیں یہ لوگ اسے کہاں لے جا رہے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ اس تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کسی زیر زمین قید خانے میں بہرحال اتنا اطمینان ضرور تھا کہ اب کرناوتی کیلئے کوئی خطرہ نہیں تھا اور نہ ہی ہابون کیلئے۔ وہ ایک لمبی سرنگ میں چلتے رہے شروع میں یہ سرنگ ڈھلان میں اتر رہی ہے اور اس کے بعد سیدھی سیدھی اتر رہی ہے لیکن آگے چل کر کچھ سیڑھیاں آگئی تھیں وہ ان سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے البتہ سیڑھیاں اتنی تھیں کہ چڑھتے چڑھتے ان کے پٹھے [illegible] لگے اور ہر سیڑھی ایک دوسرے سے خاصی اونچی تھی جب یہ سیڑھیاں ختم ہوئیں اور وہ لوگ دس قدم تک سرنگ میں چلتے رہے یہ سرنگ پہلے سے بھی زیادہ تنگ تھی اور اس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ انہیں جھک کر چلنا پڑ رہا تھا اس سرنگ میں سے نکلے تو پتھر کے ایک چبوترے پر پہنچ گئے اور یہاں تھوڑے تھوڑے حالات سمجھ آ رہے تھے اس کے اطراف میں سرد ہوائیں ان کے رخساروں کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھیں لیکن بہر طور اندھیرا اتنا ضرور تھا کہ یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور ان کے اردگرد

کیا ہے البتہ نیچے سے پانی بہنے کی آواز آرہی تھی اور اس کے ساتھ ہی دوسری آوازیں بھی جو انسانی آوازیں ہی تھیں، یوں لگ رہا تھا جیسے بے شمار افراد ایک دوسرے سے سرگوشیاں کررہے ہیں، عجیب سی سرسراہٹیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ جیسے ہوا کے جھونکے درختوں اور جھاڑیوں میں سے گزر رہی ہوں یا پھر یہ ان بے شمار عورتوں کے لباس کی سرسراہٹ ہو۔ نظر نہ آنے والا پانی اور نظر نہ آنے والے ہجوم کی موجودگی کا احساس ہولناک اور بے چین کردینے والا تھا بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ روحوں کے جال میں آ پھنسے ہوں اور سینکڑوں روحیں ان کے گرد رقصاں ہوں وہ نظر نہ آنے والے ہاتھوں سے انہیں چھو رہی تھیں بغیر الفاظ کے بول رہی تھیں بغیر آنکھوں کے دیکھ رہی تھیں عجیب ہولناک سا ماحول تھا جو بدن میں سرد لہروں کی طرح اتر رہا تھا، وحشت ناک پراسرار اور لرزہ خیز اعصاب اسقدر تن گئے تھے کہ نعمت علی کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زور سے چیخ پڑے اس سے پہلے کبھی کسی ایسی حالت سے نہیں گزرا تھا اور جانتا تھا کہ ان لوگوں کی حالت اس سے بھی زیادہ بدتر ہوگی۔ دفعتاً ایک گہرائی میں سے آواز سنائی دی جیسے کوئی بہت ہی خوفناک لہجے میں چیخ رہا ہو، پھر فوراً ہی ایک آواز ابھری۔

"خاموش رہو کتو، خاموش رہو، دیوی سے پہلے کسی کو بولنے کی اجازت نہیں ہے، خاموش رہو اگر موت کو اپنانا نہیں چاہتے......" آواز خاموش نہ ہوئی یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ہچکیاں لے کر رو رہا ہو پھر ایک بھیانک چیخ سنائی دی چیخ کی آواز کے ساتھ ایک زور...... کی آواز پھر کسی کے گرنے کا دھماکہ ایک بار پھر نظر نہ آنے والا ہجوم بھنبھنا اٹھا پھر ایک سرسراہٹ سی سنائی دی اور نعمت علی کے کان کے قریب پر میت سنگھ کی آواز ابھری۔

"یوں لگتا ہے جیسے کسی کو قتل کردیا ہو پتہ نہیں کون ہوگا بیچارہ......" نعمت علی کانپ کر رہ گیا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا شاید جواب دے نہیں سکتا تھا کیونکہ پر میت سنگھ کی آواز کے ساتھ ہی ایک کھردرا اور بڑا سا ہاتھ اس کے منہ پر آپڑا تھا خیریت اسی میں تھی کہ اس وقت خاموشی اختیار کی جائے نجانے یہ خاموشی کتنی دیر طاری رہی اور آخر کار پاگل کردینے والی خاموشی ٹوٹی اور پھر ایک مدہم سی منمناتی ہوئی آواز ابھری یہ آواز بے شک سمجھ آرہی تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ کس کی آواز ہے آہورہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا خاموشی اتنی گہری تھی کہ مدہم آواز کے باوجود آہورہ جو کچھ کہہ رہا تھا ایک ایک لفظ صاف طور سے سمجھ آرہا تھا حالانکہ یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے محسوس کررہے تھے کہ وہ کافی دور سے بول رہا ہے یا پھر نجانے اس وقت ان کی یہ کیفیت تھی جو یہ ایسی بات محسوس کررہے تھے نعمت علی نے اس آواز پر کان لگادیئے تو اس کے کانوں میں یہ آواز ابھری......

"مقدس اڈینا کے پجاریو! عظیم آذن کے پیروکارو سنو، پاتال نگری کی آبادیوں میں رہنے والوں میری آواز سنو! میں جو عظیم گہرائیوں والے کا مذہبی پیشوا ہوں اور میں جو تمہیں تاحیات روشنی کے راستے دکھاتا رہا ہوں اور گہرائیوں والا تمہارے اوپر سایہ فگن رہے، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ سنو اور اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھو جیسا کہ پاتال نگری والے جانتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے دیوی اڈینا جسے ہماری قوم ہمیشہ ہمیشہ سے پوجتی چلی آئی ہے آسمانوں سے اتر کر ہماری قوم میں آئی اور اس کے ساتھ ہی دیوتا، جو اسکا منظور نظر تھا یعنی آذن اور جب وہ اس دنیا میں رہتی تھی تو ایسا گناہ کیا جو گناہوں کا باپ ہے۔ ہوا یوں کہ پاتال نے اجالے کو قتل کردیا اور دیوی ہم سے روٹھ گئی وہ ہماری سرزمین سے چلی گئی اور ہم نہیں جانتے اور نہ کبھی جان سکیں گے کہ وہ کہاں گئی لیکن میں جانتا ہوں اور وقت جانتا ہے یا گذری ہوئی صدیاں کہ اس کے بعد ہم پاتال میں رہنے لگے اور یہ سرزمین روشنی سے محروم ہوگئی کیونکہ اجالے کو ختم کردیا گیا تھا اور اس وقت سے اندھیرا ہم پر طاری تھا اور یہ اندھیرا لوگوں کی عبادت کا جواب موت سے دیتا تھا اور گہرائیوں میں رہنے والا اس بات کا

ایمان ہے کہ اس نے ہم پر کرم کیا کہ ہماری قوم تباہ نہیں ہوئی اور اندھیرے نے جس طرح اجالے کو قتل کیا اس کا کفارہ یہ تھا کہ اسے انسان کا روپ دھار کر اس جگہ اترنا تھا جہاں پانی ہے اور جہاں کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ہمارا دیوتا جو ہمیشہ سے اس پانی میں رہتا ہے وہ جو ہم پر زندگی نازل کرتا ہے اور موت سے ہمیں بچاتا ہے وہ ہمیشہ سے یہاں مقیم ہے اور خیال یہ کیا گیا تھا کہ آذن اور اڈینا ایک بار اس دنیا میں آئیں گے اور سنو دوسری بات کہ اس گناہ کے بعد دیوی اڈینا نے ایک وعدہ کیا تھا اور کہا تھا کہ میں آؤں گی ان کے ساتھ جس نے میرے وجود سے جنم لیا اور جو میرا ساتھی بنا اور سنو میں تمہیں ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر نہیں جارہی ہوں نسلوں کے بعد نسلیں گذر جائیں گی اور تب آذن اور ہم واپس آئیں گے اور پھر تم پر ہماری حکومت ہوگی اور تب اندھیرا تمہاری سرزمین سے ہٹ جائے گا اور تم دنیا کی عظیم ترین قوم بن جاؤ گے چنانچہ اس وقت تک جب تک ہم واپس نہیں آتے تم اپنے لئے سردار منتخب کرتے جاؤ جو تمہاری دیکھ بھال کریں اور ایسا تمہیں اس لئے کرنا ہے کہ تم منتشر نہ ہوجاؤ اور تم پر کمزوری طاری نہ ہو جائے دیکھو اس کے علاوہ میری پوجا کرنا نہ بھولنا اور اس بات کا خیال رکھنا مقدس گہرائیوں میں رہنے والے کو انسانی خون مہیا ہوتا رہے اور اسے اس کی غذا ملتی رہے جو اس کی پسند ہے اور جب میرے واپس آنے کا زمانہ آئے گا تو میں تمہیں ایک نشان دکھاؤں گی جس کے ذریعے تم مجھے اور میرے ساتھی آذن کو پہچان لوگے۔ سنو میں اندھیرے میں روشنی بن کر آؤں گی حسین اور سفید دودھ جیسی ہوں گی میری رنگت، اور چاند جیسا ہوگا میرا حسن اور ایسی بن کر آؤں گی کہ مجھے دیکھنے والوں کی آنکھیں بند ہوجائیں گی لیکن میرا ساتھی یعنی آذن اپنے گناہ کی وجہ سے اس بت کی طرح زمین پر اترے گا جو تمہارے مندر میں بیٹھا ہوا ہے اس کا رنگ کالا ہوگا اور صورت اس کی گھناؤنی ہوگی ہم تمہیں پکاریں گے اور تم انہیں پہچان لوگے اور پھر ہم تمہیں اپنے وہ مقدس نام بتائیں گے جو اس وقت سے ہمارے واپس آنے تک ننگے سر اور اونچی آواز میں بولے جائیں گے اور ہوشیار، جھوٹے دیوتا تمہارے درمیان نہ آنے پائیں اور ایسا نہ ہو کہ تم انہیں پوجنے لگ جاؤ اور اگر ایسا ہوا تو تم پر عذاب نازل ہوگا اور سورج اپنا منہ چھپالے گا تو اندھیرے کے باسیوں ـــــ کہا تھا دیوی اڈینا نے، اور جو شخص صدیوں پہلے موجود ـــــ تھا اس نے ہر بات لوہے کے ٹکڑے سے پتھر پر تحریر کردی تھی اس پتھر پر جس پر میں اس وقت کھڑا ہوں لیکن کوئی اس تحریر کو نہیں پڑھ سکتا کیونکہ میں صدیوں سے اس نسل کا روحانی پیشوا چلا آرہا ہوں اب مجھے خوشی ہے کہ اس وقت میں موجود ہوں جب میری پیشن گوئی یعنی میرے اجداد کی میری زندگی میں پوری ہورہی ہے۔ اور وقت آگیا ہے۔ آج رات وہ پیشن گوئی پوری ہوگی۔ اور وہ وقت آگیا ہے، آج رات، اندھیرے کے باشندو! وہ لافانی دیوتا جو اس وقت سرزمین سے رخصت ہوگئے تھے واپس آگئے ہیں۔ اور ہم نے انہیں دیکھا اور ہمارے کانوں میں انہوں نے اپنے مقدس نام کہے یعنی آذن اور اڈینا، حسین اور سفید خاتون اور یہی وہ ہیں جو ہمارے درمیان آنے والے تھے۔"

اس کی یہ طویل تقریر ختم ہوئی اور اس طرح خاموشی طاری ہوگئی جیسے وہاں کوئی انسانی وجود ہی نہ ہو اس خاموشی میں صرف بہتے پانی کی کچھ آواز تھی اور یہ آواز کہیں گہرائی سے آرہی تھی۔ اور کہیں کہیں ہجوم کی بھنبھناہٹ البتہ سنائی دیتی تھی۔ نعمت علی کی کنپٹیاں چیخ رہی تھیں۔ اور وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھا جو مسلسل اس کا تعاقب کررہی تھیں۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی کے بعد بے حس و حرکت ٹھہرا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس جگہ ہے اور اطراف میں کیا کچھ ہے۔ لیکن یہ بھی تقدیر ہی تھی کہ وہ عین وقت پر سنبھل گیا۔ ورنہ اس شوق اور تجسس کا انجام برا ہوتا۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اس کا اگلا قدم خلا میں پڑا اور وہ ڈگمگاتا آگے کی طرف جھکا اور اگر بڑی کوشش سے اپنا

توازن قائم کر کے سنبھل نہ جاتا تو گر پڑتا خدا جانے کہاں۔ وہ پیچھے ہٹا اور فوراً ہی پرمیت سنگھ کی آواز سنائی دی۔

"آگے نہ بڑھو میں یہ سب کچھ کر کے دیکھ چکا ہوں۔؟"

"کیسی جگہ ہے یہ۔"

"بلندی اور ہمارے اطراف کوئی دیوار نہیں ہے......"

"اوہ......" نعمت علی کے منہ سے آہستہ سے نکلا پھر نجانے کیا ہوا کہ اس نے دیکھا کہ رات کا اندھیرا ہلکی ہلکی روشنی میں تبدیل ہونے لگا اور بلندیوں میں ایک بہت بڑا پتھر آہستہ آہستہ روشن ہو رہا تھا جیسے چھوٹے قد وقامت کا چاند۔ سب سے انوکھی اور تعجب خیز چیز اس زمین کی چھت ہی تھی۔ وہ جگہ جو اوپر سے نیچے کی سمت ہوگی یہ ایک انوکھی طلسم کدہ کا اظہار کرتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شعاعوں نے آسمان کے نیچے ان پہاڑوں کو روشن کیا ہوا ہے۔ روشنی مدھم مدھم تھی لیکن پھیلتی جا رہی تھی اور پھر وہ اتنی تیز ہوگئی کہ اس میں بخوبی دیکھا جائے اور نعمت علی نے دیکھا کہ بائیں طرف ایک سیاہ مینار سا بلند ہو رہا ہے اور نیچے کوئی چیز چمک رہی ہے جس سے ہلکی ہلکی آوازیں ابھر رہی ہیں۔ بالکل ایسے جیسے چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی موجیں۔ حیرت انگیز منظر روشن ہوا تھا۔ وہ عجیب وغریب تھا۔ نعمت علی کے عین سامنے نشیب میں چھت کے بغیر ایک وسیع وعریض عمارت تھی۔ جو انتہائی طویل رقبے میں تھی۔ یہ عمارت ایک سمت سے کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کی تین طرف پتھر کی دیواریں کوئی پچاس فٹ تک بلند ہوتی چلی گئی تھیں۔ ایک عجیب سی جگہ تھی۔ جیسے، زمانہ قدیم میں وہ کھیل کے میدان بنائے جاتے ہوں۔ جہاں زندگی کے کھیل کھیلے جاتے ہوں۔ ادھر فلموں میں اکثر ایسے مناظر نظر آجایا کرتے تھے۔ اور پتھر کی نشستیں قطار کی شکل میں تھیں۔ اور ان نشستوں پر لاتعداد انسان بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں مرد بچے۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے سارا شہر امڈ آیا ہو۔

تمام نشستیں بھری ہوئی تھیں۔ سوائے آخری نشستوں کے مغربی سرے پر ایک عظیم الشان بت نصب تھا۔ جو ستر اسی فٹ تک فضا میں بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے صرف ایک کالی چٹان کو تراشا گیا اس بت کے عقب میں اس سے تقریباً سو فٹ دور ایک پہاڑی چٹان تھی۔ جو اس چوٹی تک پہنچ کر ختم ہو جاتی۔ جو برف پوش تھی۔ اور جسے نعمت علی اور اس کے ساتھیوں نے جب وہ اس شہر میں داخل ہوئے تھے بہت دور سے دیکھ لیا تھا۔

یہ بت بالکل ہابون کی مانند تھا۔ بھیانک صورت کا مالک دونوں بازو جھکائے۔ اور کہنیوں پر دونوں ہاتھ لیے کئے بیٹھا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں اوپر تھیں۔ جیسے وہ آسمان کو اپنی ہتھیلیوں پر روکے ہوئے ہو۔ یہ محسوس ہوتا تھا۔ جیسے پتھر کی وہ چوکی جس پر بت ہوا ہے۔ ایک گہری کھائی یا گہرا کنواں تھا۔ اس کھائی کا طول عرض اس سرے سے اس سرے تک تقریباً تیس فٹ ہوگا۔ اور اسی کھائی میں پانی شور مچا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے اس کے نیچے گندھک کے پہاڑ ہوں۔ کیونکہ اس سے ہلکا ہلکا دھواں بھی نکل رہا تھا۔

بت کے دونوں ہاتھ کھائی پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ خود ذرا سا سر جھکائے جیسے کھائی میں جھانک رہا تھا...... نعمت علی یہ نہ دیکھ سکا کہ یہ پانی کہاں سے آرہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ لیکن بہرحال ان لوگوں نے جو بھی دیکھا تھا۔ وہ اتنا پراسرار تھا کہ دیکھنے سے دل پر دہشت طاری ہوتی تھی۔

چٹان کے تمام پہلوؤں اور بت کی ٹانگوں کے درمیان قربان گاہ تھی۔ اور اس میں وہ پتھر نظر آرہا تھا جس پر انسانوں کو ذبح کیا جاتا تھا۔ وہ چٹان جو طول وعرض میں کافی بڑی تھی۔ اور جو سب سے اہم چیز اس وقت دیکھی گئی۔ وہ قربانی کے پتھر کے عین سامنے ایک شخص کھڑا تھا۔ جیسے رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ اور اسے دیکھ کر نعمت علی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کیونکہ اس نے ایک لمحے کے اندر اندر ہنگارہ کو صاف پہچان لیا تھا۔

پاتال نگری کا سردار ہنگارا جس کے دونوں طرف جنات نما لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ اور ان کا اوپری بدن برہنہ اور وہ لمبے لمبے کھانڈوں سے مسلح تھے ان کے پیچھے جو لوگ نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر ہی نعمت علی کے ہوش وحواس جواب دے گئے تھے۔ یہ وہ غلام تھے جنہوں نے ان کے ساتھ زندگی کے سب سے طویل سفر کو شروع کیا تھا۔ اور اس وقت ان کی حالت ناقابل دید تھی۔

وہ بچے کی طرح کانپ رہے تھے۔ اور افسوس کی بات یہ تھی۔ کہ ان میں سے ایک سنگین فرش پر مردہ پڑا ہوا تھا۔ اور شاید یہ ہی وہ آدمی تھا جو اندھیرے میں گرا تھا۔ اور اس کی چیخ سنائی دی تھی۔ لیکن یہ بڑا دکھ بھرا منظر تھا۔ جسے دیکھ کر وہ دہشت سے کانپ گیا۔ اور اگر اپنے آپ کو سہارا نہ دیا جاتا۔ تو یقینی طور پر نیچے گرنے کے امکانات واضح ہوسکتے تھے۔ نعمت علی انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ اب کیا کرے۔ یہ تو انتہائی خوفناک بات تھی۔

اس نے دیکھا کہ کھولتے ہوئے پانی کے چشمے سے کوئی سو فٹ اوپر کرناوتی ہاتھی دانت سے بنی ہوئی کرسی پر بیٹھی ہے اب اس کا سیاہ لبادہ اتار دیا گیا تھا۔ اور وہ ایک سفید عباء میں ملبوس تھی۔ اس کی پتلی کمر کے گرد ایک پٹکا بندھا ہوا تھا۔ جو اصل لباس کو اس کے بدن پر روکے ہوئے تھا۔ اس کے کالے بال اس کے گورے گورے کندھوں پر ناگنوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں پھول تھے۔ دائیں میں سفید اور بائیں میں سرخ اور اس کے ماتھے پر ایک عجیب وغریب چیز چمک رہی تھی۔ جسے دیکھ کر نعمت علی کی آنکھوں میں سرخ روشنی اتر آئی۔ آہ، یہ ایک سرخ پتھر تھا۔ ایک انتہائی سرخ پتھر...... جس سے روشنی اس طرح پھوٹ رہی تھی۔ جیسے سرخ پھلجھڑیاں چل رہی ہوں۔ یہ پتھر اس کے ماتھے پر چمک رہا تھا۔ اور اسے ایک پٹی کے ذریعے اس کے چہرے پر باندھا گیا تھا۔ وہ پتھرائی ہوئی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور روشنی کی کرنیں اس کے ماتھے پر بندھے ہوئے لعل پر منعکس ہو رہی تھیں۔ اور اس کا چہرہ اس وقت ایسا عجیب لگ رہا تھا۔ کہ دیکھنے والی آنکھ اگر اسے دیکھے تو اس کے بعد کچھ دیکھنے کی آرزو نہ کر سکے۔ اس کے حسن کے بارے میں صحیح الفاظ کی تراش مشکل تھی۔ اسے کوہ قاف کی کوئی پری یا آسمانی روح بھی اتنی حسین نہیں رہی ہوگی۔ جو اس وقت وہ نظر آرہی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس بلندی پر اس چاندنی میں وہ ایک انسان سے زیادہ ایک روح ہی معلوم ہو رہی تھی۔ جو حیات کی دیوی ہو۔ اور یقینی طور وہی جو یہ لوگ سمجھ رہے تھے۔ اور وہاں موجود لوگ دوسری دنیا کی اس مخلوق کو دیکھ کر پتھرا گئے ہیں۔

پھر نعمت علی کی نگاہیں گھومیں اور اس نے ہابون کو بھی ایک عجیب رنگ میں دیکھا۔ پتہ نہیں کب، اور کس وقت، اور کس طرح ہابون کا حلیہ بھی تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اور اب وہ صرف نچلے بدن کو ڈھکنے والے لباس میں تھا۔ اور اس کے ماتھے پر ایک عجیب سی جھالر بندھی ہوئی تھی۔ البتہ ہاتھ میں ہاتھی دانت کا وہ عصاء پکڑے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کا تخت بھی آبنوس کا تھا۔ اور اس خوفناک بت کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا۔

کیفیت یہ تھی کہ ہابون اس وقت کرناوتی سے کوئی چالیس فٹ نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ اور بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ پرمیت سنگھ، نعمت علی کے قریب ہی موجود تھا۔ اور یہ دیکھ کر اس کا دم اور نکلنے لگا کہ وہ بت کی دائیں ہتھیلی پر کھڑے ہوئے تھے۔ بت کی یہ ہتھیلی کوئی چھ مربع فٹ کا پلیٹ فارم بنا رہی تھی۔ اور بت کے بازوؤں کو اندر اندر کاٹ کر سرنگ بنائی گئی تھی۔ اور اسی سرنگ میں سے انہیں لایا گیا تھا۔ اور وہ دونوں اس وقت گویا ایک ایسی بلند جگہ کھڑے تھے۔ جس کے کسی طرف کوئی روک نہیں تھی۔ اور اگر ذرا بھی کوئی گڑبڑ ہو جاتی یا ان کا توازن بگڑ جاتا تو وہ خلاء میں گہرائیوں میں جا پڑتے۔ اور کوئی نوے فٹ نیچے اس کھائی میں جہاں زندگی سب سے زیادہ غیر محفوظ تھی۔ تب نعمت علی کو پرمیت سنگھ کی آواز

سنائی دی۔

"مجھے سنبھالو میں...... چکرا رہا ہوں۔ میں نیچے گر پڑوں گا۔ مجھے سنبھالو" اور نعمت علی اس کی جانب لپکا۔ اس نے پرمیت سنگھ کو سہارا دیا۔ اور تسلی دیتا ہوا بولا۔

"خود کو سنبھالو پرمیت سنگھ!" اس نے پرمیت سنگھ کو نیچے بٹھا دیا۔ تو پرمیت سنگھ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"مجھے لگتا ہے کہ موت کا خونی کھیل شروع ہونے والا ہو اور وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ آہ۔ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" پرمیت سنگھ کی آواز نعمت علی کو ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور پھر پرمیت سنگھ نے گردن ڈال دی۔

نعمت علی گھبرا گیا تھا۔ اس نے جھک کر پرمیت سنگھ کو دیکھا لیکن یہ دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ کہ پرمیت سنگھ بیہوش ہو گیا تھا۔ لیکن خود نعمت علی کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ کیا ہونے والا ہے۔ نجانے کیا ہونے والا ہے۔

رگوں میں خون منجمد کر دینے والا ماحول در حقیقت ایسا تھا کہ اگر اس ماحول کو دیکھنے کے باوجود کوئی اپنے دل و دماغ پر قابو پا سکے تو اسے انتہائی مضبوط اعصاب کا مالک کہا جا سکتا تھا۔ پرمیت سنگھ تو بے ہوش ہو چکا تھا۔ لیکن نعمت علی اپنے آپ کو سنبھال کر ایک بار پھر نگاہیں دوڑانے لگا تھا۔ اس نے دیکھا۔ کہ کچھ فاصلے پر اس بت کے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر آہورہ کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

"تو...... پاتال نگری...... میں بسنے والو! دیکھا تم نے درشن کر لئے عظیم اڈینا کے اور مقدس دیوتا آذن کے، اور اب وہ ہمارے درمیان آ گئے ہیں اور صدیوں پہلے کی پیشن گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔ تو تم انہیں خوش آمدید کہو اور اس کے بعد ایک زبردست شور برپا ہو گیا۔ وہ سب اپنی اپنی آواز میں کچھ نہ کچھ کہنے لگے۔ جس کا مفہوم تھا کہ مقدس دیوتا ہم پر برکتیں نازل کرو۔ ہم تمہاری اطاعت کیلئے حاضر ہیں۔ تو پھر آہورہ نے کہا۔

"اور عظیم دیوتاؤں اپنے خادموں پر اپنے پجاریوں پر اپنی محبت قائم کرو۔ اور پاتال نگری کی حکومت قبول کرو۔ ہم پر حکمرانی کرو۔ ہماری قربانیاں قبول کرو۔ ہم اپنا تمام اختیار تمہیں دیتے ہیں۔ ہمارے مویشی ہماری بھیڑیں تمہاری ہیں۔ اور تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قربان گاہ کو سرخ کر دیں گے اور قربان ہونے والوں کی چیخیں تمہارے لئے حسین نغموں کی طرح ہوں گی۔ دیوتاؤ! فتح ہو تمہاری" چاروں طرف سے وہی آوازیں ابھرنے لگیں۔ اور جب آوازوں کا شور دبا تو آہورہ نے کہا۔

"لاؤ ان مقدس عورتوں کو جنہیں دیوتا کی آمد کی خوشی میں پہلی قربانی کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔" فوراً ہی کچھ پجاری دو عورتوں کو لے کر سامنے آ گئے۔ اور ایک خونی منظر کا آغاز ہو گیا۔ عورتوں کو اس ہولناک مجسمے کی ٹانگوں کے پاس کوڑ کے کنارے کھڑا کر دیا گیا اور وہ دونوں خوبصورت عورتیں تھیں۔ اور انہیں خاص طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ ان کے بدن پر لباس بہت مختصر تھا۔ اور سروں پر پھول سجے ہوئے تھے۔ بہر حال انہوں نے انہیں دیکھا عورتوں کے چہرے خوف سے پھیلے پڑ گئے ہوئے تھے۔ اور وہ کانپ رہی تھیں۔ اور ان کی حالت ناقابل بیان تھی۔

مجمع میں خاموشی طاری ہو گئی۔ اور بہت عجیب سی کیفیت تھی۔ ان عورتوں کی۔ پھر انہیں ہجوم کی طرف رخ کر کے کھڑا کر دیا گیا۔ اور ہجوم نے ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"قربان ہونے والی پہلی عورت قابل مبارکباد ہے۔ پھر پیچھے کھڑے ہوئے پجاری آگے بڑھے انہوں نے ان میں سے ایک عورت کی ٹانگیں اور دوسرے نے اس کے ہاتھ پکڑے اور دوسرے لمحے اسے کھائی میں پھینک دیا۔ ایک فلک شگاف چیخ کے ساتھ پانی میں چھپاکا سنائی دیا اور نعمت علی نے دیکھا کہ عورت سطح آب

پر کو لے کھا رہی تھی۔ اور روشنی اس جگہ کو منور کر رہی تھی۔

جو لوگ آگے موجود تھے جھک جھک کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور تجسس سے مجبور ہو کر نعمت علی نے بھی اپنے آپ کو بت کی ہتھیلی پر اوندھے منہ لٹا دیا۔ وہ بھی نیچے جھانک رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بت کے عین قدموں تلے پانی میں ایک ہلچل سی مچی اور پھر ایک انتہائی زبردست اور گھناؤنی شکل کا مگرمچھ تھوتھنی کھولے آگے بڑھا۔

اور نعمت علی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مگرمچھ کا سر اتنا بڑا تھا کہ کبھی تصور میں بھی نہ آ سکے۔ اس کے دانت لمبے لمبے اور تقریباً آدھے ہاتھ کے برابر تھے۔ گلے کا گوشت تھیلے کی طرح لٹک رہا تھا۔ اور اس کی لمبائی کا اندازہ صحیح طرح نہیں ہو سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے۔ وہ اوپر ابھرا اور اپنے شکار کی طرف لپکا۔ پھر عورت سالم اس کے منہ میں چلی گئی۔ اور نعمت علی پتے کی طرح تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے کرناوتی کو دیکھا۔ اسے خطرہ ہوا کہ کرناوتی کہیں اس خوفناک منظر کو دیکھ کر زندگی ہی نہ کھو بیٹھے۔

بابزن اور سب اس طرح بے حس و حرکت تھے۔ کہ بس یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے ان کی روح بدن سے نکل گئی ہو۔ پھر اس بدبخت آہورہ نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"مبارک ہو، مبارک ہو سب کو۔ اور آج کی رات قربانی کی رات میں بدل دو۔ اور اب اس کے بعد دوسری لڑکی کو قربان کرو۔ پھر ہنگارا کو...... کہ جب بادشاہ آ جاتا ہے۔ تو دوسرے بادشاہ کی زندگی ایک نحوست ہوتی ہے۔ اور اسے کسی بھی طرح زندہ نہیں رکھا جا سکتا پھر اس کے بعد ان غلاموں کو لاؤ۔ جو آج تک دیوی اڈینا کے قدموں میں رہے ہیں اور انہیں بھی عزت بخشو! قربانیاں پوری کرو۔ ہر ایک کو قربان کر دو۔

صرف دیوی اڈینا کو اور آذن کو ہم لوگوں پر بادشاہت کیلئے قائم رہنے دو۔ اور یہ الفاظ ایسے تھے۔ کہ اگر دلوں میں دھڑکن باقی رہ بھی گئی ہو تو جلد از جلد اس کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ ان سب کو جنہیں آہستہ آہستہ قربان گاہ کے قریب لے آیا گیا تھا۔ یعنی انہیں جو پاتال نگری کے غلام تھے اور ان لوگوں کے ساتھ آئے تھے اور پرمیت سنگھ کو بھی اور ہنگارا کو بھی جو یہاں کا سردار تھا۔ لیکن کرناوتی کی مترنم اور خوبصورت آواز ابھری۔

"پاتال نگری کے باشندو! سنو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں۔ سنو، میں تمہارے درمیان واپس آ گئی ہوں اور پاتال نگری کی اجارہ داری ختم ہو گئی ہے۔ اب اس شہر میں روشنی چلے گی۔ کیونکہ میں جس شکل میں تمہارے درمیان آئی ہوں۔ وہ روشنی کی شکل ہے۔ اور میں نے ایک پرنور دل دیا ہے۔ تمہارے دیوتا۔ آذن کو، اور سنو، برائیوں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ اور وہ جو قربانیاں قبول کرتا ہے۔ اب اپنی فطرت بدل دے گا۔ لیکن سنو تم اس سرزمین پر موت کی آغوش میں جانے کیلئے نہیں ہو۔ میں پرانی رسم منسوخ کرتی ہوں۔ اور تمہیں نیا قانون دیتی ہوں۔ اس قانون میں خون بہانے کا دور ختم ہوتا ہے۔ محبت اور پیار کے پھول ہر طرف کھلائے جائیں گے۔ مجھے اب گوشت اور خون کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم حسین پھول اور تازہ پھل قبول کریں گے۔ دیکھو! میں خون اور قربانی کی علامت کو اس پانی میں پھینک رہی ہوں۔ اور اب پاتال نگری کے باشندو! جو میں کہوں وہ ہو گا۔ چونکہ میری آمد کو قبول کر لیا گیا ہے۔"

نعمت علی نے حیرانی سے کرناوتی کو دیکھا۔ اور کرناوتی نے سرخ پھول کھائی میں پھینک دیا۔ اور پھر سفید پھول اپنے ہاتھ میں اٹھا کر کہا۔

"سفیدی محبت کی علامت ہوتی ہے۔ لوگ ایک بار پھر شور مچانے لگے۔ دیوی کے الفاظ ان کے لئے بڑی حیرت کا باعث تھے۔ قربانی کی رسم ختم کر دی گئی تھی اور یہ بہتر تو نہیں تھا۔ لیکن جو ہوتا آہورہ کے حکم سے ہوتا تھا۔ اور آہورہ نے خود اپنی زبان سے دیوی اور دیوتا کو تسلیم کیا تھا۔ اور کرایا تھا۔ لیکن آہورہ بھی چالاک تھا۔ اس نے جو پیشکش کی تھی۔ اس کا مطلب کچھ اور تھا

۔ چنانچہ وہ سرد لہجے میں بولا۔

”نہیں پاتال نگری کے رہنے والو ایسا تو کبھی نہیں ہوسکتا۔ تم جانتے ہو کہ دیوتا بھی ان رسومات کو، جو صدیوں سے چلی آرہی ہوں۔ منسوخ نہیں کرسکتے۔ انہیں اس کا اختیار نہیں ہوتا۔ یہ میں تم سے کہہ رہا ہو چلو پجاریو! جن کی قربانی مخصوص کی گئی۔ انہیں قربان گاہ پر لاؤ..... اور وہ لوگ متحرک ہوگئے۔ اور انہوں نے اس عورت کو اور اس کے بعد ہنگارا کو جو یہاں کا سردار تھا۔ پتھر پر جھکا دیا۔ تو اس وقت کرناوتی نے چیخ کر نعمت علی کو مخاطب کیا اور کہا۔

”نعمت علی تمہیں اندازہ ہے۔ کہ یہ لوگ ہم دونوں کے علاوہ سب کو قتل کردینا چاہتے ہیں۔ اب اس وقت تمہاری ہمت کی ضرورت ہے۔ جب میں اشارہ کروں تو تم ان پجاریوں کو گولی مار دینا۔ جو ہنگارا اور اس عورت کو قتل کرنے والے ہیں۔ اور اس وقت تمہاری ہمت کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں۔“ نعمت علی ایکدم سنبھل گیا۔

یہ ایک رسک تھا جو اسے لینا تھا۔ یعنی اس بات سے فائدہ اٹھانا تھا کہ یہ لوگ بارود کے جادو سے ناواقف تھے۔ اور اس وقت جو کیفیت آہورہ کی اندر سے ہوگی۔ اس کا انہیں اندازہ تھا۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”دیر نہ کرو۔ قربان کرو۔ انہیں کہ پانی میں رہنے والا ہمارا دیوتا ان کا منتظر ہے۔ تو پجاریوں نے اپنے خنجر اٹھائے۔ اور ان میں سے ایک نے اس دوسری عورت کو اور دوسرے نے سردار ہنگارا کو قتل کرنے کیلئے ہاتھ جھکائے۔

”اور نعمت علی کی پستول سے دو شعلے نکلے۔ اور پجاریوں کے سینوں میں سوراخ ہوگئے۔ اور ان سے ابلنے والا خون نیچے گرنے لگا۔ تو وہ اپنی جگہ سے ہٹے اور کھائی میں آگرے۔ اور بدصورت مگرمچھ نے انہیں بھی لپک لیا۔ اور مجمع میں ایک کہرام مچ گیا۔ تو انتہائی خوفزدہ انداز میں آہورہ نے دیکھا۔ اور اسی وقت کرناوتی کی آواز پھر ابھری۔

”نافرمانی کرنے والو! تم نے دیکھا نافرمانوں کو اور اگر ہماری نافرمانی کی گئی۔ تو اس کے بعد آسمانوں سے شعلے برسیں گے۔ اور ایسی ہی آوازیں ابھریں گی۔ اور بہت سے لوگ خون میں نہا جائیں گے۔ ہم امن کا پیغام لائے ہیں۔ اور تم یہ سب کچھ کررہے ہو۔ اور اے شخص! تو اب اس قابل نہیں رہا۔ کہ ہماری پیروی کرے۔ اور ہمارے احکامات دوسروں تک پہنچائے۔ لیکن اب بھی وقت ہے۔ جا اپنی اصلاح کر۔“

اس کے بعد ایک شور برپا ہوگیا۔ اور یہ رسم فوراً منسوخ کردی گئی۔ میں خوفزدہ تھا۔ اور خوشی کے نعرے لگا رہا تھا۔ اور آہورہ ایک طرف چل پڑا۔ اس کے بعد وہ پجاری یہاں آئے تھے۔ واپس پلٹے اور انہوں نے دیوی اڈینا، اور دیوتا آذن! کو واپس چلنے کیلئے کہا۔ تب یہ سب اسی محل میں یکجا ہوگئے۔ جہاں سے گذر کر یہاں تک پہنچے تھے۔ اور اس وقت کرناوتی نے وہ کارنامہ دکھایا تھا۔ جسے زندگی کی آخری سانس تک فراموش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور سب اس بات کے معترف تھے کہ کرناوتی ایسا جرأت مندانہ اقدام نہ کرتی تو یہ سارے کے سارے مارے جاتے۔ اب سب ہی اپنی جگہ جمع ہوگئے تھے۔ اور اس بات پر ایک دوسرے سے اظہار خیال کررہے تھے۔ نعمت علی نے کہا۔

”یہ سب کچھ تو ہوچکا ہے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے ایک دشمن تعمیر کرلیا ہے اور وہ یقینی طور پر ہماری گھات میں لگ جائے گا۔

”تمہاری آواز پر میں اپنی آواز بلند نہیں کرسکتا تھا۔ میری تو دلی آرزو یہ تھی۔ کہ اس طرح اس ایک نافرمان کی حیثیت سے قتل کردیا جاتا۔ اور یہ زیادہ بہتر ہوتا۔

”ہاں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“

”فی الحال تو وقت کا انتظار اور اس کے بعد دیکھنا ہوگا۔ کہ آگے کیا کیا جائے؟“

”صورتحال واقعی بے حد خوفناک تھی۔ تنہائی میں نعمت علی اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگا۔ وہ موقع نہایت ہی مناسب تھا۔ جب نافرمانی کے جرم میں آہورہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ آہورہ کی شکل میں ایک شیطان تھا۔ جو ان لوگوں کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ جانتے تھے کہ شیطان صفت کاہن نے ان کی حقیقت جان لی ہے۔ اور وہ ضرورت سے زیادہ چالاک ہے۔ جبکہ اس کی نسبت سردار ہنگارا ایک معصوم صفت آدمی تھا۔ اور اس نے انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

چنانچہ اس وقت جو کچھ کرنا تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ ظاہر ہے آہورہ اپنا اقتدار ختم ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔ تو اس وقت نعمت علی نے تنہائی میں جو کچھ سوچا وہ بڑے کام کی باتیں تھیں۔ پرمیت سنگھ اس کے پاس موجود تھا۔ اور پردھان سنگھ بھی اور ساری صورت حال پرمیت سنگھ اور پردھان سنگھ کے علم میں آچکی تھی۔ پردھان سنگھ نے آہستہ کہا۔

”اور تم لوگ نہیں جانتے کہ یہ بوڑھا پجاری کس قدر خوفناک شخصیت کا مالک ہے۔ میں اس وقت بے شک بچی تھی۔ لیکن یہ یہاں جو کچھ کرتا تھا۔ اس کا تھوڑا بہت علم مجھے بھی ہے۔ اور میں تم لوگوں کو ہوشیار کررہی ہوں۔ کہ اس کینہ پرور سے بچنے کی کوشش کرنا۔

”مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہم کیا کریں۔ وہ بیچارے غلام تو ایک طرح سے سمجھو کہ اپنی زندگی کے بہت بڑے عذاب میں گرفتار ہیں۔

”بہت سی باتیں سوچنے کیلئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان پہاڑوں میں سرنگوں کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ اور سرنگوں کے اس جال سے صرف آہورہ ہی واقف ہے۔ جس طرح وہ کرناوتی کے کمرے میں گھس آیا۔

”ہاں واقعی ہمیں بہت غور و خوض کرکے سارے کام کرنے ہیں تو پھر بہت سے مشوروں کیلئے سوچا گیا۔ اور ہابون اور کرناوتی کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔ جو بہت ضروری تھا۔ لیکن بہرحال یہاں کے رسم و رواج کا خیال رکھنا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ یہ لوگوں کا طریقہ زندگی تھا۔ پھر دوسرے دن سب ایک ہوگئے۔ پجاری وہاں موجود تھے۔ اور انہیں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کررہے تھے۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ یہاں کیا ہوسکتا ہے۔ یا کیا ہونا چاہئے۔ جب سب ایک جگہ جمع ہوگئے اور کرناوتی نے کہا۔

”مسٹر نعمت علی حالات واقعی سنگین نوعیت اختیار کرچکے ہیں۔ اور ہم اس مسئلے میں واقعی پریشان ہیں۔ اب تک جو کچھ بھی ہوا ہے۔ وہ تو خیر ہر حال میں ایک مناسب قدم تھا۔ اور کچھ نہیں۔ تو ہم ان چند لوگوں کی زندگی بچانے میں تو کامیاب ہوگئے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اب کیا کیا جائے۔“

میں خود پریشان ہوں۔ بہرحال میں یہ سمجھتا ہوں۔ کہ یہ جگہ ہمارے لئے سب سے زیادہ مخدوش ہے۔ کیونکہ یہاں ان پجاریوں کی اجارہ داری ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان سرنگوں میں کون کہاں سے کہاں تک آجا سکتا ہے۔ جس کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔“

”میں اس سے اتفاق کرتی ہوں۔“

”کوئی ایسی تدبیر، کوئی ایسی ترکیب ہو۔ جس سے ہم سب سے پہلے یہاں اپنا اور“ اپنے ساتھیوں کا تحفظ کرسکیں۔“

”یہ تو بے حد ضروری ہے۔“

”کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس جگہ کے بجائے ہم کہیں اور قیام کرنے کے بارے میں سوچیں۔“

”کیا یہ مشکل نہیں ہوگا؟“

”دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آہورہ اب ہمارے خلاف کیا طریقہ کار اختیار کرے گا۔“

”یہ سب سوچنا ہوگا۔“

”میں صرف ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔“ ہابون نے کہا۔

”بولو..... کیا؟“

”یہ تو تم نے دیکھا کہ تمہارے پستول سے نکلی ہوئی دو گولیوں نے حالات کا نقشہ بدل دیا۔ اور یہ بات

خوشی کی ہے۔ یہاں کے لوگ بارود سے واقف نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھ جو بارود یہاں تک پہنچا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس وقت ہماری زندگی کا ضامن ہے۔"

"بے شک ایسا ہے۔"

"تو پھر۔ سب سے پہلے اس کے تحفظ کا بندوبست کیا جائے۔"

"مگر یہاں پجاریوں کی جو اجارہ داری ہے۔ کیا وہ ہمیں ایسا کرنے کا موقع دیں گے۔ اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس وقت ہمارے خلاف کیا سازش ہو رہی ہو گی۔"

"پھر بھی بارود کا ذخیرہ ابھی میری تحویل میں ہے۔ اور یہ تمام ہتھیار جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا تحفظ سب سے پہلے کر لیا جائے۔" لیکن پھر کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پاتے تھے۔ کہ پجاری نے آ کر اطلاع دی۔

"سردار ہنگارا باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔" اور یہ سب چونک پڑے..... نعمت علی نے فوراً کہا۔

"اسے ہمارے پاس لایا جائے....." پھر پجاری جب باہر نکل گیا۔ تو نعمت علی نے کہا۔

"یہ ایک نام تو ہمارے ذہن سے نکل گیا تھا۔ اگر ہم اسے قبضے میں کر لیں تو کم از کم عارضی طور پر ہمیں سہولتیں حاصل ہو سکیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ایسا کر لیا جائے۔" اور پھر زیادہ گفتگو نہیں ہو سکی چونکہ سردار ہنگارا اندر داخل ہوا تھا۔ اسکے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت تھی اندر داخل ہونے کے بعد وہ ان کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ اور دیر تک سجدے میں پڑا رہا۔ تو۔ کرناوتی نے کہا۔

"اٹھو ہنگارا، تم ہمارے لئے باعث پسندیدگی ہو اور سب مناسب وقت میں تم نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا۔"

ہنگارا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں عقیدت نظر آ رہی تھی۔ تب اس نے کہا۔

"دیوی کون کہتا ہے۔ کہ تیری آمد باعث برکت نہیں میں تو ان لوگوں کی زندگی بچ جانے پر ہی اس بات کا قائل ہو گیا۔ پاتال نگری سے اندھیرا دور ہو جائے گا۔

"ہنگارا تیری زندگی بھی بچ گئی۔ مگر تو اگر مناسب سمجھے تو مجھے کچھ سوالات کے جوابات دے۔" کرناوتی نے کہا۔

"دیوی اپنی زبان سے کچھ کہے تو ہنگارا کی مجال کہ وہ اس سے منحرف ہو جائے۔"

"پہلے یہ بتا ہنگارا کہ یہاں اس کمرے میں کتنے ایسے دروازے ہیں جہاں سے پجاری اندر داخل ہو سکتے ہیں۔"

"صرف یہ....." ہنگارا نے جواب دیا۔

"کہاں ہے۔ وہ؟"

"اس طرح۔" ہنگارا نے اسی طرح اشارہ کیا جدھر وہ پتھر کی گول چٹان دروازے کی مانند کھل جاتی تھی۔

"کوئی ایسا عمل جس کے ذریعے دروازہ نہ کھلے۔"

"ہاں۔ ہے۔" ہنگارا نے کہا۔ اور اس کے بعد چٹان کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے ایک ایسی جگہ ہاتھ رکھ کر دبایا جو ان کے علم میں پہلے نہیں تھی۔ اور اس کے بعد وہ واپس آ گیا۔

"اب یہ جگہ اندر سے کھولنے کی کوشش کی جائے گی تب بھی نہیں کھلے گی۔"

"اس کمرے میں اور کوئی ایسی جگہ۔"

"نہیں جہاں تک میرے علم میں ہے۔"

"تو پھر ہنگارا ہم تجھ سے بہت سے سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ اصل میں قربانی کی جو رسم منسوخ ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں یہ سوچا اور دیکھا گیا ہے۔ کہ آہورہ نے اسے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ آہورہ کوئی غلط عمل کرنے کی کوشش کرے۔" ہنگارا نے گردن خم کر لی اور آہستہ سے بولا۔

"دیوی سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ آہورہ کیا

ہے؟"

"لیکن ہم صدیوں سے یہاں دور ہیں۔ اور اب ہم واپس آئے ہیں تو آہورہ ہماری آواز پر اپنی آواز بلند کرنا چاہتا ہے۔"

"دیوی آپ کو بہت سی باتوں کا علم نہیں ہو گا۔ لیکن آپ کا یہ غلام حاضر ہے۔ اور سب سے پہلے میں شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں اپنی جان کے بچ جانے کا۔ اور یہ حیرت انگیز اتفاق ہے۔ کہ اس سے پہلے آہورہ میرے قتل میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ ایک ایسا موقع تھا۔ اور اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ کہہ کر کہ جب دیوی اور دیوتا خود پاتال نگری میں حکمرانی کرنے آ گئے۔ تو پھر کسی سردار کی ضرورت نہیں اور سردار کو قربان کر دیا جائے۔ وہ اپنی کوشش میں یقینی طور پر کامیاب ہو جاتا۔ اگر دیوی میری جان بخشی نہ کرتی اور اس کے ساتھ ہی ان تمام افراد کی جو کچھ وقت کے بعد زندگی سے محروم ہونے والے تھے۔

"سن ہنگارا۔ کیا پانی میں رہنے والے کیلئے۔ قربانیاں ضروری ہوتی ہیں۔"

"ہاں۔ مقدس دیوتا! ہزاروں سال سے اس پانی کا کلیس ہے۔ اور یہ روایت پجاریوں ہی نے مشہور کی ہوئی ہے کہ کہ اگر اسکے حضور قربانیاں نہ دی جائیں۔ تو تباہی اور بربادی نازل ہوتی ہے۔"

"کیا کبھی ایسا ہوا کہ یہ قربانیاں نہ دی گئی ہوں۔"

"بھلا کس کی مجال تھی۔"

"گویا، قربانیوں کی یہ رسم ہزاروں سال سے جاری ہے۔"

"ہاں..... دیوی اسے کون منسوخ کر سکتا تھا۔"

"اچھا اب ایک اور خاص بات بتا۔ آہورہ کہاں رہتا ہے؟"

"وہ بہت سی جگہوں پر رہتا ہے۔ دیوی۔ اسکے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی عبادت گاہ میں پایا جاتا ہے۔ اور کبھی ایسے ویرانوں میں جہاں اس کی موجودگی کا تصور بھی نہ کیا جا سکے۔ حالانکہ وہ لاغر اور ضعیف ہے لیکن اس کی طاقت ناقابل یقین ہے۔ اور اسی لئے اسے سب سے برتر اور اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔"

"کیا پجاریوں کا یہ خاندان ہمیشہ سے اس شکل میں چلا آیا ہے؟"

وہاں..... آہورہ سے پہلے اس کا باپ اس سے پہلے اس کا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ، اس طرح صدیوں سے یہ سلسلہ چلتا چلا آ رہا ہے۔"

"کیا۔ آہورہ کی بیوی بھی ہے؟"

"نہیں دیوی۔ پجاریوں کی بیویاں نہیں ہوتیں۔"

"تو ان کی نسلیں؟"

"وہ مقدس قربانیاں قبول کرتے ہیں اور اس وقت تک جب تک جوان رہتے ہیں۔ حسین عورتیں ان کی خدمت کے لئے موجود ہوا کرتی ہیں۔ اور ان میں سے جو بھی حسین عورت بڑے پجاری کو پسند آتی ہے۔ وہ اس وقت تک اس کی تحویل میں رہتی ہے۔ جب تک اس سے مقصد پورا نہ ہو جائے، اور جب وہ کسی خوبصورت بچے کو جنم دے دیتی ہے۔ تو اس کی قربانی لازم ہو جاتی ہے۔ اور اس بچے کی پرورش مقدس پجاری کے بیٹے کی حیثیت سے ہوتی ہے۔"

"اور باقی عورتیں؟"

"نہیں ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔" ہنگارا نے سادگی سے بتایا۔ اور یہ لوگ حیرت سے اس آفاقی کہانی کو سنتے رہے۔" پھر نعمت علی نے سوال کیا۔

"سردار ہنگارا یہ رسم شروع سے جاری ہے، کیا تو اس کا مقصد بتا سکتا ہے؟"

ہنگارا نے بے چین نگاہوں سے ان سب کو دیکھا۔ پھر بولا۔

"مقدس اڈینا کے ساتھ آنے والے تیرا احترام ویسے بھی میں کرتا ہوں۔ لیکن تو نے ہی روشنی والی صورت بھیجی تھی۔ ان کاہنوں کیلئے جو میری زندگی لینے کے درپے تھے۔ چنانچہ میں تیری دل سے عزت اور قدر کرتا ہوں۔ آہ، تو مجھ سے وہ سوالات نہ کر جن کا جواب

دینے کے بعد میری زندگی کی ڈور تنگ ہو جائے۔ اور میں موت سے ہم آغوش ہو جاؤں۔"

"اگر تو دل سے یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ دیوی اڈینا اور دیوتا آذن تیرے درمیان موجود ہیں۔ تو پھر تو موت سے خوفزدہ ہو۔ ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ تیری موت اس طرح واقع نہیں ہوگی۔ اور ہم تیری حفاظت کریں گے سرخ شعلوں اور دھاکوں سے۔"

ہنگارا کے چہرے پر غور کے آثار پھیل گئے۔ پھر اس نے کہا۔

"عظیم دیوی! اور دیوتا۔ پاتال نگری کے اصل بادشاہ کالے لباس میں ہوتے ہیں۔ جو پجاریوں کا روپ دھارے ہوتے ہیں۔ اور وہ سردار جو حکمران ہوتا ہے۔ صرف نام کا سردار ہوتا ہے۔ ہر معاملے میں انہیں پجاریوں کا حکم چلتا ہے اور سب سے زیادہ طاقتور یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اور صدیوں سے ہی ایک خاندان بڑے پجاریوں کے عہدوں پر فائز ہوتا ہے۔ یعنی باپ کا بیٹا جیسا کہ میں نے تجھے بتایا۔ ہاں سردار کو خاص موقعوں پر اپنی ذمہ داریوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ اور یہی لوگ مل کر سردار منتخب کرتے ہیں۔ اور جب ایک سردار سے تھک جاتے ہیں۔ تو اسے بھینٹ چڑھا کر دوسرا منتخب کر لیتے ہیں۔ یہ پہلے سردار کے خاندان سے ہوتا ہے۔ یا اس خاندان سے جو ان پجاریوں کی باتیں مانتا ہے۔

اور یہ کشمکش تو ہمیشہ سے ہے کوئی سردار اگر پجاریوں کی قوت کو آنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اس کی موت بہت دردناک ہوتی ہے۔ اور کوئی حیثیت نہیں ہے۔ سردار کی۔ اور یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ اور پھر یہ لوگ فیصلہ کرتے ہیں کہ آبادی کتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ اور اس آبادی کو کم کرنے کیلئے وہ پانی والے دیوتا کا حکم سنا کر کہ وہ قربانی چاہتا ہے اور اس کے بعد قربانی کے نام پر "پاتال نگری" والوں کے گروہ پانی میں پھینک دیئے جاتے ہیں اور ان کا مال و دولت اور ان کا اسباب سب کچھ عبادت گاہ کی تحویل میں آ جاتا ہے۔ اور یہ سب سے بہتر اور بڑے لوگ ہیں کہ ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔"

یہ سب غور سے ہنگارا کی بات سن رہے تھے۔ اور غور کر رہے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ نعمت علی کے لئے خواب جیسا تھا۔ انسانی تصور سے دور اس پاتال نگری میں ایک خوفناک ہنگامہ ہوا۔ ہنگارا کی مدد سے نعمت علی بہت سے معاملات میں کامیاب ہوا۔ راجہ پرمیت سنگھ، کرناوتی اور پرداھن سنگھ اپنی چالیں چل رہے تھے۔ لیکن نعمت علی صدق دل سے صرف خیرالدین خیری کی رہائی کے لئے سرگرداں تھا۔ اور عین اس وقت جب پرداھن سنگھ کرناوتی کو دیوی کی حیثیت سے پاتال سنگھاسن پر بیٹھانے والا تھا۔ تو پورن وتی نے پرداھن سنگھ اور کرناوتی کو پاتال کی گہرائیوں میں دھکیل دیا۔ اور خود پاتال سنگھاسن پر بیٹھ گئی اور پاتال نگری والے دیوی کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ آہورہ اپنی موت مارا گیا۔ پورن وتی کی خواہش پوری ہو گئی۔ تو اس نے پاتال نگری پر اپنا اقتدار قائم کیا۔ اور اپنے محسن و کرم راج یا نعمت علی کو پیشکش کی کہ وہ اسے پاکستان کی سرحد کے دوسری طرف پہنچا دے گی۔ لیکن نعمت علی کا دل غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ اب خیرالدین خیری کے لئے کیا کرے۔ اور جب اسے خیرالدین خیری کی آواز اپنے کانوں میں سنائی دی تو اس کا دل خوشی سے منور ہو گیا۔ خیرالدین نے کہا۔

"پردھان سنگھ کی موت کے بعد میری روح اس کے تسلط سے آزاد ہو گئی۔ میری جان نعمت علی اب تمہیں کسی پورن وتی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا آنکھیں بند کرو۔ اور جب نعمت علی نے آنکھیں کھولیں تو اپنے وطن پاکستان میں خود کو اپنے گھر کے سامنے کھڑے ہوئے پایا۔ زندگی آگے تو بڑھے گی ایک بار پھر خیرالدین خیری اپنی آگے کی کارروائیوں کے لئے آزاد ہیں۔ اور اگر ان کی زندگی کے کچھ واقعات اور ہمارے علم میں آئے تو ہم آپ کو ان سے ضرور آگاہ کریں گے۔

ختم شد